Brown Book



فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۴۲ عیسوی

جلد ۲۰ نمبر ۲

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ۸/

صلاح الدین احمد ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبر لین روڈ لاہور میں چھپوا کر


چلو چائے پئیں
خاندان کے پینے کی چیز
ہندوستانی چائے
ایک گھریلو بیوی جب دوسرے گھریلو بیوی سے
بیٹھ کر بات چیت کرتی ہے تو کہتی کہ چلو چائے پئیں۔ گھر کے
چھوٹے بڑے کاموں کے بعد تازہ دم ہونے کیلئے چائے
ضروری شے ہے۔ آپکو یقین کرنا چاہیئے۔ کہ اس
ہمارے گھر کا ایک پینا آج کل
گیا ہے۔ آپ
کیجئے۔

بزم ادب

Checked 1965

حالاتِ جنگ کے تقاضے نے ہمیں آخر وہ قدم اٹھانے پر مجبور کر ہی دیا۔ جسے ہم آج تک ملتوی کرتے چلے آئے تھے۔ اس اشاعت سے ادبی دنیا اپنے معروف سائز کو چھوڑ کر موجودہ سائز اختیار کر رہا ہے۔ یہ تبدیلی اکثر ناظرین کو ناگوار معلوم ہوگی۔ ہم پر بھی بہت گراں گزری ہے لیکن اس صورتِ حالات کا کوئی مداوا نہیں کہ مارکٹ میں ادبی دنیا کے سائز کا کاغذ کسی قیمت پر بھی نہیں دستیاب نہیں ہوتا۔ سائز کی تبدیلی کے ساتھ صفحات کی تعداد میں خاصہ اضافہ کردیا گیا ہے۔ اور کتابت تو اس قدر باریک ہوگئی ہے کہ بڑے سائز کے ایک صفحے کا مضمون موجودہ سائز کے ایک صفحے میں بخوبی سما جاتا ہے۔ اب ادبی دنیا قد وقامت کے لحاظ سے اردو کے بیشتر معزز رسائل کے برابر ہوگیا ہے اور ہمیں اس یکسانی وہمدوشی سے یک گونہ مسرت بھی ہوئی ہے ایک انگریزی مثال ہے کہ ہر سیاہ بادل کا ایک نقرئی کنارہ بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے سائز کی موجودہ ناگوار تبدیلی کا روشن پہلو یہ ہے کہ اب ڈاک میں پہلے کی بہ نسبت بہت کم پرچے اڑائے جائیں گے۔ اس لئے کہ ادبی دنیا کا بڑا سائز رسالہ چرانے والوں کے لئے بجائے خود ایک بہت بڑی ترغیب تھا۔ موجودہ سائز چونکہ اس قدر دلکش نہیں اس لئے پرچہ ان حضرات کی توجہات سے نسبتاً محفوظ رہے گا۔

جنگ کے بعد انشاء اللہ وہی پہلا سائز اور وہی پہلی شان بحال ہو جائے گی۔

اس شمارے کے چاروں افسانے نہایت بلند پایہ اور دل آویز ہیں طبعزاد افسانوں میں ہمارے فلسفی افسانہ نگار جناب دھرم پرکاش آنند ایم اے کی کہانی جدید —— جدید تر مصنف کی ژرف نگاہی، خلوص، اور جرأت کی آئینہ دار ہے بورژوا سوسائٹی کے کھوکھلے پن کا اس سے بہتر مطالعہ ہمارے افسانوی ادب میں بہت مشکل سے ملے گا۔ آنند فن کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں پر ایک آہنی قدرت کا مالک ہے اُس کے ہاں نفسی تجزیے کی گہرائی مشاہدے کی باریکیوں سے رقیبانہ چشمک رکھتی ہے۔ اور دونوں میں سے کوئی دبتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ آنند صاحب بہت کم لکھتے ہیں، لیکن جب لکھتے ہیں بہت خوب لکھتے ہیں۔

مہندر ناتھ صاحب ہماری بزم میں نووارد ہیں۔ یہ مشہور افسانہ نگار کرشن چندر ایم اے کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ان کا افسانہ خلاء پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تعلیم کے دوران میں نسوانی نفسیات کے مطالعہ کا جو خفیف سا موقع انہیں ملا۔ اُسے انہوں نے رائگاں نہیں جانے دیا۔ خلاء نہ صرف ایک گہرا نفسیاتی مطالعہ ہے بلکہ ہیئت اور ساخت کے لحاظ سے ایک نہایت کامیاب افسانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مہندر ناتھ ابھی نوجوان ہیں لیکن ان کی تحریر کے رنگ میں پختگی جھلکتی ہے جسے جمالِ ہم نشیں ہی سمجھنا چاہیئے۔

بہرہ مضامین بھی اس بار کچھ کم دلچسپ نہیں۔ ہمارے پرانے کرمفرما جناب کرشن چندر ایم اے ایک عرصہ بعید کے بعد ادبی دنیا میں رونق افروز ہوئے ہیں۔ کرشن چندر کی انشائے لطیف بھی انہیں روح پرور عناصر سے معمور ہوتی ہے جو اُس کے افسانوں میں زندگی پیدا کرتے ہیں۔ وہی کیف زا نگارش۔ وہی چست بندشیں۔ وہی ہلکا ہلکا طنز۔ اور وہی وارفتگی و برجستگی یہاں بھی اپنی پوری رعنائی میں جلوہ آرا ہے۔ دیباچہ نگاری کو ان کے لطیف مضامین کے سلسلے میں ایک قیمتی اضافہ سمجھنا چاہیئے۔

علی احمد صاحب ہمارے ان نوجوان اہلِ قلم میں سے ہیں جنہوں نے شاعری کے میدان میں طبیعت کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ اب کے اُن کا ایک سیر حاصل مضمون ملاحظہ فرمائیے۔ **بلوچیوں کے گیت**۔ مضمون کے پہلے چار صفحے پڑھنے کے بعد جب حاصلِ مطلب شروع ہوتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اُن رومانی صحراؤں کی چاندنی راتوں میں کھو گئے ہیں جن کی فضا محبت کے نالہ ہائے شبگیر اور نفرت وانتقام کی لرزہ خیزیوں سے یکساں معمور ہے۔ بلوچی قبائل کا سرمایہ شعر و ادب ان کی جنگجویانہ زندگی اور رومان پرور صحرائی معاشرت کا آئینہ دار ہے۔ صاحبِ مضمون نے جس محنت سے ان خصوصیات کی توضیح وتشریح کی ہے وہ حقیقتاً داد طلب ہے۔

صلاح الدین احمد

ابدیت

کنارِ آبِ رواں آج بھی وہی ہے سکوں
جسے نکالا تھا شہروں کے شورِ پیہم نے —
ہجوم بکھرا ہوا شام کی صداؤں کا
دروں سے ٹھوکریں کھاتا ہوا گزرتا ہے
ہوا کے آہنی پنجوں کی برف خوردہ گرفت
اُسے پکڑ کے فضا میں دھکیل دیتی ہے۔
ہنسی کے شعلے لپکتے ہیں سرد سانسوں سے
مگر چراغِ مسرت جلا نہیں سکتے،
یہ خود بھی سرد ہیں — مایوس و مضطرب سی ہنسی
فسردگی کے دھوئیں میں سمائی جاتی ہے۔
نگاہیں ملتی ہیں بے اختیار ملتی ہیں
مگر دلوں میں اترتی ہیں آرزو کی طرح
ربابِ عشق صدا دے کے ٹوٹ جاتا ہے۔
گلال چہروں پہ رنگِ شفق سے ہے جیسے
کسی نے آگ لگا دی ہو ابرپاروں میں
اُداس، مرثیہ خواں، دلفگار تعمیریں
بجھے ہوئے سے چراغوں کو لے کے بیٹھی ہیں —
سیاہ پردۂ شب میں چھپی ہوئی آنکھیں
تراشتی ہیں ستاروں کے اَن گِنت آنسو —
مہیب چیخ جگاتی ہے کارخانوں کو
تواں کی لمبی بڑی ناک سے دھواں اُٹھ کر
دبوچ لیتا ہے ہاتھوں میں آفتابوں کو
تقاضا ہائے شرافت سے مُسکراتے ہوئے
وہ لوگ جن کے پلندوں سے گرد اڑتی ہے
مشین بن کے گھسے جاتے ہیں دفاتر میں۔
یہ مسکراتی ہوئی روئی صورتیں اِن کی
نہ دیکھی جائیں گی — مجھ سے نہ دیکھی جائیں گی
مجھے یہاں سے کہیں دور لے چلو کہ یہاں
حرارتِ ابدی بیچ کر خریدتے ہیں
وہ ایک نانِ جویں جس سے موت ملتی ہے،

(۲)

سنا ہے آج بھی آبِ رواں کے دھارے پہ
وہی سکوں ہے نکالا تھا جس کو شہروں نے
حقیر جان کے بے آبرو سمجھتے ہوئے —
وہیں چلیں — کہ تمہاری نگاہ کی مستی۔
فضائے دل پہ مسرت کی چاندنی بن کر
تمہارے ساتھ مجھے لازوال کر دے گی۔

یوسف ظفر

بلوچیوں کے گیت

بلوچی شاعری کے وجود کا علم اس وقت تک کسی کو نہ ہوا تھا جب تک کہ لیچ نے "بلوچی زبان کا خاکہ" کے عنوان سے چند مسلسل مضامین ۱۸۴۰ء کے جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں شائع نہ کئے لیکن چھاپے کی خرابیوں اور ترجمے کی غلطیوں کی وجہ سے یہ نظمیں اپنے "اصل متن" کی حقیقی ترجمانی سے قاصر ہیں۔ لیچ کے مرنے کے بعد بہتیرے سالوں تک کسی نے اس عنوان کی طرف توجہ نہیں کی۔ ۱۸۷۷ء میں سر آر۔ برٹن نے اپنی کتاب "سندھ کا دوبارہ سفر" میں گیتوں کے ترجمے اصل عبارت کے بغیر پیش کئے۔ ان میں سے پہلا گیت تو لفظ بہ لفظ لیچ سے سرقہ تھا اور دوسرا بھی لیچ کے گیت "عیسیٰ اور باری" کا پھیلاؤ تھا۔ تیسرا گیت شاید برٹن کا ذاتی تھا۔ اس ایک استثنا کو نظر انداز کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ لیچ کے بعد ۱۸۷۵ء تک بلوچی شاعری منظر عام پر نہ آئی یہاں تک کہ "لانگ ورتھ ڈیمس" نے برسوں کی کوششوں کے بعد ڈیرہ غازی خاں، راجن پور، سیوی، گورکھانیوں، ماریوں، بگٹیوں اور لیگھاری کی پہاڑی سرزمین سے کثیر تعداد میں نظمیں حاصل کیں اور ۱۸۸۱ء میں "جنوبی بلوچی زبان کا خاکہ" کے عنوان سے ان کے تراجم شائع کئے لیکن یہ مجموعہ بہت ہی مختصر تھا چنانچہ مصنف مذکور چھبیس سال تک "بلوچی شاعری" کے متعلق مواد فراہم کرتا رہا۔ علاوہ اس کے براہیم شمبانی، خدابخش اور لشاری گورگانی نے نظموں کا ایک بڑا سرمایہ حاصل کرنے میں مدد دی۔ محمد بالاچانی، لگا لشاری اور [illegible] نے بھی اس کا ہاتھ بٹایا۔ براہیم شمبانی، پنجو بنگولانی اور جیوا کرد نے خود اپنی نظمیں لکھوائیں۔ ۱۹۰۶ء میں اس نے خود بلوچستان کا سفر کیا اور نیز ۱۹۰۷ء میں "بلوچیوں کی عمومی شاعری" کے نام سے ایک بسیط و ضخیم کتاب شائع کی۔ یہ ساری کتابیں انگریزی زبان میں ہیں۔ اردو زبان میں صرف ایک مختصر سی کتاب "بلوچی نامہ" ملتی ہے۔ اس کا مصنف ہتو رام ہے اور یہ ۱۸۸۱ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔

یہ نظمیں یا گیت جو شعراء کی ایک بڑی تعداد پر مشتمل ہیں بلوچی قبیلوں کی زبان پر ہیں اور اس سارے خطہ میں پھیلے ہوئے ہیں جو درہ بولان اور جھل کے میدانوں سے شروع ہو کر کوہ سلیمان کے جنوبی حصے سے ہوتا ہوا پنجاب کے جنوب اور سندھ کے دامن سے ساحل تک پہنچتا ہے۔ اس خطہ کا بیشتر علاقہ [illegible] ٹیلوں کے [illegible] بکھرا ہوا ہے۔ البتہ بعض وادیاں اس قدر بنجر نہیں۔ بلوچی جو یہاں آباد ہیں مختلف قبیلوں اور جرگوں میں منقسم ہیں۔ اس نسل کی مختصر تاریخ کا ذکر گیتوں کے نقطۂ نظر سے بہت ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ان قبیلوں میں اس نسل کے بھی بہت سے خاندان شامل ہیں جو ڈوم یا ڈومب کہلاتے ہیں۔ یہ بلوچیوں کے موروثی بھاٹ اور مغنی شاعر ہیں جو قدیم شاعرانہ روایات کے امانت دار ہیں۔ یہی سلسلہ نسلاً بعد نسل آج تک چلا آ رہا ہے۔ یہ ڈوم صرف بلوچستان ہی میں نہیں بلکہ افغانستان، ایران اور شمال مغربی ہندوستان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ آپس میں کسی سندھی زبان یا پوربی پنجابی میں گفتگو کرتے ہیں لیکن اپنے مقام اصل کے لحاظ سے فارسی، پشتو، بلوچی اور براہوئی سے بھی اسی قدر واقف ہوتے ہیں۔

بلوچیوں میں ان کی حیثیت مغنیوں اور رکھوالوں کی سی ہے۔ یہ قبائلی سبھاؤں میں گیت گاتے ہیں گو بذات خود شاعر نہیں ہوتے۔ وہ قدیم گیتوں کو ہم تک پہنچاتے ہیں یا موجودہ شاعروں کی نظموں کو نشر کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ یہ گیت [illegible] انہیں لوگوں کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں جو [illegible] بلوچی ہیں۔ ایک حقیقی بلوچی عوام میں اس طرح گیت پڑھنے [illegible] کو اپنی کسر شان سمجھتا ہے۔ اسی طرح ایک شاعر جو اپنے گیتوں کو عوام میں مقبول کرانا چاہتا ہے وہ ڈوم کی خدمات حاصل کرتا ہے اور انہیں سکھاتا ہے۔

اس قسم کی ساری شاعری اپنے ماخذ اور نوعیت کے لحاظ سے بہت مقبول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ [illegible] پریم گیتوں کے [illegible] ادبی لگاؤ [illegible] آشنا فارسی شاعری کی گونا گوں صنفیں جو افغانستان اور مسلمان ہندوستان میں بہت مقبول ہیں اور جن کی ہمہ گیری [illegible] ان کے پاس نہ تو غزلیں ہیں [illegible] کوئی مکمل دیوان [illegible] شاعری [illegible] نہیں بلکہ ان کا موضوع بھی مختلف ہے۔ بلوچ شاعری [illegible] بیان کے لحاظ سے سادہ، صریح اور راست ہے [illegible] تصویریں نظر آتی ہیں جیسی کہ ہم ایسے خشک مقام سے توقع رکھ سکتے ہیں جہاں پانی کی قلت ہے [illegible] بارش بہت کم ہوتی ہے۔ ایسی سرزمین کا شاعر بارش کے ان [illegible]

طلوعوں کو بیان کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے جو کبھی کبھی پہاڑوں میں بجلیاں چمکاتا نظر آجاتے تھے اور اس اچانک تبدیلی کو نظر انداز نہیں کرتا جو بارش کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے گرد و غبار اور کہر سے بوجھل فضا دیکھتے دیکھتے ایک شفاف خلا اور جوشیلی تازگی میں تحویل ہو جاتی ہے۔ پہاڑ کی بھوری سطح مخملی فرش سے ڈھک جاتی ہے خشک نالوں میں پانی کی نہریں دوڑتی ہیں، آبشار بلندی سے گرتے ہیں اور ہر پہاڑی نشیب چشمہ بدامن نظر آتا ہے جرہ اپنے تلوار اور ڈھال سے آراستہ توڑے دار بندوق لئے اپنے گلوں کے سامنے گانے اور چھلانگیں مارتے پھرتے ہیں اور عورتیں بکریوں کی صورت میں مردوں سے الگ پہاڑیوں میں گھومتی اٹھلاتی ہیں

گیتوں کے مصنف شاعروں کے نام بڑی حد تک اب تک محفوظ ہیں ـــ اس لئے کہ بھاٹوں کے دستور کے مطابق کسی گیت کے گانے سے پہلے وہ بطور تمہید اس کے مصنف کا نام اور گیت کا موضوع ضرور بتا دیا کرتے تھے۔ اس نقطۂ نظر سے بلوچی شاعری عام شاعری سے بہت کچھ اختلاف رکھتی ہے کیونکہ عام طور پر گیت گمنام شاعروں ہی کے ہوتے ہیں۔ اصل چیز گیت ہوتا ہے۔ اس کے مصنف کا نام کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ بلوچی شاعری کی یہ خصوصیت ایک حد تک اپنی جگہ انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ تمام نظموں اور گیتوں کے اسلوب اور طرز بیان میں ایک مشترک مماثلت کام کرتی نظر آتی ہے۔ روزمرہ اور محاورں کی تکرار پڑھنے والے کو بے تکلف اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ ہر ادیب اور شاعر کو رواجی بولی اور رسمی ترتیب و بندش کا پابند ہونا لازمی ہے۔ بہ نسبت دیگر صنفوں کے گیتوں میں یہ عنصر اپنے انتہائی کمال کو پہنچ جاتا ہے ـــ اور گیت کی اصطلاح کو وسعت دے کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بلوچی گیت بیانیہ شاعری کا نمونہ ہیں۔

تمام نظمیں اور گیت ڈوم ہی گاتے ہیں۔ یہ پیشہ ور گویے اپنے ساتھ دو ساز رکھتے ہیں ایک کو ڈمبیرو کہتے ہیں اور دوسرے کو سرندا۔

ڈمبیرو ایک لانبی ساق کا تاروں والا ساز ہے۔ ناشپاتی نما لکڑی کا ایک ڈھانچہ ہوتا ہے جو مینڈولین (سارنگی کی قسم کا ایک انگریزی ساز) سے بہت مشابہ ہوتا ہے۔ ہموار سطح کو چھوڑ کر باقی سارا ڈمبیرو ایک ہی لکڑی سے بنایا جاتا ہے۔ اس میں چار تانت کی ڈوریاں ہوتی ہیں جو بھیڑ کی آنتوں سے بنتی ہیں اور اسے ستار کی طرح انگلیوں سے چھیڑتے ہیں۔ یہ فارس اور ہندوستان کے ستار ہی کی قبیل کا ایک ساز ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کچھ زیادہ لمبا ہوتا ہے اور سادہ پچی کاری کے بجائے بڑی خوبصورتی سے بنایا جاتا ہے ستار میں عموماً پانچ تار ہوتے ہیں لیکن ڈمبیرو میں صرف چار۔ پہاڑیوں میں بسنے والے عموماً اس کو چھوٹے درختوں ٹکوما اور انڈولتا کی لکڑیوں سے تیار کر لیتے ہیں جو موسم بہار میں پہاڑوں کے بنجر کناروں پر نارنجی رنگ کے بے شمار پھولوں کے ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ پنجاب اور سندھ کا لہورا یا لوہیرو اور افغانستان کا دیودار ہے۔ بلوچیوں میں یہ فارفوگہ کے نام سے جانا جاتا ہے اور جس لکڑی سے ساز بنایا جاتا ہے اس کا ذکر اکثر شاعری میں فارفوگہ دار یا ٹکوما لکڑی کی صورت میں آتا ہے۔ لکڑی بھورے رنگ کی سخت اور چکنی ہوتی ہے ـــ لفظ ڈمبیرو ایران کے طنبور یا طنبورہ اور سندھ کے دنبورو سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا ساز جو اس کے ساتھ استعمال ہوتا ہے سرندا یا سرینده ہے یہ ایک چھوٹا سا ساز ہے جو لکڑی سے بنا ہوتا ہے اور اس پر ایک جھلی لگی رہتی ہے جس پر ستار کی طرح پُل جما دیا جاتا ہے۔ اور اواخر قرون وسطیٰ میں استعمال ہونے والے ستار کی طرح زاویہ قائمہ پر خم ہوتا ہے۔ اس میں پانچ تانت کی ڈوریاں ہوتی ہیں جو پُل پر سے گزرتی ہیں۔ ان کے ساتھ پانچ دھات کے معاون تار ہوتے ہیں جو تانت کے تاروں کے نیچے سے ہوتے ہوئے پُل کے سوراخوں میں سے گزرتے ہیں۔ اس کو وائلن کی طرح سیدھا تھامتے ہیں اور گھوڑے کے بال والی کمان سے بجاتے ہیں۔ پہاڑیوں میں لوگ اسے "گریویا" درخت کی لکڑی سے بناتے ہیں۔ بلوچی اپنی زبان میں اس لکڑی کو ساگھ کہتے ہیں اور اسی نام سے یہ شاعری میں استعمال ہوتا ہے یہ لکڑی لچکدار لیکن سخت اور سرخ بھورے رنگ کی ہوتی ہے۔

سرندا ہندوستانی ساز سارنگی سے مشابہ ہوتا ہے لیکن اس سے چھوٹا اور زیادہ چوڑا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام ہی سارنگی اور ایران کے سرونج سے لیا گیا ہے۔

ایک تیسرا ساز "نار" بھی ہے دیگر سازوں کے ساتھ اس کی ہم آہنگی بھی ضروری خیال کی جاتی ہے۔ یہ لکڑی کی ایک نلی ہوتی ہے جس کی لمبائی تیس انچ تک پہنچتی ہے اس کے اطراف خام تانت لپٹی ہوتی ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ڈمبیرو اور سرندا ڈوم ہی بجاتے ہیں لیکن "نار" کا نوازنے والا ہمیشہ بلوچی ہوتا ہے۔

بلوچیوں کی جملہ اصناف شاعری کو چار عنوانوں کے تحت ترتیب دیا جاسکتا ہے۔

(۱) رجزیہ یا رزمیہ گیت ـــ ابتدائی دور

(۲) رومانی گیت
(۳) پریم گیت اور غنائی نظمیں۔
(۴) دستانگ

۱۔ رزمیہ گیت قدیم اور بلوچیوں کی اہم روایاتی داستانوں کے حامل ہیں۔ ان میں صدا اور مرکزی واقعات رندوں اور لشاریوں کی جنگیں ہیں اگرچہ بعض گیت وجوہاتِ جنگ اور اثراتِ جنگ سے بھی بحث کرتے ہیں کہیں کہیں رندوں اور دودائیوں کی لڑائیوں کا بھی ذکر آتا ہے۔

در اصل بلوچی متعدد فرقوں میں منقسم تھے جن سے رند اور لشاری کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ پھر ان میں ایک بڑا انقلاب آیا جس نے اپنے سینے پر چلنے والوں کو بولان، ملا اور دوسرے دروں کے ذریعے ہندوستان کے میدانوں میں بکھیر دیا اور سیبوی کے علاقوں، باگہ، شوران اور زیادہ تر کراچی کے میدانوں میں بس گئے۔ یہاں انہیں جمتے دیر نہ لگی تھی کہ آپس میں جھگڑنے لگے۔ رندوں کے سردار میر چاکر اور لشاریوں کے سردار میر گوہرام ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ اس خانہ جنگی کی ابتدا گوہر نامی ایک عورت سے ہوئی۔ گوہرام اسے اپنی محبوبہ بنانا چاہتا تھا لیکن وہ اس کی درخواست کو ٹھکرا کر چاکر کے پاس آگئی جو خود بھی اسے چاہتا تھا۔ انہیں دنوں میں ایک "گھوڑ دوڑ" ہوئی جس میں رآمین لشاری اور ریحان رند نے بھی اپنے اپنے گھوڑے ڈالے۔ رآمین نے صحیح طور پر ریس جیتی لیکن رندوں نے ناجائز طور پر جیتنے کا انعام ریحان کو دیا۔ لشاری برافروختہ ہو گئے اور ان کی ایک جماعت نے چاکر گوہر کے چند اونٹوں کو قتل کر ڈالا۔ عورت نے اس واقعے کو چاکر سے چھپانے کی ناکام کوشش کی اور راز کے فاش ہو جانے پر چاکر نے قسم کھائی کہ وہ اس کا بدلہ ضرور لے گا۔ بیورغ رندوں کا ایک سربراہ رکن تھا۔ اس نے اسے اس سے باز رکھنا چاہا لیکن اس کے چچا میر جان، ریحان اور پرجوش جارو نے اسے بھڑکایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رندوں نے درۂ ملا میں لشاریوں پر حملہ کر دیا۔ لشاری جنہیں نوحانیوں کی مدد حاصل تھی۔ اپنے آزادی پسند سرگروہ کی رہنمائی میں مقابلے کے لئے آئے۔ اس وقت لشاریوں کی طرف نودبندغ، گوہرام کا بوڑھا تجربہ کار باپ (جو اپنی عالی ہمتی اور عقلمندی کے لئے مشہور تھا) بہار، بیجار، رامین اور بکر جیسے بڑے سردار تھے چنانچہ اس لڑائی میں رندوں کو شکست ہوئی۔ بیورغ اور میر جان جان سے مارے گئے۔ خود چاکر کو نودبندغ نے بچایا ——— وہ اس کو اپنے گھوڑے پھول پر بٹھا کر میدان جنگ سے نکال لایا۔ بیورغ کا قندھار کے بادشاہ کی لڑکی کو بھگالے جانا اور بجائے چاکر کے گوہرام سے مدد کا طالب ہونا ——— یہ تمام واقعات جنگ شروع ہونے سے پہلے کے ہیں۔

چاکر نے ترکوں یعنی ہرات اور قندھار کے مغلوں کے پاس پناہ ڈھونڈی اور ان سے سیاسی اتحاد قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا اگرچہ لشاری انہیں رشوت دے کر اپنی طرف ملانے کی بڑی کوشش کرتے رہے۔ یہ جنگ تیس سال تک جاری رہی جس میں زیادہ تر لشاری تباہ ہوئے۔ اور چاکر کو رندوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ ترکِ وطن کر کے پنجاب آنا پڑا شوران کے رند اور ڈھال کے مگھاشی لشاری کچھی ہی میں سکونت پذیر رہے۔ پھر چاکر اور اس کے بیٹے شاہزادے نے ملتان کے لنگھاؤں سے تعلقات قائم کئے اور پھر ہمایوں کی فوج میں مغلوں کے ساتھ دہلی کے حملہ میں شریک ہو گئے۔ رندوں کی ایک بڑی جماعت نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور بیجار کی سرکردگی میں دریائے سندھ سے واپس ہو گئے۔ جہاں ان کی لڑائی دودائیوں سے ہوئی جو سہراب خاں کی کمانڈ میں لڑنے کے لئے آئے تھے۔

اس رزمیہ داستان نے خاص کرداروں کی سیرت کو جملہ گیتوں میں بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ چاکر خود بہادر، فیاض اور جوشیلا ہے اور ان صفات کے ساتھ ساتھ نیم وحشی بھی وہ جانی کو فریب دے کر مرید سے دغلاتا ہے۔ وہ جارو کو اپنے ہی لڑکے کو مار ڈالنے کے لئے ابھارتا ہے۔ برخلاف اس کے ترکوں کے ہاتھوں لشاری عورتوں کی گرفتاری کے معاملے میں وہ بڑی عالی ظرفی سے کام لیتا ہے۔ وہ آج تک ایک معیاری بلوچی سردار کی حیثیت سے مانا جاتا ہے۔ اور اس کے کارنامے آج کل کی کہانیوں میں مبالغہ کے ساتھ کرامت و اعجاز بتائے جاتے ہیں۔ لیکن گیتوں میں ان مافوق الفطرت عناصر کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

نودبندغ بلوچیوں کی طرح فیاض ہے اور بعض گیتوں میں خود اپنی زبان سے اپنے کردار کا اظہار کرتا ہے۔ وہ ایک بہادر بوڑھے کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے اور دشمن ہونے کے باوجود چاکر کو میدان جنگ سے جان بچا کر نکل بھاگنے میں مدد دیتا ہے۔ کیونکہ اس پر چاکر کی ماں کا ایک بڑا احسان تھا جو اس نے لڑکپن میں اس کے ساتھ کیا تھا۔ بقیہ ساری داستان بھی چاکر کے ساتھ ساتھ اس کے عظیم الشان کارناموں سے

بھری پڑی ہے اور اس کا نام جس کے لفظی معنی "بادلوں کا باندھنے والا" ہوتے ہیں کسی نامعلوم شدہ سنسکرت قصہ سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔

میرخاں اور چاکر دونوں شیلے جذباتی اور مرموسی جنگ جو بلوچی ہیں۔ جلد باز اور انتقام کے لئے بے چین۔ برخلاف اس کے بیورغ ان کے درمیان بہت سلجھا ہوا نظر آتا ہے اور نیک مشورے دیتا ہے۔ اُس نے چاکر کو اُس رائے پر عمل کرنے سے بہت روکا جس کا نتیجہ آگے چل کر خونریزی، تباہی اور غارت گری ہوا۔

رندوں اور لشاریوں کے درمیان اس تیس سالہ جنگ کی کوئی آزادانہ تاریخی شہادت نہیں ملتی۔ اگرچہ ذوالنون بیگ ارغون کے ذریعہ ترکوں کے ساتھ ان کا سیاسی اتحاد قائم ہونا اور سہراب خاں کی سرکردگی میں دودائیوں کا رندوں کے مقابل میں آنا ثابت ہوتا ہے نیز چاکر اور شاہزاد کے ملتان کی گھاٹیوں میں ملنے کی تصدیق ہوتی ہے ان کے علاوہ دوسرے کرداروں کے نام کسی لکھی ہوئی تاریخ میں نہیں ملتے۔ بہرحال متذکرہ بیان کی روشنی میں ہم اتنا قطعی طور پر ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اصل داستان تاریخی ہے البتہ اس میں شک نہیں کہ بیان کرنے والوں نے واقعات میں تغیر و تبدل کر کے انہیں مبالغہ کے ساتھ پیش کیا ہو۔

۲۔ رومانی گیت۔ یہ اپنی خصوصیتوں کے حامل ہیں لیکن ان میں اسلوب بیان ابتدائی دور کے رزمیہ گیتوں سے ملتا جلتا ہے۔ زبان کے اعتبار سے سب سے قدیم ہیں۔ بیورغ کا رومانی گیت اٹھارھویں صدی کے پریم گیتوں کے لگ بھگ ہے۔ ان گیتوں کی زبان عام فہم، سادہ، شستہ اور پاکیزہ ہے۔

لی لا اور مجنا کے تحت مشہور عربی داستان لیلا اور مجنوں کا چربہ اُڑایا گیا ہے اور بالکل خالص بلوچی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ لی لا کی تصویر —— اپنی چھوٹی جھونپڑی میں بیٹھنا اور پہاڑوں میں ایک ہلکے طوفان کے بعد اُبلتے ہوئے شفاف چشموں کے پاس بیٹھنا —— مقامی رنگ میں ایک عجیب حُسن کے ساتھ شاعری کی زبان میں کھینچی گئی ہے۔

پرات اور شیریں کا پلاٹ بھی یقیناً فارسی حصہ فرہاد اور شیریں سے لیا گیا ہے۔

۳۔ پریم گیت اور غنائی نظمیں —— اس عنوان کے تحت وہ محبت میں ڈوبے ہوئے گیت ہیں جو بیانیہ سے زیادہ غنائیہ ہیں۔ بیورغ یا شونا اور بخش می کے رومانی گیتوں کا پرتو ان میں کہیں کہیں جھلکتا ہے۔

پریم گیتوں کا مصنف مشہور بلوچی شاعر جام درک ہے جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں ناصر خاں کے دربار میں رہ چکا ہے۔ یہ گیت نازک اور دلکش ہیں لیکن بیان میں تصنع زیادہ ہے۔ ان میں وہ بے تکلفانہ پن اور کھلی فضا نہیں ملتی جو لی لا اور مجنا جیسی رومانی گیتوں میں ہے۔ یہ ہمیں بجائے پہاڑ کے دامن میں لے جانے کے قصبوں کے بازاروں میں پہنچا دیتے ہیں اور وہ عورتیں جو ان کے جذبات کو ابھارتی ہیں وہ چھوٹی جھونپڑیوں میں رہنے والی بلوچی دوشیزائیں نہیں بلکہ ڈیرے دار بیسوائیں ہیں جو بناؤ سنگار کر کے بازاروں میں گشت کرتی ہیں۔ سادگی، قدرتی پھول، عطر بیز نکہتوں کی جگہ بجتی ہوئی چوڑیاں، چمکتے ہوئے نتھ اور عطر و مشک کی لپٹیں دماغ کو معطر کرتی نظر آتی ہیں۔

۴۔ دستانگ —— یہ چھوٹے اور مختصر گیت ہیں۔ ان میں محبت کا عنصر بدرجہ اتم موجیں مارتا نظر آتا ہے۔ غنائی نظموں سے ان کی مماثلت بہت قوی ہے۔ اس کی تفصیلی بحث آگے آئے گی۔

(۱) رجزیہ یا رزمیہ گیت

نسبیات کے گیت

یہ گیت بلاشبہ قدیم ہے اگرچہ اپنی زبان کے لحاظ سے زیادہ قدیم معلوم نہیں ہوتا۔ تاہم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس کی بنیادی تصنیف سولھویں صدی کے ابتدائی حصہ میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بلوچی نسل کی ایک بڑی تعداد نقل وطن کر کے سندھ کی وادی اور اس کے اطراف و اکناف کی پہاڑیوں میں بس گئی تھی۔ شاعر غالباً ڈوکی قبیلہ والوں سے تعلق رکھتا تھا جن کی وہ بہت تعریف کرتا ہے۔ اور اُن کے رتبہ کو بڑھا چڑھا کر رندوں کے برابر قرار دیتا ہے۔

میں خدا کی حمد کرتا ہوں اور اس کا شکر ادا کرتا ہوں جو زمین و آسمان کا بذات خود مالک ہے۔ جب ساری دنیا غبار اور مٹی کا ڈھیر ہو جائے گی، وہ مستقیم مزاجیت کے ساتھ باقی رہے گا۔

ہم علی کے پیرو ہیں ہمارے عقیدے استوار اور ہم خدا کے پاک نبی کی تعظیم کرتے ہیں ہم میر حمزہ کی اولاد ہیں۔ ہماری فتح خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ ہم حلب سے اُٹھے اور کربلا اور بوم پور میں یزید سے جنگ کی۔ پھر وہاں سے سیستان آئے۔ ہمارا بادشاہ شمس الدین تھا جو بلوچیوں پر بہت مہربان تھا لیکن جب

جب بدرالدین آیا تو اس نے ہمارے ساتھ بہت بیرحمانہ سلوک کیا۔ میر جلال خاں ہمارا سردار تھا اور ہم جلا وطن ہو گئے تھے ہم کچھ کی داہنی جانب جارین کی حد گاہ پر آتے ہاٹ قبیلے مکران آئے اور خوسا کچھ کی سرزمین میں بس گئے پھر ہاٹ اور کندانی دیا نوح اور دودائی) کا میل لاشار کے علاقہ میں ہوا۔ دریشیخ، ہاٹ اور مزاری رندوں کے ہم رتبہ ہیں۔ رند ملی اور لشاریوں کی سرحدیں ایک دوسرے کے قریب سے گزرتی ہیں۔ گنج کے بہتے ہوئے پانی پر سب سے بڑا مکان ڈنکی ہم چلتے ہیں۔ یا کلمبو سے کھردں کے ساتھ مل کر آئے۔ تیج جبقانیوں کے ساتھ نلی میں قیام پذیر ہوئے۔ نعمہ ہلرتی اور جوائی قبیلے سیوی اور ڈہاڈر میں آباد ہوئے اور نعمہ ہی سے رندوں کی نسل کی بنیاد پڑی اور میر چاکر ان کا سردار ہوا۔ گورگیژ اپنی دولت کے لئے مشہور ہیں اور تہانی کی سرزمین میں بستے ہیں غولو، گوپانگ اور دشتی رندوں کی حدود سے باہر ہیں اور دیگر تمام بلوچی رندوں میں داخل ہیں۔ سندشوان میں بستے ہیں اور لشاری گنداوہ میں۔ ان کی حدود کو بہتے ہوئے پانی کی نہر ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں۔ شیخ رچاکر کا باپ، ان سب کا سردار ہے

ہمارے راستے کے یہ نقوش قدم ہیں۔ یہ ہیں بلوچیوں کی زندگی کی تاریخی حالات ہم تیس سال لڑتے رہے یہ بلوچی جنگ سے شیخ اور شہداد کے بعد میر چاکر سب کا سردار مقرر ہوا۔ میر کی ایک آواز پر چالیس ہزار آدمی تعمیل کے لئے حاضر تھے۔ یہ سب ایک ہی اجداد کی اولاد تھے اور تیر و کمان اور دیگر جنگ کے ہتھیار سے مسلح تھے۔ وہ سلک کے زنار زغل اور سرخ بوٹ پہنتے تھے۔ کمر میں نقرئی خنجر اور تلوار۔ انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں۔ ان میں بجر، گہرام، ساہیں اور نودبندغ جیسے سونا لٹانے والے لوگ تھے (یہ سب لشاری تھے) قصہ میں منہ توڑ جواب دینے والا جارو، اس کا اٹھانے والا بھائی، ہدی، فیروز شاہ، بجار، ریحان اور رندوں کا سب سے بڑا تیغ زن میر جان تھا۔ ان کے علاوہ دودا بھی معزز لوگ تھے — سوبھا، ہیجان، اور علی، جام شیخ اور الان، جیئند اور بیورغ، میر حسن اور براہیم شاعر یہ اشعار کہتا ہے اور میر جلال خاں انہیں سمجھتا ہے۔

(۲)

ذیل کا گیت ایک رند شاعر کا ہے جو گوہر کے اونٹوں کے قتل پر اپنی نظم کی بنیاد رکھتا ہے۔ شاہ حسین جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اصل ہرات کا سلطان حسین ہے۔ ذوالنون بیگ ارغون جس کا دست نگر تھا۔ اس بادشاہ کا دور حکومت ۱۴۶۸ء سے ۱۵۰۶ء عیسوی تک رہا۔

بہادروں کا انتقام مجھے پیارا ہے۔ ان لوگوں کا جو میر بلند قلعہ پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ قبیلے کے ممتاز لوگوں سے پوچھو رند مکران اور سیجگو کی زرخیز زمینوں سے کس طرح ہٹے۔

میر باقر اور رامین اور گوہرام جیسے ناموں والے ایک روز گوہر کے خیمے میں آئے اور گوہرام نے اس سے کہا میرے ساتھ سگائی کر لے۔ لیکن گوہر نے اپنی زبان سے کہا، میں نے بچے کی طرح میں نے تیری خدمت کی اور بھائی کی طرح تیری عزت کی۔ میرے ساتھ تیری سگائی نہیں ہو سکتی۔ گوہر گلہ بانوں کے خیمے سے چلی گئی۔ اسے گلہ بانوں کے بوڑھے مکھیا پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ اپنے سارے اونٹوں کو ہنکا لے گئی اور سیوی میں اپنا خیمہ نصب کر دیا۔ پھر بہتے ہوئے پانی سے فائدہ اٹھا کر ٹلان کے نشیب کی طرف روانہ ہو گئی۔ جہاں میر چاکر رہتا تھا اور چاکر سے کہا سردار! گوہرام نے مجھے نکال دیا ہے۔ میں تیرے پاس پناہ لینے آئی ہوں۔ مجھے اپنے اونٹوں کے رکھنے کے لئے جگہ دے۔ تب چاکر نے کہا کسی مقام کو تلاش کر لے جہاں تیرا جی چاہے۔ کچھرک کی نہروں کے ساحل پر اپنے ڈیرے ڈال دے تیرے اونٹوں اور بھیڑوں کے چرنے کے لئے یہ اچھی جگہ ہے یہاں ہر طرح امن ہی امن ہے۔

ایک دن چاکر اتفاق سے کچھرک کی نہروں کے قریب آ نکلا عین اس وقت اونٹنیاں گرد و غبار میں لپٹی ہوئی ایسی حالت میں آئیں کہ دودھ اُن کے تھنوں سے ٹپک رہا تھا۔ سردار غصے میں بھر گیا۔ تیری اونٹنیاں گرد و غبار کے بادلوں میں کیوں گھری ہوئی ہیں اور ان کے تھنوں سے دودھ کیوں ٹپک رہا ہے تب خوبصورت عورت نے میر چاکر سے بات بناتے ہوئے کہا سردار! میرے اونٹ طبعی موت سے مر رہے ہیں۔ انہیں ایک وبا نے گھیر لیا ہے۔

تب ایک چرواہے نے چاکر سے اس طرح کہا لشاری اپنی گھوڑیاں دوڑاتے ہوئے آئے۔ وہ شرارت سے آئے تھے انہوں نے دو نوجوان اونٹنیوں کو زخمی کر دیا اور اس لئے یہ اونٹنیاں گرد و غبار اڑا رہی ہیں اور ان کے تھنوں سے دودھ ٹپک رہا ہے۔ چاکر کا غصہ تیز ہو گیا اور بولا گوہر کو یہاں سے چلا جانا چاہیئے۔ اور اس نے اس کو سمانی بھیج دیا۔ میرے گھر کا پانی اب تیرے لئے حرام ہوا گوشت ہے — جیسے بھیڑ کا گوشت چاقو کے سامنے (یعنی ناجائز طور پر مارا ہوا ہے)۔ اس نے اپنی فوج کو بلایا اور صبح سویرے گنج کے میدانوں سے وہ غول در غول نکلے اور گوہرام کے اونٹوں کے ایک گلہ کو قتل کر ڈالا۔ ببرگ نے گوہر کی جوان اونٹنیوں کے گلے میں چرواہے کا ایک بازو کاٹ دیا — اس طرح ایک عورت نے خانہ جنگی کی بنیاد ڈالی۔

تب جام نندو نے کہا ہمیں پہاڑوں اور اس کی چوٹیوں میں ایک مہم سر کرنی چاہیئے لیکن بہادر بیورغ بولا۔ رانی کے محل کے ہوائی قلعے اور کھلے ہوئے ملک کی نہروں کو چھوڑ دو۔ پر جوش میر جان نے جواب دیا ہم رانی کے محل کے ہوائی قلعے اور کھلے ہوئے ملک کی نہروں کو نہیں چھوڑیں گے ہم کو دوسروں کے لئے انہیں محفوظ کر لینا چاہیئے۔ ہمارے پوتوں کے لئے جو ہمارے بعد آئیں گے اور ہمارے دشمنوں کے طعنے سننے کے لئے بے گھر رہیں گے۔

تب لشاری آئے وہ مویشیوں کی طرح ٹھٹ کے ٹھٹ آئے۔ اور خالگو سے گایوں اور صعتر کے پودوں والے شام سے بھیڑوں کو ہانکتے ہوئے آئے۔ ان جنگجوؤں نے بے حساب مویشیوں کو آپس میں بانٹ لیا۔ تب لشاری آگے بڑھے اور تب عمر لوہانی نے ایک حیرت انگیز کام کیا۔ اس نے گایوں اور بیلوں کے ساتھ سو سر کاٹے اور آٹھ سو سر بھیڑوں کے اور اس نے ایک سو تھیلے گیہوں کے آٹا کر لشاریوں کے لئے آٹا تیار کروایا۔ امیر چاکر غصے میں آپے سے باہر ہو گیا اور اپنے جاسوسوں کو بھیجا۔ جاسوس سرحد سے تمام کیفیت لیکر لوٹے اور کہا ہم نے لشاریوں کے صد ہا گھروں کو بربادی کی حالت میں دیکھا۔ تب رند خوشی سے پھول گئے اور بھیڑوں کے گلوں کی طرح ایک کثیر فوج جمع کی۔

عقلمند اور بہادر بیورغ نے سردار کی لگام پکڑ لی اور کہا چاکر اپنی تلوار کو میان میں کر لو۔ لوحانی ہزاروں کی تعداد میں اور لال ناموں والے لشاری ملا کے جنگجو ہیں۔ ان کو یہاں ہمارے علاقے میں آکر حملہ کرنے دو۔ آگے بڑھنا ہماری موت ہے۔

تب جیند شیخی بازو نے کہا اے اپنی ماں کا دودھ پینے والے بچے بیورغ لشاریوں کے تیروں سے کانپتا ہے وہ ہندوستانی چمکتی ہوئی تلواروں سے تھراتا ہے وہ مصری فولاد سے ڈرتا ہے۔ ڈرو نہیں جب ہم لڑنے کے لئے اپنی تلواریں کھینچیں گے تو ہم کو اتنی بلندی تک پہنچا دیں گے جہاں تک تیر پہنچ سکتے ہیں۔

یہ الفاظ سن کر بیورغ نے سوار کی لگام چھوڑ دی۔ صبح سویرے اُس کے تمام ساتھی بادلوں کے غبار اڑاتے ہوئے غنیم پر ٹوٹ پڑے۔ اس لڑائی میں بیورغ سات ہزار سپاہیوں کے ساتھ مارا گیا۔ چاکر اپنے بھائی کے غم میں ایک دوپہر بھی اپنے گھر میں نہ رہ سکا اور ہرات کے گنجان آباد شہر کی طرف چل نکلا اور وہاں سلطان شاہ حسین سے جا ملا۔

تب میر باتر، راہین اور ان کے سردار گوہرام نے ایک خوبصورت قالین ترکوں کے پاس بطور رشوت بھیجی۔ فوراً ترکوں کا ایک قاصد چاکر کے پاس پہنچا اور بولا "چاکر! ترک بادشاہ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے اور آپ سے ایک سوال کیا ہے۔ میرے پاس ایک شریر جنگلی گھوڑا ہے جس کی نسل سات پشتوں سے بڑھائی جا رہی ہے۔ یہاں اپنے دوستوں اور دشمنوں کے سامنے اُس پر سواری کیجئے۔ سردار نے کہا اس کو لاؤ میں خوشی سے اس اُس پر سواری کر دوں گا۔ سات آدمی اُس شریر گھوڑے کو پکڑے ہوئے تھے اور سات اُس کی پشت پر زین کس رہے تھے۔ تب چاکر نے گھوڑے کے کان میں کہا تو دُلدل کی نسل سے ہے اور میں چاکر شیخ کا بیٹا ہوں تو طاقت رکھتا ہے اور میں ہنرمندی، وہاں ایک اندھا کنواں تھا جو عین اس کے سامنے واقع تھا۔ سردار نے دشمنوں اور دوستوں کی آنکھوں کے سامنے اس کنوئیں پر سے شریر گھوڑے کو پھرتی سے گزا لیا۔ جنگلی گھوڑا اُس کی رانوں کے درمیان اتنا حلیم بن گیا تھا کہ ایک بچہ بھی باگ پکڑ کر اُس کے آگے آگے چل سکتا تھا۔ چاکر اس امتحان میں کامیاب رہا۔

پھر فوراً ایک قاصد دوڑتا ہوا آیا "چاکر! ترکوں کے بادشاہ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے اور آپ سے ایک سوال کیا ہے، چاکر اُس کے مقابل اُٹھ کھڑا ہو گیا اور اس نے چاکر سے کہا "میرے پاس ایک خوفناک شیر ہے اپنی چمکتی ہوئی تلوار منگوا کر قسمت آزمائیے۔ انہوں نے اپنے سردار کو ہتھیار دئیے اور شیر چھوڑ دیا گیا۔ اس طرف چاکر تھا۔ اس طرف شیر۔ اُس نے اپنی میان سے تلوار کھینچی اور حملہ آور شیر پر اس تیزی سے وار کیا کہ اُس کے دو ٹکڑے ہو گئے اور سُرخ جوتوں والے میر کے ہاتھ فتح رہی۔

ایک چرواہے نے یہ خبر سلطان ترک کی معزز ماں ماتھو کے پاس پہنچائی اور اُس نے اپنے بیٹے سے کہا "چاکر رندوں کا سب سے بڑا سردار ہے اور وہ تمہارے پاس مدد کے لئے آیا ہے۔ اُسے اپنی جری فوج دو یا "زولو" کا بے پناہ لشکر اُس کے ساتھ کر دو۔ میر چاکر کی خاطر میں اپنا تیس سالہ پردہ بھی پیچھے چھوڑ دینے کے لئے تیار ہوں۔

دوسرے دن ایک اونٹ پر سوار ہو کر اُس نے ایک بڑی فوج میر چاکر کی مدد کے لئے بھیجی۔ "زولو" کا بے پناہ لشکر پیر لکھن کی سرکردگی میں روانہ ہوا۔ تب وہ بولان کے نشیب کو طے کرتے ہوئے صبح اندھیرے سنہ گاج کی آبادی پر ٹوٹ پڑے اور اُسے تباہ کر دیا۔ گوہرام کو دونوں جگہ پناہ نہ ملے گی۔ نہ تو تر ہی میں اور نہ گندوا میں۔

۳

یہ گیت بہ لحاظ متن گذشتہ گیت ہی کا پَرتو ہے لیکن کچھ اختلاف کے ساتھ۔ اس میں گوہر کی اونٹنیوں کے قتل کا واقعہ یوں شروع ہوتا ہے کہ گوہر حقیقی واقعات سے پردہ پوشی کرنے کے بجائے خود چاکر سے سارا حال بیان کرتی ہے۔ بیورغ کے چاکر کو روکنے کے ذکر کا بھی اجمالاً ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جنگ کی پوری تفصیل اور بالخصوص نودبندغ کی عالی ظرفی کا بیان کہ وہ کس طرح چاکر کی جان بچاتا ہے۔

پرانے دن بھی کیا اچھے تھے جب خوش قسمت لوگ بستے تھے۔ جب ہر شخص حکومت کا ایک رکن تھا۔ اس وقت ایک خوبصورت عورت رہتی تھی جو اونٹوں کے ایک کثیر گلے کی مالک تھی اُسے لوگ گوہر مہیری (گوالن) پکارتے تھے وہ ایک مالدار عورت تھی۔ اس کے خیمے کی چوبیں سونے کی تھیں اور اُس کا بستر سلک سے آراستہ رہتا تھا۔ گوہرام نے خود اُس سے شادی کی درخواست کی۔ وہ صبح شام اُس کو پیغامات بھیجا کرتا۔ چاکر کا ایک رازدار اُس کا پیامبر تھا۔ چاکر کو اس کا علم ہوا۔ وہ گوہر کے پاس آیا اور اس وقت دوپہر ڈھل چکی تھی سردار نے گوہر مہیری سے پوچھا "تمہارے اونٹ کیوں کراہ رہے ہیں اور ان کا دودھ ان کے کھروں تک کیوں ٹپک رہا ہے تب اُس مہیری گوہر نے میر چاکر سے کہا "پرسوں لشاریوں کے بیٹے راہین خاں کے سوار آئے ——— اور نوجوان اونٹوں کو مار ڈالا۔ انہوں نے رنگین برتن توڑ ڈالے اور شتربانوں کو روتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے۔

تب گوہر اس مقام کو چھوڑ کر میر چاکر کی پناہ میں آ گئی۔ میر چاکر غصے میں بھر گیا۔ اُس نے تمام رندوں کو بلوایا اور تین رات مشورہ کرتے رہے تب بیورغ اپنی تلوار میان میں رکھتے ہوئے بولا میں رندوں کو ایک مہیری کے اونٹوں کی خاطر قتل کروانا نہیں چاہتا لیکن وہاں چند شورش پسند تھے جو شیخی مارنے میں اپنا وقت گزارتے تھے۔ یہ تھے جاڑو، ریحان اور سہراب۔ بس رہنے دو بیورغ! انہوں نے کہا "جنگ کو نہ روکو"، تب لشاریوں کو فوراً پیغام بھیجا گیا "تیار رہو جاؤ ہم ——— رند اپنے دوستوں کے ساتھ تم پر حملہ کرنے کے لئے آ رہے

ہیں، گوہرام اپنی تلوار سنبھالتے ہوئے کھڑا ہو گیا "رندوں میں اتنی ہمت اور طاقت کہاں کہ وہ اپنی تلواروں، مرصع توڑے دار بندوقوں، برچھیوں اور شیرازی شمشیروں کے ساتھ ہم تک پہنچ سکیں — تلی کی گھاٹی کا دہانہ بند کر دو۔"

جب سورج افق پر کچھ فاصلہ طے کر چکا رند اپنے گھوڑوں پر آئے اور حملہ کیا اور تیر و کمان، برچھوں، شیرازی شمشیروں اور گینڈے کی ڈھالوں کے ساتھ مصروف جنگ ہو گئے۔ شاہی فوج کے ساتھ شریک ہو کر رندوں نے گھیرا ڈال دیا۔ طلائی شمشیر والے میر جاں کے ساتھ کم و بیش سات سو لشاری مارے گئے۔ چاکر میدانِ جنگ میں زخمی ہو گیا اور زنگی تلوار اور ڈھال لئے بے سہارا کھڑا تھا۔ تب نودبندغ نے اپنے گھوڑے "پھول" کو پلٹایا اور چاکر کو اس پر بٹھا لیا۔ اُس نے "پھول" کو ایک چابک لگائی اور پھول خدا کی مدد سے کھارے دلدل، کھڑی چٹان اور گھاٹیوں پر سے ہوتا ہوا گزر گیا۔

تب گوہرام نے کہا "نودبندغ! تو رند ہے لشاری نہیں۔ چاکر کی ایسے وقت پر کون مدد کرتا؟ ہم نے اُسے مولی گاجر کی طرح کاٹ کر پھینک دیا ہوتا۔"

تب نودبندغ نے جواب دیا "میں رند نہیں لشاری ہوں لیکن میں ایک رند ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا اور میں نے موزی کا دودھ پیا ہے۔ جب موزی مجھے کھلاتی تھی وہ مجھے راتوں کو لوریاں دیتی اور میرا اسنگوان کا جھولا جھلاتی ہوئی کہتی 'ایک دن چاکر کو تیری ضرورت پڑے گی جب وہ میدانِ جنگ میں چاروں طرف سے گھر جائے گا۔' آج مجھے اُسی دن کی یاد آ رہی ہے۔"

نودبندغ کی بخشش[۴]

نودبندغ لشاریوں کا نامور سردار تھا اور اپنی فیاضی کے لئے بہت مشہور ہے۔ قبل ازیں میر چاکر کی جان بچا کر میدان جنگ سے لے بھاگنے میں اس کی بہادری کا ذکر آ چکا ہے۔ چاکر نے بہت سے موقعوں پر مختلف طریقوں سے اسے آزمایا ہے۔ نودبندغ نے ایک قسم کھائی تھی کہ وہ کسی کی التجا کو رد نہیں کرے گا اور روپیوں کو ہاتھ نہ لگائے گا۔ چاکر نے روپیوں سے بھر کر اُسے خورجی کا ایک جوڑا دیا اور اُس کے پیندے میں سوراخ کر دیا تاکہ روپے گر جائیں۔ — انہیں عورتوں کی ایک جماعت نے اٹھایا جو تمرس کے پھل چن رہی تھی۔ اور انہوں نے اُسے "زار زوال" یعنی "سونا بکھیرنے والا" لقب دیا۔

بعد ازاں چاکر نے ایک ڈوم کو نودبندغ کے پاس بھیجا کہ وہ اس سے یہ سوال کرے کہ وہ جو کچھ رکھتا ہے سب اس کو دے دے۔ ڈوم نے ایسا ہی کیا اور نودبندغ نے جواب میں کہا "مجھے اپنی پشتی (لبادہ جو کپڑوں کے اوپر پہنا جاتا ہے) دو اور میں تمہیں اپنے بدن کے تمام کپڑے اور سب کچھ دے دوں گا۔" ڈوم نے تعمیل کی۔ نودبندغ نے "پشتی" کے دو ٹکڑے کئے ایک میں خود کو لپیٹا اور دوسرا اپنی بیوی کو دیا اور تب ڈوم کو تمام کپڑے اور اپنے گھر کا جملہ سامان دے دیا۔ رات میں نودبندغ اور اُس کی بیوی خالی مکان میں سونے کے لئے لیٹ رہے۔ آدھی رات کو ایک لدا ہوا اونٹ آیا اور گھر کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ نودبندغ نے اپنی بیوی سے کہا "جاؤ اور اونٹ کا منہ سونگھو اگر کھٹی بو آئے تو اُس کو ہنکا دو لیکن اگر بو میٹھی ہو تو مجھے آواز دو تاکہ میں آ کر اس پر سے سامان اتاروں — اس لئے کہ خدا نے اُسے ہمارے لئے بھیجا ہے۔"

نیک بیوی نے اونٹ کا منہ سونگھا۔ اُس میں سے مشک کی خوشبو آ رہی تھی۔ تب نودبندغ نے اُس پر سے سامان اتارا۔ اور گٹھڑیوں کو کھولا — ان میں مردوں اور عورتوں کے پہننے کا ہر قسم کا لباس تھا سب سیا اور تیار کیا ہوا۔ اس طرح وہ اور اُس کی بیوی دونوں نے کپڑے پہنے۔ دوسرے دن جب وہ میر چاکر کے دربار میں آیا تو میر چاکر نے کہا "تو حقیقت میں سونا بکھیرنے والا ہے۔"

یہ گیت نودبندغ کا جواب ہے جو اُس نے اپنے اُن لوگوں کو دیا تھا جو اُسے اپنی تمام چیزیں دے دینے پر طعنہ دیا کرتے تھے۔

سونا بکھیرنے والا نودبندغ گاتا ہے۔ وہ اپنی تعریف میں گاتا ہے۔

اے دوستو! اور مجھ کو طعنہ دینے والے بھائیو! لالچیوں نے ایک تقریر کی ہے اور مجھے طعنے دیتے ہیں لیکن میرے خیال میں انہوں نے ایک بے گناہ شخص کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔

رحم دل لوگ میرے پاس آتے ہیں اور حریص مجھ سے لڑتے ہیں۔ کل جب میں اپنے بکروں کی کھال چھیل رہا تھا تو کتنے لالچی میرے گرد جمع تھے؟ اُس وقت میرے پاس دولت تھی — سات سو آٹھ سو بھیڑ، لاتعداد اونٹ۔

نہ تو میں نے جوا کھیلا ہے اور نہ لٹیروں نے میری دولت چھین لی ہے۔ میں نے خدا کے نام پر نیک بندوں کو دے دیا ہے جو قرآن پڑھنے والے ہیں اور جو غریب ہیں۔ صبح میں وہ خوب پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہیں — اپنے

عقیدوں سے جنگ کرنے والے ـــــ وہ خوش خوش میرا نام لیتے ہوئے آتے ہیں میں نے مالِ غنیمت میں سے کوئی قیمتی شے اپنے لئے قبول نہیں کی۔ یہ سب کچھ غازی لے گئے۔ ایک مرصع شال جو میں سوغات کی تھی اور جسے میں نے صرف ایک رات استعمال کیا تھا ایک ڈوم مانگ لے گیا میں اس کے لئے خدا کا شکر کرتا ہوں لیکن کوئی ایسا مانگنے والا میرے پاس نہ آئے جو ایک بیوی کا سوال کرے اور کہے ایک تکیہ لاؤ اور ایک خوبصورت عورت، اس لئے کہ ایسا تحفہ دیا نہیں جا سکتا۔

میں نے عمر کی قسم کھائی ہے اور عمر کا نام میرے لئے قسم ہے میں دینے سے تھکوں گا نہیں ـــــ خدا مجھے جو کچھ دے گا خواہ وہ ہزاروں ہی خزانے کیوں نہ ہوں میں بائیں ہاتھ سے انہیں پکڑوں گا اور دائیں سے بانٹ دوں گا یہاں تک کہ کچھ بھی باقی نہ رہے تاکہ نوجوان بھائی، بھتیجے اور رشتہ دار لوذبندرغ کی جمع کی ہوئی دولت کی تقسیم کے لئے آپس میں نہ لڑ مریں۔

۵

دودا کی موت

دودا کورگز کا نام بلوچیوں کی تاریخ میں اس لئے مشہور ہے کہ اس نے ایک عورت سامی کی مدد کی تھی اور اسے اور اس کے جانوروں کو بلدھی جرگہ سے نجات دلائی تھی۔ وہ اور اس کے بہت سے بھائی سامی کو بلدھیوں کے پنجے سے نکالنے میں قتل کر دیئے گئے۔ اس کا نام بلوچی بہادروں میں مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور میر چاکر سے مقابلہ کیا جاتا ہے جس نے گوہر کے اونٹوں کے لئے جنگ کی تھی۔

نیک عورت سامی اپنی گایوں کے ساتھ دودا کے پاس پناہ لینے آئی۔ رائین ایک نوجوان جو قریب ہی رہتا تھا۔ اس نے سامی کی گایوں کو دیکھا ـــــ میرال کے سپوتوں یعنی بلدھیوں نے حملہ کیا اور ناجائز طور پر انہیں بھگا لے گئے۔ یہ سب کچھ گھر دم ہوا۔ دودا ابھی پڑا سو رہا تھا کہ اس کی ہوشیار ماں آئی اور اسے جگا کر کہا میں نے اپنے پیٹ میں تجھے نو مہینے رکھا اور تین مہینے تک اپنی چھاتیوں سے تجھے دودھ پلاتی رہی۔ اب تیری باری ہے۔ جا اور جانوروں کا تعاقب کر یا تو انہیں جمع کر کے واپس لے آ یا خود واپس نہ آ، اور اس کی بیوی کی ماں نے مغرورانہ لہجے میں کہا۔ مرد جو پناہ دینے کا وعدہ کرتے ہیں وہ صبح کے وقت سویا نہیں کرتے،

عالی ہمت دودا اٹھا اور اپنی گھوڑی سمرنانگ سے بولا: "اس عورت نے تجھے پینے کے لئے ٹھنڈا پانی اور بھیڑ کے دم کی مزیدار چربی دی۔ تیری بھوک مٹانے کے لئے سرخ طشت میں اناج اور خوبصورت ڈول میں پانی لائی۔ اب دودا کی مدد کا وقت آیا ہے وہ دن جس کے لئے میں نے تجھے پالا تھا میں جانوروں کے لئے دشمنوں کے تعاقب میں جا رہا ہوں کہیں نہ کہیں انہیں پا لینا ہے اور جانوروں کو واپس لانا ہے"

پہاڑ کی دو چوٹیوں کے نیچے جہاں پانی غرماف کی گھاٹیوں میں سے ہو کر بہتا ہے۔ دودا نے انہیں جا لیا اور ان پر ٹوٹ پڑا۔ موت کا فرشتہ اسے وہاں لے گیا۔ اس کے ساتھ جام اور عمر بھی تھے ـــ ایک نوجوان نے ایک طرف سے اس پر حملہ کیا اور دودا اپنی تلوار کے ساتھ گھوڑے سے میدان میں جا گرا اور جام و عمر کے ساتھ مر گیا۔ سرخ جوتے اس کے پاؤں میں تھے اور سرخ انگوٹھیاں اس کی انگلی میں۔

(۲) رومانی گیت

بیورغ اور شاہِ قندھار کی دختر

ماثر نے اس نظم کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔ بیورغ بہار کا بیٹا اس نظم کا ہیرو ہے۔ وہ خود اپنی داستان بیان کرتا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ کس طرح وہ شاہ قندھار کی بیٹی کو بھگا کر سیوی لایا ـــــ اور کس طرح اور کیوں اپنے سردار میر چاکر کے بجائے گوہرام سے جا ملا۔

جس بادشاہ کا اشارہ اس نظم میں کیا گیا ہے۔ وہ غالباً شاہ بیگ ابن ذوالنون بیگ ارغون ہے جو اس وقت قندھار پر حکومت کرتا تھا جس سے بلوچیوں سے اکثر جھڑپیں ہوا کرتی تھیں۔ میر چاکر کے بجائے گوہرام کے پاس بیورغ کے پناہ لینے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رند لوں کی تائید میں تھے اور اس معاملے میں ان سے کسی مدد کی توقع نہ تھی۔

بیورغ کی نسل کے متعلق یوں تو مختلف روایتیں ہیں۔ لیکن موجودہ تحقیق یہ بتاتی ہے کہ بیورغ کا ایک لڑکا جسخو تھا جو شاہ قندھار کی لڑکی کے پیٹ سے تھا اور یہی جسخوری قبائل کا سردار اور بزرگ مانا جاتا ہے

بیورغ بہار کا بیٹا گاتا ہے معزز رندگاتا ہے۔ اپنی محبت کے متعلق وہ گاتا ہے۔ وہ کس طرح شہزادی کو لایا وہ گاتا ہے:۔

قندھار میں ایک باغ ہے ایک پرانے مقام پہ جو سلاطین قدیم کا مسکن تھا میں سڑک پر لوگوں کے اژدحام میں سے گزرتا ہوا اس مقام پر آیا اور یہاں دریچے میں ایک حسین لڑکی کو دیکھا میں نے اپنے مجبور دل سے ایک آہ کی۔ اُس حسینہ نے فارسی زبان میں مجھے بلایا خوش آمدید آپ ہے۔ اپنی چمکتی ہوئی تلوار اور بھروسہ والی ڈھال کے ساتھ آئیے۔ میں خدا پر بھروسہ کرکے اپنے عربی گھوڑے کے ساتھ گیا میں نے قرآن سے ایک آیت پڑھی اور جس دقت میں جارہا تھا میں اپنی محبوبہ کے طلائی شعاعوں کے باوجود اپنی روح میں ایک تاریک میلے قراری پارہا تھا۔ میں نے محل کے نیچے اپنا گھوڑا باندھ دیا اور دیوار پھاند کر اندر پہنچا۔ اندرونی کمروں سے گزرتا ہوا وہاں پہنچا اور مسرور دل کے ساتھ اپنی عورت کو دیکھا جو ایک سنہرے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ سات دن اور سات رات میں اپنی محبوبہ کے ساتھ رہا۔ تب اُس ملکۂ حسن نے مجھ سے کہا سلطان مجھے چاہتا ہے۔ اگر اس پر کہیں یہ راز افشا ہو گیا تو ہم دونوں جان سے مار ڈالے جائیں گے۔ اس لئے اگر تم میں جوانمردی ہے اور تمہارے بازوؤں میں طاقت ہے تو بہتر ہوتا کہ تم مجھے یہاں سے نکال کر اپنے ملک میں لے چلتے۔

میں اس کی باتوں کو سمجھ گیا۔ اس نے اپنا مکان سنہرا پلنگ اور سب کچھ چھوڑ دیا اور جب ہم محل کے نیچے اُتر گئے —— میں نے گھوڑے کی باگ ڈھیلی کر دی اور گھوڑا ہمیں لے کر اڑا۔ میں نے اس کی باگ درۂ بولان کی طرف موڑی اور قلعہ سیوی کی دیواروں تک پہنچ گیا۔

تب میرے حسین ساتھی نے کہا:۔ بیورغ میرے مالک! تم نے کہا تھا میرے پاس عظیم فوجیں ہیں۔ تمہارے رندوں کی کتنی سبک رفتار گھوڑیاں ہیں۔ تمہارے میر کے پاس کتنے جنگجو نوجوان ہیں؟

تب میں نے اپنی محبوبہ سے کہا:۔ چالیس ہزار جنگجو میر چاکر کے ساتھ ہیں اور تیس ہزار گوہرام کے ایک اشارے پر سر کٹانے کو تیار ہیں۔

تب میری غزاناز بولی "ان میں کون تمہارا دوست ہے اور کون تمہارا دشمن"

اور میں نے جواب دیا "چاکر میرا دوست ہے اور گوہرام میرا دشمن"۔

تب میری محبوبہ غزاناز نے کہا "ہمیں گوہرام کے پاس جانا چاہیے کیونکہ چاکر ہمیں پناہ نہ دے گا۔

اس لئے ہم گوہرام کے پاس آئے اور کہا:۔ گوہرام! سرداروں کے سردار! ہم جب تک آپ کے پاس نہیں پہنچے دم نہیں لیا۔ بادشاہ کا مال غنیمت میرے ساتھ ہے۔ اگر آپ اجازت دیں گے تو آپ کے ساتھ رہوں گا۔ اگر نہیں تو کہیں اور پناہ ڈھونڈوں گا"

تب تلوار کے دھنی گوہرام نے کہا:۔ او بلوچیوں کے سردار! ہم تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ آج سے تم اور تمہاری عورت ہماری پناہ میں ہیں۔

. . . .

بادشاہ کی فوج نے درۂ بولان کو عبور کر لیا اور فوجیں ڈیرے ڈال کر اتر پڑیں۔ سورج اپنی طلائی کرنوں کے ساتھ طلوع ہوا میر چاکر اور گوہرام نے آپس میں مشورہ کیا...... میں نے کہا میں خود سلطان کے پاس جاؤں گا۔ آپ تین رات اور تین دن میرا انتظار کریں۔

میں نے خدا پر بھروسہ کیا اور اپنے برق رفتار گھوڑے پر روانہ ہو گیا۔ اُن کے خیموں کے قریب میں نے اپنا گھوڑا باندھ دیا اور سر ہتھیلی پر رکھے ہوئے بادشاہ کے خیمے میں داخل ہوا۔ دیکھا —— بادشاہ سو رہا ہے۔ میں نے اس ترک کو اپنے ہاتھوں سے بیدار کیا اور کہا: میں بیورغ ہوں جس کا نام آپ نے سنا ہے۔ میں نے ہی شیطان کا کام کیا ہے۔ معاف کرنا بادشاہوں کا شیوہ ہے۔ اگر آپ مجھے معاف نہیں کرتے تو میں آپ کے ہاتھ میں ہوں یہ تلوار ہے اور یہ میری گردن۔

اُس نے اپنے سرداروں کو بلایا اور وہ کچھ دیر تک بحث کرتے رہے تب بادشاہ نے مجھے ایک سبک قدم گھوڑی پیش کی۔ میرا لباس سرخ ریشم میں تبدیل کروا دیا گیا۔ فوجوں نے اپنے خیمے اُکھیڑے اور وہ درہ بولان سے واپس ہو گئیں۔ میں سیوی آیا اور رند جمع ہو گئے تھے۔ جو کچھ ہوا تھا بیان کیا۔ کسی سے مجھ کو شکایت نہیں رہی۔ نہ تو رندوں کو جنگ کرنی پڑی اور نہ لشاریوں کو خون بہانا پڑا۔

میں اپنی غزاناز کے ساتھ رہتا ہوں اور اس کے طلائی گچھوں سے کھیلتا ہوں۔

۲

مرید اور حانی

یہ ایک رومانی گیت ہے جو میر چاکر اور اُس کے دوستوں سے متعلق ہے۔ لیکن اس کا سنہ تصنیف رزمیہ گیتوں کے

بہت بعد کا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ مندو کی بیٹی حانی مبارک کے بیٹے مرید سے منسوب تھی لیکن چاکر نے مرید کو جبکہ وہ حالت نشہ میں تھا۔ اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنی منسوبہ کو اس کے حوالے کر دے، چاکر سے اس کی شادی ہو جانے کے بعد مرید نے اُس سے تعلق بڑھانا شروع کیا اور پھر اُسے چھوڑ کر چلا گیا ذیل کی نظم کی ابتدا انہیں واقعات سے ہوتی ہے۔

مرید اور چاکر دونوں منگیتر تھے، وہ شکار کو گئے اور پیاسے ہو گئے۔ تب چاکر نے کہا "میری منسوبہ کے پاس جا اور اُس کے ساتھ پانی پی اور میں تیری منسوبہ کے پاس جاتا ہوں۔ چاکر مرید کی منسوبہ بیوی کے پاس آیا اور مرید چاکر کی منسوبہ بیوی کے پاس گیا۔ اُس نے اُسے پینے کے لئے پانی دیا اور وہ بہت بیمار ہو گیا۔ اور چاکر جب دوسری عورت (مرید کی منسوبہ) کے پاس گیا۔ اس نے پیالے میں تنکے ڈال کر اُسے پانی پینے کے لئے دیا اس لئے وہ بیمار نہیں ہوا — شام کو جب لوگ گھروں کو پلٹے تو دونوں نے خوب شراب پی۔ مرید اپنے ہوش کھو بیٹھا تب چاکر نے کہا "مجھے اپنی دلہن دے دے، اور مرید نے کہا وہ تیری ہے" تب چاکر نے کہا "تمام رند گواہ ہیں کہ مرید نے اپنی دلہن مجھ دے دی ہے، اور یہ بھی کہا "کل میں اپنی شادی کی رسم ادا کروں گا، جب چاکر نے شادی کر لی تو مرید اُس مقام کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا اور اس کا باپ ہر جگہ اُسے ڈھونڈتا ہوا پھرتا رہا۔ چاکر اس وقت تک فتح پور جا چکا تھا۔ مرید کا باپ اب تک تلاش میں مصروف تھا اور اُس نے کہا:۔

میں نے تیس سال اس طرح ضائع کیے۔ خدا کرے فتح پور کا قلعہ تباہ ہو جائے۔ ویران ہو جائے۔ خدا کرے کہ برسات کے بادل اس سرزمین پر کبھی نہ برسیں۔ یہاں کے جانور دل پیاسے بھٹکیں

رندوں نے میر چاکر کے خیمے کے نیچے لکڑی پر ایک نشان بنایا "اب فقیر کو نشانے پر تیر چلانے دو" جب اس کا تیر کمان سے نکلا لکڑی تڑاق سے دو ٹکڑے ہو گئی۔

رندوں نے قیاس کیا اور پھر پہچانا کہ وہ تیر کمان کا دھنی مرید تھا تب انہوں نے حانی اور مرید کو خوشبوؤں میں بسا کر ایک مکان میں چھوڑ دیا —

مرید نے مست اونٹ کی طرح حانی کو اُس کے گال پر کاٹا اور اس کے دونوں لب نرم ہونٹ۔

تب پاگل مرید نے کہا "حانی مجھے جب تک تیری ضرورت تھی تیرے پتھر جیسے دل نے مجھ پر ترس نہیں کھایا۔ اب جبکہ تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ میں تیرے قابل نہیں رہا ہوں۔ مجھے میرے دوستوں سے جدا نہ کر میری بینائی مجھ سے نہ چھین — پھر جیسے مرید نے منہ موڑا وہ رند عورت رونے لگی اور اپنی سہیلیوں سے بولی میں اپنی چادر اپنی گردن کے گرد لپیٹ کر بیس قدم تک اُس کے پیچھے جاؤں گی۔ شاید میں اس کو واپس لاسکوں اور اگر میں کامیاب نہ ہو سکی تو اُس کے ہاتھ کی کوئی نشانی لاؤں گی، تب حانی پکارتی ہوئی اُس کے پیچھے دوڑی، مرید کا جواب یہ تھا:۔ خدا کرے امیر چاکر غارت ہو جائے اور اُس کے گھر میں آگ لگ جائے۔ چور گھوڑے چرالے جائیں (اگر میری مرضی ہو) خدا کرے میرے ہاتھ کی نشانی گم ہو جائے اور میرا جسم گناہ کے بوجھ سے جھک جائے۔

۳
لی لا اور مجنا

بلوچی زبان میں یہ وہی عربی داستان ہے جو لیلیٰ اور مجنوں کے نام سے مشہور ہے ساری کی ساری نظم مقامی رنگ لئے ہوئے ہے۔ لیلا کو ایک بلوچی عورت میں تبدیل کر دیا گیا۔ جو مرلیض میں مامبو پہاڑی کے دامن میں رہتی ہے۔ اس مقام کے فردوسی مناظر حیرت انگیز طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ خاص خاص جملوں کی تکرار اس گیت کی ایک خصوصیت ہے۔

بومبور کی پہاڑی کا نشیب نہایت پرفضا ہے۔ وہاں بادل جمع ہوتے ہیں اور برستے ہیں۔ چشمے اُبل کر بہنے لگتے ہیں تب لی لا اپنی مٹی کا گھڑا لے کر تازہ پانی بھرنے کے لئے نکلتی ہے۔ وہ نیچے بیٹھ جاتی ہے۔ اپنے بال دھوتی ہے اور انہیں شانوں پر بکھرا دیتی ہے تب وہ اپنی چوکونی چھوٹی جھونپڑی میں جاتی ہے اور دروازے پر سے چلمن کو اٹھا دیتی ہے۔ وہ صندوقچی میں سے ایک نقرئی آئینہ نکالتی ہے اور اپنے ہاتھوں پر تھام کر حوروں جیسی دلکشی کے ساتھ اس میں دیکھتی ہے۔

غریب مجنا گھومتا ہوا آنکلا۔ خوبصورت لی لا بولی "اگر تو میرے پیارے ملک سے چلا جائے تو میں تجھے تین تندرست اونٹ اور نکیلے کان والے برق رفتار گھوڑے تحفہ دوں گی۔

مجنا نے یہ سُن کر جواب دیا "میں تندرست اونٹ نہیں لوں گا اور نہ برق رفتار گھوڑے اور نہ ہی میں تیرے پیارے ملک کو چھوڑوں گا۔

یہ سن کر خوبصورت لی لا غصہ میں بھر گئی اور لی لا کی ماں نے برافروختہ ہو کر کہا

"یہ نوجوان سچ میں اس سے محبت کرتا ہے۔ یہ نوجوان خطرناک ہے۔ مجھے کوئی کڑوا زہر لادے تاکہ میں پیالے میں اُسے ملا دوں"۔

صبح کو خادمہ وہ زہر کا پیالہ عاشق مجنا کے پاس لے گئی۔ وہ زہر پی کر پی گیا اور بولا "اے عورت! جب تو میری خوبصورت لی لا کے پاس جائے تو کہنا کہ جو کچھ لی لا نے مجھے بھیجا تھا وہ گائے کے دودھ کی تازہ چھاچھ تھی۔ میرے لئے ایک پیالہ اور بھجوا دینا"۔

یہ سُن کر خوبصورت لی لا غصے میں بھر گئی اور لی لا کی ماں نے برافروختہ ہو کر ایک جوگی کو دور دراز مقام سے بلایا جس نے جنگل سے ایک کالا ناگ پکڑا اور اُس کا زہر پیالے میں ملا دیا۔

صبح کو خادمہ وہ زہر کا پیالہ مجنا کے پاس لے گئی۔ زہریلے ناگ کا زہر پیالے میں اُبل رہا تھا۔ وہ زہر لے کر پی گیا اور بولا "اے عورت جب تو میری خوبصورت لی لا کے پاس جائے تو کہنا کہ یہ گویا ایک وعدہ ہے کہ میں اور تو ملیں گے۔ اس زہر نے تیری محبت کو میرے دل میں اور قوی کر دیا ہے۔"

یہ سُن کر خوبصورت لی لا غصے میں بھر گئی اور اس کی ماں نے برافروختہ ہو کر شتربانوں سے کہا "آج ہمیں یہاں سے کوچ کر جانا چاہیئے ...... تب مجنوں حیرت سے وہیں کھڑا رہ گیا جہاں کھڑا تھا ــــ اور کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ اس کا سارا جسم سوکھ کر لکڑی کے مانند ہو گیا۔

ایک دن ایک چرواہا اُس طرف آنکلا اور اُس نے لکڑی سمجھ کر اپنی کلہاڑی اُس پر ماری تب اُس لکڑی کے کندے سے ایک آواز آئی "اے چرواہے میں لکڑی نہیں ہوں۔ میں عاشق مجنا ہوں۔ لی لا کی محبت نے مجھے ایسا بنا دیا ہے"۔

یہ سُن کر چرواہا ایسی حالت میں کہ اُس کا جسم کانپ رہا تھا اور دانت بج رہے تھے ــــ جہاں لی لا تھی وہاں گیا اور خوبصورت لی لا سے کہا "ادھر آ! میں نے تیرے مجنا کو دیکھا ہے۔ وہ لکڑی بن گیا ہے اور بیلیں اُس پر چڑھ کر سایہ کئے ہوئے ہیں، چیلیں اُس کے سر پر بیٹھ کر دم لیتی ہیں۔

یہ سُن کر خوبصورت لی لا نے اپنے آنچل کو کمر کے گرد لپیٹ لیا، جوتے اتار ڈالے اور چھاتیوں پر ہاتھ رکھ کر دوڑی ــــ جہاں اس کا مجنا کھڑا تھا اور ان بیلوں کو اکھیڑنا شروع کیا جو اُس کے گرد لپٹی ہوئی تھیں تب مجنا نے یہ الفاظ کہے "بیلوں کو نہ اکھیڑ پیاری! کیونکہ یہ تجھ سے زیادہ مجھ پر مہربان تھیں۔ رات میں یہ مجھے سردی سے بچاتی تھیں اور دن کے وقت ابر بنکر مجھ پر سایہ رکھتی تھیں ــــ اور تو اپنے دوستوں سے مجنا اور باتیں کرتی رہی۔ ریشمی کپڑوں اور نرم تکیوں سے کھیلتی رہی۔

۴

پارت اور شیریں

یہ رومانی محبت و غم کا گیت نہایت سادہ اور دلکش انداز میں لکھا گیا ہے۔ پارت سے غالباً فارس کا فرہاد مراد ہے جس نے شیریں کی خاطر پہاڑ کاٹا تھا۔ ڈیمز نے اپنی "بلوچ کلاسکس" میں اس گیت کا ذکر کیا ہے۔

بادشاہ نے دنیا کے سارے ملکوں میں تلاش کی لیکن شیریں کے قابل کوئی نوجوان نہ ملا تب بادشاہ نے کہا۔ میرے پاس ایک پتھر ہے جو ایک نرامن کا ہے جو کوئی اس پتھر کو توڑے گا اس کے ہاتھ میں میں شیریں کا ہاتھ دوں گا۔

تب اس پاگل آدمی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور شیریں نے کہا کاش کہ وہ پتھر موم کی طرح نرم ہو جائے کاش وہ سرمے کی مانند ریزہ ریزہ ہو جائے۔ اور میرے محبوب کے ہاتھ زخمی نہ ہوں،

وہ ایک سال تک پھوڑتا رہا اور پتھر موم کی طرح نرم ہو گیا اور کالے سرمے کی طرح باریک ہو گیا۔ تب بادشاہ نے کہا جو کوئی پرآت کو قتل کرے گا میں اُسے بغیر شمار کئے روپے اور بغیر تولے ہوئے سونا دوں گا۔

تب ایک ذلیل بوڑھی عورت نے کہا "میں بغیر شمار کئے ہوئے روپے اور بغیر تولے ہوئے سونا لوں گی۔ اور میں اس عاشق کو مار ڈالوں گی۔

وہ تدبیریں سوچتی رہی اور پھر پارت کے پاس آئی اور کہا "افسوس میرے بچے! تجھ پر مجھے رحم آتا ہے تو ایک سال تک محنت کرتا رہا اور ایک دن بھی اپنی شیریں کو نہیں دیکھا اور اب کبھی نہ دیکھ سکے گا۔ کیونکہ شیریں تو مر گئی۔ اس کو موت آگئی"۔

دوسری صبح پرآت پانی میں ڈوب مرا۔ لوگوں نے اُسے نکالا اور محل کی دیوار تلے لائے تب شیریں نے کہا "انا! ان لوگوں سے پوچھو یہ کس کی لاش میرے محل کے نیچے لائے ہیں۔ انہوں نے کہا "یہ نوجوان پرآت ہے" شیریں نے انا کو بلا کر کہا "انا! میرے بال دھو۔ میں لال چادر اوڑھوں گی کیونکہ میں اپنے محبوب کی پیاسی ہوں،

تب ہوشیار انا نے کہا "پرات نجار کی نسل سے تھا جس کی ذات جاٹ تھی، لیکن شیریں بولی "دائی! فضول بکواس نہ کر۔ میں اپنے عاشق میں ذات نہیں ڈھونڈتی"۔

تب شیریں مر گئی، اس کو موت آگئی ــــ وہ اس کے بعد اب دوسری

دنیا میں ملیں گے۔

۵

یہ گیت بیدرغ سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن یہ اس دور کا معلوم نہیں ہوتا جس میں رزمیہ گیت لکھے گئے۔ اس کی زبان اٹھارھویں صدی کے پریم گیتوں کی زبان ہے جو ڈُرک کے بتلائے جاتے ہیں۔

سوری کے دونوں میدانوں پر بادل سر پر منڈلاتے ہوئے برستے ہیں
میں صبح سویرے اٹھتا ہوں اور ایک عورت میری طرف لہراتی ہوئی آتی ہے
گردن میں شوخ ہرنی جیسا لوچ۔ آنکھیں آتشدان کے شعلوں کی طرح دہکتی ہوئی —— وہ لہراتی ہوئی میرے قریب آتی ہے اور کہتی ہے
"اُس چشمے پانی میں کھڑے نہ رہو اس لئے کہ یہاں میرے اونٹ آکر پانی پیتے ہیں"۔

"یہ میری غلطی نہیں ہے مالدار عورت! میرے پاس اتنی بھی دولت نہیں جتنا قیمتی لباس تیرے جسم پر ہے" "تیری بزرگ ماں بہشت میں خوش رہے۔ وہ سب سے بڑی عورت جس نے تجھے پیدا کیا"

. . . .

میں آج اپنی مالدار عورت سے رخصت ہو رہا ہوں۔ آنسو اُس کی آنکھ سے شبنم کی طرح گر رہے ہیں اور اُس کی انگیا میں جذب ہو رہے ہیں۔

(۳) پریم گیت اور غنائی نظمیں

ذیل کی دو نظموں کا مصنّف ڈُرک ہے جو ڈومکی قبیلہ کا مشہور شاعر تھا اور جو اٹھارھویں صدی عیسوی میں نصیر خاں اور قلّات کے محبت خاں کے دربار میں رہ چکا تھا۔ عام طور پر اس کو جام ڈُرک کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور کبھی صرف جام ہی لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شاعر خان کے زنانخانے کی ایک عورت پر فریفتہ تھا۔ اور اُس کی بدولت اسے بڑے بڑے مصائب جھیلنے پڑے۔

۱

صبح سویرے میں خدا کی حمد کے گیت گاتا ہوں جو بنانے والا اور دینے والا ہے۔ دوستو! میرے الفاظ کان دھر کر سنو یہ جام کے گائے ہوئے اشعار ہیں:۔

مغنی! میرے اشعار زبانی یاد کر تانت کے پہلے تاروں پر انہیں گا

اور انہیں میرے حکمران سردار تک پہنچا۔

ایک دن میں امیر دوہا کے دربار میں گیا اور وہاں میں نے ایک حسین عورت دیکھی۔ اس کے لباس کا دراز دامن زمین جھاڑتا تھا۔ اُس نے بال سنوار کر ان میں عجیب دلفریب خم دے رکھے تھے۔ اُس کے لب انار کے پھولوں کی طرح سُرخ تھے۔ اور ان میں مستی جذب کی ہوئی تھی۔ اُس کی ناک تلوار کی طرح لانبی تھی۔

میں نے کہا میں اسے حاصل کر کے رہوں گا میں اس سے گفتگو کروں گا اور میں زندگی بھر اُسی کے ساتھ رہوں گا۔

. . . .

اب جبکہ ہم ایک دوسرے کے مقابل آگئے ہیں میں اپنی محبوبہ کے حُسن کی کثرت دیکھ رہا ہوں۔ میرا غم کافور ہو چکا ہے۔ میرا دل سکون بداماں ہو گیا ہے۔ وہ تازہ پھول کی طرح کھل گیا ہے اور اس کے پتے پتے پر رنگ ہے۔ اُس نے مجھ پر ترس کھایا۔ اور اپنے عارضِ حُسن کی مکمل رعنائیوں کے ساتھ میری طرف بڑھا دیے۔ "زلیا" اور "جمال" دونوں یہ یاں گواہ ہیں۔ کہ میری روح کی تمام کثافتیں دور ہو گئیں۔

۲

یہ بادل جو آسمان پر سے خاموشی کے ساتھ گزرتا ہے میری محبوبہ کی سمت سے آرہا ہے۔ گزشتہ رات میں اُس سے ملا۔ اُس کی زلفوں کی میٹھی نکہتوں نے مجھے اسیر کر لیا۔ اُس کی جدائی انتظار کی راتوں میں مجھے شمع کے موم کی طرح پگھلاتی ہے۔ کاہیر لکڑی کے مانند میں جلتا ہوں میں آدھی راتوں کو بے قرار ہو کر روتا ہوں۔ کاش مجھے اس خلجان سے نجات ہو تاکہ میں سکون کی ایک سانس لے سکوں۔

میں اس سے بات نہیں کر سکتا مجھ میں اتنی جرأت نہیں۔ اُس کے حُسن کی طاقت مجھے کمزور بنا دیتی ہے۔ میں اس دن کے لئے دعا کرتا ہوں کہ خدا مجھ پر مہربان ہو جائے اور اپنا دل میری طرف پھیر دے۔ اور تب میری ملکۂ حُسن اپنے سنہرے تخت سے اتر کر میری جانب آئے —— لہراتی ہوئی چودھویں کے چاند کی طرح۔

تب میں اُس کے موتی برساتے ہوئے منہ سے پوچھوں گا اے بیش قیمت یاقوت! اے لعلِ بدخشاں! مجھے اپنا شوہر بنا۔ میں تیرا عاشق ہوں میں تیرے پاؤں کے نیچے سُرخ ہیرے بچھا دوں گا —— اور یہ میرے خون کے قطرے ہوں گے۔

۳
غسل

یہ گیت بلوچی شاعری میں یکتا ہے۔ اس قبیل کی کوئی اور دوسری نظم نہیں ملتی۔ "کنجس بابط" سے مراد غسل کرتی ہوئی عورتیں اور "کبوتر" سے مراد اُن کے عاشق نارکش ایک مقام ہے جو درہ بولان کی سطح مرتفع پر واقع ہے۔

ایک خوشگوار دن جبکہ بادلوں کے سائے زمین پر کہیں گہرے اور کہیں ہلکے پھیلے ہوئے تھے میں نے بادلوں سے دعا اور التجا کی کہ وہ خوشحال نارکش پر برسیں ـــ اتنا کہ تمام ندی نالے بہ نکلیں۔ تب "لطیں" صبح سویرے اٹھ کر گھاٹ پر جمع ہوں گی اور شرارت کرتی ہوئی پانی میں اتریں گی اور وہاں وہ دن کا ایک حصہ گزار کر واپس ہوں گی۔ "کبوتر" کرمبوں کی شکل میں آئیں گے اور ان کے کاندھوں پر بیٹھیں گے۔ تب وہ انہیں اپنی لانبی لانبی چونچوں سے چھیڑیں گے۔

اے جل پری! باہر نکل تاکہ میں تیری مہکتی لٹوں سے خود کو معطر بنا سکوں

۴
پریاں

یہ پریوں سے ملنے کی ایک خیالی منظر کشی ہے۔ اکیانی کے نشیب پر جو کوہ سلیمان کی ایک چوٹی ہے۔

دو روز قبل میں بیلا کے باغوں سے اپنی تیز رفتار گھوڑی "جہلو" پر نکلا۔ اکیانی کے نشیب پر اپنی محبوبہ سے ملنے کے لئے صبح سویرے اپنا گھر چھوڑا۔ سرد بادل یخ برسا رہے تھے۔ دن اور رات برف مجھ پر گرتی رہی۔ تاریک رات میں سفید یخ سنہرے جھالروں کا ایک نقاب معلوم ہو رہی تھی۔ جنگلی انگور اور لیمو جھونک کھائی ہوئی چٹان پر بکثرت لٹک رہے تھے۔ شکاری چوپائے اور ہوا کے پرند انہیں کھاتے تھے۔ ـــ چیل، بھوکے کبوتر زمین کے اوتار اور آسمان کے فرشتے۔

پہاڑ کی چوٹی پر پریوں نے آگ جلا رکھی تھی۔ وہاں وہ آسمانی پریاں جمع تھیں وہ مل کر تالیاں بجا رہی تھیں۔ میں آگے بڑھا تاکہ اُن میں سے ایک کو پکڑ سکوں ـــ میں جونہی آگے بڑھا وہ گھبرا کر پیچھے ہٹیں اور پھر وہ آکاش کی رہنے والیاں اڑ گئیں۔ میں حیران ہو کر شرمیلے عاشق کی طرح کھڑا ہو گیا۔ جب وہ کچھ اوپر اڑ گئیں تو انہوں نے کہا:۔ اے بے وقوف فقیر! تو بے وقوف اور دیوانہ ہے۔ ہم اس دنیا کی نہیں ہیں۔ ہم خدا رسیدہ اور درویشوں کی پریاں ہیں ـــ اُس دن جس روز تو مرے گا اور تجھے دفنانے کی تیاریں ہوتی رہیں گی۔ ہم تیرے کثیف دل کو پانی سے دھوئیں گی اور تیری روح کی خواہشیں پوری کریں گی۔

سنو میرے دوستو! میرے دوستو اور دشمن بھائیو! میں آسمانی پری کے ساتھ بیاہا جاؤں گا اپنے جسم اور اپنے گناہ میں اپنے پیچھے چھوڑ جاؤں گا۔

۵

لنگھاری پہاڑیوں کا یہ چھوٹا گیت اسلوب بیان اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک ہے۔

سنو میرے دوستو میرے پہاڑ ساتھیو، شاہی زنیقو! ـــ میرے گیت سنو میں ایک مغنی شاعر ہوں میں نے جواہرات جمع کئے ہیں میں نے پھول اُگلے ہیں۔

پرسوں رات میں نے ایک دلفریب خواب دیکھا ـــ اس کی چھاتیاں دُمبے کے دُم کی طرح اُبھری ہوئی تھیں۔ اُس کے گال جیسے تازہ مرغزار اور دانت جیسے انار دانے۔

تیرا تبسم حُسن کا نازک پھول ہے اور تیری آنکھ ابھی نرگس ہے جو دل کو زخمی کر دیتی ہے ـــ چشموں کے دامنوں میں ہم دونوں ملیں گے۔ جسم اور روح کے ساتھ۔

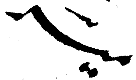
۶
سوہنا اور بخش علی

یہ گیت سوہنا اور بخش علی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ جگہ جگہ سے بے ربط اور قدیم طرز پر لکھا گیا ہے۔ سارا گیت صوفیانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔

سوہنا ابن بخش علی گاتا ہے۔ جادو بیان بخش علی گاتا ہے۔

آج خدا کے فضل سے میری جمال پری جیسی محبوبہ اپنے حسن کا تاج پہنے ہوئے ہے۔ آج کے وقت اس دور میں اتنی کمسن اور حسین دوشیزہ کوئی نہیں۔

دبلے پتلے سرو کی کیا حقیقت ہے کہ اُس کے ساتھ مقابلہ کیا جائے حسین پری! تھوڑی دیر کے لئے میری بانہوں میں خاموش بیٹھ اور گھنے بالوں کو اپنے دوش پر بکھیر دے تاکہ میں ان سے کھیلتا ہوا ... کی تعریف میں کچھ نازک خیالیاں کروں۔



تیری پیشانی پر شاہ سلیمان کی سی ... اور دیووں کو تسخیر کر سکتی ہے۔

وداع

سمت راہوں میں بگولے ہیں ابھی گرمِ سفر
آج میں تیرے شبستاں سے چلا جاؤں گا

دور مغرب کے کسی گوشۂ تنہائی میں
جس جگہ شام و سحر بیٹھ کے سستاتے ہیں
اپنی تقدیرِ غمِ بارِ سفر سے تھک کر
اور پھر تازہ نفس ہو کے پلٹ آتے ہیں

کیا خبر میں بھی کسی روز پلٹ ہی آؤں
پر کبھی تازہ نفس ہو بھی سکوں گا کہ نہیں

یہ بھی ممکن ہے کہ میں لوٹ کے آ ہی نہ سکوں
سانس پھر سانس ہے کچھ عمر کی زنجیر نہیں
اور زنجیر بھی ہوگی تو کہاں تک اختر
ٹوٹ جائے گی کسی روز جہانگیر نہیں

روز خورشید دہکتے ہوئے تلپے کی طرح
ایک دلدل کے سمندر میں ڈھلک جاتا ہے

اور اک خون اُگلتے ہوئے ساحل کے قریب
چھوڑ جاتا ہے مذبذب میں سلگتی ہوئی شام
کیا خبر پاؤں مرا ساتھ بھی دیں گے کہ نہیں
کیا خبر کیا ہے مرے عزمِ سفر کا انجام

روک آنکھوں سے ابلتا ہوا طوفانِ عظیم
ٹوٹ جائے نہ کہیں مرے تخیّل کا حصار

اجنبی دیس کی ویران گذرگاہوں میں
میں اگر پا نہ سکا عشرتِ منزل کا سراغ
لوٹ آؤں گا تصور میں تری سمت کبھی
گُل نہ ہو جائے کہیں تیرے دریچے کا چراغ!

آہ یہ دیدۂ پُریاس میں امید کی سوت
خشک ہوتی بھی نہیں اور اُبلتی بھی نہیں

تو مرا نقشِ قدم چشمِ فسردہ سے نہ دیکھ
دیکھ وہ راہ گذر ہانپ رہی ہے اب تک
میں جسے روند کے آیا ہوں باندازِ جنوں
کیا سفر موت ہے؟ تو کانپ رہی ہے اب تک

سبز پتے غمِ امروز کا ماتم نہ کریں
وقت وہ دور ہے جب دورِ خزاں آئے گا

میں مسافر ہوں مجھے تو بھی مسافر ہی سمجھ
یوں خرد سوز محبت کے جنازے پہ نہ رو
زندگی مضحکہ انگیز کہانی تو نہیں؟
یہ ملاقات کہیں پردۂ اوہام نہ ہو

روز ہم خواب میں اک شیش محل کے اندر
خام افکار کے اصنام بٹھا لیتے ہیں

تو حقیقت میں کہیں میرا تصور تو نہیں
زندگی خواب ہے اک خوابِ حقیقت کم ہے
یا تخیل ہی حقیقت کی حدوں میں گم ہے
یا حقیقت ہی تخیل کے جنوں میں ضم ہے

پیچ در پیچ ہیں اسرارِ رموزِ ہستی
کیا خبر موت کسی اور جہاں کا غم ہو

بہ گیا اوس کی مانند ستاروں کا جمود
دیکھ مشرق کی طرف رات کے آثار نہیں
تیرگی لوٹ گئی اپنا اثاثہ لے کر
زندگی موت ہے گر جذبۂ صدکار نہیں

تو سمجھتا ہے مری ذات کو سامانِ سکوں
میں سمجھتا ہوں تری یاد کو سامانِ حیات

پھر مرا خون مچلتا ہے ارادے بن کر
پھر کوئی منزلِ دشوار بلاتی ہے مجھے
پھر کہیں دشت و جبل ڈھونڈھ رہے ہیں مجھ کو
پھر کہیں دور سے آواز سی آتی ہے مجھے

کتنا دلکش ہے دھندلکا سا افق کے نزدیک
آسماں چوم ہی لینے کو ہے تقدیرِ زمیں

آج میں تیرے شبستاں سے چلا جاؤں گا
یہ دکھانا ہے کہ امید کا مرکز غم ہے
صرف آنسو ہیں ترے پاس تبسم بھی نہیں
کیوں تری چشمِ فسوں کار ابھی تک نم ہے

میرا سرمایۂ امید اگر لٹ ہی گیا
آخری سانس تری گود میں آ کر لوں گا

اختر الایمان

طاری ہو جاتی ہے اور ان کے پاؤں اس صفائی اور روانی سے حرکت کرتے ہیں کہ نہ صرف رقص کرنے والے ایک نشہ سا محسوس کرتے ہیں بلکہ دیکھنے والے کے پاؤں بھی سرور میں آ کر خود بخود ہلنے لگتے ہیں لیکن اگر نہ ناچ ٹھیک طرح سے آتا ہو اور نہ موسیقی کی تان سے ہم آہنگی پر قدرت ہو تو رقص اچھی خاصی پریشانی کا باعث بن جاتا ہے کرشن رقص گھر میں کھڑا ہو کر دیکھ رہا تھا کہ ناچ کرنے والوں میں سے بہت سے تو رقص کے فن سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ ان کے پاؤں چلانے کے انداز سے اور ان کے چہروں کی مضحکہ خیز کیفیت سے ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے شہید ہو رہے ہیں اور اگر ناچ کا سوانگ رچائے بغیر وہ دوسرے لوگوں کی بیویوں سے بغلگیر ہو سکتے تو کبھی بھول کر بھی ناچ گھر کا رُخ نہ کرتے لیکن ہمارے سماج کا زاویہ نظر بہت ٹیڑھا ہے۔ کچھ خاص باتیں کسی مخصوص انداز سے ہی کی جاتی ہیں۔ اور یہ مخصوص انداز وہی ہوتا ہے جو امیروں کو منظور رہے۔ جُوا کھیلنا اور دوسرے کی بیوی سے ربط بڑھانا عموماً بُرا گنا جاتا ہے۔ غریب لوگوں میں چونکہ معاملہ رسی کے علم کا فقدان ہے اس لئے وہ کوڑیوں سے جُوا کھیلتے ہیں اور اگر کسی کی بیوی پر دل آ جائے تو اُسے لے کر شہر ہی سے بھاگ جاتے ہیں۔ دونوں کا نتیجہ جیل کی سیر ہوتا ہے۔ امیر لوگ تاش کے پتوں سے فلیش اور پوکر اور رمی اور برج کھیلتے ہیں۔ ریس کورس میں جا کر اپنی قسمت آزماتے ہیں۔ کسی دوسرے کی عورت کی خواہش ہو تو اُن کو دعوتیں دے کر اپنی آنکھیں سینکتے ہیں اور رقص گھر میں اُن سے ہم بغل ہو کر دل کی گرمی کو ٹھنڈا کرتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف جیل کی کوٹھری سے ہی باہر رہتے ہیں بلکہ سماج کے رہبر اور اونچے طبقے کی ناک سمجھے جاتے ہیں۔ جن غریبوں کو کچھ کچھ عقل آنے لگی ہے وہ بھی اپنے جاہلانہ طریقوں کو خیرباد کہنے لگے ہیں۔ مثلاً وہ بھی اِدھر اُدھر سے پیسے اکٹھے کر کے ریس کورس پر جانے لگے ہیں، کوڑیوں کے جوئے کو چھوڑ چھوڑ کر امریکہ کے سٹے پر داؤں لگانے لگے ہیں کسی دن وہ شاید ناچ گھر بھی جانے لگیں، ناچ...... ناچ اور کرشن کے خیالات کا تانتا ٹوٹ گیا۔ اس نے کسی کو کہتے سنا "ہنا، ؤ بھئی کرشن یہاں کیا کر رہے ہو" والز ختم ہو گیا تھا اور ناچنے والے اپنی اپنی جگہ واپس جا رہے تھے۔ سردار سندر سنگھ بیدی جن کی کرشن سے جان پہچان تھی، اُس سے مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے "اکیلے ہو؟ تو پھر آ جاؤ ہماری پارٹی میں ہی" ساتھ کھڑی ہوئی ناچ کی ساتھی سے تعارف کراتے ہوئے بیدی صاحب بولے "یہ میرے دوست مسٹر کرشن ہیں...

...... اور یہ مسز کھوسلہ" اور مسز کھوسلا، سردار صاحب اور کرشن باہر نکل کے کپاؤنڈ میں آ گئے جہاں دو میزوں کے ارد گرد سردار سندر سنگھ بیدی صاحب کے دوست احباب بیٹھے تھے۔ تپائیوں پر وِسکی، بیر، لیمن، سوڈا واٹر وغیرہ کی بوتلیں اور گلاس پڑے تھے۔ کرشن کا سب سے تعارف کرایا گیا...

...... "یہ مسٹر کھوسلہ ہیں، یہ میری بیوی رجنی ہاں، ہیں مسز بیدی کو تو جانتا ہوں، یہ مسٹر کریم، یہ مسز کھوسلہ، ہاں، ان سے تو ابھی تعارف ہوا ہے) یہ مسز راج ...... بیٹھو"

"مسز راج سے تو پہلے بھی ایک بار ملنے کی مسرت حاصل ہوئی ہے" کرشن نے بیٹھتے ہوئے کہا

مسز راج نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "جی ہاں، مجھے بھی اچھی طرح سے یاد ہے۔ مسٹر شاہ محمد کی پارٹی پر آپ کی زندہ دلی کی وجہ سے خوب رونق رہی"...... میری زندہ دلی! اور آہ یہ مسکراہٹ، کھلتی ہوئی چاندنی میں یہ مسکراہٹ! اسی لئے تو وہ مسز راج سے ملنا چاہتا تھا۔ اُس کی باتوں کی شگفتگی کرشن کے نوجوان دل کو بہت دنوں سے الجھن میں ڈال رہی تھی۔ کرشن نے پہلے پہل اُسے ایک آرٹ سرکل کی میٹنگ میں دیکھا تھا۔ اُس نے ایک گانا گایا تھا اور ایک ناچ ناچا تھا۔ بعد میں اس کو معلوم ہوا کہ وہ اس آرٹ سرکل کی ایک معزز رکن ہے اور اپنے دوستوں میں بیگم کے نام سے مشہور ہے، اور سراجھی آرٹ سوسائٹی اور سنگت سبھا کی جان ہے، اور مسٹر راج اُس کے شوہر ہیں، وہی جو مالا بار ہل پر رہتے ہیں اور جن کا کاروبار اتنا وسیع ہے کہ انہیں اپنے ملازموں کو بیس ہزار روپیہ مہینہ سے زیادہ کی قسم تنخواہوں میں ہی دینی پڑتی ہے۔ کرشن مسٹر راج سے بھی مسٹر شاہ محمد کی پارٹی میں ملا تھا۔ کوئی پینتیس سال کے ہوں گے۔ سر کے بال کچھ کچھ پکنے لگے تھے۔ چرٹ پینے کے بہت شوقین تھے۔ چرٹ پینے کے انداز سے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ آپ باتیں طلب کی باتیں کرنے والوں میں سے نہیں ہیں اور اپنی ساری طاقت اور بات چیت پیسہ کمانے میں خرچ کرتے ہیں، معاً کرشن نے بیگم کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر عمر کا اثر کچھ کچھ عیاں ہونے لگا تھا لیکن نہایت صفائی سے لگائے ہوئے غازے اور پاؤڈر کی مدد سے اٹھائیس برس کو بیس تبدیل کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی تھی۔ "چھوکرا" سردار صاحب نے ایک بیرے کو آواز دی، اور پھر کرشن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "کیا پیو گے"۔ کرشن نے کہا "ابھی کچھ نہیں"۔ سردار صاحب بولے "آؤ، آؤ، کیا لو گے...... برانڈی!"

کرشن نے جواب دیا "نہیں، نہیں، اگر مجھے ضرور ہی کچھ پینا ہے تو...... چھوکرا، نارنگی کا رس...... اچھا......" سردار صاحب بات کاٹتے ہوئے بولے "بیرا، صاحب کے لئے ایک وِسکی سوڈا لاؤ" جب بیرا چلا گیا تو کرشن کہنے لگا "سردار صاحب آپ کی مہمان نوازی تو کسی دوشیزہ کی مسکراہٹ کی طرح ہے جس کا کسی حالت میں بھی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا" یہ سنتے ہی وہ...

اور ہو جاتی ہے اور ان کے پاؤں اس صفائی اور روانی سے حرکت کرتے ہیں کہ رقص کرنے والے ایک نشہ سا محسوس کرتے ہیں بلکہ دیکھنے والے کے پاؤں بھی سرور میں آکر خود بخود ہلنے لگتے ہیں لیکن اگر نہ ناچ ٹھیک طرح سے آتا ہو اور نہ موسیقی کی تان سے ہم آہنگی پر قدرت ہو تو رقص اچھی خاصی پریشانی کا باعث بن جاتا ہے کرشن رقص گھر میں کھڑا ہو کر دیکھ رہا تھا کہ ناچ کرنے والوں میں سے بیشتر رقص کے فن سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ ان کے پاؤں چلنے کے انداز سے اور ان کے چہروں کی مضحکہ خیز کیفیت سے ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے شہید ہو رہے ہیں اور اگر ناچ کا سوانگ رچائے بغیر وہ دوسرے لوگوں کی بیویوں سے بغلگیر ہو سکتے تو کبھی بھول کر بھی ناچ گھر کا رُخ نہ کرتے لیکن ہمارے سماج کا زاویہ نظر بہت ٹیڑھا ہے۔ کچھ خاص باتیں کسی مخصوص انداز سے ہی کی جاتی ہیں۔ اور یہ مخصوص انداز وہی ہوتا ہے جو امیروں کو منظور رہے۔ جوا کھیلنا اور دوسرے کی بیوی سے ربط بڑھانا عموماً بُرا گنا جاتا ہے۔ غریب لوگوں میں چونکہ معاملہ فہمی کے علم کا فقدان ہے اس لئے وہ کوڑیوں سے جوا کھیلتے ہیں اور اگر کسی کی بیوی پر دل آجائے تو اُسے لے کر شہر ہی سے بھاگ جاتے ہیں۔ دونوں کا نتیجہ جیل کی سیر ہوتا ہے۔ امیر لوگ تاش کے پتوں سے فلیش اور پوکر اور رمی اور برج کھیلتے ہیں۔ ریس کورس میں جا کر اپنی قسمت آزماتے ہیں، کسی دوسرے کی عورت کی خواہش ہو تو اُن کو دعوتیں دے کر اپنی آنکھیں سینکتے ہیں اور رقص گھر میں اُن سے ہم بغل ہو کر دل کی گرمی کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف جیل کی کوٹھڑی سے ہی باہر رہتے ہیں بلکہ سماج کے رہبر اور اونچے طبقے کی ناک سمجھے جاتے ہیں۔ جن غریبوں کو کچھ کچھ عقل آنے لگی ہے وہ بھی اپنے جاہلانہ طریقوں کو خیرباد کہنے لگے ہیں۔ مثلاً وہ بھی اِدھر اُدھر سے پیسے اکٹھے کر کے ریس کورس پر جانے لگے ہیں، کوڑیوں کے جوئے کو چھوڑ چھوڑ کر امریکہ کے سٹے پر داؤں لگانے لگے ہیں کسی دن وہ شاید ناچ گھر بھی جانے لگیں، ناچ۔۔۔۔۔ ناچ اور کرشن کے خیالات کا تانتا ٹوٹ گیا۔ اس نے کسی کو کہتے سنا "سناؤ بھئی کرشن یہاں کیا کر رہے ہو" والز ختم ہو گیا تھا اور ناچنے والے اپنی اپنی جگہ واپس جا رہے تھے۔ سردار سندر سنگھ بیدی جن کی کرشن سے جان پہچان تھی، اُس سے مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے "اکیلے ہو؟ تو پھر آ آجاؤ ہماری پارٹی میں ہی" ساتھ کھڑی ہوئی ناچ کی ساتھن سے تعارف کراتے ہوئے بیدی صاحب بولے "یہ میرے دوست مسٹر کرشن ہیں۔۔۔ ۔۔۔۔۔ اور یہ مسز کھوسلہ" اور مسز کھوسلہ اور سردار صاحب اور کرشن باہر نکل کے کمپاؤنڈ میں آگئے جہاں دو میزوں کے ارد گرد سردار سندر سنگھ بیدی صاحب کے دوست احباب بیٹھے تھے۔ تپائیوں پر وسکی، بیئر، لیمن، سوڈا واٹر وغیرہ کی بوتلیں اور گلاس پڑے تھے۔ کرشن کا سب سے تعارف کرایا گیا۔۔۔

۔۔۔۔ "یہ مسٹر کھوسلہ ہیں، یہ میری بیوی رجی ہاں، ہیں مسز بیدی کو تو جانتا ہوں، یہ مسٹر کریم۔ یہ مسز کھوسلہ (ہاں، ان سے تو ابھی تعارف ہوا ہے) یہ مسز راج ۔۔۔۔۔ بیٹھو"

"مسز راج سے تو پہلے بھی ایک بار ملنے کی مسرت حاصل ہوئی ہے" کرشن نے بیٹھتے ہوئے کہا

مسز راج نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "جی ہاں، مجھے بھی اچھی طرح سے یاد ہے۔ مسٹر شاہ محمد کی پارٹی پر آپ کی زندہ دلی کی وجہ سے خوب رونق رہی"۔۔۔۔۔ میری زندہ دلی! اور آدھی مسکراہٹ کھلتی ہوئی چاندنی میں یہ مسکراہٹ! اسی لئے تو وہ مسز راج سے ملنا چاہتا تھا۔ اُس کی باتوں کی شگفتگی کرشن کے نوجوان دل کو بہت دنوں سے ہلچل میں ڈال رہی تھی۔ کرشن نے پہلے پہل اُسے ایک آرٹ سرکل کی میٹنگ میں دیکھا تھا۔ اُس نے ایک گانا گایا تھا اور ایک ناچ ناچا تھا۔ بعد میں اس کو معلوم ہوا کہ وہ اس آرٹ سرکل کی ایک معزز رکن ہے اور اپنے دوستوں میں کسم کے نام سے مشہور ہے، اور ہر اچھی آرٹ سوسائٹی اور سنگیت سبھا کی جان ہے، اور مسٹر راج اُس کے شوہر ہیں، وہی جو مالابار ہل پر رہتے ہیں اور جن کا کاروبار اتنا وسیع ہے کہ انہیں اپنے ملازموں کو بیس ہزار روپیہ مہینہ سے زیادہ کی رقم تنخواہوں میں ہی دینی پڑتی ہے۔ کرشن مسٹر راج سے بھی مسٹر شاہ محمد کی پارٹی میں ملا تھا۔ کوئی پینتیس سال کے ہوں گے۔ سر کے بال کچھ کچھ پکنے لگے تھے۔ چرٹ پینے کے بہت شوقین تھے۔ چرٹ پینے کے انداز سے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ آپ بے مطلب کی باتیں کرنے والوں میں سے نہیں ہیں اور اپنی ساری طاقت اور رات دن پیسہ کمانے میں خرچ کرتے ہیں، معاً کرشن نے کسم کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر عمر کا اثر کچھ کچھ عیاں ہونے لگا تھا لیکن نہایت صفائی سے لگائے ہوئے غازے اور پاؤڈر کی مدد سے اٹھائیس برس کو بیس تبدیل کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی تھی۔ "چھوکرا" سردار صاحب نے ایک بیرے کو آواز دی، اور پھر کرشن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "کیا پیو گے"۔ کرشن نے کہا "ابھی کچھ نہیں"۔ سردار صاحب بولے "آؤ آؤ، کیا لو گے۔۔۔۔۔ برانڈی؟"

کرشن نے جواب دیا "نہیں، نہیں، اگر مجھے ضرور ہی کچھ پینا ہے تو۔۔۔۔۔۔ چھوکرا، نارنگی کا رس۔۔۔" "چھہ۔۔۔۔۔" سردار صاحب بات کاٹتے ہوئے بولے "بیرا، صاحب کے لئے ایک وسکی سوڈا لاؤ"۔ جب بیرا چلا گیا تو کرشن کہنے لگا "سردار صاحب آپ کی مہمان نوازی تو کسی دوشیزہ کی مسکراہٹ کی طرح ہے جس کا کسی حالت میں بھی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا"۔

سردار صاحب بولے "مگر" کرشن نے کہا "ابھی تھوڑی دیر ہوئی ٹینس کے بعد بھی میں نے وسکی پی تھی، اسی سے مجھے دن میں ستارے نظر آنے لگے تھے، اور اب یہ پی لی تو بس سر کے بل ہی چلتا نظر آؤں گا۔ چاروں طرف ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کرشن کو کسم کی آنکھوں میں ایک مسرور اور مسرت بخش مسکراہٹ کی چمک دکھائی دی اور پھر نہ جانے کیسے کرشن کی خوش گوئی اور زندہ دلی کی کھوئی ہوئی طاقتیں ایک طوفان کی طرح اُمڈ آئیں۔ خبر نہیں وہ اس دن کیا کیا کچھ کہہ گیا، لیکن اُس کی بات بات پر پارٹی کے چہرے کھل اُٹھتے تھے، اور کسم کی چنچل مسکراہٹ اُس کے نشے کو اور بھی بڑھا رہی تھی......

ہر چند منٹ کے بعد پارٹی کے کچھ لوگ اندر ہال کمرے میں رقص کرنے چلے جاتے تھے اور باقی دو چار یاں بیٹھے کھاتے پیتے اور باتیں کرتے رہتے تھے۔ کرشن ایک بار بھی اُٹھ کر اندر رقص کے لئے نہ گیا۔ مسٹر گھوسلہ پوچھنے لگے "کیوں صاحب آپ کیوں نہیں رقص کرتے"۔ کرشن بولا "کہ صاحب رقص مجھے اتنا کم آتا ہے کہ میں اپنی ہم رقص کے پاؤں کو کچل کچل کر اُس کی خوشی کو خراب نہیں کرنا چاہتا۔" سردار صاحب بیچ میں ہی بول اُٹھے "تو کیا انگلینڈ کی رقص گاہوں میں لوگوں کا منہ دیکھنے جایا کرتے تھے"۔ کرشن نے بھولا بنتے ہوئے کہا "وہاں کی عورتیں بڑی صبر والی ہیں۔ اور عام طور پر وہ طالب علم ہی ہوا کرتی تھیں۔ اگر غلطی سے میں کسی کا پاؤں کچل بھی دیتا تو معاملہ وہیں رفع دفع ہو جایا کرتا تھا۔" "میں اپنے آپ کو والنٹیر کرتی ہوں" کسم نے ہنستے ہوئے کہا "مجھ میں کافی صبر ہے"۔ کرشن تو بس اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ سردار صاحب قہقہہ لگا کر بولے "اب تو پھنس گئے کرشن صاحب۔ اب بہانے ختم ہو گئے۔ اب تو پیچھے نہیں ہٹ سکتے"۔ کرشن اس وقت تک اپنی حیرانی پر قابو پا چکا تھا۔ اس نے کسم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "آپ کی کمال مہربانی ہے، لیکن واقعی مجھے رقص کی بہت کم مشق ہے"۔ "کوئی بات نہیں" کسم نے اپنی مسکراہٹ سے کرشن کے دل کو ڈانواڈول کرتے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے آپ کسر نفسی کر رہے ہیں۔ جب میں والنٹیر کر رہی ہوں تو آپ کو اعتراض کیسا"۔ کرشن نے اپنی آواز کی خوشی کو دبلاتے ہوئے جواب دیا "مسز راج، آپ کے ساتھ رقص کر کے مجھے یقیناً از حد مسرت ہو گی، لیکن پھر بھی میں آپ کو آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر بار بار میرا پاؤں آپ کے پاؤں پر پڑا تو آپ کو مجھے معاف ہی کر دینا ہو گا...... جب والز شروع ہو گا تو آپ کو تکلیف دوں گا......"

اندر رقص شروع کرتے وقت کرشن نے کسم کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ لیکن چونکہ دونوں کی باہمی واقفیت بہت پرانی نہ ہوئی تھی اس لئے رقص کرتے وقت دونوں کے جسم ایک دوسرے سے پیوست نہیں تھے۔ اُن میں کافی فرق تھا لیکن وہ جیسے جیسے رقص گاہ کے فرش پر گردشیں کرتے گئے، کرشن اور کسم کے دماغوں پر موسیقی چھاتی چلی گئی۔ دونوں ہی اچھا ناچ کرنے والے تھے۔ دونوں کے جسم ایک دوسرے کے نزدیک تر آتے گئے۔ یہاں تک کہ دونوں موسیقی کی رو میں بہہ گئے اور اُن کے جسم ایک دوسرے سے مل گئے۔ اب وہ اس قدر نزدیک آ گئے تھے کہ ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ کسم کا گرم سانس کرشن کے لباس میں سے گذر کر اُس کے جسم میں ایک سنسنی پیدا کر رہا تھا۔ اور کرشن کسم کے کندھے سے پرے مست آنکھوں سے دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ ایک دوسرے سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے تھے کسم نے کہا تھا "تم کیسا خوبصورت رقص کرتے ہو"۔ اور کرشن نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔ "آپ سے بہتر نہیں" لیکن جیسے جیسے وہ رقص کی روح میں داخل ہوتے گئے تھے اُن کی آواز بن تھمتی گئی تھیں اور اب تو وہ صرف موسیقی کے غیر مرئی آہنگ اور ایک دوسرے کے دھڑکتے دلوں کی آواز سے ہی ایک دوسرے کو سمجھ رہے تھے پھر ایک دم کسم نے کرشن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا "کیسے خوش گفتار ہو تم" اور ایک لمحہ کے لئے کسم کا دایاں ہاتھ جو کرشن کے بائیں ہاتھ میں تھما ہوا تھا، اور دب گیا تھا، اور کسم ایک لمحہ کے لئے، فقط ایک لمحہ کے لئے کرشن کے جسم کے اور زیادہ نزدیک آتی ہوئی معلوم ہوئی تھی۔ کرشن کے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی تھی اور اس کے دماغ میں اتنا ہیجان برپا ہو گیا تھا کہ وہ کچھ جواب نہ دے سکا تھا۔ رقص جاری رہا تھا، اور دفعتاً کرشن کا خیال مسٹر راج کی طرف گیا تھا جو ابھی کلکتہ میں بیٹھا اور زیادہ دولت بنانے کے ذرائع سوچ رہا ہو گا، اور اُس کی بیوی یہاں ایک اجنبی کے ساتھ محض ایک اجنبی کے ساتھ رقص کر رہی تھی، اُس کے جسم سے پیوست ہو رہی ہے، اُسے کہہ رہی ہے۔ "کیسے خوش گفتار ہو تم"۔ کیا گھر میں جہاں کسم کو مسٹر راج کی بیوی بن کر رہنا پڑتا ہے، دونوں کے جسم ایک دوسرے میں اتنی سنسنی پیدا کرتے ہوں گے، اور اگر اُن کے جسم ایک دوسرے کے اتنا نزدیک آتے بھی ہوں گے تو کیا ان کے دلوں کی دھڑکن ایسی ہی تیز ہو جاتی ہو گی۔ کیا مسٹر راج کو کبھی یہ سننے کا موقعہ ملا ہو گا۔ "کیسے خوش گفتار ہو تم"۔ کیا وہ کبھی اُس راز کو، اُس دھڑکتے ہوئے دل کے راز کو سمجھ سکا ہو گا جس میں سے یہ فقرہ نکلا ہے اس کی کیا وجہ ہے، کرشن سوچنے لگا، کہ مسٹر راج کے نوجوان ہوتے ہوئے بھی مسز راج کو ایک رازدارانہ انداز میں ایک اجنبی سے کہنا پڑتا ہے "کتنے خوش گفتار ہو تم" اور پھر ایک لمحہ کے لئے اس کا ہاتھ تمہارے جسم کے اور بھی قریب آ جاتا ہے۔ اور تب کرشن کو خیال آیا کہ مسٹر راج کی ایک اور بھی بیوی ہے جسے دنیا عام طور پر دولت کہتی ہے اور اِس بیوی کی خوشنودی حاصل کرنے

میں مسٹر راج اتنے محو ہیں کہ اُس دوسری بیوی کی دیکھ بھال کے لئے جو معمولی گوشت اور پوست کی بنی ہوئی ہے، اُن کے پاس کوئی وقت ہی نہیں رہتا۔ شاید اُن کا خیال ہے کہ رات کو اس کے ساتھ اکٹھا سونے سے اور صبح اُسے کھلی چھٹی دینے سے کہ جہاں چاہے گھوم آؤ، جو چیز چاہے خرید لو، اُن کی بیوی کی دلجوئی ہو جاتی ہوگی۔ مگر شاید یہ غلطی اُن کی نہیں غلطی اُن کی دوسری بیوی کی ہے جو انہیں کسی اور چیز کو سمجھنے کا وقت ہی نہیں دیتی۔ اگر اُن کے پاس کچھ کم پیسہ ہوتا تو مسٹر راج شاید سمجھ جاتے کہ عورت میں "یہ چیز میری ہے"، "یہ تمہاری" کا خیال بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے آدمی اپنی دولت کی نمائش کرکے بہت خوش ہوتا ہے، ویسے ہی عورت نہ صرف اپنی شکل وصورت کو مزین کرکے اور گہنا کپڑا پہن کر خوش ہوتی ہے بلکہ اُسے لوگوں کو اپنا خاوند دکھانے میں بھی ایک روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ایسا خاوند جس پر وہ فخر اور ناز کر سکے۔ کسی محفل میں شوہر کی تعریف ہوتی دیکھ کر بیوی کی آنکھوں میں خود بخود فتح کی چمک آ جاتی ہے۔ لیکن جو خود بھی کروڑپتی کی لڑکی ہو اس کے لئے اپنے خاوند کا دولت مند ہونا کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ اُسے اُس میں کچھ اور وصف مطلوب ہیں۔ سارا دن گھر میں کام کاج کے بغیر بیٹھے رہنے کے بعد اُسے اپنا دل بہلانے کا بھی کوئی سامان چاہیئے اور اگر اُس کا خاوند اب بھی ایک لمبا موٹا چرٹ منہ میں لے کر اپنی پیسے کی دنیا میں کھویا ہوا ہے تو عورت کی خواہش تو ہوگی ہی کسی ایسے آدمی سے ملنے کی جو اپنی قابلیت اور زندہ دلی سے اُس کے لبوں پر تبسم لے آئے، اُس کے دل کی دھڑکن کو تیز کر دے اور اُسے بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور کر دے کہ "کتنے خوش گفتار ہو تم" اور اس طرح اگر روحانی مسرت حاصل ہو جائے تو ایسی صحبت میں رہنے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ اور اگر اس صحبت کا ایک ضروری جزو اُس کے جسم کا استعمال بھی ہو تو آخر اس میں مضائقہ ہی کیا ہے۔ آہ، مسٹر راج، کرشن نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوچا، سماج کے اخلاق کی جڑ میں پانی دینے والے تو تم ہو تمہاری بیوی نہیں ہے۔ وہ تو اس بگڑے ہوئے ماحول کا اثر ہے، وجہ نہیں۔ تم کس بنا پر اُسے برا کہو گے۔ تمہیں تو اُسے یہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر رہے ہو اور . . . . . . اور

بینڈ ختم ہو گیا اور ساتھ ہی اپنے قدموں پر رقص کی آخری تیز گردش کرکے کرشن اور کسم ایک دوسرے کی طرف چمکتی اور مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر تھم گئے

ویریلار کی محفل ختم ہوئی۔ اگلی ملاقات اتوار کو ہوئی اور پھر اگلے ویروار اور پھر اگلے ویروار اور پھر اتوار۔ اور پھر ویروار اور اتوار کو چھوڑ کر ہفتہ کے دوسرے دنوں میں بھی ملاقات ہونے لگی۔ اسی اثنا میں دو چار بار مسٹر راج سے بھی ملنے کا اتفاق ہو گیا۔ جب مسٹر راج بمبئی میں نہ ہوتے تب بھی کسم کلب میں آتی کبھی مسٹر اور مسز کھوسلہ کے ساتھ، کبھی سردار صاحب اور مسز بیدی کے ساتھ۔ اور کبھی اکیلی ہی۔ دن ہفتوں میں تبدیل ہوتے گئے اور کرشن اور کسم کا باہمی ربط بڑھتا گیا، اتنا کہ جب کسم کی سالگرہ قریب آئی تو کرشن کو بھی دعوت دی گئی۔ کرشن نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں تو شاید کرسمس میں پونا جا رہا ہوں، اس لئے شاید آپ کی پارٹی میں شامل ہونے کی خوشی حاصل نہ کر سکوں۔ کسم نے کہا "کوشش ضرور کیجئے۔ میری سالگرہ ۳۱ر دسمبر کو ہے۔ اس دن تاج محل ہوٹل میں نوروز کا ناچ بھی ہوگا۔ وہیں آپ کو ڈنر اور رقص کی دعوت ہے۔ خوب رونق رہے گی آپ کے لئے بھی ٹکٹ لے رہی ہوں۔ یہ سمجھ لیجئے کہ آپ نہ آئے تو ٹکٹ ضائع جائے گا . . . ."

یہ میٹھی دھمکیاں! کسم جی، پونا جانے کا تو بہانہ ہے۔ ایک بار تو دعوت میں شامل نہ ہو سکنے کی مجبوری ظاہر کرنی ہی چاہیئے۔ آپ کے کہتے ہی آپ کی بات مان لوں تو اپنی نظروں میں ہی ذلیل ہو جاؤں۔ اور پھر ۲۹ر دسمبر کو ٹیلیفون۔ "کیا آپ پونا سے واپس آ گئے ہیں"؟ "جی نہیں میں جا ہی نہیں سکا"۔ "تب تو آپ ضرور شامل ہو سکیں گے"۔ "کیوں نہیں۔ تمہارا جنم دن ہے۔ تم خود تو وہاں موجود ہو گی ہی پھر مجھے آنے سے کیونکر انکار ہو سکتا ہے۔ تمہیں دیکھنے کا موقعہ ملے گا تمہارے ساتھ رقص کرنے کا بھی۔ ہاں جب ان مہمان نوازیوں کا بدلہ اتارنے کا موقعہ آئے گا، تب تاج محل ہوٹل اور رٹز ہوٹل میں جانے کی اُمید نہ رکھنا۔ میں تو گھر پر ہی معمولی سا کھانا کھلا سکوں گا۔ خیر وہ موقع تو آنے دو۔ ابھی تو کسم دعوت دے رہی ہے۔ اپنے جنم دن پر . . . . . ."

پارٹی میں مسٹر اور مسز کھوسلہ اور مسٹر اور مسز بیدی کے علاوہ مسٹر اور مسز دلیسائی بھی تھے۔ وہ چار اور جوڑے بھی پارٹی میں موجود تھے مگر اُن سے کرشن کو دلچسپی نہ تھی۔ اگرچہ کرشن کا اُن سے تعارف کروایا گیا لیکن کرشن نے ان کا ٹھیک سے نام سننے کی بھی کوشش نہ کی تھی۔ داخلے کا ٹکٹ پچیس روپیہ فی کس ہونے کے باوجود بھی ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کتنی دولت ہے بمبئی کے لوگوں کے پاس۔ اور تب کرشن نے مسٹر اور مسز دلیسائی کی طرف دیکھا۔ دولت کی افراط سے پھولے ہوئے مطمئن چہروں والے مسٹر دلیسائی اس وقت وسکی سوڈا پی رہے تھے۔ مسز دلیسائی اپنے سامنے لیمن جوس کا گلاس رکھے بیٹھی تھیں۔ اسی طرح سے کرشن کی مسٹر اور مسز ابراہیم اور مسٹر اور مسز دنشا سے جان پہچان تھی۔ یہ دنشا اور دیسائی ہماری سماج کے اونچے طبقہ کی زینت ہیں، کرشن نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سوچا۔ ان کی بڑائی صرف ان کی دولت ہی ہے یا اپنی بیویوں کو آراستہ کرکے کلبوں میں لے جانا۔ ان کی ادب اور آرٹ سے واقفیت

صفر ہے۔ موجودہ زمانے کی سوشل اور پولٹیکل باتوں پر بحث ذہن کو جماہیاں لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ نیا طبقہ کسی ایک فرقے کی پیداوار نہیں ہے۔ مثال کے طور پر دلیسائی ہندو ہیں، ابراہیم مسلمان اور دنشا پارسی۔ ان کا اپنا مذہب صرف دولت ہے یا کلب کی زندگی اور ایسے ہی اب بھی میز پر باتیں ہو رہی تھیں" دیکھو آج ناچ میں کتنی بھیڑ ہے"۔ "پتہ نہیں یورپ میں لڑائی کا کیا بنے گا" "مسز دیسائی ایک سموسہ اور لیجئے نا"۔ "مسٹر کھوسلہ آپ کا گلاس کتنی دیر سے خالی پڑا ہے..... بیرا، صاحب کے لئے ایک بڑا بلیک اینڈ وائٹ لاؤ" اور ایسے ہی رات کے دو تین بجے تک باتیں ہوتی رہیں اور رقص ہوتا رہا۔ مسٹر راج نے صرف ایک دو بار ہی کسم کے ساتھ رقص کیا باقی بار کبھی مسز ابراہیم سے کبھی مسز کھوسلہ سے کبھی کسی اور سے۔ اور مسز راج بھی دوسروں کے ساتھ رقص کرتی رہیں یہی آج کل کی تہذیب ہے۔ مسٹر راج نے ایک بار بھی اپنی بیوی کی طرف جب وہ دوسروں کے ساتھ ناچ کرنے جاتی تھی گھور کر نہیں دیکھا۔ وہ ایسا کرتا تو دو دن میں سوسائٹی میں بدنام ہو جاتا۔ وہ اپنی وسکی پیتے، چرٹ کے کش لگانے اور سردار صاحب کے ساتھ تجارت کے معاملات پر بحث کرنے میں مشغول تھا۔

مسٹر راج کی موجودگی کے باوجود رقص گاہ میں کرشن اور کسم ایک ہو گئے ویسے ہی اتنی بھیڑ تھی کہ جسم کے ساتھ جسم چپٹا جا رہا تھا اور پھر یہ تو دونوں ناچ کرنے والے بھی اچھے تھے۔ دونوں کے دلوں کی دھڑکن ایک دوسرے میں سمائے جا رہی تھی۔ کرشن بہت خوش تھا۔ اس کی زندہ دلی کو چار چاند لگ گئے تھے کسم تمنا بھری آنکھوں سے کرشن کی طرف دیکھ رہی تھی، ویسی آنکھوں سے جن سے ایک سکول کی لڑکی ایک آرٹسٹ کی طرف دیکھا کرتی ہے۔ اس کے لئے کرشن میں کوئی ایسی بات تھی جو اسے عام طور پر اپنی دولت مند سوسائٹی میں نہیں ملتی تھی، اسے جوہر کی کچھ کچھ پرکھ تھی۔ وہ شاید سوچ رہی تھی کہ اگر اس کی شادی کرشن ایسے کسی شخص سے ہو جاتی تو اس کی زندگی کتنی پر رونق رہتی اور کرشن کے دل میں بھی خیال اٹھ رہا تھا، کہ کسم جیسی زندہ دل عورت ایک بیوقوف کے پلے پڑی ہوئی ہے جو اس کی اصلی قیمت کو نہیں سمجھتا۔ اگر وہ اس کے پاس ہوتی تو وہ اسے شاید موٹریں اور بہت قیمتی گہنے کپڑے تو نہ دے سکتا، مگر اپنے معمولی مکان میں رہتے ہوئے بھی اس کی دل بستگی کے لئے کافی سامان مہیا کر سکتا تھا۔ اپنی زندہ دلی، اپنی شگفتگی، اپنی خوش گفتاری.....

ایک دن مسٹر اور مسز راج نے کرشن کو اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دے دی۔ بہت دن سے کرشن بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اس مالابار ہل پر رہنے والے تاجروں کا گھر تو دیکھوں۔ کرشن رات کے ٹھیک آٹھ بجے مسٹر راج کے مکان پر پہنچ گیا۔ مکان کیا، اس کو محل کہنا بہتر ہوگا۔ باہر بھاٹک پر ایک پٹھان کھڑا تھا۔ اندر جب ڈیوڑھی میں اس کی چھوٹی پرانی موٹر رکی تو ایک وردی والے پٹھان نے جھٹ سے موٹر کا دروازہ کھولا اور کرشن کو اترنے میں مدد دی۔ مکان کے اردگرد ایک بڑا سا باغ تھا۔ سامنے کے حصے میں دو حسین عریاں نسوانی بت کھڑے تھے جن کے ہاتھ میں مشعلیں تھیں اور ان مشعلوں میں سے پانی کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ ایک طرف ایک بڑی چھتری کے نیچے چار پانچ کرسیاں پڑی تھیں اور میز پر کچھ بوتلیں اور گلاس۔ وہ دائیں ہاتھ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ جہاں سیڑھیاں ختم ہوتی تھیں وہاں ایک اور وردی والا پٹھان کھڑا تھا جس نے کرشن کو سلام کیا۔ کرشن نے اس کے ہاتھ میں اپنا ملاقاتی کارڈ دے دیا۔ وہ پٹھان کرشن کو اپنے ساتھ لے کر ایک لمبی گیلری میں سے ہوتا ہوا جس کے دونوں طرف بیش قیمت تصویریں آویزاں تھیں ایک اچھے سجے ہوئے کمرے میں لے گیا۔ اس میں سامنے ایک دروازہ تھا جو ان کے پاس پہنچنے پر خود بخود کھل گیا۔ کرشن نے ایسے "جادو کے دروازے" بمبئی کی ایک دو بڑی دکانوں میں دیکھے تھے اور اسے ان کے خود بخود کھلنے اور بند ہونے کا فنی اصول بھی معلوم تھا۔ لیکن اسے یہ خیال نہ تھا کہ ایسی قیمتی چیزیں اب گھروں میں بھی استعمال ہونے لگی ہیں۔ "آپ تشریف رکھئے" کہہ کر پٹھان چلا گیا اور کرشن کو اپنے چاروں طرف دیکھنے کا موقع ملا۔ کمرے میں کوئی پنکھا وغیرہ نہیں تھا اور نہ ہی بجلی کے لیمپ اور بٹن تھے۔ پھر بھی کمرے میں ایک عجیب سرور انگیز خنکی تھی۔ کمرہ ایک دل آویز روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ اور ایک بھینی بھینی مہک سے معمور تھا۔ کرشن سوچ رہا تھا کہ ہوا کو ٹھنڈا رکھنے کی مشین خریدنے میں اور دیواروں میں چھپے ہوئے بجلی کے لیمپ لگوانے میں مسٹر راج کا کتنا روپیہ اٹھا ہوگا۔ جدید ترین نمونے کے سوفوں اور دیگر فرنیچر سے کمرا ایک دل پذیر طریقے سے سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر کچھ عکسی تصویریں اور مصوری کے شاہکار آویزاں تھے۔ یقیناً اس کمرے کے سجانے میں کسم کا ہاتھ ہوگا یورپ میں کرشن کو کئی امیر آدمیوں کے بنگلے دیکھنے کا موقع ملا تھا مگر وہ سب اس مالابار ہل پر سنگ مرمر سے بنے ہوئے محل کے سامنے حقیر معلوم ہو رہے تھے۔ وہ ایک سوفے میں دھنس گیا جو نہایت نرم اور گدگدا تھا۔ اس غیر معمولی انداز سے سجائے ہوئے کمرے میں کرشن کو ایک عجیب قسم کی بے چینی کا احساس ہونے لگا۔ ایسے کمرے میں جو ہوا کو ٹھنڈا رکھنے والی مشین سے ہر وقت ایک سرور انگیز طریقے سے سرد رکھا جاتا ہو، جو چھپی ہوئی روشنی سے جگمگا رہا ہو جس کے فرش پر قیمتی دریاں اور بڑھیا غالیچے اور قالین ہوں، جس میں ایک بھینی بھینی مہک خواہ مخواہ دماغ پر ایک نشہ سا طاری کر رہی ہو، نرم سپرنگ

والے اور گدگدے دیوانوں پر بیٹھ کر آدمی کے دماغ کی سوچنے کی تمام طاقت خود بخود ہی سلب ہو جاتی ہے: اور جسم کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے، کرشن نے سوچا کہ شاید یہی وجہ ہے کہ راجاؤں نوابوں کے لئے عورتوں کی صحبت سے دُور رہنا کتنا مشکل ہے۔ مثلاً اس آرام دہ کوچ پر بیٹھ کر خواہ مخواہ جی چاہتا ہے کہ کوئی دوشیزہ پاس بیٹھی رہے۔ اِس عشرت انگیز ماحول میں کسی قسم کی ذہنی جولانی کا زندہ رہنا ناممکن ہے۔ اور کرشن نے، جسے اپنے دماغ کی قوتوں پر ناز تھا، سوچا کہ خدا کا شکر ہے کہ میں اتنا امیر نہیں ہوں نہیں تو وہی طاقتیں جو اُس کی زندگی کو پُر رونق اور پُر لطف بنائے رکھتی ہیں کبھی کی سلب ہو گئی ہوتیں . . . . . . اور

اتنے میں بائیں ہاتھ کے دروازے سے ایک بے آستین کا اودا جمپر اور اسی رنگ کی ساڑھی پہنے کُسم اندر داخل ہوئی۔ کرشن اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا اور پھر دونوں پاس پاس ایک ہی کوچ پر بیٹھ گئے۔ دو چار منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اتنی دیر میں مسٹر راج بھی کمرے میں تشریف لے آئے۔ ایک تو کمرے کی فضا ویسے ہی اتنی امیرانہ تھی کہ کرشن کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ اور دوسرے اُن نازک نرم گدوں پر بیٹھ کر کرشن کو یہ نہ سوجھا کہ وہ کیا باتیں کرے تنومند ظرافت اور مزاح کے لئے ایک آزاد ماحول کی ضرورت ہے۔ یہاں کمرے میں ہر ایک چیز ایسی قرینے سے رکھی ہوئی تھی اور ایسی سنجیدہ اور پُر وقار تھی کہ آدمی کا جی چاہتا تھا کہ خود بھی ویسی ہی ایک بے جان چیز بن کر پڑا ہے، اور کمرے کے خوبصورت فرنیچر کا ایک جزو بن جائے۔ شاید اسی لئے بہت زیادہ امیر گھر کی لڑکیوں میں ظرافت اور مزاح کا مذاق بہت کم ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے امیر گھر کی لڑکیاں اتنا سج دھج کر رہتی ہیں معمولی کپڑے پہن کر رہیں تو اپنے گھروں میں ایسی لگیں جیسی ریشمی کپڑوں کے انبار میں چیتھڑوں سے بنی ہوئی گڑیاں۔ کرشن نے تین چار بار ہوا کو ٹھنڈا رکھنے کی مشین کی، چُھپی ہوئی روشنی کی، سپرنگ والے صوفوں کی تعریف کرکے بات کو چلانا چاہا۔ مگر ہر بار کُسم نے بات کا رُخ پلٹ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے لئے اِن چیزوں کا وجود کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، اور اِن کی بابت باتیں کرنے میں اُسے کوئی مزا نہیں آتا۔ او نب وِسکی کے دو چار دور چلے جس میں صرف مسٹر راج اور کرشن ہی شامل تھے۔ کُسم نے صرف لیمن گیلیٹ پر ہی اکتفا کیا اور آہستہ آہستہ گفتگو کا رنگ جمتا گیا اور کرشن پھر کچھ کچھ اپنے پہلے جوش میں آنے لگا۔ آج تو مسٹر راج بھی کچھ کھل اُٹھے تھے لیکن کرشن کو ان کی باتیں بہت پھیکی اور بے مزہ لگتی تھیں کُسم حسبِ معمول شوخ اور زندہ دل تھی۔ مگر کرشن اپنی خوش گوئی اور اپنے جوش کے باوجود اپنے آپ کو ایک عجیب سی قید میں محسوس کر رہا تھا۔ اِس گھٹے گھٹے ماحول سے اُس کی ذہنی فضا پریشان سی ہو رہی تھی کھانے کی میز پر کھانا پیش کرنے والے چار باوردی بیرا لوگ موجود تھے، اس شاہانہ فضا میں اُسے اپنی ذہنی طاقتیں ہی سلب ہوتی نظر نہ آئیں بلکہ اُسے کھانے میں بھی لطف نہ آیا۔ کرشن کو بڑی شدت سے یہ بات محسوس ہو رہی تھی کہ آج اُس کی خوش گفتاری میں وہ برجستگی نہیں، جو اکثر اس کی زینت ہوتی ہے اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اُس کی ہر ایک بات دماغ پر زور دے کر باہر نکالی جا رہی ہے۔ اور آخر جب اُس رات کو پھر وہ اپنی پرانی اور چھوٹی موٹر میں بیٹھ کر باہر نیپین سی روڈ پر آیا تو اُس نے دو چار بار زور زور سے سانس لی تاکہ باہر کی کھلی ہوا اُس کے دماغ میں پیدا ہونے والی بے چینی کو قدرے کم کر دے۔ اُسے بار بار خیال آ رہا تھا کہ آج اُن سب جوشیلی باتوں کے باوجود کُسم کے از حد خوبصورت دکھائی دینے کے باوجود، مسٹر راج کے کھل اُٹھنے کے باوجود، کسی چیز کی کمی رہ گئی ہے، اس کی گفتگو میں برجستگی اور بے ساختگی نہیں آسکی۔ جو باتیں بھی ہوئیں، وہ سب اُس کے دماغ کی قابلیت کا نتیجہ تھیں جنہیں وہ کسی احساس کے بغیر کر رہا تھا جیسے وہ محض کسی کی خوشنودی کی غرض سے کی جا رہی ہوں اُس کی باتوں میں آج دل و دماغ کا وہ باہمی اتصال نہیں ہو سکا جس سے اُسے خود بھی مسرت حاصل ہوتی تھی اور دوسرے بھی وجد میں آجاتے تھے . . . . . .

کرشن مسٹر اور مسز راج کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے تو بیٹھا لیکن اُسے شک تھا کہ یہ دعوت اُن کے لئے تسلی بخش ہو سکے گی یا نہیں بمبئی میں تین چار سو روپیہ مہینہ کی تنخواہ سے مالابار ہِل پر مکان کرائے پر نہیں لیا جا سکتا۔ یہ تو خیر گزری کہ کرشن ابھی مجرد تھا۔ اور اس لئے وہ بھی بمبئی کے اونچے طبقے کی بستی میں رہ سکتا تھا۔ مگر کرشن آخر تھا تو مجرد ہی، اور مجردوں کی طرح ہی بے پروا گھر میں صرف ایک صوفہ سیٹ تھا جس میں سپرنگوں کی جگہ ناریل بھرا ہوا تھا، صوفہ سیٹ کے سوا چند ایک کرسیاں اور ایک میز تھا۔ انہیں مہینہ میں ایک آدھ بار قرینہ سے رکھ کر کرشن اُس کمرے کو دیوان خانے کا ممتاز درجہ دے دیا کرتا تھا اس کمرے میں نہ تو چھپی ہوئی روشنی تھی اور نہ ہوا کو ٹھنڈا رکھنے کے ذرائع۔ دیواروں پر اُس کے رشتہ داروں کی دو چار تصویریں آویزاں تھیں۔ اور اس کے پڑھنے کے میز کے سامنے کی دیوار پر ایک مسکراتی ہوئی سوئس دوشیزہ کی تصویر۔ اس لڑکی سے وہ جینوا میں ملا تھا۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے وہ اکثر اس تصویر کو دیر تک دیکھا کرتا تھا۔ اُس مسکراتے ہوئے چہرے میں کوئی ایسی بات تھی کہ کرشن اُسے دیکھ دیکھ کر خود کو بھول جایا کرتا تھا۔ آج کمرے کو تھوڑا سا سجانے کی کوشش کرتے ہوئے کرشن اپنے دل میں یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا

تھا کہ وہ اس تصویر کو اتار دے یا رہنے دے۔ اس تصویر کا کسم کے دل پر کیا اثر ہوگا۔ وہ یہ پوچھے گی تو ضرور کہ یہ تصویر کس کی ہے اور اگر اس نے یہ جواب دیا کہ مجھے خود نہیں معلوم، تو اس کا نہ تو کسم کو ہی یقین آئے گا اور نہ مسٹر راج کو لیکن یہ تصویر وہاں آویزاں ہی رہنی چاہیئے کہ کسم یہ خیال نہ کر لے کہ وہی اُس کی زندگی میں پہلی حسینہ ہے۔ میز پر اس نے ایک نیا کپڑا بچھا دیا اور اس پر دو چار کتابیں اِدھر اُدھر بکھیر کر رکھ دیں جس سے کسم کو معلوم ہو جائے کہ کرشن نہ صرف بات چیت میں بلکہ اپنے گھر اور اپنی عادات کے لحاظ سے بھی ایک آرٹسٹ ہے پہلے اُس نے سوچا کہ بازار سے جا کر وہ بھی ایک بلیک اینڈ وائٹ وِسکی کی بوتل لے آئے۔ لیکن وہ خود شراب کا شوقین نہیں ہے۔ اُس کے گھر پر لیمن سکواش، نارنگی کے رس اور ٹماٹر کے جوس کی بوتلیں پڑی ہیں۔ انہیں میں سے ایک چیز وہ مسٹر اور مسز راج کو پینے کے لئے پیش کر دے گا۔ آخر کبھی تو مسٹر راج کو شریف آدمیوں کی طرح شراب سے کنارہ کرنا ہی چاہیئے۔

مسٹر اور مسز راج کے آتے ہی کرشن نے دیوان خانے کے دونوں قمقمے روشن کر دیئے مسٹر راج تو ایک کرسی پر خود ہی بیٹھ گئے۔ کسم اور کرشن ایک کوچ پر بیٹھے۔ صوفے میں سپرنگ تو تھے ہی نہیں لیکن اب مسٹر راج اور کسم کی موجودگی میں اُسے اپنا صوفہ سیٹ پہلے سے بھی زیادہ سخت اور بے کار لگنے لگا۔ وہ چند کرسیاں جن پر گدیاں تک نہیں تھیں، کرشن کو ایسی دکھائی دینے لگیں جیسے ابھی کسی کباڑی کی دُکان سے لا کر رکھ دی گئی ہوں کسم نے کچھ کہا نہیں کمرے کے فرنیچر پر ایک دوڑتی ہوئی نگاہ ڈال کر سامنے دیوار پر آویزاں تصویر کو دیکھنے لگی۔ کرشن کا دل بے اختیار اپنے فرنیچر کے گھٹیا پن کے لئے معافی مانگنے کو چاہنے لگا۔ وہ بولا "آپ تو جانتی ہی ہیں مسز راج کہ مجرد لوگ کتنے سُست اور کتنے بے پرواہ ہوتے ہیں میرے پاس تو کام کا ایک سوفہ سیٹ بھی نہیں ہے۔" کسم نے کہا "مجردوں کو رہنا بھی ایسے ہی چاہیئے گھر کو سجانے کا شغل تو شادی شدہ لوگوں کے لئے ہے۔" اِس جواب سے کرشن کی تسلی نہیں ہوئی۔ مسز راج کے چہرے سے تو صاف عیاں ہو رہا تھا کہ اُس کو کرشن کا دیوان خانہ کسی سیٹھ کی بنائی ہوئی دھرم شالہ کی طرح لگ رہا ہے۔ کسم ذرا مسکرا کر پوچھنے لگی "معلوم ہوتا ہے آپ اُتنے بھولے نہیں ہیں جتنے کہ آپ لگتے ہیں۔ وہ خوبصورت، نوجوان عورت کون ہے؟" کرشن نے اس کا جواب صرف ایک شرارت آمیز مسکراہٹ سے ہی دینا مناسب سمجھا یہی کافی تھا۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، سماج پر، سیاسیات پر، دوسروں کے خراب چال چلن پر، ہندو مسلم فسادوں پر، مگر جو بات کرشن کو اُس دن کھٹکی تھی جب وہ مالابار ہل پر مسٹر راج کے ہاں کھانا کھانے گیا تھا، آج اور بھی شدّت سے محسوس ہونے لگی۔ اُسے خیال آیا کہ ان کو گھر پر بلا کر میں نے شاید غلطی ہی کی ہے۔ کلب کا جمہوری ماحول ہی ایسی دوستی کے لئے زیادہ مناسب تھا۔ اتنے میں نوکر جس نے نئی وردی پہن رکھی تھی نہ جوتا نارنگی کے رس کے تین گلاس لے آیا۔ مالابار ہل کی وِسکی کے بعد یہ نارنگی کا رس کتنا پھیکا اور کیسا بے مزہ معلوم ہوتا تھا۔ کرشن کو خود ہی شرم آ رہی تھی۔ اُسے پھر معافی مانگنی پڑی کہ بدقسمتی سے مجھے ایسی ہی پینے کی چیزیں زیادہ پسند ہیں۔ جب تک یہ سب جا کر کھانے کی میز پر بیٹھے کرشن میں احساسِ کمتری اس قدر شدید ہو چکا تھا کہ کھانا اچھا ہونے کے باوجود بھی اُسے بہت پھیکا اور بے مزہ لگا۔ کرشن ایک بار پھر معافی مانگنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ کسم نے شاید اُس کے دل کا راز بھانپ کر کہہ دیا "کہ آپ کا باورچی تو بہت ہوشیار معلوم ہوتا ہے"۔ کھانے کے بعد جب وہ پھر دیوان خانے میں آ کر بیٹھے تو کرشن کو ہر ایک چیز حقیر اور بیہودہ معلوم ہونے لگی۔ اُس کی قدرتی شگفتگی نہ جانے کہاں گم ہو گئی۔ مالابار ہل پر تو زور لگا کر وہ پھر بھی کچھ کہہ سُن سکا تھا، مگر آج اُس کی حالت بہت ناگفتہ بہ تھی مسٹر راج غالباً بیزاری محسوس کر رہے تھے۔ لیکن کسم آج بھی کرشن کی طرف اُسی تبسم اور اُنہی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جنہوں نے پہلے ہی دن کرشن کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ مگر جہاں آگے یہ تبسم اور یہ نظر کرشن کی خوش گفتاری کو تیز تر کر دیا کرتی تھی۔ آج اُسے بالکل بے حال بنا رہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ کرشن دل میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ یہ جلدی جائیں تو وہ سُکھ کا سانس لے لیکن کسم اُن سب باتوں سے بے پرواہ حسبِ معمول زندہ دلی اور شگفتگی سے باتیں کئے جا رہی تھی۔ مگر جہاں کرشن کو ان باتوں کا جواب دینے کے لئے عموماً بڑی دُور دُور کی سوجھا کرتی تھی، آج اُس کی زبان میں بالکل تالے پڑے ہوئے تھے، اُس کی پریشانی آخر اتنی عیاں ہونے لگی کہ کسم کو کہنا ہی پڑا کہ مسٹر کرشن آپ آج اپنے روزانہ "موڈ" میں دکھائی نہیں دیتے.....

جب مسٹر اور مسز راج موٹر میں بیٹھ کر واپس چلے تو کرشن بڑی دیر تک موٹر کی دُور ہوتی ہوئی پشت کو دیکھتا رہا۔ پشت پر بریک کی بتی بجھتی اور روشن ہوتی جا رہی تھی، کرشن کو اپنی زندگی بھی اسی بتی کی مانند لگنے لگی، جس میں بار بار امیدیں ناامیدی میں تبدیل ہو جایا کرتی تھیں۔ ایک لمبا سانس لیتے ہوئے کرشن نے سوچا کہ جو ہُوا اچھا ہی ہُوا۔ وہ کسم ایسی عورت کو بیوی بنانے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ وہ کیسے اُس گھر میں خوش رہتی جہاں گنتی کی چند کرسیاں ہیں جن پر نہ نیا روغن ہے نہ گدیاں، جہاں کا سوفہ سیٹ

نہ زم ہے نہ گدانا اور جہاں نہ ہوا کو ٹھنڈا کرنے کی مشین ہے نہ چھپی ہوئی بجلی کی بتیاں کُسم اُس کی بیوی ہوتی تو دو دن میں اُس کی زندہ دلی، اُس کی مسکراہٹ اُس کی اُمید انگیز نگاہیں ختم ہوگئی ہوتیں۔ اچھا ہے کہ کُسم جیسی امیر لڑکی مسٹر راج جیسے امیر آدمی کی بیوی ہے۔ مسٹر راج کے گھر میں اُسے ماحول تو کم سے کم اپنے درجے کے مطابق مِل جاتا ہے اور پھر اُس کی زندہ دلی اور شگفتگی، مالابار ہل پر نہ سہی، کلب میں تو اپنے عروج پر آہی جاتی ہے۔ مالابار ہل پر اُسے سب کچھ ملتا ہے جس کے لئے وہ بنائی گئی تھی، مشینوں سے ٹھنڈی کی جانے والی ہوا ہلکی ہلکی مہک۔ نرم اور سپرنگ والے صوفے، ایسے کمرے جس میں بیٹھ کر آدمی کا جی چاہتا ہے کہ وہ بھی غیر فانی ہوکر کمرے میں پڑی ہوئی چیزوں کا ایک جزو بن جائے، اور جہاں بیٹھ کر مسٹر راج بے شمار سگرٹ اور چُرٹ پی سکتا ہے۔ اور جہاں وہ اپنی بیوی کو کھلی اجازت دے سکتا ہے، کہ جہاں چاہے گھوم آؤ، جو چیز چاہے خرید کر لو۔ اور تب ہر دیر دار اور اتوار کو اُسے کلب میں لے جاتا ہے جہاں کھانا پینا بھی ہوتا ہے، رقص بھی ہوتا ہے۔ دوسرے نوجوان بھی ہوتے ہیں اور تب کسی کسی نوجوان کو دیکھ کر مسز راج کی زندہ دلی اپنے جوبن پر آجاتی ہے، اور جب وہ ایسے کسی نوجوان کے ساتھ رقص کرتی ہے تو وجد میں آکر کہہ سکتی ہے۔ "کیسے خوش گفتار ہو تم" اور وہ نوجوان بھی اس ماحول کو پسند کرتا ہے کیونکہ اس فضا میں نہ تو اُس کا مالابار ہل کی طرح دم ہی گھٹتا ہے اور نہ اپنے گھر کا معمولی فرنیچر دیکھ کر احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے۔ اور ایسے مسز راج اور اُس نوجوان کی زندگی میں کچھ رونق سی آجاتی ہے۔ اور جب مسٹر راج اپنی وِسکی پینے، چُرٹ کے کش لگانے اور دولت بنانے کے ذرائع سوچنے میں محو ہوتے ہیں تو مسز راج اور وہ نوجوان کلب کی جمہوری فضا میں والز کا رقص کرتے ہیں، اور کبھی کبھی جب مسز راج کہہ اٹھتی ہے "کتنے خوش گفتار ہو تم"۔ تو اُس کا ہاتھ اس نوجوان کے ہاتھ میں ذرا اور دب جاتا ہے، ایک لمحہ کے لئے اس کا جسم نوجوان کے جسم کے اور زیادہ قریب آجاتا ہے، اور دونوں کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو جاتی ہے اور دونوں بینڈ کی موسیقی کے آہنگ میں کھو جاتے ہیں، ایک ہوکر!

دھرم پرکاش آنند

سب جینے والے

کیا خبر صبح کے ستارے کو
ہے اسے فرصتِ نظر کتنی،
نکہتِ منتشر کو کیا معلوم
ہے اُسے مہلتِ سفر کتنی،
دیکھ سکتی نہیں مآلِ بہار،
گرچہ نرگس ہے دیدہ ور کتنی
برقِ بے تاب کو خبر نہ ہوئی
کہ ہے عمرِ دمِ شرر کتنی
کبھی سوچا نہ پینے والے نے
جام میں مے تو ہے مگر کتنی
جانے کیا زندگی کی جاگتی آنکھ
ہوگئی اس کی شب بسر کتنی
شمعِ خود سوز کو پتہ نہ چلا
دور ہے منزلِ سحر کتنی
مسکراتی کلی کو اس سے غرض
کہ ہے عمر اس کی مختصر کتنی

سب جینے والوں کا کام جینے سے!
زندگی کا نظام جینے سے!

مجید امجد بی اے

سائے

یہ سائے، یہ پھیلے پھیلے، بکھرے بکھرے سائے
یہ سائے، یہ دھندلے دھندلے، نکھرے نکھرے سائے

گو یہ سائے آج سمجھتے ہیں مجھ کو بیگانہ
لیکن ان سے وابستہ ہے ایک حسیں افسانہ

ان کے نیچے میں نے کاٹیں بھادوں کی دوپہریں
جب رقصاں ہوتی تھیں ہر سو، دھوپ کی تپتی لہریں

جب اک البیلی چرواہی لہراتی آتی تھی
رستوں سے کتراتی جب کھیتوں میں چھپ جاتی تھی

چھپتی چھپتی، جھکتی جھکتی، میرے پاس آتی تھی،
ہانپتی ہانپتی، ڈرتی ڈرتی، گھاس پہ گر جاتی تھی

اور جب گھبرا کر کہتی تھی — "کوئی دیکھ رہا ہے!
سامنے کی پگ ڈنڈی پر وہ کالا دھبا کیا ہے؟"

میں ہنس کر کہتا تھا — "پگلی۔ یہ تو وہم ہے تیرا
کوئی اگر ہو بھی تو یہ رکھا ہے چاقو میرا!"

وہ میرے پہلو میں سمٹ کر چپکے سے کہتی تھی،
"یہ وادی تجھ سے پہلے دوزخ سا بنی رہتی تھی!

اب تو ذرے ذرے میں آباد ہے جنت میری
تجھ سا بانکا گبرو پایا — واہ ری قسمت میری!

شام پڑے تو لگ جاتی ہے دل کو دن کی چنتا
کاش کبھی تو شب کو میرے دل کی دھڑکن گنتا!

دیکھو لڑما کے جاتے ہی، مجھ کو چھوڑ نہ جانا،
مجھ سے آنکھیں موڑ نہ لینا، دل کو توڑ نہ جانا

میں تیری ہوں، مرتے دم تک میں تیری ہوں پیارے
تیرے قدموں میں بیٹھی ہوں، اپنا تن من ہارے!

لیکن گرما کے جاتے ہی میں اس کو چھوڑ آیا،
اس البیلی چرواہی کا نازک دل توڑ آیا،

اب آیا ہوں تو ہر جانب کہرا سا چھایا ہے
اس کا مفلس باپ اسے پردیس میں بیچنے آیا ہے

اب یہ ٹھنڈے سائے آن میں تپ جاتے ہیں
ایک پرانے ساتھی پر چنگاریاں برساتے ہیں

دھوپ کو رستہ دے دیتے ہیں دامن کو سرکا کر
یوں ہلتے ہیں — ناگ اٹھتے ہیں جیسے پھن لہرا کر

احمد ندیم قاسمی

دیباچہ نگاری

جن دنوں میں افسانے لکھا کرتا تھا، افسانہ نگاری کو ادب کی تمام اصناف میں سے مشکل ترین اور ممتاز ترین سمجھتا تھا۔ اور دیباچہ اور دیباچہ نگاری کے متعلق تو میرا یہ خیال تھا کہ یہ ایک سہل ترین ادبی مشغلہ ہے، افقی اور سماوی حقیقتوں کے ساتھ خارجی اور داخلی تخیل کے ڈانڈے ملاؤ، اور ان میں فرائیڈ، جیمس جائس اور ڈی ایچ لارنس کی آمیزش کرو، اس کے بعد تکنیک، فن کار، اور رجحان جیسے الفاظ کا بار بار ذکر کرو، بس دیباچہ تیار ہے، اسی خیال کے زیر اثر میں دیباچہ نگاروں کو "ادبی مفت خورے" کہا کرتا تھا۔ اور میرے ذہن میں ان کی ادبی حیثیت وہی تھی جو میونسپل لائبریریوں سے رسالے چرا کر پڑھنے والوں کی ہے، بلکہ تھی کیونکہ اب تو میں میونسپل لائبریری سے اخبار اور رسالے چرانے کے کام کو بھی فنون لطیفہ میں شمار کرتا ہوں (!)

اب کچھ دنوں سے میری توجہ افسانہ نگاری سے ہٹ کر دیباچہ نگاری کی طرف مائل ہوئی ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ کام اتنا آسان نہیں، بلکہ میرے خیال میں تو افسانہ لکھنا دیباچہ لکھنے سے کہیں سہل ہے، افسانے میں مصنف اپنے جذبات سے جس طرح چاہے کھیل سکتا ہے جس طرح چاہے واقعات کو توڑ موڑ کر اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ اگر ہیرو سے ناراض ہو جائے تو اسے خودکشی پر مجبور کر سکتا ہے، اسے زہر دے سکتا ہے۔ پہاڑ کی چوٹی سے نیچے پھینک سکتا ہے، لیکن اگر آپ دیباچہ لکھ رہے ہیں تو آپ صاحب کتاب کو کسی ایسی بات کے لئے مجبور نہیں کر سکتے، آپ اس کی لکھی ہوئی عبارت کا ایک لفظ بھی نہیں بدل سکتے آپ اپنا افسانہ جب جی چاہے پھاڑ ڈالئے۔ لیکن دیباچے والی کتاب سے آپ ایسا سلوک کبھی نہیں کر سکتے، یہ بات دیباچہ نگاری کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے، اس سے صاحب کتاب کی دل شکنی ہوتی ہے، پھر اس ملک میں جہاں لوگ سانپوں کو بھی دودھ پلاتے ہیں، اس قسم کا تشدد کیسے روا رکھا جا سکتا ہے؟

جوں جوں میں دیباچہ نگاری کے فن کا مطالعہ کرتا ہوں، مجھے یہ ایک بحر ذخار معلوم ہوتا ہے، ہندوستانی موسیقی کی طرح دیباچہ نگاری کی ابتدا اور انتہا معلوم نہیں ہوتی، اس کی وسعت اور گہرائی سے مجھے ڈر محسوس ہوتا ہے، لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ ادب کے سمندر میں جن گوہر بے بہا کی مجھے تلاش ہے وہ مجھے یہیں سے حاصل ہوگا جب میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے ملک کے بہترین مفکر اور ادیب وہ لوگ ہیں جنہوں نے عمر بھر دیباچے لکھنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا، تو میں اور بھی انہماک سے دیباچے لکھنے میں مصروف ہو جاتا ہوں، آپ لاکھ اچھے شاعر ہوں، افسانہ نگار ہوں ناول نگار، اور ڈرامائسٹ ہوں، آپ کو کوئی پوچھے گا بھی نہیں، لیکن اگر آپ ایک عدد دیباچہ لکھ دیں تو دنیائے ادب میں آپ کا نام ستارے کی طرح چمک اٹھے گا۔ ہر شخص آپ کی تعریف میں رطب اللسان ہوگا۔ آپ سے ملنے، بات کرنے اور اپنی کتاب کا دیباچہ لکھوانے کے لئے کوشاں ہوگا، لیڈری کے بعد دیباچہ نگاری ہی ایک ایسا فن ہے جس سے آدمی ہندوستان میں ابدی شہرت حاصل کر سکتا ہے، اور اس کے لئے نہ کسی کوٹھی کی ضرورت ہے، نہ کار کی، نہ ریڈیو سیٹ کی!

شہرت کے علاوہ دیباچہ نگاری کے بھی اور کئی فائدے ہیں، مثلاً یہ کہ صاحب کتاب سے آپ کے ذاتی مراسم ہمیشہ کے لئے استوار ہو جاتے ہیں اور وہ عمر بھر آپ کا احسان مند رہتا ہے، کبھی کسی مجلس میں آپ کے خلاف وہ ایک لفظ تک نہیں کہہ سکتا، کیونکہ اس کی کتاب پر آپ نے دیباچہ لکھا ہے، سب لوگ اس امر سے واقف ہیں، اگر وہ آپ کے خلاف کچھ کہتا ہے، تو یار لوگ اسے اس کے "فطرتی کمینہ پن" پر محمول کریں گے، اس لئے بھی میں کہتا ہوں کہ اپنے دوستوں کی بجائے دشمنوں کی کتابوں پر دیباچے لکھنا زیادہ سود مند ہوتا ہے، یہ ایک ایسا گر ہے جسے بہت کم دیباچہ نگار جانتے ہیں لیکن جس کی افادیت آج سے مسلم سمجھی جانی چاہئے۔

دیباچے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے کتاب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اس سلسلے میں بعض دیباچے اتنے عمدہ ہوتے ہیں کہ انہیں پڑھ کر کتاب کو پڑھنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی، اور میرے خیال میں تو ایک اچھے دیباچہ نگار کا یہی نصب العین ہونا چاہئے، یہ سچ ہے کہ ایسے معیاری دیباچے بہت کم لکھے جاتے ہیں اور اگر لکھے بھی جائیں تو کبھی کبھی صاحب کتاب انہیں کتاب میں شامل کرنے سے انکار بھی کر دیتے ہیں، لیکن یہ ایک ایسا خطرہ ہے جسے ہر ایک دیباچہ نگار کو خوشی قبول کرنا چاہئے، اس طرح دیباچہ نگار نہ صرف اپنے فرائض منصبی کو سرانجام دیتا ہے، بلکہ رفاہ عام کا کام بھی کرتا ہے، آج کل زمانہ بیکاری اور کشمکش کا ہے، بقائے حیات کے لئے لوگوں کو اتنی تگ ودو کرنی پڑتی ہے، کہ وہ ادبی مصروفیتوں کے لئے زیادہ وقت نہیں نکال سکتے۔ وہ ناول چھوڑ کر افسانے پڑھتے ہیں، تھیٹر دیکھنے کے بجائے سینما دیکھتے ہیں، اخبار دیکھنے کے بدلے ریڈیو سنتے ہیں اور اب وہ دن بھی دور نہیں کہ جب کتاب پڑھنے کے بجائے وہ صرف اس کا دیباچہ پڑھا کریں گے!

دیباچے کئی قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو لکھے جاتے ہیں، دوسرے وہ جو نہیں لکھے جاتے، دوسری قسم میں وہ دیباچے شامل ہیں، جہاں صاحب کتاب اپنی طرف سے دیباچہ لکھ کر اس پر کوئی فرضی، جعلی، جھوٹا نام دے دیتا ہے، یا پھر یوں ہوتا ہے کہ کسی دیباچے پر دیباچہ نگار کا نام اس سے پوچھے بغیر دے دیا جاتا ہے، پچھلے دنوں ایک صاحب کو جو ضلع کیمبل پور میں درزی ہیں، اپنے غیر مطبوعہ افسانوں کے لئے ایک دیباچے کی ضرورت محسوس ہوئی، انہوں نے جھٹ اپنے ایک دوست کو خط لکھ دیا (جو بد قسمتی سے دیباچہ نگار کا بھی دوست تھا) کہ وہ اپنے دیباچہ نگار دوست سے ایک عدد دیباچہ لکھوا کر بھیج دے۔ دیباچہ نگار کے دوست نے اپنے دیباچہ نگار دوست سے کچھ کہنے سنے بغیر ہی اپنے دوست کو (دیباچہ نگار کے دوست کو نہیں) لکھ دیا کہ وہ خود ہی ایک دیباچہ تیار کر لے اور اس میں جو جی چاہے لکھ ڈالے، اور اس پر دیباچہ نگار کا نام دے دے، خیریت یہ ہوئی کہ دیباچہ نگار کو عین وقت پر سب حال معلوم ہو گیا، اور اس نے خود ایک دیباچہ لکھ کر پیچھا چھڑایا، خیر یہ تو ایک اتفاق تھا، ورنہ عموماً ان حالتوں میں یہ ہوتا ہے، کہ دیباچہ نگار کو اپنے دیباچے کا اس وقت پتہ چلتا ہے، جب کتاب چھپ کر اس کے پاس پہنچ جاتی ہے، اور جب وہ اپنے دیباچے میں یہ فقرے پڑھتا ہے، "جناب شیام کیمبلپوری کے افسانے درد، یاس اور غم کے جذبات میں ڈوبے ہوئے ہیں، افسانوی نقطہ نگاہ سے وہ ہمیں منشی پریم چند کے ہم پلہ نظر آتے ہیں" تو دیباچہ نگار کا اپنا دل ڈوبنے لگتا ہے، اس وقت اس کے سینے میں جو درد اٹھتا ہے، اور جس طرح اس کے دل پہ یاس اور غم کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ اچھی طرح سے کر سکتے ہیں جو جعلی دستخط بنانے میں ماہر ہوں، یا جن کا روپیہ بینک سے کسی جعلی دستخط بنانے والے نے ہتھیا لیا ہو۔

عام قاعدہ یہ ہے کہ دیباچہ نگار اور صاحب کتاب دو مختلف افراد ہوتے ہیں لیکن کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ صاحب کتاب ہی خود اپنا دیباچہ نگار ہوتا ہے، من تو شدم تو من شدی...... یہ وہ عرفانی مقام ہے جہاں ساری دوئی مٹ جاتی ہے، اور کتاب دیباچے میں اور دیباچہ کتاب میں مدغم ہو جاتا ہے، لیکن یہ کام بڑے جان جوکھوں کا ہے، اس کا حوصلہ وہی ادیب کر سکتے ہیں جو معرفت کے درجے تک پہنچ چکے ہوں، مقام شکر ہے کہ کئی ترقی پسند، صوفی منش ادیبوں کو بھی اس قسم کا ادبی عرفان حاصل ہو چکا ہے،

دیباچے عموماً دو طرح سے لکھے جاتے ہیں (۱) کتاب پڑھ کر (۲) کتاب پڑھے بغیر، پہلا طریقہ صرف عطائی اور مبتدی دیباچہ نگار عمل میں لاتے ہیں، جو تجربہ کار کہنہ مشق دیباچہ نگار ہیں۔ وہ کبھی کتاب نہیں پڑھتے، بلکہ اکثر کتاب کے نام مصنف کے اسم گرامی اور نفس مضمون سے بے بہرہ ہوتے ہیں، کتاب اور دیباچے میں جتنا بُعد ہوگا، دیباچہ اتنا ہی عمدہ ہوگا، اور اگر کتاب اور دیباچے میں سرے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو تو اسے دیباچہ نگاری کی معراج سمجھئے، یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اردو ادب میں اس قسم کی دیباچہ نگاری کی کئی ایک عمدہ مثالیں موجود ہیں، اور ادب کی کسی اور صنف میں نہ سہی، کم از کم اس صنف میں تو ہم یقیناً مغربی ادب سے بہت آگے نکل گئے ہیں، جیسا کہ میں ابھی آپ کو بتا چکا ہوں، ایک اچھے دیباچے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کا کتاب کے نفس مضمون سے کوئی تعلق ہو، مثال کے طور پر اگر آپ کو جنید بغداد اگنی ہوتری کی نئی مثنوی "رفعت خیال" پر دیباچہ لکھنا ہے تو آپ اسے اس طرح شروع کر سکتے ہیں،

میں مسوری میں اپنی کوٹھی "الہلال" میں بیٹھا ہوا اپنی ننھی لڑکی نجمہ سے باتیں کر رہا تھا۔ نجمہ بڑی شریر ہے (نجمہ کی گھریلو شرارتوں کے متعلق چند لطیفے) اتنے میں میری بیوی مسکراتی ہوئی اندر آئیں، میری بیوی کو مسکرانے اور پان کھانے کی بہت بری عادت ہے، (بیوی کے متعلق ایک پیرا) بیوی نے مجھے اگنی ہوتری جی کا ایک خط لا کر دیا جو ابھی ڈاکیا دے گیا تھا۔ مسوری میں ڈاک کا انتظام تسلی بخش نہیں، بجلی اور گرم پانی کا انتظام بھی اچھا نہیں (بجلی، گرم پانی اور مسوری کی میونسپل کمیٹی کے متعلق ایک صفحہ) میں نے خط کھول کر پڑھا، اگنی ہوتری جی کا انداز تحریر بے حد شگفتہ ہے

خط پڑھ کر جی خوش ہوگیا، اور جب میں خط پڑھ رہا تھا تو عالمِ خیال میں دیا رفعتِ خیال میں!) میرے سامنے اگنی ہوتری جی کی مسرت بھری آنکھیں چمک رہی تھیں۔ (اگنی ہوتری جی کی چمکیلی آنکھوں اور اُن کی شکل وشباہت کے متعلق ایک صفحہ بلکہ اگر ہو سکے تو دو صفحے) اگنی ہوتری جی نے مجھ سے دیباچہ لکھنے کی استدعا کی ہے۔ میں ہیچ میدان، ہیچ میرز کس لائق ہوں، اردو ادب کی خدمت کرتا ہوں، اردو ادب خطرے میں ہے، یہی بات میں نے پچھلی کل ہند اردو کانفرنس میں کہی تھی جس کا میں صدر تھا (پچھلی کل ہند اردو کانفرنس کی صدارتی تقریر کا خلاصہ دو صفحوں میں) جہاں تک دیباچہ لکھنے کا سوال ہے، میں اسے بے معنی سمجھتا ہوں، آخر دیباچوں سے اردو ادب کی حفاظت کب تک ہوتی رہے گی، یہی سوال دن رات پریشان کر رہا ہے میری صحت خراب ہو چکی ہے، ڈاکٹروں کی رائے ہے (ڈاکٹروں کی رائے ——— رائے بہت خطرناک ہونی چاہئے، ڈپتھیریا، انا سیتھزیا، اور سوم نومبلزم جیسے خطرناک الفاظ بار بار آئیں، ورنہ سارے دیباچے کا مزا کرکرا ہو جائے گا!) بہر حال مجھے اگنی ہوتری جی کی خوشنودی منظور ہے، اپنے دوستوں کے لئے آدمی کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ مجھے یاد ہے جب میں نے پہلا دیباچہ لکھا تھا (پہلا دیباچہ کب، کیسے اور کن حالات میں لکھا گیا تھا، اُس کے بعد اُن تمام دیباچوں کا جستہ جستہ تذکرہ جو بعد میں لکھے گئے، چار صفحے) اگنی ہوتری جی نے مثنوی لکھی ہے۔ اردو کی پرانی مثنویوں میں نواب مرزا شوق اور دیا شنکر نسیم کی مثنویاں بہت بلند پایہ ہیں (مواز نہ مثنوی مرزا شوق اور گلزار نسیم پانچ صفحے) یہ مثنوی جو اگنی ہوتری جی نے لکھی ہے، بہت خوب ہے (خیالات، محاکات، تعلیمین کی بادشاہی پر ایک فقرہ) بہت ہی کامیاب مثنوی ہے، اگنی ہوتری جی ابھی نوجوان ہیں، لیکن ترقی پسند ادیبوں کی طرح بے راہرو نہیں، (ترقی پسند ادیبوں کے خلاف ——— جتنے صفحے چاہے لکھ دیجئے) اگنی ہوتری جی نے اگر اعتدال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا تو ایک دن آسمانِ ادب پر ستارہ بن کر چمکیں گے، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

احقر

خواجہ ایم، رفیع

"الہلال" مسوری

۱۲ ستمبر ۱۹۴۱ء

دیکھا آپ نے، اس طرح آپ تیس چالیس صفحوں کا دیباچہ بہ آسانی لکھ سکتے ہیں، اسی طریق پر عمل کرکے آپ پچیس، پچاس تو کیا پانسو صفحوں کا دیباچہ لکھ سکتے ہیں اور ابدی شہرت حاصل کر سکتے ہیں۔ کئی کتابوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ دیباچے کا حجم تین چوتھائی ہوتا ہے، اور اصل کتاب کا حجم صرف ایک چوتھائی (اس میں جلد اور گرد پوش بھی شامل ہیں) یہ بھی دیباچہ نگار کا اعجاز ہے، لیکن فن کی ان بلندیوں تک پہنچنے کے لئے بڑی کد وکاوش کی ضرورت ہے۔

دیباچے کے آخر میں اس جگہ کا نام جہاں پر دیباچہ لکھا گیا ہو۔ بڑی اہمیت رکھتا ہے، مندرجہ بالا دیباچے کے آخر میں "مسوری" کا نام دیباچے کی زینت کو دوبالا کرتا ہے، بصورت دیگر اگر آپ "الہلال" مسوری کے بجائے "جنگڑ محلہ، لاہور" "بازار مائی سیوان۔ امرت سر" "باکھاری باؤلی، دہلی لکھ دیں تو دیباچہ دو کوڑی کا ہو جائے گا۔ اور نہ کوئی کتاب پڑھے گا نہ آپ کا دیباچہ، اس لئے دیباچے اور کتاب کی کامیابی کے لئے اپنے تخیل کو وسیع کیجئے، اگر آپ لاہور میں رہتے ہیں تو "سنی ویو، گلمرگ" لکھئے۔ امرت سر میں ہوں تو "الہلال مسوری" لکھئے۔ دہلی میں ہوں تو نینی تال لکھئے یعنی جس جگہ آپ رہتے ہوں، اس سے جتنی دور اور جتنی اونچی جگہ کا آپ نام لکھیں گے، آپ کے دیباچے کو اتنی ہی مقبولیت حاصل ہوگی۔ میں کہتا ہوں آپ "مسوری" یا "گلمرگ" بھی کیوں لکھیں آپ بے دھڑک لکھئے "میری ماڈلین کالج۔ آکسفورڈ" "سٹریٹ فورڈ۔ آن۔ ایوان انگلینڈ" آپ کے دیباچے کو چار چاند نہ لگ جائیں تو میرا ذمہ، بڑے بڑے جغادری نقاد بھی آپ کا لوہا نہ مانیں تو میرا نام ..... نہیں!

یہ جو کچھ میں نے ابھی لکھا ہے، یہ اصل میں دیباچہ ہے میری اس کتاب کا جو میں فن دیباچہ نگاری پر لکھ رہا ہوں، یہ کتاب مکتبۂ ہندوستانی لاہور سے شائع ہوگی، قیمت ڈھائی روپے فی نسخہ، محصول ڈاک بذمہ خریدار۔ عید، دیوالی اور کرسمس کے دنوں میں یہ کتاب نصف قیمت پر فروخت ہوگی، ابھی سے آرڈر بھیجئے، ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔

کرشن چندر

غزل

وہ پرسشِ حال کو آئیں گے بیمار کو یہ خوش فہمی ہے
جذبات کی بے رونق دنیا میں کتنی گھما گھمی ہے

اے گردشِ ساغر گردشِ دورِ فلک سے مجھ کو خوف نہیں
ایام کے چکر سے ڈرنا ناشکری ہے نافہمی ہے

حوروں سے یہ جی بہلائے گا کوثر سے یہ جام اڑائے گا
میں شیخ کو خوب سمجھتا ہوں - پرلے درجے کا وہمی ہے

اُس جلوۂ حیرت زا سے کسبِ نور کا کچھ آساں کام نہیں
دل بیٹھا جاتا ہے تابِ نظارہ سہمی سہمی ہے

محفل میں نگاہِ ساقی نے ٹوکا تھا تجھے کم خواری پر
ڈر کر رُک جانا اے رندِ کم ظرف تری کم فہمی ہے

یہ کس کے نشیمن سے چنگاریاں اڑ کر باغ میں پھیل گئیں
کیوں اپنی حرکت نازیبا پر بجلی سہمی سہمی ہے

پھر کس کی آمد آمد ہے احساس کے حیرت خانے میں
دنیائے خیالِ فطرت میں کیوں آج یہ گھما گھمی ہے

عبدالعزیز فطرت

لین دین

(ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی پہلی کہانی)

پانچ لڑکوں کے بعد جب ایک لڑکی پیدا ہوئی تو ماں باپ نے بڑے پیار سے اس کا نام نِرو پما رکھا۔ اس گھرانے میں اس سے زیادہ اچھا نام کبھی سننے میں نہیں آیا تھا۔ بچوں کے نام اکثر دیوی دیوتاؤں کے نام ہی پر رکھ دیئے جاتے ہیں مثلاً گنیش کارتک۔ پاروتی وغیرہ

اب نِرو پما کے بیاہ کی بات چل رہی ہے۔ اس کے والد رام سندر مِتر نے بہت دوڑ دھوپ کی لیکن پسند کا کوئی لڑکا ہی نہ ملا۔ آخر کار ایک بڑے بھاری رائے بہادر رئیس کے اکلوتے لڑکے سے شادی کا پیغام دیا گیا۔ رائے بہادر کے باپ دادا کی جائداد اگرچہ بہت کچھ برباد ہو چکی تھی لیکن تھا وہ خاندانی آدمی۔

لڑکے والوں کی طرف سے دس ہزار روپیہ نقد اور ایک گرانقدر جہیز کی مانگ پیش ہوئی۔ رام سندر بلا کچھ سوچے سمجھے اس بات پر راضی بھی ہو گئے۔ ایسے لڑکے کو کسی طرح بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیئے۔

روپے کا انتظام آخر کسی طرح نہ ہوا۔ رہن رکھ کر۔ بیچ کر بہت کوشش کرنے پر بھی چھ سات ہزار کی کمی رہ گئی۔ ادھر بیاہ کے دن قریب آ رہے تھے۔

آخر کار بیاہ کا دن بھی آ گیا۔ بہت زیادہ سود پر ایک شخص نے روپیہ دینا قبول بھی کیا تھا مگر موقع پر وہ بے پتہ ہو گیا۔ بیاہ کے منڈپ میں بڑی کائیں کائیں مچ گئی۔ بڑی ناراضگی پھیلی۔ رام سندر نے رائے بہادر کے ہاتھ پیر جوڑ کر کہا "یہ شبھ کاج پورا ہو جانے دیجئے۔ روپے میں ضرور ادا کر دوں گا" رائے بہادر بولے "بغیر روپیہ لئے لڑکا منڈپ میں نہیں جا سکتا"

اس ناخوشگوار واقعہ سے گھر میں رونا دھونا پڑ گیا۔ اس مصیبت کی جو خاص وجہ تھی ــــ نِرو پما وہ بیاہ کے کپڑے پہنے ماتھے پر چندن لگائے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ ہونے والے خسر کے خاندان کے ساتھ اس کا پریم، اس کی محبت بڑھ رہی تھی یا نہیں، یہ نہیں کہا جا سکتا۔

اتنے میں ایک نئی بات ہوئی۔ لڑکا یکایک اپنے والد کے خلاف ہو گیا۔ وہ باپ سے کہہ اٹھا۔

"خرید فروخت، بھاؤ تاؤ کی بات میں نہیں سمجھتا۔ بیاہ کرنے آیا ہوں اور بیاہ کر کے جاؤں گا"

باپ نے جس کو سامنے پایا اسی سے کہا "دیکھی صاحب آج کل کے لڑکوں کی سمجھ"

دو ایک تجربہ کار اور جہاندیدہ اصحاب نے کہا "شاستر شکچھا وغیرہ تو اب کچھ رہی نہیں۔ اسی سے"

موجودہ تعلیم کے زہریلے اثرات اپنی اولاد میں دیکھ کر رائے بہادر صاحب ہتھیار ڈال کر بیٹھ رہے۔ بیاہ تو خیر کسی طرح ہو ہی گیا۔ مگر بڑی اداسی کے ساتھ۔

نِرو پما کو رخصت کرتے وقت باپ بیٹی کو کلیجے سے لگا کر آنسو ضبط نہ کر سکا لڑکی نے سوال کیا۔

"وہ لوگ کیا اب مجھے کبھی نہ آنے دیں گے بابو جی؟"

رام سندر نے کہا "کیوں نہ آنے دیں گے بیٹی؟ میں تجھے لے آؤں گا"

رام سندر اکثر لڑکی کو دیکھنے جاتے ہیں مگر سمدھیانے میں ان کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ نوکر چاکر تک ان کو چھوٹا سمجھ کر نیچی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ زنانخانے کے باہر ایک چھوٹے سے کمرے میں پانچ منٹ کے لئے کسی دن لڑکی سے مل پاتے اور کسی دن یوں ہی لوٹ آتے۔

سمدھیانے میں تو ایسی بے عزتی برداشت نہیں کی جاتی۔ رام سندر نے طے کیا کہ جس طرح ہو روپیہ ادا کر ہی دینا چاہیئے۔

مگر جو قرض ابھی سر پر لدا ہے اسی کا اتارنا مشکل ہے۔ گھر کا خرچ

کسی طرح کھینچ تان کر چل رہا ہے۔ مہاجنوں سے بچنے کے لئے طرح طرح کے حیلے حوالے سوچنے پڑتے ہیں۔

ادھر سسرال میں اٹھتے بیٹھتے لڑکی کو جلی کٹی سننا پڑتی ہے میکے کی برائی سن کر کمرہ کے دروازہ بند کرکے آنسو بہانا تو اس کا روز کا کام ہوگیا ہے۔

خاص کر ساس کی جھڑکی تو کسی طرح بھی نہیں رکتی۔ اگر کوئی کہتا "کیا صورت پائی ہے۔ بہو کا منہ دیکھ کر جی نہال ہو جاتا ہے"۔ تو ساس بول اٹھتی "ہوگا نہیں جیسے گھر کی لڑکی ہے ویسی ہی شکل بھی ہوگی۔"

اور تو اور بہو کے کھانے پہننے تک کی کوئی خبر نہیں لیتا۔ اگر پڑوس کی کوئی رحم دل عورت ساس کی توجہ کسی کوتاہی کی طرف دلاتی تو وہ جھٹ کر کہتی۔ "بس اتنا بہت ہے" یعنی باپ اگر پوری رقم دیتا تو لڑکی کی پوری خاطر ہوتی! گھر کے سبھی لوگوں نے یہی روش اختیار کر رکھی تھی گویا گھر میں بہو کا کوئی حق ہی نہ تھا اور وہ دھوکے سے گھس آئی تھی۔

شاید لڑکی کی اس بے عزتی کی خبر باپ کے کانوں تک پہنچی۔ اسی سے رام سندر آخر کار اپنے رہنے کا مکان تک بیچنے کی کوشش کرنے لگے۔

لیکن لڑکوں کو وہ گھر سے محروم کرنے والے ہیں۔ یہ بات ان لڑکوں سے چھپا رکھی۔ سوچا تھا کہ مکان کو بیع کرکے اسی کو کرائے پر لے کر رہیں گے۔ ایسی ترکیب سے چلیں گے کہ مرنے سے پیشتر یہ بات لڑکوں کو معلوم ہی نہ ہوگی۔

مگر لڑکوں کو یہ بات معلوم ہوگئی۔ سب آکر رونے لگے۔ تینوں بڑے لڑکے شادی شدہ تھے اور ان میں دو کے بچے بھی تھے۔ ان کی مصیبت نے بڑی بھیانک صورت اختیار کی اور آخر مکان کا بیچنا ملتوی کرنا پڑا۔

تب رام سندر جگہ جگہ سے زیادہ سے زیادہ سود پر رقمیں قرض لینے لگے ایسا ہوا کہ گھر گرہستی کا خرچ چلانا مشکل ہوگیا۔

نروپما باپ کا چہرہ دیکھ کر سب کچھ سمجھ گئی۔ بوڑھے باپ کے سفید بال۔ سوکھے منہ پر اور ہمیشہ غمگین رہنے والے چہرے پر فکر اور بے چارگی صاف صاف نظر آنے لگی۔ لڑکی کے سامنے جب باپ گناہ گار رہے تو اس گناہ کے اثرات کیونکر چھپائے جا سکتے ہیں۔ رام سندر جب سمدھیانے میں اجازت لے کر لڑکی سے ملتے تب ان کی چھاتی کس طرح پھٹتی یہ تو ان کی ہنسی دیکھنے سے ہی معلوم ہو سکتا تھا۔

محض باپ کی چھاتی ٹھنڈی کرنے کے خیال سے نروپما میکے جانے کے لئے بے قرار ہو اٹھی ہے۔ باپ کے مرجھائے ہوئے منہ کو دیکھ کر وہ اب اس سے دور نہیں رہ سکتی ہے۔ ایک دن اس نے رام سندر سے کہا "بابوجی مجھے گھر لے چلو"۔

رام سندر نے کہا "اچھی بات ہے"

لیکن اس کا بس نہیں۔ اپنی بیٹی پر باپ کے جو قدرتی حقوق ہوتے ہیں۔ وہ گویا جہیز کے باقی روپیوں کے بدلے گرو رکھ دیئے پڑے ہیں۔ اور تو اور لڑکی سے ملنا اور وہ بھی بڑے پس و پیش کے بعد۔ بھیک سی مانگنی پڑتی ہے۔ اور بعض اوقات اجازت نہ ملنے پر پھر کہنے کی ہمت نہ ہوتی۔

مگر جب لڑکی خود میکے آنا چاہتی ہے تب بھلا باپ اسے بغیر لائے کیونکر رہ سکتا ہے۔ اسی لئے سمدھی سے اس بات کی درخواست پیش کرنے سے پہلے رام سندر نے کس قدر ذلیل اور بے عزت ہو کر نقصان اٹھا کر تین ہزار روپے جمع کئے تھے۔ اس کی داستان پوشیدہ ہی رہے تو اچھا ہے۔

نوٹوں کو رومال میں لپیٹ اور چادر میں باندھ کر رام سندر سمدھی کے پاس جا بیٹھے پہلے منہ پر زبردستی ہنسی لا کر محلے کی بات چھیڑی۔ ہرے کرشن کے گھر پر بہت بھاری چوری ہوگئی ہے۔ اسے شروع سے آخر تک بیان کیا۔

نوین مادھو اور رادھا مادھو ان دونوں بھائیوں کا موازنہ کرکے علم عقل اور عادات و اطوار کے بارے میں رادھا مادھو کی تعریف اور نوین مادھو کی شکایت کی۔ شہر میں ایک طرح کی بیماری پھیلی ہے۔ اس کے بارے میں بہت سی عجیب و غریب باتیں بیان کیں اور آخر کار حقہ کو ایک کنارے رکھ کر باتوں ہی باتوں میں بولے "ہیں ہیں سمدھی صاحب آپ کے روپے تو ابھی باقی ہی ہیں۔ جب آتا ہوں تبھی سوچتا ہوں کہ کچھ لئے چلوں مگر چلتے وقت یاد ہی نہیں رہتا۔ اب تو بھئی بوڑھا ہو چلا ہوں"۔ اس طرح کی ایک لمبی تمہید گانٹھ کر پسلی کی تین ہڈیوں کی طرح ان تینوں نوٹوں کو گویا بڑی آسانی سے بے پروائی کے ساتھ نکال کر رکھ دیا۔ لے دے کر صرف تین ہزار کے نوٹ دیکھ کر رائے بہادر صاحب قہقہہ مار کر ہنس اٹھے۔ بولے "رہنے دو سمدھی۔ مجھے یہ نہیں چاہئیں"۔ ایک مروجہ ضرب المثل کہہ کر انہوں نے کہا "ذرا سے کے واسطے ہاتھ گندے کرنا نہیں چاہتا"۔

اس کے بعد لڑکی کو رخصت کرانے کی بات کسی کے منہ سے نہ نکلی۔ رام سندر سوچنے لگے رشتہ داری کا لحاظ کرنا میرے لئے اچھا نہیں لگتا۔ دل پر گہری چوٹ پہنچنے کے باعث وہ کچھ دیر تک چپ رہے۔ آخر کار انہوں نے نرمی سے اس بات کا ذکر کیا۔ رائے بہادر نے بغیر کسی وجہ بیان کئے ہی کہہ دیا۔ "یہ تو ابھی نہیں ہو سکتا"۔ اتنا کہہ کر وہ کسی کام سے باہر چلے گئے۔

رام سندر لڑکی کو منہ نہ دکھا کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ان نوٹوں کو چادر کے

گٹھے میں باندھ کر سیدھے گھر لوٹ آئے اور دل ہی دل میں عہد کیا کہ جب تک کُل روپے ادا کر کے بلا روک ٹوک لڑکی کے کھوئے ہوئے حقوق نہ حاصل کر لوں گا تب تک سمدھی کے گھر نہ جاؤں گا۔

بہت دن گذر گئے۔ نروپما آدمی پر آدمی بھیجتی مگر باپ کے درشن نہ ہوتے آخر کار ناراض ہو کر اس نے آدمی بھیجنا ہی بند کر دیا ۔۔۔ تب رام سندر کے دل کو بڑی گہری چوٹ لگی ۔ مگر پھر بھی وہ نہ گئے ۔

کنوار کا مہینہ آیا۔ رام سندر نے کہا "اس مرتبہ درگا پوجا کے موقع پر لڑکی کو ضرور بلاؤں گا نہیں تو میں ۔۔۔۔"

بڑی سخت قسم کھا بیٹھے ۔

پنچمی یا چھٹی کے روز پھر اُسی چادر کے کونے میں کچھ نوٹ باندھ کر رام سندر چلنے کی تیاری کرنے لگے ۔ پانچ سال کا ایک پوتا آ کر کہنے لگا ۔۔۔ "بابا میرے لئے گاڑی لینے جا رہے ہو؟" بہت دنوں سے اُسے گاڑی پر بیٹھ کر ہوا کھانے کا شوق ہوا تھا اور وہ ارمان پورا نہ ہو رہا تھا۔ چھ برس کی ایک پوتی نے روتے روتے آ کر کہا "پوجا کے نیوتے میں جانے کے لئے میرے پاس ایک بھی اچھی دھوتی نہیں ہے۔"

رام سندر کو معلوم تھا اور اس بارے میں تمباکو پیتے ہوئے بہت کچھ سوچ بھی رہے تھے۔ رائے بہادر کے گھر سے جب پوجا کا نیوتا آئے گا تب اُن کی بہوؤں کو کیا اسی طرح معمولی گہنے پہن کر ہی جانا ہوگا۔ ان باتوں کا خیال کر کے انہوں نے بہت سی لمبی سانسیں لیں لیکن اس سے اُن کی پیشانی کی لکیریں اور گہری ہو جانے کے علاوہ اور کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

اپنے افلاس زدہ کُنبہ کی دُکھ بھری فغاں کانوں میں بھر کر بوڑھے رام سندر سمدھی کے گھر میں داخل ہوئے آج اُن میں پہلی سی جھجھک اور اگلی سی بات نہ تھی پہلے وہ دربان اور نوکروں کی طرف آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتے تھے اور بہ مشکل تمام اندر گھستے تھے مگر آج وہ اس طرح اندر چلے گئے جیسے اپنا ہی گھر ہو۔ بھیتر جا کر معلوم ہوا کہ رائے بہادر گھر میں نہیں ہیں۔ کچھ دیر بیٹھنا ہوگا۔ رام سندر اپنے دل کی اُمنگ نہ روک سکے لڑکی سے ملاقات کی۔ مارے خوشی کے آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ باپ بھی روتا تھا اور لڑکی بھی رو رہی تھی۔ دونوں میں کسی کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ اسی طرح کچھ وقت گذر گیا۔ پھر رام سندر نے کہا "اس بار تجھے لیو لے چلوں گا بیٹا۔ اس مرتبہ کوئی رُکاوٹ نہیں"۔

اتنے میں رام سندر کا بڑا لڑکا ہرموہن اپنے دونوں چھوٹے بچوں کو ساتھ لے کر گھر میں یکایک گھس آیا۔ باپ سے بولا "بابوجی تو اب ہم لوگوں کو راہ کا بھکاری ہی بننا پڑے گا"۔

رام سندر غصے سے تمتما کر بول اُٹھے "تم لوگوں کے لئے کیا میں دوزخ میں جاؤں؟ تم لوگ مجھے اپنے فرض سے روکو گے؟"

رام سندر نے مکان بیچ ڈالا ہے۔ لڑکوں کو معلوم نہ ہو جائے اس کے لئے انہوں نے کافی انتظام کیا تھا لیکن پھر بھی بات پھوٹ ہی گئی۔ یہ معلوم کر کے انہیں بڑا غصہ آیا اور وہ جھنجھلا اُٹھے۔

اُن کا پوتا اُن کے دونوں گھٹنے پکڑ کر منہ اوپر کو اٹھا کر کہنے لگا۔ "بابا میری گاڑی؟"

رام سندر سر جھکائے کھڑے رہے۔ کوئی جواب نہ پا کر لڑکا نروپما کے پاس دوڑ گیا اور بولا "بوآ جی مجھے ایک گاڑی لے دے گی؟"

نروپما سب کچھ سمجھ گئی۔ بولی "بابوجی اب تم ایک پیسہ بھی میرے سسر کو دو گے تو پھر تم اپنی بیٹی کو نہ دیکھ پاؤ گے۔ میں تمہارا بدن چھو کر کہتی ہوں"۔

رام سندر نے کہا "اچھی بیٹی۔ اس طرح کی بات نہیں کہتے۔ اگر میں روپیہ نہیں دے سکا تو اس میں تیرے باپ اور تیری ہی بے عزتی ہے بیٹی"۔

نروپما نے کہا "بے عزتی تو روپیہ دینے میں ہے تمہاری لڑکی کی کیا کوئی عزت نہیں؟ میں کیا صرف روپے کی ایک تھیلی ہوں۔ جب تک روپیہ ہے تبھی تک میری قدر و قیمت ہے؟ نہیں بابوجی روپیہ دے کر تم میری بے عزتی نہ کرو اور پھر میرے ۔۔۔ وہ بھی تو روپیہ نہیں چاہتے!"

رام سندر نے کہا "تو پھر یہ لوگ تم کو رخصت نہ کریں گے بیٹی"۔

نروپما بولی "نہ کریں گے تو پھر تمہارا کیا اختیار ہے بابوجی تم لینے کے لئے نہ آنا"۔

رام سندر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹ بندھی ہوئی چادر پھر سنبھالی اور چور کی طرح سب کی نگاہ بچاتے ہوئے نکل گئے۔

لیکن یہ بات کہ رام سندر روپیہ دینے آئے تھے اور بغیر دیئے ہی چلے گئے چھپی نہ رہ سکی کسی نٹ کھٹ ماما نے ساری باتیں کواڑ کی آڑ سے سن کر نروپما کی ساس سے کہہ دیا۔ سُن کر ساس آپے سے باہر ہو گئی۔

نروپما کے لئے اُس کی سسرال کانٹوں کا بستر ہو گئی۔ ایک طرف تو اُس کا

خاوند کچھ دنوں سے ڈپٹی کلکٹر ہو کر پردیس چلا گیا تھا۔ دوسری طرف اس خیال سے کہ کہیں میکے والوں سے آمدرفت اور ربط ضبط رکھنے سے خاندانی نقائص عود نہ کر آئیں میکے والوں سے اس کا ملنا بھی بند کر دیا گیا تھا۔

اسی درمیان میں زوبیا سخت بیمار پڑ گئی لیکن اس کے لئے اس کی ساس کو پورے طور پر ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اپنی طرف سے وہ خود بہت بے پروا ہو گئی تھی۔ نانک کے مہینے میں جب کافی اوس پڑتی ہے وہ سرہانے کی طرف کا دروازہ کھول کر ساری رات بلا کچھ اوڑھے پڑی رہتی۔ کھانے پینے کا بھی کوئی ٹھیک نہیں تھا۔ ماما ئیں کبھی کبھی ناشتہ وغیرہ لانا بھول جاتی تھیں تو وہ انہیں اپنی طرف سے کبھی یاد بھی نہ دلاتی۔ اس کے دل میں یہ بات اچھی طرح جم گئی تھی کہ وہ اس گھر میں ماما کی حیثیت سے ہے اور مالک مالکن کے رحم و کرم پر زندگی بسر کر رہی ہے لیکن یہ بھی ساس سے نہ دیکھا گیا۔ اگر کھانے پینے میں بہو کی کوئی بے پروائی دیکھتی تو جھٹ کہہ اٹھتی "نواب کی بیٹی ہے نا؟ غریب کے گھر کا کھانا کیسے اچھا لگے۔ کبھی کہتی ذرا شکل تو دیکھو کیسی ہو رہی ہے دنوں دن جیسے جلی لکڑی ہوتی جا رہی ہے۔"

بیماری جب زیادہ بڑھ گئی تو ساس بولی "ارے یہ سب اس کے نخرے ہیں"۔ آخرکار ایک دن زوبیا نے ساس سے بڑی خوشامد کے ساتھ کہا۔ "بابوجی اور بھائیوں کو ایک بار دکھا دو ماں جی"۔ ساس بولی "بس یہ سب میکے جانے کے ڈھنگ ہیں"۔

کہنے سے کوئی یقین نہ کرے گا جس دن شام کے وقت زوبیا کی سانس چلنے لگی اسی دن پہلے پہل ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور وہی دن اس کے معالجہ کا آخری دن ہوا۔

گھر کی بہو مری ہے۔ خوب دھوم دھام سے جنازہ نکالا اور آخری مراسم بہت بڑے پیمانے پر ادا کئے گئے۔ چندن کی لکڑیوں کی ایسی چتا آج تک کسی نے دیکھی ہی نہ تھی۔ پھر شرادھ بھی کچھ ایسی تیاریوں کے ساتھ ہوا کہ وہ رائے بہادر کے یہاں ہی ممکن تھا۔ سنا جاتا ہے کہ اس میں وہ کچھ مقروض بھی ہو گئے۔

رام سندر کو لوگ تسلی دیتے وقت اسی بات کی تعریف کا پل باندھ دیتے تھے کہ ان کی لڑکی کا کس دھوم دھام کے ساتھ کام ہوا۔

ادھر ڈپٹی مجسٹریٹ کا خط آیا "میں نے سب انتظام مکمل کر لیا ہے۔ اب بہو کو جلد ہی بھیج دو"۔ رائے بہادر کی اہلیہ محترمہ نے لکھ بھیجا "بیٹا تمہارے لئے دوسری لڑکی تجویز کر لی گئی ہے۔ اس لئے جلد ہی چھٹی لے کر یہاں چلے آؤ"۔

اس مرتبہ بیس ہزار نقد ملے اور ہاتھوں ہاتھ وصول بھی ہو گئے۔

چندر بھوشن سنگھ

شعر

شبِ وصل ایسی کھلی چاندنی
وہ گھبرا کے بولے سحر ہو گئی

داغ



غزل

دلِ اندوہگیں میں آج یہ پھر کس کی یاد آئی
کہ رخصت ہو گئے صبر و سکون تاب و توانائی

خس و خاشاکِ گلشن میں یہ رعنائی یہ زیبائی
چمن میں ہے کسی سحر آفریں کی کارفرمائی

وہ گردوں پر گھٹا چھائی پیامِ زندگی لائی
فضا نے تازگی پائی گلستاں میں بہار آئی

کسی کے حسنِ عالمگیر کے یہ سب کرشمے ہیں
تڑپ بجلی میں ہیرے میں چمک پھولوں میں رعنائی

نہایت خوب ہے راوی! خرام دل نشیں تیرا
تری اس نرم رفتاری میں ہے شانِ دل آرائی

کہیں زنجیر کے ٹکڑے کہیں پرزے گریباں کے
ذرا دیکھو تو صحرا میں جنوں کی کارفرمائی

کوئی اس طرح بھی احباب سے روپوش ہوتا ہے
زمانہ ہو گیا تم نے مگر صورت نہ دکھلائی

وہاں سے کوہساروں کو سکوں حاصل ہوا کیونکر
جہاں سے قطرۂ سیماب نے اپنی تڑپ پائی

وہاں سے رات کو وحشت فزا ظلمت ملی کیونکر
جہاں سے چاند میں اپنی سکوں پرور ضیا آئی

ترا منظر تو ہے اے فصلِ گل! اب بھی وہی لیکن
گیا وہ دل کہ تھا تیری بہاروں کا تماشائی

فقط ذوقِ نظر سے حُسن ہے آزاد ہر شے میں
وگرنہ ایک ہے برگِ چمن اور خارِ صحرائی

جگن ناتھ آزاد

قربانی

.......اور تمہیں چینی جنرل شیانگ کے صدر مقام پر جا کر جاسوس کے فرائض سرانجام دینے ہوں گے۔ ہماری فوجیں ترشانگ کو فتح کرکے ہشاؤ کا رُخ کریں گی اور کرنل اسوگی تمہاری خفیہ اطلاعات پر اپنی فوجوں کو نقل و حرکت دے گا۔ تمہاری کامیابی پر ان پچاس ہزار غریب الوطن جاپانی سورماؤں کی زندگی کا دار و مدار ہے جو یاد رِ وطن کو نئی فتوحات کا وعدہ دے کر گئے ہیں..... جاپان تم سے قربانی چاہتا ہے قیمتی قربانی۔ جاپانی افواج میں مایوسیوں اور ناکامیوں کے لئے جگہ نہیں..... اچھا جاؤ...... ہاں سنو..... تمہیں اس دفتر سے کسی قسم کی مدد کی توقع نہیں رکھنا چاہیئے۔ جو کچھ کرو اپنی ہمت کے بل بوتے پر"

بڈھے جاپانی جنرل کا یہ حکم کپتان نگاٹی نے نہایت خاموشی سے جذبات کی ایک عجیب کشمکش میں سنا اور سلام کرکے کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر آکر اس نے پتھر کی اس عمارت کی طرف دیکھا جس پر جاپان کا شاہی جھنڈا طلوع ہوتے ہوئے سورج کے نشان کو لئے ہوئے چاندنی میں لہرا رہا تھا۔ نگاٹی اس جھنڈے کو دیکھ کر بے اختیار مسکرا دیا۔ اس کے دماغ میں ان دنوں کی یاد تازہ ہوگئی جب اُس نے اس جھنڈے تلے چین کے وسیع میدانوں میں کئی بار موت کے کھیل کھیلے تھے۔

نگاٹی پیدائشی سپاہی تھا..... موت کی بازی لگانے والا سورما سپاہی پرسکون زندگی سے اسے نفرت تھی۔ وہ ہر وقت ایک ہنگامہ چاہتا تھا جس کا ہیرو وہ خود ہو۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بہت جلد ترقی کی منازل طے کرکے کپتان کے عہدے تک پہنچ گیا تھا۔ اور اب جاسوسی جیسی اہم اور خطرناک خدمت اسے سپرد کی جا رہی تھی۔ اب وہ کتنا خوش تھا۔ اس کی [illegible] سے بے قرار روح کس قدر تسکین محسوس کر رہی تھی۔ تسکینِ روح کے علاوہ خدمتِ وطن اور اس سے زیادہ پاؤلین کی نظروں میں مزید وقعت پیدا کرنے کا سنہری موقع۔ نگاٹی دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اسے جاسوسی کی خدمت نہیں ملی تھی، یا دشاہت مل گئی تھی۔ ہنگامہ، وطن، پاؤلین..... نگاٹی جوش مسرت سے دیوانہ سا ہو کر تیز تیز قدم اٹھانے لگا............

...... پاؤلین سے ملاقات کے لئے ٹینسٹن کی ملکۂ جمال، چین کی حسین ترین رقاصہ پاؤلین کے آستانے پر جبہ سائی کے لئے

یہ حقیقت کہ اس کی محبوبہ چینی تھی نگاٹی کے لئے لایعنی سی بات تھی۔ اگر اس کا دل چیرا جا سکتا تو شاید اس کے ہر گوشہ پر پاؤلین ہی کندہ نظر آتا۔ کیا اجتماع ضدین ہے جاپان کا ایک نڈر سپاہی، معتبر جاسوس چینیوں کے خون سے ہولی کھیلنے والا بانکا سورما کتنے کو چینی پر ترجیح دینے والا انسان۔ ایک چینی رقاصہ کا اسیر زلف نگاٹی ایک جھرجھری لے کر چونکا لیکن پھر کھو گیا۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ یہ تو دل کا معاملہ ہے چینیوں کو قتل کرنا خدمتِ وطن ہے اور پاؤلین سے پیار خدمتِ دل۔ اور پھر چینیوں پر ظلم بھی کہاں ہو رہا ہے۔ دہ بے وقوف ہیں جو ایسا خیال کرتے ہیں۔ اُسے سرکاری طور پر جو پمفلٹ پڑھنے کے لئے ملا تھا۔ اس میں تو یہ صاف طور پر لکھا ہوا تھا کہ جاپان چین سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی کوشش کر رہا ہے...

...... کیسا عجیب فلسفہ ہے خون بہا کر دوستی حاصل کرنا! نگاٹی پھر کچھ پریشان سا ہوگیا...... مگر یہ باتیں اس کے سمجھنے کے لئے نہیں۔ یہ تو وزیروں اور کمانڈر والوں کا حصہ ہیں۔ اسکول میں بھی تو ماسٹر صاحب نے اسے کسی بڑے آدمی کا یہ قول سمجھایا تھا کہ ہر ایک شخص کے لئے ایک مخصوص شاہراہ ہوتی ہے اسے اسی پر چلنا چاہیئے۔ خواہ مخواہ اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے والا کچھ نہیں حاصل کر سکتا۔ بس اس کے لئے بھی ایک شاہراہ ہے..... جنگ۔ ہنگامہ۔ خون کی ہولی۔ وطن اور پھر آخر میں پاؤلین۔ نگاٹی نے اطمینان کا سانس لیا۔ شاید ارسطو نے منطق کا پیچیدہ ترین مسئلہ حل کرنے پر بھی وہ مسرت محسوس نہ کی ہوگی جو نگاٹی کو من مانے دلائل سے جنگ کے متعلق اپنا نظریہ قایم کرکے اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے پر محسوس ہوئی۔

سنیچر کی شب۔ دوسرے دن اتوار۔ کیسا طمانیت بخش تصور ہے! یہ تو اس کے دل سے پوچھنا چاہیئے۔ جو ہفتہ بھر کولہو کے بیل کی طرح کام کرتے کرتے اندھوا سا ہو گیا ہو...... ٹینسٹن کی ہا جا کلب میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی ہفتہ بھر کے کام سے تھکے ماندے اس میں اس طرح جمع ہو رہے تھے جس طرح

شمع کے گرد پروانے کہ اطمینان کی ان چند میسر شدہ ساعتوں کو صراحی کی قلقل جاموں کی کھنکھناہٹ اور موسیقی کی تانوں پر قربان کر کے کچھ عرصے کے لئے دنیا ومافیہا سے بے نیاز ہو جائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ٹینسٹن میں جنگ ہو رہی تھی لیکن شہر کے دروازوں سے باہر ہاں کلب نوجنگ کے ہول کا تریاق فراہم کر رہی تھی ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٹگائی کلب میں داخل ہوا ۔ پاؤلین نے اُسے اور اُس نے پاؤلین کو دیکھا ۔ دونوں طرف سے ہلکی سی مسکراہٹ ۔ پھر شوق اور شوخی ۔ نیازمندی اور بے نیازی عشق اور حسن میں کشمکش ۔ اس کے بعد قہقہہ ۔ ۔ ۔ ۔ ٹگائی اور پاؤلین باتیں کرنے لگے تھے ۔

"تو تم جا رہے ہو؟"

"ہاں"

"کب؟"

"کل"

"کب واپس ہو گے؟"

"چند دنوں میں"

"چند دنوں میں" پاؤلین نے ٹگائی کے فقرے کو دہراتے ہوئے کہا ۔ "خون کی ہولی کھیلنے کے چند دنوں بعد لیکن تم جاؤ ہی کیوں؟ کیا تمہاری فوج میں کوئی اور نہیں جو تمہاری بجائے بھیجا جا سکے؟

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر یہ ہولناک کشت و خون کب بند ہو گا؟"

"چھوڑو اس قصے کو پاؤلین تمہیں جنگ سے کیا واسطہ ۔ دیکھو اطمینان کی ان چند ساعتوں کو ادھر اُدھر کے بکھیڑوں میں ضائع نہ کرو میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا ۔ کیا میں پہلے واپس نہیں آیا؟ یہ جنگ تو کیا ایسی ہزاروں جنگیں مجھے تمہاری محبت سے دست بردار نہیں کرا سکتیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے یہ آنسو کیسے؟"

پاؤلین کی طرف آنکھوں سے آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے ڈھلک کر اس کے دامن پر گر پڑے اور اُس نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا ۔ "ایسی ہزاروں کیا لاکھوں جنگیں تمہیں میری محبت سے دست بردار نہیں کرا سکتیں لیکن کیا تمہیں معلوم ہے ۔ ٹگائی کہ ایک بزدل سے بزدل چینی کی گولی تمہیں قبرستان کا مسافر بنا سکتی ہے؟"

"گولی اور وہ بھی چینی بزدل کی!" ٹگائی نے تحقیر آمیز ہنسی ہنستے ہوئے کہا "میں کسی چینی کے ہاتھ سے مرنے کے لئے پیدا نہیں ہوا ۔ پاؤلین ۔ مجھے زندہ رہنا ہے اور زندہ رہوں گا" پھر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے پاؤلین کی ایک چھوٹی سی تصویر نکال کر "دیکھو جب تک تمہاری یہ تصویر میری حرز جاں ہے ۔ میں گولیوں کے طوفان سے بھی صحیح وسالم واپس آؤں گا ۔ اس میں طلسم ہے"

"دوسرے الفاظ میں میرے وطن کی بے عزتی اور میرے دل کی بربادی کے لئے!"

ٹگائی کے تیور بدل گئے اور اس نے اپنے لہجے میں درشتی پیدا کرتے ہوئے کہا "غداری وطن اور فرض میں کوتاہی کے علاوہ بے عزتی اور بربادی لایعنی باتیں ہیں" ۔ پھر کچھ چونک کر "مجھے معاف کرنا پاؤلین میری درشتی سے تمہارے دل کو ضرور دکھ ہوا ہو گا ۔ اگر سچ پوچھو تو اس وسیع سیاسی بساط پر میری حقیقت ہی کیا ہے ۔ ایک بے بس پیادہ سی جس کی چال شاطر کے ہاتھ میں ہوتی ہے مجھ سے یہ پوچھنا کہ مجھے کہاں اور کیوں رکھا جائے گا میرے نزدیک فضول سی بات ہے ۔ اس کی ذمہ دار قدرت اور اس کے بعد سیاسی شاطر ہیں میرے لئے یہی کافی ہے کہ میں بلا پس و پیش ان کے احکام بجا لاتا رہوں ۔ اس سے زیادہ میں کچھ کر بھی نہیں سکتا ۔ اگر کسی نے کچھ کیا ہوتا تو شاید میرے لئے بھی ممکن ہو سکتا" ۔

پاؤلین وحشت زدہ ہرنی کی طرح ٹگائی کو دیکھ رہی تھی ۔ ٹگائی کے یہ الفاظ آبشار کی سی تندی کے ساتھ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے ۔ "غداری وطن اور فرض میں کوتاہی کے علاوہ بے عزتی اور بربادی لایعنی باتیں ہیں" ۔

"پاؤلین" ٹگائی چلایا ۔

"پاؤلین ہوں" کہہ کے پھر خاموش ہو گئی

طاقتوروں اور کمزوروں کی جنگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گولیوں کی سنسناہٹ ۔ گولوں اور بموں کی گرج ۔ دھوئیں کے اُٹھتے ہوئے بادل ۔ آگ کی بارش ۔ خون ندیاں ۔ مجروحین کی چیخ پکار ۔ کمزوروں کا طاقتوروں کے خلاف دانت پیس پیس کر لڑنا اور بے بسی کے عالم میں ان کی پسپائی ۔ طاقتوروں کی طرف سے نعرے"

اور پھر فاتحانہ داخلہ ۔ ہواؤں کی ہچکیاں ۔ بچوں کے نالے ۔

مفتوحین کا اپنے گھروں پر فاتحین کو قابض ہوتے

آسمان کی طرف تکنا اور خون آلود آہیں کھینچ کر "بس"

تصور میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی ۔ ۔ ۔ ۔

لگا ۔ جدا چیزیں ہیں ۔ میں تم سے محبت کرتا

"تمہیں کیا ہو گیا پاؤلین؟" ٹگائی نے ۔ ہوری میں مخل نہیں ہو سکتی ۔ اس پیغام

پر پچاس ہزار غریب الوطن جاپانی سپاہیوں کی زندگی کا دار و مدار ہے.... جاپان کی قسمت کا روشن ستارہ میرے پاس ہو اور میں اسے تمہیں دے دوں"۔

"میری درخواست کو مت ٹھکراؤ نگائی۔ کہیں محبت کا دیوتا غصّہ کے بھوت کا جامہ نہ پہن لے"۔

"بچوں کی سی باتیں مت کرو پاؤلین۔ جاؤ"۔

"میں کچھ لے کر جاؤں گی"۔

"ناممکن ہے"۔

"غلط"

"میرا راستہ چھوڑ دو پاؤلین"۔

"تم نہیں جا سکتے نگائی۔ اگر تم جاپان کی قسمت کا ستارہ منور دیکھنا چاہتے ہو تو میں چین کی قسمت کا ستارہ کیوں ماند ہونے دوں؟"

"ضد مت کرو پاؤلین"۔

چند منٹ تک دونوں پر موت کی سی خاموشی چھائی رہی۔ دونوں ہی ساکت و صامت کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ موت کا خوفناک ہتھیار دونوں میں حائل تھا۔ ایک مرد اور ایک عورت میں کشمکش تھی۔ دونوں کے دلوں میں محبت اور خدمتِ وطن کے بادل اُٹھتے تھے اور آپس میں ٹکرا ٹکرا کر غم و غصہ کی بجلیاں پیدا کر رہے تھے...... اپنی ضد سے کوئی بھی باز نہ آتا تھا۔

پاؤلین کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اسے ایک طرف نگائی کے ساتھ عیش و مسرت کی زندگی کا خوبصورت قصر کھڑا نظر آ رہا تھا۔ اور دوسری طرف تلملیکی ہی تاریکی۔ اس کے کانوں میں نگائی کے یہ الفاظ بھی گونج رہے تھے "غداریِ وطن اور فرض میں کوتاہی کے علاوہ بے عزتی اور تباہی لا یعنی باتیں ہیں"۔

نگائی چٹان کی طرح کھڑا تھا۔ اس کے سامنے اس وقت صرف ایک مقصد تھا۔ ترشانگ کی فتح...... اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ کوٹ کی جیب کی طرف بڑھنے لگا "خدا کے لئے حرکت مت کرو نگائی" پاؤلین چلائی۔

مگر نگائی نے کچھ نہ سنا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا پستول باہر نکال لیا...... اور اُسے تانے آگے بڑھنے لگا۔

"ٹھہرو" پاؤلین چلائی "تم دروازے سے باہر نہیں نکل سکتے"؟

"میرا راستہ چھوڑ دو پاؤلین۔ ترشانگ کی فتح میں تاخیر ہو رہی ہے" نگائی نے ترشروئی سے جواب دیا۔

"ٹھہرو! ترشانگ فتح نہیں ہو سکتا" پاؤلین پھر چلائی۔

نگائی نے اپنا پستول جھکا دیا۔ پھر دانت بھینچ کر اسے تانا اور آنکھیں بند کر کے اسے داغ دیا..... دھماکا...... پستول کی گولی پاؤلین کے کان کے پاس سے ہوتے ہوئے اُس کے آہنی خود کو توڑ کر نکل گئی.....

نگائی کے چہرے پر ایک وحشیانہ مسکراہٹ آئی۔ مگر ایک ثانیہ کے لئے۔ پاؤلین کا پستول جواباً دغا۔ نگائی کا سینہ چھلنی ہو گیا اور وہ تیورا کر پاؤلین کے قدموں میں گر پڑا۔ "پاؤلین" چلایا اور ٹھنڈا ہو گیا۔

....

چینی جنرل کا پیغام کسی قسم کے تغیر و تبدل کے بغیر ترشانگ میں جنرل چی تک پہنچ گیا۔ اور اُس نے جاپانی حملوں کو روکے رکھا۔ دونوں چینی جنرل اُس کی مدد کو پہنچ گئے.... ترشانگ پر جاپانی افواج بُری طرح پسپا ہوئیں۔ چین کو جاپان پر یہ پہلی عظیم الشان فتح نصیب ہوئی تھی۔

....

ترشانگ کی ایک چھوٹی سی خانقاہ میں ایک پاگل چینی عورت ہے جو اپنی تصویر کو دیکھ دیکھ کر روتی رہتی ہے.... تصویر کے عین وسط میں ایک سوراخ ہے۔

(چنگ) آفتاب شروانی

شعر

یہ مے چھلک کے بھی اس حسن کو پہنچ نہ سکی
یہ پھول کھل کے بھی اس کا شباب ہو نہ سکا

اختر شیرانی

تفاوتِ راہ

اس زمانے میں کہ جنگل تھا یہ باغ
گلّے بانوں نے ستاروں سے لگایا تھا سراغ
بھولے رستوں کا جو بے دھیانی میں کھو جاتے ہیں،
ویسے ہی باغ مراحب سے بناہے جنگل
ایک اک لمحہ ستاروں ہی کا دھیان آتا ہے،
ہر ستارہ مجھے لے جاتا ہے۔
اُسی چوپال کے بے نام کنارے کی طرف۔
جس میں بیٹھے ہوئے انسان یونہی، بے مصرف
مری ناکامی، ترے نام کی رسوائی سے
تلخ باتوں میں ہر اک رات بسر کرتے ہیں۔

بھولا رستہ کشتی ڈوبی ہوئی کشتی کی طرح سطح پہ اک پل میں اُبھر آتا ہے،
آنکھ میں اشک جھلکتے ہیں مگر اشکوں میں
وہ چمن اور وہ مکاں اور وہ روزن ــــ تینوں
گھلتے رنگوں کی طرح عکس بنا کرتے ہیں
ایک انسان کا جو تقدیر کی بے راہی سے
کبھی مالی، کبھی عاشق تھا، کبھی دیہاتی
گلّے بانی میں جسے یاد جب آئے ماضی
بنسری اپنی بجاتے ہوئے رو دیتا ہے۔

جیسے رستے میں کوئی ہاتھ میں دو شمعوں کو
لئے جاتا ہو شبِ ماہ کی طغیانی میں
اور زمیں سینے پہ اک شخص کے، اک رہرو کے
تین سایوں سے ڈری جاتی ہو، ــــ سہمی سہمی
اُس کے ہر بڑھتے قدم کو دل میں
جان کر اپنی رہائی کا ثبوت
یہ سمجھتی ہوا [illegible]ور چلا جائے گا،
اور پھر خوف سے حیران نگاہوں کو فقط
چاندہی چاند نظر آئے گا،

اس طرح تو نے بھی سوچا ہوگا!
راہرو پاؤں سے جو دُھول کے ذرّے مجھ پہ
پھینکتے پھینکتے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
انہیں سیندور کی سرخی سے مٹا ڈالوں گی۔
اور پھر دودھ کے دریا میں نہا کر، یکسر
سینۂ صاف کی مانند نظر آؤں گی۔

گلّے بانوں نے ستاروں سے لگایا تھا سُراغ،
راستہ ملتا نہیں مجھ کو، ستارے تو نظر آتے ہیں،
پیرہنِ رنگِ گلِ تازہ سے یاد آتا ہے
اور زرکار نقوش
اک نئی صبحِ حقیقت کا پتا دیتے ہیں،
کبھی ڈھولک، کبھی شہنائی کی آواز سنا دیتے ہیں،
زینے کی بھول بھلیاں اسی آواز میں کھو جاتی ہے،
ہاتھ میں تھامی ہوئی شمعیں بھی بجھ جاتی ہیں،
ساتھ کے باغ کی ہر صاف روش بھُولا ہوا راستہ بن جاتی ہے،
اور تنہائی پھر اک سانپ نظر آتی ہے۔
ڈستی جاتی ہے، کہے جاتی ہے:
گلّے بانوں نے ستاروں سے لگایا تھا سراغ!

کیوں بہن ہم نے سنا ہے کہ دُلہن کی آنکھیں
آنکھ بھر کر نہیں دیکھی جاتیں؟
اور کہتی ہے بہن وہ
مرے بھیّا کو بڑا چاؤ ہے، کیوں پوچھتی ہے۔
اب تو دو چار ہی دن میں وہ ترے گھر ہوگی۔

کس کا گھر، کس کی دُلہن، کس کی بہن، ــــ کون کہے؟
میں کہے دیتا ہوں، میں کہتا ہوں، میں جانتا ہوں

میراجی

حسنِ رہگذرے

یہ کس پر پڑ گئیں یارب نگاہیں کہ لہرانے لگیں سینے میں آہیں
محبت کر رہی ہے دل میں راہیں کھلی جاتی ہیں بے تابی میں باہیں
یہ کس پہ پڑ گئیں یارب نگاہیں

یہ چشمِ مست کے شیریں اشارے اشارے ہیں کہ بدمستی کے دھارے
فلک سے چھوٹتے ہیں یا ستارے چمک اُٹھی مری ہستی کی راہیں
یہ کس پہ پڑ گئیں یارب نگاہیں

یہ ہنستا سا ہوا آنکھوں میں کاجل یہ گیسو ہیں کہ بدمستی کے جنگل
جبیں پر لہلہاتا ہے یہ آنچل کہ رقصاں ہیں زمانے کی نگاہیں
یہ کس پہ پڑ گئیں یارب نگاہیں

فلک بر دوش ابرو کی کمانیں جہاں بر نوک مژگاں کی سنانیں
یہ کاکل ہیں کہ وحشت کی زبانیں کہ ہیں لپٹی ہوئی دنیا کی آہیں
یہ کس پہ پڑ گئیں یارب نگاہیں

یہ زلفیں ہیں کہ بے خوابی کے مدفن کھلے ہیں آتشی ہونٹوں پہ گلشن
جنوں کے ہاتھ میں ہے دل کا دامن یہ کس پر پڑ گئیں یارب نگاہیں
یہ کس پہ پڑ گئیں یارب نگاہیں

باقی صدیقی

اور سیمین ایگونسٹس بائرن کی نظم پرزنر آف شلان، اسکاٹ کی ناولیں کوئنٹن ڈرورڈ اور ٹیلسمین، لٹن کی ناول رنزی، جارج ایلیٹ کی ناول رمولا بیزوہ بہت سے ترجمے جو عربی، فارسی، سنسکرت، یونانی، لاطینی، پرتگالی، جرمن، روسی اور چینی زبانوں سے انگریزی میں کئے گئے انگریزی ادب کے لئے بدیسی نہیں خیال کئے جاتے تو ان ترجموں پر جو عربی یا فارسی زبانوں سے اردو میں کئے گئے ہیں یہ الزام کیوں عاید کیا جاتا ہے کہ ان میں بدیسی پن ہے۔ انگریزی ادب میں یونانی، رومی اور یہودی روایات اور تاریخی واقعات اور تاریخی اور اصنامی ہستیوں کے بے شمار اشارے اور تلمیحیں ہیں لیکن اس کے باوجود انگریزی ادب کے کٹر سے کٹر شیدائیوں نے بھی کبھی ان تلمیحوں یا اشاروں کے خلاف آواز بلند نہیں کی۔ پھر یہ کون سی سمجھ ہے کہ اگر ہندوستانیوں کا ایک طبقہ کہ جس کی مذہبی نسبتیں ہندوستان کے حدود تک محدود نہیں ہیں ہندوستان سے باہر کی تلمیحیں استعمال کرتا ہے تو اردو کو اس کے لئے موردِ الزام قرار دیا جائے یہ کہا گیا ہے کہ "ہندی کو ہندوستان کی تمام بڑی بڑی زبانوں سے نسلی تعلق ہے" میں اس بحث کو زیادہ طول نہ دوں گا لیکن یہ بیان ظاہر ہے، بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ پھر دراوڑی زبانوں کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ کیا اردو کا پنجابی سے ویسا ہی تعلق نہیں جیسا ہندی کا پنجابی سے ہے؟

اردو پر ہندی کو ترجیح دینے کے لئے پروفیسر جھا نے جو دلیلیں پیش کی تھیں ان پر بحث کرنے کے بعد اب میں "ہندوستانی" پر ان کی رائے زنی سے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ہندوستانی" کو برا بھلا کہنے میں ان کو خاص لطف آتا ہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے "ہندوستانی" کو دوغلا جانور (HYBRID MONSTER) کہا تھا۔ اب وہ اس کو "ایک مضحکہ خیز زبان" کہتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ ان کے ذہن میں ہے کیا۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ دنیا کی کوئی ایسی زبان نہیں جو مخلوط نہ ہو۔ انگریزی زبان نے تو نہایت بے باکی کے ساتھ دنیا کی تقریباً ہر زبان سے استفادہ کیا ہے۔ اس طرح "دوغلوں" کی فہرست میں انگریزی کا نام تو سب سے پہلے آنا چاہئے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ کیا سنسکرت خالص زبان ہے۔ اگر ایسا ہے تو اُن دراوڑی اور منڈا الفاظ کے متعلق کیا رائے ہے جو ایک بڑی تعداد میں سنسکرت میں داخل ہو چکے ہیں۔ دیکھئے تو سنسکرت ادب کی تاریخ ہوتا یا پھر کو دیکھئے کی بہت سی عربی اصطلاحیں سنسکرت کی ان کتابوں میں ہیں جو ہندوستانی ہیئت کی خاص کتابیں کہلائی جاتی ہیں۔ کیا اردو مخلوط زبان نہیں ہے جس میں افعال تو انڈو آرین ہیں اور اسم فارسی! اور ہندی کیا ہے ــــ کیا تلسی داس، بہاری لال، کیشو اور دوسروں نے عربی اور فارسی لفظ نہیں استعمال کئے ہیں۔ اور کیا نئی ہندی میں انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی، عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ دراوڑی، منڈا اور چینی زبان کے لفظ استعمال نہیں کئے جاتے ہیں۔ دکھنی اردو پر غور کیا جائے جو تقریباً چار سو برس تک ادبی زبان بنی رہی اور اس کے پڑھنے لکھنے والوں نے پراکرت اور فارسی لفظوں کے میل جول کو کبھی مضحکہ خیز نہیں سمجھا۔ یہ سب بالکل ویسا ہی ہے کہ بعض لوگوں کو پیاز کا شوق ہوتا ہے اور بعض کو لہسن کا اور بعض لوگ پیاز اور لہسن کے آمیزے کو پسند کرتے ہیں تو کیا ان لوگوں کو جو پیاز کے شایق ہوں یہ حق ہو سکتا ہے کہ اُن کو برا بھلا کہیں جو لہسن یا لہسن اور پیاز کے آمیزے کو پسند کرتے ہیں۔

پروفیسر جھا کو یہ یقین نہ کر لینا چاہیئے کہ ملک میں اس سنسکرت ملی ہندی کے ہمدرد بہت ہیں۔ ان صوبوں میں جہاں اردو یا ہندی مادری زبان کی طرح نہیں بولی جاتی ہیں، لوگ یہ چاہتے ہیں کہ سارے ہندوستان کے لئے ایک لنگوا فرانکا ہو۔ مجھ کو یقین ہے کہ اُس زبان کی کوئی شکل جو شمالی ہندو اور مسلمانوں میں بولی جاتی ہے یہ مقصد پورا کر سکے گی ان کو یقین نہیں ہے کہ کون سی شکل اختیار کی جائے۔ ایک زمانے میں ڈاکٹر ایس کے چٹرجی، مشہور ماہر لسانیات نے ایک ایسی ہندی یا ہندوستانی کے رواج کے لئے کوشش کی تھی جو تمام نحوی مشکلوں مثلاً افعال کی تذکیر و تانیث وغیرہ سے بری ہو۔ مسٹر ستیا نرائن نے جو جنوبی ہند میں ہندی پرچار کے بہت پُرجوش حامی اور نہ تھکنے والے کارکن ہیں۔ ہندی پرچار سبھا، چارمن جو دکشنی بھارت ہندی پرچار سبھا کا خاص اخبار ہے۔ ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے جو ہندی کو سنسکرت لفظوں سے بھر دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ لکھا ہے اور ان کو متنبہ کیا ہے کہ

"اگر ہم کو ایک ایسی ہی زبان قبول کرنا ہے جو سنسکرت سے بھری ہوئی ہو یا جس میں بڑا حصہ سنسکرت کا ہو تو ہمیں شمال کی زبانوں ہی پر نظر جمانے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ بنگال، مہاراشٹر اور دکن کی زبانیں ایسی غریب نہیں کہ اس لین دین میں ان کا دیوالہ نکل جائے۔ سنسکرت ملانے کی، اس دلیل میں اتنا فائدہ نہیں ہے جتنا بظاہر نظر آتا ہے بلکہ اس کے برعکس نقصان کا زیادہ امکان ہے۔"

کچھ روز ہوئے جب ان صوبوں کے باشندوں نے جہاں ہندی نہیں بولی جاتی یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہندی میں کچھ ادل بدل کیا جائے تو ڈاکٹر دھرندر ورما نے اس مطالبے پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا تھا۔

"واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان بننے کی عزت کے خیال اور اس لالچ نے ہندی والوں کو اس وقت ایک ایسی خود فریبی میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ یا تو اپنی زبان کے اصلی مسائل کو بھلائے بیٹھے ہیں اور یا پھر ان کو صحیح نقطۂ نظر سے دیکھنے کی قوت ہی جاتی رہی ہے

گئی ہے" (دوبنا)

پروفیسر جھا ان چند لوگوں کو خوش کرنے کے خیال سے جو ہندی کو اس لئے پڑھیں گے کہ وہ انگریزی کی جگہ لے کر ہین صوبائی زبان بنے گی۔ اس میں سنسکرت ملانے کی زبردست حمایت کر رہے ہیں لیکن وہ یہ نہیں محسوس کرتے کہ اس طرح سے وہ لاکھوں مسلمانوں کے دلوں میں جو ہندوؤں کے ہمسائے کے طور پر دریائے سندھ سے دریائے کوسی تک اور ہمالیہ سے ست پڑا تک پھیلے ہوئے ہیں دشمنی اور نفرت کا جذبہ پیدا کئے دے رہے ہیں۔

اب میں ان اعتراضوں کا تجزیہ کروں گا جو اردو پر کئے گئے ہیں۔ پروفیسر جھا فرماتے ہیں۔

"اردو ادب کا سارا ماحول غیر ہندوستانی ہے بمشکل ہی سے کوئی دیسی بحر اردو میں مستعمل ہے"۔

یہاں پر مجھے وہ سب دہرانے کی ضرورت نہیں جو اردو کے ہندوستانی ہونے کے متعلق میں اوپر کہہ چکا ہوں لیکن بحر (Metre) کے متعلق اتنا ضرور کہوں گا کہ اول تو کوئی بحر (Metre) کسی زبان سے مخصوص نہیں ہوتی اس لئے کہ زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ بحریں بدلتی رہتی ہیں۔ یہ کیفیت اس قدر عام ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت نہیں لیکن انگریزی اور بنگالی ادب پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انگریزی میں ـــــ جیسا کہ انگریزی ادب کا ہر متعلم جانتا ہے کہ نئے عہد کے شعراء نظم کی مختلف طرز کے تجربے کرنا اپنا شیوہ بناتے رہے۔ اس رجحان کا سب سے تازہ منظاہر (Sprung verse) ہے جس کو جرارڈ ہاپکنس نے پچھلی جنگ عظیم کے دوران میں ایجاد کیا تھا اور جو اب ہارڈی اور برجیز کی ارکانی (Syllabic) نظم کی جگہ عام ہو رہی ہے بنگالی میں پرانے ماترریتیا اور اکشرریتیا کے علاوہ ایک تیسری بحر سوریتیا ہے۔ پہلی بحریں تو شمالی ہندوستان کی اور زبانوں میں بھی ہیں لیکن تیسری بحر جس کی بنیاد دنا لبناتا (Stress) پر ہے بنگالی کے لئے مخصوص ہے بعض ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ یہ عزیز ترین چیز ہے۔

ان باتوں سے قطع نظر اب مجھے یہ بتانا ہے کہ باقافیہ نظم کے لحاظ سے اردو اور ہندی یکساں ہیں اور سنسکرت ان دونوں سے مختلف ہے۔ اس لئے کہ سنسکرت میں باقافیہ نظموں کا وجود ہی نہیں۔ اس کے علاوہ اردو میں گیتوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے کہ ان کے راگ ہندی گیتوں کے راگ جیسے ہیں اور راگوں کی اس یکسانی کی وجہ سے اردو گیتوں اور ہندی گیتوں میں پہچان نہیں کی جا سکتی۔ اس وقت اگرچہ اردو نظم اور ہندی نظم پر کوئی بڑی علمیاتی بحث نہیں کی جا سکی ہے۔ لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ شاعری کی حد تک اردو ہندی سے بالکل مختلف نہیں ہے۔ جو بھی اس کی تصدیق کرنا چاہے۔ ہندی "چوپائی" اور اردو "بحر متقارب" کا موازنہ کر لے۔

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہ اردو کا ماحول بالکل غیر ہندوستانی ہے پروفیسر جھا نے ان لفظوں کا ذکر کیا ہے جو مشہور لغت فرہنگ آصفیہ میں دئیے گئے ہیں۔ مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ذکر جس پیرائے میں کیا گیا ہے وہ بہت گمراہ کن ہے۔ پروفیسر جھا نے اس کا تذکرہ ہی نہیں کیا کہ اس لغت (فرہنگ آصفیہ) میں ۴۵ ہزار سے زیادہ لفظ دئیے گئے ہیں جن میں سے صرف ساڑھے تیرہ ہزار لفظ فارسی اور عربی کے ہیں گویا بدیسی لفظوں کی تعداد کل لفظوں کی چوتھائی ہے۔ اس تناسب کی بنیاد پر کون کہہ سکتا ہے کہ اردو غیر ہندوستانی زبان ہے۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اردو اور ہندی کو دو مختلف زبانیں ثابت کرنے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن، مسٹر سمپورنانند اور ہندی ساہتیہ سمیلن کے دوسرے ادیب الوہر میں یہ بھول گئے کہ اس واقعہ کی تردید ہی ممکن نہیں کہ اردو اور ہندی دراصل ایک ہی بولی جانے والی زبان کی دو مختلف شکلیں یا صورتیں ہیں۔ اسی طرح چھوٹے موٹے مضمون نگار کچھ بھی کہتے پھریں مگر لسانیات کی کسی کتاب سے اس دعوے کی تصدیق نہیں ہو سکتی کہ برج بھاشا، اودھی اور نئی ہندی ایک ہی ہیں۔ زبانوں کی یکسانی کا دارومدار ظاہری مشابہت پر نہیں ہوا کرتا۔

اگر اس وقت ہندی اور اردو کے لکھنے والوں میں ایسے شدت پسندوں کی اکثریت ہے جو اپنے طرز تحریر کو نمایاں اور پر اثر بنانے کے شوق میں دقیق اور غیر مانوس عبارت کے عادی ہیں تو اس کے یہ معنی تو ہرگز نہیں ہو سکتے کہ یہ اکثریت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اردو کے ادیبوں نے ایک زمانے میں صوتیاتی اور لسانی خالصیت کے اصولوں پر غلط طریقے سے کاربند ہو کر عام استعمال کے بہت سے اچھے، سادے اور موثر لفظوں کو ادب سے نکال پھینکا تھا اور اردو الفاظ کی کانٹ چھانٹ کے لئے ایسے قاعدے بنا دئیے تھے جن میں اس رواج کا کوئی لحاظ نہ رکھا گیا جو صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔ یہ انہوں نے بڑی سخت غلطی کی تھی۔ آج ہندی کے حق میں اس سے بھی بڑھ کر غلطی بہت سے ہندی کے ادیب کر رہے ہیں۔ ان میں اس سے بعض تو "ہندوستانیت سے مراد کیا ہے"۔ اس کے متعلق نہایت غلط عقیدہ رکھتے ہیں اور بعض اعلانیہ فرقہ وارانہ تعصب سے متاثر ہیں۔ ہندی والے یہ غلطی چار طرح سے کر رہے ہیں۔

(۱) بدیسی زبانوں کے وہ لفظ نکالے جا رہے ہیں جو نہایت سہل سادے اور عام طور پر بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔

(۲) عام تدبھو کی جگہ سنسکرت تت سم رکھے جا رہے ہیں۔

(۳) مشتقات کے لئے سنسکرت کی قواعد استعمال کی جا رہی ہے جو پراکرتکی فطری ترقی کے مخالف ہے اور ہندی کے صوتیاتی نظام پر بوجھ ہے۔

(۴) سنسکرت کے ذخیرۂ الفاظ سے موزوں اور ناموزوں ہر قسم کے لفظ بلا امتیاز لئے جا رہے ہیں۔

اردو و ہندی کے متعلق صرف یہی درست نہیں کہ اردو میں ہندی کے معمولی لفظوں کی جگہ بدیسی لفظ استعمال کئے جانے لگے بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ نئی ہندی بنی ہی اس طرح کہ اردو میں سے فارسی الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت الفاظ رکھ دیئے گئے اور نئی ہندی تیار ہو گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہندی کے مقابلے میں اردو، ایک بہت شاندار قدامت کی حامل ہے اور اردو والوں کو یہی اصلی شکایت ہے کہ ہندی والے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ایک ہندوستانی زبان کو مٹا کر دوسری نئی گھڑی ہوئی زبان چالو کر دیں۔

یہ کہنا کہ اس طرح اردو، اور ہندی دونوں فطری ترقی کے راستے الگ الگ طے کر رہی ہیں، واقعات کی بہت غلط تاویل ہے۔ اس لئے کہ یہ کسے نہیں معلوم کہ یہ رجحانات زبردستی اور ایک خاص مقصد سے پیدا کئے جا رہے ہیں۔ اردو، اور ہندی کے درمیان خلیج کو بڑھانا در اصل ادبی زندگی میں اس فرقہ واریت کا مظاہرہ ہے جو ہماری معاشرتی اور سیاسی زندگی میں اس قدر سرایت کر گئی ہے میری مخالفت ضرور ہو گی مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سنسکرت ملی ہندی کا پروپیگنڈا کوئی صحت پرور قومی تحریک نہیں ہے کیونکہ اس سے علیحدگی کی پالیسی میں مدد ملتی ہے۔ ہندوستان ایک مرکب ملک ہے۔ یہاں کئی نسلیں، کئی مذہب کئی تمدن اور کئی زبانیں ہیں۔ ہندوستان کی قوم انگلستان، فرانس، اٹلی، یا جرمنی کی قوموں کی طرح ایک وحدانی ہم جنس ادارے کی شکل نہیں اختیار کر سکتی ہندوستان کی مشترکہ لنگوا فرینکا میں ہندوستانی قومیت کے تمام اجزا کی نمائندگی ہونی چاہئے اور اسی لئے ہر وہ کوشش ناکام رہے گی اور تفرقہ برپا کرے گی جو ایسی زبان کو ملک کی قومی زبان بنانے کے لئے کی جائے گی جس کی بنیاد کسی ایک مخصوص تمدن کی روایات پر ہو۔

انہی مشکلات کا اعتراف کر کے انڈین نیشنل کانگرس نے ہندوستانی کو صاف صاف محسوس کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"مجھے اب ذرا بھی شبہ نہیں کہ ہندی اور اردو، کو ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ جانا چاہئے۔ اور چاہے ان کی ظاہری شکل مختلف ہو مگر وہ لازمی طور سے ایک ہی زبان ہو جائیں گی"۔

دونوں فرقوں کی باہمی بیگانگی دور کرنے کی خواہش نے ابھی حال میں مہاتما گاندھی کو یہ کہنے پر مجبور کیا۔

"میں ایک ایسی انجمن بنانا چاہتا ہوں جس کا مقصد یہ ہو کہ اس کے اراکین دونوں بولیاں، اور دونوں رسم خط سیکھیں اور اس کا پروپیگنڈا بھی کریں اور یہ سب اس امید پر کہ بالآخر دونوں مل کر ہندوستانی کے نام سے ایک بین صوبائی زبان بن جائیں اور پھر مساوات یہ نہ ہو گی کہ ہندی + اردو = ہندوستانی، بلکہ مساوات یہ ہو گی — ہندوستانی = ہندی = اردو"

مجھے امید ہے کہ تمام ذی فہم لوگ اس مسئلہ کی طرف دل سے توجہ کریں گے اور اپنی حد تک تو میری بڑی خواہش ہے کہ مہاتما گاندھی کی تجویز کامیاب ہو جائے۔

(ہماری زبان) ڈاکٹر تارا چند

اشعار

روز جاتا ہوں نئے بھیس میں ان کے در پر
روز رکھتا ہوں نیا نام بدل کر اپنا

داغ۔

(۲)

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی اپنے توہمات میں

نقد ونظر

"گنج ہائے گرانمایہ"

مصنفہ پروفیسر رشید احمد صدیقی

مجلّد۔ کاغذ اچھا۔ کتابت وطباعت شگفتہ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ اردو اکیڈیمی۔ لوہاری گیٹ۔ لاہور۔

یہ کتاب رشید صاحب کے آٹھ مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ہندوستان کی بعض نامور ہستیوں کے اٹھ جانے اور اپنے چند مخلص احباب کے داغِ مفارقت دے جانے سے متاثر ہو کر لکھے تھے۔ تقریباً تمام مضامین اس سے قبل وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن بزرگوں اور دوستوں کے انتقال پر ان مضامین میں رنج والم کا اظہار کیا گیا ہے، اُن میں مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری۔ مولانا سید سلیمان اشرف۔ مولانا ابوبکر محمد شیث فاروقی۔ اصغر گونڈوی۔ محمد ایوب عباسی۔ ڈاکٹر اقبال اور مولانا احسن مارہروی شامل ہیں۔ رشید صاحب کی ان سب سے اچھی گہری ملاقات تھی۔ اس لئے کتاب کی ہر سطر میں غم واندوہ کی وہ ناقابلِ کسک موجود ہے جو انسانی قلب صرف اس وقت محسوس کرتا ہے۔ جب کوئی محبت کرنے والا دوست بچھڑ جائے۔ مولانا سید سلیمان اشرف، مولانا ابوبکر، محمد ایوب عباسی اور مولانا احسن مارہروی چونکہ برسوں علی گڑھ میں رہے اور رشید صاحب کا پندرہ بیس سال تک اُن سے مسلسل ساتھ رہا اس لئے اُن کی زندگی کے مرقعے ایسے جیتے جاگتے اور مرصع الفاظ میں کھینچے گئے ہیں کہ پڑھنے والا انہیں اپنے سامنے چلتے پھرتے اور حرکت کرتے محسوس کرتا ہے کردار کو صفحۂ قرطاس پر یوں ابھارنا کہ اُس کی مجسم صورت اور زندگی کا پورا نقشہ سامنے آجائے سیرت نگاری کا کمال ہے۔ ایوب عباسی رشید صاحب کے ایک بے تکلف مخلص اور جاں نثار دوست تھے۔ اس لئے اُن کی سیرت کے خد و خال بیان کرنے میں انہوں نے جس والہانہ شگفتگی کا اظہار کیا ہے۔ اُس سے خود پڑھنے والے کے دل میں نادیدہ ایوب مرحوم کی محبت و شفقت کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان مختصر مضامین میں ہر شخص کے پورے سوانح حیات تو بیان نہیں کئے جا سکتے تھے۔ اس لئے مصنف نے ایک چابکدست صناع کی طرح اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے صرف انہی واقعات وحالات کا ذکر کیا ہے جو مرحوم کے متعلق اُن کے نقطۂ نگاہ کی بخوبی وضاحت کر سکیں۔ تاہم اس اختصار و اجمال کے باوجود زیرِ نظر کتاب میں بعض ایسی دلچسپ باتیں درج ہیں۔ جن کا بہت کم لوگوں کو علم ہے اور جو زیرِ بحث شخصیت کے اعمال و اخلاق اور اُس کے زاویۂ نگاہ کو سمجھنے میں بہت مدد دے سکتی ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال کے متعلق یہ واقعہ کہ جب لیڈی مسعود کی دوسری بچی نادرہ پیدا ہونے والی تھی تو علامہ مرحوم نے جو اس زمانے میں بھوپال میں سر راس مسعود کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے ایک خوش الحان قاری مقرر کرا دیا تھا جو ہر صبح آدھ گھنٹے تک لیڈی موصوف کو قرآن مجید سناتا مرحوم کا خیال تھا کہ ایامِ حمل میں کسی خوش لہجہ قاری سے اگر ماں کلامِ پاک سن لیا کرے تو بچے پر اس کا اثر بہت اچھا پڑے گا۔

رشید احمد صدیقی کی سب سے زیادہ شہرت ایک مزاح نگار کی حیثیت سے ہے۔ اُن کی دو تصانیف مضامینِ رشید اور خنداں مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں۔ گنج ہائے گرانمایہ نے پہلی مرتبہ اُس رشید احمد صدیقی کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے جس کا اسلوبِ تحریر اتنا پرشکوہ اور طرزِ نگارش اتنا پُر زور ہے کہ مضامینِ رشید اور خنداں ہیچ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ موجودہ مجموعہ میں جگہ جگہ حسنِ بیان اور سحرِ تحریر کے لاجواب نمونے نظر آتے

ہیں۔ رشید صاحب کی مزاح نگاری کے متعلق راقم الحروف نے کبھی اچھی رائے قایم نہیں کی اور بغیر کسی ظاہری سبب کے یہ ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ رشید صاحب مزاح نگاری کے لئے وضع نہیں کئے گئے۔ اس رنگ میں وہ جو کچھ لکھتے ہیں بڑی حد تک بے کیف اور بے نمک ہوتا ہے۔ گنج ہائے گرانمایہ کے مطالعہ سے یہ خوشگوار حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ رشید صاحب کی انشا پردازی کا حقیقی اور اصلی میدان یہی ہے۔ جس شخص کو قدرت نے ایسا شاندار اسٹائل عطا کیا ہو وہ اپنی قوتوں کو ارزاں قسم کے مزاحیہ مضامین لکھنے میں صرف کرے ظلم ہے اور ستم۔ ڈاکٹر انصاری کے باب میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"میں ہمیشہ مریض رہا اور ڈاکٹر انصاری سے اپنی تکلیف رجوع کرتا رہا میں جانتا تھا کہ میرا مرض معمولی مرض نہیں ہے اور اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ ایسی حالت میں جب ذہن کی فضا ایسی مٹیالی، نمناک اور غلیظ ہو جاتی جس کو میں اس طرح چھو سکتا تھا جیسے گلی سڑی پھپھوندی کو۔ اس وقت میں ان کے مطب کا رُخ کرتا۔ انتظار میں اکثر زیادہ وقت صرف ہوتا اور میں اُن کے انتظار کے کمرے میں بیٹھا فتحپوری کی دکانوں، گزرنے والوں کی تگ و دو، گاڑیوں اور ریہڑی والوں کے شور و شغب دیکھتا اور سوچتا کہ یہ چہل پہل، یہ لہر بہر یہ مشغولیت یہ خلفشار زندگی ہے جس سے میں ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دیا جاؤں گا۔ زندگی ہی وہ کُل ہے جو اپنے جزو سے مستغنی ہے تو مجھ پر ہراس، مایوسی اور اکثر بغاوت کا جذبہ طاری ہو جاتا اور میں زیادہ بیتابی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا منتظر ہو جاتا۔"

محمد علی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

"محمد علی کے باب میں بعض کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے لیکن اُن کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ یہ تنگ دلوں اور تنگ نظروں کا فیصلہ ہے۔ مرد غازی کے کارنامے کا اندازہ مقبوضات کی وسعت مالِ غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی ہمہمی و طرب انگیزی تمغا و اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے نہیں کیا جاتا ہے۔ ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، دہکتی ہوئی روح اور دمکتے ہوئے چہرے ——— ڈوبتے ہوئے سورج سے!"

کیا اچھا ہو کہ رشید صاحب اب اپنے قلم کی جولانیاں اسی رنگ اور اسی میدان کے لئے وقف کر دیں۔ مضی ما مضی۔ گنج ہائے گرانمایہ بہت ثقیل نام ہے بہتر تھا کوئی آسان اور ہلکا سا نام تجویز کیا جاتا۔

"ع"

مارچ ۱۹۴۲ء
جلد ۲۰
نمبر ۳

فہرستِ مضامین

ایڈیٹر
صلاح الدین احمد
آنریری جائنٹ ایڈیٹر
میراجی

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک و وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ فی پرچہ آٹھ آنے

[illegible] ایڈیٹر و پرنٹر نے مرکنٹائل پریس [illegible] روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ادبی دنیا [illegible] روڈ لاہور سے شائع کیا

گزارشِ احوالِ واقعی

جو حضرات مدت دراز سے کارخانے کی تیار کردہ اشیا استعمال کرتے ہیں اُن سے مخفی نہیں کہ کارخانے سے ۱۹۳۹ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انہوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیا کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیا کی فروخت سے فایدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں اگرچہ بظاہر وہ خوشبوئیں ہمارے مال سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر و تیل سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے بعض وقت اس قسم کی آمیزش باعثِ مضرت ثابت ہوتی ہے۔

اس لئے اپنے ان خریداروں سے خصوصاً جو کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے رہے ہیں اور باقی خریداروں سے عموماً عرض ہے کفایت سے

خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز بھی خالص ہے

کہ محض خوشبو جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے آپ نے ہماری اصلی خوشبو کی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہمارے عطریات اور روغن انگریزی خوشبویات سے پاک ہیں۔

مینیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر حنا بلڈنگ لکھنؤ



ڈونگرے کا بال امرت

کے استعمال سے بچے طاقتور اور تنگے بنتے ہیں یہ مشہور دوا ہے

ضرورت ہے

اور

اس قدر ضرورت کہ سکول فار الیکٹریشنز لدھیانہ کے اکثر ہوشیار طلبہ کو دورانِ تعلیم میں ہی سرکاری ملازمتیں مل جاتی ہیں سکول گورنمنٹ ایڈڈ ہے اور رجسٹرڈ اور جلد روزگار حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ لہذا بجلی کا کام سیکھنے والے طلبا جلد درخواستیں بھیجیں۔ پراسپکٹس مفت

مینیجر

دنیائے کاروبار

اب کی گرمیوں میں اس کو آزمائیے

اخبار "نیو اسٹیٹسمین اور نیشن" کی تازہ ترین اشاعت میں مشہور انگریز ناول نویس "رابرٹ لینڈ" نے "چائے کی پتیوں" کی سرخی دے کر ایک مضمون لکھا ہے کہ چائے کے متعلق کچھ انتہائی درجہ خوشی کی یادگار ہے وہ گاڑھی قسم کی ہندوستانی چائے ہے اس خوشگوار دھن میں وہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ سمندر کے کنارے کسی روز جب سورج کی تپش سے موسم گرم ہو رہا ہو دھوپ میں غسل کرنے، دھوپ میں چلنے پھرنے۔ دھوپ میں لیٹنے کے بعد اگر گھر کے اندر آئیں اور دیکھیں کہ میز مکھن، ڈبل روٹی اور ٹوسٹ سے بھرا ہوا ہے اور اس کے ساتھ عمدہ چائے پینے کے لئے رکھی ہوئی ہے تو دل بلیوں اچھل جاتا ہے۔ ہندوستانی چائے کی ایک یا دو پیالیاں پینا ایک منظر قائم کر دیتا ہے جو آنکھوں کے لئے مسرت ذائقہ کے لئے چاٹ اور تمام جسم کے لئے باعث طاقت ہوتا ہے یہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ اس کا تجربہ کرنے کے متعلق ہے کہاں تو پیشانی پر پسینے کی بوندیں ٹپک رہی ہیں کہاں وہ گرم چائے کا پینا اور ناشتہ کرنا، چائے اور پھر ان لوازمات کے ساتھ ایسی ہی خوشگوار ہے جیسے کہ باہر سورج کی تپش سمندر کی سرد ہوائیں اور بحر اطلانتک کا نیلا پانی مجھے تو دنیا کا ایک بہترین خطہ نظر آ رہا تھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس سے اور بہتر دنیا کیا ہو سکتی ہے۔ چائے کسی وقت بھی پی جائے ایک اچھا موقع اور سماں بنا دیتی ہے شاید یہ ہماری زندگی کو ایک یا دو منٹوں کے لئے آرام پہنچانے کے لئے مجبور کرتی ہے لیکن اگر چائے کا مزہ اٹھانا ہو تو اُسے گرمیوں میں بھی پیا جائے اور چائے خود بھی گرم ہونی چاہیے۔

چائے کی خوبیوں کو نبھانے کا ایک اور سبب یہی ہے سورج میں تپش جس قدر زیادہ ہوئی اتنا ہی چائے کا زیادہ مزہ آئے گا وہ لوگ جو کرۂ زمین کے مقابل جانب رہتے ہیں اُن کے بارے میں مجھے معلوم نہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ چائے کے بارے میں انہوں نے اٹھارھویں صدی کی عادتوں کو اب تک برقرار رکھا ہے وہ ہر وقت ہر جگہ اور ہر موسم میں چائے کو بڑے شوق سے پیتے ہیں اگر ڈاکٹر جانسن آج زندہ ہوتے تو میرا خیال ہے کہ وہ ضرور اسکاٹ لینڈ کے اس پار آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کا سفر کرتے تاکہ صحیح معنوں میں چائے پینے والوں کو تلاش کر سکتے۔

اس نامہ نگار کے مذکورہ بالا خیال سے تو ہم لوگ اسی دنیا میں پہنچ جاتے جہاں صحیح معنوں میں گرم چائے گرمیوں کے دنوں میں بھی پینے والے لوگ ہیں۔

ایمپائر آف انڈیا لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ

کمپنی پینتالیسویں (۴۵) سالانہ رپورٹ اور چیئرمین کی تقریر جو آپ نے اس موقع پر کی ہے ہمارے سامنے ہے جو ظاہر کرتی ہے کہ جنگ کے باوجود کمپنی کے لئے بزنس میں اضافہ ہوا ہے یعنی ۱۳۴۳۸۴۳۵ روپے کی نئی پالیسیاں جاری کی ہیں اور ان کے بھاری بزنس کے باوجود کمپنی کے اخراجات کا تناسب صرف ۲۲ر۶ فی صدی رہا ہے، اس کفایت شعارانہ انتظام کا نتیجہ ہے کہ ۱۸۷۵۶۴ روپے کے اخراجات کے کلیم اور ۱۵۸۵۷۳ روپے کے میعادی کلیم ادا کرنے اور انتظامی اخراجات کے بعد کمپنی کا لائف فنڈ جو سال کے شروع میں ۵۰۲۲ر۳۳۹ روپے سال کے اختتام پر ۵۲ر۸۳۶۲۶۶ روپے پر جا پہنچا ہے اور ریزرو فنڈ کو شامل کر لیا جائے تو یہ ۵۲۲۳۱۵۱۹ روپے ہے اور کمپنی کے ایسٹ ۵۸ر۸۹۰۰۱ روپے کے ہیں کمپنی نے اس سال میں اپنے اسٹاف کو ایک ماہ کی تنخواہ بطور بونس اور حصہ داروں کو ۱۷ روپیہ فی صد بطور منافع دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس شاندار کارکردگی کے لئے ہم منتظمان کمپنی کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مینیجر صیغۂ اشتہارات


ٹیپاٹ کا مہمان نوازی
خاندان کے پینے کی چیز
ہندوستانی چائے
مہمان نوازی کا سب سے بڑا درجہ یہ ہے کہ آپ اپنے مہمانوں کو چائے پلائیے خواہ وہ دن کا کوئی حصہ بھی ہو۔ اسکے پینے کے بعد ایسا سماں پیدا ہوتا ہے کہ یہ مُلاقات ایک بہترین تفریح طبع ہو جاتی ہے۔ چائے دانی ہر وقت مستعد رکھیئے۔ تاکہ وہ اپنا فرض ادا کر سکے اور آپکے مہمان اپنا گھر سمجھیں۔

بزمِ ادب

نئے سائز پر ادبی دنیا کا یہ دوسرا پرچہ ہے ہمیں تفصیلی طور پر معلوم نہیں کہ سائز کی اس جبری تبدیلی کا ناظرین پر کیا اثر ہوا لیکن جن احباب سے ذاتی طور پر ملنے کا موقع ہمیں ملا ہے، ان میں دو قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ ایک فریق نے تو رنج و افسوس کا اس شدت سے اظہار کیا جیسے ادبی دنیا عالمِ فانی سے رخصت ہوگیا ہے اور ہم سے ماتم پرسی کی جا رہی ہے۔ اس فریق کی رائے میں ادبی دنیا کا بند ہو جانا اس کے موجودہ سائز پر چھپنے سے بہتر تھا۔ گویا ادبی دنیا کا جہازی سائز ہی اس کا سب سے بڑا امتیاز تھا۔ اس کے خلاف بہت سے حضرات نے ہمیں مبارکباد دی کہ آخر ادبی دنیا بھی اس معقول سائز پر آگیا جو اور رسائل میں سب سے زیادہ مقبول ہے اور یہ امید ظاہر کی کہ ہم اس سائز پر پرچے کو زیادہ سے زیادہ جاذبِ توجہ بنا سکیں گے۔ ان متضاد آرا کے پیشِ نظر ہم خود کوئی رائے پیش کرنے کی اس وقت تک جرأت نہیں کر سکتے جب تک کہ ہمارے عام ناظرین اس معاملے پر اپنے خیالات کا اظہار نہیں فرماتے۔ ہم ان کی آرا کے منتظر ہیں۔

شمارۂ زیرِ نظر کے مضامین میں پروفیسر کنہیا لال کپور کا مضمون "غالب جدید شعراء کی ایک مجلس میں" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ پروفیسر صاحب اپنے اندازِ بیان کی شگفتگی اور بے ساختگی کے باعث اردو کے طنز نگاروں میں ایک بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ہمارے ناظرین ان کی تحریر کے چند دل آویز نمونے اس سے پہلے بھی ملاحظہ کر چکے ہیں۔ کپور صاحب ہماری بزم میں آتے ہیں تو انہیں دیکھ کر جہاں ہم میں سے اکثر کے چہرے کھل اٹھتے وہاں بعض کے زرد بھی پڑ جاتے ہیں۔ شاید اس دشنۂ پنہاں کو دیکھ کر جو ان کی آستین میں سے کبھی کبھی جھانک لیتا ہے۔

ابو مسلم صاحب صدیقی ادبی دنیا کے پرانے کرم فرما ہیں۔ زیرِ نظر اشاعت میں ان کا ایک قیمتی مضمون "اردو مرثیہ کا وجود و ارتقاء" شامل ہے۔ صاحبِ مقالہ نے مباحث کی ترتیب و تقسیم میں خاص کاوش سے کام لیا ہے۔ اور چند ان مراثی کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن کا موضوع غمِ حسین نہیں بلکہ غمِ اعزا و احباب ہے۔ افسوس ہے کہ اس سلسلے میں صاحبِ مضمون کچھ رک سے گئے ہیں۔ ورنہ وہ ذرا اور آگے بڑھتے تو انہیں یہ گلزار بھی جلوہ ہائے رنگا رنگ سے معمور نظر آتا۔ امید ہے کہ کسی آئندہ مقالے میں وہ اس کمی کو پورا کر دیں گے۔

افسانوں میں اُپیندر ناتھ صاحب اشک کا افسانہ "ابال" ناظرین کی خاص توجہ کا مستحق ہے۔ اشک صاحب کم و بیش ایک سال کے بعد ہماری محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر کچھ تعجب ہوا کہ اس قلیل عرصے میں ان کی تحریر میں ایک خاصہ انقلاب آگیا ہے ان کے کرداروں کے جذبات زیادہ گہرے ہو گئے ہیں ان کی بیانیہ کہانی اپنے نشیب و فراز سے کچھ ہٹ کر نفسی تجزیے کی پُر پیچ راہوں میں داخل ہو گئی ہے۔ اندازِ بیان میں شگفتگی کا رنگ جھلکنے لگا ہے اور تشبیہات نے ایک استادانہ پختگی اختیار کر لی ہے۔ "ابال" ہماری رائے میں ان کی فن کاری کے راستے پر ایک اہم سنگِ میل ہے یہاں سے کچھ ایسی بلندیاں شروع ہوتی ہیں جن کے افق ابھی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ لیکن آثار کہے دیتے ہیں کہ ان کی اوٹ میں پُر بہار وادیاں اور شاداب مرغزار کروٹیں لے رہے ہیں۔

صلاح الدین احمد

دھیان سہارے

اوٹ پٹانگ خیالوں کی گر ذہن میں لہر اٹھلاتی ہے بل پہ تصوّر کے گر یونہی میرا جنازہ اٹھاتی ہے
مجھ کورا جلکمار کوی اک پچھلے جنم کا بتاتی ہے یا پھر میری شخصیّت اقبال سے لگا کھاتی ہے
آمد اُن کی ہوائی قلعے، دیکھتے دیکھتے ڈھاتی ہے حسن فلسفہ داں کی عنایت تجزیہ کر کے دکھاتی ہے

کہتے ہیں "اِس سے دُور رہو یہ صحت مند افتاد نہیں یہ عارضہ نفسی پیچ کا ہے اور پچھلے جنم کی یاد نہیں
ہیرو سے "فرد کی رغبت" پر تحلیل نفس کا صاد نہیں جبر کے دام سے اپنا جنازہ لوگوں کا غم آزاد نہیں
فطرت ہو ہزیمت خوردہ اگر تو دستے حقائق داد نہیں سُکھ پانے کو ایسی فطرت ایسا جادو جگاتی ہے"!

میز پہ گھونسہ وقفے سے تدلیل کو قوت دیتا ہے رخسار کا دہکا رنگ مجھے تسلیم کی دعوت دیتا ہے
بولنے میں ہونٹوں کا تنا دُشمنوں کو رخصت دیتا ہے تیوری کا بل بحث کو ان کی طبع کی حدّت دیتا ہے
آنکھوں کا چمکنا اِک سپنے کو رنگِ حقیقت دیتا ہے الغرض اُن کی سعیٔ تجزیہ عارضہ میرا بڑھاتی ہے!

مختار صدیقی

اردو مرثیہ کا وجود اور ارتقاء

لکھنؤ میں ایک زمانے میں مثل مشہور تھی کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویّا مرثیہ خوان" لیکن یہ ہماری اس علمی بدمذاقی کا نمونہ ہے جس نے لوگوں کو یقین دلا دیا ہے کہ اردو شاعری میں زلف و خط و خال کنگھی چوٹی، ہجر و وصال اور جھوٹی خوشامد اور مداحی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ میر تقی کا تغزل، درد کا تصوف غالب کا فلسفہ شاعری کی جان ہیں لیکن وائے قسمت کہ ان دُرہائے بے بہا میں سے بھی ہم صرف خالی سیپیاں اور گھونگھے ہی چُن کر خوش ہوتے ہیں۔

یہ مسئلہ نہایت دقیق ہے کہ شاعری کیا چیز ہے۔ مولانا شبلی کی رائے جس سے اکثر علماء اتفاق کرتے ہیں یہ ہے "کہ شاعری کے دو جز ہیں۔ مادہ و صورت یعنی کیا کہنا چاہیئے اور کس طرح کہنا چاہیئے۔ انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے، سننے یا کسی حالت یا واقعہ کے پیش آنے سے جوش و مسرت عشق و محبت، درد و رنج، فخر و ناز، حیرت و استعجاب، طیش و غضب وغیرہ کی حالت طاری ہوتی ہے اس کو جذبات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان جذبات کا بیان کرنا شاعری کا اصل ہیولیٰ ہے۔ اس کے سوا عالم قدرت کے مناظر، مثلاً گرمی و سردی، صبح و شام، بہار و خزاں، باغ و راغ، دشت و کہسار، صحرا و بیابان کی تصویر کھینچنا یا عام واقعات اور حالات کا بیان کرنا بھی اس میں داخل ہے لیکن شرط یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ اس انداز سے کہا جائے کہ جو اثر شاعر کے دل میں ہے وہی سننے والوں پر بھی چھا جائے۔ یہ شاعری کا دوسرا جز یعنی اس کی صورت ہے۔ اور انہیں دونوں اجزا کے مجموعے کا نام شاعری ہے"۔

شاعری کی اس تعریف کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ صنف سخن جس میں ان تمام باتوں کا بیان ایک ساتھ ہو سکتا ہے مرثیہ ہے اور اصلاً مرثیہ ہی کو فطری شاعری کہہ سکتے ہیں۔

دنیائے شاعری میں شعر کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی کیونکہ یہ امر محتاج ثبوت نہیں کہ فارسی اور اردو شاعری کا سرچشمہ عرب کی شاعری ہے اور عرب میں شاعری کی ابتدا بالکل فطرت کے اصول پر ہوئی کیونکہ جو جذبات دلوں میں پیدا ہوتے تھے وہی شعر میں ادا کر دیئے جاتے تھے۔ عرب میں چونکہ شاعری کی ابتدا اظہار جذبات سے ہوئی تھی اور غم کا جذبہ سب سے قوی تر ہے۔ اس لئے سب سے پہلے شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی جو سب سے قوی جذبہ کا اثر ہے۔

مرثیے عین اس حالت میں کہے جاتے تھے جبکہ شاعر کا دل درد و غم سے لبریز ہوتا تھا۔ مرثیہ کا مقصد متوفی کے محامد اور فضائل کا بیان کرنا ہے۔ قصیدہ اور مرثیہ میں صرف فرق اتنا ہے کہ قصیدہ زندہ آدمی کی تعریف میں کہا جاتا ہے اور مرثیہ جس میں تاسف اور افسوس بھی شامل ہوتا ہے۔ مردہ کی تعریف میں جس کا مقصد اس کی یاد کو دنیا میں تازہ رکھنا ہوتا ہے

نام نیکِ رفتگاں ضائع مکن تا بماند نام نیکت برقرار

تاریخ ادب اس کی شاہد ہے کہ جو مرثیہ ایسی ہستی کا لکھا گیا جو کہ شاعر کو دنیا میں سب سے زیادہ محبوب تھی اس سے زیادہ مؤثر کوئی دوسرے اشعار نہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ جو کچھ اہل بیت کی تعریف و توصیف یا زندگی و مصیبت کے متعلق اور وہ بھی واقعہ کربلا سے مخصوص ہو۔ مرثیہ ہے لیکن ایسا سمجھنا غلطی ہے۔ اصلاً جو کچھ کسی متوفی کی زندگی کے متعلق حزیں انداز سے کہا جائے وہی مرثیہ ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرثیہ کا اطلاق انہیں اشعار پر کیوں ہوتا ہے جو واقعہ کربلا سے متعلق ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کربلا [illegible] سا سانحہ اور ٹریجڈی دنیا کی تاریخ اب تک نہ پیش نہ کر سکی ہے اور نہ کر سکے گی بس اس واقعہ کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے گا سننے والے کے دل پر فطری طور پر ضرور اثر کرے گا۔ دوسرے یہ کہ اہل اسلام کو جو محبت آل رسول سے ہو سکتی ہے اور غیر شخص سے نہیں ہو سکتی لہٰذا جو کچھ ان کے متعلق کہا جائے گا اثر سے خالی نہ ہوگا۔ اور مرثیہ کا کام ہی یہ ہے کہ جو جذبات شاعر کے دل میں ہوں وہی سننے والوں کے دل میں بھی پیدا ہو جائیں۔ اور چونکہ نہ تو ہمارے پاس عرب شاعروں کے سے مؤثر الفاظ کا ذخیرہ ہی ہے کہ جن کے سننے سے غیر شخصوں اور ان غیر شخصوں کے کہ جو متوفی کے نام سے بھی واقف نہ تھے آنسو ٹپک پڑتے تھے۔ اور نہ ہمارے دل ہی درد سے لبریز ہیں کہ غیروں کی موت کے حالات سن کر آنسو بہانے لگیں۔ جیسا اگر کسی کا مرثیہ

سامنے آجاتا ہے تو پڑھ کر کوئی اثر اور کیفیت دل پر طاری نہیں ہوتی۔ لہذا میر انیس اور دیگر اردو شعرا کا یہ فعل قطعی حق بجانب تھا کہ انہوں نے مرثیہ کو صرف واقعہ کربلا کے لیے مخصوص کر دیا۔

موجودہ تحقیقات کی رُو سے محمد علم

ہندوستان میں شاعری کی ابتدا ولی دکھنی سے ہوئی۔ ان کے مجموعۂ کلام میں اگرچہ کربلا کے حالات کے بارے میں ایک مثنوی مل جاتی ہے مگر مرثیہ کا کہیں ذکر نہیں یہ امر نامعلوم ہے کہ اردو شاعری میں مرثیہ کی ابتدا کس نے کی لیکن اس قدر یقینی ہے کہ سودا اور میر سے پہلے اردو شاعری میں مرثیہ کا رواج ہو چکا تھا۔ سودا نے اپنے شہر آشوب میں میاں مسکین مرثیہ گو کا ذکر کیا ہے ؎ اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے۔

مرثیہ میر تقی نے بھی کہا ہے۔ اگرچہ ان کے دیوان میں موجود نہیں۔ مگر سودا کا اس مرثیے کا لکھنا ان کے مرثیہ کے وجود پر پُر زور دلالت کرتا ہے۔ اس وقت تک مرثیے چومصرعے ہوتے تھے لیکن سودا نے مسدس لکھا اور اس طرح اردو کے مرثیہ کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کا سہرا سودا ہی کے سر ہے۔ میر انیس کا یہ شعر

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

ہمیں بتاتا ہے کہ ان کے پر دادا میر ضاحک اور میر حسن نے بھی مرثیہ لکھا ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا تعجب تو یہ ہے کہ میر تقی اور سودا جیسے قادرالکلام شعرا نے مرثیہ کو کوئی نمایاں ترقی نہیں دی اور میر ضاحک تک یہ فن گویا ابتدائی حالت میں ہی رہا سودا کا یہ بند اس کا ثبوت ہے

خویش و فرزند و عزیز اس کے تھے جتنے پیارے   دشنہ و تیغ سے ہیں ظالموں کے سب مارے
اہلبیت اس کے جو باقی ہیں سو ہیں آوارے   قید میں کوفیوں کی جاتے ہیں وہ بیچارے
نہ انہیں چین ہے دن کو نہ انہیں رات آرام
اس مصیبت میں چلے جاتے ہیں کربل سے شام

یہ خیال کہ اس زمانے میں لوگ مرثیہ کو مذہبی فرض قرار دے کر کہتے تھے یا صرف رونے رلانے کا مقصد خیال کرتے تھے۔ سودا کے مندرجہ ذیل بیان سے رد ہو جاتا ہے

" لیکن بہ تشکل تزیین دقائق، طریقۂ مرثیہ کا معلوم کیا کہ مضمون کو ہزار رنگ میں ربط معنی دیا اس کام میں محتشم سا کسو نے عز قبول نہیں پایا۔ پس لازم ہے کہ مرثیہ مدنظر رکھ کر مرثیہ کہے نہ کہ برائے گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے"

مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنانے کا سہرا میر ضمیر، مرزا دبیر کے استاد کے سر ہے۔ میر ضمیر نے سوز کو چھوڑ کر مرثیہ کو تحت اللفظ میں پڑھنے کا رواج دیا۔ نئی تشبیہات استعارہائے لطیف، مبالغہ، واقعہ نگاری، غرض جتنے محاسن میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام میں ملتے ہیں۔ سب میر ضمیر کے یہاں موجود ہیں مگر میر ضمیر کے یہاں ان کا رنگ ہلکا ہے اور انیس اور دبیر نے اس رنگ کو کافی شوخ کر دکھایا ہے میر ضمیر کے چند شعر ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

چیر کر فوج کو اس پار سے اس پار گئے   میں نے خود دیکھا کہ دریا پہ کئی بار گئے

پانی تو پی نہیں حیدر کے نواسے آئے   بولے عباس کہ پیاسے گئے پیاسے آئے

چاہتا تھا کہ کروں ضبط پہ چپ رہتا تھا   پوچھو اکبر سے میں ہر بات پہ کیا کہتا تھا

جا کے میدان میں کس طرح یہ محبوب لڑے   یہ تو کہئے کہ غلام آپ کے کچھ خوب لڑے

میر ضمیر نے گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں بھی بند کہے ہیں۔ گھوڑے کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

گھوڑا وہ تیز رو تھا کہ نا گاہ ایک بار   اتنا کہا تھا وہم نے یاں چل تو راہوار
دو لوں نے ہم عنانی سرعت کی اختیار   آخر کہاں وہ اور کہاں وہم ہرزہ کار
کچھ کچھ تو ساتھ ساتھ وہ مفقود ہو گیا
پھر یہ خبر نہیں کہ کہاں تھا کدھر گیا۔

اس زمانے میں میر خلیق نے بھی اس فن کو نمایاں ترقی دی۔ میر انیس انہیں کے بیٹے تھے۔ جو دنیائے مرثیہ کے آفتاب ہو کر چمکے اور جن کا نام رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔ میر انیس کے مراثی میں علاوہ درد و اثر کے اور دوسری شاعرانہ خصوصیات کی بھی کمی نہیں۔ اور علاوہ درد انگیز اور موثر ہونے کے واقفیت کے پہلو میں اس قدر ڈھلے ہوئے ہیں کہ کہیں سے حرف گیری نہیں ہو سکتی وہ مضامین جن سے کوئی مرثیہ خالی نہیں۔ یہ ہیں۔ آمادگیٔ سفر، راہ کی تکلیفات اور صعوبتیں، قیام گاہ کا انتظام، خیموں کی روک ٹوک، معرکہ کی تیاریاں، رزم آرائی، رجز، حریفوں کا جدال و قتال، دشمنوں کی فتح، اہل حرم کی بیکسی بیچارگی، شام کا سفر، قید خانہ اور دربار کی حاضری، اس کے علاوہ رات کی ہولناکی اور گرمی کی شدت کے بیانات بھی ہر جگہ ہر مرثیہ میں ملتے ہیں لیکن میر انیس کے کلام میں یہ وصف بدرجۂ اتم موجود ہے کہ پڑھ کر یا سن کر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو دیکھنے سے ہوتی

پھر حفظِ مراتب کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ میر انیس اس باب میں سب پر فوقیت رکھتے ہیں۔ میر انیس کے یہاں ان شاعرانہ خصوصیات کی بھی مثالیں ملتی ہیں جو اس زمانے میں دنیائے شعر میں رائج تھیں مثلاً ایہام و رعایت لفظی و مبالغہ وغیرہ۔ حضرت امام حسین کی پیدائش کے ساتھ جو برکتیں نازل ہوئیں ان کا اثر یوں دکھاتے ہیں۔

اے کعبۂ ایماں تیری حرمت کے دن آئے   اے رکن یمانی تری شوکت کے دن آئے
اے بیت مقدس تری ہو اسک کے دن آئے   اے چشمۂ زمزم تری چاہت کے دن آئے
اے سنگِ حرم جلوہ نمائی ہوئی تجھ میں
اے کوہِ صفا اور صفائی ہوئی تجھ میں

مناجات میں خداوند کریم سے دعا کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اے خدا تو مجھے ایسی قوتِ گویائی دے کہ:۔

تعریف میں چشمہ کو سمندر سے ملا دوں   قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرے کی چمک مہرِ منور سے ملا دوں   خاروں کو نزاکت میں گلِ تر سے ملا دوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

علاوہ شاعرانہ خصوصیات کے مرثیے میں اخلاق کے بھی نادر الوجود نمونے ملتے ہیں اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ:۔

"مرثیہ شعریت اور اخلاق کے بلند ترین نصب العین پیش کرتا ہے۔"

"تاریخ میں یونانی بچوں کی ان ماؤں کا اخلاق بہت سراہا گیا ہے جو بخوشی اپنے خورد سال بچوں کی پیٹھوں پہ کوڑے پڑتے ہوئے دیکھ کر اور کوڑے کی ہر ضرب کے ساتھ ان کو متبسم دیکھ کر خود بھی دریائے تبسم میں غوطہ زن ہو جاتی تھیں لیکن کیا یہ مائیں کسی طرح بھی ان ماؤں کی ہمسری کر سکتی ہیں جنہوں نے اپنے جگر گوشوں کو برچھیوں کی انی سے چھدتے ہوئے ان کا سینہ پتھروں سے فگار ہوتے، ان کا سرِ تن سے جدا ہوتے دیکھا اور باوجود اپنی تباہی کے یقین داثق کے دل پر میل لانا تو درکنار ذرا خیال بھی نہ کیا کہ انہوں نے انہیں اپنا خونِ جگر پلا کر پالا تھا کیا یہ ان کے جگر گوشہ نہ تھے کیا یہ اپنی ماؤں کے لال نہ تھے مگر کیا مجال کہ ان کی ماؤں کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ بھی ٹپکا ہو۔

ذرا اس وقت پر نظر کیجئے کہ حضرتِ عباس اپنی لاڈلی بھتیجی کی پیاس سے مضطرب ہو کر نہر پر جاتے ہیں۔ اُن کی زبان پیاس سے خشک ہو چکی ہے حلق میں کانٹے پڑ گئے ہیں۔ سامنے شفاف پانی موجیں مار رہا ہے۔ آپ مشک بھرنے کے لئے پانی میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ پانی کی خنکی آپ کی پیاس کو اور بھی بھڑکا دیتی ہے۔ مگر کیا مجال کہ ایک گھونٹ خود پی لیں۔ اس کی وجہ صرف ان کا اخلاق تھا اور صرف یہ خیال تھا کہ آخر اور لوگ بھی تو پیاسے ہیں پہلے ان کے حلق تر کر لوں تب اپنے منہ میں بھی چند قطرے چوالوں گا۔

دیکھ کر پانی کو یاد آگئی بچوں کی پیاس   آبدیدہ ہوئے صدمے سے جنابِ عباس
اس عطش میں تھا نہ بس تشنگیٔ شاہ کا پاس   مشک لی کاندھے سے منہ پھیر لیا حسرت و یاس
تسمہ غازی نے بصد رنج و محن کھول دیا
مشک نے دیکھ کے پانی کو دہن کھول دیا

مناظرِ قدرت پر عربی اور فارسی میں بہت کم لکھا گیا ہے اور میر انیس اور مرزا دبیر سے پہلے گویا اردو میں تو اس کا وجود ہی نہ تھا میر انیس نے صرف اس کو شروع ہی نہیں کیا بلکہ جو کچھ بھی کہا ہے کمال کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔ صبح کا سماں یوں پیشِ نظر کیا ہے۔

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح   ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح   ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

تھی دشتِ کربلا کی زمیں رشکِ آسماں   تھا دور دور تک شبِ ماہتاب کا سماں
چھٹکے ہوئے ستاروں پہ ذروں کا تھا گماں   نہرِ فرات بیچ میں تھی مثلِ کہکشاں
سرسبز جو درخت تھا وہ مثلِ طور تھا
صحرا کے ہر درخت کا سایہ بھی طور تھا

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دم بدم   مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم   سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم

واہ کیا شعر ہے۔ محاکات کی اس سے بہتر مثال ملنی مشکل ہے۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا   تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

فارسی شعرا نے گرمی کی تعریف میں بہت مبالغے کا تصرف کیا ہے لیکن میر انیس نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ اگرچہ جگہ جگہ نیچر سے تجاوز کر جاتا ہے لیکن پھر بھی خوب ہے۔ اور انیس کی ہمہ گیری پر دلالت کرتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا   کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

آبِ رواں سے مُنہ نہ اٹھاتے تھے جانور — جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر — خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر

اور یہ شعر تو ضرب المثل سا ہوگیا ہے۔ مبالغہ کی ایسی لطیف مثال ملنی مشکل ہے۔

گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں — پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

گرمی کی اس سے بہتر تعریف اور کن الفاظ میں ہوسکتی ہے۔

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے — آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے — گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

اس بند پر ایک اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ جب گرمی کی یہ شدت تھی کہ زمین پر گرتے ہی دانہ بھن جاتا تھا تو پھر سبزہ زار کس طرح باقی رہ گئے تھے کہ جس سے غزال منہ نہ اٹھاتے تھے۔

میر انیس کی واقعہ نگاری کو بھی کوئی دوسرا فارسی یا اردو شاعر نہیں پہنچتا۔ میر انیس کے یہاں ہر موضوع پر اُس کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ مثلاً نزع کی حالت، گرمی کی شدت میں لوگوں کی حالت۔ صغیر سن بچے کی حالت عالم نزع میں یوں بیان کرتے ہیں۔

چھاتی میں دم بدم جو دم اس کا اُکھڑتا تھا — گھبرا کے ننھے ہاتھوں کو دے دے ٹپکتا تھا

فوجوں کی آمد اور تیاری، سفر کی تیاری، حضرت امام کی بیکسی و تنہائی کے نقشے بھی مؤثر الفاظ میں پیش نظر کئے ہیں۔

ایک موقع پر دکھاتے ہیں کہ حضرت عباس دریا پر پہنچ گئے ہیں، گھوڑا بھی کئی دن سے پیاسا تھا مگر چونکہ اہلِ بیت کا تمام قافلہ کئی دن سے پیاسا تھا اس لئے حضرتِ عباس اسے بھی پانی نہیں پلانا چاہتے۔ گھوڑے کی حالت پانی کو دیکھ کر کیا سے کیا ہوگئی۔ میر انیس اس کا سماں یوں کھینچتے ہیں۔

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند — دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند — چمکارتے تھے حضرتِ عباس ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

کیا واقعہ نگاری کو انتہائی عروج پر نہیں پہنچا دیا ہے۔

تلوار کی تعریف یوں کرتے ہیں

افلاک پہ چمکی کبھی سر پر کبھی آئی — کوندی کبھی جوشن پہ سپر پر کبھی آئی۔
گہ پڑ گئی سینے پہ جگر پر کبھی آئی — تڑپی کبھی پہلو پہ کمر پر کبھی آئی
طے کر کے پھری کونسا قصہ تھا فرس کا
باقی تھا جو کچھ کاٹ وہ حصہ تھا فرس کا

بے پاؤں جدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی — ندی اِدھر اک خوں کی اُبلتی ہوئی آئی
دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی — پی پی کے لہو لعل اُگلتی ہوئی آئی
ہیرا تھا بدن رنگ زمرد سے ہرا تھا
جوہر جو لہو پیٹ جواہر سے بھرا تھا

سودا اور ذوق اور نیز فارسی کے مشہور قصائد میں بھی تلوار کی تعریف ملتی ہے مگر ان اشعار کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ میر انیس کے رزمیہ پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ تاریخی پہلو سے واقعہ کے خلاف ہے کیونکہ ایک طرف صرف ۷۲ آدمی دوسری طرف ہزاروں کا نرغہ۔ بھلا مقابلہ کیا تھا۔ تین چار گھنٹے میں جنگ کی دیوی کے قدم انسانی خون کی بارش سے بخوبی دھل گئے۔ میر انیس کا یہ کہنا کہ ایسی جنگ ہوئی کہ زمین تھرا گئی، آسمان کانپنے لگے پہاڑ جگہ سے ہٹ گئے۔ دریا اُبل پڑے۔ فرشتے آسمانوں میں چھپتے پھرتے تھے۔ واقعی واقعیت سے دور ہے لیکن اس وقت ہمارا مقصد مرثیہ کی شعری خصوصیات کا پیش کرنا ہے۔ اور چونکہ میر انیس کا دل ایسے جذبات سے پُر تھا اور ان کو ان تمام واقعات پر یقین کامل تھا۔ اس لئے انہوں نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ جوش اور رنگ سے خالی نہیں اس لئے قابل بیان ہے۔

غرض جہاں تک اس قسم کے مراثی کا تعلق ہے میر انیس نے ان کو انتہائی عروج پر پہنچا دیا۔ مرزا دبیر بھی اس معاملے میں ان کے ہم پہلو رہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ میر انیس اور میرزا دبیر کا عہد اردو مراثی کا عہد زریں تھا، صرف یہ ہی نہیں بلکہ ان دو قابل رشک ہستیوں نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی کہ اردو شاعری میں کس حد تک گنجائش ہے اور اس سے کیا کیا اعلیٰ مقاصد پورے کئے جاسکتے ہیں۔ واقعی کونسی صنف سخن ہے جو ان مراثی میں نہیں پائی جاتی۔ میر انیس کی شاعری کی تعریف ان ہی کے ایک بند سے کرتا ہوں۔

ہے لعل و گہر سے یہ دہن کانِ جواہر — ہنگام سخن کھلتی ہے دُکانِ جواہر
ہیں بند مرصع تو ورق خوانِ جواہر — دیکھے اسے یاں ہے کوئی خواہانِ جواہر

بنائے رقومات ہنر چاہئے اس کو
سودا ہے جواہر کا نظر چاہیئے اس کو

دراصل میر انیس کے بعد اردو شاعری میں واقعۂ کربلا کے مراثی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور شعرا نے، اس لئے اس میدان میں توسن فکر کو گامزن نہ کیا کیونکہ میر انیس سے آگے نکل جانا تو درکنار ان کی گرد کو بھی نہ پا سکتے تھے۔

اب ہم ان مراثی کا ذکر کرتے ہیں جن کو واقعۂ کربلا سے کوئی تعلق نہیں غالب جیسے مایہ ناز شاعر کے اردو دیوان میں کوئی مرثیہ نہیں اور جو دو مرثیے ہیں ان کو اگر مرثیہ کہنا غلط نہیں ہے تو صحیح بھی نہیں۔ ہاں حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے کہ مرزا نے ایک فرمائش پر تین بند سید الشہدا کے مرثیہ کے بطور لکھے تھے اور پہلا بند یادگار غالب میں یوں درج ہے۔

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو   اے دجلۂ خوں چشم ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو   اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

مرزا نے ساتھ ہی اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں۔ یہ ان لوگوں کا حصہ ہے جنہوں نے اس وادی میں عمریں بسر کر دیں۔ ان کا قول تھا کہ ہندوستان میں انیس و دبیر جیسے مرثیہ گو نہ ہوئے ہیں نہ ہوں گے۔

اس کے علاوہ مرزا کے اردو دیوان میں دو مرثیے اور ہیں ان میں سے ایک مرثیہ ان کے ایک عزیز قریب عارف نامی کا ہے جن سے مرزا کو انتہائی محبت تھی۔ جب وہ جوان عمر میں فوت ہوئے تو مرزا کو نہایت قلق اور رنج ہوا اور انہوں نے ایک غزل بطور رزنہ لکھی جو عارف کے مرثیہ کے نام سے مشہور ہے۔ غزل واقعی دردناک ہے اور چند شعر قابلِ تعریف ہیں اور یہ شعر تو ضرب المثل سا ہو کر رہ گیا ہے۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے   کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

اس کے علاوہ غالب کے اردو دیوان میں ایک غزل اور ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ انہوں نے اپنے معشوق کے مرثیہ کے بطور لکھی ہے۔ اس میں غالب نے ایک حد تک مرثیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی ردیف بھی "اے لئے" رکھی ہے لیکن غالب جیسے شاعر اور فلسفی کو اپنے جادو نگار قلم سے جیسی عکاسی اور مصوری بے ثباتیِ دنیا، اور نیرنگیِ زمانہ کی کرنی چاہئے تھی۔ اس سے یہ مرثیہ بالکل مبرا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں اور ساتھ ہی معشوق کی تعریف بھی کرتے ہیں۔

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا   عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

معشوق کے بعد دنیا میں اپنا وجود بے کار خیال کرتے ہیں اور تمام دنیا سے ناراضی و بیزاری کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی   یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

اپنے رنج و غم کا اظہار اور اپنی بے کسی کا ذکر کس خوبی سے کرتے ہیں۔

گوش مہجورِ پیام و چشم محروم جمال   ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

لیکن ان تمام اشعار میں غزل کی شان نمایاں رہتی ہے اور غزلیت مرثیت پر غالب ہے۔

حالی نے یوں تو ایک طور پر بالکل قوم کا مرثیہ ہی گایا ہے مگر ہاں غالب جیسے یکتائے روزگار اور قادر الکلام شاعر کی موت پر جو کچھ کہا ہے وہ واقعی جذبات اور رنگ و کیفیت سے خالی نہیں۔ حالی نے اس مرثیہ میں مرثیہ کے تمام لوازم ادا کر دیئے ہیں۔ یعنی پہلے تو دنیا کی بے ثباتی، اور بے وفائی، اور ناحق شناسی، کے مناظر دکھا کر دل کو گداز کرتے ہیں۔

پھر چونکہ خود بھی مبتلائے رنج و غم ہیں اس لئے دنیا سے اپنی بیزاری کا منظر یوں پیشِ نظر کرتے ہیں۔

عیش دنیا سے ہو گیا دل سرد   دیکھ کر رنگ عالمِ فانی
کچھ نہیں جز طلسم خواب و خیال   گوشۂ فقر و بزمِ سلطانی
ایک دھوکا ہے لحنِ داؤدی   اک تماشہ ہے حُسنِ کنعانی
نہ کر دل تشنگی سے تر لبِ خشک   چشمۂ خضر کا ہو گر پانی
لوں نہ اک مشت خاک کے بدلے   گر ملے خاتمِ سلیمانی
بحرِ ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

پھر جیسا کہ ایک مرثیے کے لئے ضروری ہے مرنے والے کی وسعتِ اخلاق، عالی ہمتی، ذوقِ سلیم، اور سخاوت وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔

نکتہ داں، نکتہ سنج نکتہ شناس   پاک دل پاک ذات پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج   رند اور مرجع کرام و ثقات
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا   قلم اس کا تھا اور اس کی دوات
لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھول   سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

فرماتے ہیں کہ اس کے مرنے سے دلی میں رہ ہی کیا گیا۔

تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں — سے چلیں اب وطن کو کیا سوغات
اس کے مرنے سے مرگئی دلی — خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

اس کے بعد انہوں نے غالب کو اس لباس میں پیش کیا ہے جس میں وہ حلقۂ سخن سنجاں میں نظر آتا ہے یعنی "شاعر" اور "ادیب"۔ اور دوسرے شعرائے کرام سے اس کا مقابلہ کرتے ہوئے غالب کی کتنی سچی تعریف کی ہے۔

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح — اہل انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم — لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے — ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

پھر غالب کی بے مثل نثر نگاری اور دلفریب نظم کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

نثر و حسن و جمال کی صورت — نظم غنج و دلال کی صورت
تہنیت ایک نشاط کی تصویر — تعزیت ایک ملال کی صورت

غالب کی موت کا کیا اثر ہوا۔

چشم دوراں سے آج چھپتی ہے — الوری و کمال کی صورت
لوح امکاں سے آج مٹتی ہے — علم و فضل و کمال کی صورت

پھر تمام شہر کو ان کے رنج و غم میں سوگوار اور اشکبار دیکھ کر کس مؤثر طریقے سے تعریف کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

نازش خلق کا محل نہ رہا — رحلت فخر روزگار ہے آج
تھا زمانے میں ایک رنگیں مزاج — رخصت موسم بہار ہے آج
بار احباب جو اٹھاتا تھا — دوش احباب پر سوار ہے آج

اہل ہند اب کریں گے کس پہ ناز — رشک شیراز و اصفہاں نہ رہا

اٹھ گیا تھا جو مایہ دار سخن — کس کو ٹھہرائیں اب مدار سخن

غالب کی عالی ہمتی، ان کا قابل تقلید اخلاق، سخاوت اور مروت اور ساتھ ہی ساتھ ان کی دنیاوی تنگ دستی عسرت و بے بسی کا بیان بھی کس خوبی سے کرتے ہیں۔

بے صلہ مدح شعر بے تحسیں — سخن اس کا کسی پہ بار نہ تھا
نذر سائل تھی جان تک لیکن — درخور ہمت اقتدار نہ تھا
ملک و دولت سے بہرہ ور نہ ہو — جان دینے پہ اقتدار نہ تھا
خاکساروں سے خاکساری تھی — سربلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلہ — دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے — زہد اس کا اگر شعار نہ تھا

واہ کس بلندی سے غالب کو دیکھتے ہیں اور کتنی سچی تعریف کرتے ہیں:-

مظہر شان حسن فطرت تھا — معنیٔ لفظ آدمیت تھا

خود مرثیہ گو پر بھی کچھ نہ کچھ اثر متوفی کی موت سے ہوتا ہے، حالی پر غالب کی موت کا جو کچھ اثر ہوا اس کا بیان ان مؤثر الفاظ میں کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کو حالی سے محبت اور حالی کو غالب سے انتہائی عقیدت تھی۔

اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے — جا کے دلی سے آئے گا اب کون
مرگیا قدردان فہم و سخن — شعر ہم کو سنائے گا اب کون
مرگیا تشنۂ مذاق کلام — ہم کو گھر سے بلائے گا اب کون
تھا بساط سخن میں شاطر ایک — ہم کو چالیں بتائے گا اب کون

واہ کیا پر عقیدت اور حسرتناک شعر ہے۔

شعر میں ناتمام ہے حالی — غزل اس کی بنائے گا اب کون

حالی نے اس مرثیے میں وہ تمام حقوق ادا کر دیئے ہیں جو کہ ان پر واجب تھے اور مرثیہ واقعی قابل قدر اور قابل تعریف ہے۔

پنڈت برج نارائن چکبست کے "دیوان صبح وطن" میں بھی مرثیے ملتے ہیں مگر وہ اس قابل نہیں کہ ان کا ذکر اس موقعہ پر تفصیل سے کیا جائے صرف نمونے کے طور پر ایک بند گوپال کرشن گوکھلے کے نوحہ کا درج کرتا ہوں۔

اجل کے دام میں آتا ہے یوں تو عالم کو — مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو — مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو
جنازہ ہند کا در سے تیرے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

اس کے علاوہ پنڈت صاحب موصوف نے چند نوحے اور بھی لکھے ہیں مثلاً بشن نرائن در وغیرہ کی موت پر لیکن ان میں کوئی شان مرثیت کی نہیں پائی جاتی اور وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو انیس اور حالی کے مراثی کے برابر جگہ دی جا۔

علامہ اقبال نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اس قومی شاعر کے یہاں تین مشہور مرثیے ملتے ہیں۔ پہلا غالب کا دوسرا داغ کا اور تیسرا خود اُن کی والدہ ماجدہ کا۔ اب ہم ترتیب وار ان مراثی کا ذکر کرتے ہیں۔

اقبال کا رنگ ہی جدا تھا۔ انہوں نے غالب کے مرثیے میں غالب کی کتنی سچی تعریف کی ہے اور دنیا کو بتایا ہے کہ غالب کیا تھا اور اس کا مقابلہ دنیا کی کس ہستی سے کیا جا سکتا ہے واقعی قابل رشک تھی ہستی غالب اور داغ کی کہ اقبال جیسے شاعر نے ان کے مرثیے کہے۔ اگر حالی اور اقبال غالب پر قلم نہ اٹھاتے تو غالب کی آرزو دل ہی میں رہتی۔ اصلاً غالب کو یقین کامل تھا کہ ان کی ہستی اس قابل ہے کہ لوگوں کو اس کی یاد دلا کر تڑپایا جائے چنانچہ وہ اشارہ بھی کرتے ہیں۔ اور اُمید کرتے ہیں کہ اُن کے ہمعصر ضرور ان کا مرثیہ کہیں گے۔

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید   مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

خیر اگر وحشت اور شیفتہ جیسے شعراء نے مرثیہ نہ کہا تو نہ سہی لیکن حالی اور اقبال نے اس کمی کو بخوبی پورا کر دیا۔ مگر افسوس کہ خود اقبال جیسے شاعر اور ناقابل فراموش محسن کا مرثیہ کسی سے بھی ایسا نہ ہو سکا کہ اس کی ہستی کے شایانِ شان ہوتا۔ اگرچہ رسائل کے اوراق ان کے مراثی سے سیاہ نظر آتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت ان میں سے ایک شعر بھی اس قابل نہیں کہ جسے اقبال کے مرثیے کا شعر کہہ سکیں[1]۔

اقبال نے غالب کے مرثیے میں صرف پانچ بند لکھے ہیں۔ مگر واقعی کوزہ میں دریا بند کیا ہے۔ سب سے پہلے فرماتے ہیں کہ غالب کی ہستی ایسی تھی کہ کل بنی نوع انسان کو ناز کرنا چاہیئے کیونکہ

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا   ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو بزمِ سخن پیکر ترا   زیب محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے   بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

اس کے بعد بتاتے ہیں کہ غالب کی زندگی اس کے کلام میں مضمر ہے

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں   تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں

اس کے بعد فارسی شعراء سے غالب کا موازنہ کرتے ہیں اور کس عمدگی سے غالب کو بڑھا دیتے ہیں۔

شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر   خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر۔

اقبال کا خیال ہے کہ اگر دنیا میں غالب کا مقابلہ کسی شاعر سے کیا جا سکتا ہے تو وہ گوئٹے ہے جس کی ہستی کسی مزید تعارف کی محتاج نہیں۔ واقعی دونوں کی ہستی انسانی تصور کے آخری حدود کا پتہ دیتی ہے۔ شاعری دونوں پر ختم ہے۔ عتیق اور جدید خیالات، حقیقت اور مجاز، قدرت اور حیات کی کثرت ان دونوں دماغوں میں وحدت میں منتقل ہو کر وجود پاتی ہے۔ تہذیب و تمدن تعلیم و تربیت معاشرت و فطرت، غرض زندگی کے ہر پہلو پر ان کا اثر پڑا ہے۔ مگر گوئٹے اور غالب میں صرف اتنا فرق ہے کہ گوئٹے نے اپنا عروج اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے لیکن غالب نے شیریں نئی شہرت کا مزہ تلخیٔ موت کے بعد چکھا۔ گوئٹے کا کلام اپنا منشا پورا کر چکا ہے اور غالب کا کلام آئندہ نسلوں کو بام ترقی تک پہنچائے گا لیکن اقبال نے جن الفاظ میں دونوں کا مقابلہ کیا ہے وہ بھی سننے کے قابل ہیں۔ خالص اور ٹھوس نوحہ ہے۔

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے۔
گلشن ویمر میں ترا ہمنوا خوابیدہ ہے

غالب کی موت کا اردو لٹریچر پر اثر ان شاعرانہ الفاظ میں دکھایا ہے

ہائے اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی یہ سرزمیں   آہ اے نظارہ آموز نگاہ نکتہ بیں
گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے   شمع یہ سودائی دلسوزیٔ پروانہ ہے

پھر فرماتے ہیں کہ دلی یوں تو ہمیشہ سے کانِ علم و فضل رہی ہے مگر غالب جیسی ہستی دوسری نہ تھی۔

اے جہاں آباد اے گہوارۂ علم و ہنر   ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرہ ذرہ میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر   یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے   تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

داغ کے مرثیے میں اقبال ایک بڑی حد تک اصول مرثیہ گوئی پر کاربند رہے ہیں اور ان کا یہ مرثیہ غالب کے مرثیہ سے بڑھ جاتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انہیں داغ سے شرف تلمذ حاصل تھا اور اس لئے کچھ خصوصیت تھی۔ دوسرے یہ کہ جب داغ کا انتقال ہوا تو وہ ایک بڑی حد تک حساس ہو چکے تھے۔ اور مرثیہ تو ہے ہی ان جذبات کا اظہار جو شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ داغ کے مرثیے کو وہ غالب کے مرثیے کی طرح شروع نہیں کرتے کہ یکدم تعریف و توصیف شروع کر دی بلکہ بتاتے ہیں کہ موجودہ فضا یا حالات کیا تھی۔ دنیائے شعر کن مشکلات کا سامنا کر رہی تھی اور داغ کی موت سے دنیائے شاعری کو کیسا دھکا لگا اور دہلی جو گہوارۂ علم و ادب و شعر و سخن تھی کس طرح تباہ و برباد ہو گئی۔ فرماتے ہیں۔

[1] معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مضمون نے اس بارے میں جستجو اور وسعت نظر سے کام نہیں لیا۔ ایڈیٹر

عظمتِ غالب ہے اک مدت سے پیوندِ زمیں مہدیٔ مجروح ہے شہرِ خموشاں کا مکیں
توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر

لیکن داغ کی موت کا کیسا دلگداز اثر ہے کہ

آج لیکن ہمنوا سارا چمن ماتم میں ہے شمعِ روشن بجھ گئی بزمِ سخن ماتم میں ہے
چل بسا داغ آہ! میت اس کی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

پھر بتاتے ہیں کہ داغ کے ساتھ طرزِ بیان کی شوخی بھی سفر کر گئی۔ اب کوئی اتنا بھی باقی نہیں ہے جو سکوتِ گل کا راز دریافت کرکے دنیا کو بتا سکے یا نالۂ بلبل کا راز دریافت کرنے کی کوشش کرے۔ اور نہایت خوش اسلوبی سے بتایا ہے کہ داغ مجاز کے پردے میں حقیقت تک رسائی حاصل کر چکے تھے یہ اُن کی انتہائی عقیدتمندی کا ثبوت ہے۔

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اقبال کوئی مایوس اور محزون شاعر تو تھے نہیں بلکہ ان کے کلام میں امید کی جھلک ہے۔ وہ اپنے فلسفے سے اس مرثیے میں بھی گریز نہیں کرتے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ مجھے یقین ہے اور بھی شعرا پیدا ہوں گے اور اپنے کلام فیض التیام میں تخئیل کی باریکیاں دکھائیں گے اور ایسے ایسے جادونگار بھی ہوں گے جن کے کلام کو پڑھ کر ہماری باریک بیں آنکھیں زمانے کے جور و ستم پر بغیر خراجِ اشک دیئے نہ رہ سکیں گی اور

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

لیکن داغ کی کمی کیسے پوری ہو سکتی ہے اس کا سا عشق کا بیان کون کر سکتا ہے وہ تو اپنے طرز میں یکتائے روزگار تھا۔

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

واہ کیا انتہائے رنج کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ دنیا کی ہر شے کو داغ کے غم میں گریاں دیکھنا چاہتے ہیں۔

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں تو بھی رو اے خاکِ دلی داغ کو روتا ہوں میں

داغ کی موت کا اثر دہلی پر یوں بیان کرتے ہیں۔

آہ! اے بیت الحرامِ مذہبِ اہلِ سخن ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن
وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا یعنی خالی داغ سے کاشانۂ اردو ہوا

دہلی داغ کا وطن تھا مگر ان کی موت دکن میں ہوئی اسے کس لطیف موثر اور جدید طریقے پر ظاہر کرتے ہیں۔

دو نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں وہ مہِ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں

حالی کی برتری کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

اٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا یادگارِ بزمِ دہلی ایک حالی رہ گیا

لیکن اقبال یہ سمجھتے ہیں کہ موت ایک ضروری چیز ہے جس نے شیرینیٔ زیست کی شیرینی کا مزا چکھا ہے وہ تلخیٔ اجل سے ضرور آشنا ہوگا۔ لہٰذا صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی کی قدر و منزلت صرف موت کی وجہ سے ہے۔

آرزو کو خون رلواتی ہے بیدادِ اجل مارتا ہے تیر تاریکی میں صیادِ اجل
کھل نہیں سکتی شکایت کے لئے لیکن زباں ہے خزاں کا رنگ بھی وجہِ قیامِ گلستاں
ایک ہی قانونِ عالمگیر کے ہیں سب اثر بوئے گل کا باغ سے گلچیں کا دنیا سے سفر

اقبال نے اپنی والدہ کے مرثیے کے بطور جو نظم لکھی ہے وہ سب سے بڑھ کر ہے۔ چونکہ اقبال کوئی معمولی شاعر نہ تھے۔ اس لئے اپنی والدہ کے انتقال پر انہوں نے جو کچھ کہا ہے یا جس پیرائے میں اپنے رنج و غم کا مظاہرہ کیا ہے وہ فلسفیانہ پہلو سے بھی قابلِ قدر ہے۔ انہوں نے دوسرے شعرا کی طرح صرف اپنی والدہ کی محبت اور احسانات کا اعادہ و اعتراف کرکے اپنے رنج و غم کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ فلسفۂ حیات و موت پر بہت ہی مفصل اور دقیق بحث کی ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے قانونِ قدرت کے متعلق بتایا ہے کہ فطرت نے چند اصول مقرر کر دیئے ہیں اور نظامِ قدرت جب تک قائم ہے وہ چیزیں انہیں مقررہ اصولوں کی پابند رہیں گی اور اس طرح وہ اپنے رنج و غم کا مظاہرہ نہ کرنے اور مصروفِ آہ و بکا نہ ہونے کا سبب ظاہر کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اصولِ قدرت کے مطابق فنا لازمی اور ضروری چیز ہے اور جو شخص اس پر یقین رکھتا ہے۔ وہ غم سے مجبور ہو کر اشک فشانی کیونکر کر سکتا ہے کیونکہ

علم و حکمت رہزنِ سامانِ اشک و آہ ہے یعنی اک الماس کا ٹکڑا دلِ آگاہ ہے

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ عالمِ تصور میں جب وہ اپنی عزیز والدہ کا خیال کرتے ہیں تو آنسوؤں کا ایک سیلاب ان کی آنکھوں سے ابل پڑتا ہے وہ اس وقت کا خیال کرتے ہیں جبکہ ان کی دنیا صرف ان کی ماں کی آغوش تک ہی محدود تھی نہ صرف یہ بلکہ ان کا خیال ہے کہ باوجود بڑے بڑے عہدے حاصل کر لینے کے اور باوجود بڑی بڑی ڈگریاں لے لینے کے اور زندگی کی متعدد بہاریں دیکھنے کے بھی انسان ماں کے سامنے جا کر وہی طفلِ شیر خوار

بن جاتا ہے جو کہ وہ ابتدائے آفرینش میں تھا اس وقت وہ اس نعمت کو پاکر دنیا کی ہر بڑی سے بڑی نعمت کو فراموش کرسکتا ہے

زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم   صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم

چونکہ اپنی والدہ کی موت کے وقت اقبال انگلستان میں تھے اس لئے انہیں لازمی طور پر اپنی والدہ کے وہ جذبات یاد آئے جو صحیح معنی میں اس ماں کے ہوسکتے ہیں۔ جس کا محبوب بیٹا اس سے عارضی طور پر جدا ہوگیا ہو۔ ان خیالات کو وہ انوکھے لباس الفاظ میں یوں دکھاتے ہیں۔

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار   کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار
خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا   اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

ماں کی تعریف میں اس سے بہتر شعر ملنا دشوار ہے۔

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات   تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

واہ! کس حسرت اور محبت کا مظاہرہ کیا ہے

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی   میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

پھر یک دم ان کا خامۂ جادو نگار فلسفۂ موت کی توضیح میں رواں ہوجاتا ہے وہ دیکھتے ہیں کہ موت کی حکمرانی ہر جگہ ہے اس کے آنے کے بھی مختلف طریقے ہیں انسان کی زندگی کی بہار   ایک دن ضرور تاراج خزاں موت ہوگی۔ وہ مصائبِ زندگی کا خیال کرکے کہتے ہیں۔

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت   گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت
زلزلے ہیں بجلیاں ہیں قحط ہیں آلام ہیں   کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں
کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں موت   دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں   ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا شمع فلسفہ سے روشن دماغ انہیں یقین دلاتا ہے کہ اصل زندگی اس طرح ختم نہیں ہوتی۔

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں   ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

کیونکہ ان کی باریک بین نگاہیں دیکھتی ہیں کہ سطح آب پر کتنی آسانی سے حباب پیدا ہوئے ہیں اور وہی ہوا جو انہیں پیدا کرتی ہے کتنی آسانی سے انہیں فنا کرکے ان کا وجود نیست و نابود کردیتی ہے۔ اسی طرح اگر زندگی موت کے بعد فنا ہوجایا کرتی یا قدرت میں دوسرے آدمی پیدا کرنے کی صلاحیت یا مقدرت نہ ہوتی تو موت اتنی عام نہ ہوتی۔ اس کا اتنا عام ہونا ہی اس کے ہیچ ہونے کی دلیل ہے۔ اس کے بعد وہ ستاروں کی مثال لیتے ہیں کہ یہ اس زمانے سے چلے آرہے ہیں جب سے نظام قدرت قائم ہے اور ان میں کوئی نمایاں تبدیلی نظر نہیں آتی لیکن یہ انسان جس کو خدا نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اور جس کی وجہ سے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے کیوں ان ستاروں سے کم زندگی لے کر اس دنیا میں آتا ہے؟

شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا   کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا

اس سے وہ یہ مطلب نکالتے ہیں کہ اصلاً موت کی کوئی اہمیت ہی نہیں کیونکہ جس موت کو ہم موت سمجھتے ہیں یہ اصلاً انسانی زندگی کا ایک باب ہے۔

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے   خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

اس تمام فلسفے کے بعد ان کو پھر اپنی والدہ کی یاد تڑپا دیتی ہے اور وہ کہتے ہیں۔

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے   جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

آہ کیا جدید اور کیسی پاکیزہ تشبیہ ہے۔

اور آخر میں وہ صاف صاف اس فلسفے کا اعادہ کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد انسانی زندگی کا دوسرا اور سب سے اچھا اور آخر دور شروع ہوتا ہے

مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے   آخرت بھی زندگی کی ایک جولانگاہ ہے
ہے وہاں بے حاصلی کشتِ اجل کے واسطے   سازگار آب و ہوا تخمِ عمل کے واسطے

اس کے بعد وہ اپنی والدہ کی مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور کس لطیف طریقے سے مرثیے کو ختم کرتے ہیں۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر   خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا   نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے   سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اقبال کا یہ مرثیہ اردو شعرا کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ انہوں نے مرثیے کے تمام لوازم کو مدنظر رکھ کر بالکل جدید اور بہت موثر طریقے پر مرثیہ کہا ہے اور دکھا دیا ہے کہ اس صنف سخن میں موجودہ شعرا کے لئے کتنی گنجائش ہے۔ اور وہ ابھی مرثیے ہی کے ذریعے کس حد تک اردو زبان کی خدمت کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں جوش ملیح آبادی کا ذکر نہ کرنا ایک فروگذاشت ہوگی جوش کی مشہور نظم بعنوان "ذاکر سے خطاب" اس موضوع کے لئے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اصلاً اس نظم میں جوش نے صرف ذاکر ہی کو نہیں لتاڑا ہے بلکہ ان شعرا کو بھی در پردہ ایک پھٹکار بتائی ہے جنہوں نے شہدائے کربلا کے مرثیوں کو

صرف رونے دھونے کا سبب بنا رکھا ہے انہوں نے وسیع پیمانے پر مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے اس شعر کی تشریح کی ہے۔

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے　　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

جوش کا نظریہ ہے کہ شہدائے کربلا کے مراثی کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس سے ایثار، وفا، ہمدردی، محبت، الفت، صبر و قناعت، شجاعت، سخاوت، اخوت، ہمت، عالی حوصلگی، بے غرضی، فراخ دلی، قربانی و بہادری کے عمدہ اسباق لے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے دل میں ظلم، جور، جفا، ہوس، لالچ، ریاکاری، مکاری، کبادی، بے ایمانی، حق تلفی، دغا، فریب، نامردی و بے رحمی وغیرہ سے نفرت بھی پیدا ہو جائے۔ ہمارے شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی نے اس نظریے کو اپنا نصب العین بنا کر اس صنف سخن میں انقلاب آرائی کی سعی بلیغ فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ مرثیہ کا مقصد کیا ہونا چاہئے اور ہم نے کیا کیا بنا رکھا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کہتے ہیں کہ میں رونے کو منع نہیں کرتا کیونکہ گریہ فطری شے ہے لیکن کہتے ہیں کہ شہدائے کربلا کے حالات پڑھ کر یا سن کر چند نمائشی آنسو گرانا شہدائے کربلا کی توہین کرنا ہے۔ اتنی بڑی قربانی کے لئے یہ کافی نہیں ہے

کربلا میں اور تجھ میں اتنا بعد المشرقین　　اُس طرف شورِ رجز خوانی ادھر سے کے بین
اس طرف تکبیر ادھر ہنگامۂ صد شور و شین　　اُس طرف اشکوں کا پانی اس طرف خونِ حسین

وہ تھے کس منزل میں اور تو کونسی منزل میں ہے
شرم سے گڑ جا اگر احساس تیرے دل میں ہے

کربلا کے واقعہ کی اہمیت بتاتے ہیں۔

کربلا سے واقفیت بھی ہے مردِ منفعل　　کربلا در پردہ بشاش اور بظاہر مضمحل
جس کی رفعت سے بلندی آسمانوں کی خجل　　جس کے ذروں میں دھڑکتے ہیں جوانمردوں کے دل

خندہ زن ہے جس کی رفعت گنبدِ افلاک پر
مہرِ تکمیلِ نبوت ثبت ہے جس خاک پر

کربلا کی عظمت کا یوں مظاہرہ کرتے ہیں۔

کربلا تو آج بھی قائم ہے اپنی بات پر　　مہر اب بھی سجدہ کرتا ہے ترے ذرات پر

کربلا کی اہمیت کی وجہ یوں بیان کرتے ہیں۔

اے زمیں خوش ہو کہ تیری زیب و زینت ہے حسین
تیرے سناٹے میں محوِ خواب و راحت ہے حسین

اس کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام کی اس عظیم قربانی اور ان کے صبر و ایثار کا تذکرہ کرتے ہوئے واقعہ کربلا کی اہمیت اور اس کا اثر مذہب اسلام پر یوں بیان کیا ہے۔

جو دہکتی آگ کے شعلوں پہ سویا وہ حسین　　جس نے اپنے خون سے مذہب کو دھویا وہ حسین
جو جواں بیٹے کی میت پر نہ رویا وہ حسین　　جس نے سب کچھ کھو کے پھر کچھ بھی نہ کھویا وہ حسین

مرتبہ اسلام کا جس نے دوبالا کر دیا
خون نے جس کے دو عالم میں اجالا کر دیا

کیا حسین علیہ السلام کی اس سے بہتر الفاظ میں تعریف ہو سکتی ہے ملاحظہ ہو۔

نطق جس کا زینتِ دینِ پیمبر وہ حسین　　تھا جو شرحِ مصطفےٰ تفسیرِ حیدر وہ حسین
تشنگی جس کی جوابِ موجِ کوثر وہ حسین　　لاکھ پر بھاری ہوئے جس کے بہتر وہ حسین

جو محافظ تھا خدا کے آخری پیغام کا
جس کے سینے میں تھا دل پیغمبرِ اسلام کا

اس کے بعد انہوں نے جس خوبی سے حضرت امام حسین علیہ السلام کا تمام مظالم و ستم کو بخوشی برداشت کرنا دکھایا ہے وہ بھی قابل ستائش ہے اور ساتھ ہی وہ ہمیں بھی پیروی کی تلقین کرتے ہیں۔

ہنس کے جس نے پی لیا جامِ شہادت وہ حسین　　مر گیا لیکن نہ کی فاسق کی بیعت وہ حسین
ہے رسالت کی بنا جس کی امانت وہ حسین　　جس نے رکھ لی نوعِ انسانی کی عزت وہ حسین

وہ کہ سوزِ غم کو سانچے میں خوشی کے ڈھال کر
مسکرایا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

وہ بتلاتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کی اس قربانی کا اثر اور احسان غیر فانی اور زوال نا آشنا ہے اور واقعی ہم لوگ جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔

اے حسین اب تک لبالب ہے ترا زریں ایاغ　　ضوفشاں ہے آج تک تیری شہادت کا چراغ
تو نے دھو ڈالے جبینِ ملتِ بیضا کے داغ　　تو اگر اسلام کا دل ہے تو ایماں کا دماغ

فخر کا دل میں دریچہ باز کرنا چاہئے
جس کا تو آقا ہو اس کو ناز کرنا چاہئے

ساتھ ہی ساتھ وہ آج کل کے نوجوان مسلمانوں کو بتاتے ہیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے اور کیوں ہم مذہب کو خطرۂ عظیم میں دیکھ کر بھی کروٹ نہیں بدلتے پھر ہمیں خود کو کونسے منہ سے حسین علیہ السلام کا پیرو کہنا جائز ہے۔

ختم ہے آنسو بہانے ہی پہ تیری آرزو　　اور شہیدِ کربلا نے تو بہایا تھا لہو
ہاتھ ہے ماتم میں تیرا سینۂ افگار پر　　اور حسین ابن علی کا ہاتھ تھا تلوار پر

ہمارا فرض ہے کہ دیکھیں کہ ہم پستی و زوال کی کن منازل پر پہنچ چکے ہیں۔ اور اس کی وجہ صرف ہماری غفلت اور ذوقِ تن آسانی ہے اب ہمیں ہوشیار ہو جانا چاہیئے اور زمانے کو دکھا دینا چاہیئے کہ ہماری اصل حقیقت کیا ہے اور ہم کون ہیں اور کیا کر سکتے ہیں۔

دیکھو تو کتنی تکدر ہے فضائے روزگار — کس طرح چھایا ہوا ہے حق پہ باطل کا غبار
بزمِ یزدانی میں روحِ اہرمن ہے گرم کار — میان سے باہر نکل بیٹے علی کی ذوالفقار
نقشِ حق کو اب بھی او غافل جلی کرتا نہیں
اب بھی تقلیدِ حسین ابنِ علی کرتا نہیں

جوش نے ثابت کیا ہے کہ اب بھی سید الشہدا کے مراثی کہہ کر لوگوں کو دکھایا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری میں کتنی وسعت ہے اور کیا کیا جدید طریقے پر نہی ہزاروں مرتبہ کے سنے سنائے واقعات کو پھر جاندار اور پر اثر کر کے پیش کیا جا سکتا ہے۔

اب صرف یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انیس و دبیر کے بعد اہم شعرائے اردو نے واقعہ کربلا کے متعلق مراثی لکھنے میں کیوں طبع آزمائی نہیں کی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آج کل اور اس سے پیشتر بھی دوسرے اردو شعرا نے ایسے مراثی لکھے اور فی زمانہ لکھنؤ میں آبر محشر وغیرہ شعراء اس صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت انیس و دبیر کے بعد اب اس میں اور کوئی گنجایش ہی باقی نہیں رہی مثلاً رشید نے ساقی نامہ مرثیہ میں داخل کر دیا لیکن اب یہ موجودہ شعرا کیا بڑھائیں۔ لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ مرثیہ کی ترقی ہی میں اس کے تنزل کا راز نہاں تھا رنگ جمانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے لہٰذا یہ مراثی نہ مقبول ہوئے اور نہ ہم لوگوں کے کانوں تک پہنچے۔ دوسرے یہ کہ ان شعرا کا مقصد ایسے مراثی کہہ کر صرف رونا رلانا ہے اور وہ لوگ واقعہ کربلا کی اہمیت کو پیش نظر رکھ کر مرثیہ نہیں کہتے کہ آج کل بھی ہمیں ایسی ہی قربانیوں کی ضرورت ہے اور ہم کو مراثی سے ہی ایسے قابل تقلید اسباق مل سکتے ہیں اور کربلا کے دلگداز واقعہ کی تقلید کرنا ہمارے لئے زمانے کی رفتار کو دیکھ کر فرض ہو گیا ہے اور کربلا کا ذکر کر کے رونے کا وقت گذر چکا ہے

کربلا کہ حسرت و اندوہ کا افسانہ ہے
یہ تو غافل یادگارِ ہمتِ مردانہ ہے

ابو مسلم صدیقی ایم اے

ناکام دھوکے

پھر آج زیست کو ویران پا رہا ہوں میں

بہت فریب دیئے خود کو اب نڈھال سا ہوں
لطیف یادوں کی پیہم خلش سے بچنے کو
چھپا گناہ کے بھاری سیاہ پردوں میں
حسین بگولوں کی باہوں میں کھنچ چکا ہوں میں
یہ کھیل کھیل ہی نکلے حقیقتیں نہ ملیں
تسلیوں کے وہ نازک فریب ختم ہوئے
کسی کی دکھ سے بھری ملتجی نگاہوں سے
خراش دل پہ پڑی تھی کبھی سو اب بھی ہے
مری حیات کے پھیکے طویل سالوں پر
وہ چند رس بھرے لمحے محیط ہیں اب بھی
اداس ہو کے تمنائیں راہ تکتی ہیں!

پھر آج زیست کو ویران پا رہا ہوں

مسعود احمد قریشی

خوابِ گراں

قمقمہ بجلی کا روشن تھا — بجھا ہے کیونکر
چاند بھی نکلا نہیں۔ ابر — ہوا کا طوفان
سرد بستر ہے — کھلے روشندان

سہمے سہمے سے مرے قہقہے گونج اُٹھے تھے
محفلِ زیست میں بے معنی تھا اب اس کا وجود
روحِ ناپاک، خبیث و مردود

شور — دروازے پہ دستک سی ہوئی تھی — ہاں ہاں
جیسے مردانے سے درباں نے جگایا تھا مجھے
ملنے والا کوئی آیا تھا مجھے

میرے آرام کی دشمن، میرے سکھ کی بیرن
جیسے میں اس کو جھڑکتا ہی چلا جاتا تھا
سایہ معدوم ہوا جاتا تھا

ایک سایہ — کسی مانوس حسیں پیکر کا
جس کے دامن میں کئی ایسے ہی سائے لرزاں
رات کے سینے پہ جس طرح دھواں

اب نہ کچھ بھی تھا مگر ایک بھٹکتی آواز
شعلے بن بن کے اندھیرے میں بھڑک اٹھتی تھی
گویا کوندے کی لپک اٹھتی تھی

وہم تھا میرا — کہ دراصل وہی سایہ تھا
یاد اب مجھ کو نہیں — جیسے میں گھبرایا تھا
اس نے کیسے مجھے جتلایا تھا۔

اور میں — ظالم و بے حس تھا — سنا تھا میں نے
جیسے اس رات کی تاریکی فروزاں ہوگی
اور مری موت کا ساماں ہوگی

میرا اقرارِ محبت — میری رنگیں قسمیں
جن کی رعنائی میں اُلجھی تھی جوانی اُس کی
اور پھر جاں بھی گئی تھی اُس کی

تم بھی جاگ اٹھی ہو — روتی ہو — مری جان سنو
کیا میں زندہ نہیں۔ تم تو نہ مجھے جھٹلاؤ
گرم بستر ہے — قریب آجاؤ

قیوم نظر

شامت اعمال

(ایک ہندی افسانہ)

ہمارے انٹر کلاس میں داخل ہوتے ہی ٹرین چل پڑی۔ ہم بیٹھنے کی جگہ ڈھونڈنے لگے۔ کونے میں ایک طرف پورا برتھ خالی پڑا تھا۔ سامنے والے برتھ پر ایک بزرگ سفید چادر بچھائے لیٹے اخبار پڑھ رہے تھے۔ کھڑکی سے آتی ہوئی ہوا رہ رہ کر ان کے سر کے لمبے بالوں کو لہرا دیتی تھی۔

میں نے برتھ پر بیٹھتے ہوئے کہا "مسٹر جادو سونے کا نام کچھ دیر میں لگے گا۔ ابھی بستر کھولنے کی آپ تکلیف نہ کریں"۔ مسٹر جادو نے "ہولڈ آل" اوپر برتھ پر ٹھونستے ہوئے۔ "ہماری بلا سے تم سو چاہے نہ سو پر میں بیٹھ نہیں سکتا۔ سویرے سے ......"

میں نے کہا "معلوم ہے سویرے سے آپ نے بڑی کمر توڑ محنت کی ہے۔ پر آپ کیا آج سو سکتے ہیں"؟

وہ مجھے کھڑکی کے پاس ٹھیل کر سونے چلا تھا۔ پر میں نے ایسا کرنے نہ دیا آخر وہ جھنجھلا اٹھا اور ربولا "نہ سوؤں گا میری بلا سے" اور اس نے سگرٹ جلا لیا اور مستعدی سے کش کھینچنے لگا۔

دھیرے دھیرے ہم لوگوں کی باتیں شروع ہوئیں پھر بحث چھڑ گئی۔ یہ تو نت کا دھندا تھا۔ پر آج کافی فرصت تھی۔ اطمینان تھا۔ بات ادب یا لٹریچر سے شروع ہوئی۔ سیاست، سماج اور دھرم سے ہوتی ہوئی بیسواؤں پر آگئی۔

میں نے کہا "یہ تمہارا خیال بالکل غلط ہے کہ بیسواؤں کی سماج کو ضرورت ہے بلکہ یہ رواج یا بیسواؤں کا ادارہ ہماری تہذیب کے تنزل کا باعث ہے"۔

وہ بولا "پر ازل سے یہی ہو رہا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ اور اگر سماج میں یہ نہ رہے گا تو ہماری گھریلو زندگی بے عزت ہو اٹھے گی۔ ہماری استریاں بھرشٹ ہو جائیں گی"

میں نے گرم ہو کر کہا "کیا بکتے ہو" میرے شبدوں میں زم سا غصہ آگیا تھا سامنے لیٹے ہوئے سجن ایکا ایک چونک کر اٹھ بیٹھے۔ میں نے ایک ہی جھلک میں ان کے [illegible] چہرے اور شریفانہ انداز کو بھانپ لیا۔ مجھے ایسا جان پڑا گویا وہ ہم لوگوں کے بیچ دخل دینے کے لئے مجبور سے ہو رہے ہوں پر وہ چپ چاپ بیٹھ کر اپنا اخبار پڑھنے لگے۔

مسٹر جادو نے گفتگو میں کترا تے ہوئے کہا "مسٹر بی تم چونکو چاہے جتنا، پر سماج میں تم سب کو دیوتا نہیں بنا سکتے۔ انسان تو انسان ہے۔ وہ اپنی کمزوری کو چھوڑ کر انسان نہیں رہ سکتا"۔

میں نے مختصر سوال کیا "آخر آپ کہتے کیا ہیں"؟

"کہتے کیا ہیں؟ یہی کہ انسانی سماج میں کچھ ایسے مرد اور کچھ ایسی عورتیں ضرور رہیں گی جو جنسی اخلاق کے بندھن سے بندھی نہیں رہنا چاہیں گی"۔ آخر ان کے لئے کہیں جگہ ہونی چاہیئے کہ نہیں"؟

میں نے اسے دھتکارتے ہوئے کہا "تمہیں شرم آنی چاہیئے اس بچار پر کیا تم کچھ چوروں کے لئے کچھ ایسے گھر بھی محفوظ چھوڑ دو گے جن میں وہ چوری کر سکیں"؟

"میں یہ نہیں کہتا" اگر تم لوگوں کو صرف سنتشٹ کر دو تو کیا تم سمجھتے ہو وہ چوری نہ کریں گے۔ چوری کا تعلق انسانی طبیعت سے ہے۔ دھن دولت سے نہیں"

"یہ بے سر پیر کی باتیں ہیں مسٹر"

"سنو مسٹر بی جذباتی ہونے سے کام نہیں چلتا۔ انسانی نفسیات کے اصولوں سے بے پروائی برتی نہیں جا سکتی۔ ناممکن ہے کہ جو بیسوائیں ہیں انہیں سدھار کر آپ دیوی بنا سکیں۔ یا جو بدچلن مرد ہیں انہیں فرشتہ خصلت بنا سکیں۔ بس بھلا اسی میں ہے کہ وہ جس حالت میں ہیں انہیں پڑا رہنے دیا جائے"۔

میں نے کہا "جذبات کوئی بری چیز نہیں اگر ان کا ٹھیک استعمال ہو سکے تو یہ انسان کو دیوتا بنا سکتے ہیں جن کی تم ہنسی اڑانا چاہتے ہو۔ اسی کے بل پر انسان کی بڑائی اور شرافت قائم ہوتی ہے کیا تمہیں یہ بات تکلیف نہیں پہنچاتی کہ یہ بیسوائیں

ہماری ہی بہو بیٹیاں ہیں۔ کیا انہیں اس حالت میں دیکھنے سے تمہیں کچھ بھی رنج نہیں ہوتا؟"

مسٹر جادو ٹھٹھا مار کر ہنس پڑے۔ "جب انسان اتنا جذباتی ہو جائے گا تو اس کی ہستی کا نام و نشان ہی دنیا سے اُٹھ جائے گا۔ پھر آپ گائے کا دودھ نہ پئیں گے ......"

وہ نہ جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا کہ سامنے کی برتھ پر بیٹھے ہوئے سجن بول اُٹھے۔ "دیکھئے آپ لوگ ابھی میرے سامنے لڑکے ہیں۔ میرے بیچ میں دخل دینے سے برا تو نہ مانئے گا ......"

ہم دونوں ایک ٹک ان کی طرف دیکھنے لگے۔ ہم دونوں کو کچھ ناگوار سا تو لگا مگر ہم دونوں اس آشا سے اُن کی طرف دیکھنے لگے کہ شاید ہمارے ہی خیال کی تائید کرنے والے ہوں۔ ہم دونوں کے مکھ سے ایک ساتھ ہی نکلا "نہیں نہیں برا ماننے کی کونسی بات ہے یہ تو معمولی سی بحث تھی۔"

سامنے کے برتھ پر بیٹھے ہوئے سجن کہنے لگے: "آپ دیکھتے ہیں میری عمر کیا ہو گی ابھی آپ دونوں کی عمر ملا کر مجھ سے کم ہی ہو گی۔ زیادہ سے زیادہ آپ لوگوں کی عمر ملا کر چالیس برس کی ہو گی۔ میں پچاس پار کر چکا ہوں۔ اور اب ایک دو ہی سال میں ساٹھ کو پہنچتا ہوں۔ پھر چاہے میں سٹھیا جاؤں پر ابھی میں ہوش حواس کی باتیں کرتا ہوں۔"

ہم دونوں کو ہنسی سی آ گئی۔ پر ہم دونوں نے بڑے ادب سے اسے دبایا اور ان کی باتیں سننے لگے۔ وہ اب ڈٹ کر بیٹھ گئے تھے اور کہہ رہے تھے "آپ لوگ شہر کے رہنے والے ہیں میرا رہنا دیہات میں ہوتا ہے ہم لوگ زمیندار ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب میں بھی آپ لوگوں کی طرح جوان تھا۔ پر وہ زمانہ اور تھا تب بیس سال کی عمر زیادہ نہیں سمجھی جاتی تھی۔ جب تک شادی نہ ہو جائے بچے نہ ہو جائیں۔ ماں باپ زندہ رہیں تب تک ہم لوگ بچے ہی سمجھے جاتے تھے۔ دنیا سے ہمیں واسطہ نہ تھا۔ دنیا کے مسئلوں پر ہم غور کرنے کے لائق نہ سمجھے جاتے تھے۔"

ہم لوگ سن رہے تھے۔ بیچ بیچ میں ایک دوسرے کو اسی نظر سے دیکھ لیتے تھے کہ یہ کیا شیطان کی آنت شروع ہو گئی۔ وہ بوڑھے زمیندار صاحب کہنے لگے ــــ "دیکھئے میں آپ بیتی سناتا ہوں۔ اس وقت میری عمر آپ ہی کے برابر کوئی بیس اکیس برس کی رہی ہو گی۔ پر میں آپ سے تگڑا تھا مست تھا۔ لاپروا تھا۔ ہمارا کام تھا کشتی لڑنا شکار کھیلنا۔ گانا بجانا ہنسی مذاق۔ ہمیں پڑھنے لکھنے سے ہمارا سروکار نہ تھا۔ پر ہماری پڑھائی ہمارا مقصدِ زندگی نہ تھی صرف ایک زینت تھی میرے لئے دو ٹیچر رکھے گئے تھے ایک انگریزی پڑھاتا تھا۔ دوسرا تہذیب سکھاتا تھا۔ مجھے فوٹو گرافی کا بھی شوق تھا میرے ماسٹر اس میں بھی مجھے مدد دیتے تھے۔ ان دنوں میرے پتا زندہ تھے۔ میری شادی نہ ہوئی تھی۔ ایک دن کی بات ہے میں بغل میں کیمرہ لٹکائے ہاتھ میں بندوق لئے جنگل کی طرف نکل پڑا تھا۔ سوچا تھا۔ اگر کچھ ملا تو شکار کروں گا۔ نہیں تو ندی کے کنارے پر بیٹھ کر سہانے منظر کا فوٹو لوں گا۔ ہلکی سی بدلی تھی۔ رہ رہ کر دھوپ نکل آتی تھی۔ برسات کا پہلا پانی پڑ چکا تھا دبی ہوئی دھول کے بیچ بیچ میں گھاس کے انکھوے اُٹھ رہے تھے۔ کھیتوں میں کسان "پرواہی" مارنے گئے تھے۔

جب میں جنگل میں داخل ہوا۔ اس وقت چرواہے اپنے ڈھوروں کو لے کر چرانے پہنچ گئے تھے۔ گلے بھینس اور بکریوں کے ریوڑ بکھرے ہوئے چر رہے تھے اور ان کے چرانے والے لڑکے لڑکیاں اپنا اپنا گروہ بنائے کھیل رہے تھے۔ میں انہیں دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ مجھے جنگل تک پہنچنے میں قریب آدھے میل کا راستہ تھا۔

"ندی تک پہنچتے پہنچتے کئی مور بھاگ کر جھاڑیوں میں گھس گئے کئی تیتر اپنا بولنا بھول کر پھُر سے اڑ گئے۔ کئی خرگوش میرا راستہ کاٹ گئے۔ پر میں ان میں سے ایک پر بھی وار نہ کر سکا۔ اساڑھ کے شروع کی پروا ری ہوا عجیب آس پیدا کر رہی تھی۔ جب وہ زمین چھوتی ہوئی۔ لہراتی ہوئی نکلتی تو دل میں عجیب سی گدگدی ہوتی۔ جی میں آتا کہ کسی درخت کی چھایا میں لیٹ جاؤں۔ اور آنند لوں۔ چلتے چلتے میں جھاڑیوں سے باہر نکل گیا۔ سامنے مہوے کے درخت ہرے ہرے پتوں اور پھولوں سے لدے تھے۔ ڈال پر بیٹھے ہوئے پنچھی اور بندر پھلوں کو کُتر کُتر کھاتے اور گراتے تھے۔ کچھ دور پر جنگلی ندی ٹیڑھی میڑھی بل کھاتی بہہ رہی تھی۔ مجھے یہ منظر ایسا بھلا لگا کہ میں وہیں ایک گھنے مہوے درخت کی چھایا میں بیٹھ گیا۔ بندوق ایک طرف ڈال۔ میں نے کیمرا سیدھا کیا۔ کئی ایک سنیپ شاٹ لئے ایکا ایک اندھیرا ہو جانے کے کارن کیمرے کو بند کر دینا پڑا۔ دیکھا تو آسمان میں بادل گھنے ہو رہے تھے ہوا رک رہی تھی میں نے اب لوٹ چلنا مناسب سمجھا۔

مسٹر آپ لوگ شہروں میں رہتے ہیں۔ ہم دیہات کے لوگ سڑک اور موٹر کا دھیان نہیں رکھتے۔ ہمیں صرف سمتوں کا علم ہوتا ہے کہ کدھر جاتا ہے۔ اور کدھر جا رہے ہیں۔ میں نے جنگل سے باہر ہونا شروع کیا۔ مہوے کی باڑی کو پار نہ کرنے پایا تھا کہ بوندیں پڑنے لگیں۔ میں جتنی دیر میں میدان پار کر کنارے کے بڑے درخت کے نیچے پہنچوں بڑی بڑی بوندوں نے کافی بھگو دیا۔ میں اس سینکڑوں تنے والے درخت کے بڑے تنے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ پانی گھمر گھمر

کر برسنے لگا تھا۔ چڑیاں خوش ہوکر ڈالوں پر پھدکنے لگی تھیں۔ بندر پانی میں بھیگتے ہوئے ڈالوں پر اچھل رہے تھے۔ اور میں یہ سب دیکھتا ہوا۔ بھیگنے سے بچنے کے لئے درخت کے تنے سے لگا لپٹا جا رہا تھا۔ اس بیچ میں میرے کان میں "برہے" کی تان پڑی۔ گویا کوئی پاس ہی گا رہا ہے۔ گلے کا سریلا پن کانوں سے چھپا نہ رہا۔ ایک خاص ذوق و شوق سے میں نے گانے والے کے لئے ادھر ادھر آنکھیں دوڑائیں۔ پر کوئی دکھائی نہ پڑا۔ پھر مجھے ایسا جان پڑا گویا اس برگد کے موٹے تنے کی اوٹ سے آواز آ رہی ہے۔ میں گھوم کر ادھر جا پہنچا۔ میرے پہنچتے ہی گانے والا شرما کر چپ ہو گیا۔ میں نے دیکھا ایک پندرہ سولہ برس کی لڑکی بھیگتی ہوئی۔ دبکی شرمائی نیچی نگاہ کئے برگد کے تنے سے لگی۔ لاٹھی پکڑے کھڑی ہے۔ اس کے بھیگے ہوئے پھٹے کپڑوں کے اندر اس کا کندن سا جوبن اور ہوا اور پانی پر پلا ہوا حسن چھپ نہ سکا۔ مجھے اب یہ کہتے ہوئے شرم سی لگتی ہے کہ میں نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ اس کی کالے کالے لمبے لمبے بالوں کی کنگھی سے بے نیاز چوٹی اس کی ہرنی کی سی آنکھیں۔ اس کے لال لال گال اور پتلے ہونٹوں کو دیکھتے ہی بنتا تھا۔ میں نے پوچھا "تو کس کی لڑکی ہے رے ..... ؟" وہ چپ رہی۔ میں نے ڈانٹ کر زمینداری کے رعب میں کہا "بولتی کیوں نہیں ؟" وہ دھیرے دھیرے سے بولی "میں اس گاؤں کی نہیں"۔ میں نے پوچھا "تو پھر یہاں کیسے آئی ڈھور چرانے ؟" بولی "پھوپھا کے گھر آئی ہوں انہوں کے ڈھور چرانے آئی ہوں"۔ میں نے پوچھا "تیرا پھوپھا کہاں رہتا ہے ؟" بولی "آپ کے ہی گاؤں میں"۔ "کون ہے رے تیرا پھوپھا ؟" میں نے پھر پوچھا۔ اس نے کہا "مہابیر"۔ "اچھا تو مہابیر آہیر کے ہاں آئی ہے۔ تب ڈرتی کیوں ہے بتلاتی کیوں نہ تھی"۔

اس نے اب میری طرف دیکھا میں نہیں کہہ سکتا۔ پر میں مسکرا پڑا۔ اور اس نے مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ پانی کچھ تھم رہا تھا۔ پھر بھی برگد کے پتوں پر گر کر وہ پٹ پٹ آواز کر رہا تھا۔ میں اسے پھر اوپر سے نیچے تک دیکھنے سے اپنے کو روک نہ سکا۔ میرے من میں آیا کہ یہ سندر بدن۔ یہ نرم و نازک جسم اور یہ افلاس اور یہ سخت زندگی۔ میں نے کہا "تو تو اچھا گاتی ہے رے۔ ذرا سنا تو اپنا گانا"۔ وہ شرما کر سکڑ گئی۔ "دیکھ ایک بار گانا سنا دے تو تیری تصویر کھینچ دوں"۔ اس نے عجیب لالچ سے میری طرف اچنبھا بھری نظر سے دیکھا۔ گویا جاننا چاہتی ہے کہ کیا بندوق سے تصویر بھی کھینچی جاتی ہے۔ میں نے کیمرے کے لٹکتے ہوئے تھیلے کو دکھا کر کہا۔ "اس میں تصویر کھینچنے کی مشین ہے"۔ اس نے غور سے اسے دیکھا میں نے جھٹ کیمرا نکال لیا۔ دکھا کر بولا "اگر گانا سنا دے تو تیری تصویر بنا دوں گا"۔ پہلے وہ کچھ ہچکچائی مگر اصرار کرنے اور لالچ دینے پر اس نے کان پر انگلی دے کر اونچی آواز سے "برہا" شروع کیا۔ اس کی آواز گویا گھنے جنگل کو چیرتی ہوئی چاروں طرف ٹکرانے لگی اور اس کی "میں" میں ٹیسکر جوان دل میں دھڑکن پیدا کرنے لگی۔ میں ٹکٹکی لگائے اس کے مکھڑے کو دیکھتا رہا۔ جادو کئے ہوئے آدمی کی طرح کھڑا تھا۔ اور وہ اساوری سپیرنی کی طرح زہریلے سانپ سے کھیل رہی تھی۔ پانی تھم گیا دھوپ پھر نکل آئی۔ دور پر کسی چرواہے کی تان سنائی دی۔ "مالتی۔ اری مالتیا" اس نے گانا روک دیا بولی "ہاں۔ آئی" اور وہ چلنے کو تیار ہوئی۔ میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ روک کر بولا۔ "جاتی ہے تصویر نہیں کھنچوائے گی"۔ وہ سہمی ہوئی بولی۔ "کیا ایسے جلدی کھینچتی ہے"۔ میں نے ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا "اچھا پھر کھینچ دوں گا تو تو پاس ہی رہتی ہے" سچ بات تو یہ تھی کہ یکایک ہاتھ پکڑنے کی برائی کے خیال سے چونک سا پڑا تھا۔ اس نے کہا "اچھا بھیا جی" وہ لاٹھی کے سہارے چھلانگ مارتی ہوئی چلی گئی۔ میں جانے کتنی دیر تک وہاں برگد کی جڑ کے پاس کھویا ہوا سا بیٹھا رہا۔ کہہ نہیں سکتا۔ پر جب چلنے کا ہوش آیا۔ اس وقت سورج سر پر پہنچ رہا تھا"۔

مسٹر جادو دس منٹ تک بنا سگریٹ کے نہیں بیٹھ سکتے۔ دوسری سگریٹ جلا کر انہوں نے بوڑھے مسافر کو بھی پیش کی۔ وہ بولے معاف کیجئے گا۔ جوانی میں صرف ایک بار میں اپنی خواہشوں پر قابو نہ پا سکا تھا۔ جس کا پچھتاوا آج تک مجھے ہے۔ اور اس غلطی کا الزام چاہے تو آپ مجھے دیں چاہے میری جوانی کو۔ مالتی سے مل کر جب میں گھر لوٹا تو میرا من میرے بدن میں نہ تھا۔ اس پر بھی ڈھونڈنے پر کوئی اچھا نہ دکھائی پڑتی تھی۔ کوئی چیز کم نہ نظر آتی تھی۔ پر آنکھوں کے سامنے اس لڑکی کی تصویر کھینچی رہتی۔ جی میں اس کو دیکھنے کی آرزو تھی۔ اس سے باتیں کرنے کو جی تڑپ رہا تھا۔ شام ہوئی میں ٹہلنے نکل پڑا۔ مہابیر کا گھر راستے سے کچھ ہٹ کر پڑتا تھا۔ پھر بھی میں اسی طرف سے نکلا۔ گاؤں کی حالت شاید آپ لوگ نہ جانتے ہوں۔ شہر کے رہنے والے ٹھہرے۔ پر ہم زمیندار لوگ جب کبھی نکل پڑتے ہیں جدھر نگاہ جاتی ہے لوگ جھکے ہوئے سلام کرتے ہی نظر آتے ہیں۔ چارپائیاں خالی ہو جاتی ہیں اور اگر ہم نے کسی کا نام پکار لیا تو وہ شکر گذار ہو کر ہاتھ جوڑے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے کسی کے دروازے پر اگر ہم رک گئے اور اس کا کچھ حال چال پوچھ لیا تو وہ بنا مول کا چاکر ہونے کو تیار ہو جاتا ہے۔ میں آج کل کی نہیں کہتا۔ اب تو ہوا ہی بدل گئی ہے۔ اس دن مہابیر کے گھر کے سامنے سے نکلتے ہوئے یونہی میں نے پکارا "مہابیر" وہ شاید

کھیت سے لوٹا نہ تھا۔ اس کا لڑکا ڈھوروں میں تھا۔ گھر کی ٹٹی ہٹا کر کسی نے جھانکا۔ میں نے دیکھا۔ ہرن کی سی دو آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ میں نے پوچھا "ارے مالتی مہابیر گھر پر ہے"۔ اس نے سر ہلا کر دھیرے سے کہا "بھیا جی بپو بھیا جی کھیت میں ہیں"۔ میں نے کچھ نہ کہا۔ کچھ کہہ نہ سکا۔ پر اسے ایک بار دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئے بنا نہ رہی۔ میں قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ ایک بار مڑ کر دبی ہوئی نگاہ سے دیکھا تو وہ تصویر کی طرح دروازے پر کھڑی ہے۔ پھر تو یہ نت کا دھندا ہو گیا۔ اسی مہابیر کے گھر کے سامنے سے ہو کر نکلتا۔ لوٹتا۔ پہلے صرف دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کر لیتا تھا۔ پھر اس کی میٹھی بولی کا آنند لینے لگا۔ مجھے اب وشواش ہو گیا کہ میرے من میں جو درد ہے۔ اسی درد سے۔ گویا وہ بھی درد مند ہے۔ اب وہ بھی کسی نہ کسی بہانے میری طرف آتی اور کسی نہ کسی بہانے مجھے دیکھ جاتی۔ مسکرا جاتی۔ ہماری آنکھیں ملنے لگیں جانے کیا سمجھنے بوجھنے لگیں۔ پر اس حالت سے میرا دل اداس رہنے لگا۔ کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ بنا اسے دیکھے مرجھایا پڑا رہتا تھا۔

میرے پتا جی کافی بوڑھے ہو رہے تھے۔ ان کی چار شادیوں میں صرف میں ہی ان کا اکیلا بیٹا تھا۔ میری ماں کبھی کی مر چکی تھی۔ گھر میں نوکر نوکرانیاں بہت تھیں پتا جی کے تعلق کی وجہ سے میں کسی کو چاچی کسی کو "کاکی" کہہ کر پکارتا تھا۔ مجھے اداس دیکھ کر ایسا جان پڑتا ہے کہ میری بہن اور چاچی نے پتا کے سامنے چنتا ظاہر کی نہیں تو پتا جی سے میرا سامنا کب ہوتا تھا۔؟ وہ اپنے کام اور آرام میں لگے رہتے تھے۔ اور میں اپنی دنیا میں رہتا تھا۔ پر اس دن انہوں نے بلا بھیجا۔ میں ادب سے ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ چوکی پر بیٹھے اپنے ہاتھوں کو پاکیزگی کے خیال سے ایک سو ایک بار مٹی مل کر دھو رہے تھے۔ پاس میں چکنی مٹی کا ڈھیر رکھا تھا۔ سامنے نوکر بڑا سا لوٹا لئے پانی چھوڑ رہا تھا۔ میں سر نیچا کئے ادب سے داہنے بغل کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بولے "بھیا آج کل کیا طبیعت ٹھیک نہیں رہتی؟"

میں نے ایکا ایک تن کر کہا "نہیں تو پتا جی اچھا تو ہوں" وہ اپنی انگلیوں کو اسی ذوق شوق سے مٹی سے ملتے رہے۔ بیچ بیچ میں نوکر کو کچھ ہدایت دیتے جاتے تھے۔ ایک بار پھر شاید میرا دھیان نہیں آ گیا۔ ہاتھ دھوتے بولے۔ دیکھو بیٹا اپنی تندرستی کا خیال رکھا کرو۔ تمہیں چنتا کس بات کی؟ کھاؤ پیو، مست رہو۔ ہم تمہاری عمر کے تھے تو اپنے کرتے ٹوپی تک کی خبر نہ رکھتے تھے۔ تم لوگ تو اتنی ہی عمر میں جانے کیا دو یا پڑھ لینا چاہتے ہو۔ بار بار سمجھاتا ہوں کہ پڑھنے لکھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تندرستی ہزار نعمت ہے۔ بڑے بوڑھے کیا یونہی کہہ گئے ہیں"! اب وہ داتن کرتے جا رہے تھے۔ اس کام میں کم سے کم بالشت بھر کی تین چار نیم کی ٹہنیاں وہ چبا ڈالتے تھے۔ اور اس میں دو گھنٹے سے کم وقت نہ لگتا تھا۔ میں کب تک کھڑا رہتا۔ دھیرے سے دبے پاؤں لوٹ کر اپنی بیٹھک میں جا پہنچا۔ لیٹ کر جانے کیا سوچنے لگا۔ من میں شنک اٹھتا کیا باپ کے کانوں میں کچھ بھنک پڑی ہے پھر یقین ہو گیا۔ نہیں وہ گئو آدمی ہیں۔ ان سب باتوں پر کیا دھیان دیں گے۔ اپنے پتا کے اس اعلیٰ چلن پر مجھے بے حد یقین ہو گیا۔ میں نے من ہی من میں ان کے چرنوں میں اپنا سر رکھ دیا اور ایشور سے گڑگڑا کے بھیک مانگی کہ انہیں لمبی عمر دے۔ اب میرے دن اچھے کٹنے لگے۔ میری سرگذشت بڑھنے لگی۔ شکار کے بہانے میں جنگل میں ہمیشہ جانے لگا پڑھنا لکھنا پتا کے اپدیش کے مطابق بے کار سمجھنے لگا۔ ماسٹر صاحب اپنی ڈیوٹی کا خیال کر کے شام کو میری مصاحبی کر لینا ضروری سمجھنے لگے۔ ہم سب خوش تھے۔ جنگل میں عام طور پر ہمیشہ مالتی سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ جنگل کا نرالے سے نرالا کونا بھی ہمارے قدموں سے پوتر ہو چکا تھا۔ ہمارے ملنے کی جگہ ہمیشہ بدلتی رہتی۔ کبھی ہم ندی کے کنارے پر جامن کے جھرمٹوں میں اجگر کی طرح پھیلی ہوئی جڑوں پر بیٹھ کر گاتے کبھی ہم پانی پر لٹکی ہوئی سہور کی ڈالیوں پر بیٹھ کر جھولتے۔ کبھی ہم کروندے کے پکے پھلوں کو توڑ کر کھاتے۔ تیتروں کے گھونسلے ڈھونڈتے۔ کبھی گایوں کو "کھادیں" چرنے کے لئے چھوڑ خرگوش کے بلوں کی تلاش کرتے۔ حالت یہ ہو رہی تھی کہ ان سب میں ہم اپنا کھانا پینا بھول جاتے اور کبھی کبھی اپنے آپ کو بھی۔

کچھ ہی مہینوں بعد میری شادی ٹھیک ہو گئی۔ اس کی تیاریاں ہونے لگیں ہم زمینداروں کی شادی ہمارے جیون کا کارنامہ نہیں ہوتی۔ اگر اس کا کوئی بڑا مقصد ہوتا ہوگا تو یہ کہ وہ ماتا پتا جی کا تراحق ہے۔ ہم اس سے بچ نہیں سکتے۔ اس لئے ہم اس کی زیادہ چنتا بھی نہیں کرتے۔ ہماری شادی ہو گئی۔ ہمارے گھر میں پتا کی بہو آ گئی۔ اب جیسے وہ اپنی زندگی کی آخری آرزو پوری کر چکے تھے۔ میں نے اکثر کہتے سنا۔ "اب مجھے کیا کرنا ہے بھیا اپنا گھر بار سنبھالنے لگیں۔ اور میں ایودھیا جی میں جا کر رام نام بھجوں۔ بہت سکھ کیا اب کچھ پرلوک کی بھی فکر کرنی چاہیئے"۔ کہتے کہتے ایک دن وہ سچ مچ چلنے کو تیار ہو گئے۔ مجھے بلا کر بولے "اب زندگی کا ٹھکانا نہیں۔ جب تک شریر میں سانس ہے بھگوان کا سمرن کروں گا اب تم سمجھ دار ہوئے اپنا برا بھلا سوچ سکتے ہو"۔ میں کیا جواب دیتا چپ چاپ کھڑا سن رہا تھا وہ کہنے لگے "اب میں ایودھیا میں جا کر رہنا چاہتا ہوں۔ تم

اپنا کاروبار دیکھو جب تک موجود ہوں جو پوچھو گے بتلا دوں گا۔

پتا جی چلے گئے ان کے ساتھ ہی میری چاچی۔ کاکی بھی چلی گئیں۔ پرانے نوکر بھی چلے گئے۔ اب میں گھر کا مالک تھا۔ سب کچھ تھا۔ نئے نئے نوکر نوکرانیاں بھرتی ہوئیں۔ ان میں مالتی بھی ایک تھی۔ مالتی میری استری کی خاص سیوا میں رہتی۔ اسی بہانے میں اسے دیکھ لیتا دو باتیں بھی کر لیتا تھا مالتی اب خوش حال تھی۔ اس کے تن پر اچھے کپڑے رہتے۔ کانوں میں کرن پھول لٹکتے۔ ہاتھوں اور پیروں میں چاندی کے کڑے کھنکتے۔ وہ کھلی جا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میرا دل آپے سے باہر ہو جایا کرتا تھا۔ پر میں بیاہا ہوا تھا۔ اس لئے صبح کا بھولا شام تک گھر پہنچ جاتا تھا۔

ہولی کے دن تھے۔ اپنے راج کی پہلی ہولی آئی تھی۔ ہفتوں سے خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ ایسی امنگ۔ ویسی خوشی۔ ویسا آنند آج تک نہ دیکھنے میں آیا۔ سویرے سے رنگ میں بھیگ کر دوپہر کو نہا دھو کر کھا پی کر بیٹھک کے کوٹھے پر آرام کر رہا تھا۔ باہر دھوپ چمک رہی تھی۔ چھت پر ٹھنڈک اچھی لگ رہی تھی۔ میں السایا ہوا پلنگ پر لیٹا تھا۔ دور کوئیں پر لوگوں کے نہانے اور "ہو ہلّا" کرنے کی آواز سنائی پڑ رہی تھی۔ زینے پر کسی کے چھم چھم کر چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھ گیا۔ مالتی پان لے کر آ رہی ہے۔ کہہ نہیں سکتا۔ کیوں پر میں سونے کا بہانہ کر کے بستر پر پڑا رہا۔ پیروں کی آہٹ سے میں سمجھ گیا۔ وہ پاس آ کر کھڑی ہو گئی ہے۔ مجھے ایسا لگا گویا وہ غور سے مجھے جھک کر دیکھ رہی ہے۔ میرے ہردے میں گدگدی ہونے لگی۔ میں نے اپنے کو بہت روکنے کی کوشش کی۔ پر آخر مسکراہٹ آ ہی گئی۔ اس نے سمجھ لیا میں سو نہیں رہا ہوں۔ وہ پان کا ڈبہ سرہانے رکھ کر یہ کہتی ہوئی لوٹنے جا رہی تھی۔ "یہ جیرز کیا وہ پان رکھا ہے" میں نے جھٹ اس کا بایاں ہاتھ پکڑ لیا اور ہنستا ہوا اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں کھولتے ہی اس کا ٹھاٹھ دیکھ کر میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ لمحہ بھر اس کا مکھڑا دیکھتا رہا۔ اس کا حسن ان زیوروں اور بسنتی ساڑی سے پھوٹا پڑتا تھا۔ میں نے چڑاتے ہوئے کہا "آج کسے ٹھگنے نکلی ہو مالتی" اس نے ترچھی نگاہوں سے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں پلنگ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "آؤ تمہاری تصویر کھینچ دوں مالتی" اور میں نے اسے پکڑ کر کھڑکی کے پاس تخت پر بٹھا دیا۔ پچھم کی طرف جاتے ہوئے سورج کی روشنی صاف اس کے کندن سے مکھڑے پر پڑ رہی تھی۔ میں نے جھٹ کیمرہ نکال اس کے تین چار پوز لے لئے۔

وہ چلنے کو ہوئی۔ میں نے جانے کیوں جلدی سے کیمرہ ادھر پلنگ پر پھینک اسے روک لیا۔۔۔۔

کئی دن تک ہم دونوں ایک دوسرے کا سامنا کرتے ہوئے سہمتے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ وہ مجھے اکیلے میں ملنے سے بھاگتی۔ میں اسے دیکھ کر کترا جاتا۔

مالتی کے لئے میرے دل میں کشش کا جیسے خاتمہ ہو گیا تھا۔ اب وہ میری نظروں میں وہ مالتی نہ رہی صرف معمولی نوکرانی کی طرح رہ گئی تھی جس پر دھیان دینا میری پوزیشن اور درجہ کو شوبھا نہیں دیتا تھا۔ پر میں اب بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جب بھولے سے ہماری نظریں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتیں اس وقت اس کی بڑی بڑی آنکھوں کا وہ بھاؤ میری نظروں سے نہ چھپا رہتا تھا جس کے کارن میرے ہردے میں ایک عجیب درد اٹھتا تھا جو بڑھتے بڑھتے مجھے اپنے کو دھتکارنے پر بے بس کرتا تھا۔ ہم لوگوں کی تعلیم و تربیت ایسی ہے کہ ہم جذباتی نہیں ہو سکتے۔ میں نے دھیرے دھیرے اپنی اس کمزوری کو دبا دیا۔ اور کفارہ کے طور پر میں نے مالتی کو دھن دے کر سنتشٹ کر دینے کا فیصلہ کیا۔ آپ لوگ شاید یہ نہ جانتے ہوں کہ ہم زمیندار پیسوں سے اپنی آتما کو بھی شدھ کر لینے کی مشق رکھتے ہیں۔

مالتی کو ایک بار کسی نہ کسی بہانے میں دیکھ ہی لیتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کی روشنی برابر مدھم ہونے لگی تھی جو شک میں نہیں ڈالتا تھا کہ کم ہو۔ اب کچھ دن سے مجھے خیال ہونے لگا کہ میں نے اس کے ساتھ بھاری ظلم کیا۔ ایک دن میں باہر جاتے ہوئے اسے کہہ گیا کہ پان پہنچا جا۔ میں بیٹھک کے اوپر والے کمرے میں لیٹ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈرتی ہوئی ہاتھ میں پان کا ڈبہ لے کر پہنچی۔ میری آنکھ بچاتے ہوئے اس نے پوچھا "کہاں رکھ دوں" میں نے بڑی جرأت سے کہا "ادھر لا" اور اس نے ہاتھ بڑھا دیا ——— اس نے پاندان والا ہاتھ بڑھا دیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ میری آنکھوں سے بچنے کے لئے منہ پھیر لیا۔ میں نے پاندان کے ساتھ اس کی کلائی بھی پکڑ لی۔ اور کھینچتے ہوئے بولا۔ "مالتی مجھے پہچانتی نہیں" اس نے روتی ہوئی آواز سے کہا "مجھے جانے دیں" میں نے کلائی نہ چھوڑی۔ بولا "یہ تیری کیا حالت ہے مالتی کیسی ہو رہی ہو؟" اس نے مشکل سے اتنا کہا "کیا حالت ہے۔ آپ نے مجھے کہیں کا نہ رکھا ——— کیا آپ جانتے نہیں؟۔۔۔۔۔" میں سناٹے میں آ گیا۔ لمحہ بھر اس سوچ نے مجھے گھبرا دیا۔ بیچاری اب کیا کرے گی۔ اس ہندو سماج میں اسے کہاں جگہ ملے گی!

اسے میں بھی نہ جانتا تھا۔ میں نے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا "تو اپنے گھر چلی جا" وہ بولی "میرے گھر کون ہے" میں نے پوچھا "تیرا آدمی کہاں رہتا ہے"؟ وہ کچھ تلملا سی گئی پھر بولی "سنتی ہوں وہ کہیں کاشی میں نوکری کرتے ہیں میں نے تو انہیں شادی کے بعد دیکھا ہی نہیں" میرے من میں اس کے لئے ہمدردی بھر گئی۔ میں نے ترکیب سوچ لی۔ اسے ڈھارس دیتے ہوئے میں نے کہا "تو گھبرا مت میں تجھے آنچ نہ آنے دوں گا"۔ وہ شکریہ کے آنسوؤں سے چھلچھلائی آنکھوں سے مجھے دیکھتی اور آنسو پونچھتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد مجھے اس کا احساس ہوا کہ اس کے لئے میرے دل میں سچی ہمدردی تھی۔

جمادار کو بلا کر میں نے مالتی کے پتی کا پتہ لگایا۔ اس کے پاس خط لکھا کے اور رلے سے یہاں آ کر مالتی کو لوا لے جانے کے لئے خرچ بھیجا۔ وہ آیا۔ میں نے اس کی بڑی بڑی خاطریں کیں۔ وداع کرتے وقت اسے کپڑے لتے سے خوش کر دیا۔ مالتی جا رہی تھی۔ میرے ہردے کا جیسے بوجھ اتر رہا تھا۔ پر دل جیسے بیٹھا جا رہا تھا۔ بھیتر بھیتر ہی جیسے ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ کچھ بھاری چیز کھانے والا ہوں۔ میں اپنی اس کمزوری پر غصہ ور ہوا اٹھا تھا۔ وہ چلی گئی۔ میں نے نوکرانی سمجھ کر اس کے جانے کی پرواہ تک نہ کی پر اس کے چلے جانے کے بعد میرا جی جانے کیسا ہو اٹھا۔ تنہائی میں اپنی آنکھوں میں [illegible] آنسوؤں کو بہنے دینے سے روک نہ سکا۔ جی میں آتا تھا۔ جی بھر رو کر اپنے ہردے کو ایک بار ہلکا کر لوں۔

مالتی چلی گئی۔ پھر اس کی خبر نہ ملی یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ اس کے بچے کا کیا ہوا۔ اپنے بکھیڑوں میں اسے ایک دم بھول گیا۔ اس بیچ میں میرے لڑکے لڑکیاں ہوئیں پتا کا انتقال ہو گیا۔ پندرہ برس بعد میری بیوی بھی چل بسی۔ میں کچھ کا کچھ ہو گیا۔ زمانہ کچھ کا کچھ ہو گیا۔ لوگوں نے بہت مجبور کیا کہ ابھی عمر ہی کیا ہے۔ پر میں دوسری شادی کرنے پر راضی نہ ہوا۔ لڑکیوں کی شادی کر۔ لڑکوں کو تعلقدار کالج میں بھیج بھلا اچھی طرح زندگی بتانے لگا تھا۔ پرانے زمانے میں ہم لوگ جو کچھ کرتے تھے۔ گھر ہی پر رہ کر کرتے تھے۔ پر اب ہمیں دیہاتی دنیا میں مزا نہیں آتا۔ اس لئے ہم موج کرنے شہروں میں نکل جاتے ہیں کبھی کبھی مقدمے کے سلسلے میں کبھی افسروں سے ملنے کے بہانے کبھی تیرتھ جانے کے نام پر میں بھی کسی نہ کسی بہانے جب جی چاہتا کسی نہ کسی بڑے شہر کی پناہ لیتا۔ وہاں ہمارا روزانہ مشغلہ کیا ہوتا۔ شاید آپ لوگوں کو اس کا خیال نہ ہو۔ ہمارا من وہاں کھانے پینے۔ خرید و فروخت کھیل تماشے موج مزے میں بیتتا ہے۔ تیرتھ استھانوں میں جا کر ہم لوگ گنگا بھی نہا لیتے ہیں۔ گھنٹوں جاپ بھی کر لیتے ہیں۔ برہمنوں اور مندروں کے پجاریوں کو خوش کر کے دعا بھی بٹور لیتے ہیں۔ پر یہ سب جیسے اوپرے دل سے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے۔ آپ اسے دورنگی سمجھیں۔ ہم اس پر جھینپنے والے نہیں ہمیں اس کی شرم نہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ ہم اس زمین پر سکھ بھوگنے کے لئے آئے ہیں۔ اس دنیا میں دن سکھ سے بیتے۔ اس لئے کبھی کبھی دھرم کے کام کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

میری بیوی کو مرے پانچ سال ہو گئے تھے۔ میں گاؤں سے اکتا کر کاشی میں جی بہلانے پہنچا تھا۔ دیوالی کا تہوار بیت چکا تھا۔ ہلکی سردی پڑنے لگی تھی۔ رات کے قریب نو بجے میں وہاں کی اس گلی میں ہوا کھانے نکلا تھا جس کا نام آج کل کے پڑھے لکھے زبان پر لانے میں ہچکچاتے ہیں۔ پر میں کاشی کی اس گلی کا نام لینا اتنا برا نہیں سمجھتا۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ وہاں بیسوائیں رہتی ہیں۔ میں اس دال منڈی میں پان والے کی دکان پر کھڑا پان کھا رہا تھا۔ سامنے لگے جلی شیشے میں اپنی مونچھ اینٹھ رہا تھا۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر میں من میں خوشی سے پھول رہا تھا۔ سوچتا تھا کیا یہ صورت اس عمر میں بھی کسی کا دل لبھانے میں کسی سے پیچھے رہ سکتی ہے۔ دیکھتے دیکھتے مجھے اس آئینے میں کسی حسینہ کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ میں نے مڑ کر اوپر دیکھا تو سامنے کھڑکی پر بیٹھی ایک بائی جی مسکرا رہی تھیں۔ سر میں اتھل پتھل ہو اٹھا۔ کچھ سمجھ نہ آتا تھا کہ اسے دیکھ کیوں آنکھ للچا گئی کبھی دیکھا ہو یہ دوسری بات ہے۔ پر یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں دیکھا ہے

پان والے کی کتنی گلوریاں چبا گیا۔ اور کھڑا کھڑا مسکراتا رہا۔ میرے ساتھ میرا معتبر اور وفادار نوکر رامو بھی تھا۔ وہ اس وقت بھی میرے ساتھ ہے۔ تیسرے ڈبے میں اسے آپ دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے رامو کو اشارہ کیا۔ وہ راستہ ڈھونڈھ کوٹھے پر جا پہنچا۔ لمحہ بھر بعد میں نے پان والے سے بائی کا اتا پتا پوچھا۔ معلوم ہوا ان کا نام چمپا بائی ہے اور اس شہر میں اس کے حسن اور گلے کی دھوم مچی ہوئی ہے میں نے چار پان منہ میں دبائے اس کی طرف روپیہ پھینک دیا۔ رامو نے آ کر دھیرے سے کہا سرکار چلیں۔ اور میں کوٹھے پر جا پہنچا۔ وہ نیچے زینے پر بیٹھا اپنی بیڑی سلگانے میں لگ گیا۔ اوپر پہنچتے ہی بائی جی نے میرا استقبال کیا۔ پان حاضر کئے سازندوں کی پکار ہوئی۔ یہ سب ہوتا رہا میں ایک ٹک اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ مسکرا کر مجھے دیکھتی رہی۔

مجرا ہوا اس نے خوب گایا میں نے بھرپیٹ داد دی۔ اور مٹھی بھر بھر کے انعام دیئے۔ اس نے اور اس کے سازندوں نے جھک جھک کے سلام کئے۔ قریب

گیارہ بجے میں گھر لوٹ آیا۔ سارے راستے میں کچھ سوچنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ مجھے یہ بھی پتا نہ چلا کہ کیا سوچتا تھا۔ اب میرے دن اچھے کٹنے۔ سویرے گنگا اشنان کرتا۔ گھاٹ پر بیٹھ کر جپ کرتا۔ لوٹ کر وشنو ناتھ اَن پورنا کا درشن کر۔ دل بہلاتا۔ کچھ دن بیت چلے۔ اب ہم دونوں میں بے تکلفی بڑھنے لگی۔ گانا بجانا کم ہونے لگا۔ گپ شپ ہنسی مذاق بڑھنے لگے۔ اکثر ہم اکیلے بیٹھ کر گھنٹوں تاش کھیلتے۔ کبھی کبھی بیچ بیچ میں میں ہارمونیم بجانے لگتا۔ اور اس سے کسی گیت گانے کی فرمائش کرتا۔

اس دن کچھ سردی بڑھ گئی تھی "اندھیری پاکھ" کی رات ہلکی بدلی کے کارن اور بھی اندھیری ہو رہی تھی۔ پر جب میں اندھیری سڑکوں اور گلیوں کو پار کر اس گلی میں پہنچا تو وہاں کافی روشنی تھی۔ دو کانوں پر گیس کی بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ اس زمانے میں کاشی میں بجلی کا انتظام نہیں تھا۔ میں نے دیکھا "بائی جی" کچھ اداس سی جیسے کسی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ کمرے میں "پیٹرومکس" جل رہا تھا۔ اس کی دودھ سی روشنی میں اس کا چہرہ کنول سا لگ رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "تم بہت اچھی لگ رہی ہو جمنا" اس نے شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ بولی "کب سے راستہ دیکھ رہی ہوں۔ یہ تو نہ پوچھا۔ راستہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرانے لگیں" مجھے اس شروعات پر ہنسی آ گئی۔ پر میرا دل اس کا مذاق کرنے پر راضی نہ ہوتا تھا۔ میں نے کہا "اچھا معاف کرو بائی جی بولو کچھ سنانی ہو؟"

میں نے فرمائش کی وہ ہنس ہنس کر گانے لگی اس دن گانا خوب جما۔ سازندوں نے خوب بجایا۔ بائی جی نے بھی اپنا جوہر دکھایا میں تو خوشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے ایسا جان پڑنے لگا گویا میں سنگیت کی میٹھی لہروں پر بہتا جا رہا ہوں۔ گلی میں سناٹا چھا گیا۔ تماش بینوں کا جھنڈ بھی چلا گیا۔ زیادہ تر کھڑکیوں کے دروازے بھی بند ہو چکے تھے۔ گھڑی پر نظر پڑی تو بارہ بج رہے تھے۔ میرا اشارہ پاتے ہی سازندے چلتے بنے۔ میں بھی اُٹھنے کی سوچنے لگا تھا۔ "بائی جی" نے کہا "معاف کیجیے گا!" یہ کہہ کر پاس کے کمرے میں چلی گئی باہر کی ٹھنڈی ہوا پردوں کو اڑاتی ہوئی بھیتر آ رہی تھی۔ مجھے ایسا جان پڑا گویا پانی کی چھینٹیں بھی آ رہی تھیں۔ سامنے کمرے کی طرف نظر چلی گئی۔ دروازے پر لگے جالیدار پردے کے بھیتر روشنی جگمگا رہی تھی۔ ایسا جان پڑا گویا جمنا بائی کسی کام میں لگ گئی ہیں۔ میں اس سے بدا مانگنے کی نیت سے کمرے میں جا پہنچا۔ دیکھا تو سامنے بڑے آئینے کے کھڑی وہ اپنے بال ٹھیک کر رہی ہیں۔ میں نے اس کی پیٹھ پر لٹکے ہوئے چمکیلے لمبے بالوں کو دیکھا

میں پاس جا پہنچا۔ آئینے میں اس کی جوانی کی خوبصورتی دیکھ میں بے ہوش سا ہو گیا۔ میں نے کہا "جمنا بائی کافی دیر ہو رہی ہے اب چلتا ہوں"۔ اس نے مسکراتے کہا "سچ مچ آپ جانا چاہتے ہیں۔ اس سردی کی رات میں بے وقت آپ جا کر کیا کریں گے"۔ اور اس نے میرے چہرے پر آنکھیں گڑا دیں" میرا جی جانے کیسا ہو گیا۔ پھر بھی میں نے اپنے کو روکا۔ میں نے کہا "جاؤں گا نہیں تو یہاں کیا کروں گا"۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر پاس صوفے پر بٹھا دیا اور اپنی ساری سنبھالنے لگی۔ میں نے ایکا ایک اس کا نرم ہاتھ کھینچ اسے بغل میں بٹھا لیا اور بولا "مجھے جانے کیوں نہیں دیتیں"؟ وہ چپ چاپ مسکرا رہی تھی۔ کونے میں اگردان میں سلگتی ہوئی اگربتی کی خوشبو کمرے کو بسا رہی تھی۔ اس کے نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں دباتے ہوئے میں نے پوچھا "بولتی کیوں نہیں جاؤں یا رہوں"؟

وہ منہ پھیر کر چپ ہو رہی۔ میرے حواس غائب ہونے لگے۔ سامنے کچھ اوپر دیوار پر لگے سنہری چوکھٹے والی تصویر پر میری نظر جا پہنچی۔ مجھے ایسا جان پڑا گویا جمنا دھیرے دھیرے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہی ہے لمحہ بھر کے لئے میں اس طرف متوجہ ہو کر اسے دیکھنے لگا "تصویر ہے"! یہ خیال آتے ہی میں نے جمنا کا مکھ پھیرتے ہوئے پوچھا "تمہاری یہ تصویر کس ہوشیار مصور کی بنائی ہوئی ہے"؟ چتر کی طرف وہ ایک نگاہ دیکھتے ہوئے بولی "یہ میرا چتر نہیں ٹھاکر صاحب" "پھر کس کا ہے۔ تمہاری بہن کا"؟ میں نے پوچھا۔

"نہیں وہ میری ماں کا ہے" میں نے محسوس کیا "ماں" کا لفظ کہتے ہوئے اس کی آواز میں کچھ لڑکھڑاہٹ سی آ گئی تھی۔ میں نے پوچھا "کیا تمہاری ماں اب جیتی نہیں ہیں"؟ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولی "میری ماں مجھے زمین پر جنم دینے کے ساتھ ہی سورگ کو سدھاری تھیں"۔ میں اس تصویر کو رہ رہ کر غور سے دیکھنے لگا۔ یہ آنکھیں جیسے اسے کبھی دیکھنے میں مشتاق تھیں۔ میں اپنی یادداشت کے خزانے میں ٹٹول رہا تھا۔ پر کچھ دھیان میں نہ آتا تھا۔ میں نے جاننے کی خواہش سے پوچھا "تمہاری ماں کی ماں نے تمہیں پالا پوسا ہو گا"! اس نے یتیم کی طرح دردمند ہو کر جواب دیا "ٹھاکر صاحب میری ماں وہ نہ تھی جو میں ہوں"۔ اس پر مجھے اور پوچھنے کی جرأت ہوئی۔ اس لئے میں نے پھر پوچھا "تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا تم تو کہتی ہو تم نے اسے دیکھا ہی نہیں"۔

وہ بولی "جس دائی نے مجھے پالا پوسا تھا وہ بتاتی تھی کہ اس کی گود میں مجھے سونپ کر میری ماں نے بڑی مشکل سے جان دی تھی"! ایکا ایک یونہی سا خیال بجلی کی طرح میرے من میں کوند گیا۔ پھر جیوں کا تیوں اندھیرا ہو گیا۔ میں نے پوچھا "کیا

تمہارے یہاں کوئی اور نہ تھا جو تمہیں اس پیشے سے بچاتا"

"کون تھا ۔ میرے پتا نے میری ماں کو اس سبب سے تیاگ دیا تھا کہ میری ماں کا تعلق ایک گاؤں کے ٹھاکر سے ہوگیا تھا" میں نے ہمت کرکے پوچھا ۔ "تمہاری ماں کون جاتی کی تھی؟" "امیرن ۔ ۔ ۔ ۔" اس نے جواب دیا ۔ میں پوچھتا گیا ۔ "اس کا گھر کہاں تھا" وہ بولی "یہاں سے بہت دور کسی گاؤں میں ۔ مجھے یاد نہیں بھلا سا نام بتلاتے تھے ۔ میرا دل کانپ رہا تھا ۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا لیکن ایک غیبی روشنی سے کچھ دیکھ کر میں نے پوچھا "تمہاری کیا عمر ہوگی جمنا" وہ اس غیر معمولی مسرت کش سوال سے کچھ شرما سی گئی ۔ اس نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے مسکرا کر کہا "میری عمر کیوں پوچھتے ہیں آپ کیا میں بڑھی جان پڑتی ہوں؟" میں نے کہا "نہیں نہیں کتنے دن ہوئے ہوں گے تمہاری ماں کو مرے ہوئے" ۔ امیرن کا گلا جیسے بھر آیا ۔ بولی "اسے مرے ہوئے اب بیس برس ہو رہے ہیں ۔ اور اتنی ہی میری عمر ہوگی" میں نے ایک بار پھر اس تصویر کی طرف غور سے دیکھا ۔ مجھے ایسا معلوم ہوا گویا مالتی مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہے ۔ میرے ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہو گئے ۔ میں نے لمحہ بھر کے لئے آنکھیں موند لیں ۔ میری بغل میں کون بیٹھا ہے اس خیال نے سانپ کی طرح گویا مجھے ڈس لیا ۔ میں ایک ایک کھڑا ہو گیا ۔ اور یہ کہتا ہوا وہاں سے بھاگ نکلا "جمنا بہت دیر ہو رہی ہے ۔ اب نہیں ٹھہر سکتا" وہ مجھے روکنے کے لئے نہ اٹھ سکی میں دھڑ دھڑاتا ہوا زینے کے نیچے اتر گیا ۔ زینے کے دروازے پر رامو کو پھاند کر گلی میں جا پہنچا ۔

گرتا پڑتا بھاگتا ۔ جب میں ڈیرے میں پہنچا تو میرے چوکیدار نے پوچھا "سرکار کیسے آ رہے ہیں اور رامو؟" میں نے کچھ جواب نہ دیا ۔ سیدھا کمرے میں پہنچ کر پلنگ پر پڑ کر ہاتھوں سے منہ ڈھانپ رونے لگا "یا پرمیشر تو نے مجھے صاف صاف بچا لیا" اور یہ کہہ کر وہ بوڑھے ٹھاکر صاحب اپنا منہ ڈھانپ کر بچوں کی طرح رونے لگے ۔ اور ہم دونوں جھینپے سے ادھر ادھر دیکھنے لگے خیریت یہی تھی کہ اس وقت اس سارے ڈبے میں ہمیں تینوں مسافر باقی تھے ۔"

میل ٹرین اپنی پوری رفتار سے شور مچاتی ہوئی بھاگی جا رہی تھی ۔ پر ہمارے کمرے میں سناٹا چھا رہا تھا اور ہم تینوں پتھر کی مورتی کی طرح خاموش بیٹھے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے چاند کی طرف دیکھا وہ اب کسی بحث کے لئے تیار نہ تھا"

(چاند)

شری بھارتیا ایم اے ۔

مہر محمد خاں شہاب

سوزِ ناتمام

اے مری شامِ خزاں کے بادل
میری تخئیل کے خوابوں میں جھلکنے والے
میری امید کی کرنوں میں دمکنے والے
ڈال دے اب مرے رُخ پر آنچل
میں تری یاد کو اس طرح چھپا رکھوں گا
جیسے مضراب کے سینے میں نہفتہ نغمے
عمقِ بحر میں جس طرح اچھوتا موتی
جیسے انگور کے قطروں میں وجودِ مستی
آ بھی اب چاند ستارا بن کر
میری راتوں کی سیاہی کا اجالا بن کر
تیرا کمزور یہ بازو شہنا
ڈوبتے کے لئے تنکے کا سہارا ہوگا
اور تو نے نہ دیا ساتھ اگر
زندگی کی یہ کٹھن راہ گزر
اور جوانی کا یہ دشوار سا دشوار سفر
کیسے طے ہوگا اکیلے تنہا

علی احمد ۔۔۔

اُبال

جب دودھ اُبل اُبل کر کوئلوں پر گرنے لگا اور شاں شاں کی آواز کے ساتھ ایک تیز سی بو اٹھی تو چندن نے ہڑبڑا کر پتیلی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کوئلوں کی تپش سے پتیلی سرخ ہو رہی تھی۔ بے بسی کے انداز میں چندن نے جلد جلد ادھر اُدھر دیکھا — کوئی کپڑا پاس نہ تھا۔ اس نے چاہا، پانی کا چھینٹا ہی دے دے لیکن لوٹے کے پانی میں ابھی ابھی اس نے آٹے والے ہاتھ دھوئے تھے۔

دودھ ابل رہا تھا اور جلتی ہوئی جھاگ کی بو کمرے میں پھیلنے لگی تھی۔ اندر اس کے مالک اور مالکن آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ بے بسی کے اس لمحے میں چندن کے بڑھے ہوئے ہاتھ اور آگے بڑھ گئے۔ اور لحظہ بھر میں تپتی جلتی پتیلی کھٹ سے فرش پر آگئی۔ چندن کی انگلیوں کی پوریں جل گئیں، اُبلتا ہوا دودھ اس کے ہاتھوں پر گر گیا اور جلن کی وجہ سے اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ ایک "سی" نکل گئی۔

پتیلی کو کھٹ سے فرش پر رکھتے ہوئے تھوڑا سا دودھ فرش پر بھی گر گیا تھا۔ اسی آٹے کے پانی سے اُس نے اُسے دھو ڈالا۔ اور انگلیوں کی جلن کو جیسے جھاڑ کر اتارتا ہوا وہ غسل خانے کی طرف بھاگا۔

پانی کی دھار کے نیچے ہاتھ رکھے رکھے اُس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور مسکرایا۔ جب کبھی اس سے کوئی بے وقوفی سرزد ہو جاتی تھی۔ وہ اسی طرح سر ہلا کر ہونٹوں کے بائیں کونے میں مسکرایا کرتا تھا۔ اور ہونٹ کٹے ہونے کے باعث اس کے دانت دکھائی دینے لگتے تھے۔

بات یوں ہوئی کہ دودھ کو انگیٹھی پر رکھ کر وہ اپنے مالک اور مالکن کی باتیں سننے میں محو ہو گیا تھا۔ اگرچہ دن کافی چڑھ آیا تھا اور چندن نے دوپہر کے کھانے کے لئے آٹا تک گوندھ لیا تھا لیکن وہ دونوں ابھی بستر ہی میں تھے اور کچھ ہی دیر پہلے اس کے مالک نے وہیں سے چندن کو چائے بنانے کا حکم دیا تھا۔

اس نے دودھ کی پتیلی کو انگیٹھی پر رکھ دیا تھا۔ اور دروازے کی طرف کان لگائے اپنے مالک اور مالکن کی باتیں سننے لگا تھا۔ جب سے اس کے مالک کی شادی ہوئی تھی۔ وہ دیر سے اٹھتا تھا۔ اس سے پہلے وہ علی الصبح اُٹھنے کا عادی تھا۔ نور کے تڑکے اُٹھ کر وہ چندن کو اٹھاتا۔ مالش کرواتا۔ ورزش کرتا۔ بارہا سیر کو بھی جاتا لیکن اب وہ اپنی اس نئی بیوی کے ساتھ دن چڑھے تک سویا رہتا۔ اور جب جاگتا تو وہیں لیٹے لیٹے اسے چائے بنانے کا حکم دے دیا کرتا۔ چندن کو ان باتوں میں رس آنے لگا تھا۔ وہ بستر پر لیٹے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہوتے وہ میٹھا انہیں سننے کی کوشش کیا کرتا۔

آنچ کی تیزی کے باعث دودھ پتیلی میں بے طرح ابل کھا رہا تھا۔ اور چندن اس طرف سے بے خبر ہمہ تن گوش اپنے مالک اور مالکن کی باتیں سننے کی کوشش میں مصروف تھا۔

"میں مجبور ہو جاتا ہوں۔ تمہارے گال ہی ایسے ہیں"۔ ..... "آپ کے ہاتھوں کا تو کوئی قصور نہیں" ..... "اتنے اچھے ہیں تمہارے گال کہ" ..... "جلنے لگے ہیں آپ کی چٹکیوں سے" .... "تو میں انہیں ٹھنڈا کر دیتا ہوں ....."

اور چندن کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے کوئی نرم و نازک پھول ریشم کے فرش پر جا پڑا ہو تصور ہی تصور میں اس نے دیکھا کہ اس کے مالک نے اپنے ہونٹ اپنی بیوی کے گالوں سے چپکا دیے ہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کا جسم گرم ہونے لگا۔ اس کے اعضا تن گئے اور تصور ہی تصور میں اپنے مالک کی جگہ اس نے لے لی۔

ہاتھ دھو کر اس نے سر کو پھر جھٹکا دیا اور ہونٹوں کے بائیں کونے سے مسکراتا ہوا وہ اندر گودام میں گیا۔ اس نے ذرا سا سرسوں کا تیل لے کر اپنے ہاتھوں کی میلی سیاہ، جلتی ہوئی پشت پر اس جگہ لگایا۔ جہاں جلن ہو رہی تھی۔ پھر جا کر وہ باورچی خانے میں بیٹھ گیا۔ اور اُس نے چائے کی کیتلی انگیٹھی پر رکھ دی۔

لیکن ہاتھ جلانے اور اپنی اس حماقت پر دو بار سر ہلا کر مسکرانے کے باوجود اس کے کان پھر کمرے کی طرف لگ گئے اور اس کا تصور اپنی تمام یکسوئی کے ساتھ اس کے سامنے کی مدد پر کمر بستہ ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے پھر کئی تصویریں اُبھرنے اور مٹنے لگیں۔

. . . .

"چندن!" اس کے آقا نے چیخ کر آواز دی اور پھر کہا "وہیں مر گیا کیا؟"

آقا کی آواز سن کر وہ چونکا۔ جلد جلد چائے اور توس تیار کر کے اندر لے گیا اس کی مالکن اور مالک حسب دستور بستر پر پڑے تھے۔ وہ دونوں ہم آغوش تو نہیں

تھے۔ لیکن پھر بھی دونوں ایک دوسرے سے لگے تکئے کے سہارے لیٹے ہوئے تھے۔ لحاف ان دونوں کے سینے تک تھا۔ اور مالک کا بازو ابھی تک مالکن کی گردن کے نیچے تھا۔

"ادھر رکھ دو!"

چندن نے ٹرے تپائی پر رکھ دیا۔

ایک نظر دیکھ کر مالک نے کہا "نہیں ہو کیا گیا ہے؟ دودھ کا جگ کہاں ہے؟"

"جی ابھی لایا!" اور سر کو ایک بار جھٹکا دے کر ہونٹوں کے بائیں کونے سے مسکراتا ہوا وہ رسوئی کی طرف بھاگا۔

دوسرے لمحے اس نے دودھ کا برتن لا کر رکھ دیا۔ لیکن اسے پھر گالیاں سننا پڑیں۔ کیونکہ دوبارہ دیکھنے پر مالک کو معلوم ہوا کہ چھلنی بھی نہیں ہے۔

چندن نے چھلنی لا کر رکھ دی اور لمحے بھر کے لئے وہیں کھڑا رہا۔ اُس کی دبی ہوئی نگاہ اپنی مالکن کے چہرے پر جا پڑی۔ خوبصورت لمبے کھلے بالوں کی لٹیں اس کی گوری پیشانی پر بکھری ہوئی تھیں۔ ہونٹ سوکھے ہونے کے باوجود گیلے گیلے تھے۔ مسکراتی سی آنکھوں میں خمار کی باریک سی لکیر تھی اور چہرے پر ہلکا سا اضمحلال چھایا ہُوا تھا۔ اس کے مالک نے بڑے پیار سے کہا "چائے بنا دو نا جان!"

لیکن جان نے روٹھتے ہوئے کروٹ بدل لی۔

"میں کہتا ہوں چائے نہیں ہو گی" اسے مناتے ہوئے مالک نے کہا۔

"مجھے نہیں پینی چائے" گال کو مسلتے ہوئے مالکن نے جواب دیا۔

گردن کے نیچے کا بازو اٹھا اور مالکن اپنے مالک کی آغوش میں بھنچ گئی۔

"کیا کرتے ہو شرم نہیں آتی؟"

چندن کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اور اس کے مالک کا قہقہہ کمرے میں گونج اٹھا۔

"اٹھو نا بنا دو نا چائے!" مالک نے بڑی ملائمت سے ہاتھ کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے کہا "تمہارے گال ہی ایسے پیارے ہیں کہ خواہ مخواہ ان پر چٹکیاں لگانے کو جی چاہتا ہے!"

تڑپ کر مالکن نے پھر کروٹ بدل لی۔

"چندن تم بناؤ چائے!"

شدتِ احساس سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چندن نے چائے کی پیالی بنائی۔

پیالی اٹھا کر اپنی جان کو آغوش میں بھینچتے ہوئے اس نے کھڑا بھیگ پیالی اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔

. . . .

یہ "جان" کا لفظ تھا۔ یا اس کے مالک کا اس کے سامنے بیوی کو آغوش میں لینے کا طریقہ کہ جب دوپہر کو چندن کام کاج سے فارغ ہو کر اپنی کوٹھڑی میں جا لیٹا تو اس کے سامنے زہرہ جان کی تصویر کھنچ گئی۔ اور اس نے اضطراری طور پر سرسوں کے تیل اور مٹی میں سنے ہوئے بے غلاف کے خستہ اور بوسیدہ تکئے کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔

اچانک ابل کر اوپر آ جانے والے دودھ کی طرح نہ جانے زہرہ کی یہ تصویر کس طرح اس کے بچپن کے گہرے دبے غاروں سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی — وہی بوٹا سا قد۔ بھرا بھرا گدار جسم۔ بڑی بڑی چنچل آنکھیں۔ پان کی لالی سے رنگے ہونٹ۔ بھرے کولہے۔ وہی سینے کا ابھار اور وہی مسکراہٹ جس کے منبع کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ کہ آیا پہلے اس کی آنکھوں میں شروع ہوتی ہے یا ہونٹوں پر۔

وہ اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ اور ماں باپ کے مر جانے کی وجہ سے اپنی موسی کے پاس رہا کرتا تھا۔ اس کی یہ موسی ایک سیٹھ کے بچوں کی دایہ تھی۔ یہ سیٹھ چاوڑی بازار میں گراموفون اور دوسرے سازوں کی دکان کرتا تھا۔ اسی دکان کے ساتھ زہرہ کا چوبارہ تھا۔ اور سیٹھ کی دکان کے باجے آہستہ آہستہ چاندی کے سکے بن بن کر وہاں پہنچا کرتے تھے۔

چندن اپنے بڑے بھائی اور پنڈت جی کے بڑے لڑکے کے ساتھ کبھی کبھی زہرہ کے چوبارے پر چلا جاتا تھا۔

زہرہ پنڈت جی کے لڑکے کو پیار کیا کرتی تھی۔ مٹھائی وغیرہ دیتی تھی۔ اور اس کا کچھ چوتھا حصہ ان دونوں بھائیوں کو بھی ملا کرتا تھا۔ کئی بار وہ دوسرے بچوں کے ساتھ چوبارے کے باہر آنگن میں کھیل رہا ہوتا اور سیٹھ جی زہرہ کے پاس جا بیٹھتے اسے آغوش میں لے لیتے یا اُس کے زانوؤں پر سر رکھ کر لیٹ جاتے۔

اس کی یہ مالکن بھی تو زہرہ سے ملتی جلتی تھی۔ اُسی جیسا بوٹا سا قد۔ اسی جیسے بھرے بھرے کولہے۔ اُمڈی ہوئی چھاتیاں۔ گول گول رس بھرے گال۔ بڑی بڑی مسکراتی آنکھیں اور گیلے ہونٹ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس ایک لمحہ میں مالک کے پہلو میں اسے لیٹے ہوئے دیکھ کر ہی اسے زہرہ کی یاد نہ آ گئی تھی۔

تصور ہی تصور میں چندن زہرہ کے بالاخانے پر پہنچ کر سیٹھ کی طرح اُس کے زانوؤں پر لیٹ گیا۔ اور زہرہ پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ

.... وہ بھول گیا کہ اس کے ٹخنوں تک میل چڑھی ہوئی ہے خشکی سے باعث ٹانگوں کی جلد گھٹنوں تک پپڑی سی بن گئی ہے۔ اس کا تہبند جو اس کے مالک نے مدت ہوئی دیا تھا میل سے کالا ہو گیا ہے۔ اس کی قمیص کئی جگہ سے پھٹی ہوئی ہے۔ اس کے سانولے ماتھے پر چوٹ کا ایک نہایت بدنما داغ ہے۔ اس کا نچلا ہونٹ کٹا ہوا ہے اور اس کے سر کے بال چھوٹے چھوٹے کھڑے اور روکھے ہیں۔ وہ سست لیٹا رہا۔ اور زہرہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ وہیں اُس کے زانوں پر لیٹے لیٹے اس نے کروٹ بدلی۔ اور پیار سے کہنا چاہا۔ "زہرہ کتنی اچھی ہو تم ....." لیکن اس کی کمر میں کوئی سخت سی چیز چبھی۔ اور اس وقت اُسے معلوم ہوا کہ وہ ننگے فرش پر لیٹا ہوا ہے۔ وہ چیز جس پر اس کا سر رکھا ہے۔ زہرہ کا زانو نہیں بلکہ ایک بوسیدہ سڑا گلا تکیہ ہے۔

چندن نے سر کو جھٹکا دیا لیکن وہ مسکرایا نہیں۔ اٹھ کر دیوار کے ساتھ بیٹھ لگا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں کے سامنے پچھلے کئی برس اڑتے ہوئے سے گذر گئے۔

سیٹھ جی تو اپنی سب جائداد جو باردل کے حسن کی نذر کر کے اپنے نانا کے گاؤں چلے گئے تھے، جو وسط پنجاب میں کہیں اپنی سادگی۔ غلاظت اور ناخواندگی کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔ چندن کی موسی اور اپنے گاؤں چلی گئی تھی اور چندن اس چھوٹی عمر میں ہی تین روپے ماہوار پر ان سیٹھ صاحب کے ایک دوست کے ہاں نوکر ہو گیا تھا۔

اس کے بعد اس کی زندگی اس کمبل کی طرح تھی جسے ایک جگہ سے سوکیا جائے تو دوسری جگہ سے پھٹ جائے۔ دوسری جگہ سے سیا جائے تو تیسری جگہ سے چاک ہو جائے۔ اپنے اس مالک کے ہاں پہنچ کر اس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ اور اس نے محسوس کیا تھا کہ ایسا زندہ دل۔ خوش مزاج اور کھلی طبیعت کا مالک گذشتہ بارہ سال کی نوکری میں اسے نہیں ملا۔ لیکن اس کے مالک کی فراخ دلی اس کے لئے مصیبت بن گئی تھی۔ اس کا مالک اس کے سامنے ہی اپنی بیوی کو پیار کرنے میں ذرا بھی نہ جھکتا تھا۔ جیسے چندن کوئی آدمی نہ تھا۔ مٹی کا لوندا تھا۔

چندن نے سوچا اس شادی سے پہلے وہ اطمینان سے رہتا تھا۔ یہ بے چینی سی، یہ گرمی گرمی سی، یہ اعضا کا تناؤ سا، یہ شب بیداری سی۔ اس نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ پہلے وہ سوتا تھا تو اسے دین دنیا کا ہوش نہ رہتا تھا۔ لیکن جب سے اس کے مالک نے شادی کی تھی اور اس کی یہ نئی مالکن آئی تھی۔ اس کی نیند اڑ سی گئی تھی۔ اسے عجیب عجیب طرح کے خواب آتے تھے۔ رات اس نے کاشی کو دیکھا تھا۔ کاشی اس کے پہلے مالک کی لڑکی تھی۔ کچی ناشپاتیوں کی سی چھاتیاں تھیں۔ ٹخنوں سے اونچا لہنگا اور بنڈی پہنے وہ ننگے سر گھوما کرتی تھی۔ یہی لڑکی خواب میں اس کے ساتھ آ لپٹی تھی۔ کیسے؟ کہاں؟ اسے کچھ یاد نہیں لیکن وہ جاگ اٹھا تھا۔ اس کا جسم گرم تھا۔ اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ اسے پسینہ آ گیا تھا۔ پھر وہ سو نہ سکا تھا۔

کچھ بھی سمجھ میں نہ آنے سے اپنی بے وقوفی پر اس نے سر ہلایا۔ لیکن وہ ہنسا نہیں۔ اس کا مالک دفتر گیا ہوا تھا۔ مالکن اندر کمرے میں گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ وہ اٹھا اور پڑوس میں رائے صاحب کے نوکر جیٹھو کی کوٹھڑی کی طرف چل پڑا۔

. . . .

چیت کی پورنماشی کا چاند برگد کے پیچھے سے آہستہ آہستہ نکل رہا تھا۔ نو عمر کیکر کے پتے اس کی کرنوں کے لمس سے چمک اٹھے تھے۔ چندن آہستہ آہستہ اپنی کوٹھڑی سے نکلا۔ سامنے کوٹھی کے پورچ پر پھیلے ہوئے دو گن بیلیا کے سرخ گل اناری پھول چاندنی میں ہلکے سیاہی مائل معلوم ہوتے تھے۔ ایک طرف گل مہر کا پرانا درخت جس کا تنا پار سال درمیان میں سے کاٹ دیا گیا تھا۔ اپنی چند ایک شاخوں کے سروں پر پتوں اور پھولوں کے گچھے لئے جھوم رہا تھا۔ دور سے یہ گچھے بادلوں کے ننھے ننھے پارے سے معلوم ہوتے تھے۔ رگ رگ بدندے اور کرنے کے پھولوں کی خوشبو فضا میں بسی ہوئی تھی۔ اگرچہ ابھی تک وہ سب اندر کمرے میں سوتے تھے لیکن آمدِ بہار کے باعث سردی زیادہ نہ رہی تھی۔ چندن ایک عالمِ محویت میں گوندی کے درخت کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس نے بے خیالی میں ایک دو ننھی ننھی گوندنیاں توڑ کر منہ میں ڈال لیں۔ پوری طرح پکی نہ تھیں۔ اس کا منہ بے مزہ ہو گیا۔ ایک لمحہ تک وہ شش و پنج کی سی حالت میں وہیں کھڑا رہا۔ پھر وہ برآمدے میں گیا۔ اور اس نے بڑی احتیاط سے دیوان خانے کا دروازہ کھولا۔

سونے کا کمرہ مردانے کے ساتھ ہی تھا اور دیوان خانہ عام طور پر کھلا رہتا تھا۔ اس کا ایک دروازہ وہ باہر سے بند کر لیا کرتا تھا۔ اور ایک اس کے مالک اندر سے بند کر لیتے تھے۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ مالک کے سونے کے کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی۔ اس کا عکس دروازے کے شیشے پر پڑ رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی نے گدلی روشنی کا برش دروازے کے شیشوں پر پھیر دیا ہو۔ آہستہ آہستہ دری پر پاؤں رکھتا

ہوا چندن بڑھا اور جا کر دروازے کے ساتھ پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا۔

اندر چھت میں لال رنگ کا بلب روشن تھا۔ اس کی مدھم روشنی میں وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بھاگا۔ اس کا جسم گرم ہونے لگا تھا۔ اعصاب تننے لگے تھے۔ اس کا گلا اور ہونٹ خشک ہو گئے تھے اور اس کی نسوں میں جیسے دودھ اُبلنے لگا تھا۔

پنجوں کے بل بھاگ کر وہ باہر آیا۔ آہستہ سے اس نے دروازہ بھیڑا۔ اور باہر چاندنی میں آ کھڑا ہوا۔ سامنے گل مور کا تنا کھڑا تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ ہڑ پسینے کی ایک ضرب سے وہ تنے کو گرا دے۔

کوٹھی کے سامنے لان میں فوارے کے گرد سرخی مائل پیلے پیلے پھولوں کے بے شمار پودے لہرا رہے تھے۔ جن کے چوڑے چوڑے پتوں پر پانی کی بوندیں پھسل پڑا کرتی تھیں۔ کروندے کی خوشبو اور بھی نکھری ہو کر فضا میں بس گئی تھی۔ چندن نے جا کر فوارے کی ٹونٹی گھما دی۔ پھر رہ رہ کر ایک میٹھی سی پھوار اس پر پڑنے لگی۔

وہ جیٹھو کے ہاں کیوں گیا؟ وہ سوچنے لگا ـــ دوپہر کے وقت اردگرد کی کوٹھیوں کے نوکر جیٹھو کی کوٹھڑی میں جمع ہوتے تھے۔ کبھی تاش کھیلتے۔ کبھی چوسر کی بازی لگاتے۔ کبھی اپنے اپنے مالکوں اور مالکنوں کی نقلیں اتارتے۔ کبھی کبھار جیٹھو اپنے چچا سے ایک پرانا گراموفون مانگ لاتا جو اس نے کبھی ایک کباڑی کی کلیرنگ سیل میں خریدا تھا۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے اسہال کا مریض کراہ رہا ہو۔ لیکن وہ سب بڑے مزے سے "اس پرگوری تیرے گورے گال ہے"، "یا تو سے لاگی نجریا ہے" سنا کرتے۔ حال میں جیٹھو چار پی کا ایک نیا ریکارڈ لے آیا تھا۔ اور دوپہر بھر اس کی کوٹھڑی میں تیری نظر نے مارا

(تیری نظر نے مارا۔

ایک دو تین چار پانچ چھ۔ سات آٹھ۔ نو دس گیارہ۔

تیری نظر نے مارا۔)

ہوتا رہتا تھا۔ لیکن چندن کبھی ادھر نہ گیا تھا۔ اُسے وقت ہی نہ ملتا تھا۔ صبح سویرے ہی اس کا مالک اُسے جگا دیا کرتا تھا۔ وہ اس کے مالش کرتا۔ اس کے لئے نہانے کا پانی تیار کرتا۔ چائے بناتا۔ اس کے دفتر چلے جانے کے بعد دوپہر کے کھانے کا انتظام کرتا۔ کھانا بنا کر دفتر لے جاتا۔ آ کر نہاتا۔ کھانا کھاتا اور سو جاتا ـــ ایسی گہری نیند سوتا کہ بارہا غروب آفتاب تک سوتا رہتا اور اس کے مالک کو ٹھوکریں مار مار کر اسے جگانا پڑتا۔ لیکن آج اپنی بے خوابی سے ہار کر جب وہ دوپہر کو جیٹھو کی کوٹھڑی میں گیا تو اس نے ایسی باتیں سنیں کہ اس کی رہی سہی نیند بھی حرام ہو گئی۔

پھوار کے پڑتے ہی اس کے جسم میں جھرجھری سی اُٹھی۔ وہ ذرا چونکا۔ کہیں اسے بخار تو نہیں ہو گیا۔ رُت بدل رہی ہے۔ اور وہ پانی کے نیچے کھڑا بھیگ رہا ہے۔ اگر نمونیا ہو گیا تو! اس نے سر کو ایک بار جھٹکا دیا۔ لیکن وہ مسکرایا نہیں اور فوارے کو کھلا چھوڑ کر ہی اپنی کوٹھڑی میں جا کر لیٹ گیا۔

. . . .

لیکن جلد ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا سر بھاری بھاری تھا۔ جسم پر بخار کی سی کیفیت طاری تھی۔ اور آنکھیں کچھ ابلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے پھر ایک خواب دیکھا تھا۔ کچی ناشپاتیوں کے گچھے اُس کے سر کے گرد گھوم رہے ہیں۔ وہ ایک ویران سے مکان میں کھڑا انہیں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پاس ہی پانی کا نلکا چل رہا ہے۔ اور اس کے پاس ایک بچہ کھڑا چلا چلا کر کہہ رہا ہے "میرا کھلونا مت توڑو میرا کھلونا مت توڑو"۔ وہ سر اٹھا کر ادھر دیکھتا ہے۔ وہ بچہ کانسی بن جاتا ہے۔ اور وہ سنتا ہے "میری ناشپاتیاں مت توڑو۔ میری ناشپاتیاں . . . . . .

چندن پاگلوں کی طرح اٹھا۔ جیٹھو کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج گئے۔ اس نے کرتہ پہنا۔ ایک پرانے مٹی کے میلے کوزے میں سے پرانا سا بٹوا نکال کر جیب میں رکھا۔ کوٹھڑی کو کنڈی لگائی اور آہستہ آہستہ کوٹھی سے باہر نکل گیا

. . . .

چاندنی ایک وسیع شامیانے کی طرح پربت کی گراؤنڈ پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور سڑک کے نیم جیسے اس شامیانے کو تھامے کھڑے تھے۔ اُن کے پتوں سے بجلی کے قمقمے ٹمٹماتے تھے۔ اور دور سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ان درختوں کے پرے کوئی الاؤ جل رہا ہو۔

چندن کوئن میری روڈ پر ہو لیا۔ دائیں طرف کوٹھی سے لگ کر وندے کے گل شب بو اور مولسری کی ملی جلی مہک کا ایک جھونکا آیا۔ اور سڑک پر درختوں کے نیچے بچھے ہوئے روشنی اور سائے کے جال ہلے۔

تیس ہزاری کے چورستے پر وہ رکا کہ شاید کوئی ٹریم آتی ہوئی مل جائے لیکن شاید گیارہ کبھی کے بج چکے تھے۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ ایک گندگی کی گاڑی عفونت پھیلاتی ہوئی اس کے پاس سے گذر گئی۔ چندن کا دماغ پھٹنا گیا۔ بھاگ کر وہ مٹھائی کے پل پر ہو لیا۔ جس چبوترے پر سپاہی کھڑا رہتا تھا۔ وہ ٹوٹا ہوا تھا۔ شاید کسی موٹر والے نے سپاہی کی کرختگی کا بدلہ اس معصوم چبوترے سے لیا تھا۔ پل پر بالکل سناٹا تھا۔ اوپر چاند چمک رہا تھا۔ اور پل کے نیچے گہرائی اور تاریکی میں ریل کی لائنیں اور سامنے کچھ دور لال ہرے سگنل چپ چاپ ٹمٹما رہے تھے۔ چندن پل کی دیوار کے

ساتھ سرلگائے لمحہ بھر تک مبہوت و ساکن ان ناگنوں سی لائنوں اور ان ٹمٹماتے ہوئے سگنلوں کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ آگے چل پڑا۔

سڑک بالکل سنسان تھی۔ دونوں طرف کی دکانیں بند تھیں۔ اور پٹڑی پر کہیں کہیں میلے سے لحاف لئے دکاندار سوتے ہوئے تھے۔ میلی کچیلی دھوتیوں میں ان کے زرد زرد اعضا پورنماشی کے چاند کی اس روشنی میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ تیلی باڑہ کے سامنے پٹڑی پر ایک ٹوٹا ہوا تانگہ پڑا تھا۔ اور دو تین کوڑا اٹھانے والی خالی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ بائیں طرف دور تک ایک سفید سی دیوار چلی جاتی تھی جس کے پیچھے کبھی کسی گاڑی کے تیز تیز گزرنے کی آواز آجاتی تھی اور دائیں طرف دکانوں کے باہر کہیں بانسوں کے گٹھے پڑے تھے کہیں چارپائیاں اور کہیں لکڑی کی خالی پیٹیاں! چندن چپ چاپ اپنے خیالات میں محو قطب روڈ کے چورستے پر آگیا۔

صدر بازار بالکل بند ہو چکا تھا۔ صرف کونے کے حلوائی کی دکان کھلی تھی۔ چندن کی بھڑکی ہوئی طبیعت یہاں تک آتے آتے، قریب قریب ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ صرف اس کے دل میں ایک ہلکا سا اشتیاق کا جذبہ موجود تھا۔ اور اس کے ماتحت اس نے حلوائی کی دکان سے آدھ سیر گرم گرم دودھ پیا۔ پھر جیسے ایک نئی اُمنگ پاکر وہ اور آگے بڑھا۔

دونوں طرف کی دکانیں بند تھیں۔ بائیں طرف کے ماشاء اللہ ہوٹل میں کوئی شخص بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔ دائیں بائیں کہیں کہیں کسی پنواڑی یا حجام کی دکان کھلی تھی۔ ایک دکان میں ایک مزدور (جسے دن میں شاید فرصت نہ ملتی تھی) بیٹھا سر پر استرا پھروا رہا تھا۔

کاٹھ بازار کے سرے پر چندن ایک لمحہ کے لئے رکا۔ تانگوں کے اڈے پر ایک دو تانگے والے ابھی گھوم رہے تھے۔ تانگہ سٹینڈ کے عین اوپر چاند چمک رہا تھا اور اس چاندنی میں گرد اور دھوئیں کا ہلکا سا غبار بھی ملا ہوا تھا۔ وہ کاٹھ بازار میں داخل ہوا اور حیران سا ایک چوبارے کی طرف دیکھنے لگا جس میں گیس کی روشنی کے سامنے ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ چندن کی مری ہوئی امنگ پھر جاگی لیکن یہاں ابھی تک کئی آدمی کھڑے تھے۔ اتنے آدمیوں کے سامنے۔ اتنی روشنی میں اس کے لئے معاملہ کی بات کرنا مشکل تھا۔ اس نے نیچے کی کوٹھڑیوں کی طرف دیکھا۔ ہر ایک کوٹھڑی کے آگے ایک لیمپ لٹک رہا تھا اور ایک عورت کھڑی یا بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی کسی کوٹھڑی کا دروازہ بند ہو جاتا اور کسی شخص کے پیچھے لیمپ اٹھائے ہوئے عورت ایک میلے سے پردے کے اندر چلی جاتی تھی۔ لمحہ بھر کے لئے ابھری ہوئی امنگ چندن کو پھر ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ ذرا آگے بڑھ کر ایک لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا، جو عین چوک میں بچھی ہوئی تھی۔ اور جس کے پاس ایک سبز پر رنگ برنگ بوتلیں رکھے ایک دو چمپی کرنے والے بیٹھے تھے۔

"چمپی کراؤ گے؟"

چندن نے غیرارادی طور پر سر ہلا دیا۔ پاس ہی ایک اور ایسی دکان تھی اور اس کے ساتھ بچھے ہوئے بنچ پر ایک شخص بیٹھا چمپی کروا رہا تھا۔ اس کے ایک لمبے برآمدے میں اپنی اپنی کوٹھڑیوں کے سامنے عورتیں کھڑی اپنے گاہکوں کو بلا رہی تھیں۔ تھک جانے کے ڈر سے انہوں نے چھت سے رسیاں لٹکا رکھی تھیں۔ جن کے سہارے وہ کھڑی ہو جاتی تھیں۔

چندن کے سر میں تیل کے گرنے سے بجلی کی سی سرسراہٹ ہوئی اور پھر حجام لڑکا چمپی کرنے لگا۔ چمپی کرنے کے بعد اس نے چندن کی پیشانی اور گردن کو ایک میلے سے تولئے سے پونچھ کر اس کے بال بنا دیئے۔

چندن جب وہاں سے اٹھا تو اسے ناک میں سستے خوشبودار تیل کی تیکھی سی بو آرہی تھی۔ اور اس کی اُمنگ پھر جیسے بیدار ہو گئی تھی۔ چوک چھوڑ کر وہ ایک گلی میں ہو گیا۔ یہاں لوگ کم تھے اور روشنی بھی اتنی نہ تھی۔ وہ ایک بار گلی کے دوسرے سرے تک جاکر مڑ آیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیسے بات چیت شروع کرے۔ وہ تو ان سے آنکھیں بھی نہیں ملا سکتا تھا۔ محض خیال ہی سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا تھا۔ اس نے سوچا واپس چلا جائے اسے جیٹھو کے ساتھ آنا چاہئے تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ گلی میں سے ہوتا ہوا دوسری طرف سے نکل جائے گا مگر اتنی دور آکر وہ یوں ہی جانا بھی نہ چاہتا تھا۔ لیکن اسی وقت ایک کوٹھڑی کے آگے قدرے اندھیرے میں بیٹھی ہوئی ایک موٹی سی تھل تھل پل پل عورت نے اس کی مشکل حل کر دی۔ اس کے پاس دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں فرش پر ہی دری بچھائے لیٹی ہوئی تھیں۔ بالکل کاسنی کی عمر کی۔ "آؤ ادھر آؤ" پیار سے اس نے کہا۔

چندن بڑھا۔

سرگوشی میں اس نے کہا۔ "آؤ سوچتے کیا ہو۔ بارہ آنے لگیں گے"

اشارہ اس کوٹھڑی کے سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت کی طرف تھا جو صرف ایک بنیان اور کالی ساڑھی پہنے بیٹھی تھی۔ جس کی بغلوں کے بال تک نظر آتے تھے۔ اور جس کی چھاتیاں مرجھائی ہوئی ککڑی کی طرح تھیں۔

چندن نے اس کے پاس فرش پر آدھی لیٹی اور آدھی بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف

بھری نظر سے دیکھا جس کے ناک میں ایک چھوٹی سی نتھ تھی۔

سمجھ کر موٹی عورت نے کہا "یہ تو ابھی چھوٹی ہے۔ یہ ابھی یہ باتیں کیا جانے"۔

چندن کے دماغ میں کچی ناشپاتیاں گھوم گئیں۔ پھر کاسنی اور پھر کچی ناشپاتیاں۔ اور موٹی عورت نے کہا۔ "دو روپے لگیں گے"۔

چندن چپ رہا۔ وہ کہنا چاہتا تھا "دو روپے بہت ہیں"۔

تبھی موٹی عورت نے کہا "اچھا تو ڈیڑھ روپیہ ہی دے دو۔ ابھی تو نتھ بھی نہیں اتری"۔

چندن کی نسوں میں دودھ اُبلنے لگا۔ اُس کا جسم گرم ہونے لگا۔ دوسرے لمحے وہ اس میلے پردے کے اندر چلا گیا اور اس کے پیچھے اس لڑکی کو لئے ہوئے وہ موٹی عورت . . . .

. . . .

ایک ہفتے کے بعد سر پر اپنا بوریا بستر اٹھائے چندن پورچ میں کھڑا تھا۔ اور اندر کمرے میں اس کے مالک اپنی بیوی کو ہدایت دے رہے تھے "میں ابھی ڈاکٹر کو بھیجتا ہوں سارے مکان کو ڈس انفیکٹ کروا لینا۔ سب جگہ تو جاتا رہا ہے کمبخت!"

اور چندن بے بسی کی حالت میں کھڑا سوچ رہا تھا۔ لیکن لڑکی کی عمر تو تیرہ سال کی بھی نہ ہو گی۔ اور اس کی تو ابھی تک نتھ بھی نہ اتری تھی۔

اوپندر ناتھ اشک

شعر

بہلا نہ دل نہ تیرگیٔ شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

فانی

ولولے

ولولوں کا دود آنکھوں میں مری
سرخیاں دوڑا رہا ہے کیا کروں؟ خون کھولا جا رہا ہے کیا کروں؟
پیچ و خم کھاتا ہوا نیلا دھواں
تیرتا جاتا ہے نظروں میں مری
سرخ ہو جیسے شفق سے آسماں
آسماں ہے اس پہ ہیں کالی بدلیاں
کاکلوں کی طرح بل کھاتی ہوئی
آنچلوں کی طرح لہراتی ہوئی
بھیرویں گاتی ہوئی انگڑائیاں
گیت ــ جن کے زمزمے ہیں بے صدا
جس طرح گیسو جھٹکتا ہو کوئی
جیسے بل کھا کر مٹکتا ہو کوئی
جیسے لہراتی ہو لہروں پر ہوا
اور یوں محسوس ہوتا ہے مجھے
کوئی لہروں میں ڈبوتا ہے مجھے
ہر طرف ہے ایک محرابوں کا جال
دور تک پھیلا ہوا اک سلسلہ
جس طرح صحرا میں کوئی قافلہ
چھوڑ جاتا ہے نقوش پائمال
اس طرح محسوس ہوتا ہے مجھے کوئی گہرائیوں میں ڈبوتا ہے مجھے
گھومتی لہریں ہیں پہیے تو نہیں دوڑتے پہیے ہیں نغمے تو نہیں
ہانپتے نغمے مدوّر تو نہیں تیرتے سائے منوّر تو نہیں
کانپتی لَو دوڑتی ہے دُور تک دائرے پھیلے ہوں جیسے دُور تک
حل ہوا جاتا ہوں میں گرداب میں
جل رہا ہے دل کے ایوانوں میں عود
گیت ہیں یوں ذہن کے سیلاب میں
جس طرح گاتا ہو کوئی خواب میں
بے صدا بے لفظ بے ساز و سُرود
رفتہ رفتہ ولولوں کا کارواں چھوڑتا جاتا ہے قدموں کے نشاں
راستے کے پیچ و خم کے ساتھ ساتھ ہر قدم پہ ہر قدم کے ساتھ ساتھ
لڑکھڑاتا ہے گھٹا کے سامنے جیسے لَو کانپے ہوا کے سامنے

یوسف ظفر

نیا پرانا

ایک تو گرمی کا موسم اس پر دوپہر کا وقت۔ سارا پلیٹ فارم گویا تنور بنا ہوا تھا۔ جو ٹرین ابھی پلیٹ فارم پر آکر رکی ہے اس کی طرف دیکھنے سے بھی وحشت ہوتی ہے۔

پھر بھی جگدیش بابو کو دوڑ دھوپ کر کے ڈبے میں داخل ہونا پڑا۔ دنیا بھر کے ساز و سامان اور غل غپاڑہ کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی طرح وہ اپنی بھاری بھرکم بیوی سمیت ٹرین میں سوار ہو گئے۔ اور ساتھ ہی گارڈ نے سیٹی بجادی ان کی بیوی کیتانی کو بلغمی شکایت تھی۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ ایک مشٹنڈے ہندوستانی نے ان کے پاؤں پر پاؤں رکھ دیا۔ اس لئے وہ سامنے ہی بستر کے بنڈل پر بیٹھ کر پاؤں سہلانے لگیں۔ وہیں سے ان کا سوال ہوا "سب چیزیں آگئیں نا۔ کتنے عدد تھے۔ سولہ یا سترہ؟ کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ اور ہاں میرا وہ سوٹ کیس؟"

جگدیش بابو نے بگڑ کر جواب دیا "میں کیا جانوں کیا آیا اور کیا نہیں آیا۔ جو آگیا آگیا۔ اور اب تو ٹرین بھی چل پڑی ہے۔ دنیا بھر کے نکموں کو ساتھ لے کر سفر کرنا میری ہی قسمت میں لکھا ہے!"

جگدیش بابو کا مزاج گرم ہو گیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہندوستان کی گرمی میں دوپہر کے وقت جس کو سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس کو خوب اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ بڑا لڑکا ستیش دلی میں ملازم ہے۔ اس نے تار دیا ہے کہ بہو کی طبیعت خراب ہے۔ دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔ اماں آجائیں تو اچھا ہوتا۔

جگدیش بابو تار پاتے ہی طوفان میل سے روانہ ہو گئے تھے مگر ان کی بیوی اس پر راضی نہ ہوئیں کہ پریاگ میں اشنان کئے بغیر دلی چلی جائیں۔ لیکن ایسی حالت میں تاخیر بھی نامناسب تھی۔ اس لئے صبح کو اسٹیشن پر پہنچ کر اسباب سمیت پریاگ گھاٹ چل کے اشنان کیا پھر قلعہ وغیرہ دیکھ کر بارہ بجے کا ایکسپریس پکڑنے کے لئے ان کو اسٹیشن لوٹنا پڑا۔ آرام کا تو ذکر کیا کھانا بھی نصیب نہ ہوا معمولی ناشتہ تک نہ ملا۔

خیر جگدیش بابو کے مزاج کا پارہ اور زیادہ نہیں چڑھا جس طرح ممکن ہوا انہوں نے اپنا اسباب ڈبے میں ٹھونسا۔ کچھ بنچ کے نیچے رکھا۔ کچھ ادھر ادھر اور سامان کی حفاظت کے متعلق بیوی کو سینکڑوں ہدایات دیتے ہوئے مقابل کی نشست پر دری اور چادر بچھا کر بیٹھنے کی جگہ بنالی۔

اب کیتانی نے ڈبے کا بغور معائنہ کیا قسمت سے ڈبا خالی ہی تھا۔ گرمیوں کے موسم میں دوپہر کے وقت کوئی سخت ضرورت کے بغیر سفر نہیں کرتا صرف ایک کونے میں ایک ادھیڑ عمر کا ہندوستانی اور دوسری طرف کیتانی کے مقابلہ میں کھڑکی کے نزدیک دو بنگالی میاں بیوی بیٹھے تھے۔ دونوں جوان اور خوبصورت بس یہی چند مسافر تھے کیتانی نے اپنا نقرس زدہ پاؤں سہلاتے ہوئے انہی دونوں کی طرف توجہ کی۔

لڑکی کا سن کوئی سترہ اٹھارہ برس کا ہوگا۔ اچھی صورت شکل کی۔ ہاں کیتانی کی طرح ہی خوبصورت ہوگی۔ لڑکا بھی خورد۔ عمر بھی شاید پچیس چھبیس برس کی ہوگی یا اس سے بھی کم۔ قرینے سے تو پتا چلتا ہے کہ ابھی ابھی شادی ہوئی ہے مگر کیتانی کو ان کے سن و سال یا حسن و جمال سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ ان کی عجیب و غریب بے شرمی نے کیتانی کو متعجب و متوجہ کیا۔ ان کے دھوپ کی طرف بیٹھنے کی کوئی وجہ کیتانی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ شاید پہلے بھیڑ تھی۔ مجبوراً ان کو اس طرف بیٹھنا پڑا۔ مگر دھوپ کے ڈر سے کھڑکی بند کرنے پر ان کی حالت اور بھی قابل دید ہو گئی ہے دونوں کے کپڑے پسینے سے تر ہو گئے ہیں۔ چہروں کی طرف دیکھو تو گمان ہوتا ہے کہ جھلس گئے ہیں۔ کیتانی نے دیکھا لڑکی اپنے شوہر کے زانو پر سر رکھ کر عجیب انداز سے سو رہی ہے۔ اور لڑکا اس کی پیشانی پر سے اس کے گیلے بالوں کو ہٹا رہا ہے۔ اچانک لڑکی نے اسی حالت میں لڑکے کے گلے میں باہیں ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچا اور پھر اس کے بالوں سے کھیلنے لگی۔

لیکن لمحہ بھر میں لڑکی اچانک اٹھ بیٹھی۔ لڑکا فوراً اس کے زانو پر سر رکھ کر دراز ہو گیا۔ ذرا دیر بعد لڑکی نے اس کو گدگدا کر اور چٹکی لے کر اٹھا دیا۔ اس پر دونوں

میں پر لطف نوک جھونک سی ہونے لگی۔ اُس نے پیار سے چٹکی لی اُس نے گال پر تھپڑ لگا دیا۔ لڑکی ہی زیادہ چنچل ہے۔ وہ کبھی اٹھتی ہے کبھی بیٹھتی ہے اور کبھی لیٹ جاتی ہے کبھی شوہر سے کہتی ہے پنکھا جھلو کبھی خود ہی آنچل سے اس کے چہرے پر سے پسینہ پونچھ کر ہوا کرنے لگتی ہے۔ گرمی کی وجہ سے وہ جتنا پریشانی کا اظہار کرتے تھے۔ اس سے کہیں زیادہ شرارت اور مذاق کرتے تھے یعنی سفر کی تکلیف اور یہ ناقابل برداشت گرمی سب کچھ گویا اُن کے لئے اچھا خاصہ مذاق تھا۔

ان کی حالت دیکھ کر کتیانی ہمیشہ ہوگئیں۔ گھونگٹ تو درکنار وہ تو جیسے بھول ہی گئی تھی کہ ڈبے میں اور بھی کوئی ہے۔ سب سے زیادہ ناگوار حرکت لڑکی نے یہ کی کہ اطمینان کے ساتھ شوہر کی گود میں اپنے پاؤں رکھ دیئے پھر کہنے لگی ذرا دبا دو۔ کتنانی گویا آسمان سے گر پڑی۔

کیتانی نے شوہر کی طرف مڑ کر چپکے چپکے کہا یہ کیسے لوگ ہیں کیسی بے شرم لڑکی ہے۔ ہم لوگ جو گاڑی میں ہیں تو اس کی انہیں ذرا بھی پروا نہیں۔

جگدیش بابو اخبار پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے آہستہ ہی سے جواب دیا۔ ان کا جو جی چاہے کریں۔ تمہیں ادھر دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ آج کل کی لڑکیاں لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

انہوں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا پھر کھڑکی پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کیتانی نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ پیٹھ پھیر کر سونے کی کوشش کی جائے لیکن نیند کیونکر آتی۔ آنکھ بند کرتے ہی گذری ہوئی جوانی کی یاد آنے لگی۔ وہ بھی کبھی جوان تھیں اور اپنے شوہر کی محبت میں سرشار لیکن یہ بے حیائی تو نہ تھی۔

اچانک انہوں نے سنا لڑکی کہہ رہی تھی۔ بڑھیا سو گئی کیا؟ بپناہ بخدا کتنی موٹی ہے۔ لڑکے نے کہا چپ چپ کہیں سن نہ لے۔

لڑکی نے جواب دیا خاک سنے گی۔ دونوں خراٹے لے رہے ہیں۔

لڑکے نے کہا اور جو بڑھیا جاگ رہی ہو تو۔ وہ تو خراٹے نہیں لے رہی ہے۔

لڑکی نے زور سے سر ہلا کر کہا۔ پاگل! اس گرمی میں کوئی بڑھیا جاگ سکتی ہے؟ ابھی خراٹے لینے لگے گی۔ دیکھو تو سہی۔

اس کے بعد دونوں نے جانے کیا سرگوشی کی۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑے کچھ دیر بعد لڑکے نے کہا کسی روز تم بھی ایسی ہی ہو جاؤ گی موٹی اور بوڑھی!

لڑکی نے جواب دیا تمہارے کہنے سے! دیکھنا میں اس سے پہلے ہی مر جاؤں گی۔

لڑکے نے کہا۔ اگر نہ مرو۔

لڑکی نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔ ضرور مروں گی۔ تم دیکھ لینا۔ اگر یوں موت نہ آئی تو گلے میں رسی ڈال کر مر جاؤں گی لیکن بڑھیا ہو کر زندہ رہنا مجھے ہرگز گوارا نہیں۔

غصے سے کتیانی بے تاب ہوگئیں۔ ان کے کان لال ہوگئے۔ یہ ان کی کھلی تحقیر تھی۔ پھر بھی ان کو اپنے دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ شادی کے دو چار روز بعد انہوں نے بھی اپنے شوہر سے ایسی ہی باتیں کی تھیں۔ ان کے شوہر کی ایک پھوپھی پاس کے کمرے میں گٹھیا کی تکلیف سے کراہ رہی تھیں۔ دونوں پیار کی باتوں میں مست ہونے کے باوجود یہ تکلیف بھری آواز سن رہے تھے۔ آخر کار کیتانی نے شوہر سے کہا "بڈھی ہو کر جینا بھی ایک عذاب ہے ..... "

جگدیش نے کہا "بے چاری مجبور ہے۔ موت پر تو کسی کا بس نہیں۔"

کتیانی نے کہا تھا بس نہیں ہے تو کیا ہوا ان کی جگہ میں ہوتی تو زہر کھا لیتی۔

لیکن یہ تو بہت دنوں کی بات ہے تینتیس سال پہلے کی بات۔ اچھی طرح یاد بھی نہیں ہے۔ آج وہ بھی بوڑھی ہو گئی ہیں لیکن مرنے کا خیال تک نہیں آتا۔

لڑکی اس وقت کہہ رہی تھی "اور اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ میری دادی بھی ایسی ہی ہیں، انہیں کوئی پسند نہیں کرتا اور نہ کسی مصرف کی ہیں پھر بھی ان کا خیال ہے کہ ان کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہر کام میں ان کا دخل دینا ضروری ہے۔ اور سنتے ہو کل وہ مجھے سنوارنا چاہتی تھیں! بڑی ہنسی آئی مجھے تو ......

اتنے میں گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی۔ لڑکی نے کھڑکی سے باہر سر نکالا۔ "ذرا دیکھو تو وہ لڑکی کون ہے کیسی مردنی چھائی ہے اس کے چہرے پر! مگر کتنی خوبصورت ہے! عمر بھی کچھ زیادہ نہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا۔ اسے دو آنے کے پیسے دے دو نا!

لڑکے نے جواب دیا "اگر وہ بھکارن نہ ہوئی تو بڑی شرمندگی کا سامنا ہوگا۔ شاید مہتر کی بیوی ہے۔

لڑکی نے کہا، کچھ بھی ہو۔ دو آنے کی مٹھائی خرید لے گی۔ جاؤ نا، دے آؤ۔

چاروں طرف جوانی نغمہ ریز تھی۔ مگر اس میں ان کا تو کوئی قصور نہیں۔ کیتانی کو بھولی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں۔ جب کوئی کم سن چھوکری بھیک مانگنے آتی تھی تو کیتانی بھی ساس کی نظر بچا کر اسے کچھ زیادہ ہی دے دیتی تھیں۔

ساری باتیں سچی ہیں! وہ سب سے جکڑے رہنا چاہتی ہیں لیکن کوئی اُن کی ضرورت محسوس نہیں کرتا! یہ تو پار سال کی بات ہے ان کی بہو اور تینوں لڑکیاں کمرے میں خوش گپیاں کر رہی تھیں۔ کیتانی کا ان کی باتیں سننے کو جی چاہا۔ اور وہ کمرے میں جا کر لیٹ گئیں۔ پھر کیا تھا۔ لڑکیاں ایک ایک کر کے کمرے سے نکل گئیں نواسے نواسیوں کو تو وہ جبراً قہراً اپنے پاس رکھتی ہیں۔ آخر ستیش ہی کے آرام و آسائش کی خاطر وہ بہو سے جھگڑتی ہیں مگر ستیش کو دیکھو وہ انہیں سے ناراض ہوتا ہے۔ ہاں تو پھر اس سنسار میں وہ کس کے کام آتی ہیں۔ شوہر کے؟ ہائے ری قسمت......

صبح سے شام تک کتنی بار ملاقات ہوتی ہے شوہر سے! گھر گرہستی کے دھندے میں سارا دن گذر جاتا ہے۔ بیماری کی وجہ سے وہ خود تو کچھ کر نہیں سکتیں لیکن ہر بات پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ اور شوہر! کبھی تو وہ آکر پوچھ لیتے ہیں کیسی ہو! کبھی اس کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ یہ تو ہیں میاں بیوی کے تعلقات!

کیتانی کا گویا دم گھٹنے لگا۔ ان سے اور رہا نہ گیا۔ وہ بے قرار ہو کر اُٹھ بیٹھیں۔ انہوں نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ اب اس نوجوان میاں بیوی کی طرف نظر نہیں کریں گی۔ اس لئے وہ باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگیں لیکن خود بخود ان کی نظر بار بار اس نوجوان جوڑے کی طرف جاتی تھی۔ ان کی معمولی معمولی حرکتیں بھی ان کے دل پر نقش ہونے لگیں۔ وہ سوچنے لگیں، سارے جہان کی مسرت خدا نے نوجوانوں ہی کے لئے وقف کر دی ہے اور اپنی زندگی تو صرف تلخ حقیقتوں کا گہوارہ ہے۔

شام کے قریب گاڑی اٹاوہ پہنچی۔ نوجوان میاں بیوی کافی شور و غل مچاتے ہوئے اتر پڑے۔ شاید وہ یہاں سیر کرنے آئے ہیں۔ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں، کیا کرتے ہیں، شادی کب ہوئی اس قسم کے بیسیوں سوالات کیتانی کے لب تک آئے لیکن خودداری مانع ہوئی اور ان سے کچھ پوچھا نہ گیا۔

جگدیش بابو بھی جاگ اٹھے گاڑی سے اتر کر انہوں نے منہ ہاتھ دھو اور ایک پیالی چار لے کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ ڈبے کا دوسرا مسافر بھی شکوہ آباد میں اتر گیا تھا۔ اس کی نشست کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا "اب تو ڈبا بالکل خالی ہے۔ ہے نا؟ مگر بالکل خالی ہونا بھی خطرہ سے خالی نہیں۔"

اچانک ان کی نظر بیوی کے چہرے پر پڑی۔ انہوں نے محسوس کیا ضرور کوئی غیر معمولی بات ہے۔ پوچھنے لگے "خیر تو ہے۔ بہت سست معلوم ہوتی ہو تم تو چائے بھی نہیں پیتیں۔ دودھ لا دوں؟"

معمولی باتیں تھیں پھر بھی کیتانی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ان کا دل بھر آیا۔ انہوں نے صرف گردن ہلا کر "ہاں" کہا۔ جگدیش بابو جا کر دودھ لے آئے۔ پھر اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ ڈبے میں کیتانی اور جگدیش بابو کا راج تھا۔ ایسا موقعہ اگر کسی اور وقت ملتا تو کیتانی ہرگز چپ نہ رہتیں۔ گھر گرہستی کے کل مسائل کا تصفیہ کرنے ضرور بیٹھ جاتیں۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا، وہ صرف باہر کی لامحدود تاریک فضا کو مبہوت ہو کر دیکھنے لگیں۔

اکسپرس ٹرین ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ رات کافی بھیگ گئی۔ اُف گٹھیا کا درد تو اب سہا نہیں جاتا! ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی موذی داہنے پاؤں کو چیر رہا ہے! ہائے ری تکلیف! اسی تکلیف کی وجہ سے کتنی بار انہوں نے سوچا ہے کہ اب زندہ رہنا بے کار ہے۔ پھر بھی موت کی تمنا وہ کبھی نہ کر سکیں۔ یہی خیال ان کو بار بار ستاتا تھا کہ ان کے بغیر سنسار کیسے چلے گا مگر کیا اس سنسار کو سچ مچ ان کی کوئی ضرورت بھی ہے؟

ٹونڈلہ اسٹیشن پر جگدیش بابو نے کچھ کھانے کی چیزیں خریدیں۔ کیتانی بھی اس عرصے میں کچھ سنبھل سی گئی تھیں۔ انہوں نے خود آگے بڑھ کر شوہر کے ہاتھ سے چیزیں لیں اور دیکھ بھال کر ان کو کھانے کے لئے دیں، تھوڑی بہت اپنے آگے بھی رکھ لیں لیکن پانی کا خیال ان کو ٹرین کے چلنے پر آیا۔ "اے لو، پانی تو لیا ہی نہیں......" جگدیش بابو نے دق ہو کر کہا۔ "اسٹیشن پر گاڑی کھڑی تھی تو ہوش نہ آیا۔ اکسپرس ٹرین ہے۔ کہاں چل کے پھر رکے گی۔ کون جانتا ہے۔ جس کام کو میں نہ کروں وہ قیامت تک نہ ہوگا۔"

کیتانی چپ رہیں۔ تھوڑی دیر بعد جگدیش بابو نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "سورین عرصے سے شملے بلا رہا ہے کبھی جانے کا موقعہ نہیں ملا۔ اس دفعہ ارادہ ہے کہ تمہاری طبیعت سنبھل جائے تو دو چار دن کے لئے شملے بھی ہو آؤں گا تم ستیش کے پاس ہی رہنا میں لوٹتے وقت تمہیں ساتھ لے لوں گا۔"

سورین جگدیش بابو کا بھانجہ ہے۔ شملے میں سرکاری ملازم ہے، اچھی خاصی تنخواہ ہے۔ اس نے کیتانی کو بھی بہتیرا لکھا ہے لیکن گھر بار کے جھنجھٹ اُسے کہیں جانے نہیں دیتے۔ انہوں نے اشتیاق کے ساتھ کہا "ارے اس نے مجھے بھی تو بلایا ہے۔ خوب ہوا! اس دفعہ تمہارے سنگ میں بھی چلوں گی......"

منہ بنا کر جگدیش بابو بول اُٹھے "بس بس رہنے دو۔ ایسی ہمدرد تم کبھی

مریض کو ساتھ لے جا کر میں اپنی جان آفت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ دو دن کے لئے سیر کرنے جاؤں گا یا ٹرین سے اترتے ہی ڈاکٹروں کی تلاش میں مارا مارا پھروں گا۔ نہیں آپ مہربانی کر کے دلّی ہی میں تشریف رکھیں۔ خشک آب و ہوا ہے۔ اچھی رہو گی۔"

کتیانی نے اور کوئی بات نہیں کی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو لڑ پڑتیں۔ مگر آج ان کی خودداری کو سخت ٹھیس لگی۔ انہوں نے احتجاج کے طور پر بھی ایک لفظ نہ کہا۔

جب دوسرے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو جگدیش بابو نے پانی لیا۔ اور کھانا کھا کر آرام سے بچھونے پر دراز ہو گئے۔ صرف ایک بار انہوں نے دریافت کیا۔ تم نہیں کھاؤ گی؟ کتیانی نے جواب دیا۔ میں نے اب تک پوجا نہیں کی تم سو رہو۔ میں کھا لوں گی۔

جگدیش بابو سے کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ بہت ہی جلد وہ خراٹے لینے لگے۔ لیکن کتیانی کی آنکھوں میں بھلا نیند کہاں۔ انہیں بار بار یہ خیال ستا رہا تھا کہ سنسار میں اب وہ محض بے کار اور نکمی ہیں۔ ...... اب ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے ...... جس سنسار کی وہ روح رواں تھیں آج وہ اسی کا بوجھ ہیں ...... !

سارے دن کی بھوک پیاس، محنت اور قیامت کی گرمی کی وجہ سے کتیانی کا دماغ کھول رہا تھا۔ ورنہ ایسی معمولی باتیں آج کیوں انہیں بے قرار کئے دے رہی ہیں؟

اُف گٹھیا کا ناقابل برداشت درد! آج مرض نے بھی پوری شدت سے حملہ کیا تھا۔

آخر یہ تکلیفیں وہ کس کے لئے جھیل رہی ہیں! ان کو بہت دن پہلے کی ایک بات یاد آگئی۔ ایک روز ان کے شوہر رات کو بڑی دیر میں آئے۔ وہ ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ شوہر نے کہا تھا "میں اتنی رات تک کہاں تھا۔ تم نے پوچھا تک نہیں! تمہیں مجھ پر شک نہیں ہوتا!

کتیانی نے تمکنت کے ساتھ جواب دیا تھا۔ جس روز میں سمجھوں گی۔ تمہارے دل میں میری محبت نہیں ہے۔ اس دن میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی۔ ہاں گلے میں پھانسی ڈال کر مر جاؤں گی!

ہائے وہ زمانہ آج کہاں! یہی تو وہ شوہر ہیں جنہوں نے کچھ دیر پہلے کھلم کھلا کہہ دیا ہے کہ تم میری زندگی میں ایک بوجھ ہو۔ میں تمہیں لاد کر شملے نہیں جا سکتا۔

آج وہ بھی بیوی سے چھٹکارا چاہتے ہیں۔

پھر ......؟

تینتیس سال پہلے کا عہد آج پورا کرنے میں کون سی رکاوٹ حائل ہے ایک مریض نکما جسم ہے کہ ساری دنیا حتیٰ کہ شوہر کے بھی بار خاطر ہو کر جینے میں کیا رکھا ہے؟

بے انتہا جوش کی وجہ سے کتیانی کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ ان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بیٹھے رہنا ان کے لئے محال ہو گیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ موت تو سامنے ہی کھڑی ہے! ٹرین ہوا سے باتیں کر رہی ہے ...... صرف دروازہ کھول کر چھلانگ لگانے کی دیر ہے ......

شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے لامحدود تاریکی، یقینی موت ...... بس چند لمحے کی دیر ہے۔ پھر ابدی راحت! ....

یکایک کھلے ہوئے دروازے سے ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ جگدیش بابو نے آنکھ کھول دی۔ اچانک ان کی نظر دروازے پر پڑی کھلے ہوئے دروازے پر کتیانی کھڑی تھیں!

بیوی ......

ایک دلدوز چیخ کے ساتھ انہوں نے لپک کر کتیانی کو پکڑا۔

کیا ہوا۔ تم اس طرح کیوں کھڑی ہو یہاں۔ گاڑی ہچکولے کھاتی ہے اگر تم گر پڑیں؟

اب ان کی نظر بیوی کی حالت پر پڑی۔ پریشان لباس۔ بکھرے ہوئے بال، پُرنم آنکھیں، جسم میں تھرتھری۔ نہایت دردناک اور بے کسانہ انداز ......

جگدیش بابو نے ہاتھ پکڑ کر سامنے کی نشست پر ان کو بٹھا دیا۔ پھر کہا "پرمیشور کے لئے بولو کیا ماجرا ہے۔ میرا دل دھڑک رہا ہے۔ اگر گر پڑتیں! آخر کیا بات ہے؟ کیا تم ڈر گئی تھیں؟

تو کیا زندگی کے ساز میں اب بھی کوئی سُر باقی ہے؟

کتیانی کا دل بھر آیا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ انہوں رو کر کہا — میں مرنا چاہتی تھی!

خوف سے جگدیش بابو کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ جیمی جیمی تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا! ذرا میری طرف تو دیکھا ہوتا۔ تمہارے بغیر میں کیونکر زندہ رہتا۔

اس کے بعد انہوں نے پیار سے کتیانی کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا "میں تمہیں شملے لے جانے پر راضی نہ ہوا کیا اسی لئے روٹھ گئیں۔ سوچو مجھے تو تمہاری تکلیف کا خیال تھا۔ تم بوجھ کیوں ہو نہیں؟ ستیش نے اپنی بیوی کی تیمارداری کے لئے تمہیں کو سب سے پہلے تار دیا۔ ...... آئی نادان ہوگئیں تم۔ چلو تم کو بچھونے پر بٹھادوں میرا ہاتھ پکڑ لو۔

کتیانی شوہر کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ پر آئیں اور مبہوت ہوکر بیٹھ گئیں۔ اب ان کے کھانے کی طرف جگدیش بابو کی نظر پڑی۔ ارے یہ کیا! تم نے تو کھانا بھی نہیں کھایا۔ خیر اب کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگلے اسٹیشن پر گرم گرم کھانا خرید دوں گا

کتیانی نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا سچ مچ کوئی اسٹیشن نزدیک آرہا ہے۔ تاریکی دور ہوتی جارہی ہے۔ اسٹیشن کی تیز روشنی کی جھلک پاکر کتیانی نے محسوس کیا کہ تاریکی اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کی زندگی سے دور ہوگئی۔ رفتہ رفتہ ان کا چہرہ روشنی میں چمکنے لگا۔

گاڑی اس وقت علی گڈھ اسٹیشن میں داخل ہورہی تھی۔

(گجندر کمار منترا)

انیشیم

اشعار

بنا کے ہجر کی راتوں کو بے نیاز سحر
تعینات کے پردے اٹھا دئیے تو نے
شعور عقل و غم عشق کے دوراہے میں
بڑوں بڑوں کے قدم ڈگمگا دئیے تو نے

فانی

ترے باغ میں ہے بہار؟

بہار آئی گلستاں میں تو کیا، اب یاس کو بھولوں ؟
بہار آئی تو کیا اب دامنِ اُمید کو چھُولوں ؟
کھلے گر پھول گلشن میں تو کیا، آنسو سکھاؤں میں !
مگر کیسی بہار آئی کہ جب اس کو نہ پاؤں میں ؟
میں اُن کو بھول جاؤں؟ آہ ان مُسیٹھی نگاہوں کو ؟
یہ کہہ دوں ان کو، جاؤ تم، یہ کہہ دوں سرد آہوں کو؟
نہیں، یہ ہو نہیں سکتا، یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا !

میں اونچے آسماں کو چشمِ تر سے دیکھ کر، چُپ ہوں
نہیں آرام قسمت میں، سمجھ کر، سوچ کر، چُپ ہوں
میں ان پھولوں کو کیوں دیکھوں کہ مجھ کو یاد آ جائیں
وہ اس کے ساتھ دیکھے پھول، اور دل کو دُکھا جائیں
نہیں گر ساتھ اس کا، کس طرح گلشن میں آؤں میں ؟
یہ تنہا زیست بھی کچھ زیست ہے؟ کیوں مر نہ جاؤں میں؟
نہیں، یہ ہو نہیں سکتا، یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا۔

نہیں گر وہ، تو میرے پاس ہیں، شام و سحر، یادیں!
محبت کی پکاریں ہیں، محبت کی ہیں فریادیں!!
اگر وہ چھپ گئی نظروں سے آنکھوں میں ابھی وہ ہے !
مری آہوں میں، فریادوں میں، اشکوں میں ابھی وہ ہے!!
بہار آئی گلستاں میں، تو کیا، خاموش ہو جاؤں؟
میں اُس کو بھول کر، تیرے گلستانوں میں کھو جاؤں؟
نہیں یہ ہو نہیں سکتا یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا!!!

ع۔ احمد

شعر

کیا اب میں درخورِ نگہِ گرم بھی نہیں ؟ بجلی تڑپ رہی مرے آشیاں سے دور

فانی

کیا گوری کیا سانولی

پہلے انسان کو صرف عورت کی ضرورت تھی، پھر زندگی پھیلتی گئی اور طبیعت رنگ بدلتی گئی، یہاں تک کہ آج عورت کی مختلف قسمیں ذہن انسانی کا مرکز ہیں۔ سرو قد، بُوٹا سا قد، بھرے بھرے سڈول اعضا، چھریرا جسم، حسن صبیح، حسن ملیح — غرض جتنی آنکھیں ہیں اتنی باتیں ہیں، اور اس میں کسی کا کیا بس، دل ہی تو ہے، — لیکن دل ڈانواڈول ہوتے رہنے کے باوجود کوئی نہ کوئی وجہ تو اپنے انتخاب کی رکھتا ہوگا، عظمت اللہ کہتے ہیں:

کیوں مجھے تیری چاہ ہے اس کو کیوں پوچھیے
جس کی بوجھن کچھ نہیں اُس کو کیوں بُوجھیے

گویا دل کوئی سبب پیش نہیں کر سکتا تو آیئے ہم دماغ سے کام لینے کی کوشش کریں۔

ابتدا ہی سے اندھیرے اجالے کا ساتھ رہا ہے۔ لیکن انسان نے ہمیشہ اجالے کو اندھیرے پر ترجیح دی ہے۔ ممکن ہے اس پسند کی علت تاریکی سے خوف ہو، وہ خوف جو مذہب کی ایجاد کا باعث بنا۔ اور یوں مذہبی کتب میں دیوی دیوتا اور فرشتے اور حوریں ہمیں گورے ہی دکھائی دیتے ہیں، اور شیطان تاریکی کا بادشاہ۔ پھر بھی تہذیب و تمدن کی ترقی یافتہ منزلوں میں ہمیں چارلس باڈلیئر ایسے شعرا یہ کہتے سنائی دیتے ہیں،

"اس کی سرپات کالے رنگ کی ہے، وہ تو روح شبانہ دکھائی دیتی ہے، روح تیرگی ...... وہ ایک گہرا آبنوسی ہے ایک نجم سیاہ اس کے باوجود نور و مسرت کی کرنیں اس میں سے پھوٹ رہی ہیں ...... وہ سیمیں سیارہ نہیں جو لوگوں کے مطمئن خوابوں میں مسکراتا ہو، بلکہ ایک سانولی، غضبناک دیوی ہے۔"

گویا رنگ کا مسئلہ ایک ایسا بھید ہے جسے ہم ابھی تک پوری طرح نہیں سمجھ سکے۔ یہ تو ہر کسی کو معلوم ہے کہ رنگوں کا اثر نہ صرف جسمانی لحاظ سے ہم پر ہوتا ہے بلکہ ذہنی یا نفسی لحاظ سے بھی ہمارے احساسات اور خیالات ان سے تحریک پاتے ہیں۔ اور ہر رنگ انسانی ذہن پر مختلف حسیاتی یا تخیلی تاثر پیدا کرتا ہے، اور اس نسبت سے ہر جذبے یا خیال کا بھی مختلف رنگ ہے۔ مثلاً غصے کا سرخ، محبت کا گلابی، حسد کا سبز — وغیرہ۔ مشرق میں مغرب کی نسبت رنگوں کی اس گہری اہمیت کا احساس زیادہ پرانا ہے جس کی ایک مثال راگ راگنیوں کے رنگ ہیں۔ اور یہ سلسلہ صرف آدا رنگ ہی نہیں ختم ہو گیا بلکہ روزمرہ کی زندگی میں بھی اس کا جال پھیلا ہوا ہے۔ اور مختلف پہلو مختلف تشریحات کے حامل ہیں۔ سہاگن سرخ جوڑا کیوں پہنتی ہے، سادھو سنت جوگیا لباس کیوں پسند کرتے ہیں، بیوہ سفید ساڑھی ہی لپیٹے رکھتی ہے، سیاہ کپڑا سوگ کا نشان ہے۔ بھڑکیلے اور رنگ برنگے کپڑے پہننے سے طبیعت میں ایک چلبلاپن، ایک اُمنگ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یوں ہی ایک سادہ طبیعت کے مقابلے میں کوئی چلبلا یا امنگوں بھرا دل بھڑکیلے اور رنگ برنگ کپڑوں کو پسند کرتا ہے۔

لیکن اس وقت ہمیں رنگوں کے اتھاہ بھید کے گوناگوں پہلوؤں کی بجائے صرف گورے اور سانولے پہلو پر غور کرنا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی سرسری طور پر دیکھنا ہے کہ ادب اور خصوصاً اردو ادب میں اس لحاظ سے شعرا کا کیا مسلک رہا ہے۔ نیز اس کی وجوہ کیا تھیں لیکن پہلے ہم انسان کے موجودہ علم کی روشنی میں جنسی انتخاب کے معیار کے اصولوں کو دیکھتے ہیں۔

ہیولاک ایلس کی تحقیق کے مطابق حُسن کا احساس کوئی اضطراری بات نہیں اس احساس اور انتخاب کی بنیاد پانچ اصولوں پر ہے۔

اول۔

جمالیاتی خصوصیات کی داخلی بنیاد جس کی تمام متنوع صورتیں یک جا رہتی ہیں، اور جس کے ذریعے سے نسائی حُسن کے اس آدرش تک پہنچا جا سکتا ہے

جواب تک تمام نسلوں کے ذہین انسانوں کا خاصہ رہا ہے۔

دوم

کسی نسل یا قوم کی معینہ اور امتیازی خصوصیات حسن کے آدرش میں اختلاف پیدا کر دیتی ہیں کیونکہ اکثر حسن نسلی یا قومی لحاظ سے جسمانی خصوصیات کی انتہائی نشوونما کا دوسرا نام ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کسی قوم یا نسل کی جسمانی خصوصیات کی انتہائی نشوونما اس قوم یا نسل کی صحت اور طبیعت کی انتہائی نشوونما کا اظہار بھی کرتی ہے۔

سوم

اکثر ممالک میں حسن کا ایک اہم اور عموماً لازمی عنصر ثانوی جنسی خصوصیات بھی ہیں، مثلاً عورت میں سر کے بال، چھاتیاں، کولھے اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں۔

چہارم

انفرادی ذوقِ سلیم جس کی بنیاد اور نشوونما مخصوص نظامِ جسمانی اور ذاتی تجربات پر ہوتی ہے اور اکثر یہ انفرادی اجزاء اجتماعی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور یوں حسن کے بدلتے ہوئے فیشن رائج ہوا کرتے ہیں، کیونکہ ایک فرد کی شخصیت کا اثر کسی خاص بات کو بہت سے افراد کے ذہنوں پر طاری کر دیتا ہے۔

پنجم

جب تہذیب و تمدن ترقی کی انتہائی منازل میں ہوں تو بے چین اور اعصابی افراد حسن کا ایک غیر معمولی آدرش قائم کر لیتے ہیں۔ اور اس کی بجائے کہ وہ اپنی قوم یا نسل کے قریب تر حسن سے متاثر ہوں انہیں ایسی صورتیں اور مورتیں پسند آنے لگتی ہیں جو ان کے لئے مانوس نہ ہوں بلکہ اجنبی، اچھوتی اور دور کی چیز ہوں۔

بنیادی طور پر جنسی انتخاب کے یہ پانچ اصول ہیں لیکن میرے خیال میں اس کے ساتھ ہی ہمیں محبت اور نفرت کے تعلق کو بھی نہ بھولنا چاہئے۔ بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کو کسی خوبصورت یا گوری عورت سے محبت میں ناکامی ہوئی ہے تو نفسی عمل نے نفرت کا احساس پیدا کر کے دوسری بار اسے پہلی سے بالکل مختلف قسم کی عورت کی طرف راغب کیا ہے۔ چنانچہ فرانسیسی شاعر چارلس باڈلیئر کی سیاہ پسندی اس کی بہترین مثال ہے۔ اپنی نسل کی عورت سے بوجوہ محبت میں غیر مطمئن ہونے کے بعد اس کے احساسات ایک حبشن پر مرکوز ہو گئے لیکن ایسی مثالیں استثنا کا درجہ رکھتی ہیں۔ کیونکہ انسانی رجحان زیادہ تر گورے رنگ کی طرف ہے اور اس سلسلے میں جب ہم مختلف اقوامِ عالم کے معیارِ حسن پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں ذیل کی وضاحت ملتی ہے

پہلا گروہ خالص سفید اقوام کا جو فطرتاً سفید رنگ کو پسند کرتی ہیں۔

ایران: سفید اور چہرے کا گلابی رنگ

یونان: سفید رنگ

فرانس: سفید اور گلگوں، دودھ سی سفید کھال

جرمنی: سفید اور گلگوں۔

آئرلینڈ: برف سے زیادہ سفید کھال۔

ترکی: سفید رنگ۔

دوسرا گروہ غیر خالص سفید اقوام کا جو غیر خالص ہونے کے باوجود سفید رنگ کو پسند کرتی ہیں۔

جاپان: سفید کھلا ہوا رنگ

شام: انجیل میں لکھا ہے، تیری گردن ہاتھی دانت کا مینار ہے۔

عرب: اس کا چہرہ پورے چاند کا سا تھا اور سر کے (کالے) بالوں سے بالکل متضاد۔

اطالیہ: مشہور شاعر پیٹرارش کی محبوبہ برف سی سفید ہے۔

تیسرا گروہ، غیر خالص گندمی رنگ والا جو گورے رنگ کو پسند کرتا ہے۔

ھندوستان: اور ہندوستان میں قدیم تصور کے لحاظ سے بدمتی کی مثال نمایاں ہے جس کا رنگ کنول کی طرح مانا گیا ہے۔ لیکن انتہائی مثال کے طور پر راجپوتانے کے ایک گیت کا مصرعہ بھی دیکھئے:۔

گورے مکھ پہ سہائے کالی چونڈری۔

اردو ادب کی طرف آنے سے پہلے ہندوستان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہئے۔ پہلے ہندوستان میں صرف سیاہی مائل اقوام بستی تھیں چنانچہ نہ صرف وہ خود بلکہ اُن کے دیوی دیوتا بھی سیاہ اور وحشتناک تھے اور کالی اور کرشن مہاراج کے تصور کی بنیاد بھی انہی کے تصورات پر ہے۔ بعد ازاں آریہ لوگ اپنے سفید رنگ کو ہندوستان میں لائے۔ پھر یونانی آئے اور اپنے رنگ کی آمیزش کی، پھر مغل آئے اور انہوں نے رنگ کی غزل کا نہ صرف مطلع بلکہ مقطع بھی عرض کیا۔ اور یوں ہندوستان مختلف رنگوں کا ایک کھولتا ہوا سمندر بن گیا۔

چونکہ ہمیں بنیادی اقوام کا ادب حاصل نہیں ہے اس لئے ہم باہر سے آنے والوں ہی کے متعلق اندازہ لگاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آریہ رفتہ رفتہ

یہاں کے لوگوں میں گھلے ملے ہوں گے۔ چنانچہ ابتدا میں اُن کے دیوی دیوتاؤں کے جتنے تصورات ہیں اُن میں گورے رنگ ہی کو فوقیت حاصل ہے۔ برہما گورے، شیو گورے، پاربتی کا ایک نام ہی گوری، وشنو گورے، اُن کی لکشمی بھی گوری ـــ اور بہت بعد میں جاکر وشنو کے رغالباً نویں اوتار کرشن مہاراج سانولے نظر آتے ہیں، لیکن رادھا پھر بھی گوری ہی رہتی ہیں۔ اب میں پہلے زمانے کے لحاظ سے سنسکرت کے شاعر امرو کو دیکھئے جس کا زمانہ ۷۸۳ قبل مسیح اور ۳۸۰ بعد مسیح کے درمیان ہے

"تمہارے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے ہیں،
اور روشنم آدھبنت کا جنگل مصرا کیتی کے رنگین مندر کو اپنی گود کے
گھیرے میں لئے ہوئے ہے"

ظاہر ہے کہ رنگین جگمگاتا ہوا مندر سیاہی مائل نہیں ہو سکتا۔ امرو ہی کی ایک اور نظم میں جو بدھ کی بیوہ کی پرارتھنا ہے، امرو کو چندر مکھ کہا گیا ہے اور اُس کی جسا گلاب کا ایک پھول ہے"

ایک اور شعر دیکھئے:۔

"میں تو اٹھ کر اس جگہ پہنچنے کو ہوں جہاں وہ میری راہ دیکھ رہا ہے جو دن سے کہیں سندر ہے"

ایک اور نظم میں عورت کہتی ہے:۔

"جب وہ کالی جھیل میں سے نہا کر نکلتا ہے تو گویا چاند رات میں نمودار ہوتا ہے"

اور جو ذرا سانولے ہیں وہ گورا بننے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ سنگار کے سلسلے میں

"ـــ بڑے بڑے کنول کے پھولوں سے برادہ لے کر اپنی چھاتیوں پر چھڑک لیا"

امرو کے بعد سنسکرت ادب کو چھوڑ کر ہم صوبائی رجحانات کی طرف آتے ہیں۔ بہار کے شاعر ودیاپتی نے سنسکرت ادب ہی کی روایات کے سہارے پر اپنے ذہنی عقیدے کو ذاتی محبت کے چھپانے کا ذریعہ بنایا اور اس لئے اس کے گیتوں میں رادھا گوری ہے اگرچہ یوں بھی رادھا کو گوری کہا جاتا ہے۔ چنانچہ

چہرہ جیسے بجلی چمکے ـــ اور کاندھے پہ بال گھٹا سے

ایک اور شعر

"چاند کنول کو گود میں لے کر ـــ ڈوب گیا مستی میں یکسر" اس شعر میں چاند کرشن مہاراج ہیں اور یہاں ودیاپتی نے سانولے سلونے شیام کی نسبت کا لحاظ بھی نہیں رکھا۔

اور سنئے: ـــ رادھا چھپ کر ملنے جا رہی ہے۔

۵ انگ انگ رادھا کا ایسی سندر جوت جگائے
چندر اجالا جس کے اندر گھل مل کر کھو جائے
نین کسی کے دیکھ نہ پائیں دیکھیں تو کب جانیں
رادھا اور چندر اجالا دونوں ایک ہوں کیسے مانیں؟

ممکن ہے کہ رادھا کا گورا تصور کرشن کے سانولے پن کے مقابل میں محض اضافی حیثیت رکھتا ہو لیکن گورے رنگ سے رغبت بہرحال ظاہر ہے۔

ودیاپتی کا ہمعصر چنڈی داس ہے جو بنگالی تھا اور بنگالیوں کے متعلق کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں لیکن اس کے ہاں بھی رادھا اگرچہ اس کی اپنی محبوبہ رامی دھوبن کا ایک عکس ہے پھر بھی گوری ہی دکھائی دیتی ہے۔

اردو شعرا گورے اور سانولے رنگ کے لحاظ سے عجب ڈھل مل قسم کے رہے ہیں اور ان کے ہاں اکثر دونوں رنگوں کا ذکر دکھائی دیتا ہے بعض شعرا اس لحاظ سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

ہندوستانی زندگی میں سانولے رنگ کی کثرت کے باوجود یہاں کے گیتوں اور ٹھمریوں میں بھی جہاں عموماً

"سانولی صورت، مہراج من"

دکھائی دیتا ہے وہاں

"گورے مکھ پہ سہائے کالی چونڈری بھی" نظر آتا ہے اور یہ بھی اچنبھے کے علاقے میں جہاں کے ریگستان میں پانی کو پھر شاید مل جائے صحیح معنوں میں گورا رنگ نادر معدوم ہی کا حکم رکھتا ہے کیونکہ پیلے رنگ کو گورا نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ شاید مختلف نسلوں کے رنگا رنگ اجتماع کا اثر ہے، غالباً قدیم ہندوستان میں مغلوں کی آمد سے پہلے سفید رنگ مانوس ہونے کے باوجود کچھ خاص رغبت کا باعث نہ تھا۔

ولی دکنی گجرات کے سانولے حسن کے گن گاتا ہے، میر تقی کو فرقت کا غم اس قدر مار ڈالتا ہے کہ معشوق کا حسن ان کے کلام میں ایک ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے اس کے باوجود یہ شعر کہ

کیفیت اس کے لب کی کیا کہئے   پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

گورے ہی رنگ کی ترجمانی کرتا ہے۔

میر حسن کی مثنوی کے تقریباً تمام کردار گورے ہیں۔ چنانچہ بدر منیر کے متعلق کہتے ہیں۔

۱۔ وہ ترکیب اور چاند سا وہ بدن   وہ بازو پہ ڈھلکے ہوئے نورتن
۲۔ وہ مکھڑا جسے دیکھ مہ داغ کھائے   وہ نقشہ کہ تصویر حیرت کو آئے
۳۔ زبس مثل آئینہ تھا اُس کا تن   کہے تو کہ تھی ناف عکس دہن
۴۔ وہ ساق بلوریں وہ انداز پا   پھرے ہے سحر چشم و دل میں سدا
۵۔ سماں اُس گھڑی کا کہوں کیا میں آہ   ستاروں میں تھا جلوہ گر ایک ماہ

نجم النسا کو دیکھئے:۔

۱۔ بھبھوکا سا تن اور منہ کی دمک   کہ جوں شعلۂ آتش سے اُٹھے بھڑک
۲۔ نہانے سے نکلا عجب اس کا روپ   نکل آئے بدلی سے جس طرح دھوپ
۳۔ وہ مہتاب سا چہرہ ہو زرد زرد   سراپا ہوا شکل اندوہ و درد

عیش بائی رقاصہ بھی گوری ہی ہے۔

۱۔ فقط کان میں ایک بالا پڑا   کہے تو کہ تھا مہ کے ہالا پڑا
۲۔ لٹیں منہ پہ چھوٹی ہوئی سربسر   کہ بدلی ہو جوں مہ کے ادھر اُدھر

یہ سب تو بڑے کردار تھے لیکن بدر منیر کی ساتھنوں کو بھی دیکھئے

۱۔ کئی ہمدم اُس کی جو تھیں ماہرو   بچھائے ہوئے کرسیاں سُو بسُو

اس کے مقابل میں سانولے رنگ کی حمایت میں ولی کے علاوہ داغ اور انشاؔ کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ انشا صنائع بدائع اور رعایت لفظی کے زمانے کا شاعر اور اس زمانے کے شعرا پر خلوص جذبات کے لحاظ سے غالباً نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اکثر ان کے کلام میں محبوب کا رنگ شعر کی فنی باتوں سے معین ہو جاتا ہے پھر بھی انشا پہلا اردو شاعر ہے جو سید اور زر کی فارسی کا عالم ہونے کے باوجود اکثر سانولے رنگ کا ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ

ہے نام خدا، وا جھڑے کچھ زور تماشا ——— یہ آپ کی رنگت
گات ایسی غضب، قہر پھبن اور جھمکڑا ——— اللہ کی قدرت

اور اس رنگت کی وضاحت اگلے ہی شعر میں ہے۔

۵ میں نے جو کہا ہوں میں ترا عاشق شیدا ——— لے کان ملاحت
فرمانے لگے ہنس کے سنو! اور تماشا ——— یہ شکل یہ صورت

اور یہ دیکھئے:۔

یہ نمک، یہ چھب، یہ سج دھج، یہ ادا کو دیکھ تیری
بتلا طلسم تحیر ہوئے غرق ہوشمنداں ———

ایک اور

سانولے پن پہ غضب ہے دھج بسنتی شال کی
جی میں ہے کہہ بیٹھئے جے اب کنہیا لال کی

غالب کے ہاں اگرچہ وہ داخلی ہوتے ہوئے بھی اپنی ہمہ گیری کی بنا پر غیر جانبدار شاعر ہے فطرتاً سفید رنگ ہی نمایاں ملتا ہے۔

مرزا رسوا عموماً ایک ناول نویس اور عالم کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن اُن کی شخصیت کے ساتھ اُن کی شاعری بھی دلچسپ اور قابل توجہ ہے۔ زندگی میں اُن کی محبوبہ ایک فرانسیسی عورت تھی لیکن جس طرح اپنے ناولوں میں انہوں نے آپ بیتی کے عنصر کو لوگوں کی نظروں سے چھپا کر پیش کیا ہے، اُسی طرح اپنی مثنوی امید و بیم کے ذریعے سے بھی اپنی محبوبہ کو

سانولا رنگ، نشیلی آنکھیں
شوخ طرار رسیلی آنکھیں

کہہ کر بات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بہ حیثیت عمومی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو شعراء کے محبوب کا رنگ عموماً جغرافیائی نسلی اور روایتی اثرات سے نمایاں ہونے کے باوجود امتیازی حیثیت نہیں رکھتا لیکن غالب کے بعد کے زمانے میں دو مثالیں مجھے بہت درخشاں طور پر دکھائی دیتی ہیں یعنی عبدالرحمن بجنوری اور عظمت اللہ مرحوم۔ ان دونوں شاعروں کی ایک ایک نظم گورے اور سانولے حسن کی تعریف میں ہے۔ اور اپنی مختلف خوبیوں کی بنا پر میں یہ دونوں نظمیں پیش کرتا ہوں۔

پہلے بجنوری کو سنئے۔

اجنبی

صنم فرنگ قمر جبیں، بت سیم رنگ، غضب حسیں
وہ عذار نازک دشر مگیں کہ رقیب ساغر آتشیں
وہ ہوا میں کاکل عصفریں کہ شہاب ثاقب شب رواں

۲

در قات غنچۂ گلاب گوں وہ لب گداز پر از فسوں
مژدۂ دراز دکج و نگوں میں نہاں وہ دیدۂ نیلگوں
کہ سحر کے پردہ ارغواں میں فضائے گنبد آسماں

۳

تجھے میں نے دیکھا ہے اک نگہ نہیں مجھ سے تو ذرا آشنا
ترے عشق میں ہوں میں مبتلا بسلاسلِ الم و بلا
مجھے کیا پتہ کہ ہے اب کہاں، تجھے کیا خبر گئی کس کی جاں

بخشوری کی نظم میں ایک گوری عورت کو جس چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ ایک سانولے حسن کے متوالے کو بھی للچا سکتا ہے اور یہی کیفیت عظمت اللہ کی نظم میں ہے سنئے:۔

سندر صورت سندر ہی ہے رنگت گوری یا کالی

اندھر دیس کی سندر پتری کالی کوئل سے کالی
بال بھی کالے گھنگھور گھٹا
ہونٹ وہ گدرے جامن کے سے اور ادھرٹ میں لالی

. . . .

بڑی بڑی سی آنکھ غلافی پتلی بھنورا سی کالی
خمار اک ستانا چھایا
وہ من موہنی مقناطیسی ان میں چمک ناگن والی
آنکھ لڑی اور دل کو بھایا
اور سراپا گدرا گدرا، سانچے میں ڈھلا، لچکیلا
جوش جوانی، پھٹتا جوبن
بھرا بھرا سا ڈھلا ڈھلا سا وہ اک اک عضو سجیلا
وہ ہر چیز کا بے ساختہ پن
اک موج مچلتی مچلاتی چڑھتی اترتی تھراتی
اور گردن کا نفیس ڈھلاؤ
سینے کا جوالا مکھ، کمر لچکتی، بل کھاتی
ہوش ربا اتار چڑھاؤ
سندر صورت سندر ہی ہے رنگت گوری یا کالی
نظر نے جس رنگ میں ڈھالی
فطرت کے لئے حسن یہی ہے سج دھج گرمانے والی
جان کی کھیتی جوتنے والی

مضمون تو ختم ہو گیا۔ لیکن کوئی صاحب شاید یہ پوچھیں کہ عنوان پوری طرح چسپاں نہیں ہوتا، لیکن میں کہوں گا کہ اپنے لئے سب برابر ہیں۔

کیا گوری، کیا سانولی۔

میراجی

شعر

ذروں میں طور قطروں میں طوفاں تجھے لئے ہے
ڈالا مری نگاہ نے پردہ کہاں کہاں

فانی

نیا کھیل

در احاطۂ مسجد سنا رہا ہے پرانی کہانیاں مجھ کو
گزر کے اس میں سے ہم سارے دوست ایک نیا کھیل کھیلنے کے لئے جایا کرتے تھے اکثر
میں ایک سات آٹھ برس کا ذرا سا بچہ تھا
— ذرا سا بچہ جسے ایسی ویسی باتوں کی بالکل کوئی خبر ہی نہ تھی۔

وہاں — جہاں پڑے رہتے تھے جھاڑو مٹی کے لوٹے — غبار آلودہ،
پھٹی ہوئی سی صفیں تھیں، اٹی ہوئی تھیں غبار اور جالوں سے یکسر،
پھدکتی رہتی تھیں بھوری سی ٹڈیاں جن پر
— وہ کاہلی کی چڑیلیں، کریہہ اور منحوس!
کبھی کوئی متنفس جہاں بھٹکتا نہ تھا۔
سوائے عورتوں کے، اور وہ بھی عید کے دن! —
وہیں ہم اپنا نیا کھیل کھیلا کرتے تھے
ہمیں جو ایک نئے دوست نے سکھایا تھا
وہ ایک دن کے لئے شہر سے وہ آیا تھا!

انجم رومانی

تغزل

سرد آہیں بھروں گا تو جوانی میں بھروں گا
مرنے کا ہے موسم یہی، جی بھر کے مروں گا

آغاز طلب ہے مرا افسانۂ ہستی
بنیاد تری آنکھ کی مستی پہ دھروں گا

حالات مجھے خوابِ پریشان بنا لیں
حالات کو کچھ میں بھی پریشان کروں گا

تو رُوپ میں انساں کے مرے سامنے آجا
اللہ! تجھے صدق بھرا سجدہ کروں گا

گمنام ہوں، ناپید ہوں، گویا کہ نہیں ہوں
جینا مِرا تسلیم ہو پہلے تو مروں گا

جو بات چھپاتا ہوں وہ ہے پہلے ہی رسوا
لیتے ہیں ترا نام کہ میں آہ بھروں گا

آجاتی ہیں خود لب پہ مرے آپ کی باتیں
اندیشہ ہے میں آپ کو بدنام کروں گا

اے موت خرابات میں ملنا کبھی آ کر
رندانہ جیا ہوں تو میں رندانہ مروں گا

اس ہوش نے کیا کیا مجھے گمراہ کیا ہے
اس ہوش کو میں بھی ذرا گمراہ کروں گا

شاعر ہوں عدمؔ! موت کی تقریب تو ہو کچھ
مے پی کے کسی شوخ کے زانو پہ مروں گا

عدمؔ

رخصت

ہاں، یہ مانا کہ بہت دور تھا لیکن اکثر
سوچتے سوچتے ہی راستہ کٹ جاتا تھا،
شہر کے قرب و جوار
گویا اک آنکھ جھپکتے میں نہاں ہوتے تھے،
سامنے مجھ کو نظر آتا تھا
ایک ویران محل،
یونہی بے دھیانی میں چوکھٹ بھی نکل جاتی تھی،
(وہی چوکھٹ جسے لاکھوں پاؤں
دہاتھ کے بل پہ ہمیشہ چھپ کر،)
روندتے روندتے اس حال پہ لے آئے تھے،
ٹوٹے دروازے کے سب نقش و نگار
کچھ تو بوسیدہ تھے اور باقی مری آنکھوں کو
اتفاقاً ہی نظر آئے تھے،
جیسے چلتے ہوئے ــــــ رستے میں پھسل کر کوئی
بے چلے راہ سے کچھ دور نکل آتا ہے
میں بھی دروازے سے، چوکھٹ سے گذر جاتا تھا،
جیسے ساون میں کسی ڈال پہ کوئی گرگٹ
دیکھتے دیکھتے میں رنگ بدل جاتا ہے
ایک ہی وقت میں، اک لمحے میں
یونہی ایوان بھی لیٹا ہوا، بیٹھا ہوا استادہ نظر آتا تھا،
راہ تکتے ہوئے، چپ چاپ ــــ نگاہیں اُس کی
مجھ کو بے رنگ جھروکوں سے نکلتی ہوئی کرنوں کی طرح
بھولی یادوں سے ملا دیتی تھیں ــــ
بھولی یادیں جو پھسلتے ہوئے ملبوس کی مانند نئی باتوں کو لے آتی ہیں
کبھی للچاتی ہوئی اور کبھی شرماتے ہوئے قلب کو گرماتی ہوئی،
آپ ہی آپ میں بہتے ہوئے دھارے کی طرح
اپنے پاؤں کو بڑھا لیتا تھا۔
آپ ہی آپ میں رِستی ہوئی بوندوں کی طرح
سوچتے سوچتے رُک جاتا تھا۔
آپ ہی آپ اُبلتی ہوئی چشمِ نمناک
یاد کے دامنِ بوسیدہ سے
خشک ہونے کے لئے پل کو لپٹ جاتی تھی،
آپ ہی آپ میں اڑتے ہوئے طائر کی طرح
بہتے بہتے کسی ٹہنی پہ بسیرا لے کر
جھولتی ٹہنی سے لپٹی ہوئی، پھیلی ہوئی، بے جان زمیں کے اوپر
اپنی ہستی کو گرا دیتا تھا،
اور گرتے ہی نظر آتا تھا
ایک ویران محل
جس کی چوکھٹ کو مرے ہاتھوں کے ناخن ہر دم
چھیلنے کے لئے بے تاب رہا کرتے ہیں۔
جیسے یوں چھیلنے سے منظرِ بوسیدہ پر
کچھ نئے نقش ابھر آئیں گے۔

اب سمجھتا ہوں کہ یوں بات نہیں بنتی ہے،
آپ ہی آپ کوئی بات کبھی بن بھی سکی؟
آپ ہی آپ کلی کھلتی ہے
اُس کی صورت ہی بگڑ جاتی ہے،
آپ ہی آپ زمیں ہلتی ہے
اُس کی صورت ہی بگڑ جاتی ہے،
آپ ہی آپ گھٹا چھاتی ہے۔
آسماں صاف نظر آتا نہیں،
آپ ہی آپ چلی آتی ہے اندھی آندھی
اور پھر منظرِ بوسیدہ ابھر آتا ہے،
آپ ہی آپ کوئی بات کبھی بن بھی سکی؟
اب سمجھتا ہوں کہ یوں بات نہیں بنتی ہے،
آپ ہی آپ میں شرمندہ ہوا کرتا ہوں۔

میراجی

نقد و نظر

ہندوستانیوں کی مختصر تاریخ

مصنفہ ایچ۔ جی۔ رالنسن سی۔ آئی۔ ای۔ ایم اے۔ آئی۔ ای۔ ایس ــ مترجمہ بول چند ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر ہندو یونیورسٹی۔ بنارس۔ حجم پونے پانچ سو صفحات۔ لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ مجلد۔ کاغذ نفیس۔ قیمت ڈھائی روپے۔ شائع کردہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی۔

یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ ہے جو مصنف نے انگریزی میں لکھی تھی۔ اور ڈاکٹر بول چند نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ ہندوستانی مدارس میں ہائی کلاس کے نصاب میں شامل ہو سکتی ہے۔ زمانہ ماقبل تاریخ سے لے کر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء تک ہندوستان کی عہد بہ عہد سیاسی و معاشرتی تبدیلیوں اور ترقیوں کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے۔ تاکہ طلبہ ہر اہم واقعہ سے آشنا ہو سکیں۔ کتاب کا وہ حصہ جو ہندو کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے تسلی بخش طریقے سے لکھا گیا ہے۔ ویدک زمانے کے حالات، بدھ مذہب کی اشاعت و فروغ، مگدھ کی سلطنت کا عروج، چندر گپت موریہ اور اشوک کا عہد زریں اس حصے کے اہم باب ہیں۔ مصنف عہد قدیم کی ہندو تہذیب کی مدح و ستائش کرتا ہے اور بتانا چاہتا ہے کہ اس وقت ہندوستان نہایت خوش حالی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ سلطان سبکتگین کے عروج سے ہندوستان اور افغانستان کی چپقلش شروع ہوئی جس کا انجام یہ ہوا کہ تھوڑے عرصے کے اندر ہندوستان میں مستقل اسلامی سلطنت قائم ہو گئی۔ یہ بات کہ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں تہذیب و تمدن، علم و فضل اور عسکری روایات کے اعتبار سے ہندوستان کو کس قدر بلند حیثیت کا مالک بنا دیا تھا اب بحث و مباحثہ کے حدود سے گذر کر ایک تاریخی واقعہ بن چکا ہے لیکن زیر نظر کتاب پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انگریز مصنف اب بھی وہی پرانا راگ الاپ رہے ہیں جو انہوں نے آج سے ایک سو سال پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کے لئے ایجاد کیا تھا یعنی یہ کہ مسلمان بادشاہ ظالم، جابر اور ہندو کش تھے انہوں نے مندر مسمار کئے، ہندوؤں کو بہ جبر مسلمان کیا اور اسلام کی تبلیغ شمشیر کے ذریعے سے کی۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس کتاب کے مصنف نے بھی جابجا اس غلطی کا ارتکاب کیا ہے اور مسلمان بادشاہوں کے خد و خال کو نہایت گھناؤنے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ سلاطین دہلی کے متعلق لکھتے ہیں۔

> "اس تین سو سال کی حکومت میں ہندو ایک خوفناک آزمائش سے گذرے۔ مسلمان حملہ آور خونخوار اور متعصب تھے۔ ہندوؤں کو لوٹنا اور غلام بنانا اپنا حق اور مندروں اور بتوں کو مسمار کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔" (صفحہ ۱۰۱)

محمود غزنوی اور اورنگزیب کے جبر و تعدی کی وہی فرضی داستانیں بیان کی گئی ہیں جن کا تاریخ سے قطعاً کوئی تعلق نہیں اور جن کا ہندوستان کے معتبر و مستند ہندو اور مسلم مورخوں نے تار و پود بکھیر کر حقیقت کا چہرہ بے نقاب کر دیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ایک ایسی تالیف میں جو درسی نصاب کے طور پر لکھی گئی ہے اس قسم کی بے سر و پا روایات درج ہیں جن کا تاریخی حقائق کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور جو محض برطانیہ کی شہنشاہی اغراض کو پورا کرنے کے لئے وضع کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ مصنف اکثر مقامات پر ایسی باتیں لکھ گیا ہے جن کی خود ہی آگے جا کر وہ تردید کر دیتا ہے۔ شاہجہاں کے باب میں لکھتا ہے۔

> "شاہجہاں کا عہد مغلیہ حکومت کا زریں عہد کہلاتا ہے۔ ... سالانہ مالیہ ۲۲ کروڑ روپیہ تھا۔ اور آگرہ کے قلعے کے تہ خانوں میں بے شمار خزانہ جمع تھا۔ شاہجہاں کا دربار نہایت عالیشان سجایا جاتا تھا۔ مصوروں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی ...."
>
> (ص ۲۵۲)

اس سے آگے چل کر مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب گناتے

ہوئے لکھتا ہے

"شاہجہاں کی شان دار عمارتوں کے لئے روپیہ فراہم کرنے کی غرض سے جو زبردست محاصل لگائے گئے ملک ان کے بوجھ سے تباہ ہو گیا تھا" (صفحہ ۱۷۲)

دیانت داری کے ساتھ ہماری یہ رائے ہے کہ جو شخص فارسی سے ناواقف ہے اور جس نے ہندوستان کی اسلامی سلطنت کے ہم عہد، ہم عصر مورخین کی لکھی ہوئی تاریخوں کو نہایت بالغ نظری سے مطالعہ نہیں کیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہدِ حکومت کی صحیح اور قابلِ اعتبار تاریخ لکھنے کا اہل ہی نہیں۔ ایک خاص نقطۂ نگاہ سے اور چند مخصوص اغراض کے ماتحت اِدھر اُدھر سے حسبِ منشا مواد فراہم کر کے ایک کتاب مرتب کر لینا تاریخ نگاری نہیں کہلاتا۔ اس کے لئے سیکڑوں مطبوعہ و غیر مطبوعہ مسودات کی چھان پھٹک کی ضرورت ہے۔ پھر کہیں جا کر روایات کا بادل چھٹتا اور حقیقی تاریخ کا چہرہ نظر آتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ جو ناقص اور بے مصرف نظامِ تعلیم ہمارے مدارس میں رائج ہے اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسی قسم کی تاریخی کتابیں نصاب میں شامل ہوں۔

"ع"

اشعار

بے رنگ ہے گلاب کی کلی کا
نقشہ ہے کسی کی کم سنی کا
بلبل کی بہار میں نہ پوچھو
منہ چومتی ہے کلی کلی کا
دیکھو نہ جلیل کو مٹاؤ
مٹ جائے گا نام عاشقی کا

جلیل

اپریل سنہ ۱۹۴۲ء
جلد ۲۰
نمبر ۴

ایڈیٹر
صلاح الدین احمد
آنریری جائنٹ ایڈیٹر
میرا جی

فہرست مضامین

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک و وی پی پانچ روپے۔ ممالک غیر سے دس شلنگ فی پرچہ آٹھ آنے

دنیائے کاروبار

"ایک رات"

ایک عرصے سے فلم بین طبقہ شالیمار پکچرس کی شاندار پیشکش "ایک رات" کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔ آخرش انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں اور ڈائرکٹر و پروڈیوسر مسٹر ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد کا پہلا شاہکار ۱۵ مئی سے کراچی کے بہترین سینما ہال پلازا میں دکھایا جارہا ہے۔

وہ لوگ جنہوں نے پراسرار نینا کا رو پہلی حسن صرف صفحۂ قرطاس کی سہ رنگی تصاویر میں دیکھا ہے۔ اب پردۂ سیمیں پر جلوہ ریز دیکھ رہے ہیں۔ نینا گو پہلی مرتبہ کیمرے کے سامنے آئی ہے مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اداکاری کے ہر پہلو سے آشنا ہے۔ اُس کی نگاہیں کیمرے کی ہر حرکت کو سمجھتی ہیں۔ وہ جانتی ہے کہ جذبات کو کس طرح پیش کیا جاتا ہے۔

"ایک رات" کا افسانہ مہمل اور بے ربط واقعات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ہماری سوسائٹی میں رات دن پیش آنے والے واقعات کی ایک جھلک ہے۔ ان واقعات کو مسٹر احمد نے نرالے ٹریٹمنٹ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مکالمے عام فہم اور روزمرہ کی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ گانے بامعنی اور نہایت پاکیزہ ہیں جنہیں مسٹر ایس کے پال نے اپنی نرالی دُھنوں سے موثر دیا ہے۔ اس کے قطع نظر ٹریڈ مارک اور ٹائٹل کی موسیقی ہندستانی تاریخ فلمسازی میں بالکل نئی ہے ——— موسیقی کا زیر و بم ہا کی عروجی کیفیات کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کیا گیا ہے سننے والے کو مجسم موسیقی چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے "ایک رات" تاریخ فلمسازی میں ایک بہترین باب کا اضافہ


کا مہمان نوازی

خاندان کے پینے کی چیز
ہندوستانی چائے



بزمِ ادب

اس اشاعت کے پانچوں افسانے معیار کے اعتبار سے بلند اور دلچسپی کے لحاظ سے صفِ اوّل کے افسانوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ جناب دیویندر ستیارتھی جو دیہاتی گیتوں کے جامع کی حیثیت سے ایک عالمگیر شہرت کے مالک ہیں، رفتہ رفتہ ہمارے افسانوی ادب میں بھی نام پیدا کر رہے ہیں۔ اُن کا شاملِ اشاعت افسانہ یہ انسان، بہ یک ان کی قوتِ تجزیہ، اور ہمدردانہ اندازِ نظر کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ ستیارتھی کی تحریر میں جو ایک ناقابلِ بیان سی نرمی پائی جاتی ہے وہ اُن کی اپنی شخصیت کا عکس ہے۔ غالباً انہیں غصّہ کبھی نہیں آتا اور شاید اسی لئے اُن کے افسانے بھی کسی شدید قسم کے مدّ و جزر سے معرا ہوتے ہیں۔ ستیارتھی نے اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا حصّہ سفر میں بسر کیا ہے، اُن کا موجودہ افسانہ اُن کی زندگی کے اس پہلو کی نہایت خوبی سے غمازی کرتا ہے۔

جنابِ مختار صدّیقی نے قربانی کے نام سے جِدل آویز افسانہ لکھا ہے۔ وہ اپنی طرزِ تحریر کے لحاظ سے آج سے پچیس برس پیشتر کے اُستادانِ فن کی یاد دلاتا ہے۔ مختار صاحب کا طرزِ بیان پُر شکوہ اور اُن کا انتخابِ الفاظ غایتِ درجہ ماہرانہ ہے۔ فن کار نے افسانے کی رومانی فضا کو جس انداز سے الفاظ کے طلسم میں باندھا ہے، وہ کچھ اسی کا حصہ ہے۔

قدرت اللہ صاحب شہاب کا افسانہ پہلی تنخواہ وارداتِ شباب کا ایک نہایت گہرا مطالعہ ہے۔ افسانہ نگار کا خلوص، اس کے مشاہدے کی باریکی اور اُس کے داخلی اندازِ تفکر کی مچلتی ہوئی کیفیت افسانے کی ہر ہر سطر سے عیاں ہے۔ شہاب صاحب کی ہمارے ہاں غالباً یہ پہلی چیز چھپ رہی ہے۔ اس آغاز سے ان کی تحریر کے شباب کا اندازہ لگائیے۔ جنابِ دھرم پر کاش آنند خبردار ہو جائیں۔

رہبر صاحب اُن خاموش ہندو نوجوانوں میں سے ہیں۔ جنہیں اردو ادب سے ... محبت ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں چپکے چپکے اپنی واردات کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ زیرِ نظر کہانی اُن کے گوناگوں تجربات کا ایک لطیف عکس ہے جس کی خاموش، حزیں اور پُرسوز کیفیت کچھ محسوس کرنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ شکارا نوجوانی کے ایک شاذ نمونے کا عمیق نفسیاتی مطالعہ ہے۔ لیکن ہم اپنے آپ میں اس سے اجنبیت نہیں پاتے اس کا ہیرو ہماری ہمدردی اور تحسین کا پورا مستحق ٹھہرتا ہے اور یہی آرٹسٹ کی کامیابی ہے۔

بہرہ مضامین میں دو نہایت قابلِ قدر مضمون چھپ رہے ہیں۔ محی الدین صاحب زخمؔ عظیم آبادی نے اردو شاعری کے جدید رجحانات کا جائزہ ایک نئے زاویۂ نگاہ سے لیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اس جائزے میں انہوں نے ہمارے ایک بہت بڑے ذہین طبقے کی پوری نمائندگی کی ہے بعض اعتبارات سے یہ مقالہ کچھ تشنہ نظر آئے گا مگر جب یہ خیال کیا جائے کہ ادبی دنیا کے پندرہ سولہ صفحات میں ایک پورے دور کا جائزہ نظم کیونکر سما سکتا ہے تو صاحبِ مضمون کو ان کے اندازِ انتخاب اور قرینۂ تحریر پر مبارکباد پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

جناب شیدا کیوردی نے مومن کی نزاکتِ تخیل پر ایک دل آویز مضمون لکھ کر مومنیات میں ایک قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ ہمارے عہد میں جن شعراء کی دوبارہ قدریں قائم کی گئی ہیں، ان میں میر، غالب، آتش اور نظیر اکبر آبادی کے ساتھ مومن بھی ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارا سخن فہم طبقہ اس مضمون کا نہایت دلچسپی سے مطالعہ کریگا۔ **صلاح الدین احمد**

اردو شاعری کے جدید رجحانات

لارڈ میکالے کا خیال ہے کہ تمدن کی روشنی میں شاعری کی روشنی تخئیل کھو جاتی ہے، سیاسی بیداری اور قومی شعور کی رنگارنگی میں حسن شعری مدغم ہو کے رہ جاتا ہے، یوں فنی نقطۂ نگاہ سے شعر و ادب کے نئے چولے لاکھ جاذب نظر ہوں، لیکن وہ حسن کارانہ نغمے جو دلوں کے تاروں کو چھیڑ سکتے ہوں مدھم پڑ جاتے ہیں ——

مغربی مفکر کا زاویہ نظر نفسیاتی اصول پر ٹھیک ہے، لیکن اتنا محدود و مسدود ادب ترقی پسند لٹریچر نہیں ہو سکتا، ایسے ادب کی مثال تالاب کے پانی سی ہے جو شورش و ارتعاش سے قطعاً محروم اور گاتی ہوئی ندیوں کی روانی سے بالکل معرا ہوتا ہے، ادب قوموں کی زندگی کا آئینہ ہے، آئینے میں ہر خط و خال روشن ہونا چاہئے، —— ——

آنکھ کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

یہی ہوا جب ۵۷ء کے طوفان نے جہاں ملک کی سیاسی اور معاشی بساطیں الٹ دیں، وہاں انجمن شعر و ادب کا نظام بھی درہم برہم ہو گیا، ساقی و میکش بدلے مینا و ساغر بدلا شمع کا نور بجھی، پروانوں کا ذوق کلیمی کافور ہوا، مغربی سائنس اور عقلیات دماغوں پر مستولی ہو گئے۔ نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ زلف ایاز میں خم، جیحوں و سیحون کے سوتے خشک ہو گئے اور حالی و آزاد نے پرانے آئینے توڑ ڈالے، آئینہ بے قصور تھا، وہ آدمی سا چور نہیں ہوتا، بلکہ حقیقت کو عریاں کر دیتا ہے، قبح پر حسن کا پردہ نہیں ڈالتا، اگر اپنے خط و خال مارنگ و روغن درست نہیں تو آئینہ سے برہمی کیوں؟

نیچرل شاعری:-

جدید شاعری آزاد کی "انجمن پنجاب" کی انجمن آرائی کو نہیں بھول سکتی، ان کا فارسی شاعری سے بغاوت کا بلند بانگ آوازہ اب تک کانوں میں گونج رہا ہے، "تعجب ہے کہ اس نے (فارسی) شاعری نے اس قدر خوش ادائی اور خوش نمائی پیدا کی کہ ہندی بھاشا کے خیالات جو خاص اس ملک کے حالات اور ماحول کے مطابق تھے انہیں بھی مٹا دیا، چنانچہ خواص و عوام پپیہے اور کوئل کی آواز چنبیلی اور موگرے کی خوشبو کو بھول گئے، ہزارہ او بلبل، نسرین و سنبل جنہیں کبھی دیکھا لیکن ان کی تعریف کرنے لگے، رستم اور اسفندیار کی بہادری، کوہ الوند اور بے ستون کی بلندی، جیحون و سیحون کی روانی نے وہ طوفان اٹھایا کہ ارجن کی بہادری ہمالہ کی ہری ہری چوٹیاں اور گنگا جمنا کی روانی کو بالکل روک دیا، (نیرنگ خیال)

نظیر اکبرآبادی:-

لیکن دیکھنے والی آنکھیں جانتی ہیں کہ جس تجدید کے لئے یہ راگ الاپا جا رہا تھا، حالی و آزاد جو عمارت کھڑی کر رہے تھے۔ اس کی داغ بیل غیر محسوس طور پر نظیر اکبرآبادی نے ڈال دی تھی، اس کی شاعری کے سوتے زندگی کے لامعلوم چشموں سے پھوٹتے ہیں، یہ ایک ایسا تناور درخت ہے کہ جس کی جڑیں ہمارے سرگزشتہ حیات میں پھیلی ہوئی ہیں، ایک ایسا آئینہ ہے جو فطرت کے تمام حسن و قبح کا عکاس ہے، لیکن اس کا کمال یہ ہے کہ اس ہمہ گیری کے ہوتے بھی حسن کاری کا دامن کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیتا۔ اس کی ہر نظم مختلف جذبات اور متنوع خیالات و محسوسات کا ایک رنگین اور دلآویز گلدستہ ہے۔ وہ عالم جذب میں فطرت کے بوقلموں مناظر سے کھیلتا اور اس کا دماغ ایک آئینہ خانہ بنتا ہے، برسات کی چاندنی، مہتاب کی انگڑائیاں اور چادر سیمیں میں بہار کی گلفشانی کا ایک منظر دیکھئے ——

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں   جھرنوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں

پڑتی ہے پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں — گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
جنگل سب اپنے تن پہ ہریالی سج رہے ہیں — گل پھول جھاڑ بوٹے کر اپنی دھج رہے ہیں
بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہے ہیں — اللہ کے نقارے نوبت کے بج رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

وہ جس ماحول کی تصویر پیش کرتے ہیں اس میں کھو جاتا ہے لیکن اس کا دماغ بیدار رہتا ہے، اس کی آنکھیں ہر رنگ میں دار رہتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ قصداً مناظر قدرت کی تصویریں نہیں کھینچتا، بلکہ خود تخیل کی طوفان خیزی اس کے آئینۂ خیال میں حسین و دلکش تصویریں بن کر عکس ریز ہونے لگتی ہے جذبات کو اپنی تصویروں میں بڑی اہمیت دیتا ہے۔ شام کے وقت قوسِ قزح کی رنگینی بڑی دلآویز ہوتی ہے لیکن حقیقت آگاہ نگاہوں کے لئے اس کے حاشیے پر شفق کی گلگونی کم نظر فروز نہیں، آبشار کا مدھر نغمہ عجیب پرکیف ہوتا ہے لیکن جھٹ پٹے کا نغمہ زا سکوت بھی حسن فطرت کی جان ہے، بالکل اسی طرح مناظر قدرت کے جذبات بھی فطرت پرست شعراء کے لئے بنیادی اجزائے شعری ہیں، جاڑے کے موسم کی تصویر کشی میں نظیر کی فن کارانہ تصویریت نے کیا ہی دلآویز عالم پیش کیا ہے ——

جب ماہ اگھن کا ڈھلتا ہو تو دیکھ بہاریں جاڑے کی
جب ہنس ہنس پوس سنبھالتا ہو تو دیکھ بہاریں جاڑے کی
دن جلدی جلدی چلتا ہو تو دیکھ بہاریں جاڑے کی
پالا برف پگھلتا ہو تو دیکھ بہاریں جاڑے کی

اگھن کے ماہ کا ڈھلنا، پوس کا ہنس ہنس کر سنبھلنا اور دن کا جلدی جلدی چلنا جذبات نگاری کی روشن مثالیں ہیں —— یہ وہ مثالیں ہیں جن سے اجنبیت کی بو نہیں آتی، پھر خلاقی کا یہ معراج ہے کہ منظومات کا بیشتر حصہ ہندوستانی فضا، ہندوستانی ماحول اور سرزمین میں سانس لیتا ہے۔ اس میں خاص ایک درد ہے۔ **ایک موسیقی** ہے۔ ایک ایسی موسیقی جو ندی کی لہروں میں گنگناتی ہے۔ اور تھکے ہوئے دماغوں کو سکون بخشتی ہے۔ دیوالی اس نوع کی کامیاب نظم ہے ——

ہر جا گہ مثال گلابوں کی خوش رنگت کی گلکاری ہے
اور ڈھیر عبیروں کے لاگے، سو عشرت کی تیاری ہے
ہیں راگ بہاریں دکھلاتے، اور رنگ بھری پچکاری ہے
منہ سرخی سے گلنار ہوئے، تن کیسر کی سی کیاری ہے
یہ روپ جھمکتا دکھلایا، یہ رنگ دکھایا ہولی نے
ہر آن خوشی ہیں، آپس میں، سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں
رخسار گلابوں سی گلگوں کپڑے سو رنگ ٹپکتے ہیں۔
کچھ آگ اور رنگ جھمکتے ہیں، کچھ مے کے جام چھلکتے ہیں
کچھ کودے ہیں، کچھ اچھلے ہیں کچھ ہنستے ہیں، کچھ بکتے ہیں
یہ طور، یہ نقشہ عشرت کا ہر آن دکھایا ہولی نے

ہولی ہندوستانی اساطیر کی ایک رنگین یادگار ہے، مرلی منوہر کرشن کنھیا اور چندر روپی رادھا کے اتھاہ پریم کا سندر سپنا ہے۔ آج اس داستان پارینہ کو صدیاں گزر چکی ہیں، لیکن ہمارے معاشرہ میں اس کی یاد اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ زندہ اور پائندہ ہے —— پھاگن بسنت رت ہیں جبکہ ہندوستان جنت نشاں پر ایک دہقانی دوشیزہ کے شباب کا عالم طاری ہوتا ہے، حسین فطرت انگڑائیاں لیتی ہوئی اٹھتی ہے، فضائیں چھاگلیں چھلکاتی اور ہوائیں مستانہ وار چلتی ہیں، سرسوں پھولتی ہے، مور بولتے ہیں، باغوں میں جھولے ڈالے جاتے ہیں، نو خیز دوشیزائیں جھولتی اور گاتی ہیں، نمو اور بھرپور جوانی کے ابھار سے اُن کی چولیاں مسکنے لگتی ہیں، عبیر و گلال کی بارش ہوتی اور پچکاریاں چھوڑی جاتی ہیں، چاند سا نکھرا رنگ سے گلنار ہو جاتا ہے، کومل اور نازک بدن کیسر کی کیاری بن جاتی ہے، سچ تو یہ ہے عشق جاگتا اور حسن بدمست شباب ہو جاتا ہے، نظیر کی ہولی میں یہ ساری رنگینیاں موجود ہیں، کوئی گوشہ حسن اور نظر فروزی سے معرا نہیں متخیلہ ان رنگین نوائیوں پر جھوم جاتا ہے۔

آزاد :-

یہی تھے وہ اساس جن کی بنیاد پر آزاد نے ایک نئی عمارت بنانی چاہی لیکن فرق یہ ہے کہ انہوں نے مغربی ساز پر مشرقی گیت گانا چاہا، عشق و حسن کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں، گل و بلبل چمن شاعری سے نکال دیئے گئے، بالعموم آزاد نے اظہار جذبات کے لئے صنف

شاعری میں "مثنوی" کو محبوب رکھا، اور اسے اخلاقی مضامین اور مشاہدہ فطرت کے لئے کامیاب ترین ترجمان سمجھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری بے کیف اور بے رنگ افکار کی ایک منظوم داستان ہو کر رہ گئی، ہو سکتا ہے کہ انسان جذبۂ حسن و محبت سے منہ موڑ کر کوئی اور ارفع اور اعلیٰ مخلوق بن جائے لیکن کم از کم شاعر تو نہیں ہو سکتا، "مثنوی شب قدر" آزاد کی شاید گراں قدر یادگار ہے!!

اس کے کچھ افتتاحیہ اشعار یہ ہیں ——

اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو　　عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو
کلفت سے دن کی ہو گیا منہ نیز زرد ہے　　اور ڈالی اس پہ شام نے غربت کی گرد ہے
آئے شب سیاہ کہ لیلائے شب ہے تو　　عالم میں شاہزادیٔ مشکیں نسب ہے تو
ہونا وہ بعد شام شفق میں عیاں ترا　　اڑنا وہ آبنوس کا تخت رواں ترا
کھولے ہوئے شفق کا نشاں زرق برق ہے　　رکھ کر کرن کا تاج نکلتا تھا شرق سے
اس کے عمل کو توڑنا تیرا ہی کام ہے　　سکہ ہے اب ستاروں پہ اور تیرا نام ہے

پوری نظم ایک صحرائے بے آب و گیاہ نظر آتی ہے، شعریت کا کہیں پر نام و نشان بھی نہیں، ترنم اور موسیقی اسے چھو نک نہیں گئی سادگی یقیناً شاعری کی معراج ہے، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ اس سے شعریت کی روح نکال دی جائے، میر کے ان اشعار میں بھی سادگی ہے اور غایت سادگی۔ ؎

منعِ گریہ نہ کر تو اے ناصح　　اس میں بے اختیار ہم بھی ہیں

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں　　حالت اک اضطراب کی سی ہے
میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں　　ساری مستی شراب کی سی ہے

لیکن ان سے دماغ پر ایک نشہ کا عالم طاری ہو جاتا ہے، ذوق و وجدان جھومنے لگتا ہے اور روح گنگنانے لگتی ہے، یہاں وہ شریت نہیں جس کی آزاد کی نظم میں بہتات ہے، آزاد ایک جگہ "فصاحت" پر یوں روشنی ڈالتے ہیں "فصاحت" اسے نہیں کہتے ہیں کہ مبالغہ اور بلند پروازوں کے بازوؤں پر اڑتے، قافیوں سے فر فر کرتے گئے، لفظی اور شوکت الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے" —— لیکن شب کے لئے لیلیٰ کی رعایت، شاہزادیٔ مشکیں نسب کا التزام خود کس شان و شوکت سے کرتے ہیں، خیر اتنا تو مشرقی شاعری میں خوشگوار یا ناگوار طور پر کسی طرح گوارا کیا جا سکتا ہے، لیکن "اڑنا وہ آبنوس کا تخت رواں ترا" کی تشبیہ شاعر تو کجا جمالیاتی ذوق کا ایک معمولی انسان بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہاں تمام وہی عناصر موجود ہیں جن کے خلاف بغاوت کا پرچم لہرایا گیا تھا، اور آزاد خود اس کے سرخیل کارواں تھے۔

آزاد اکثر سودا کے رنگ میں بھی آ کر رنگ جما جاتے ہیں، لیکن یہاں بھی نقل اصل کی منزل تک نہیں پہنچتی۔

"ابر کرم" کے چند اشعار کے تیور ملاحظہ ہوں ——

اے ابر جب تو آتا ہے میداں پہ اوج کے　　دل بادل آگے پیچھے لئے ساتھ فوج کے
آتا ہے دیوزاد کی صورت بنا کے تو　　اور بال و پر سمند کے اڑا تا لگا کے تو
اس وقت تیرے رعد کی آواز ہے غضب　　اے ابر تیرا ہمدم و دمساز ہے غضب

جو تصویر پیش کی گئی ہے۔ اسے ابر کرم کی بجائے۔ ابر غضب کہنا زیادہ موزوں ہے، اس کو پڑھ کر طبیعت میں سکون نہیں بلکہ تکدر پیدا ہوتا ہے۔ ذہن الجھنے لگتا ہے۔ اور روح گھبرانے لگتی ہے۔

بڑا ظلم ہو گا اگر مٹی کی تصویروں اور خس و خاشاک کے انبار میں بعض بولتی ہوئی تصویریں اور ہنستے ہوئے پھول نہ پیش کروں، یہ مشاہدہ فطرت کی کمی تھی جس نے ہمارے شعراء کو اکثر حقائق سے بے نیاز رکھا، مناظر فطرت کی بھی تصویر کشی میں بھی تصوریت کی کارفرمائی نے حقیقت پر مجاز کا پردہ ڈال دیا۔ ہمارے پھول کاغذ کے پھول ہیں کہ رنگ و روپ تو اصلی پھول کے سے ہیں، لیکن بو سے قطعی معرا۔ آزاد نے اس کو محسوس کیا اور مختلف مناظر کی تصویر کشی کی صحیح نقاشی کی کوشش کی، لیکن ان کی فکر میں کوئی ذاتی تجربہ نہیں ہے، اس لئے اکثر نظمیں بے کیف اور بے روح نظر آتی ہیں۔ کہیں کہیں غیر محسوس طور پر کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔

بوندوں میں جھومتی ہیں درختوں کی ڈالیاں　　اور سبز کیاریوں میں وہ پھولوں کی لالیاں
وہ ٹہنیوں سے پانی کے قطرے ڈھلک رہے　　وہ کیاریاں بھری ہوئی تھالے چھلک رہے
گرنا وہ آبشار کی چادر کا زور سے　　اور گونجنا وہ باغ کا پانی کا شور سے

ہر جا پہ طائرانِ چمن غول غول ہیں   آپس میں بول بول کے کرتے کلول ہیں
کوئل کا دور دور درختوں پہ بولنا   دل میں وہ اہلِ درد کے نشتر کھنگولنا

اس میں شعریت، ترنم، شگفتگی سبھی کچھ موجود ہے، شاعر تصوریت سے زیادہ جذبات میں بہتا نظر آتا ہے، اشعار میں ربط و ضبط بھی نظر آتا ہے، یہاں بھی آزاد نظیر اکبر آبادی سے بہت پیچھے ہیں، نظم کا پس منظر نظیر سے بہت کم درجہ رکھتا ہے، مگر غنیمت ہے۔ اس شعر میں کتنی سچی اور حقیقی تصویر پیش کی گئی ہے ——

جھولوں میں نوجوان ہیں پینگیں چڑھائے   اور رنج آم کے ہیں پپیہے بجا رہے

حالی:-

مرزا شوق نے زہر عشق پلایا، نوجوان جھومنے لگے عشق سر پہ ناچنے لگا۔ دستِ عیش سازِ ہستی بجا رہا تھا، کہ سحر البیان نے دریا کا رخ بدل دیا، شمع محفل بجھ گئی، نادر کی تلوار چھن سے ٹوٹ گئی، سازِ ہستی سے بروگ ٹپک رہا تھا۔

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے   یہی دنیا کا کارخانہ ہے

ایک چراغ بجھتا ہے، دوسرا جلتا ہے، داغ بھوپال نے رونق انجمن ہوئے اور جھوم کر پڑھنے لگے۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ پہنچ جائیں   عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

کالی گھٹا نے مے برسا دی، سخن ساز نے سرمستوں کو سیہ مست بنا دیا، محفل پر یہ عالم طاری تھا کہ میر حسن حُسن کی مشاطگی کے لئے ایک آئینہ لے کر آئے، قصۂ زلف دوتا چھیڑ دیا، کالی گھٹا چھا گئی۔ کانوں میں لہرا گئی، اسی ساغر و صہبا کی گردش میں صبح ہو گئی، نسیم سحر برائے صبوحی "گلزار نسیم" لائی، محفل اجڑ رہی تھی، نشہ اتر رہا تھا، شمع محفل اپنے آنسوؤں میں غرق تھی کہ مولانا حالی مسدس ہاتھ میں لئے ہوئے آئے اور سچ تو ہے کہ

سینہ کوبی میں رہے جبتک کہ دم میں دم رہا   ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

جب کبھی فرصت ملی تو آنکھیں مل کر مے ریز فضاؤں کو دیکھا، مناظر قدرت سے دل حزیں کو بہلایا، نئی روشنی، جدید ماحول، سرسید اور آزاد کی ہم نشینی ترکھارت کی محرک ہوئی ——

گرمی کی تپش بجھانے والی   سردی کا پیام لانے والی
وہ شاخ و درخت کی جوانی   وہ مور و ملخ کی زندگانی

ابھی تمہید ہی تھی کہ گھٹائیں امنڈ آئیں اور اودے اودے شامیانے سروں پر تن گئے، ——

ہے ابر کی فوج آگے آگے   اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے
ہیں رنگ برنگ کے رسالے   گورے ہیں کہیں کہیں ہیں کالے
ہے سُرخ جرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی   اک آتی ہے فوج ایک جاتی
جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے   ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے

اشعار کے تیور بتا رہے ہیں۔ یہ تمام مناظر آنکھوں کے سامنے سے گذر رہے ہیں، ہلکے اور گہرے بادلوں کی تفریق کے لئے گورے اور کالے کا امتیاز رعد کی کڑک کے لئے توپ خانوں کا التزام اپنی اپنی مستقل حسن کاری کا حامل ہے، آگے چل کر مینہہ کے دریا دلی کے نمایاں اثرات پر روشنی ڈالی گئی۔

باغوں نے کیا ہے غسل صحت   کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت
سبزہ سے ہے کوہ و دشت معمور   ہے چار طرف برس رہا نور
ہے سنگ و شجر کی ایک وردی   عالم ہے تمام لاجوردی
پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار   دولہا سے بنے ہوئے اشجار

اس کیف پرور عالم کی رنگیں سامانیوں سے مست ہو کر مور ہر سو جھنگھارتے پھرتے ہیں اور پپیہا پیو پیو کرنے لگتا ہے، شاعر کا قلم یہیں نہیں رُک جاتا بلکہ پس منظر جیتی جاگتی تصویریں کھڑی کر کے نظم کی دل آویزی میں اور چار چاند لگا دیتا ہے، ——

کھم باغوں میں جا بجا کھڑے ہیں   جھولے ہیں کہ سُو بہ سُو پڑے ہیں
کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کمسن   جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن
ہیں پھول رہی خوشی سے ساری   اور جھول رہی ہیں باری باری
جب گیت ہیں ساری مل کے گاتی   جنگل کو ہیں سر پہ وہ اٹھاتی
اک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے   اک گرنے کا خوف کھا رہی ہے
ہے ان میں کوئی ملار گاتی   اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی
گاتی ہے کوئی کبھی ہنڈولا   کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا
اک جھولے سے وہ گری ہے جا کر   سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر

اسمٰعیل میرٹھی:-

اسمٰعیل کو اردو شاعری میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو انگریزی ادبیات میں "لوئی اسٹفنسن" کا ہے، یہ بچوں کے شاعر، بچوں کے لئے کہتے ہیں،

اور غالباً بچہ ہی بن کر کہنا چاہتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی کام نہیں، یہ ایک ایسے دماغ کا کام ہے جو نفسیات کا گہوارہ ہو، جس کا دل معصوم اور آنکھیں نلک پیما ہوں، صرف سیدھے سادے الفاظ، نرم و نازک بندشیں ہی بچوں کے معصوم متخیّلہ کا آئینہ بردار نہیں ہوسکتا، بچوں کے لئے کہنا آسان ہوسکتا ہے، لیکن بچہ بن کر کہنا کھیل نہیں! ——— "صبح کی آمد" کے دو بند ہیں:

میں سب کاروبار کے ساتھ آئی   میں رفتار گفتار کے ساتھ آئی
میں باجوں کی جھنکار کے ساتھ آئی   میں چڑیوں کی چہکار کے ساتھ آئی

اٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

یہ چڑیاں جو پیڑوں پہ ہیں آتی جاتی   ادھر سے اُدھر اڑکے ہیں غل مچاتی
دموں کو ہلاتی، پروں کو بھلاتی   مری آمد آمد کی ہیں گیت گاتی

اٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

جذبات معصوم اور ترکیبیں ہلکی پھلکی ہیں اور دل میں گھر کرنے والی، چڑیوں کا پیڑوں پر غل مچانا، پھر پھر ادھر سے اُدھر اڑنا، دموں کو ہلانا اور پروں کو پھلانا نفسیاتی طور پر کم عمر بچوں ہی کے جذبات ہو سکتے ہیں، اس کا نباہ بہت ہی پُر کیف اور مترنم انداز میں ہوا ہے اور شعریت ہر ٹکڑے میں موجود ہے، لیکن رفتار و گفتار، کاروبار کی ہنگامہ آرائی اور تصریح بچوں کی رنگین دنیائے تخیل اور معصوم متخیّلہ کی پیداوار نہیں ہوسکتی، اسٹیفن ایسی ٹھوکریں نہیں کھاتا، فکر کے وقت اس کا دماغ تصوریت کے اس عالم میں پہنچ جاتا ہے کہ وہ اپنے کو بھول جاتا ہے، اور سچ مچ کا بچہ بن جاتا ہے، اس دنیائے تصور میں ماہتاب کو وہ ایک حجری کرہ نہیں بلکہ صرف "چندا ماموں" ہی جانتا ہے، اس کی نظم "کھیون ہار" دیکھئے، اس میں تصوریت کی معراج ہے یہاں بستر علالت پر اس کے جذبات کو گدگدی ہوتی ہے، عالم طفلی کے محسوسات دل میں انگڑائیاں لینے لگتے ہیں، وہ اپنے تکیہ کو ایک چھوٹی سی پہاڑی تصور کرتا ہے، اور خود کو ایک دیو، اس پہاڑی پر بیٹھ کر ایک شاہانہ تمکنت کے ساتھ چاروں طرف ایک مادی تخیل پر اپنی نظر نگراں دوڑاتا ہے ——— پھر تخیل کا ایک طوفان اس کے بستر کو ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بنا دیتا ہے، اور اس کا تکیہ ایک سبک روکشتی بن جاتی ہے، وہ خود ماجھی بن کر گاتی ہوئی لہروں سے کھیلتا خوابوں کی دنیا کی طرف ناؤ کو کھیتا چلا جاتا ہے، جہاں حسین حسین کھیلوں کا وہ بلا شرکت غیرے مالک بن جاتا ہے ———

یہ ہے صحیح نفسیات کی ترجمانی، یہ نظم بچوں کے تصوریت کی شاہکار کہی جاسکتی ہے، اسمٰعیل کے تخیل میں گہرائی نہیں وہ ظاہری خط و خال پر مرتے ہیں، داخلی پہلو کے گوشوں تک اُن کا دماغ نہیں پہنچتا، "تاروں بھری رات" کے کچھ اقتباسات دیکھئے ———

اے چھوٹے چھوٹے تارو   کہ چمک دمک رہے ہو
تمہیں دیکھ کر نہ ہووے   مجھے کس طرح تحیّر
کہ تم اونچے آسماں پر   جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے   کہ کسی نے جڑ دیئے ہیں

گہر اور لعل گویا

جو نہیں آفتاب تاباں   نے چھپا یا اپنا چہرہ
وہیں جلوہ گر ہوئے تم   یہ تمہاری جگمگاہٹ
ہے مسافروں کے حق میں   بڑی نعمت اور راحت
اگر اتنی روشنی بھی   نہ میسّر آتی اُن کو
تو غریب جنگلوں میں   یوں ہی بھولتے بھٹکتے
نہ تمیز راس وچپ کی   نہ طرف کی کوئی اٹکل

خیالات سطحی ہیں اور عام مگر شاید بچوں کے صحیح ترجمان نہیں لعل و گہر جڑنے کی تشبیہ ناظم کے فکر کے لئے گرانمایہ ہو تو ہو ایک بچے کے قیاس سے بہت دور کی بات ہے، آخری بند میں Pole Star (قطب نما) کی قطب نمائی اور اس سے رہ گیروں کی راست روی کی جغرافیائی بصیرت بچوں کے اندر پیدا کرنا ان کی معصومیت کا خون کرنا ہے، ہوسکتا ہے کہ معلومات کی بنا پر نظم میں اس سے کوئی خوبی پیدا ہوتی ہو مگر شعریت اس بار کو برداشت نہیں کرسکتی ——— پھر بھی اسمٰعیل کی ہستی اردو شاعری کے لئے بہت غنیمت ہے، ان کو آزاد پر مجموعی طور پر تفوق حاصل ہے اور وہ نظیر سے قریب تر نظر آتے ہیں، ان کی شاعری میں پھولنے پھلنے کی صلاحیت موجود ہے اور جدید ادب ان نقوش کو زیادہ ابھار رہا ہے، مستقبل کی نسل نظیر کے بعد اسمٰعیل کی سب سے زیادہ قدرداں ہوگی، "ان کے شفق" کا رنگ آج بہت گہرا ہو رہا ہے اور

روز بروز پھیلتا جا رہا ہے، کیسا دلفریب منظر ہے۔

شفق پھولنے کی بھی دیکھو بہار ہوا میں کھلا ہے عجب لالہ زار

اندازِ بیان بتا رہا ہے کہ شاعر فطرت کی بوقلموں بہار ساما نی کا نظارہ کر رہا ہے۔ اس کی نگاہیں حسن کی گوناگون جلوہ آرائیوں میں بہک رہی ہیں۔

ہوئی شام بادل بدلتے ہیں رنگ جنہیں دیکھ کر عقل ہوتی ہے دنگ
طبیعت ہے بادل کی رنگت پہ لوٹ سنہری لگائی ہے قدرت نے گوٹ
ذرا دیر میں رنگ بدلے کئی بنفشی و نارنجی و چمپئی

یہ تصوریت نہیں بلکہ مطالعہ و مشاہدہ ہے بنفشی، نارنجی، چمپئی رنگا رنگی بتا رہی ہے کہ یہ آنکھوں میں بسنے والی متنوع کیفیات کی ترجمانی ہے۔ فوراً ہی ہوا کی لہروں نے جو ذرا چھیڑا تو ــــــ

یہ مغرب میں جو بادلوں کی ہے باڑ بنے سونے چاندی کے گویا پہاڑ
فلک نیلگوں اس میں سرخی کی لاگ ہرے بن میں گویا لگا دی ہے آگ

کتنی حسین اور لطیف تشبیہیں ہیں، یہی وہ رنگ ہے جس میں جدید ادب ڈوبا جا رہا ہے، اقبال کی "کنجِ عزلت" کے کچھ اشعار گنگنائیے ــــــ

مرتا ہوں خامشی پہ یہ آرزو ہے میری دامانِ کوہ میں اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہے میں چشموں کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
آغوش میں زمیں کے سویا ہوا ہو سبزہ پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

روح دونوں نظموں کی ایک ہے، مگر احساسات میں ہلکا سا فرق ہے، حسن فطرت کی جلوہ سامانی کے انداز میں ہم آہنگی ہے لیکن جانگ دو ہیں۔ اسمٰعیل کی آنکھیں جلووں سے متکیف ہیں، اور اقبال کی نگاہِ تصور ان سے جھوم رہی ہے۔ مگر آئینہ خانہ دماغ کے لئے دونوں عکس حقیقت بن کر نظر آتے ہیں، یہ اقبال کی اخلاقی کا کمال ہے کہ حقیقت و مجاز میں دوئی نہیں، بلکہ ترنم اور لحن اس کے اثر میں چار چاند لگا دیتا ہے، جوش، ساغر اور فطرت کے رومانی کلام پر یہی رنگ چڑھا ہوا ہے،

اکبر الہ آبادی:۔

اکبر کی شاعری قوم کے ہاتھوں میں ایک آئینہ ہے وہ ہماری سوسائٹی معاشرہ اور اخلاقیات پر ایک گہری تنقید ہے، لیکن یہاں میں ان کی طنزیات سے بحث نہیں کروں گا، بلکہ انہیں فطرت پرست کے روپ میں دکھانا چاہتا ہوں، حالی کی اٹھتی ہوئی محفل کا اثر، اور جدید ساز کی گونج سے ان کا کلام بھی خالی نہیں۔ دیکھنے والی آنکھوں کیلئے اس رنگ میں بھی بہار سامانی اور تنوع کی کمی نہیں، پھاگن کے دو شعروں میں کتنی جان ہے، اور ان میں تجدید کی کس قدر لہریں موجیں مارتی نظر آتی ہیں، ــــــ

چھڑا ہے راگ بھونرے کا غضب کی ہے نئی دھن بھی
قیامت پر قیامت ہے جوانی بھی ہے پھاگن بھی
جمالِ عارضِ گُل، نغمۂ مستانۂ بلبل
اشارہ کرتی ہے فطرت اِدھر آ دیکھ اُدھر سن بھی

سوذی انگریزی ادب کا ایک مشہور شاعر ہے، لڈور اس کی ایک کامیاب نظم ہے۔ اکبر نے اس نظم کا منظوم ترجمہ کیا ہے، دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اکبر نے کس طرح انگریزی نظم کی روح کو اردو میں ڈھال دیا ہے نظم کی روانی ملاحظہ ہو،

اچھلتا ہوا اور ابلتا ہوا اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا
روانی میں اک شور کرتا ہوا رکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا
پہاڑوں پہ سر کو ٹپکتا ہوا چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا
وہ پہلوئے ساحل دباتا ہوا یہ سبزہ پہ چادر بچھاتا ہوا
وہ گاتا ہوا، وہ بجاتا ہوا یہ لہروں کو پیہم نچاتا ہوا
ادھر جھومتا اور مٹکتا ہوا اُدھر جھومتا اور لٹکتا ہوا
بپھرتا ہوا، جوش کھاتا ہوا بگڑ کر وہ کف منہ پہ لاتا ہوا
ہواؤں سے موجیں لڑاتا ہوا حبابوں کی فوجیں بڑھاتا ہوا

نظم کا کمال یہ ہے کہ پانی کے تموج اور ارتعاش کا عالم، جزر و مد کی تمام کیفیتیں نگاہوں میں کھنچ جاتی ہیں۔ روانی میں لہروں کی چٹانوں سے زور آزمائی ساحل کا پہلو دبانا، سبزہ پر سفید سفید چادر کی فراشی، گرداب اور ریلا کا نمود تمام وہ کیفیتیں ہیں جو نیچر کی بولتی ہوئی تصویریں ہیں، اگر یہ رنگ زیادہ گہرا ہوتا تو نہ جانے کتنی ایسی انوکھی اور پیاری تصویریں آج اردو

ادب کا سرمایہ ناز ہوتیں، "تتلیوں کے رقص" پر کتنی لطیف اور حسین نظم ہے:

دو تتریاں ہوا میں اڑتی دیکھیں ۔۔۔ اک آن میں سو طرف کو مڑتی دیکھیں
بھولی، خوش رنگ، نازک، پیاری ۔۔۔ پہنے ہوئے فطرتی منقش ساری
پھرتی ہے کہ برق کی طبیعت کا ابھار ۔۔۔ تیزی ہے کہ آنکھ کو تعاقب دشوار
جو فاصلہ کر لیا ہے باہم قائم ۔۔۔ وہ بھی ہے بلا زیادت و کم قائم
کیونکر میں کہوں کہ یہ نظر بندی ہے ۔۔۔ اللہ اللہ کیا ہنرمندی ہے
ان جانوروں میں گرل اسکول کہاں ۔۔۔ فطرت کے چمن میں صنعتی پھول کہاں
کس بزم سے ناچ سیکھ کر آئی ہیں ۔۔۔ پریاں اندر کی جس سے شرمائی ہیں
اس سمت اگر خیالِ انساں اٹھ جائے ۔۔۔ دامانِ نظر پہ رنگ عرفاں چڑھ جائے

شوق قدوائی:-

یہ نظم مشاہدۂ فطرت پر مبنی ہے، اس رنگین رقص میں ذہن کے مطالعہ کی تصویر کشی کی گئی ہے، سادگی اور برجستگی نے اسے مؤثر اور دلفریب بنا دیا ہے، اکبر کی طنزیات میں ہمالہ کا وقار ہے، لیکن اس میں جمود ہے، ان کے بعد وہ رنگ بے رنگ ہو گیا، مگر یہ رنگ ایک بہتا ہوا دھارا ہے جو ہمیشہ متحرک ہے شوق کی "تتلیاں" ان تتلیوں سے کتنی مماثل ہیں، ملاحظہ ہو۔

پر کھول کے تتلیوں کی پرواز ۔۔۔ پر جوڑ کے بیٹھنے کے انداز
وہ نقش و نگار، اور وہ بوٹے ۔۔۔ پر اُن کے چھوؤ تو رنگ چھوٹے
رنگ ان میں بہت ملے ہوئے ہیں ۔۔۔ پر کیا ہیں چمن کھلے ہوئے ہیں
ہر خال ہے پر پہ اک نگینہ ۔۔۔ سونے چاندی پہ جیسے مینا
ہے رنگ کسی کا زرد گہرا ۔۔۔ اتنا گہرا کہ بس سنہرا
کوئی جس کے سفید ہیں پر ۔۔۔ جیسے چاندی کے صاف پتر
طاؤسی و صندلی گلابی ۔۔۔ دھانی، کاہی، سیاہ، آبی،
نیلے، اودے، زمردی لال ۔۔۔ ہر رنگ کے پر ہیں با خط و خال
پرواز بھی حسن ہے پھبن بھی ۔۔۔ رنگت بھی ہے حسن سادہ پن بھی

سونے چاندی پہ جیسے مینا کتنی اچھی اور لطیف تشبیہ ہے، پر چھونے پر رنگ کا چھوٹنا کتنا سچا مشاہدہ ہے، رنگوں کا ہلکا ہلکا سا فرق کس سادگی اور دل ربا انداز سے بیان کیا گیا ہے، ساری نظم میں الفاظ کتنے شیریں اور مترنم ہیں، آزاد کی طرح کہیں بھی ثقالت نہیں۔ تخیل میں جدت اور انداز بیان میں ندرت ہے۔

شوق کے منظومات کے دو رُخ ہیں، ایک وہ جس کا آزاد نے ڈنکا بجایا مگر بالکل تشنۂ تکمیل چھوڑا، دوسرا رُخ وہ ہے جو قطعی جدید رجحانات ادب کی پیداوار ہے، ثانی الذکر کی آئینہ بردار اُن کی مثنوی "عالم خیال" ہے، یہ نظم ان کی زندگی کا اہم ترین کارنامہ ہے، اس میں انہوں نے اپنی قوت ایجاد و اختراع سے کام لیا ہے اور رسمی شاعری پر ایک باغیانہ مضحکہ ہے۔

لیکن مناظر قدرت میں بھی شوق کی انفرادیت موجود ہے، اس کے انداز بیان کا تنوع اور اختراع کی گلکاری ہر رنگ میں غمازی کرتی نظر آتی ہے، "آبشار" اس صنف شاعری کی کامیاب ترین نظم ہے، کیا خوب کہتا ہے۔

اونچے اونچے پہاڑ، نیلے ۔۔۔ پھیلے ہوئے گول اور نوکیلے
ٹیڑھے، سیدھے نہال ان پر ۔۔۔ نازک بیلوں کے جال اُن پر
بہنا کہیں اور کہیں ٹپکنا ۔۔۔ خورشید کے نور سے چمکنا
شفاف وہ دھار اور پتھر ۔۔۔ نکلی ہوئی جیسے مانگ سر پر
چوٹی پہ وہ برف کی صفائی ۔۔۔ چمکی جب دھوپ اس پہ آئی
ضو جنبش مہر سے عیاں تھی ۔۔۔ کیا کوندرہی ہیں بجلیاں سی
برف اس کی پگھل کے بہ رہی ہے ۔۔۔ چاندی گل گل کے بہ رہی ہے

آبشار کے شفاف دھار کی تشبیہ "نکلی ہوئی جیسے مانگ سر پر" بالکل جدید ہے، برف کا چاندی کی طرح پگھلنا مشاہدۂ عینی کی عکاسی ہے، یہاں تمام وہ نوخیزی و شادابی موجود ہے جو اسمٰعیل کی بہار سامانی کا حصہ ہے، برسات کی بھری ندی کے اٹھلا کے چلنے کی کیا ہی رنگین تاویل ہے:-

پیچ و خم کے ساتھ بہنے سے کھلا مستی کا حال ۔۔۔ ندیاں چلتی ہیں میدانوں میں متوالوں کی چال

اس کے تموج اور ارتعاش کے عالم کو کس خوبصورتی سے نظم کیا گیا ہے:-

کس لئے غصے کی حالت ان پہ طاری ہو گئی ۔۔۔ کف لبوں پر آ گیا آواز بھاری ہو گئی
کیوں بھنور چکر میں ہیں موجوں کو کیوں ہے پیچ و تاب ۔۔۔ کیوں یہ آکر جوش میں آنکھیں دکھاتے ہیں حباب

بالکل اکبر کے "لٹو" کا پرشور سیلاب معلوم ہوتا ہے، لیکن بیان ذرا مختلف ہے، اور کیف انگیز بھی، حبابوں کا آنکھیں دکھانا ایک شاعرانہ حسن بیان ہے، اور اس میں شک نہیں کہ بہت لطیف ہے

اسے اکبر کی شاعری کا نقشِ ثانی کہنا چاہئے۔ دوسرے نقش کو ذرا اُبھرا ہوا ہونا بھی چاہئے ! ہاں البتہ اسمٰعیل کے کلام میں شوق سے زیادہ آمد کا زور ہے، وہ جس چیز سے متاثر ہوتا ہے، اس کی روح پیش کر دیتا ہے، چڑیوں پر نظم کا کچھ اقتباس اسمٰعیل کے سلسلے میں پیش کیا جا چکا ہے۔ شوق کی خیال آرائیوں کا نمونہ ملاحظہ ہو ——

چڑیوں کا اِدھر اُدھر سے آنا ۔ چھوٹے چھوٹے پھلوں کو کھانا
کچھ سبز ہیں جن کے لال سر ہیں ۔ کچھ زرد سنہری جن کے پر ہیں
کچھ جن پہ سفیدی اور سیاہی ۔ کچھ جن کے سروں پہ تاجِ شاہی
پانی میں اِدھر اُدھر نہا کر ۔ بیٹھی شاخوں پہ پر پھلا کر

کلام میں سادگی ہے، بیان شگفتہ ہے، لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس کا درجہ اسمٰعیل کی نظم سے کم نظر آئے گا۔

سیماب اکبر آبادی :۔

جدید شاعری کے صرف دو رُخ ہیں، مناظرِ قدرت کی نواسازی، یا قومی ترانہ کی نغمہ ریزی، دونوں صورتوں میں شاعر کی آنکھیں اگر مشاہدۂ فطرت سے نا آشنا رہیں تو اس کی شاعری نقالی ہو کر رہ جاتی ہے۔ شاعر کا فرض ہے کہ وہ چاند سے ہمکلام ہو، آفتاب کی شعاعوں سے سرگرم گفتگو ہو، کوہسار کے سکوت، شفق کی گلگونی، سبزہ زار کی دلفریبی اس کی نگاہ کے گوشے گوشے میں جلوہ آرا ہوں، مجسمے کو صرف زیوروں سے سجا دینا ہی کمالِ تزئینِ جمال نہیں، کیونکہ اس سے تو اور فطری حسن چھپ جاتا ہے اور اصلی خط و خال نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں، جدید شعرا کو دُھن ہے کہ جدید تشبیہوں اور استعاروں سے نئی نئی تصویریں بنائی جائیں، بذاتِ خود کوئی مشاہدہ ان کی نظم کا محرک نہیں ہوتا، اقبال کی لَے میں کشش تھی، ان کا سُر بلند تھا، انہوں نے جو رُخ بدلا تو ہوا کا رُخ بھی بدل گیا، غزلوں پر سردھننا ختم ہوا اور نظم کا نشہ چڑھنے لگا۔ لیکن چولا لاکھ بدلے شاہدِ مشہود وہی ہیں، نظم کے نام پر جو آج شاعری کی جا رہی ہے، اس کی ماہیت اتنی ہی تو ہے کہ قصیدہ، مثنوی، یا مرثیہ پر تجدید کے غلاف ڈال دیئے گئے ہیں۔

سیماب اکبر آبادی کی دُھن بھی وہی دُھن ہے، ان کی شاعری اقبال کے کلام کی صدائے بازگشت ہے، منظر نگاری میں تمام وہی عناصر موجود ہیں جو اس دور کا طرۂ امتیاز ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بند مرتب کر کے ان میں الفاظ جڑ دیئے گئے ہیں،

کیا تازگی ہے ۔ کیا دلکشی ہے
اک زندگی سی ۔ چھائی ہوئی ہے
ہے خوابِ راحت ۔ یا بے خودی ہے
یہ بے خودی بھی ۔ بیداری سی ہے
مرکز ہو زنہ ۔ شاعر وہی ہے
سنگِ لحد پر تاروں کی چادر
راتیں منوّر ۔ باتیں معطّر

ہاں البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس رنگ میں اُن کی قومی شاعری کی طرح بے سروسامانی نہیں ہوتی، بعض مقامات دلفریب اور خوش آیند بھی ہیں، خاکستر کے ڈھیر میں کہیں کہیں چنگاری نظر آجاتی ہے، "شبِ ماہ" کی ایک تصویر ہے، ——

عروجِ شبہائے ماہ کا ہے ضیا فضاؤں پہ چھا رہی ہے
عروسِ شب بے حجاب ہو کر تجلیوں میں نہا رہی ہے
چمک رہا ہے دُھلے ہوئے آسمان پر چاند چودھویں کا
برس کے بادل ابھی کھلے ہیں، فضا کی خنکی بتا رہی ہے
فلک بھی روشن، زمیں بھی روشن، مکاں بھی روشن مکیں بھی روشن
جہاں ہے اور روشنی سراپا، نظر جہاں تک بھی جا رہی ہے

ان شعروں کے روپ میں قدیم روشنی جلوہ گر ہے، اور سیماب صاحب اس میں شک نہیں کہ اس میدان میں کھیلنے کا اچھا موقع ملا ہے۔——

چکبست :۔

چکبست کی شاعری کی ابتدا انیس کے رنگ سے ہوئی اور انتہا میں اقبال کا تتبع ہے، "جلوۂ صبح" میں دیکھئے انیس کا کس طرح رنگ جھلک رہا ہے، ——

جب رنگِ شب آئینۂ ہستی سے ہوا دور ۔ ہنگامِ سحر کون و مکاں ہو گئے پُر نور
تبدیل ہوئی صورتِ کوہِ شبِ دیجور ۔ چمکا وہ تجلّیِ سحر سے صفتِ طور
بجلی کی طرح چرخ پہ نورِ سحر آیا
آنکھوں کو نہ پھر خرمنِ انجم نظر آیا

تقلید انیس کی ہے لیکن مشاہدے کی وہ صداقت، جذبات کی وہ اصلیت موجود نہیں، رنگِ شبِ دیجور کا دور ہونا، اور کوہ

شبِ دیجور پر تجلیٔ سحر سے جلوۂ طور کا دھوکا، دبیر کی نقالت کا آئینہ دار ہے:—

آیا جو تیغِ روز لئے شاہِ نیمروز ماہی شکار شیر سوار، و جہاں فروز
باندھے کمر میں خنجرِ بیضائے کینہ سوز پھر دی بہ ہفت سر ہوا صیدِ عقابِ روز

مہتاب لشکرِ شہ خاور میں گھر گیا
آرہ شعاع کا سرِ انجم پہ پھر گیا

"شاہِ نیمروز" کا تیغ بکف آنا، "خنجرِ بیضا" کمر میں لٹکائے آنا کتنا بھیانک اندازِ بیاں ہے! مہتاب کا لشکر خاوری میں گھر جانا، اور سرِ انجم کے سر پر آرہ کا چل جانا کوئی جمالیاتی ذوق کا انسان پسند نہیں کرسکتا، یہی نفسیات کی کم مائگی ہے جو دبیر کو انیس کی سطح پر نہیں پہنچنے دیتی، خدائے سخن اس منظر کی کیسی حسین و لطیف تصویر کشی کرتا ہے، —

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے رواں چُن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار پر گُلِ مہتاب کی خزاں مرجھا کے گر گئے ثمرِ شاخِ کہکشاں

دکھلائے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

سبحان اللہ! کیا حسنِ بیان ہے، لفظ لفظ میں شعریت موجود ہے، جلوۂ خورشید سے یہاں ماہتاب لشکرِ خاور میں نہیں گھرتا، انجم کے سر پر آرہ نہیں پھرتا بلکہ ایک شاعرانہ مفاہمت سے کام لیا گیا ہے جو متخیلہ کو پُر کیف اور ذہن کو لالہ زار بنا دیتا ہے، نجوم کو غنچہ کہنا اور وقتِ سحر ان کے ڈوبنے کو غنچوں کے مرجھا جانے سے تشبیہ دینا عجیب رنگیں مفاہمت ہے! چکبست کے فکر کی بنیاد تقلید پر ہے، اس لئے ان کے ہاں یہ حسن کاری ناپید ہے بعض بعض نظمیں کامیاب نظر آتی ہیں لیکن ان میں انفرادیت نہیں، آزاد کا رنگ پھوٹا پڑتا ہے، "سیرِ دیرہ دون" ایک جاذبِ نظر نظم ہے، لیکن آزاد کا تصنع ہر لفظ سے نمایاں ہے۔

لباس پہنے ہیں، کل خشت و سنگ سبزہ کا بجائے خاک کے اڑتا ہے رنگ سبزہ کا

....

طلسمِ حُسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلوؤں میں صف بستہ
یہاں جو آکے مسافر مقام کرتے ہیں یہ سنتری ہیں پہلے سلام کرتے ہیں

حفیظ جالندھری:-

اقبال کی صدائے بازگشت کی دوسری لَے حفیظ کی شاعری ہے، اقبال اسلامی سیاست، اسلامی تمدن و روایات کے احیاء کا علمبردار تھا، حفیظ نے "تاریخِ ماضی" کو نظم کرکے قوم کے لئے ایک آئینۂ عبرت بنایا، فردوسی نے عجم کو زندہ کیا، اور حفیظ نے روایاتِ اسلامی کو آبِ حیات پلانا چاہا! اس میں شک نہیں کہ یہ ایک مبارک اقدام ہے، لیکن بقول شخصے۔

"فنِ موسیقی میں جو اہمیت قومی موسیقی کی ہوتی ہے، وہی اہمیت فنِ شاعری میں قومی و ملی شاعری کو نصیب ہے، قومی موسیقی سریع التاثیر ہوتی ہے، یہ چند جذبات کو زور و شور کے ساتھ بھڑکاتی ہے لیکن اس ولولہ انگیزی کے ہوتے ہوئے بھی اس کی دنیا بہت تنگ ہے، یہ سازِ دل کے ہر تار پر مضراب کا کام نہیں کرتی، جہاں یہ چند جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے، وہاں دماغ ادراک و فہم سے یک قلم کنارہ کش کر دیتی ہے جب یہ طلسم ٹوٹا، دماغ ان جذبات کی تنگ سامانی سے منغص ہو جاتا ہے۔"

شاہنامۂ اسلام کی حقیقت بھی یہی ہے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ حفیظ کے دماغ میں ایک اختراع کی طاقت ہے، ان کی چھوٹی چھوٹی نظمیں اکثر کامیاب و خوشگوار ہیں، ان میں ترنم بھی ہے اور شعریت بھی، کیف بھی نظر آتا ہے اور وجدان بھی، منظر نگاری میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔ ان کے منظومات میں مشاہدے کی شاعرانہ مصوری نظر آتی ہے، شام کا ایک منظر ہے، —

مغرب کے گھر میں سورج بستر جما رہا ہے رنگیں بادلے میں چہرہ چھپا رہا ہے
کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی دھاریوں کو پھیلا دیا فلک پر گوٹے کناریوں کو
عکسِ شفق نے کی ہے اس طرح زرفشانی گھل مل کے بہہ رہی ہیں ندی میں آگ پانی

حفیظ کی اس رنگ کی شاعری میں ابھرنے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ ہر بند و ہر جوڑ سے شعریت چھلکی پڑتی ہے، عکسِ شفق کے زرفشاں منظر کے لئے "گھل مل کے بہہ رہے ہیں ندی میں آگ پانی" کی تمثیل شاعر کے جوشِ وجدان کی غمازی کر رہی ہے کاش حفیظ کو اپنی ان نہاں طاقتوں کا صحیح ادراک ہوتا! —

نہال عظیم آبادی:-

"نہال کی برسات" اس ضمن میں اپنی سر و سامانی کے لحاظ سے سدا بہار نظم ہے، اس کے اندر "موسم برشکال" کے جزئیات پر نہایت ہی حُسن کارانہ انداز سے نظر ڈالی گئی ہے، — متوالی گھٹائیں جھومتی

جھامتی اٹھیں بکھرے آرہی ہیں، شاعر اس منظر کو دیکھتا ہے اور بے تابانہ کہتا ہے، —

آئی گھنگھور گھٹا چھا گئے بادل ہر سو — آئیں بگلوں کی قطاریں لبِ دریا اُڑ کر
کوئلیں کوکیں پپیہوں نے صدا دی دلکش — ہو کے خوش مور نے بھی ناز سے پھیلائے پر
فاختہ دید میں ہے سروسہی کے مشغول — مسکراتے ہوئے غنچوں پہ ہے بلبل کی نظر
بال سنبل کے جو اُلجھے ہوئے اس نے — شانہ کرنے لگی منقار سے بلبل آکر
کالی کالی جو گھٹا میں کہیں بجلی چمکی — پھر گئی آنکھ میں اس شوخ کے غصے کی نظر

آپ محسوس کریں گے کہ نہالؔ عظیم آبادی کی نظر بہت ہی فطرت پرست ہے، یہ اثر ان کے اس ماحول کا ہے جس نے بہار میں نیچرل شاعری کی داغ بیل ڈالی، اور وہ وہ گل کھلائے کہ جنہیں دیکھ کر آج بھی وجدان جھوم جھوم جاتا ہے "میرا اپنے سخن حضرت شادؔ عظیم آبادی اور ان کے میخانے کے میگساروں کی طرف ہے — جناب سلطان عظیم آبادی کا یہ ایک شعر نہ جانے کتنی بہاریہ نظموں پر بھاری ہے۔

موسم گل میں دیکھ گلوں کو جوشِ طرب نے مست کیا ہے
پھٹ گئیں کیا کیا چُست قبائیں اف ری جوانی ہائے زمانے

بہار اسکول کی شاعری پر تجزیہ کرنے کا محل نہیں، اور نہ مجھے اس وقت اردو شاعری کے مقامی رنگ پر روشنی ڈالنی ہے، ہاں البتہ جدید شاعری کے سوتے کہاں کہاں سے پھوٹتے ہیں، اور ان کی شاخیں کدھر کدھر پھیلی ہوئی ہیں دیکھنا ناگزیر ہے۔ —

کالی کالی جو گھٹا میں کبھی بجلی چمکی — پھر گئی آنکھ میں اس شوخ کے غصے کی نظر

اس شعر سے حضرت نہالؔ عظیم آبادی نے عجیب بات سے بات پیدا کی ہے، اور حضرت محسنؔ کارکوروی کی طرح قوتِ اختراع اور ندرتِ بیان کا ثبوت دیا ہے۔ —— اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ،

محسنؔ کارکوروی: محسن کارکوروی کی انفرادیت میر انیس کی طرح اپنی جگہ پر بلطبع محتشم اور جادو داں ہے، اس کا دماغ جام جہاں نما ہے، جو بوقلموں مناظرِ قدرت کا آئینہ دار ہے۔ وہ ان مناظر سے جس طرح چاہتا ہے کھیلتا ہے حسنِ کمال یہ ہے ان کی دوشیزگی کو ذرا بھی آنچ نہیں آتی، تصوف کی رنگ آمیزی سے عموماً اشعار کی سحرِ حقیقت گم ہو جاتی ہے لیکن محسن کے قلم کی سحرکاری کا یہ کرشمہ ہے کہ لفظ لفظ سے حسن پھوٹا پڑتا ہے۔ تشبیہہ و استعارے کی لطافت سے متخیلہ بدمست و سرشار ہو جاتا ہے اور ذوقِ شعری وجد کرنے لگتا ہے تلمیحات سے سامع کا دماغ بار محسوس نہیں کرتا بلکہ ایک اور تازگی حاصل ہوتی ہے، "عبادتِ صبح" کے اشعار گنگنائیے، کس قدر لطیف اور مترنم اشعار ہیں:۔

کیفیتِ وحی میں ہے بلبل — ہے وقتِ نزولِ مصحفِ گل
سبزہ ہے کنارِ آبِ جُو پر — یا خضر ہے مستعدِ وضو پر
نوبت ہے صدائے قمریاں کی — تیاری ہے باغ میں اذاں کی
اک شاخ رکوع میں رکی ہے — اور دوسری سجدے میں جھکی ہے
سوسن کی زباں پہ مناجات — جاری لبِ جو سے التحیات
پھیلی ہوئی بوئے گل چمن میں — اور صلِ علیٰ کا غُل چمن میں
غنچے پہ ہے خاموشی کا عالم — یا صومِ سکوت میں ہے مریم
سالک ہے چمن میں نہر موزوں — مجذوب ہے شاخِ بید مجنوں
سجادہ بدوش لالہ یک سو — یکسو شبِ زندہ دار شبو
ہے استغراق نیلوفر کو — پاسِ انفاس ہے سحر کو
ہر شمع خموش فکر میں ہے — ہر طائرِ شوخ ذکر میں ہے
وحدت ہے چمن میں مغز تا پوست — صادق ہے بہار پر ہمہ اوست

غنچہ کی خاموشی کو مریم کے صومِ سکوت سے تشبیہہ دینا بالکل نئی چیز ہے، صومِ سکوت کی تہہ تک نہ پہنچنے پر بھی ذہن اس سے ایک خاص قسم کا کیف محسوس کرتا ہے بکیاریوں کے اعتکاف، اور آبِ رواں کے طواف میں قطعی مذہبی تخئیل کار فرما ہے۔ سالک، مجذوب، پاسِ انفاس، ذکر و مذاکرہ اور ہمہ اوست ایک دم تصوف کی اصطلاحیں ہیں مگر ان کو اس شوخی سے نظم کیا گیا ہے کہ طبیعت پر گراں نہیں گزرتیں۔

محسن کی شاعری اس دور میں بہت مقبول ہو رہی ہے، اور غیر محسوس طور پر شعرا اس کے کلام سے اثر پذیر ہو رہے ہیں،۔

شاکر میرٹھی:۔

شاکر اس دور کے ایک خوش فکر شاعر ہیں، "موسمِ سرما" والی نظم وقت کے ذہنی رجحان کی عکاسی کر رہی ہے، دیکھئے محسن کارکوروی کا خونِ جگر کہاں کہاں گلگونی کر رہا ہے، ——

موسمِ سرما کی بھی کس درجہ ہے دلکش فضا — یہ ہرا سبزہ زار اور ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا
پھول پانی میں شگفتہ ہیں کنول کے جا بجا — یہ وہ موسم ہے کہ جس میں ہے عجب لطف و بہا

گونجتے پھرتے ہیں بھونرے اف رے جوشِ نشاط — اور سرگرمِ ترنم طائرانِ خوشنوا
اجلی اجلی کانس بن کر دشت میں ریشِ سفید — دیتی ہے برسات کی پیرانہ سالی کا پتا
صاف اور ستھرا ہے نالابوں کا پانی جس طرح — پاک دنیا کی ہوس سے قلبِ مردِ باصفا
اب ہے مطلعِ آسماں کا صاف یوں جس طرح ہو — قلبِ صافی ہو کدورت سے کوئی ناآشنا
مچھلیاں یوں گھر رہی پانی میں ہیں گم جس طرح — عابدوں کے دل کو اطمینانِ کامل ہو عطا
چاندنی بکھری ہوئی ہے اور چکوروں کا گروہ — ٹکٹکی باندھے ہوئے یوں چاند کو ہے تک رہا
جیسے ہوں ہیں محو جلوۂ دیدارِ حق — عابدانِ باخدا و زاہدانِ بے ریا

پوری نظم کا پس منظر ہندوستانی ہے، نو شگفتہ کلیاں ہیں، بھینی بو باس ہے، جاڑے کی رت ہے، تال کے صاف شفاف پانی میں کنول کا پھول ہنس رہا ہے، بھونرے گونج رہے ہیں، اوشا دیوی انگڑائی کے عالم میں ہے، اور طائرانِ خوشنوا سرمستی کے عالم میں نوخیز پودوں کی لچکتی ڈالیوں پر چہچہا رہے ہیں، اجلی اجلی کانس سفید سفید داڑھی معلوم ہوتی ہے جو برسات کی پیرانہ سالی کا پتہ دے رہی ہے، بکھری ہوئی چاندنی رات میں چاند پر چکوروں کی ٹکٹکی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زاہدانِ بے ریا خلوتِ ناز میں جلوۂ حق کے دیدار میں محو ہیں، اس طرز کی شاعری اس دور میں محسن کاکوروی اور جوش ملیح آبادی کے امتزاج کی پیداوار ہے، —

سرور جہاں آبادی:-

منشی درگا پرشاد سرور جہاں آبادی کے قلم نے اس زمین میں خوب خوب بیل بوٹے کھلائے ہیں، اور قابلِ تقلید نمونہ پیش کیا ہے، افسوس کہ موت کے ظالم پنجے نے اس پھول کو بے وقت ریاضِ شاعری سے چن لیا۔ "فضائے برشکال" کی مے بار فضا پر کتنے پرکیف اشعار ہیں

اٹھا وہ جھوم کے ساقی چمن میں ابرِ بہار — چٹک رہے ہیں شگوفے برس رہی ہے پھوار
سہی قدوں کا ہے جمگھٹ کنارِ آبِ رواں — کہ برج میں لبِ جمنا ہے گوپیوں کی قطار
ترانہ ریز ہے یوں شاخِ سرو پر قمری — کہ جیسے گاتی ہو مدھ بن میں کوئی سندر نار
ہے موتیوں کی لڑی کہ قطار بگلوں کی — ہوا میں اڑتے ہیں جگنو کہ چھوٹتے ہیں انار

تمام تشبیہیں اور استعارے جدید ہیں، شاعری کا چولا نیا ہے رنگ روپ نئے ہیں، شاخِ سرو پر قمری کا ترانہ نہیں بلکہ مدھ بن میں کوئی سندر نار نغمہ ریز ہے، کنارِ آبِ رواں سروشوں کا جمگھٹ نہیں، بلکہ گوپیوں کی قطار ہے، اور فضا میں جگنو نہیں اڑ رہے بلکہ انار چھوٹ رہے ہیں

———— اس کو کہتے ہیں شاعرانہ مفاہمت کی معراج! ————

"بیر بہوٹی" بھی اس نوع کی ایک دلپسند نظم ہے

آہ! او ننھے سے کیڑے نازشِ صحرا ہے تو — دشت میں اک سرخ چھوٹا سا گلِ رعنا ہے تو
صفحۂ ہستی پہ اک نقشِ تحیر زا ہے تو — شعلہ زارِ حسن کی چھوٹی سی اک دنیا ہے تو
برقِ عالم سوز کی ننھی سی ہیکل ہے کوئی
آتشِ یاقوت کی چھوٹی سی منقل ہے کوئی
گل بداماں ہے شفق میں شعلۂ تنویرِ حسن — خونِ عاشق بازمیں ہے گریباں گیرِ حسن
یا عقیقِ حسن کی چھوٹی سی ہے تعمیرِ حسن — نقشِ نیرنگِ فسوں ہے یا کوئی تصویرِ حسن
جلوۂ گل ہے فضائے وادیٔ پر خار میں
سرخ تکمہ ہے قبائے سبزۂ کہسار میں

جوش ملیح آبادی:-

زمانے کے ردوبدل نے آج ثابت کر دیا ہے کہ ادب مظاہرِ زندگی میں سے ایک مظہر ہے، ادب خلا میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ زندگی کے بطن سے جنم لیتا ہے، اور اس کی آغوش میں پلتا اور پروان چڑھتا ہے، جب سماج چولا بدلتا ہے، اہم تاریخی ادوار میں تصادم اور تبدیلی ہوتی ہے، کہنگی اور فرسودگی جدت اور تازگی کے لئے جگہ چھوڑتی ہے، آفتابِ تازہ طلوع ہوتا ہے اور کمھلائے ہوئے تارے غروب ہو جاتے ہیں، تو ادبا اور شعرا کے آئینہ خانۂ تخیل میں بھی نئی تصویریں رقص کرنے لگتی ہے۔ ملٹن پیورٹن انقلاب کے نغمے گاتا ہے، شیلے ۱۹ء کے انقلابی رجز الاپتا ہے، اور وھٹ جمہوریت امریکہ کا ثنا خواں ہوتا ہے، حالی قومی پستی کا رونا روتے ہیں، اقبال سیلابِ مغرب کے خلاف مجاہدانہ سینہ تانتا ہے، زندگی کا ایک اور تشنہ گوشہ اقتصادی پستی تھا۔ جہاں امنگ اور ترنگ کی کرن تڑپ کر کراہ رہی تھی، جوش نے اس کراہ کو سنا اور چیخ اٹھا —

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا — آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھ کو صد حیف یہ حکم — بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

بہروں نے تو سنا ہی نہیں، جنہوں نے سنا بھی ان کی بھویں تن گئیں، ماتھے پر شکن پڑ گئے، بات یہ ہے کہ جس ماحول میں ہم سانس لے رہے ہیں اس کی بیداری کچی نیند کی طرح ہے۔ پو پھٹنے سے پہلے آنکھ کھل گئی ہے، اس لئے نیند ابھی پلکوں کی اوٹ میں گنگنا رہی ہے

اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ابھی شعوری انقلاب کا دور نہیں آیا ہے، یہی وجہ ہے کہ سماج اور ادب میں جو بندھن ہونا چاہئے وہ ابھی ڈھیلا ہے، دوسرے بھوک، افلاس اور جنسی کمزوریوں کو پیش کر دینا ہی صرف ترقی پسند ادب کی معراج نہیں، بلکہ لامحدود انسانی جذبات اور متنوع خیالات کو وجود ہیئت میں پیش کرنا سچی حقیقت نگاری ہے۔ انقلابی شاعر کے لئے حقیقت نگار ہونا ضروری ہے۔ شاعر جتنا حقیقت نگار ہوگا اتنا ہی دل بربائے گا ہیں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان میں انقلابی ادب پیدا ہوچکا ہے۔ مگر ہاں جوش کی خاکستر میں اس کی بے تاب چنگاریاں دبی نظر آتی ہیں۔ دیکھئے ذیل کے محسوسات میں کتنی سچی حقیقت جگمگا رہی ہے۔

شب کو سونے جنگلوں میں جگنوؤں کے رقص سے کانپ کانپ اٹھتی ہے کچھ یوں تیرگی بے اختیار
جس طرح مایوس راتوں کی فضائے تنگ میں نیم جاں امید جھپکاتی ہے آنکھیں بار بار

حوض میں مستانہ بطکے تیرنے سے جس طرح کائی میں پڑتا چلا جاتا ہے خط رہگزار
حافظے پر یوں ہی اک بیدار کی ملی خراش ڈال دیتی ہے شب مہ میں پپیہوں کی پکار

جنگل کی خاموش فضا اور سن سن کرتی ہوئی راتوں میں جگنوؤں کے رقص مستانہ کا عالم کس شاعرانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے، کہ شعر دل میں ایک کسک پیدا کر دیتا ہے، پپیہے کی پکار پر کم و بیش ہر شاعر نے کچھ نہ کچھ طبع آزمائی کی ہے، لیکن جوش کی انفرادیت اور شاعرانہ خلاقی سے تصور رقص کرنے لگتا ہے، اور ذہن پر سرشاری کا عالم طاری ہو جاتا ہے فطرت کا اتنا گہرا مشاہدہ اور اتنی چبھتی ہوئی تشبیہہ سوائے جوش کے کہیں اور نہیں مل سکتی ——

"جامن والیاں" کیف و سرمستی میں ڈوبی ہوئی ایک رنگین نظم ہے، برسات کے وجد آفریں مناظر شباب پر ہیں، کالی کالی گھٹائیں چھم چھم مینہ کا برسنا، کوئل کی کوک، مور کا شور سنکی ہوئی ہوائیں۔ دل کی دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دیتی ہیں، شاعر ان مناظر کو دیکھ کر جھوم جاتا ہے اور آپ ہی گنگنانے لگتا ہے

روح شاعر آج ہے پھر جبیں آ ڈوبی ہوئی آم کے باغوں میں ہے کالی گھٹا چھائی ہوئی
مست بھونرا گونجتا پھرتا ہے کوہ و دشت میں روح پھرتی ہے کسی وحشی کی گھبرائی ہوئی
غنچہ غنچہ اپنے فطری رنگ میں ڈوبا ہوا پتی پتی اپنے اصلی رنگ میں ڈوبی ہوئی
خار صحرا فیض ابر و باد سے نکھرے ہوئے خاک گلشن موج رنگ و بو سے اترائی ہوئی
بہہ رہی ہیں ندیاں ساون کے نغموں کی طرح گا رہی ہیں کوئلیں موسم کی پرنائی ہوئی

مغرب جو ہر پرست ہے، اس نے ورڈس ورتھ Words Worth کی Corn Reapes کو آنکھوں سے لگایا اور شاعر کو سونے سے تولا جوش ملیح آبادی سپہر مشرق کا چاند ہے، چاند کے سینے میں دوامی داغ، جوش کا دل بھی داغدار ہے، اس کی آنکھیں روتی ہیں تو دنیا کہتی ہے کہ یہ موتی جھوٹے ہیں، اس کا نغمہ نغمہ نہیں بروگ ہے، پھر جامن والیوں کی کون قدر کرے۔

مست بھونرا گونجتا پھرتا ہے کوہ و دشت میں روح پھرتی ہے کسی وحشی کی گھبرائی ہوئی

میں کیا لطف ہے زمانہ اس سے بے نیاز ہے، بیان کی ندرت اور خیال کی رفعت ایک دنیائے لالہ زار ہے۔ "روح پھرتی ہے کسی وحشی کی گھبرائی ہوئی" ادب کے سیکڑوں شعروں پر بھاری ہے، کیف رنگ و بو سے مست بھونرے کی اس قدر بلند تشبیہہ شاید ممکن نہیں، برخلاف اس کے جن آنکھوں نے آموں کے باغ میں جھولے پڑے ہوئے دیکھے ہیں، پینگوں کے وقت نوخیز دوشیزاؤں کی لہراتی ہوئی زلفوں کا نظارہ کیا ہے، جن کے ذہن نے کوئل کے دل دوز نغموں کو فضا میں تیرتے ہوئے محسوس کیا ہے۔ ان ہی کو اندازہ ہوسکتا ہے کہ "بہہ رہی ہیں ندیاں ساون کے نغموں کی طرح" میں کس درجہ شعریت موجیں مار رہی ہیں، ہمارا فطرت پرست شاعر اپنے ساتھ ہمیں بھی محو نظارہ کر لیتا ہے، ہمارا تصور برسات کا ایک کیف بار منظر دیکھتا ہے، جس کے افق پر چند دہقانی عورتیں نظر آتی ہیں، ان کے شباب کا عالم اور تشنہ شباب کی سرمستی قیامت ہے، شاعر ایک ایسا شہ پارۂ صناعت پیش کرتا ہے کہ ہمارا خیال بھی انگڑائیاں لیتا ہوا مائل پرواز ہو جاتا ہے، جوش کو مطالعہ کرتے وقت آپ محسوس کریں گے کہ البیلا شاعر ایک شاعر فطرت ہے، اس کے ذہن میں حسن فطرت کے نقش نگار مرتسم ہیں، اور اس کی طبیعت میں ان کے اثرات رچے ہوئے ہیں جہاں بھی ذرا موقع ملتا ہے اس موضوع پر اس کی طبیعت امنڈ آتی ہے جمنا کے کنارے کی ایک تصویر دیکھئے۔

خورشید طلوع ہو رہا ہے افسانہ شروع ہو رہا ہے
گردوں کی جبیں چمک رہی ہے پودوں کی کمر لچک رہی ہے
جاگے ہیں طیور چہچہاتے چونکے ہیں حسین کسمساتے

مکھڑوں پہ لئے بصد تجلّی   شبنم کی نمی، صبا کی خنکی
پونچھیں منہ اگر ذرا بھی   رومال میں چھوٹ آئے سرخی
رگ رگ میں ہے محوِ پرفشانی   وارستہ مزاج نوجوانی
پھوٹی ہے کرن جو تلملاتی   شبنم کی دھڑک رہی ہے چھاتی

کس قدر دلفریب صبح ہے، اور کتنے حسین مناظر ہیں، طلوعِ مہر کیا ہے گویا ایک افسانۂ رنگین کی تمہید ہے، اور گلگونیٔ شفق کیا ہے۔ شاید اس کی سرخیٔ مطلع کا حسنِ مطلع دیکھئے۔ آفتاب کی نازک کرنوں نے جبین گردوں پر افشاں چن دی، نسیمِ سحری کے جھونکوں نے نوخیز پودوں کی ڈالیاں لچکا دیں، علوئے خیال کی نزاکت کا یہ عالم ہے کہ شاعر ڈالیوں کو ڈالیاں نہیں بلکہ پودوں کی کمر کہتا ہے ——— ادھر نور کا تڑکا ہوا، ادھر طیور چہچہانے لگے، حُسنِ شب بھر کی مست جوانی سے اس طرح کسمسا اٹھا کہ رُخِ جلوۂ شباب سے رشکِ صد طور، لب ہمہ خون صد میخانہ، آنکھوں میں صبا کی خنکی اور شبنم کی ایسی نمی کہ ست

ملی جو آنکھیں ہتیلیوں سے
ٹپک پڑے بادۂ شبانہ

واہ رے خوش ہنگامی کہ اُدھر آسمان پر شفق کی گلگونی، ادھر گالوں پر جوانی کی ایسی سرخی کہ رومال سے پونچھیں تو رنگ چھوٹنے لگے، ایک طرف کرن پھوٹ رہی ہے، اور دوسری طرف شبنم کی نازک چھاتی دھڑک رہی ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ جوش کے ادب میں خلاقی ہے، اس کے الفاظ نظم میں رقص کرتے نظر آتے ہیں، اور خیال چھاگل لنڈھاتا آتا ہے، وہ جس ماحول کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اس کی روح کھینچ کر پیش کر دیتا ہے، "جوانی کی آمد آمد" اور "نظارۂ صبح" اور بیسیوں ایسی نظمیں ہیں جن میں جوش کا اصلی رنگ جھلکتا نظر آتا ہے، یوں جوش لاکھ شاعرِ انقلاب یا اور جو چاہیں ہوں، لیکن اُن کی شخصیت کا سب سے اعلیٰ جوہر اور ان کی شاعری کا لافانی کارنامہ اسی نوع کی منظومات میں پوشیدہ ہے، کاش انہیں فطرت کی لازوال ودیعت کا صحیح احساس ہوا،

ساغر نظامی:۔

گلشنِ سخن میں ایک کلی پھوٹی، شبنم نے مُنہ دھلایا، نسیمِ سحری نے گدگدی دی، کلی ہنس پڑی، وفورِ جوش سے اس کی چولی مسک گئی۔ واہ رے قسمت کہ کلی کا نام اب پھول پڑ گیا، نرگس نے اسے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا، لالہ کا دل رشک سے داغدار ہو گیا، اس شاعرانہ تمہید میں ایک شعرِ مجسم کی شخصیت پنہاں ہے، شعرِ مجسم کون؟ کرشن کی بانسری، جمشید کا ساغر یعنی ساغر نظامی ——— یہ جوان اور حسین شاعر ہمارے جدید ادب میں ایک ہیرو کی حیثیت رکھتا ہے۔ لارڈ بائرن کی طرح وہ فرسودہ سماج سے باغی ہے، زندگی کے درخشاں چہرے سے وہ ان نقابوں کو الٹ دینا چاہتا ہے۔ جن کو انسان نے خود ڈال رکھا ہے، غم کی تلخ کامی سے اس کا دل لرزتا ہے لیکن شیلے کی مانند وہ تمام تلخ کامیوں کو نغموں کی رو میں بہا دینا چاہتا ہے، دنیائے مشرق میں وہ حافظ کا ہمنوا ہے ۔

ساغرے نوش کن و جرعہ بر افلاک فشاں   تلکے از غمِ ایام جگر خوں باشی

زبان کے مسئلے میں ساغر بہت مفاہمت پسند شاعر ہے، اس کا کمال ایک آئیڈل لٹریچر کا حامل ہے، فارسی کی شیریں بندشوں کے ساتھ ہندی کے سریلے الفاظ کا اختلاط شربت میں ایک ہلکی سی ترشی کا سواد پیدا کر دیتا ہے، بحروں کے انتخاب میں اس کا ذوقِ موسیقی چار چاند لگا دیتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نغموں میں بہتے ہوئے دریا کی روانی اور گلگتے ہوئے آبشار کا ترنم پوشیدہ ہے، اس کا تخیّل فطرت کے بوقلموں مناظر سے رچا ہوا ہے، جن کے بیان کرنے میں وہ فن کی جزئیات کو بھی فروگذاشت نہیں کرتا "سکوت" کا ایک بند ملاحظہ ہو ———

وداع ہوتی ہے ظلمتِ شب سحر کھڑی مسکرا رہی ہے   اندھیریاں ہو رہی ہیں رخصت سواری نور آ رہی ہے
ستارے انگڑائی لے رہے ہیں قمر ہے آسودۂ منازل   ردائے انجم بہ شرِ باد وداع کے گیت گا رہی ہے
گداز کیف سحر کو اب ٹپکنے والے ہیں شگوفۂ شبنم   صبا بہ اندازۂ نوازش گلوں کے دامن بڑھا رہی ہے
کنارِ حسرت میں سونے والی ہر غنچہ کوئی چونک رہا   جہان پہ صبح کی تجلّی سکوت بن بن کے چھا رہی ہے

زمیں بھی ساکت   زماں بھی چپ ہے
ندی بھی خامش   ندا بھی چُپ ہے
ہے ساز ساکن   نوا بھی چُپ ہے

خموش ہے نہر کی روانی ٹھہر گیا ہے سمٹ کے پانی   سحر کی خاموش ضو فشانی سکوت میں مسکرا رہی ہے

نظم میں جدت کے علاوہ بحر اور الفاظ کا وہ تنوع ہے کہ خموشی ٹپکی پڑتی ہے سحر مسکرا رہی ہے، قمر آسودۂ منازل ہے، ستارے انگڑائیاں لے رہے ہیں

اورگداز کا وہ کیف ہے کہ شبنم بن کے ٹپکنا چاہتے ہیں، صبا ان انمول موتیوں کو رولنا چاہتی ہے اس لئے پھولوں کے دامن بڑھا رہی ہے، فضا مدہوش، ندی کی لہریں سوئی ہوئی ہیں، موجوں کے گھونگھرو ساکت ہیں۔ اور سازِ ہستی تشنۂ مضراب ہے، پوری نظم میں کوئی ایسا عنصر نہیں جو مخرّبِ سکوں ہو،

نیچرل شاعری کا کمال یہ ہے کہ وہ جس حال کی تصویر کشی کرے اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھڑی کر دے تخیل اور مشاہدہ میں بعد نہ ہو صبح کی دلآویزی، شام کا جلوۂ محجوب، کوہ و بیاباں کا سکوت نظروں میں بھر جائے، آبشار کا نغمہ کانوں میں گونجنے لگے "ملاحوں کا گیت" اس نوع کی ایک کامیاب ترین نظم ہے، آپ صاف دیکھیں گے کہ نظم کے تمام عناصر ماحول کے حقیقی ساز و سامان کے حامل ہیں، نکھرا ہوا آسمان، سیماب کی سی بےکل موجیں اور مہتاب کی روپہلی چاندنی، دریا کا آب آئینہ سیما اور اس پر تیرتی ہوئی کشتی ——

آئینۂ ساز زیر، موجۂ شناور پر چادرِ سیماب
سایۂ مہتاب پر، منظر شب تاب پر جیسے مئے ناب
ہے مری کشتی رواں
اور میں ہوں نغمہ بار

کشتی رواں ہے اور مناظر رقصاں، ہر کیفی اور سرمستی ہے، فضائیں ساکت ہیں اور نوائیں خاموش، چپ و راست کی تمام چیزیں مدہماتی معلوم ہوتی ہیں، جوئبار کو نیند سی آ رہی ہے، کوہساروں میں بہاریں اینڈ رہی ہیں، مگر مانجھی ہیں کہ چپو چلائے جا رہے ہیں، اور مگن ہیں کبھی کبھی بجھے ہوئے دل کو ملہار گا گا کر بہلاتے ہیں، ملہار کی ہر لے سے بروگ ٹپک رہا ہے، لفظ لفظ سے دل کے مخفی تاروں کو چھیڑتا ہے حسن انتخاب دیکھئے کہ طبع آزمائی اسی بحر میں کی گئی ہے کہ جس میں اکثر مانجھیوں کے گیت ہوا کرتے ہیں، ترنم کا ایک ایسا امرت دھارا بہایا گیا ہے۔ جو سمندر کے نغمہ زا سکوت میں جادو کا اثر پیدا کر دیتا ہے، ——

نیند میں ہے جوئبار، کیف میں ہے لالہ زار
اینڈ رہی ہے بہار، سونے کو ہے آبشار، تجھ کو نہیں کچھ قرار
ہے مری کشتی رواں
اور میں ہوں نغمہ بار

کشتی اور اس کی روانی پر کتنی پر کیف تشبیہیں پیش کی ہیں ——

بادہ میں جیسے سبو، جیسے چمن میں نمو، جیسے خلا میں علو
جیسے فضاؤں میں ہو، جیسے ہواؤں میں بو، جیسے رگوں میں لہو
ہے مری کشتی رواں
اور میں ہوں نغمہ بار

اجمیر میں جہاں شاہ اجمیری نے نور کا دھارا بہایا، وہاں شاہجہاں نے حسن کی موجیں لہرائیں، نور حقیقی کو کبھی فنا نہیں، حسن حقیقی بھی سدا بہار ہے، ادھر خواجہ کی دریا دلی ہے، ادھر "آنا ساگر" موجیں مارتا ہے، آج بھی چاندنی راتوں میں جب نور مہتاب تال کی موجوں سے کھیلتا ہے۔ اور لب جو کے قصر مرمریں کو بوسہ دیتا ہے تو دیکھنے والی آنکھیں بدمست و سرشار ہو جاتی ہیں، ساغر نے اس تالاب پر کیا خوب نظم لکھی ہے

اراولی کے وسیع میداں میں کون یہ جگمگا رہا ہے — حسین چاندی کا اک کٹورہ بھرا ہوا تھرتھرا رہا ہے
زمیں کے دل پہ جڑ دیا ہے مگر اک آئینۂ مطوّل — کہ نیلگوں آسماں سے کوثر کا عکس چھن چھن کے آ رہا ہے
ظہور گاہِ مذاقِ آنا — ورودِ انوار کا ٹھکانا
صباحتوں کا بھرا خزانا — بہارِ رفتہ کا آشیانا
مثالِ ساغر چھلک چھلک کر فضا کی مستی بڑھا رہا ہے
وہ اس کا انوار بار ساحل مقدّرِ قصرِ مرمریں کا — نگار خانہ ہے تہہ نشیں کا بہاؤ ہے موج کی جبیں کا
وہ ذوقِ شاہجہاں کا مظہر وہ مونسِ کمالِ صنعت — وہ منظر روشن و منور وہ نقش ارژنگ یاسمیں کا
وہ صاف پانی میں بیل اس کا سا — وہ اک تموج سا بام و در کا
ہے کشتی ماہتاب گویا — غریقِ فکرِ عبورِ دریا
مگر وہ طوفان تازگی کا وہیں جھکولے سے کھا رہا ہے

صاف و شفاف پانی میں قصر مرمریں کی عکس ریزی، ہوا کی موجوں سے سطح آب پر ہلکی ہلکی لہروں کا پیدا ہونا اور ان میں حسین بام و در کے کانپنے کو دلکش انداز میں بیان کرنا شاعرانہ مفاہمت اور تصوّریت کی معراج ہے۔ بات یہ ہے کہ جب شاعر کی فطرت حسن پرست ہو جاتی ہے تو ارغنونِ ہستی کا ہر ایک پیکر وجود جلوۂ حسن کی ایک کرن نظر آنے لگتا ہے۔ اس کا تخیلہ فطرت کے گوشے گوشے سے گذرتا ہے، اور انہیں رعنائی و جمال سے معمور پاتا ہے، پہاڑ اور دریا، بیابان اور چمنستان، آفتاب اور ماہتاب اپنے اپنے پہلو میں ایک دنیائے شاعری لئے نظر آتا ہے۔ "شعر فطرت" والی نظم میں دیکھئے کس طرح شاعر کو فطرت کا ہر

منظر ایک چھلکتا ہوا شعر نظر آتا ہے

دشت میں بہہ رہا ہے اک چشمہ
جس میں مخزن ہے صاف پانی کا
اس کی موجوں میں ہے اک آئینہ
ہے تماشائی وسعتِ صحرا
یہ بھی اک شعر ہے چھلکتا سا
اک زریں و زرفشاں نقطہ
چاند کہتی ہے جس کو سب دنیا
زینتِ ارض، آسماں آرا
لیلیِ شب، مسافرِ تنہا
یہ بھی اک شعر ہے فلک پیما

سید محمد محی الدین رنجور عظیم آبادی

رباعی

خورشید جب آنکھوں سے نہاں ہوتا ہے
جب تیرہ و تاریک جہاں ہوتا ہے
جب تیرگی ابر سے پیدا ہے
اُف کتنی لطافت سے رواں ہوتا ہے
رتھ چاند کی دیوی کا رواں ہوتا ہے

جگن ناتھ آزاد

غزل

دو دن کے لئے جذبات کی دنیا میں گھما گھمی ہی سہی
دُنیا ہمیں وہمی کہتی رہے عاشق نہ سہی وہمی ہی سہی

ساقی کی نگاہ سے میں نے جو مطلب پانا تھا پا ہی لیا
زاہد کی نگاہ میں یہ میری خوش فہمی ہے خوش فہمی ہی سہی

میں گردشِ دوراں سے بھاگا اور سایہ ساغر میں پہنچا
منزل تو ہے نظروں کے آگے نظریں سہمی سہمی ہی سہی

غم کی ظلمت میں اُس پاکیزہ ذکر سے کچھ تنویر سی ہے
اس باغ میں چاندنی پھیلی ہے مدھم سہمی سہمی ہی سہی

آلام کے دام میں آ کر فطرت خود کو میں پھر اُن کا سمجھا
اُن کے متعلق مجھ کو غلط فہمی ہے غلط فہمی ہی سہی

عبدالعزیز فطرت

یہ انسان

ہر چند کہ یہ دنیائے دنی ہر عیب و ہنر کو چھپاتی ہے
لیکن جو حقیقت ہوتی ہے وہ سامنے آہی جاتی ہے

کانٹے بھی چھپائے چھپتے ہیں شاداب گلستانوں میں کہیں
پھولوں کی مہک رک سکتی ہے پُرہول بیابانوں میں کہیں

کیا باطل کی تاریکی سے انوارِ حقائق چھپتے ہیں
خورشید کی اک تنویر سے جب ذرّے بھی چمک کر اٹھتے ہیں

جس چیز کے جوہر قابل پر عالم کی نگاہ خاص نہیں
کیا اہلِ ہنر کی آنکھوں میں وہ پتھر ہے، الماس نہیں

پرشور تموّج ہوتے ہیں خاموش صفت دریاؤں میں
کچھ پھول مہکتے رہتے ہیں بے آب و شجر صحراؤں میں

کب زورِ حوادث کے آگے صحرا و جبل کا چلتا ہے
آخر اسی جھکڑ طوفاں میں ہستی کا دیا بھی جلتا ہے

مقصود یہ ہے، ہر چیز یہاں اک خاص طبیعت رکھتی ہے
جس شے کی حقیقت جتنی ہے، وہ اس میں فضیلت رکھتی ہے

یہ کبر کا پتلا، بانیِ شر جو خلد کو کھو کر آیا ہے
یہ ننگِ خلائق روزِ ازل شیطان نے جسے ٹھکرایا ہے

یہ ظلم کا بانی عالم میں جو تاج بہ سر کہلاتا ہے
یہ خون کا پیاسا گرگ صفت جو نوعِ بشر کہلاتا ہے

اخلاق کا جس کو پاس نہیں کچھ خوف نہیں داور کا جسے
اوتار کی جس کو کچھ پروا، احساس نہ پیغمبر کا جسے

افسوس وہ ارذل دنیا کی مخلوق میں سب سے بدتر ہے
اے کاش زمیں پر گردوں کی چھت ٹوٹ پڑے تو بہتر ہے

یہ کفر و ریا کا خواہاں ہے، اس کو صفتِ رحماں نہ کہو
یہ روزِ ازل کا حیواں ہے، للہ اسے انساں نہ کہو

یہ جور و جفا کا حامل ہے، یہ عہد و وفا کا قاتل ہے
یہ دہر میں سب سے غافل ہے، یہ خلق میں سب سے جاہل ہے

یہ پھول نہیں ہے خار ہے یہ، یہ نور نہیں ہے نار ہے یہ!
آرام نہیں آزار ہے یہ، انسان نہیں خونخوار ہے یہ!

اک ڈھیر ہے گرد و کثافت کا قدرت کے کمالِ زرّیں پر
انسان نہیں اک دھبّہ ہے فطرت کی قبائے رنگیں پر

ہستی ہے اگر اک راہِ طلب، اُس راہ میں یہ اک روڑہ ہے
عالم جو ہے اگر اک جلوۂ حق، اُس جلوے کا یہ پردہ ہے

گو فرض و خرد کی نعمت سے انسان نرا محروم نہیں
لیکن وہ فرائض کیا کیا ہیں، شاید یہ اسے معلوم نہیں!

دراصل ہوس کی شدّت سے مجبور ہے یہ، معذور ہے یہ
تخریب کے چکر میں پڑ کر تعمیر کی حد سے دور ہے یہ

جب نفس کا جبڑہ کھلتا ہے یہ بڑھ کے غذا دیتا ہے اُسے
اُس وقت وہ اُس کا بھائی ہو، یہ بھینٹ چڑھا دیتا ہے اُسے

جب کوئی نئی خواہش اس کو اعجاز کوئی دکھلاتی ہے
اُس وقت جہالت انساں کی فولاد سے ٹکر کھاتی ہے

اخلاص کو ہر خود غرضی سے یکلخت بدل دیتا ہے وہیں
یہ رسم و رہِ دیرینہ کو پیروں سے کچل دیتا ہے وہیں

شیطان بھٹک جاتا ہے جہاں یہ اس کو نبی بتلاتا ہے
جس راہ میں ظلمت آتی ہے یہ شمع وہاں دکھلاتا ہے

یوں دہر کے ذرّے ذرّے کو بے خوف و خطر جل دیتا ہے
پڑتی ہے کہیں جب زد کوئی، مذہب کی سپر لے لیتا ہے

ایثار و وفا تو خیر کجا، ایثار و وفا کا وہم نہیں
پتھر کے جگر میں شاید ہو، انسان کے دل میں رحم نہیں

رہزن کو کبھی رہبر کی طرح دیکھا ہے کسی ویرانے میں
اے دوست! اسے کچھ باک نہیں الیاس و خضر بنجانے میں

آفاق کے گوشے گوشے میں بدکیش ہے یہ، بدبخت ہے یہ،
تاریخ شہادت دیتی ہے انساں کی کہ ابن الوقت ہے یہ!

حرماں خیرآبادی

شکارا

"بابو جی! میراکدل؟"

"ہاں، میراکدل۔"

"تو آؤ بیٹھو۔ ایک ہی سواری چاہیئے۔"

منگل چرن کے بیٹھتے ہی مانجھی نے چپّو لگایا اور شکارا[1] چل پڑا۔ دو بچے اور میاں بیوی کا ایک جوڑا پہلے ہی سے وہاں موجود تھا منگل کو ایسے جوڑوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ یک گونہ نفرت تھی اس لئے وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سورج ایک بڑے چنار کے پیچھے چھپا چاہتا تھا۔ درختوں کے لمبے لمبے سائے جھیل کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلتے چلے گئے تھے جھیل میں کتنے ہی شکارے چل رہے تھے۔ لیکن وہ بہت آگے نکل گئے تھے۔ ان کا شکارا سب سے پیچھے آہستہ آہستہ چل رہا تھا

منگل چرن نے آج سری نگر کے بہترین باغات کی سیر کی تھی نشاط اور شالامار کے حسین منظر آنکھوں میں تیر رہے تھے۔ وہ رنگا رنگ پھولوں کے تختے، وہ گرتے ہوئے سیمیں آبشار اور وہ اچھلتے ہوئے شوخ فوّارے اس کے دماغ پر ایک لطیف کیفیت بن کر چھائے ہوئے تھے۔ اس کے پہلو میں ایک اور منظر تھا ——— ہری ہری گھاس، سایہ دار گھنے درخت اور ان کے نیچے بیٹھے ہوئے آدم اور حوا کے بیٹے بیٹیوں کے جوڑے ..... یہاں آ کر اس کا تصور رُک جاتا تھا اور وہ سوچنے لگتا تھا ——— یہ لوگ زندگی کا بوجھ ڈھوتے ہیں اور بہروپ بھرتے ہیں محبت کا، محبت! ———

اب اس کی نظر خود بخود کنول کے اس پھول پر جا پڑی تھی جو اس نے آتی دفعہ ایک ڈونگے والے سے لیا تھا ——— محبت تو اس سفید پھول کی طرح ہے۔ وہ اس طرح دل کی گہرائیوں میں جنم لیتی اور پرورش پاتی ہے اور اپنی خوشبو اور لطافت سے انسانی زندگی کو خوشگوار اور ملائم بناتی ہے لیکن یہ شادی، بچے اور بندھن ..... اسے محبت کہنا زندگی کے ساتھ مذاق کرنا ہے اور مذاق بھی فریب نما ......

زیادہ دیر تک اسی قسم کی باتیں سوچنا اور پریشانی سے اُلجھنا اسے پسند نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک کیف پرور ماحول میں غرق ہو کر طبیعت کا سکون اور اطمینان حاصل کرے۔ مگر ایک بے قرار جذبہ دل کے کسی کونے سے کسی پہاڑی چشمے کی طرح پھوٹ نکلا تھا۔ اور اس کے خیالات کو غم آلود اور بے کیف بنا رہا تھا۔ اس پریشانی سے ابھرنے کے لئے اس نے سر اوپر اٹھایا اور دور تک نگاہ دوڑائی اب سورج چھپ چکا تھا اور سامنے شنکرا چاریہ کے پہاڑ ——— تختِ سلیمان ——— پر بجلی کے قمقمے روشن ہو چکے تھے اور اُن کے عکس جھیل کے گہرے پانیوں میں ڈوب کر اس طرح جگمگا رہے تھے جس طرح دل کی گہرائیوں میں ماضی کی حسین یادگاریں جگمگا اُٹھتی ہیں۔

منگل جھیل کی گہرائیوں، لمبی لمبی گھاس اور سطحِ آب پر اُٹھنے والی اَن گنت لہروں کو دیکھ رہا تھا اور یوں سوچ رہا تھا جیسے اپنے آپ میں اور اپنے ماحول میں کوئی مطابقت پیدا کر رہا ہو کہ عورت کے پاس بیٹھے ہوئے بچے نے، جس کی عمر چار، ساڑھے چار سال ہو گی، منگل کا پھول جھپٹ لینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ لیکن اس عورت نے بچے کا بازو پکڑ کر اور ایک ہلکی سی 'نا' کے ساتھ اسے اس حرکت سے باز رکھا۔

منگل کو اس 'نا' میں ایک آشنا سا لہجہ محسوس ہوا اور اُسے یاد آیا کہ جب وہ شکارے میں آ کر بیٹھا تھا تو وہ عورت اسے کنکھیوں سے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اُسے جانتی ہو اب منگل نے بھی عورت کی طرف ذرا غور سے دیکھا تو چونک اٹھا اور "چندرا" کا لفظ اس کے ہونٹوں

[1] ایک چھوٹی سی کشتی جو کشمیر کی جھیلوں میں سیر کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔

پر آ کر رُک گیا۔

ماضی کا ایک دس سال پرانا واقعہ اس کے ذہن میں یوں اُبھر آیا جس طرح حرارت پاتے ہی موم سے لکھے حروف اُبھر آتے ہیں

. . . .

منگل کو پالم پور آئے کتنے ہی دن گذر گئے تھے جو کچھ اسے دیکھنا تھا وہ دیکھ چکا تھا۔ اب وہ ہوٹل کے ایک کمرے میں بیٹھا سامنے لاریوں کے اڈے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ موٹروں والوں کی آوازیں "بلند کوٹ۔ دھرم سالہ۔ بلند کوٹ او موٹر تیار ہے" پے در پے اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ موٹر تیار ہے، نے منگل کے دل میں بھی تیار ہونے کی تحریک پیدا کی۔ خیال آنے کی بات تھی کہ وہ جھٹ پٹ اُٹھا، سامان باندھا اور ہوٹل کے نوکر کو بلا کر کہا کہ سامان اٹھا کر موٹر پر رکھ دے۔ سامان ہی کیا تھا ایک مختصر سا بستر ایک سوٹ کیس اور ایک کیمرہ۔

سواریاں پوری ہوئیں تو موٹر چل پڑی۔ راستے میں کلینر نے کرایہ وصول کرنا شروع کیا۔ جب وہ منگل کے پاس پہنچا تو اس نے پوچھا: "کتنے پیسے دوں؟"

"ایک روپیہ چھ آنے"

"لیکن بلند کوٹ کے تو ڈھائی روپے لگتے ہیں"۔

"تو آپ کو بلند کوٹ جانا تھا" کلینر نے پوچھا۔

"تو اور!"

"بابوجی، آپ سے تو بھول ہوگئی۔ بلند کوٹ والی موٹر تو پہلے چلی گئی تھی۔ یہ موٹر تو دھرم سالہ جائے گی"۔

"اچھا بلند کوٹ نہیں تو دھرم سالہ ہی سہی۔ کہیں جانا ہی تو ہے"

سبھی مسافر منگل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پہلے ان کی آنکھوں میں طنز اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات تھے۔ لیکن جب یہ الفاظ سنے کہ کہیں جانا ہی تو ہے۔ تو سب کے سب حیران رہ گئے کہ یہ بھی عجیب آدمی ہے جس کی کوئی منزل ہی نہیں۔ سامنے کی نشست پر ایک دوشیزہ بیٹھی تھی۔ اس نے بھی یہ بات سنی تو اپنی گھنی اور لمبی لمبی پلکوں کو اٹھا کر ایک نظر منگل کو دیکھا اور اسے اس کی عجیب شخصیت سے کسی قدر دلچسپی محسوس ہوئی۔

منگل کے پاس ایک کتے کا پلا تھا۔ اُس نے پلے کو موٹر کے فرش پر بٹھا دیا اور جیب میں سے ایک چمڑے کا بٹوا نکال کر کرایہ ادا کیا۔

پلے نے جب اپنے آپ کو آزاد پایا تو اُسے کھیل کی سوجھی۔ وہ دوشیزہ کے سلیپر کا ایک پاؤں اٹھا کر دور لے گیا۔ اور اس کے ساتھ اس طرح کھیلنے لگا جس طرح بلی کا بچہ چوہے سے کھیلتا ہے۔ کبھی اُسے پنجوں سے جھنجوڑتا۔ کبھی مُنہ میں پکڑ کر اِدھر اُدھر پٹکنی دیتا اور کبھی ایک لمحہ کے لئے یونہی چھوڑ دیتا تھا۔ منگل بیٹھا اُسے دیکھا کیا۔

تھوڑی دیر بعد دوشیزہ نے اپنے سیٹ پر رکھے ہوئے پاؤں نیچے لٹکائے اور اُسے سلیپر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ سلیپر کا ایک پاؤں وہاں نہ پا کر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ تب منگل بولا۔ "معاف کرنا آپ سلیپر ڈھونڈ رہی ہیں نا۔ یہ میرے پلے کی شرارت ہے۔ وہ دیکھو وہاں بیٹھا ہے لئے"۔

پھر منگل نے پلے کو "جیکب جیکب" کہہ کر لکارا اور وہ سلیپر اٹھا کر دوڑ آیا۔ منگل نے اسے سلیپر وہیں رکھ دینے کا حکم دیا جس کی اس نے فوراً تعمیل کی۔

"بڑا سیانا پلا ہے"۔ دوشیزہ نے اسے گود میں اٹھاتے ہوئے کہا

"اور شریر بھی" منگل بولا۔

"کیوں جی آپ نے اس کا نام جیکب رکھا ہے نا" دوشیزہ نے دریافت کیا اور منگل کی طرف سے جواب کا انتظار کئے بغیر آپ ہی بولی:—

"یہ تو انگریزی نام ہے۔ کیا آپ کو دیسی نام پسند نہیں آتے؟"

"پسند، ناپسند کی میں نہیں کہتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ انگریز کتوں سے بہت پیار کرتے ہیں اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہم کیا نہیں کرتے؟" دوشیزہ بیچ میں ہی بول اُٹھی۔

"ہم!" منگل نے ایک طنز آمیز مسکراہٹ سے کہا: "ہماری بات آپ جانے دیجئے۔ کتوں سے تو کیا، ہم تو اپنے آپ سے بھی پیار نہیں کرتے"۔

دوشیزہ سے اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ بحث کا خیال چھوڑ کر پلے کو پچکارنے اور پیار کرنے لگی اور اس میں اتنا محو ہوئی گویا وہ کوشش کر رہی ہے کہ اگر وہ منگل کی بات کو دلیل سے نہیں جھٹلا سکی تو عمل سے ضرور غلط ثابت کر دے گی۔

دوشیزہ کا نام چندرا تھا۔ وہ منڈی گرل سکول میں استانی کا کام کرتی تھی اور اب وہ پربھاکر کا امتحان دینے دھرمسالہ جا رہی تھی۔ راستہ بھر منگل میں اور اس میں مزید بات چیت نہ ہوئی۔ مگر وہ پلا چندرا کی گود میں دبکا بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے ہلنا جلنا بھی بند کر دیا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ کہیں شرارت کرنے سے چندرا کی آغوشِ راحت چھوڑ کر پھر منگل کے پاس نہ جانا پڑے۔

لاری دھرمسالہ کے اڈے پر جا کر رکی۔ چندرا پلے کو لئے نیچے جا کھڑی ہوئی اور اس کا نوکر سامان اتارنے لگا۔ منگل نے بھی اپنا بستر اور سوٹ کیس سنبھالا

"ڈھونڈیئے نہیں بابو جی۔ آپ کا پلا میرے پاس ہے" نیچے سے چندرا بولی۔

"بہت اچھا۔ اس نوازش کا شکریہ" منگل نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔ "کیوں جی! آپ کیوں ادا کرتے ہیں شکریہ۔ جیسے اٹھایا وہ تو ہُوا بولتا ہی نہیں" چندرا نے پلے کے مُنہ پر ایک ہلکا سا تھپڑ لگاتے ہوئے کہا۔

نوکر نے سامان اتار لیا تو مڑ کر پوچھا: "اب کہاں چلنا ہے بی بی جی؟"

چندرا نے نوکر کے سوال کا کچھ جواب نہ دیا بلکہ منگل سے پوچھا:۔ "آپ کہاں ٹھہریں گے جی؟"

"یہیں کسی ہوٹل وٹل میں"

"ڈاک بنگلے ہی میں کیوں نہ ٹھہریں۔ میں بھی وہیں جا رہی ہوں"

"تو ڈاک بنگلے میں ہی سہی" منگل بولا۔

ڈاک بنگلا قریب ہی تھا۔ نوکر سامان اٹھا کر وہاں لے گیا اگلے روز امتحان شروع تھا۔ چندرا صبح ہی امتحان دینے چلی جاتی اور منگل دن بھر سیر کیا کرتا۔ اگر کوئی دلفریب منظر نظر آتا تو کیمرے سے تصویر لے لیتا اور بنگلے پر آ کر چندرا کو دکھاتا۔ شام کو کھانا کھا کر چندرا بھی اکثر اس کے ساتھ سیر کو جاتی۔ اسے منگل کی باتوں میں ایسا اثر، جادو اور انوکھا پن محسوس ہوتا تھا جو اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔

آخر اس کا امتحان بھی ختم ہو گیا۔ اب وہ محض سیر کی غرض سے ٹھہری ہوئی تھی، اور یا یوں کہئے کہ جتنے دن منگل کے ساتھ بسر ہو جائیں انہیں غنیمت سمجھتی تھی۔ وہ دن بھر اس کے ساتھ سیر کیا کرتی۔ ایک دن وہ چلتے چلتے بہت دور نکل گئے۔ چندرا کو تکان محسوس ہونے لگی۔ وہ بولی:۔ "منگل بابو! میں تو تھک گئی۔ کہیں ٹھہرو گے بھی یا چلتے ہی رہو گے؟"

"واہ! ٹھہرنے کی بھی ایک ہی کہی۔ میں تو چاہتا ہوں چلتے چلتے اُفق تک پہنچ جائیں"۔

"اُفق تک!" چندرا نے ایک دلآویز مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے دوہرایا اور پھر کہا:۔ "کیا کوئی اُفق تک بھی پہنچ سکتا ہے؟"

"نہ پہنچ سکتا ہو۔ لیکن پہنچنے کی حسرت تو انسان کے دل میں رہتی ہے"

اس پر چندرا منگل کے منہ کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی بات ہونٹوں سے جدا نہ ہو سکی۔ اُسے ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ملتے تھے۔ شاید وہ کہنا چاہتی تھی — ہر ایک انسان کے دل میں تو نہیں ہوتی یہ حسرت! ایک تم ہوئے یا ایک شاید میں ——!

. . . .

اندھیری رات کا پہلا پہر تھا۔ منگل ڈاک بنگلے کے چمن میں ایک بنچ پر بیٹھا خاموش ماحول کی پرعظمت گہرائی میں اس قدر کھویا ہُوا تھا کہ اُسے معلوم بھی نہ ہوا کہ چندرا کب اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی وہ ساکن بیٹھی اس طرح دیکھتی رہی جس طرح ایک پجارن اپنے دیوتا کو دیکھتی ہے۔ برآمدے کے لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی منگل کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں اس کا سانولا رنگ کچھ عجیب کیفیت لئے ہوئے تھا۔ اس کی چوڑی پیشانی، موزوں خدوخال اور چوڑے شانے اس کی مردانہ شان کو دوبالا کر رہے تھے۔ اس کی یہ محویت دیکھ کر چندرا بے خود سی ہو گئی۔

"کیا سوچ رہے ہو منگل بابو؟"

منگل بابو چونک اُٹھے اور معذرت کی:۔ "معاف کرنا چندرا تم کب آئیں؟"

"میں ابھی آئی ہوں"۔ چندرا نے جواب دیا اور پھر وہی سوال دُہرایا۔ "تُم کیا سوچ رہے تھے اتنے محو ہو کر؟"

"میں" منگل نے قدرے تامل سے کہا: "میں سامنے ان پہاڑوں

کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کتنے بلند اور شاندار ہیں یہ پہاڑ۔ گویا فردی ہوئی زمین کی عظمت سر اٹھائے کھڑی ہے۔ کاش! ہم انسانوں کے ارادے بھی ایسے ہی بلند اور مضبوط ہوتے!"

چندرا نے سوچا کتنی شاعری ہے اس آدمی کی باتوں میں۔ اس کے ارادے واقعی بلند اور مضبوط ہیں اور اس کا دل آسمانی وسعتوں کی طرح خوبصورت اور وسیع ہے۔ کیا وہ اس وسیع دل میں اتر کر ان مضبوط ارادوں کو پڑھ سکتی ہے؟ وہ یہ جاننے کے لئے ایک دم بے تاب سی ہو اٹھی۔ چندرا کے لئے اس خیال کا سنبھالنا تک مشکل ہو گیا۔ اس کا سر منگل کے کندھے سے جا لگا اور وہ بولی:۔

"منگل بابو! ہم دونوں قیامت تک اکٹھے رہیں اور اس طرح باتیں کیا کریں!"

منگل نے نہ تو اپنا کندھا ادھر ادھر ہلایا اور نہ چندرا کی بات کا کچھ جواب دیا۔ شاید اس نے یہ بات سنی نہیں۔ وہ اوپر آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا اور شاید سوچ رہا تھا کہ ان سات ستاروں میں وہ چوتھا ستارہ مدھم کیوں ہے؟

وہ دونوں بہت دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔ منگل اندھیری حسین رات کا اور چندرا اس کے کندھے کے سہارے کا لطف اٹھاتی رہی۔ آخر جب سردی کی وجہ سے باہر بیٹھنا مشکل ہو گیا تو اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

منگل کو نیند نہیں آتی تھی۔ اسے اپنے کندھے پر بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ منوں بوجھ! کیا وہ اسے اٹھا سکے گا؟ کہیں یہ بار اس کے پر تو نہیں توڑ دے گا؟ وہ بچنے کیا کچھ سوچا کیا۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کی دنیا کو محدود کرنا چاہتا ہے۔ اس خیال ہی سے اسے کوفت ہونے لگی۔ وہ سونا چاہتا تھا مگر سو نہیں سکا۔ لحاف کو ایک طرف پٹک دینے کے باوجود بھی اس کی طبیعت گرمی کے مارے گھبرا رہی تھی۔ وہ چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ کھول کر باہر آیا۔ اس نے دیکھا کہ چندرا بنگلے کے سامنے ٹہل رہی ہے۔ اس کا آنچل ڈھلک گیا ہے اور چاند کی سنہری چاندنی اس کے بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔ چندرا کو بالکل معلوم نہیں ہوا کہ منگل کھڑا اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنی ہی دھن میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کے تن میں کوئی جلن تھی جسے چاندنی کے ٹھنڈے رس سے تسکین ملتی تھی۔ وہ گھومتی رہی ۔۔ گھومتی رہی۔ منگل واپس اندر چلا گیا اور آہستہ سے دروازہ بند کر لیا۔

صبح جب چندرا سو کر اٹھی تو دن خوب روشن ہو کر نکل چکا تھا اور جیکب اس کے قریب ہی بستر پر بیٹھا تھا۔ چندرا نے اس کی طرف دیکھا اور نگاہوں ہی نگاہوں میں شکایت کی ۔۔ تو بھی کیسا چپکا بیٹھا رہتا ہے۔ جیکب۔ مجھے جگا کیوں نہیں دیا۔

اس نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ایک لفافہ فرش پر پڑا نظر آیا۔ چندرا نے اٹھا کر پڑھا۔ لکھا تھا:۔

"چندرا!

میری آزادہ روی زندگی کے کسی بندھن کو قبول نہیں کرتی۔ محبت تو دل کی چیز ہے۔ یہ پلا اس محبت کی نشانی تمہارے پاس چھوڑے جاتا ہوں۔"

چندرا آخری جملہ ختم کرتے ہی باہر نکل آئی۔ منگل کا کمرہ خالی پڑا تھا وہ دیوانہ وار اس کے اندر گھومنے لگی۔ شاید منگل کسی کونے میں نہ چھپ گیا ہو۔ مگر اسے معلوم ہوا کہ وہ رات ہی کہیں چلا گیا ہے۔ وہ ہونٹوں میں کچھ بڑبڑاتی اپنے کمرے میں لوٹ آئی اور جیکب کو سینے سے لگا کر کتنی ہی دیر بستر پر ساکن و مبہوت بیٹھی رہی۔ آخر جب سورج کی تیز کرنیں روشندان کے راستے اس کی آنکھوں پر پڑنے لگیں تو وہ اٹھی اور پلے کی طرف دیکھ کر بولی:۔ "راہی تھا چھوڑ کر چلا گیا"۔

کسے؟ ..... جیکب کو یا اسے؟ شاید دونوں کو!

. . . .

دو سال بعد منگل نے ایک بار پھر چندرا کو لاہور میں نسبت روڈ پر دیکھا۔ آگے آگے ایک نوجوان چل رہا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے چندرا جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ جوان آدمی کو دیکھ کر منگل کا دل پکڑا سا گیا۔ لیکن اس وقت چندرا کا پاؤں خربوزے کے ایک چھلکے پر سے پھسلا اور بوٹ کی ایڑی نکل گئی۔

"بھائی جان! ذرا ٹھہرنا۔ میں بوٹ ٹھیک کر لوں"۔ وہ چلائی۔

بھائی جان سن کر منگل نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ اسے معلوم ہو گیا کہ یہ نوجوان چندرا کا بھائی ہے اور کوئی نہیں۔ اب اس کی نظر جیکب پر بھی پڑی۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے سڑک سونگھتا آ رہا تھا۔

اس کے گلے میں ایک خوبصورت پٹا بندھا تھا اور اب وہ خاصہ بڑا ہو گیا تھا۔

اس کے بعد اڑھائی تین سال تک اسے اپنے دوست کرم چند کے خطوط ملتے رہے۔ ان کے ذریعے اسے معلوم ہوتا رہا کہ چندرا بدستور استانی کا کام کر رہی ہے۔ گھر والے شادی کے لئے زور دے رہے ہیں مگر اس نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ پھر وہ خط آنے یک بیک بند ہو گئے۔ کرم چند منڈی چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا تھا۔

پانچ ساڑھے پانچ سال سے اسے چندرا کی نسبت کچھ معلوم نہیں ہو سکا اور نہ اس نے جاننے کی چنداں کوشش کی۔ منگل کو اس کی محبت پر یقین تھا اور وہ اس محبت کے سہارے آزاد فضاؤں میں تیرتا پھرتا تھا۔

آج پھر چندرا اس کے سامنے بیٹھی تھی لیکن کیا یہ وہی چندرا تھی جس نے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا؟ نہیں، یہ چندرا تھی دو بچوں کی ماں۔

شکارا جھیل کو پار کر کے اب دریا میں داخل ہو چکا تھا۔ چاند کی چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ چندرا کے دونوں بچے ——— ایک گھٹنے پر سر رکھے اور دوسرا گود میں ——— سو رہے تھے۔ اس کا شوہر ملاح کے ساتھ باتوں میں محو تھا اور وہ خود گردن جھکائے یوں بیٹھی تھی گویا کہہ رہی ہو: منگل بابو! مانا کہ تمہاری آزادہ روی زندگی کے کسی بندھن کو قبول نہیں کرتی۔ مگر ہم، جنہیں زندگی کا بوجھ ہی ڈھونا ہے۔ کیوں نہ اسے مل جل کر ڈھوئیں؟

منگل اس بات کا کیا جواب دے۔ سب لوگ تو اس کی طرح آزادہ روی اختیار نہیں کر سکتے۔ سبھی کے ارادے تو پہاڑ کی طرح بلند اور مضبوط نہیں ہوتے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ چندرا کو یوں ملزم کی سی حیثیت میں بیٹھی دیکھے۔ اس لئے وہ نظر گھما کر اور چیزوں سے دل کو بہلانے کی بے سود کوشش کرنے لگا۔ شکارا اب دریا کے اس حصے میں سے گذر رہا تھا جہاں اس کے دونوں کناروں پر شہر کی تنگ تاریک اور غلیظ گلیاں دور تک پھیلتی چلی گئی ہیں اور ان گلیوں میں ہزاروں ایسے آدمی بھرے پڑے ہیں جنہیں زندگی کا بوجھ ڈھونا ہی پسند ہے۔ وہ اسی میں خوش اور مطمئن ہیں۔ ان کے لئے یہی سب کچھ ہے۔

کون پھرتا ہے آدرش کے پیچھے پیچھے!

شکارا گھاٹ پر جا لگا۔ چندرا کے خاوند نے بڑے لڑکے کو اٹھا کر کندھے سے لگایا اور اتر کر آگے آگے چلنے لگا۔ چندرا بھی گود کے لڑکے کو اٹھا کر اس کے پیچھے ہو لی۔ اس کا آنچل ڈھلک گیا تھا۔ اس کے پاؤں میں وہی لڑکھڑاہٹ اور انداز میں وہی بے چینی تھی جو منگل نے اس رات بنگلے کے باہر گھومتی ہوئی چندرا میں دیکھی تھی۔ وہ کھڑا دیکھا کیا ——— دیکھا کیا آخر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ منگل کے ہاتھ کا مرجھایا ہوا پھول ڈھیلی گرفت سے نکل کر زمین پر جا گرا۔ ایک بادل کے ٹکڑے نے چاند کو چھپا لیا۔ بجلی کی بتیاں بھی بجھتی سی نظر آئیں۔ اس کے اندر اور باہر اندھیرا چھا جانے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اب کدھر کو جائے۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا گویا شکارا جھیل کے اتھاہ پانیوں میں اس کے نیچے سے نکل گیا ہے اور وہ نیچے ہی نیچے دھنستا چلا جا رہا ہے۔ اس میں ہاتھ پاؤں مارنے کی بھی سکت نہیں۔ جھیل کی لمبی لمبی گھاس اس کے چاروں طرف لپٹ گئی ہے۔ آہ! یہ گھاس کتنی لمبی ہے اور نہ جانے کہاں سے اپنی خوراک حاصل کرتی ہے اور اندر ہی اندر بڑھتی رہتی ہے۔ منگل اس میں الجھتا چلا جا رہا ہے۔ کنارہ کہیں نظر نہیں آتا۔ شکارا ——— جس پر وہ تیر رہا تھا۔ دُور بہت دور نکل گیا ہے۔

رہبر بی اے

شعر

اُس بُت کی ابتدائے جوانی مرا دے ہے
مومن کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں

مومن

دو رنگ

اے شکاری دوست تو دراصل ہے روحِ روانِ زندگی
دیکھ کر تجھ کو مرے دل کی کلی
ایسے کھل جاتی ہے جیسے صبح کا پرنور چہرہ دیکھ کر تالاب میں ننھے کنول
تیرے نغمے یوں اُتر جاتے ہیں میرے قلب کی گہرائی میں
جیسے لاسلکی میں ہر آواز ہو جاتی ہے جذب
دوستوں پر تو بہت ہے مہرباں
تیری اک اک بات ان کو نغمہ ہائے طائرانِ جنت الفردوس سے واللہ ہرگز کم نہیں
نرم دل کتنا ہے تو
دوستوں کی اک ذرا تکلیف پر ہو جاتے ہیں آنسو رواں
وہ ترے مردانہ بازو، روئے زیبا، قدِ موزوں، شرمگین و مہر آلودہ نگاہیں، اور تری آواز کی شیریں لچک
دشت کی تاریکیوں میں ہو کے گُم
آگ اگلنے والی بندوقیں تری
اس پہ وہ پتلی کمر اور تیز دانتوں والے سگ
خوبصورت اور لمبے بالوں والے وہ ترے چالاک اسپ
تیز چاقو جیب میں اور لمبے برچھے ہاتھ میں!
جن سے تو کرتا ہے صحرا میں جدا ہو کر جیبوں سے جہانِ مرغ و ماہی کو تباہ
جیب میں سونے کی نب والا وہ اک کالا قلم
لال پگڑی والا وہ تیرا مقدم روسیاہ
وہ ترا کارندہ جو انساں نما اک بھیڑیا ہے پردۂ دنیا کے دامن پر بہت مجہول داغ
جن سے اپنے گاؤں میں تو سیدھے سادے کاشتکاروں کو کیا کرتا ہے بڑھ بڑھ کر ہلاک
ہیں ترے منہ میں کبھی حیواں کبھی انساں کی کچّی بوٹیاں۔
آہ یہ تیری دو رنگی زندگی
تجھ سے نفرت ہے مجھے۔

(چودھری) ابوالفضل صدیقی

پہلی تنخواہ

تین سو ننانوے روپے پندرہ آنے ....! ایک آنہ رسید کے ٹکٹ کا کٹ گیا، ورنہ پورے چار سو ہوتے۔ رومیش نے سوچا، یہ گورنمنٹ بھی کئی بار کیسی عجیب باتیں کرتی ہے۔ ہمارے خالی دستخطوں پر اتنے بڑے دفتر کا کام چلتا ہے، اور اتنے وسیع علاقے کی مالگذاری کا حساب کتاب ہوتا ہے — لیکن جب تنخواہ کے چار سو روپوں کی بات ہو، تو ایک آنے کا ٹکٹ ضرور لگانا پڑتا ہے — جیسے ہم پر کچھ اعتبار باقی نہیں رہا! رومیش نے نوٹوں کا پلندہ کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔ اور واپس پھرنے کے لئے مڑا، تو دیکھا کہ خزانے کا چپراسی وردی ٹھیک کر کے سلام کی تیاری کر رہا ہے —

اونہہ! بدمعاش کہیں کا، جیسے ایک چونی پر اس کا پیدائشی حق ہے، لوگوں نے بھی کیا کیا واہیات رواج تراش رکھے ہیں۔ یہی تو رشوت ستانی کی اصلی جڑ ہے۔ بدمعاش کس طرح جھک کر سلام کر رہا ہے..... جیسے وہ خود کوئی تنخواہ ہی نہیں لیتا...... بچ گیا شیطان، اگر منہ سے کچھ مانگتا تو ضرور رپورٹ ہو جاتی.......

رومیش گھر پہنچا تو اس نے سوچا کہ آج اس کی کوٹھی کچھ خالی خالی سی نظر آتی ہے — فرنیچر وہی تھا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ وہی کمرے تھے، وہی خوشنما احمری پردے جنہیں دیکھ کر وہ اپنے گھر کی نفاست پر ناز کیا کرتا تھا — پھر بھی آج وہاں ایک خلا سا تھا، ایک بے رونق پھیکا سا خلا — جس طرح کوئی ضروری چیز کھو گئی ہو۔ رومیش ایک صوفے سے اٹھ کر دوسرے پر جا بیٹھا! وہاں سے کرسی پر آ گیا، پھر میز پر! پھر دیوار کے سہارے لگ کر کھڑا ہو گیا — لیکن اس کی بے چینی بڑھتی گئی۔ کیوں نہیں کوئی اس کے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھتا! جس کے نقرئی قہقہے اس کمرے کی بے معنی خاموشی میں چاندی کی گھنٹیوں کی طرح بجنے لگیں.....! جو ندی کی لہروں کی طرح مچل مچل کر بھاگے...... اور رومیش اپنی جیب سے نوٹوں کے پلندے نکال نکال کر اس کے منہ پر مارتا جائے...... سارے کمرے میں نوٹ ہی نوٹ بکھرے ہوئے ہوں...

"بابو جی، یہ خط بیرنگ ہے۔ ڈاکیہ ایک آنہ مانگتا ہے —" رومیش کے نوکر نے ایک بوجھل سا خط لا کر دیا۔

خط پر دو آنے کا ٹکٹ تھا۔ اور لفافہ خوب بھاری تھا۔ پتہ رومیش کے والد کا لکھا ہوا معلوم ہوتا تھا — اونہہ! رومیش نے سوچا — اب شاید پتاجی یہ خیال کرتے ہوں گے کہ بیٹا کمانے لگ گیا ہے۔ خط لکھنے پر وہ اکیلے ہی کیوں پیسے خرچ کریں! رومیش کو بھی برابر کا حصہ دار ہونا چاہئے! اور پھر انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ بے چارا نیا نیا ملازم ہوا ہے۔ اُسے اتنے لمبے چوڑے خط پڑھنے کی فرصت کہاں ہے! لیکن ان کی بلا سے.....

رومیش نے اپنا سگار سلگایا، اور لمبے لمبے کش لگا کر لفافہ کھولا۔ اس میں بہت سے خط تھے، اور مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے تھے — یہ خوب! رومیش نے دل ہی دل میں کہا — اب تو گھر کا گھر خط لکھنے کا شوقین بن گیا ہے.......

پہلا کاغذ رومیش کے پتا کا تھا۔ کوئی خاص بات نہ تھی۔ وہی پرانی باسی باتیں — "صحت کا خوب خیال رکھنا۔ ہر روز صبح اٹھ کر نہایا کرو...... شام کے وقت لمبی سیر کرنا چاہئے......" جیسے یہ باتیں کوئی اور جانتا ہی نہیں!

دوسرا خط ماتاجی کا لکھا ہوا تھا — "پرماتما نے کن کن مرادوں کے بعد یہ دن دکھایا ہے — بیٹا، اب تمہیں پہلی تنخواہ ملے گی۔ ایشور تمہیں دن دگنی رات چوگنی ترقی دے — لیکن سب سے پہلا کام یہ کرنا کہ دس روپے شوجی مہاراج کے مندر میں چڑھانا...... محلے کے دو چار یتیم بچوں کو کپڑے بنوا دینا...... تین برہمنوں کو بھوجن کرانا......" اور اس مہینے تو نہیں، لیکن اگلے مہینے میں ضرور اپنے بیٹے کے پاس آؤں گی۔ اور اس کے گھر پر رہوں گی! پرماتما کا کتنا شکر...... "ماتاجی کیا دقیانوسی باتیں کر رہی ہے! مندر میں روپے چڑھانا — تاکہ وہ کاہل، پھولے ہوئے پنڈت بیٹھے بٹھائے گلچھرے اڑائیں، اور برہمنوں کو خیرات دینا! ماتا کو کیا معلوم کہ ابھی کل ہی رومیش نے انسدادِ گداگری کے جلسے میں صدارتی فرائض انجام دیئے تھے —

اُف! دنیا بھر کے بکھیڑے اور فقط چار سو ..... ایک آنہ کم چار سو روپے تنخواہ ..... تو خیر ہوئی کہ خزانے کا چپراسی کچھ جھکی گیا ورنہ ایک چونی اور نکل جاتی ___ اور پھر ماتا جی خود بھی آنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ جیسے انہیں وہاں بے حد تکلیف ہے! خواہ مخواہ ایک کمرے کا فرنیچر درہم برہم کرنا ہو گا کہ ان کی سندھیا کے لئے جگہ نکل آئے ___ اور پھر وہ انڈے اور ایک گوشت پر کس قدر ناک بھوں چڑھائیں گی ___ اور انہیں میز کرسی پر کانٹا چھری سے کھانا بھی نہ آئے گا ___ اور پھر وہ اپنی سیاہ کنارے والی سفید دھوتی پہننے پر اصرار کریں گی ___ اور اس روشنی اور تہذیب کے زمانے میں ایسی پرانی اور دقیانوسی باتیں .....

تیسرا خط شانتا کی طرف سے تھا ..... "بھیا کہیں ہماری چیزیں نہ بھول جانا ___ پتا جی نے مجھے بہت سے جمپر لا دئیے ہیں۔ اب آپ کے بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ وہ سبز ساٹن بہت جلد بھیج دینا اور قمیص کے لئے جارجٹ کا رنگ بسنتی کی بجائے گلابی ہو تو اچھا ہے۔ اب جبکہ ہیروں کی فرمائشیں دور ہو گئی ہیں، آپ ان کے بدلے مرکو لیدر کا ایک اچھا سا ہینڈ بیگ بھیج دیں ..... اور آج کل میری ایک سہیلی مجھ سے ملنے آئی ہوئی ہے ___ آپ کو شاید چمپا یاد ہو گی، کانپور کے رائے صاحب گلاب کی بیٹی۔ جس کے ساتھ ہم بچپن میں کھیلا کرتے تھے ..... اب تو وہ بڑی ہو گئی ہے، اور اس سال ایف۔ اے کا امتحان دیا ہے۔ اگر آپ کوئی اچھی سی چیز اس کے لئے بھی بھیج دیں تو وہ بہت خوش ہو گی ....."

شانتا اور اس کی فرمائشیں! رمیش نے سوچا وہ روز بروز کس قدر آزاد خیال ہوتی جا رہی ہے ___ جب دیکھو بناؤ سنگار کا بھوت سر پر سوار ہے نہ معلوم یہ نئی روشنی کی تہذیب اور کیا کیا سکھائے گی ___ ساڑھی، جمپر، جارجٹ، مراکو لیدر کا ہینڈ بیگ ___ کم بخت، ماتا جی کی مثال سے بھی کوئی سبق نہیں سیکھتی، وہ اپنی سادگی میں کس قدر خوش ہیں، اور ان کی زندگی کس اطمینان سے گذر رہی ہے ..... اور دوسری طرف چمپا نے ایف۔ اے کا امتحان بھی دے دیا۔ اور ابھی انٹرنس میں تھی ہوئی ہے۔ ..... چمپا بچپن میں کس قدر شوخ ہوا کرتی تھی ___ اب اس نے ایف اے کا امتحان بھی دے دیا ہے چمپا ___! نام کچھ کچھ چمپیلی کے وزن پر ہے ___ یعنی کلیاں کھلی ہوئی کلیاں ___!! اب اسے کیا تحفہ بھیجنا چاہئے ___ شاید وہ سنگار دان ..... لیکن اس کی قیمت صرف آٹھ روپے ہے۔ کچھ اور چاہئے ..... کچھ ......

رمیش نے چوتھا کاغذ نکالا تو اسے دستخط پہچاننے میں کچھ دقت ہوئی تھی بملا نے اپنی زندگی کا پہلا خط لکھا تھا۔ عبارت میں ہی بچپن کی معصومیت جھلک رہی تھی اور طرز بیان وہ حکیمانہ انداز لئے ہوئے تھا۔ جو ایک ننھی بہن بڑے بھائی سے برتا کرتی ہے ___ بملا کی فرمائشیں کچھ بہت بڑی نہ تھیں ___ وہ پہلی تنخواہ کی اہمیت کو نہ سمجھتی تھی۔ اس لئے مندر کا چڑھاوا اور یتیموں کے کپڑے اس کے لئے کچھ معنی نہ رکھتے تھے۔ اور عمر کے سات سالوں نے ابھی اسے ساڑھی، جمپر اور مراکو لیدر کے ہینڈ بیگ کی کشش سے بھی آگاہ نہ کیا تھا ___ اسے انگریزی کا نیا قاعدہ چاہئے تھا، ایک اچھا سا جزدان، سبز رنگ کے چمکدار بوٹ، کچھ مٹھائیاں اور یہاں آ کر اس کی ضروریات کا تخیل ختم ہو جاتا تھا!

رمیش پر ایک وجدانی سرور سا چھا گیا۔ اس کے دل میں پیار کی ہلکی ہلکی گدگدیاں ہونے لگیں۔ بملا نے کس محنت سے یہ خط لکھا ہو گا۔ لکھتے وقت وہ زبان ہونٹوں میں دبا کر کاغذ پر جھکی ہوئی اور پھر اپنے ننھے ننھے ہاتھ سے قلم کو اس خوبصورتی سے گھماتی ہو گی جیسے ایک باکمال مصور اپنا رنگین نقشہ بنا رہا ہو ....!

انگریزی کا قاعدہ، اچھا سا جزدان، سبز رنگ کے چمکدار بوٹ، کچھ مٹھائیاں ...... اور رمیش دل ہی دل میں ان ننھی ننھی فرمائشوں پر مسکرا رہا تھا ___ ننھی بملا کا تخیل صرف اپنی ذات کے گرد منڈلاتا ہے! ماتا جی یہاں آنے کا ارادہ کر رہی ہیں ___ لیکن کیا اچھا ہو اگر ان کی بجائے چمپا ..... یعنی شانتا اور چمپا دونوں آ جائیں۔ اور پھر وہ کسی گہری سوچ میں چلا گیا ___

تین سو ننانوے روپے پندرہ آنے مہینہ بھر کا خرچ ___ ننھی بملا کی فرمائشیں بھی کتنی ننھی ننھی ہیں ..... لیکن بچوں کی تربیت میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ انہیں ہوش سنبھالتے ہی دوسروں سے مانگنا سکھایا جاتا ہے ...

رمیش نے ایک بار پھر اپنے خالی خالی سے کمرے پر نگاہ ڈالی۔ اور وہ خلا جو آج پہلی بار وہاں پیدا ہو گیا تھا۔ اسے اور بھی بے تاب کرنے لگا۔ وہ بدمزگی کے عالم میں کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلتا رہا اور پھر کمرے کی جنوبی کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو گیا ___ سامنے پٹیل صاحب کی کوٹھی تھی۔ باغیچے میں رنگ رنگ کے پھول لہلہا رہے تھے۔ اور کملا حسب معمول مالی کی قینچی ہاتھ میں لئے پودوں کی قطع و برید میں مصروف تھی۔ اس پاکیزہ ماحول میں کملا بھی دوسرے پھولوں کی طرح ایک ہنستا ہوا پھول تھی ___ معصوم اور چنچل ___ اور

عمر کے پہلے دس سالوں نے ہی اُسے ایک مشتاق مالن کی طرح پھولوں اور پتوں کا ماہر بنا دیا تھا۔ رومیش بابو کو کھڑکی میں دیکھ کر اس نے اپنا سفید رومال ہوا میں لہرایا اور معصومیت میں ڈوبی ہوئی ایک دو مسکراہٹیں بکھیر کر اپنے کام میں لگ گئی ——— رومیش کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار کوٹ کی جیب کی طرف اٹھا اور نوٹوں کے پلندے کے پاس جا کر رک گیا ——— اوہ! اُس نے سوچا، کملا ایک ہی دن میں کس قدر بدل گئی ہے! سچ مچ، یہ لڑکیاں کس قدر جلد بڑھ جاتی ہیں ——— اور کیا آج وہ میرے پاس سنگترے کے بیج مانگنے نہ آئے گی!......

رومیش کے دل میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ وہ اپنے اس ویران گھر سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس بے کیف چار دیواری میں اس کی طبیعت بالکل اچاٹ ہو گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی کچہری کے کمرے میں چلا جائے اور عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر مقدموں اور فیصلوں میں کھو جائے۔ شاید آج پھر وہاں وہی بڑھیا آئے جس کا بیٹا چوری کے الزام میں حوالات میں بند تھا اور شاید اس کے ساتھ اس کی بہو بھی ہو ——— وہ نوجوان، شرمائی ہوئی، غمدیدہ لڑکی جو اُس روز تن تنہا رومیش کی کوٹھی پر اپنے پتی کو چھڑانے آئی تھی۔ اور جس نے سب طرف سے مایوس ہو کر اپنا گھونگھٹ اُلٹ دیا تھا اور اپنا چاند سا چہرہ اور کنول سی آنکھیں دکھا کر ہچکچاتی ہوئی بولی تھی ——— "سرکار آپ مجھ سے قیمت لے لیں ——— لیکن انہیں چھوڑ دیں ———" لیکن آہ، بے وقوف رومیش! آج سے چند روز پہلے وہ ایک جذباتی گدھا تھا ——— انصاف! اصول! سچائی! ——— یہ دنیاوی ڈھونگ آخر اس کے کس کام آئے تھے، یہی نا، کہ اس روز ایک خوبصورت، جوان لڑکی مایوس ہو کر لوٹ گئی، اور اُس کا خاوند جیل بھیج دیا گیا ———، اور پھر ایک بار جب وہ دورے پر گیا تھا تو سادھو پور کا نمبردار رات کے وقت اس کے کیمپ میں آیا اور جب وہ ہاتھ ملتا ہوا رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا ـــ "حضور، رات کے لئے کوئی ......" تو اُسے سختی سے جھڑک دیا گیا ـــ اور رومیش ساری رات ایک ذہنی کرب میں تلملاتا رہا ——— اونہہ! اخلاق! اصول! دنیا میں کیا کیا ڈھونگ ....

رومیش نے بے تاب ہو کر کھڑکی بند کر دی ——— اور اپنے کمرے کی بے کیف خاموشی سے ڈر کر باغیچے میں آ گیا ـــ سامنے مالن مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ اس کی سیاہ رنگت میں پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

اور وہ اپنے موٹے موٹے، بدنما، ہونٹ ہلا کر مرغیوں سے کچھ مبہم سی باتیں کر رہی تھی ـــ رومیش ذرا زور سے کھانسا۔ اور نوٹوں کا پلندہ جیب سے نکال کر ہوا میں اچھالنے لگا۔ مالن نے نظر اٹھا کر غور سے دیکھا، پھر جھک کر سلام کیا، اور مرغیوں کو اپنے آگے لگا کر وہاں سے چلی گئی۔

..... غوں ..... غوں ..... تماں ...... ، مالن مرغیوں سے اسی طرح پیار کرتی جا رہی تھی ـــ جیسے کچھ بھی نہیں ہوا....

آہ! کوئی بھی نہیں ...... رومیش نے سوچا۔ اس مطلب پرست دنیا میں آج کوئی بھی نہیں جو اپنا مطلب نکالنا چاہتا ہو....... اور پھر اس نے اپنا سارا زور لگا کر نوکر کو پکارا۔ اور اُسے دس روپے کا نوٹ دے کر کہا ـــ "چندو، ایک بوتل سولن وسکی ...... انگریزی شراب کی دوکان سے......"

چندر اچھل کر ایک طرف ہو گیا، جیسے اسے بچھو نے ڈس لیا ہو ـــ اور فرطِ حیرت سے اس کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں ـ

"تم جانے کیوں نہیں!" رومیش کڑک کر بولا ـــ "میری طرف کیوں گھور رہے ہو...... حرامزادے ......"

. . . .

..... صبح صادق کے جھٹپٹے میں چندو نے اٹھ کر باورچی کی حجامت کے لئے پانی گرم ہونے کے لئے رکھ دیا اور خود دیوار سے پیٹھ لگا کر کسی گہری سوچ کی اونگھ میں چلا گیا...... رومیش ایک صوفے پر اوندھا پڑا تھا۔ سامنے تپائی پر "سولن وسکی" کی خالی بوتل تھی ـــ اور احمری پردوں سے چھن چھن کر آنے والی چند مدھم سی شعاعیں کمرے میں تھرتھرا رہی تھیں ـــ ننھی بملا کا خط صوفے کے پاس گرا پڑا تھا۔ اور اس کے نزدیک رومیش کی پہلی تنخواہ ......

قدرت اللہ شہاب

آئی سی ایس



شکاری

جبیں پہ ایک موجِ رنگ و نور سی لئے ہوئے
شراب سی پئے ہوئے
درِ بہشت مست انکھڑیوں میں وا کئے ہوئے
مرے خدا یہ کون ہے!

قدم قدم پہ ایک فتنہ ساجگا رہی ہے وہ
کچھ ایسے آ رہی ہے وہ
بلند و پست پر نشہ سا بن کے چھا رہی ہے وہ
میرے خدا یہ کون ہے!

لبوں میں ایک کپکپی سی وقفِ پیچ و تاب ہے،
نگاہ محوِ خواب ہے،
یہ عکسِ ماہتاب ہے کہ روحِ آفتاب ہے،
میرے خدا یہ کون ہے!

وہ مجھ کو دیکھتے ہی اپنے راستے سے ہٹ گئی،
دبک کے یوں سرک گئی،
کہ جیسے ناگن اٹھی اور گھاس میں لپک گئی
میرے خدا یہ کون ہے!

مجھے قریب دیکھ کر کچھ اس طرح لجا گئی
کچھ ایسے پیچ کھا گئی
کہ ساری کائنات پر رَدائے خواب چھا گئی
میرے خدا یہ کون ہے!

وہ تیز تیز جا رہی ہے بادلوں کی چھاؤں میں
وہ سامنے کے گاؤں میں
مگر یہ بیڑیاں سی کیوں پڑی ہیں میرے پاؤں میں
میرے خدا یہ کون ہے!

وہ اُس کی میلی اوڑھنی، یہ میرا اُجلا پیرہن
یہ پیرہن کا بانکپن
مگر میرے لباس پر ہیں اُس کے ناز خندہ زن
میرے خدا یہ کون ہے!

بس اب اِسی جگہ پر ایک جھونپڑا بناؤں گا۔
اسی کے گیت گاؤں گا
کبھی تو اُس کو اپنے جذبِ دل سے کھینچ لاؤں گا
مگر بتا وہ کون ہے!

احمد ندیم قاسمی

مومن کی نزاکتِ تخیّل

اس کے قبل کہ ہم مومن کی نزاکتِ تخیّل کے نمونے پیش کریں اور ان خیالات کی رونمائی کریں جو ان کی شاعری میں ان کے قلم سے جلوہ گر ہوئے اور جن سے انہوں نے اردو ادب کو مانوس کیا اس سے بحث کرنا لازمی ہے کہ مومن کی شاعری میں نزاکتِ تخیّل کے کیا معنی ہیں۔

مومن کا تخیل اس تخیل سے مختلف ہے جو مرزا غالب کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔ ان میں غالب کی رفعت و پرواز عنقا ہے۔ مومن کسی اچھوتے خیال یا نئے مسئلے کو ادا نہیں کرتے ان کے تخیّل کی کارفرمائی خیالات کے جدید پہلو تلاش کرنے تک محدود ہے۔

مومن میں غالب کا تخیل نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے طبعی رجحان، انفرادی صلاحیت، شخصی ماحول اور ذاتی حالات بالکل مختلف تھے۔

اس زمانے کی مختلف تحریکات خصوصاً مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل کی تحریکِ اصلاح پر، جسے سرسید نے لوتھر کی تحریک ریفارمیشن (REFORMATION) کے مشابہ قرار دیا ہے اور جو تقلید کی مخالفت میں تھی۔ نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ غالب اور مومن نے اس سے کیا ذہنی اثرات قبول کئے تو ان کی افتادِ طبع اور انفرادی صلاحیت ظاہر ہوتی ہے۔

غالب مولوی فضل حق خیرآبادی کے جو مقلدین کے سرگروہ تھے اگرچہ دوست تھے اور ان کے اصرار پر ایک فارسی مثنوی نظریہ امتناع خاتم النبیین کے موضوع پر لکھی لیکن جیسا کہ حالی نے "یادگارِ غالب" میں لکھا ہے۔ ان کا اپنا نقطۂ نظر شاہ اسمٰعیل سے ملتا تھا اور وہ اُس وقت کے روایات اور معتقدات کی تقلید سے بالطبع آزاد تھے۔

مومن اگرچہ مولانا سید احمد بریلوی کے، جو اس تحریک کے بانی تھے، مرید تھے اور اپنے دیوان کا آغاز بھی ان کی تعریف سے کیا ہے لیکن پھر بھی معتقدات اور سمیات کے قائل اور عامل تھے۔

شاعری میں غالب کا طبعی رجحان تحلیل و تجزیہ کی طرف تھا جس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہم غالب کی شاعری کے ابتدائی دور میں بھی پاتے ہیں طبیعت کا یہی رجحان ان کو بیدل کی طرف کھینچ کر لے گیا، مومن زمانے کے معتقدات کے ساتھ شاعری کے معتقدات کو بھی ملحوظ رکھتے تھے۔ اس لئے ابتداً نصیر ۔۔ جن کو صاحب شعر الہند نے بجا طور پر "دہلی کا ناسخ" کہا ہے، شاگرد ہوئے اور ایہام گوئی اور رعایت لفظی کو معراجِ سخن قرار دیا، کچھ دنوں بعد جب انہوں نے اپنا رنگ بدلا تو بقول عبدالسلام ندوی "ان کی عاشق مزاجی نے ان کو جرأت کی طرف مائل کیا لیکن انہوں نے اس میں بھی دلی کی شان کو قائم رکھا اور نہایت متانت و تہذیب کے ساتھ عشق و ہوس کے جذبات ادا کئے۔"

پھر ان لوگوں کی عام زندگی ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ تھی، جن خارجی اور مالی مصائب سے غالب کو سابقہ رہا، مومن ان کا شکار نہ ہوئے۔ غالب کا لکھنؤ اور کلکتہ کا سفر مصائب پر مبنی تھا، مومن سہسوان، رام پور، بریلی، اور سہارن پور میں عشق کی سلسلہ جنبانی کرتے پھرے۔ سفر کے تجربات کا ذہنی اثر دونوں پر مختلف ہوا،

ان اسباب کو جب مدِنظر رکھا جائے تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ غالب اور مومن کا تخیّل کیوں مختلف ہے، غالب نے تقلید کو کیوں برا سمجھا، فلسفہ الہیات اور تصوف کو شعر میں کیوں جگہ دی، اپنے شاعرانہ مسلک کو کیوں حقیقت یا انسانیت کی ترجمانی قرار دیا اور اتنا متنوع زاویۂ نگاہ کیوں اختیار کیا۔ برخلاف اس کے مومن نے تقلید کو کیوں برا نہ جانا، حیات و کائنات کی وسیع فضا کو شاعری میں کیوں

جگہ نہ دی اور اپنے شاعرانہ نقطۂ نظر کو غزل میں حسن محبت اور رقابت تک کیوں محدود رکھا۔ بہرکیف یہ جو کچھ لکھا گیا مومن کی شاعری میں تخیل کا مفہوم واضح کرنے کے لئے تھا۔

مومن کا تخیل موضوعات شعری کے لحاظ سے حسن و عاشقی کے دائرے میں محدود ہے۔ اب مومن کے تخیل کی نزاکت کو بھی سمجھ لینا چاہئے۔

مومن کے تخیل کی نزاکت غالب کی غامض نظری سے مختلف ہے مومن ایک عشقیہ خیال کو لیتے ہیں اور نہایت کاوش دماغی سے اس میں نیا پہلو پیدا کرتے ہیں۔ اس تخیلی اجتہاد میں مومن حقیقت یا واقفیت کے مقابل نزاکت کو زیادہ مدنظر رکھتے ہیں۔ مومن کی یہی خصوصیت ہے جسے ناقدین نے نزاکتِ تخیل سے موسوم کیا ہے۔

اب دیکھنا چاہئے کہ مومن نے نزاکت تخیل سے کام لے کر کیا کیا نئے پہلو عشقیہ خیالات کے ادا کئے ہیں اور ان جدید پہلوؤں سے ہم کو آشنا کرنے کے لئے کیا کیا ذرائع استعمال کئے ہیں۔

خیال کے نئے پہلو تلاش کرنے میں مومن نے حسن استدلال سے کام لیا ہے۔ وہ ایک قسم کا منطقی مغالطہ کہا جا سکتا ہے یا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی بنیاد خطابیات (Rhetoric) پر ہے لیکن تخیل کے اس عمل سے مومن اس کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ سامع اس کی صحت و غلطی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ اس کی جدت اور دلفریبی میں مسحور ہو جاتا ہے ؎

یہ عذر امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا ¦ میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے ¦ اس کا نہ دیکھنا نگہہ التفات ہے

پھرتے سے شام وعدہ تھکے یہ کہ سو رہے ¦ آرام شکوۂ ستم اضطراب تھا

ان اشعار میں عاشق کے بے تاب ہو کر محفل محبوب میں جانے کو جذبۂ دل کی کمی، محبوب کے نہ دیکھنے کو نگہہ التفات، اور شام وعدہ اپنے تھک کر سو رہنے کو شکوۂ ستم اضطراب قرار دینا مومن کی نزاکت تخیل کا وہ پہلو ہے جس میں شاعرانہ منطق کی سحر آفرینی شامل ہے۔

لیکن ان جدید پہلوؤں کو مومن نے عمداً ان تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحوں کے ذریعے پیش کیا ہے جن سے ہم مانوس ہو چکے ہیں اور اس طرح شاعر نے ہم کو اپنے تخیل کی جدت طرازیوں سے غیر محسوس طور پر آشنا کر دیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ نئے جرعے ان شیشوں میں بھر دئیے گئے ہیں جو ہماری نگاہوں میں بسے ہوئے ہیں۔

تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحوں کا کام کلام میں بلاغت اور اختصار پیدا کرنے کے علاوہ یہ بھی ہے کہ وہ جدید خیالات بآسانی ہمارے ذہن نشین کر سکتی ہیں اور پھر جبکہ ہم ان سے مانوس ہوں تو یہ اثر آفرینی یقینی ہے۔

آوارگی ہے باعثِ نشو و نما کہ دیکھ ¦ سرسبز جب ہوئی کہ پھری دربدر بسنت

آوارگی کو باعثِ نشو و نما قرار دینا مومن کی جدت تخیل کو ظاہر کرتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں جو تمثیل دی گئی ہے اس سے ہم اتنے مانوس ہیں کہ خیال سے کوئی بیگانگی محسوس نہیں ہوتی۔

آہ سحر، فلک سے ہماری پھری ہو ¦ کیسی ہوا چلی یہ کہ جی سنسنا گیا

تمام شعراء نے آہ کو ہوا سے تشبیہہ دی ہے۔ مومن کے اس شعر میں جو رجعتِ آہ کا جدید پہلو ہے وہ آہ اور ہوا کی مانوس تشبیہہ کی وجہ سے بے گانہ نہیں معلوم ہوتا۔

یا اس شعر کو دیکھئے ؎

پھیلی شمیم یار مرے اشکِ سرخ سے ¦ دل کو غضب فشار رہا پیچ و تاب میں

آنسوؤں میں خوشبوئے دوست جدت خیال ہے لیکن دل کا پھول سے استعارہ جدید نہیں۔ اس شعر میں مومن نے جدت خیال کو مانوس استعارہ کے پردے میں پیش کیا ہے۔

یا اس شعر کو لیجئے:۔

ثوابت ہیں سیارِ منزل شرر ¦ مری آہ کرسی نشیں ہو چکی

آہ کے کرسی نشین ہونے کا استعارہ نیا نہیں لیکن جو اثر آہ سے پیدا کیا ہے وہ جدت خیال کا نمونہ ہے۔

اس شعر پر غور کیجئے ؎

آسماں راہ پہ نہیں آتا ¦ دعوئے خضر بے دلیل ہوا

شعر میں خیال کا جدید پہلو موجود ہے لیکن مروجہ تلمیح کی وجہ سے کوئی اجنبیت باقی نہیں۔ مومن شاعری کے عام تخیلات سے تھوڑا سا گریز یا انحراف کر کے بھی مضمون پیدا کرتے ہیں لیکن مضمون میں لطافت کا اس قدر خیال کرتے ہیں کہ اس کے لئے تشبیہہ، استعارہ یا تلمیح کے ذرائع کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ذہن اس کو براہ راست قبول کر لیتا ہے۔

وہ سوختہ جگر ہوں کہ پیمانہ و سبو بنتے نہیں ہیں خاک سے میری مگر چراغ

عام طور پر فارسی اور اردو شعرا نے اپنی خاک سے جام تیار کئے ہیں۔ مومن کا خاک سے چراغ تیار کرنا ایک لطیف تخیل ہے۔ یا ؎

بجلی گری فغاں سے مری آسمان پر جو حادثہ کبھی نہ ہوا تھا سو اب ہوا

بجلی زمین پر گرتی ہے مومن نے آسمان پر گرائی ہے۔

کہاں ہے تاب ناز برق اے کاش جلا دے آتش گل آشیاں کو

عموماً آشیاں جلانے کے لئے شعرا نے بجلیوں کی خوشامد کی ہے یا کبھی گل کے رنگ کو آگ سے تشبیہہ دی ہے لیکن اس آگ سے آشیان کو جلانے کی خواہش مومن نے کی ہے۔

موجودہ دور میں فانی نے اس خیال کو دہرایا ہے۔

بھڑک کے شعلۂ گل تو ہی اب لگا دے آگ
کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا فانی

مومن کی جدید تراکیب میں عرفی کی شگفتگی پائی جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض تراکیب بقول مولانا محمد حسین آزاد اردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں تاہم مجموعی حیثیت سے یہ تراکیب نہایت اعلیٰ شگفتہ اور پر معنی ہیں۔ ان ترکیبوں کو توسیع زبان کی طرف ایک مبارک اقدام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اجل، چارہ، رقیب آفرینی، بیگانہ آشنا، پامال سر، آہوئے نیم خواب، جانِ غم مانوس وغیرہ مومن نے جدید پہلوؤں کو ان جدید تراکیب میں بھی ملبوس کیا ہے جن کی شگفتگی اور موزونیت ہم کو خیال کی اجنبیت محسوس نہیں ہونے دیتی۔

قلق کشتہ سخت جانی ہے پھر امید اجل آفریں ہو چکی
کثرتِ سجدہ سے وہ نقش قدم کہیں پامال سر نہ ہو جائے

یا ؎

شاید کبھی وہ میکش بدمست منہ لگائے خاک اپنی کاش درد تہ خم نشستہ ہو

مومن کوئی فرسودہ خیال پیش کرتے ہیں تو بیان کا طرز اس کو تازہ بنا دیتا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے کوئی بات نئی کہی۔

مومن کی شاعری میں بیان کی اہمیت بھی بہت واضح ہے، ہجر، وصل عشق اور حسن کے موضوعات کے لئے جیسے اسالیب بیان مومن نے اختیار کئے ہیں کم شعرا کے ہاں اتنی مثالیں ملیں گی۔ انداز بیان کا یہ تنوع دراصل ان کی نزاکت تخیل کا معجزہ ہے۔

مومن پرانے اور فرسودہ خیالات کو اپنے بیان کے ذریعے نہایت کامیابی کے ساتھ نیا روپ دے دیتے ہیں۔ ان کے ادائے بیان میں الفاظ کا کوئی نہ کوئی پیچ (Twist) پایا جاتا ہے۔ مضمون کو نیا بنانے کے لئے وہ کبھی حذف، کبھی تضاد اور کبھی طنز کا حربہ استعمال کرتے ہیں۔

مومن اکثر اوقات مضمون کے اجزا چھوڑ جاتے ہیں جس سے خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ اجزا ایسے ہوتے ہیں کہ سننے والے کا ذہن خود بخود ان کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ مثلاً

جیب درست لائق لطف و کرم نہیں ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں

اس شعر میں یہ ٹکڑا کہ ناصح ایسا کہتا ہے بالکل محذوف ہے۔

یا مومن مضمون میں ایک مقدمے کو مسلم مان لیتے ہیں اور اس کو شعر میں حذف کر دیتے ہیں مثلاً

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

آشیاں کی بربادی کو لازمی و یقینی تسلیم کر کے بیان میں نظر انداز کر دیا ہے۔ یا ؎

وصل میں احتمال شادی مرگ چارہ گر درد لا دوا ہے عشق

ظاہر ہے کہ عشق کی زندگی دو حال سے خالی نہ ہوگی یا وصل ہوگا یا ہجر۔ ہجر میں جان جانے کو مومن نے مسلمہ امر سمجھ کر حذف کر دیا ہے۔ صرف وہ مقدمہ جس میں اختلاف کا احتمال ہو سکتا ہے۔ اس کو بیان کر دیا ہے۔ اور اس سے نتیجہ بھی قریب کر دیا ہے کہ عشق درد لا دوا ہے۔

مومن نے اپنے اشعار میں تضاد کا استعمال بھی بہت جگہ کیا ہے شعر میں اضداد کو بیان کرنے کی خصوصیت مومن میں بدرجہ اتم موجود ہے

کیا سنتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

اس شعر میں مرنے کے لفظ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

اس قسم کے اور شعر دیکھئے

زندگی ہجر بھی اک موت تھی مرگ نے کیا کار مسیحا کیا

یا ؎ بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

یا ؎ تیرے پڑنے کی بے پردہ رہی تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

اکثر مومن اپنے مطلب کو اس طرح ادا کرتے ہیں کہ مخاطب اس میں اپنا فائدہ تصور کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہنا ہے کہ دشمن کی طرف نہ دیکھو تو

اس کے لئے یہ انداز اختیار کرتے ہیں۔

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا   جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

محبوب پر ثابت کیا ہے کہ تمہارے نہ دیکھنے سے دشمن کا فائدہ ہے حالانکہ فائدہ اپنا مقصود ہے۔

سرمگیں آنکھ سے تم نامہ لگاتے کیوں ہو   خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو

محبوب کو اور کس طرح رقیب کے خط کی تکریم کرنے سے روکا جاسکتا ہے۔ یا سد

خواہشِ مرگ ہو اتنا نہ ستانا ہرگز   دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

اس شعر میں دبی زبان سے شکوۂ جور بھی ہے اور تقاضائے کرم بھی لیکن فائدہ اس کا ظاہر ہو رہا ہے۔

ان اشعار کو دیکھئے۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا   میری طرف بھی دیدۂ غماز دیکھنا

گر ذکرِ وفا سے یہی نفرت ہے تو اب بھی   گو قتل کا وعدہ ہو تقاضا نہ کریں گے

وہ بدخواہ مجھ سا تو میرا نہیں   عبث دوستی تم کو دشمن سے ہے

سب میں وہی بات نمایاں ہے۔

مومن نے بعض فرسودہ خیالات کو طنزیہ پیرائے میں ادا کر کے دوبارہ جان ڈال دی ہے۔ ادبیات میں طنز کی ایک خاص اہمیت ہے۔ طنز کے لئے ایک خاص طور کی ذہنیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نثر میں طنز اتنا مشکل نہیں جتنا نظم میں ہے۔ اردو ادب میں طنز سوائے سودا کے کسی کے یہاں مستقل حیثیت نہیں رکھتا۔ مومن کے یہاں اگرچہ اشعار میں طنزیہ پہلو کی کمی نہیں لیکن مومن صحیح معنوں میں طنز نگار نہیں کہے جاسکتے۔ انہوں نے طنز کو ایک پیرایۂ بیان کی حیثیت سے برتا ہے۔ اس کی اصل اہمیت کو کبھی محسوس نہیں کیا

پھر مومن کے اشعار میں جو طنز پایا جاتا ہے وہ طنز کا اعلیٰ معیار بھی نہیں۔ اعلیٰ طنز نگاری میں ظرافت کا شائبہ لازمی ورنہ طنز سطحی ہو کر رہ جاتا ہے۔

بہرحال مومن نے بہت سے پرانے مضامین کو زندہ کرنے کے لئے یہ پیرایۂ بیان بھی اختیار کیا۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے   میں نے ہی تم سے بیوفائی کی

میرے آنسو نہ پونچھنا دیکھو   کہیں دامان تر نہ ہو جائے

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے   تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

ان اشعار میں اگرچہ خیالات پرانے ہیں لیکن ایک زندگی پیدا ہو گئی ہے۔

مومن نے بعض بعض جگہ صحت مقال (Accuracy of statement) سے کام لے کر فرسودہ مضامین میں زور پیدا کر دیا ہے۔ صحتِ مقال کی خصوصیت یہ ہے کہ کوئی ایسا پہلو نکل ہی نہ سکے جو اسے غلط ثابت کر دے۔

درد کا ایک شعر ہے۔

میرے تغیرِ حال پر مت جا   یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے

غور کیجئے وہ کونسی چیز ہے جو شعر کو نشتر بنائے ہوئے ہے۔ وہی صحت مقال ہے جس کو شاعر نے دبی زبان سے "یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے" کہا ہے۔ کون اس قول کی تکذیب کر سکتا ہے۔

شیفتہ کا یہ شعر دیکھئے۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ   اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اس شعر میں آگ کے ساتھ "سی" کا اضافہ کس قدر نزاکت لئے ہوئے ہے۔

مومن لکھتے ہیں ؎

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے   تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

ایسے اشعار جن میں صحت مقال کا خیال رکھا جائے ان میں جتنے لفظی قیود زیادہ ہوتے ہیں۔ معانی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ پہلے مصرعے میں "کچھ خوش نہیں" کا ٹکڑا جذبات کی کس قدر صحیح ترجمانی کر رہا ہے۔ پھر اسی مصرعے میں "بھی" پر غور کیجئے۔ یا یہ شعر لے لیجئے۔

کر دیا خواہشِ بیداد نے احوال تباہ   تو تو ظالم نہیں تم نہار ہیں ہم مظلوم

شاعر محبوب کو ظالم نہیں کہتا لیکن اس کا کیا علاج کہ اس پر ظلم ہوا ہے۔ شاعر کا یہ بیان جس سے انتہائی احتیاط ٹپک رہی ہے اتنے ہی زور کے ساتھ کسی کے ظالم ہونے کی حقیقت کو سامع کے دل پر نقش کر دیتا ہے جس قدر شاعر اپنی مظلومی پر زور دیتا ہے۔

اسی قبیل کے اشعار میں مومن کا وہ مشہور شعر بھی ہے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن نے گویا کا لفظ کہہ کر صحت مقال پیدا کر دی۔ اس شعر میں نفسیات کا ایک گہرا مسئلہ حل ہے۔ حالی نے "یادگار غالب" میں لکھا ہے کہ غالب نے یہ شعر سن کر کہا تھا۔

"کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور یہ شعر مجھے دے دیتا"۔

بیان کے ان اسالیب سے قطع نظر مومن نے جدید تشبیہات کے استعمال سے بھی پامال خیالات کو تازگی دی ہے۔ ان جدید تشبیہات کی روشنی تخیل کی فرسودگی کو چھپا لیتی ہے۔

کس کی زلفوں کا دھیان تھا کہ میں شب — محو دود چراغ خانہ رہا

زلف کو دود چراغ کہنا کئی حیثیتوں سے پر لطف ہے۔ ایک وجہ شبہ حرکت ہے۔ دوسری "سیاہی" اور تیسری "پریشانی"۔ شعر کا مضمون بہت فرسودہ ہے لیکن تشبیہ کی جدت جادو طراز ہے۔

آتش آہ بے اثر سے مری — آسماں گلشن خلیل ہوا

مضمون نیا نہیں لیکن گلشن خلیل کی تشبیہ نے نیا حسن دے دیا ہے

برا ہے عشق کا انجام یارو — بچانا فتنۂ آخر زماں سے

انجام عشق کو فتنۂ آخر زماں سے تشبیہ دے کر مضمون کو نئی روح دی ہے۔

چھوٹنا دام شکستہ سے بھی آساں نہیں — میں گرفتار خم گیسوئے صیاد رہا

مضمون جدید نہیں لیکن خم گیسو کو دام شکستہ سے تشبیہ دینے سے کس قدر جدت پیدا ہو گئی ہے۔

مومن محبوب کی شوخیوں کو ایک جگہ بھڑکتے ہوئے شعلہ سے تشبیہ دیتے ہیں ؎

تم شوخیوں سے شعلۂ بے تاب جستہ ہو

یا محبوب کی آواز کو شعلہ کی چمک سے تشبیہ دیتے ہیں۔

؎ شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

ان اشعار میں تشبیہ کی جدت دیکھئے

تیری پابوسی سے اپنی خاک بھی پابوس ہے — نقش پا پر نقش پا ظالم کف افسوس ہے

ازبسکہ ثبت نامہ ہے سوز تپ دروں — قاصد کا ہاتھ ہے ید بیضا کلیم کا

سوز دل سے گئی جاں بخت چمکنے کے قریب — کرتے ہیں موسم گرما میں سفر آخر شب

اس شعر میں دیکھئے مومن نے ایک بہت فرسودہ خیال کو نئی تمثیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

شبنم خراب مہر و کتاں سینہ چاک ماہ — لو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں

تلمیحات۔ بلاغت میں تشبیہ اور استعارہ سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں ایک مشہور انشاپرداز کا قول ہے کہ تلمیحات وہ لفظی اشارے ہیں جن سے ہم کسی مشہور واقعہ یا حال کا حوالہ دیتے ہیں۔ طویل قصوں اور کہانیوں کے بار بار دہرانے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے اس نے تلمیحات نے بچا دیا ہے۔ بلاغت اور اختصار کے علاوہ ایک بڑا فائدہ تلمیحات کا یہ ہے کہ ان سے بہت سے تاریخی واقعات مذہبی عقاید، اوہام معاشرتی اور تمدنی حالات، رسوم و مشاغل محفوظ ہو جاتے ہیں۔

تلمیحات کے ماخذ تاریخی واقعات۔ مذہبی قصص۔ دینی عقاید اور روایات، معاشی و تمدنی رسوم، مختلف سماجی آداب و اطوار علوم و فنون، عام فرضی قصے اور افسانے ہیں۔ مومن علم احادیث نجوم اور حکمت پر پورا عبور رکھتے تھے۔ انہوں نے بہت سی جدید تلمیحات مذہبی قصص، مذہبی رسوم، آیات، احادیث، نجوم اور حکمت سے اخذ کی ہیں۔ یہ تلمیحات زیادہ تر خاقانی کی تلمیحات کی طرح غیر متعارف ہیں جن کے لئے تفصیل اور لغت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

مومن نے ان جدید تلمیحات سے پرانے خیالات کو نیا لباس دینے میں بڑی مدد لی ہے۔ مومن کی غزل میں مذہب کی عصبیت موجود ہے۔ ان اشعار میں آیات و احادیث کی طرف تلمیحات پائی جاتی ہیں ؎

ڈرتا ہوں اہل نار کی تبدیل جلد سے — مومن غضب ہے آتش لذت فزائے داغ

اس میں آیۂ کریمہ "بَدَّلْنَاهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا" کی طرف اشارہ ہے۔ یا ؎

ساتھ نہ چلنے کا بہانہ تو دیکھ — آکے مری نعش پہ وہ رو گیا

حدیث شریف میں نوحہ کرنے والوں کو مشایعت جنازہ سے منع کرنے کی تاکید کی گئی ہے

ذیل کے اشعار میں مذہبی رسوم و روایات سے تلمیحات اخذ کی گئی ہیں۔

خیالِ خواب راحت ہی علاج اس بدگمانی کا ٭ وہ کافر گور میں مومن کا شانہ ہلاتا ہے

حضرات شیعہ کے ہاں یہ رسم ہے کہ تلقین کے وقت میت کا شانہ ہلاتے ہیں۔ یا ـــ

ہم اور یہ بدعت تپشِ دل کے سبب سے ٭ مومن مرے سینہ پہ رہے بعد فنا ہاتھ

مرنے کے بعد میت کے ہاتھ سیدھے کر دیئے جاتے ہیں سینے پہ رکھنا بدعت ہے۔

اس شعر میں ـــ

ہم بھی تو ناداں ہیں آخر پاس مطلب کے لئے ٭ خضر موسیٰ کو پئے تعلیم دانائی ملا

مذہبی روایات کی طرف اشارہ ہے۔

مومن اپنے وقت کے مشہور حکما میں سے تھے اگر انہوں نے علم حکمت کی اصطلاحات کو بطور تلمیح استعمال کیا تو کوئی حیرت نہ ہونی چاہیئے۔

کابوس ہیں بتاتے مجھے واں تو رشک سے ٭ کاش اور کوئی آئے اطبا کے خواب میں

نجوم میں مومن ماہرِ فن تھے۔ اس کی فنی اصطلاحات سے بھی شاعری میں فائدہ اٹھایا ہے۔

قرانِ انجم سیارہ برج آبی ہیں ٭ ڈبوئے گی مری چشم ستارہ بار مجھے

شاعر نے اپنے اشکوں کو انجم سیارہ کے اور چشم ستارہ بار کو برج آبی کے مماثل قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو جمع ہیں گویا انجم سیارہ کا برج آبی میں قران ہے جو کثرت باراں کی علامت ہے یقین ہے کہ چشم اشکبار مجھے ڈبوئے گی۔ کہا جاتا ہے کہ طوفانِ نوح کے وقت ساتوں سیارے برج سرطان میں جمع تھے۔

صبحدم آنے کو تھا وہ کہ گواہی دے ہے ٭ رجعت قہقری شمس و قمر آخر شب

اصطلاح نجوم میں سیاروں کا اپنی سیر طبعی سے مشرق کے بجائے مغرب کی طرف واپس جانا رجعت کہلاتا ہے۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ آخر حصۂ شب میں شمس و قمر کا، جو رجعت سے مستثنیٰ ہیں الٹے پاؤں پھرنا اور اول حصۂ شب کی طرف واپس جانا اس امر کی دلیل ہے کہ محبوب کا قصد میرے یہاں صبحدم آنے کا تھا۔ ورنہ یہ الٹے پیچ کیوں پڑتے صبح کے بجائے شام کے آثار پیدا ہونا برگشتگی تقدیر کا کرشمہ ہے۔

بعض اشعار میں معاشرتی رسوم سے بھی تلمیحات ملتی ہیں۔

کب تک جلیں یا رب ہجر غیرت مہ میں ٭ صبح اٹھ کے منہ کب تک آفتاب کا دیکھیں

صبح اٹھ کر منہ دیکھنے کا خیال خاص معاشرتی چیز ہے۔

جو قول دے تو رنگ حنا کا شکستہ ہو۔

شرط کے وقت ہاتھ پر ہاتھ مارنے کی رسم کی طرف اشارہ ہے۔

ان تمام اشعار میں اگرچہ تلمیحات کی وجہ سے ایک جدت پیدا ہو گئی ہے لیکن دراصل وہی فرسودہ معاشقانہ مضامین ہیں جو لاکھوں بار دہرائے گئے ہیں۔

اس ضمن میں اُن غزلیات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا جن میں مومن نے واسوخت کا رنگ بھر دیا ہے اور اس طرح خیالات میں نیا پن پیدا کیا ہے

اب اور سے لو لگائیں گے ہم ٭ جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

کیوں نہ خونناب نوشی بادہ خواری آپ کی ٭ کس لئے ہے بیخودی غفلت شعاری آپ کی

یا ـــ توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے

یہ تمام غزلیں اسی رنگ میں ہیں۔

غرض مومن کے کلام میں یہ دونوں رُخ موجود ہیں انہوں نے خیالات کے جدید پہلو تلاش کئے (نزاکتِ تخیل) اور ان کو اس طرح پیش کیا کہ مانوس معلوم ہوں، نیز فرسودہ خیالات کو اس طرح بیان کیا کہ نئے معلوم ہوں (اسلوب بیان)۔ اُن کی نزاکتِ تخیل اور اسلوب بیان، دونوں قابلِ داد و ستائش ہیں۔ مولوی عبدالغفور نساخ نے تو سخن شعرا میں یہاں تک کہہ دیا ہے "راقم کے زعم میں اس مزے کی طبیعت کا کوئی شاعر ریختہ گویوں میں نہیں گذرا"

شیدا اکبوروی

رباعی

جو ظرفِ حقیر ذات پاتا ہوں میں
لبریز مئے حیات پاتا ہوں میں
کیا ایسے میں کائنات کی فکر کروں
ہر ذرے میں کائنات پاتا ہوں میں

حرماں خیرآبادی

بعد کی اُڑان

چُوم ہی لے گا، بڑا آیا کہیں کا ــــ کوّا،
اُڑتے اڑتے بھلا دیکھو تو کہاں آ پہنچا،
کلموا، کالا کلوٹا، کاجل ــــ
میں اگر مرد نہ ہوتا تو یہ کہتا تجھ سے،

دوش پر بکھرے ہوئے ہیں گیسو،
بندی دمدار ستارہ ہے، مگر ساکن ہے،
چلتے چلتے کوئی رُک جائے اچانک جیسے،
غسل خانے میں نظر آیا تھا انگلی پہ مجھے سُرخ نشان،
وہی دمدار ستارے کی نمائش کا پتہ دیتا تھا،
آپ ناپید ہوا ہے مگر اپنے پیچھے
کسی نقشِ کفِ پا کی صُورت
رات کے راستے میں چھوڑ گیا ہے وہ کہانی جس کو
سننے والا یہ کہے گا مجھ سے
گیت میں ایسی لرزتی ہوئی اک تان کی حاجت ہی نہ تھی،

ایسی ہی ایک لرزتی ہوئی تان آئی تھی
جب پھسلتے ہوئے ملبوس لرزتے ہوئے جا پہنچے تھے
فرش پر، ایک مسہری کے کٹہرے پہ ہُوا آویزاں
چھوڑ دو، رہنے دو، اس کو تو یہیں رہنے دو"
نیم وا آنکھوں کو پھر بند کیا تھا اُس نے،
ہاتھ بھی آنکھوں کے پردوں پہ رکھے تھے یک دم،
اور اب ایک ہی پل میں یہ اگر کھل جائیں،
یہی آنکھیں جو مجھے دیکھ نہیں سکتی تھیں،
دیکھتے دیکھیں مجھے، ــــ ہاتھ کہاں رکھیں گی؟
وہیں رکھیں گی، ــــ وہی ایک نشانِ منزل
جس جگہ آ کے ازل اور ابد ایک ہوئے تھے دونوں،
ایک ہی لمحہ بنے تھے مل کر،
اُسی لمحے میں یہ بندی مجھے دُمدار ستارہ سا نظر آئی تھی
رات کے راستے میں چھوڑ گئی تھی وہ کہانی جس کو
سننے والا یہ کہے گا مجھ سے
گیت میں ایسی لرزتی ہوئی اک تان کی حاجت ہی نہ تھی،

اب لرزتے ہوئے ملبوس نظر آتے نہیں ہیں لیکن
اُن کی آنکھوں کو ضرورت بھی نہیں،
وہ تو اک رات کے طوفان کا اعجاز تھا، طوفان ملا،
کیسا طوفان تھا! ــــ اندھا طوفان،
جس کے تھمنے پہ مجھے نوح کی یاد آئی ہے،
اور پھر نوح نے بیٹوں سے کہا
"کھول دو پنجرا، اسے چھوڑ دو، ــــ اس فاختہ کو
جا کے خشکی کا پتہ لے آئے،"
چند ہی لمحوں میں وہ فاختہ لوٹ آئی، مگر ناکامی
اس کی قسمت میں لکھی تھی،
اور پھر کوّے کو چھوڑا، یہی خشکی کا پتہ لائے گا،
اڑتے اُڑتے بھلا دیکھو تو کہاں آ پہنچا،
چُوم ہی لے گا، بڑا آیا کہیں کا کوّا،
کلموا، کالا کلوٹا، کاجل!

میراجی



نہ دن کا آرام

نہ رات کا چین

ہاضمے کی فالتو پیداوار کا مکمل اخراج لازمی ہے۔ شدید اخراج نہیں بلکہ مکمل اخراج چونکہ کروشن سالٹ اندرونی نظام کو نہایت باقاعدہ اور سڑنے والے فالتو مواد سے صاف رکھتا ہے۔ اس لئے یورک ایسڈ جیسی جسمانی زہروں کو بھی جمع ہونے کا موقع نہیں ملتا۔



نقرس کی مریضہ اب تندرست ہو چکی ہے۔ اور ان لوگوں کے فائدے کے لئے جو اس موذی مرض میں گرفتار ہوں لکھتی ہے:۔

پچھلی گرمیوں میں ٹانگ کے درد میں بری طرح مبتلا ہو گئی درد کی شدت کے باعث نہ مجھے دن کو کل پڑتی تھی اور نہ رات کو نیند آتی تھی بہت سی دوائیں استعمال کیں مگر بے کار۔ آخر ایک سہیلی نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کروشن سالٹ کا بھی تجربہ کر دیکھوں۔ وہ خود اسے آزما چکی تھی۔ خوش قسمتی سے میں نے اس کی صلاح مان لی پہلی ہی بوتل سے مجھے نمایاں فائدہ ہوا۔ اب میں اس موذی درد سے بالکل نجات پا چکی ہوں اور رات کو نیند بھر کے سوتی ہوں

ہم میں سے اکثر مرد اور عورتیں جن عجیب سے درد وں کا شکار رہتے ہیں ان میں سے بیشتر کا باعث ایک ہی ہوتا ہے اور وہ قبض ہے

کروشن سالٹ ہر دوا فروش اور سٹور سے مل سکتا ہے

KRUSCHEN SALTS



م ہو جاتی ہیں۔

یہ آدمی ؛ یہ بیل

. . . . اور یہ پرانی شکستہ حال سڑک ہر وقت چلتی رہتی ہے۔ برسوں سے بیاس شہر کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ کئی خوانچے والے اس پر انجنوں کی طرح شنٹ کرتے رہتے ہیں۔ یہ تھکی ہاری مخلوق، گاڑیبان، مزدور، سب سڑک ہی کی طرح شکستہ حال، بھوکے ننگے، گزر رہے ہیں گزرے جاتے ہیں ۔ اِدھر سے اُدھر میری ہی طرح ان سب کے دل و دماغ میں بھی شاید چیونٹیاں سی رینگ رہی ہیں ہنستے بھی ہیں تو ایک مریل سی ہنسی، کھوکھلی اور بے کیف۔ ایک بے قابو مشین کی طرح میرا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ مجھ پر ایک ہزیانی سی کیفیت چھا جاتی ہے۔ اپنا دکھ نہ مجھے سبھی کا دُکھ محسوس ہوتا ہے۔

آج یہ سڑک بہت اُداس ہے۔ راہ گیروں کی بھی بے دلی سے یہ حالت ہے کہ وہ چلتے معلوم نہیں ہوتے۔ بولنا بھی چاہیں تو یہ لوگ کیا بول سکتے ہیں؟ اُف ہے اس احساسِ شکست پر جس کے باعث یہ لوگ یوں چُپ چاپ چلے جاتے ہیں۔ یہ دھندلی دھندلی سی آنکھیں، یہ تھکے تھکے سے پاؤں، عجیب اُلجھنوں میں گرفتار ہیں یہ لوگ کانپتے ہیں، لڑکھڑاتے ہیں جیسے دنیا بھر کا بوجھ بس انہیں کے کمزور کندھوں پر آن پڑا ہے۔ کوئی ان کی چیتھڑا چیتھڑا قسمت میں کچھ پیوند لگا بھی دے تو آخر کتنا فرق پڑ سکتا ہے؟

ارے تو ہے ڈس جائے کالا . . . . . چیں چیں، ریں ریں، قطار کی قطار چھکڑے سے چلے جاتے ہیں۔ گاڑیبانوں کے منہ میں تو زہر بھرا ہے۔ ایک سندر ناگوری یوں دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی عورت رکشا کھینچ رہی ہو۔ میں اس گاڑیبان سے کہنا چاہتا ہوں "بیٹا پھر ناگوری کو گالی دی تو زبان گُدی سے کھینچ لوں گا" مگر میرا کچھ بس نہیں چلتا۔ کوڑا اوپر اُٹھتا ہے، ہوا میں لہراتا ہے اور ناگوری پر برس پڑتا ہے۔ دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے۔ گاڑیبان ایک بے تکا گیت شروع کر دیتا ہے۔ دُھری چیختی ہے۔ یہ چرچر کہاں کا موزوں تال ہے؟ گیت میں بھی تو گاڑیبان کا جی پوری طرح نہیں لگتا۔ گنوار — وحشی کے ہونٹوں پر ایک بدصورت سی مُسکراہٹ دوڑ جاتی ہے۔ ایسے پاپی کی مسکراہٹ بھلا سُندر کیسے ہو سکتی ہے؟

بیل اب بھی بیل ہیں۔ اَن گنت صدیوں کا لمبا سفر طے کرنے کے بعد بھی بیلوں کی حالت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ ہل کے بیل، رہٹ کے بیل، خراس اور کولہو کے بیل، چھکڑے کے بیل — کیا کبھی بیل کی گردن سے جُوا اُتر بھی سکتا ہے؟ میں اس پر غصے سے آگ بگولا ہو جاتا ہوں۔ اپنے ہونٹ کاٹنے لگتا ہوں۔ بیلوں کے چہروں پر وہی پرانی متانت اور بیکسی دیکھ کر میرے جسم کا سارا خون سر کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ شاید میں پاگل ہو جاؤں گا۔ سوچتا ہوں کہ بے چارے بیلوں کے لئے شراب خانہ بھی تو نہیں ہے۔ جہاں وہ تھوڑی سی پی سکیں اور اپنے غم بھول سکیں۔

چھکڑے دور نکل گئے۔ کوئی یہاں کھڑا نہیں ہونا چاہتا۔ میں تول تول کر قدم اُٹھاتا ہوں — جیسے پلکیں آنکھوں کو چھو رہی ہوں بہ ظاہر میں پُرسکوں ہوں لیکن یہ کون جانتا ہے کہ در اصل ایک آتش فشاں پہاڑ ہوں، جانے کب پھٹ پڑوں۔

ہانپتے ہوئے بیل کچھ بول نہیں سکتے۔ آدمی کی گالیاں وہ سمجھتے نہیں۔ تھکے ماندے، روزگار کے ہاتھوں ستائے ہوئے بیلوں کو بھی شاید اپنا دُکھ سبھی کا دُکھ معلوم ہوتا ہے۔

جب سورج نکلتا ہے۔ اِس خستہ حال سڑک کے میلے کچیلے جسم پر سونے کا پانی پھر جاتا ہے۔ اس کے پیوند آتشی زخم معلوم ہوتے ہیں۔ پھر قریب سے دیکھنے سے اس کی رگوں میں کچھ نیا خون دوڑتا نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی صدیوں کی تکلیفیں ختم ہوا چاہتی ہیں۔

نیلے انگریزی سوٹ پہ نام دھاریوں کی سی دستار سجائے ایک سردار صاحب آرہے ہیں۔ پیچھے پیچھے ایک قلی چلا آتا ہے۔ جانے کیا لوہا بھرا ہے بستر میں۔ بے چارا دُہرا ہوا جاتا ہے۔ یہ دریچہ نہ ہو تو سڑک کا یہ نظارہ یہاں بیٹھے بیٹھے کر سکتا ہوں؟

"او بھائی کالا پانی!"

"ہیلو ہیلو۔"

"کب چلے تھے کالے پانی سے؟"

"گذشتہ مہینے کی پندرھویں کو۔ کلکتے میں بہت دن لگ گئے؟"

میرے روکتے روکتے اقبال سنگھ جیب سے چونی نکال کر قلی کی کھردری ہتھیلی پر رکھ دیتا ہے۔ جزیرہ انڈیمان میں اقبال سنگھ سرکاری کلرک ہے اور ہنسی ہنسی میں اُس کا نام کالا پانی پڑ گیا ہے۔ سکول میں تو وہ مریل سا بچھڑا معلوم ہوتا تھا لیکن اب اس کا جسم بھر گیا ہے۔

قلی کہتا ہے "ای تو کھوٹی چونی بھئی۔"

"کھوٹی! بکومت۔"

"ای مور کچھو کام کی ناہیں، سردار جی۔"

"چونی ہے چونی۔ جانے کدھر گئے تھے تلنگے والے؟ کیا نام ہے تیرا؟"

"ترسو ہے مور نام۔ پر ای تو بڑی کھوٹی دِکھتّ ہے، سردار!"

"تیرے باپ کا نام؟ قوم...... ساکن...... تھانہ؟ صاف صاف بتانا!"

"ترسو اب ان سوالوں کا کیا جواب دے؟ اقبال سنگھ چلا کر کہتا ہے "گو اوے یو ڈیم۔"

آدمی نہیں، نرا حیوان ہے۔" یہ کہتے ہوئے اقبال سنگھ میری طرف دیکھ کر مسکراتا ہے۔ اور غسلخانے کو چل دیتا ہے۔ شاید کھوٹی چونی کو چلانے کی ترکیبیں سوچتا ہوا ترسو باہر نکل جاتا ہے۔ میرا ذہن اُس کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتا ہے.....

"چنے چٹ پٹے" دو قدم پر ایک خوانچے والا آواز دیتا ہے۔

"ترسو کہتا ہے "اِدھر دُو دیو۔"

"کتنے کے؟"

"پیسے کے۔ صبح سے گھومت ہوں چل پان بنا۔"

خوانچے والا پتے پر چنے ڈال کر ترسو کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے اور بڑے فخر سے تھال میں چمچہ پھیرتا ہے۔ جیسے کہتا ہو کہ ابھی بکری ہو رہی ہے اور ابھی بہت دیر بھی تو نہیں ہوئی گھر سے نکلے۔

"چٹنی ناہیں؟"

"کاہے ناہیں!"

ترسو کو چٹنی بھی مل جاتی ہے۔ لُبی ہوئی سی ہوگی۔ خوانچے والا ترسو کی آنکھوں میں جھانکتا ہے، جیسے کہہ رہا ہو پورے مائی کے لال ہو بیٹا! پیسے کا پورا پورا حق لینا آتا ہے تمہیں۔

پھٹے پرانے تھیلوں جیسے بادلوں کی طرف دیکھتا ہوا ترسو سوچتا ہے سینکڑوں سکے روز جیبیں بدلتے رہتے ہیں۔ وہ خوانچے والے کو چونی دے کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

"ای تو کھوٹی بھئی۔"

"کھوٹی؟"

"دیکھے ناہیں؟"

"رام رام!..... اِتّا انیائے!"

چونی واپس لے کر ترسو ادھیلا دیتا ہے:

"اِتّا اب، باقی دوسرے سمے بھگوان کی کسم۔"

خوانچے والا ادھیلا لے کر سوچتا ہے کہ بچو نے بھگوان کا آسرا نہ لیا ہوتا تو پورا پیسہ لے کر چھوڑتا۔

سڑک پر دور سے ایک کتا دوڑا آتا ہے۔ پاس آ کر وہ کسی کا جھوٹا پتا چاٹنے لگتا ہے۔ یہ کیا چل پان ہے! جانے کس پھوہڑ کتیا نے جنا ہوگا اِس دُم کٹے کتے کو؟ ایک کتیا پانچ پانچ، سات سات پلّوں کو بلکہ دس بارہ تک کو بھی ایک ہی جھول میں جنم دے دیتی ہے۔ اور وہ بھی پانچ چھ مہینے کے وقفے سے۔ عورت کی طرح نہیں جسے ایک بچے کی ماں بننے کے لئے ایک مدّت درکار ہوتی ہے۔ کتے آوارگی ہی میں پل جاتے ہیں۔ آگے پیچھے کسی نہ کسی طرح اس کتے کی زندگی سرکتی رہتی ہے۔ اِسے اپنی ماں کی پھٹی پھٹی، بے سُری بھوں بھوں کبھی یاد نہ آتی ہوگی۔ اِسے تو ہمیشہ پیٹ کی فکر رہتی ہے۔

میں اقبال سنگھ کو بتاتا ہوں کہ مالک مکان کی بیوی ہمیشہ کرایہ داروں سے جھگڑتی رہتی ہے۔ تین کرایہ دار بسا رکھے ہیں۔ اچھے اچھے کمروں میں اور خود میاں بیوی ایک تنگ سے حصے میں گذارہ کئے جاتے ہیں۔

"تنگ کمروں میں رہنے والوں کا تنگ دل ہونا تو کچھ عجیب نہیں بھئی وہاں انڈیمان میں تو زندگی بہت مزے سے گذرتی ہے۔ بلکہ وہاں تو قیدی تک آزاد ہیں۔ خوب کماتے ہیں۔ خوب کھاتے ہیں اور کھلے مکانوں میں رہتے ہیں لیکن تمہارے مالک مکان کی بیوی جھگڑتی کس بات پر ہے؟"

کہتی ہے پیپ کا ہینڈل دھیرے دھیرے چلاؤ، پیسے خرچ ہوئے ہیں، ڈھبریاں گھسا دوگے، ناس کردو گے۔ اس طرح تو.....

خود بہت پھوہڑ عورت ہے۔ خاوند کی گالیوں سے اپنے دماغ کی ڈھبریوں ہی کو بچا کر رکھا کرے۔"

"بھئی اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ آدمی اپنا مکان بنوائے اور اگر کرائے کے مکان میں رہنے پر مجبور ہو تو کسی ایسی چڑیا سے تنگی عورت کے مکان میں کبھی نہ رہے۔"

"کالے پانی میں تو ایسی عورتیں نہ ہوتی ہوں گی؟"

"ہاں، ہاں، ہاں، کالے پانی میں ایسی عورتیں نہیں ہوتیں۔"

سڑک پر رامو دھوبی کا چھوکرا روئے جاتا ہے۔ ماں دو طمانچے جڑ دیتی ہے۔ دودھ، دودھ، سارا دن ایک ہی رٹ لگائے جاتا ہے۔ باپو تو مرگئے، اب ماں کب تلک بنی رہ سکت ہے دودھیل گئیّا؟"

"ساونی نے چینو کو جنم دیا تھا اقبال، کہ رامو مرگیا۔ اب وہ بدھوا ہے۔"

"زندگی کی کٹھن سڑک پر وہ کب تک تنہا چل سکے گی؟"

"بہت دن تو نہیں چل سکتی۔"

"کسی بھاگوان دلھن کے کپڑے دھوتے ہوئے ایک دن ہاتھ بڑھا کر وہ رامو کی یاد کا پاکیزہ چہرہ نوچ ڈالے گی۔ کوئی چھیل چھبیلا دھوبی اُس کی آنکھوں میں کھُب جائے گا۔"

"کل کا کھُبتا آج ہی کھُب جائے۔ رامو کونسا شریف تھا؟"

"بہت بدمعاش تھا رامو؟"

"اور نہیں تو؟ اور اس پر بھی ساونی کو ہمیشہ اپنی دُبیل سمجھتا رہا۔

اب موت کے بعد بھی وہ اُس کی دھونس سہتی رہے؟ یہ زندگی تو سدا نہیں ملتی ——— ساونی۔"

"بدنامی کا خیال شاید [illegible] خودکشی پر آمادہ کردے۔"

"لیکن نشے میں سب ڈر کافور ہو جاتے ہیں۔ پہلا مہینہ ٹلنے کے بعد ہی وہ اپنے جسم کے اندر کسی نئے چینو کے خواب دیکھنے لگے گی۔"

چینو برابر روئے جاتا ہے۔ میں پکار کر کہتا ہوں "اری لے دے ساونی چینو کو دو گھونٹ دودھ۔"

ساونی قریب آکر کہتی ہے "بابو کون کمائی چھوڑ گیو۔ جیوت میں مورلھو پیوت رہے۔ اب اُس کا للّو مور پران کھائے جات ہے۔"

"اری دو کپڑے اور دھولیجیو۔ ساونی۔ چینو تو بچہ ہے۔"

ساونی کے دُکھ درد اس کی استری کے کوئلوں کی طرح میری نظر سے اوجھل رہنے پر بھی سلگتے رہتے ہیں۔ جیب کا ایک ہی مسلا ہوا پیسہ نکال کر میں چینو کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں۔ وہ خوش ہو کر بھاگ جاتا ہے۔ ساونی کے چہرے پر کچھ ہچکچاہٹ نظر آتی ہے، وہ گھبراتی ہے اور چپ چاپ گھوم کر پرے چلی جاتی ہے۔ میں اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی دیکھ لیتا ہوں، جیسے کسی نے شکستہ حال سڑک میں کہیں ایک نیا پیوند لگا دیا ہو۔

"بڑا ہو کر چینو ایک بیل ہی تو نکلے گا۔ اقبال!"

"بیل یا ایک دُم کٹا آوارہ کتّا؟"

"قدرت کی کتنی بڑی ستم ظریفی ہے!"

"ہاں، ستم ظریفی!"

"وہ دن دور ہے، اقبال، جب ہماری مائیں اپنی کوکھ میں نئے انسان کی سب سے پہلی سب برابر نسل کی بنیاد رکھیں گی۔"

"میری سمجھ سے تو باہر ہے تمہارا یہ فلسفہ۔"

کچوری کا آخری ٹکڑا میں کتّے کی طرف پھینک دیتا ہوں۔

"بس بیٹا، اب کچھ نہیں ملے گا۔"

کتّا چلا جاتا ہے۔ اقبال سنگھ کہتا ہے "خیر اچھا ہے، سمجھدار ہے اُس نے تو مجھے کالے پانی کے کتّوں کی یاد دلا دی۔"

"بہت اچھے ہوتے ہیں کالے پانی کے کتّے؟"

"بہت اچھے ہوتے ہیں، آنکھ کا اشارہ تک سمجھ لیتے ہیں۔"

پرے ساونی کی کھڑکی سے، اُس کی آنکھیں نظر آجاتی ہیں — دو خوابیدہ سی بتیاں جنہیں اُکساتے ہوئے اقبال سنگھ اس دریچے سے اُٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ جیسے دُم کٹے آوارہ کتے کے پیچھے ہو لیتا ہے..... اور یہ ڈری ڈری سی سہمی سہمی سی سڑک اپنی آنکھیں جھانکنے لگتی ہے۔ اور ان گنت صدیوں کی گرد جھاڑ کر، ان گنت بندھن جھٹک کر سُکھ کا سانس لینا چاہتی ہے۔

پرسوں شام ہی اقبال سنگھ آگرے کو روانہ ہو گیا تھا۔ تاج محل دیکھ کر آج اُس کو لوٹ آنا ہے۔ جتنا روپیہ وہ جانے آنے پر خرچ کر آئے گا۔ اتنا ساونی پورے مہینے کی دھلائی سے بھی نہیں کما سکتی۔

..... دور اُفق پر ایک لال پگڑی والا نمودار ہوتا ہے۔ پھر وہ قریب آجاتا ہے۔ ٹول کی خاکی قمیص، پگڑی تہہ بر تہہ، کپڑے کی نہیں، سیمنٹ کی بنی ہوئی یا کسی سنگتراش کا شاہکار۔ ٹول کی خاکی قمیص کی جیبیں تاش کے بادشاہ کی مونچھوں کی طرح تراشی ہوئی ہیں۔ ہاتھ گرم کرنے کے لئے نکر کی جیب میں ڈالتا ہے اور جسم کے ساتھ بھینچ بھینچ کر اُن کی خُنکی دور کرتا ہے۔ ایک ہاتھ میں ڈنڈا ہے۔ وہ ڈانٹ کر کہتا ہے:۔

"ارے گوکل، آج تو پھر کھڑا ہے سڑک کے بائیں طرف"

اتنا بھی گیا گزرا کیا ہو گا گوکل۔ ایک چونی تو دے ہی مرے گا۔ اگلے دن اُسے یونہی چھوڑ دیا تھا۔ روز تو نرمی نہیں برتی جا سکتی۔ ماں کے خصم نے نئی قمیص پہن رکھی ہے اور چودھری بنا بیٹھا ہے

"جی سرکار!" — گوکل جواب دیتا ہے۔

"سرکار کا سالا! کیا نام ہے تیرے باپ کا؟"

"مور باپ کا نام..... سنتری جی، آپ مور مائی باپ —"

اور گوکل کہاں سے دے چونی؟ چونی ہو بھی اُس کے پاس؟ مشکل سے قمیص کے دام چکا پایا۔ گھر والی کے لئے سُرخ کپڑا خریدا۔ نیا لہنگا ڈالے گی رُکمن کی طرح بیچی۔ رُکمن کی ریس کرے ہے۔ رکمن تو دلہن ہے ..... اپنی کھردری گردن پر گوکل ناخن پھیرتا ہوا سوچ میں ڈوب جاتا ہے۔

سپاہی کا ہاتھ بھر لمبا ڈنڈا گوکل کی کمر پر پڑتا ہے۔

"ہٹ یہاں سے حرامی!"

گوکل کتنا گیا گذرا ہو لیکن اتنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ بپھرتا ہے اور سپاہی کو اپنی چونی بھول جاتی ہے۔ سپاہی کے ڈنڈے کی تمام رتی رتی قوت دیکھتے ہی دیکھتے گوکل کے کوڑے میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اور وہ اُسے اپنے بیلوں پر برساتا ہے۔ بیلوں کا چالان ممکن نہیں ورنہ شاید گوکل ان کا چالان کر دیتا۔ کیسے اینٹھے جاتے ہیں جم کے ماموں، جیسے ستّو کھا کر جھٹ سے پانی پی لیا ہو.....

"...... دھت توری، مریں تورے رکھوالے"!

"سُنا بھئی گاڑیبان اپنا سُکھ دُکھ"!

"ہمارا سُکھ دُکھ کا پوچھت ہو بابوجی، روح کو اں کھو دت ہیں، روح پانی پیت ہیں"!

"سچ ہے، غریبی بڑی لعنت ہے۔ اور ان بیلوں کے پیر تو من من بھر کے ہو رہے ہیں"!

"ان کا بھگوان ہی سُکھ دیہے، ہم کا دیہے"؟

"کون بھگوان"؟

"سب کا بھگوان اُہے بیلن کا بھگوان"!

"یہ تمہارا بھگوان بھی کوئی گاڑیبان ہو گا"!

...... دھت توری مہتاری مر جائے ...... اندھیارے ماں لوڑ جائے تورا آمتا بیج منجدھار ماں..... کوونہ ہوئے سہائی تور بپت ماں ...... گالی پہ گالی، نت نت کی دھتکار۔ اوپر سے کوڑے پہ کوڑا۔ یہ ہمیشہ کے بیگاری۔ اے کاش کوئی ان کے تصور کو بیدار کر دے ان کے تخیل کو اُکسا دے۔

بہت دور سے یہ سڑک بل کھاتی آتی ہے، دور دیہات سے چوکڑی بھولے ہوئے بوڑھے ہرنوں کی طرح کچھ کسان آرہے ہیں۔ کدھر کو جا رہے ہیں یہ لوگ، شاید کچہری کو۔ میری آنکھوں میں گاؤں کا ایک بھیانک منظر پھر جاتا ہے۔ ایک زمیندار کے لٹھ باز پیادے ایک غریب کسان کو گھسیٹتے ہوئے لئے آتے ہیں۔ پیچھے پیچھے بے چارے کی گھر والی چلی آتی ہے — ایک بھوکی، مریل، مصیبت زدہ گائے۔ بقایا لگان بے دخلی — یہ دونوں میں جو زمیندار چلائے گا، چلا کر رہے گا.....

کہانیوں کے کسی خونخوار دیو کی طرح زمیندار کی آنکھیں لال ہو گئی ہیں۔ کسان کانپتا ہے، روتا ہے اور اُس کی گھر والی اپنے خاوند کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی.....

"دُکھ ہی دُکھ دیکھا جندگی ماں۔ سُکھ کبھوں ناہیں دیکھا"

سچ سچ دکھ ہی دیکھا ہوگا ــــ کسانوں کی باتیں تو بھوکی مصیبت زدہ زمین کی باتیں ہیں۔

"جمیندار چاہیں تو ہماری فصل کٹوائے لیں ــــ"

"چاہیں تو اپن لٹھیت بھیج کئے کھلیان اٹھائے لیں ــــ"

"پر جمیندار کا کچھو دوس ناہیں، ہمار بھاگ ہی نیکے ناہیں ہیں"۔

اپنے اوپر چلنے والوں ہی کی طرح یہ سڑک صدائے احتجاج کھو بیٹھی ہے۔ کبھی یہاں سناٹا چھا جاتا ہے۔ اِس دبی ہوئی، پسی ہوئی، خستہ حال سڑک کے سینے میں کوئی خلا تو نہ پیدا ہو جاتا ہوگا جو مجھے دفعتہً اپنے اندر پیدا ہوتا محسوس ہوتا ہے۔

چھکڑے آ رہے ہیں، جا رہے ہیں۔ دور سڑک کے چہرے پر ایک غبار سا اُبھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اوپر بادلوں میں ایک شکل پولیس کے سپاہی جیسی ہے۔ ایک اور بادل نے بیل کا روپ دھار رکھا ہے اور وہ پولیس کا سپاہی اب کوئی کسان نظر آتا ہے۔ دوسرے بہت سے بادل بھاگے آتے ہیں لیکن یہ بیل تو صرف رینگ ہی سکتا ہے اور میلے سے آسمان کے نیچے یہ سڑک جانے کس غم میں سہمی ہوئی سی، کس یاد میں کھوئی ہوئی سی، لیٹی ہوئی ہے۔

اقبال سنگھ بہت خوش نظر آتا ہے۔ روضۂ تاج محل کی تعریف کرتے وہ تھکتا نہیں سوچتا ہوگا کہ سادنی تو بیوہ ہے۔ اور اگر رامو زندہ بھی ہوتا تو اپنی دھوبن کے لئے کس جمنا کے کنارے شاہجہاں کا سا سپید مرمریں روضہ بنوا سکتا تھا؟

"کیا سوچ رہے ہو، میاں ادیب؟"

"یہی کہ کیا کالے پانی میں بھی کوئی مرمریں روضہ موجود ہے ــــ کالے پانی میں جو بجائے خود ایک لمبا چوڑا جیل خانہ ہے، جہاں محبت نہیں کی جاتی بلکہ سزا بھگتی جاتی ہے"۔

"ارے بھئی، تمہیں نہیں معلوم...... تم کیسے جان سکتے ہو؟"

"تو کیا کالے پانی میں بیلوں پر کوڑے نہیں برستے؟"

"ہاں ہاں ہاں، وہاں بیلوں پر کوڑے نہیں برستے"۔

"یعنی تمہارا مطلب ہے وہاں کوڑے ہوتے ہی نہیں؟"

"ہاں ہاں ہاں، میرا مطلب ہے وہاں کوڑے ہوتے ہی نہیں"۔

"یعنی بیل بہت زیادہ سمجھدار ہیں وہاں!"

"ہاں ہاں ہاں، لیکن اب چھوڑو اس بات کو۔ ذرا اِدھر دیکھو نا، کوئی جلوس آ رہا ہے شاید"۔

مزدوروں کا جلوس قریب آ جاتا ہے۔ میرا ذہن چمک اُٹھتا ہے۔ نئے دور کا استقبال کرنے کے لئے میں سب سے آگے نکل جانا چاہتا ہوں۔ مزدوروں کا کورَس گیت فضا میں گونجنے لگتا ہے:

سارا سنسار ہمارا ہے۔
سارا سنسار ہمارا ہے
مظلوموں نے ملکوں ملکوں
اب جھنڈا لال اُٹھایا ہے
جو بھوکا تھا جو ننگا تھا
اب غصہ اس کو آیا ہے
روکے تو بھلا کوئی ہم کو ذرا
سارا سنسار ہمارا ہے
سارا سنسار ہمارا ہے۔

اقبال سنگھ کہتا ہے "یہ سڑک شاید کبھی سو نہیں سکتی، نہ دن کی روشنی، نہ رات کے اندھیارے میں۔ یہ کیسی سڑک ہے!"

"اُس جبڑے کے مانند، اقبال، جس کے آدھے دانت بڑھاپے کی وجہ سے سڑ گئے ہوں اور باقی آدھے کالے پڑ گئے ہوں، جیسا کہ گورکی نے اپنے نانا کے گھر کے سامنے سے گذرنے والی سڑک کے متعلق لکھا تھا۔ اور دیوہیکل لاریاں بھی اب اس غریب سڑک کو لتاڑتی رہتی ہیں"۔

"ارے بھئی تم بھی عجب فلسفی ہو۔ سڑک تو ہمیشہ سے ایک مشترکہ شے چلی آئی ہے، اِس پر سے آدمی گزریں چاہے بیل، چھکڑے گذریں چاہے نئے دَور کی لاریاں"۔

موجودہ دور کی دھڑکنوں کا ایک ہلکا سا احساس اقبال سنگھ

کو بھی ہو چلا ہے۔ لیکن چھٹی پوری ہوتے ہی وہ کالے پانی کو بھاگ جائے گا۔ جہاں اُسے اپنے افسر کی جھڑکیاں سہنی ہوں گی۔ حتیٰ کہ اُس کی رگوں میں بہنے والا لہو انڈیمان کے ساحل پر ٹکرانے والے پانیوں ہی کی طرح کالا پڑنا شروع ہو جائے گا۔ اُس وقت شاید وہ مزدوروں کی احتجاجی آواز کی اہمیت کو جان سکے ——— جو بھوکا تھا، جو ننگا تھا اب غصّاس کو آیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کالے پانی میں تو بھوکے اور ننگے نہ ہوتے ہوں گے، اقبال؟"

"ہاں ہاں ہاں، کالے پانی میں ایسے لوگ نہیں ہو سکتے۔"

"یعنی تمہارا مطلب ہے کہ وہاں کسی کو یوں غصّہ نہیں آتا۔ اور نہ یوں جلوس ہی نکلتا ہے؟"

"ہاں ہاں ہاں، وہاں کسی کو غصّہ نہیں آ سکتا، نہ کبھی یوں کوئی جلوس ہی نکل سکتا ہے۔"

"یعنی تمہارا مطلب ہے وہاں مکمل آزادی ہے کسی احتجاج کی گنجائش نہیں؟"

"ہاں ہاں لیکن چھوڑو اس بات کو۔ میں کہتا ہوں کہ جھگڑے کا پرانا ڈیزائن مجھے تو سرے سے ناپسند ہے۔"

یعنی یہاں بھی نئی طرز کے جھگڑے ہونے چاہئیں جیسے کالے پانی میں ہوتے ہوں گے۔"

"ارے بھئی اب جانے بھی دو۔"

گھروں سے پرے ہرے بھرے کھیتوں کو چیر کر، کالے پانیوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے میری نگاہیں جزیرہ انڈیمان کی تلاش میں بھٹکنے لگتی ہیں، جہاں اقبال سنگھ کی چہیتی دنیا بستی ہے، جہاں لوگ لڑا کھڑاتے نہ ہوں گے، حکم میں بندھے فوجیوں کی طرح تن کر چلتے ہوں گے مزے سے۔

جاہل، گدھا، بے سینگ کا بیل ۔ ۔ ۔ ۔ سڑک پر جھگڑا دیکھ کر کسی دیوہیکل لاری کا ڈرائیور چنگھاڑ اُٹھتا ہے۔ گاڑیبان کی آنکھوں میں احتجاج بھڑکتا ہے۔ لاری بہت آگے نکل چکی ہوتی ہے۔ پھر شاید گاڑیبان یہ سوچنے لگتا ہے کہ لاری ڈرائیور بھی ایک مزدور ہے۔ مُورکھ! مزدور ہو کر مزدور پر جھپٹتا ہے۔

بُھڑیاں نکلیں تو ردیہ پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور کوڑا اوپر اُٹھتا ہے، ہوا میں لہراتا ہے، برس پڑتا ہے۔ ارے تو ہے ٹھنڈی مار مارے بھگوان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے بھگوان تو ہے آنند راکھے، موڑ پتوا۔ رات ڑبھت چلی آوت ہے۔ گھیو میدے کا بچن دیت ہوں، شنو کے نندی!

۔ ۔ ۔ ۔ یہ گالیاں، یہ پیار اور یہ پرانی شکستہ حال سڑک جو رازدارانہ انداز سے روزگار کے بندھن دیکھتی ہے، سب کی باتیں سُنتی ہے۔ یا شاید یہ سڑک سرے سے اندھی ہے، بہری ہے۔

ٹن ٹن ٹن ٹن ۔ ۔ ۔ ۔ گرجے کے گھڑیال نے نیا گھنٹہ شروع ہونے کی صدا سنا دی۔ گرجے کے دروازے پر ایک فقیر نے ہاتھ پھیلا رکھے ہیں، کبھی کبھار ترس کھا کر گرجے میں جانے والے لوگوں میں سے کوئی اس غلاظت کے کیڑے کی طرف ایک دو پیسے پھینک دیتا ہے۔

ان گنت صدیوں کی بھوک بھینچے ہوئے، جانے کب سے کھڑا ہے۔ یہاں، یہ بھیانک آدمی، اقبال!

"باتیں پھر کرنا۔ پیسہ ہو تو نکالو۔"

"لیکن ایک پیسے سے کیا ہو گا، اقبال؟ صدیوں کی بھوک ہے یوں نہ مٹے گی۔"

اقبال سنگھ میری طرف گھور کر دیکھتا ہے اور میں آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر کہتا ہوں "ایسے پیلے سے چاند کو دیکھ کر ہی کسی نے کہا تھا، اقبال، کہ یہ تو ایک بڑی سی روٹی ہے ——— سیلے ایندھن کے دھوئیں کے کرتوت سے اپنے حال پر شرمندہ۔ اور بادلوں کے آڑے ترچھے ٹکڑے بھوکے آدمی کی طرح جبڑے کھولے لپکے آتے ہیں۔ اس روٹی کو نگل جانے کو۔"

اقبال سنگھ کوئی جواب نہیں دیتا۔ آگے بڑھ کر وہ مجھ سے بغلگیر ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ برسوں سے اسی سڑک پر رہتا آیا ہے، اسی پرانی شکستہ حال سڑک پر جہاں یہ لوگ ہر وقت چلتے رہتے ہیں، جانے کب تک چلتے رہیں گے ——— یہ آدمی، یہ بیل!

دیویندر ستیارتھی

غزل

ٹھہر گلشن کے طائر اے اسیرِ سست پروازی
کہ اس انجام میں شامل ہے میری دیر آغازی

میانِ پردہ ہائے ابر چپ ہے برق برسوں سے
پڑے ہے آسماں سے گل کے راہی کی تنک تازی

سرِ کہسار جیسے نیم شب کم جوشیِ فطرت
شکستِ ہوش دیتی ہے مجھے درسِ کم آوازی

فریبِ شوق کے یہ فتنہ ہائے پے بہ پے کیا تھے
نہیں لازم مری گر کارِ فطرت میں دراندازی

مبارک تجھ کو اے شاہی کہ میرے قصرِ باطل کو
ملے ہیں جہل کے ابلیس لاکھوں بہرِ دمسازی

تجھے اے گلشنِ ہستی شرر گوں ہو کے رہنا ہے
شبِ اول ستاروں کی یہی تھی مجھ سے غمازی

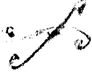
رہا زندانیِ تقدیر انساں مہدِ طفلی سے
نہ آئی راس اس کو اپنی فطرت کی سرافرازی

محبت میں مداوا کیا ہو بیمارِ محبت کا
کہ ہے تسکینِ خاطر اس کے حق میں وجہِ ناسازی

ابھی تک باوجودِ صد گناہ بے سبب تائب
خدا ناکردہ زندہ ہے مرے غم کی خدا سازی

مراتب علی خاں تائب

بچّے



امّی، ابّا اور چچی ندیا گھر پر نہیں ہیں۔ وہ ایک پڑوسی سے ملنے گئے ہوئے ہیں۔ گرلیشا، انیا، الوشا، سونیا، اور باورچی کا لڑکا اینڈ ریؔ، کھانے کے کمرے میں میز پر بیٹھے ہوئے انتظار کر رہے ہیں اور تاش کھیل رہے ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ سونے کا وقت ہو چکا ہے لیکن جب تک ماں گھر نہ آجائے۔ بچے کس طرح سوئیں۔ کمرے میں فانوس روشن ہے اور میز پر مونگ پھلی کے چھلکے، کاغذ کے پرزے اور شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھرے ہوئے ہیں۔ ہر کھلاڑی کے سامنے دو دو پتے اور نمبروں کو ڈھانپنے کے لئے شیشوں کے ٹکڑوں کا ایک ڈھیر پڑا ہوا ہے۔ میز کے وسط میں ایک چینی کی پیالی میں پانچ پیسے رکھے ہوئے ہیں۔ پیالی کے پاس ایک نیم خوردہ سیب، ایک قینچی، اور ایک رکابی پڑی ہے، مونگ پھلی کے چھلکے ڈالنے کے لئے۔ بچے پیسے لگا کر کھیل رہے ہیں۔ فی بازی ایک پیسہ مقرر ہے۔ اگر کوئی دھوکا کرتا ہے تو اُسے فوراً نکال دیا جاتا ہے۔ کمرے میں سوائے کھلاڑیوں کے اور کوئی نہیں۔ آیا اگیا باورچی خانے میں کام کر رہی ہے۔ اور بڑا بھائی وسیا، جو پانچویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ تھک تھکا کر، ملاقات کے کمرے میں صوفے پر لیٹا ہوا ہے۔

بچے بڑے جوش اور انہماک سے کھیل رہے ہیں۔ سب سے زیادہ بے چینی گرلیشا کے چہرے سے ظاہر ہو رہی ہے۔ اُس کی عمر نو سال ہے۔ سر گھٹا ہوا، گال پھولے ہوئے اور ہونٹ حبشیوں کی طرح موٹے موٹے۔ وہ چوتھی جماعت میں پڑھتا ہے۔ اور اس لئے دوسرے بچے اُسے اپنے سے بڑا اور چالاک خیال کرتے ہیں۔ وہ محض پیسے جیتنے کی خاطر کھیل رہا ہے۔ اگر پتوں پر لگانے کے لئے پیالی میں پیسے نہ رکھے ہوتے تو وہ کبھی کا سو گیا ہوتا اُس کی بے چین اور حریص بھوری بھوری آنکھیں۔ دوسرے کھلاڑیوں کے پتوں کی طرف تک رہی ہیں۔ ہار جانے کا خوف، حسد، اور اقتصادی جوڑ توڑ جن سے اُس کا گھٹا ہوا سر بھرا پڑا ہے، اُسے نچلا نہیں بیٹھنے دیتے کہ پورے دھیان سے کھیل سکے۔ وہ بار بار پہلو بدلتا ہے۔ جیسے کانٹوں پر بیٹھا ہو۔ جب وہ بازی جیتتا ہے تو ایک لالچی کی طرح دوسروں کے ہاتھوں سے پیسے چھین کر فوراً اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے۔ اُس کی بہن انیا بھی۔ جس کی عمر آٹھ سال اور آنکھیں بڑی روشن اور شریر ہیں۔ ڈرتی ہے کہ کہیں کوئی دوسرا نہ جیت لے۔ وہ کچھ شرما رہی ہے۔ جھجھک رہی ہے۔ اور کھلاڑیوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی ہے۔ پیسوں سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہاں! جیت کے خیال سے اُسے مسرت ہو رہی ہے۔ دوسری بہن سونیا جس کی عمر چھ سال، بال گھنگھریلے اور رنگ صحت مند بچوں اور قیمتی گڑیوں کی طرح بڑا نکھرا ہوا ہے۔ کہنیاں ٹیک کر بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے چہرے پر معصومیت کھیل رہی ہے۔ خواہ کوئی بھی جیتے وہ ہنس دیتی ہے۔ اور تالیاں بجانے لگتی ہے۔ الوشا، جو گول مول سا ہے، زور زور سے ناک کے راستے سانس لے رہا ہے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پتوں کی طرف تک رہا ہے اُسے نہ تو جیتنے کا شوق ہے اور نہ ہی رنگ میں بھنگ ڈالنے کا۔ وہ تو بس ایک بات سے ڈرتا ہے کہ کہیں کمرے سے باہر نکل جانے یا سونے کا حکم نہ مل جائے۔ بظاہر وہ بڑا سیدھا سادا معلوم ہوتا ہے لیکن ہے اصل میں شریر۔ اُسے کھیل کا اتنا شوق نہیں جتنا اُس گڑبڑ کو دیکھنے کا جو کھیل میں عام طور پر ہوا کرتی ہے۔ اگر ایک بچہ دوسرے کو پیٹتا ہے یا گالیاں دیتا ہے تو وہ بڑا خوش ہوتا ہے۔ وہ ایک منٹ کے لئے میز کو نہیں چھوڑتا۔ اس ڈر سے کہ کوئی اس کے پیسے نہ چرا لے۔ ورنہ وہ تو کبھی کا کسی جگہ بھاگ گیا ہوتا۔ چونکہ اُسے گنتی ایسی ویسی ہی آتی ہے۔ اس لئے انیا نے اُس کے نمبروں کو چھپا رکھا ہے۔

پانچواں کھلاڑی۔ باورچی کا لڑکا اینڈریؔ ہے۔ اُس کا رنگ سیاہی مائل اور چہرہ بیماروں کا سا ہے۔ اُس نے سوتی قمیص پہن رکھی ہے۔ اور سینے پر ملمع کی صلیب لگائی ہوئی ہے۔ وہ بالکل بے حس و حرکت کھڑا ہے۔ اور

خواب آلود نظروں سے نمبروں کو دیکھ رہا ہے، اُسے نہ اپنی جیت اور نہ دوسروں کی کامیابی ہی سے کوئی دلچسپی ہے بلکہ وہ تو کھیل کے حسابی پہلو میں مگن ہے۔ اور سوچ رہا ہے کہ ساری دنیا میں کل کتنے اعداد ہیں اور وہ آپس میں خلط ملط کیوں نہیں ہو جاتے؟

سونیا، اور الوشا کے سوا باقی سب باری باری اپنے اپنے نمبروں کو زور زور سے پکارتے ہیں۔ کھیل میں دلچسپی پیدا کرنے کی خاطر انہوں نے نمبروں کو مختلف نام دے رکھے ہیں۔ مثال کے طور پر سات کو "دستہ" کا۔ گیارہ کو "چھڑیوں کا" اور نوّے کو "دادا" کا۔ وعلیٰ ہذا۔ کھیل بڑے زور شور سے چل رہا ہے۔

گرِنشا اپنے ابا کے ہیٹ کو اچھالتے ہوئے کہتا ہے "بتیس! سترہ! اٹھائیس! اب رکھ دیجئے بیتے ......"

اینا دیکھ رہی ہے کہ اینڈری نے اٹھائیس کو سرکا لیا ہے۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اُسی وقت شور مچانے لگتی۔ لیکن اب اس کا فائدہ چُپ رہنے ہی میں ہے اور اس لئے وہ خوش ہو رہی ہے۔

گرِنشا پھر پکارتا ہے "تئیس، ستّر، نو"

"کھٹمل کھٹمل" سونیا چلاتی ہے۔ کھٹمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو میز پر دوڑ رہا ہے۔ "اوہ"۔

الوشا "اسے مار نا مت۔ شاید اس کے بچے ہوں ....."

سونیا کی آنکھیں کھٹمل کی طرف لگی ہوئی ہیں اور اس کے بچوں کا خیال کر کے حیران ہو رہی ہے کہ وہ کتنے چھوٹے چھوٹے ہوں گے،

"نینتا لیس! ایک!" گرِنشا کھیل کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے۔ اور اس خیال سے ناخوش ہے کہ اینا نے دو چوکے بنا بھی لئے ہیں۔ "چھ!"

"کھیل ختم! میں جیت گئی" سونیا بڑے پیار سے انداز سے اپنی آنکھوں کو گھماتی ہوئی اور چٹکیاں بجاتی ہوئی چلّا اٹھتی ہے

کھلاڑی بُرا سا منہ بنا لیتے ہیں۔ اور گرِنشا بڑی حقارت سے سونیا کی طرف دیکھ کر کہتا ہے "اچھا ذرا دیکھ لینے دو"۔

گرِنشا چونکہ سب سے بڑا، اور چالاک ہے اس لئے فیصلے کا کام اپنے ذمے لیتا ہے۔ جو کچھ وہ چاہتا ہے۔ دوسروں سے کرا لیتا ہے۔ سونیا کی گنتی کی آہستہ آہستہ لیکن نہایت احتیاط سے تصدیق کی جاتی ہے اور آخر میں سب کھلاڑیوں کو بے حد رنج ہوتا ہے کہ وہ واقعی جیت گئی ہے۔ اب دوسری بازی شروع ہوتی ہے۔ "کل میں نے ایک چیز دیکھی تھی" اینا گویا اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتی ہے "ہوُجو نے کسی طرح سے اپنے پپوٹوں کو پلٹا لیا جس سے اس کی آنکھیں، کسی خبیث روح کی طرح بڑی سُرخ اور ڈراونی معلوم ہونے لگیں"۔

گرِنشا "میں نے بھی دیکھا تھا" آٹھ! اور ہمارے سکول کا ایک لڑکا اپنے کان بھی ہلا سکتا ہے۔ ستائیس"

اینڈری گرِنشا کی طرف دیکھتا ہے۔ اور بڑا سنجیدہ منہ بنا کر کہتا ہے "میں بھی اپنے کان ہلا سکتا ہوں ....."

"تو پھر ہلاؤ" سب پکار اُٹھتے ہیں۔

اینڈری اپنی آنکھیں، اپنے لب، اور اپنی انگلیاں ہلاتا ہے۔ اور یہ سمجھتا ہے کہ اُس کے کان بھی ہل رہے ہیں۔ سب ہنسنے لگتے ہیں۔

سونیا آہ بھر کر کہتی ہے "ہوُجو بہت خوفناک آدمی ہے۔ کل وہ ہمارے باغیچے میں چلا آیا۔ اس وقت میں نے صرف قمیص پہن رکھی تھی۔ اس سے مجھے بڑی شرم آئی"۔

"کھیل ختم" گرِنشا بے تحاشا چلا اٹھتا ہے۔ اور جھپٹا مار کر پیالی میں سے پیسے اٹھا لیتا ہے "میں جیت گیا۔ اگر شک ہو تو دیکھ لو"۔

باورچی کا لڑکا دیکھتا ہے۔ اس کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ اور نہایت دھیمی آواز میں کہتا ہے "تو پھر اب میں تو نہیں کھیل سکتا ..... کیونکہ ..... اب میرے پاس اور پیسے نہیں" گرِنشا جواب دیتا ہے "ہاں تم پیسوں کے بغیر تو نہیں کھیل سکتے"۔

اینڈری پھر اپنی جیبوں کو ٹٹولتا ہے۔ اپنا شک دور کرنے کے لئے۔ جیب سے سوائے روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور ایک ٹوٹی ہوئی پنسل کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ اس سے اینڈری رونی سی صورت بنا لیتا ہے۔ اور زور زور سے آنکھیں جھپکانے لگتا ہے

سونیا اُس کی غم زدہ صورت کو دیکھ نہیں سکتی اور کہتی ہے "تمہاری جگہ میں پیسے لگا دیتی ہوں لیکن بعد میں مجھے واپس کر دینا"۔

سونیا پیسے لے آتی ہے۔ اور بازی پھر شروع ہوتی ہے۔

اینا اپنی آنکھیں پھاڑ کر کہتی ہے "میرے خیال میں کہیں گھنٹی بج رہی ہے۔

سب کھانا بند کر دیتے ہیں۔ اور منہ کھول کر تاریک کھڑکی میں سے باہر جھانکنے لگتے ہیں۔ لیمپ کا عکس تاریکی میں صاف نظر آرہا ہے۔

"تمہارا وہم ہی تھا۔"

"رات کو صرف قبرستان میں گھنٹی بجتی ہے۔" اینڈری جواب دیتا ہے۔

"لیکن وہاں کیوں؟" سب پوچھتے ہیں۔

"چوروں کو گرجے سے دور رکھنے کے لئے۔ وہ گھنٹی سے بہت ڈرتے ہیں۔"

سونیا پوچھتی ہے "چور گرجے میں کیا لینے آتے ہیں؟"

"یہ تو ہر کوئی جانتا ہے۔ پہرہ داروں کو مارنے کے لئے۔"

ایک منٹ تک خاموشی رہتی ہے۔ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ قدرے خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ اور پھر کھیلنے لگتے ہیں اس دفعہ اینڈری جیت جاتا ہے۔

الوشا لال پیلا ہو کر بغیر کسی وجہ کے چلا اٹھتا ہے۔ "اس نے دھوکا دیا ہے"۔

"جھوٹ ہے۔ میں نے کوئی دھوکا نہیں دیا۔"

اینڈری کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ اس کی زبان چلنے لگتی ہے اور وہ الوشا کے سر پر ایک تھپڑ مارتا ہے۔ الوشا غصہ سے بھڑک اٹھتا ہے۔ اچھلتا ہے۔ اور ایک گھٹنے کو میز پر ٹیک کر اینڈری کے گال پر ایک طمانچہ مارتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ایک ایک اور تھپڑ مارتے ہیں۔ اور دواہی تباہی بکنے لگتے ہیں۔ سونیا اس منظر کو برداشت نہیں کر سکتی اور چلانے لگتی ہے۔ سکرے سے رنگ رنگ کے رونے کی آوازیں آرہی ہیں۔ لیکن یہ خیال نہ کرنا کہ اب کھیل ختم ہو گیا۔ پانچ منٹ نہیں گذرنے پاتے کہ بچے پھر ہنستے ہوئے اور شانتی سے باتیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے چہرے تو بے شک اشک آلود ہیں۔ لیکن وہ مسکرانے سے اب بھی باز نہیں آتے۔ الوشا بہت خوش ہے کہ کھیل میں کچھ تو گڑبڑ ہوئی۔

وسیا، جو پانچویں جماعت میں پڑھتا ہے کھانے کے کمرے میں آتا ہے۔ اسے نیند آئی ہوئی ہے۔ گریشا نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال رکھا ہے۔ پیسوں کی جھنکار آرہی ہے۔ وسیا اسے سن کر کہتا ہے۔ "یہ چیز اچھی نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ والدین بچوں کو کیوں پیسے دیتے ہیں جس سے انہیں قماربازی کی عادت پڑے۔ خیر یہ تربیت کا طریقہ اچھا ہے۔ افسوس"۔

لیکن بچوں کا کھیل اتنا دلکش ہے کہ وہ بھی شامل ہونے اور قسمت آزمائی کرنے سے رہ نہیں سکتا۔

"ایک منٹ ٹھیرو۔ میں بھی شامل ہوتا ہوں"۔ وہ کھلاڑیوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

"تو پھر پیسہ لگا دیجئے،"

"ابھی لگاتا ہوں"۔ وہ اپنی جیبوں کو ٹٹولتا ہوا کہتا ہے "میرے پاس پیسہ تو نہیں ہے لیکن ایک اٹھنی ہے یہی لگا دیتا ہوں"۔

"نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ . . . . ایک پیسہ ہی لگائیے"۔

"ارے احمق اٹھنی بڑی ہے یا پیسہ"۔ وسیا اکڑ کر کہتا ہے "جو بازی جیت لے گا۔ وہ باقی کے مجھے پیسے دے دے"۔

"نہیں جی تم جاؤ"۔

وسیا برا سا منہ بنا لیتا ہے۔ اور باورچی خانے میں خوردہ لینے کے لئے جاتا ہے۔ نوکروں کے پاس سے ایک پیسہ نہیں نکلتا۔ باورچی خانے سے واپس آکر گریشا سے کہتا ہے "تو پھر تم ہی مجھے خوردہ دے دو ساتھ بٹہ بھی لے لینا۔

گریشا مشکوک نظروں سے وسیا کی طرف دیکھتا ہے۔ اور سوچ رہا ہے کہ کہیں اس سے دھوکا تو نہیں کیا جا رہا۔ وہ اپنی جیبوں کو مضبوطی سے پکڑ کر کہتا ہے "میں نہیں دوں گا"۔

وسیا تنہ شروع ہو جاتا ہے اور انہیں گدھے۔ احمق۔ گاؤدی کہہ کر کوسنے لگتا ہے۔

سونیا اس کے شور سے مرعوب ہو کر کہتی ہے "وسیا بیٹھ جاؤ میں تمہاری جگہ پیسے لگا دیتی ہوں"۔ وہ بیٹھ جاتا ہے اور اپنے سامنے دو پتے رکھ لیتا ہے۔ سونیا اپنا نمبر گننے لگتی ہے۔

"ذرا ٹھہرو میرا پیسہ گر گیا۔ گریشا گھبرائی ہوئی آواز میں کہتا ہے۔

وہ لیمپ اٹھا لیتا ہے۔ اور پیسہ ڈھونڈنے کی خاطر میز کے نیچے گھس جاتا ہے۔ وہ مونگ پھلی کے چھلکوں اور دوسری گندی ناکارہ چیزوں کو ٹٹولتے ہیں۔ باہم سر ٹکراتے ہیں لیکن پیسہ نہیں ملتا۔ اب دوبارہ تلاش شروع ہوتی ہے اور سلسلہ کافی دیر تک رہتا ہے حتیٰ کہ وسیا

گرشیا کے ہاتھ سے لپک کر اُسے میز پر رکھ دیتا ہے۔ گرشیا اندھیرے ہی میں ڈھونڈتا رہتا ہے۔ آخر پیسہ مل جاتا ہے۔ کھلاڑی پھر میز پر بیٹھ جاتے ہیں۔ کھیلنے کے خیال سے۔

الوشا کہتا ہے "سونیا سو گئی"

سونیا، اپنے گنگھریالے بالوں والے سر کو اپنے بازوؤں پر رکھ کر بڑی میٹھی اور چین کی نیند سو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے سوئے ہوئے کافی دیر ہو چکی۔ جب دوسرے بچے پیسے کی تلاش کر رہے تھے تو یہ اسی وقت سو گئی تھی۔

اینا اُسے میز پر سے اٹھاتی ہے اور کہتی ہے "آؤ میرے ساتھ۔ امی کی چارپائی پر سو جاؤ! چلو!"

سب اینا کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ پانچ منٹ نہیں گذرنے پاتے کہ امی کی چارپائی ایک عجیب منظر پیش کرتی ہے۔

سونیا سو رہی ہے۔ الوشا اُس کے پہلو میں لیٹا ہوا خراٹے لے رہا ہے۔ گرشیا اور اینا بھی ایک دوسرے کے سر کی طرف پاؤں کر کے خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہیں۔ باورچی کا لڑکا اینڈری بھی کسی نہ کسی طرح دونوں کے درمیان گھس کر لیٹ گیا ہے۔ پاس ہی پیسے پڑے ہوئے ہیں۔ اب اُن میں کوئی دلکشی نہیں رہی۔ اچھا۔ شب بخیر۔

چیخوف — (چودھری) **اکبر علی** ایم اے

شعر

کرتے وفا امیدِ وفا پر تمام عمر
پر کیا کریں کہ اس کو سرِ امتحاں نہیں

مومن

ایک شاعر دوست کے نام

کل کی سی ہے بات ابھی جب تو نے
نظم آزاد سنائی تھی مجھے
گونجتے ہیں مرے کانوں میں ابھی تک ترے الفاظ "اے دوست!
آج سے آپ نہ پائیں گے مرے شعروں میں
تذکرہ حسن و محبت کا کوئی
آج سے میں نے بدل ڈالا ہے اندازِ سخن"
آج پھر سُن کے رباعی تیری
مجھ کو بے ساختہ آتی ہے ہنسی
کیا ہوا اب وہ ترا عزمِ صمیم؟
کیوں ہوا زخم ترا پھر تازہ؟
چل گیا تجھ پہ بھی محبوبۂ شہرت کی اداؤں کا فسوں؟
سوچتا ہوں کہ ترے عہد کو توڑا کس نے
تیری اونگھی ہوئی حسرت کو جھنجھوڑا کس نے
پردہ اس راز سے اے دوست اٹھا دے للہ!
وجہ ردِ عملِ طبع بتا دے للہ!

سید جابر علی

ایک نظم اور ایک غزل

بے بسی

وہ مری شمعِ کہن ——
اب بھی ہوتا ہے تصوّر کے دھندلکوں میں چراغاں جس سے!
اور یہ قمقمۂ نَو ——
کہ مری زیست کی تاریک نگاہیں ہیں فروزاں جس سے۔
رات بہلاتی رہیں دونوں مرے دل کی تمناؤں کو
ایک ہی پیکرِ روشن بن کر
—— ایک ہی نیم حقیقی پیکر!

شعبدہ بازِ تمنا کے فسوں سے امشب
خواب میں میرے تصوّر کے دھندلکوں سے مری شمعِ کہن
قمقمہ بن کے کچھ اس طرح سے نکلی —— جیسے
کوئی دیرینہ تمنا ہو، جو بر آئی ہو!

کس طرح میری یہ دیرینہ تمنا بر آئے؟ ——
زندگی ایک حقیقت ہے کوئی خواب نہیں!
شعبدہ بازِ تمنا کا فسوں
ڈھال سکتا نہیں من مانے طریقے پر اسے!

انجم رومانی

غزل

اک پرتوِ دلکش ہے خیالوں کے اثر کا
خود حُسن حقیقت نہیں، دھوکا ہے نظر کا

اے جوشِ جنوں دولتِ دیدار مبارک!
صد شکر، نقابِ رُخِ محبوب نہ سرکا

رہتی ہے نظر تشنۂ نظارۂ فطرت
شکوہ ہے تنک مائگیِ شام و سحر کا

ہنگامِ سحر قطرۂ شبنم کی ضیا میں
انجام جھلکتا ہے شبابِ گلِ تر کا

سکندر علی وجد

قربانی

ناقوس کی صدا اُس عظیم الشان پرانے معبد کی فضا میں تھرتھرا رہی تھی۔ مدھم چراغ ہلکی ہلکی تاریکیوں میں ٹمٹما رہا تھا۔ ناقوس کی ہر ضرب کے وقفے میں ایک عجیب پرہول سناٹا...... ایک مرعوب کن سکوت...... اس کے در و دیوار پر جیسے چھایا جاتا تھا۔ عبیر و لوبان کی مقدس خوشبو بڑی بڑی سلگتی انگیٹھیوں سے جو ایک عجیب شانِ تمکنت سے جابجا سنگِ اسود کے ضخیم ستونوں کے قدموں میں استادہ تھیں، نکل کر ایک ہلکے سے غبارِ دود کی صورت میں اس دہشت انگیز فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔

یکایک ناقوس کی صدا بند ہو گئی۔ مگر اس کی بازگشت ابھی تک بلند دیواروں، رفیع الشان محرابوں، آہنیں و سنگی مجسموں اور سنگِ اسود کے ضخیم ستونوں کے خم و پیچ سے ٹکرا رہی تھی...... چراغ کی دھندلی اور جاں بلب شعاعیں دم بدم تاریکی کے عرصۂ پیکار میں ہزیمت خوردہ...... اور زخموں کی شدت سے نڈھال ہو کر سسک رہی تھیں...... کہ ایک گہری خاموشی میں ان کی آخری سسکیاں اور دم واپسیں کی اُکھڑی اور بے قاعدہ سانسیں گم ہو گئیں ——— اب ایک مکمل سکوت اس ہیبت ناک اور عہدِ عتیق کی مقدس یادگار پر حاوی و طاری تھا...... ایک موت کا سا سناٹا...... یا گورستان کی سی عمیق خاموشی جس کو توڑنے کے لئے اُلّو کی بے ہنگام اور اداس چیخیں بھی فرومایہ ثابت ہوتی ہیں۔ اس عظیم عمارت کی وسیع خلا میں "منتشر" تھی دنیا داروں کے غل غپاڑے اور محفلِ ہستی کی شورشیں جن میں جاں بخش قہقہوں اور دلدوز آہوں کی بازگشت تھی...... یہاں خاموشیوں میں ڈوبتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ ہر سمت گورِ غریباں کی سی خاموشی محیط تھی ——— وہی بدقسمت سکوت جو اِن تُربتوں کی بے کسی میں اضافہ کر دیتا ہے اور جسے اُلّو کی دلدوز چیخیں بھی نہیں توڑ سکتیں یہاں بھی در و دیوار پر سایہ فگن تھا۔ مگر بجائے "بے کسی کے" یہ اس پُر اسرار جگہ کی ہول پروری میں معتدبہ اضافہ کرتا ہوا معلوم ہوا۔

چراغ آخری بار متبسم ہوا، اور پھر اس معبد کو سکوت ماحول اور دھندلکوں کی تحویل میں دے کر خود حسرت سے آخری بار گرد و پیش کی چیزوں پر نگاہ ڈال کر رخصت ہوا۔ اس نگاہِ التفات کے آخری پرتو سے مذکورہ اشیا جگمگا اُٹھیں...... ان میں نمایاں چیز سامنے کی دیوار پر منقش چند تصاویر تھیں...... کہیں جنگل کہیں پہاڑ کہیں لق و دق صحرائے بے آب و گیاہ، جس پر خشمگیں سورج آتشیں کوڑے برسا رہا تھا...... ان تصاویر کی تشکیل میں ظاہری سر و سامان اور نظارہ ہائے قدرت میں تعدد ہو تو ہو مگر ان میں ایک چیز کی یکسانیت دیکھنے والے کو ضرور تحیر میں کھو دیتی ہوگی ——— وہ یہ کہ ہر جگہ ایک ہی شکل و شباہت کا انسان ——— خوبصورت، جوان، وجیہہ ——— ہر جگہ کاٹے آنکھیں بند کئے کائنات و مافیہا کو بھلائے، گرد و پیش سے قطعاً بے خبر سا جن سے لو لگائے مصروفِ عبادت تھا۔ یہ تھی ان مجموعہ ہائے تصاویر کی کائنات جن پر بجھتے چراغ کی آخری زرد شعاعیں جن میں حسرت، ارمان، تمنا اور خبر نہیں کیا کیا جذبات انعکاس پذیر تھے پڑیں اور پھر سارا معبد تاریکی میں غرق ہو گیا۔

(۲)

پرسکوت اندھیرے میں کسی کے دھیرے دھیرے اٹھتے ہوئے قدموں کی چاپ طلسمِ خاموشی کو اُسی طرح توڑتی ہوئی معلوم ہوئی۔ جیسے خزاں کی فضا کی اداسی اور خاموشی کو اشجار کے زرد زرد پتوں کے کھڑکھڑانے کی ہلکی صدائیں باطل کر دیتی ہیں۔ قدموں کی باقاعدگی اور آنے والے کی آہستہ خرامی سے یہی مترشح تھا کہ وہ اس مقام کے چپے چپے سے کماحقہ واقف ہے۔ اور یہاں کی دہشت انگیز فضا اور لرزہ خیز تاریکی سے اس کا دل قطعی طور پر غیر متاثر ہے۔ اور یقیناً اُس نے خود کو ایک "خود فراموشانہ" انتشار اور بے خیالی کے ساتھ ایسے ماحول کے سپرد کر دیا ہے۔ جہاں "جمعیتِ تخئیل" کی موجودگی دل اور دماغ پر ایک ہول پرور ناگوار بار طاری

کر دیتی ہے ..... ورنہ کون ہے جو اس غیر معمولی سناٹے سے جو ارضی معلوم نہیں ہوتا بلکہ غیر مرئی عناصر سے مرکب معلوم ہوتا ہے ..... اِن اونچی محرابوں۔ ایستادہ ستونوں مختلف الہیہ مجسموں اور اصنام سے (جن کے وجود کا احساس باوجود تاریکی کے ہر اُس شخص کے دماغ پر مسلط ہونا لابدی ہے جو ایسے وقت میں ایسے مقام پر موجود ہو) ڈر نہ جائے۔

قدموں کی چاپ دُور ہوتی گئی۔ اور پھر وہی گہرا سکوت معبد کو آغوش میں لئے تھپک رہا تھا۔ آخر اس لمبی اداسی میں سرد آہوں کے بجوکے صاف سنائی دینے لگے ــــ اِن کی غمناک "جھنکار" سے فضا کی خلا پر ہوتی معلوم ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہلکی ہلکی سسکیاں سنائی دیں ..... شاید ان سسکیوں کے ہمرکاب گرم گرم آنسوؤں کی جوئے رواں بھی ہو! کیونکہ یہ ترحم انگیز صدائیں اگرچہ مدھم تھیں۔ مگر تھیں دلدوز جگر خراش اور کڑی کمان کے تیر کی طرح دل کی اتھاہ گہرائیوں میں پیوست ہو جانے والی ......

کوئی دل گرفتہ، حرماں نصیب اور آوارہ بخت انسان اپنے قرطاسِ قسمت کی سیاہی کو اپنے آنسوؤں سے دھو رہا تھا لیکن جیسے شبِ تاریک کی تیرگی کو چند ستارے یا ہنگامِ سحر تک اشکبار رہنے والی شمع روشنی کا لباس پہنانے سے قاصر رہتی ہے بالکل ویسے ہی قرطاسِ قسمت کی سیاہی چند آنسوؤں سے دُھل نہیں سکتی۔ کیونکہ یہ سیاہی عذاب اور اذیت کی دیوی کے منحوس قلم کی رہینِ منت ہے اور قربانگاہ اذیت پر آنسوؤں کی بھینٹ نہیں، جگر کے تازہ گرم اور سُرخ خون کی بھینٹ ہی ایک مقبول اور معقول بھینٹ ہے۔

سسکیوں کی آواز بدستور آرہی تھی۔ حتیٰ کہ یہ غمناک صدائیں فضا کا ایک جزو معلوم ہونے لگیں۔ شدتِ تاثر اور تلاطمِ جذبات سے یہ ہلکی سسکیاں آہستہ آہستہ دلخراش چیخوں میں تبدیل ہو رہی تھیں ...

..... دفعتہً معبد کا بڑا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ ایک روشنی کی کرن اندر آئی۔ جس کے ساتھ ہی کسی نے مضبوط ہاتھوں سے پھر اُسی آہستگی سے اُسے بند کر دیا۔ آنے والے کے ہاتھ میں ایک چراغ تھا۔ جس کی لو پر اُس نے اپنی نگاہیں لگا رکھی تھیں۔ چراغ کی ہلکی روشنی میں اُس کا چوڑا چکلا، پُرسکون اور سنجیدہ چہرہ غیر ارضی طور پر افکار و تردّدات کے فطری اور نمایاں خطوط سے مبرا معلوم ہوا۔ اُس کی آنکھیں بڑی بڑی اور روشن تھیں۔ جن میں دیکھنے والے کو ایک ایسے عمق کا احساس ہوتا کہ اُس کی نظریں فقط اِن کی ظاہری تشکیل میں گم ہو جاتیں اور یہ دیکھنے سے قاصر رہتیں کہ اِن آنکھوں کی تشکیل میں معتد بہ حصہ اُن سرمدی انوار اور تقدسی ضیاؤں کا ہے جن کی روشنی خلدِ نعیم کے صرف انہی شبستانوں میں ہے جن کو "شہیدانِ وفا" نے اپنے مبارک قدم سے سرفراز کیا ہے ــــ وہ ایک موٹے کپڑے کی ڈھیلی ڈھالی اور طویل عبا پہنے ہوئے تھا جس کی سرسراہٹ انجیر کے پتوں کی سرسراہٹ سے مشابہ تھی جن میں سے بادِ شمال دھیرے دھیرے گزر جائے۔

نووارد آگے بڑھا۔ چراغ کو دیوی کے بُت کے پاؤں میں رکھ دیا اور بغیر کسی اظہارِ تحیّر کے اُس نے دیوی کے حضور میں دوزانو گریہ و بکا میں مصروف پیکرِ انسانی کو اٹھا کر کھڑا کر دیا۔

"مت رو میری بچی، مت رو"ــــ

اس کی آواز نرم روآبِ جو کی طرح شیریں اور دلآویز تھی ...

ہلکی ترنم ریز آواز اور مشفقانہ لہجے نے دل گرفتہ عورت کو متحیّر کر دیا دلخراش چیخیں نرم اور تسکین دہ تکلّم کی دلداریوں میں گم ہو گئیں۔ عورت کے چہرے سے پریشانی استعجاب۔ تحیّر اور خوف کے ملے جُلے جذبات ہویدا تھے۔ اُس نے اپنی اشک آلود اور سُرخ خوبصورت آنکھیں مستفسرانہ انداز میں نووارد کے چہرے پر گاڑ دیں مگر اُس کا چہرہ جذبات کے وجود سے خالی تھا۔ صرف ایک نور ..... ایک متبسم نور اُس کے چہرے پر رقصاں تھا۔ اُسی طرح جیسے نیلا آسمان خورشید کے ہوتے ہوئے تمام سماوی عناصر کی آئینہ داری نہیں کرتا۔

عورت یکایک شاید خوف سے مغلوب ہو کر پیچھے ہٹی۔

"میری بچی۔ تو خوفزدہ نہ ہو۔ میں ..... ہوں ــــ معبد کا محافظ"

عورت نے ایک چیخ ماری۔

مقدس باپ .....!" وہ سرمہ در گلو ہو گئی، اور آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

"میری بچی! تجھ پر کیا افتاد پڑی جو تو اس قدر دل شکستہ ہو رہی ہے"۔

عورت نے دونوں ہاتھوں سے اپنے حسین چہرے کو ڈھانپ لیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے شکستہ دلی نے اُسے جذبات پر قابو نہ پانے دیا۔ درماندگی نے اُسے گریہ پیہم پر مجبور کر دیا تھا۔

شکستہ جام میں شراب کا اُکنا محال ہو جاتا ہے۔ یہی اُس کے دل کی حالت تھی...... اس کے بے تحاشا گریہ پر سنگین تخت پر فرعونانہ اور اندازِ خسروانہ سے متمکن دیوی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے گھور رہی تھی بڑی بڑی بے نور اور خالی آنکھیں ایک اندازِ تفاخر، ایک فاتحانہ شان سے بدنصیب عورت کے چہرے پر ٹکٹکی باندھے ہوئے تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک وحشیانہ تبسم تھا...... ایسی مسکراہٹ جو جذبۂ انتقام کی سیری کے وقت انتقام لینے والوں کے لبوں پہ ہوتا ہے۔ اس کے بڑے سنگین ہاتھ میں ایک چھرا تھا جس پر خشک شدہ خون کے سیاہی مائل دھبے چراغ کی دھندلی ضو میں صاف دکھائی دیتے تھے۔ دوسرا ہاتھ ہوا میں بلند تھا۔ بھینچی ہوئی مٹھی اور بازو پر کی اُبھری ہوئی شریانیں———— عورت نے اپنا ستا ہوا مظلوم چہرا اٹھایا۔ ڈرتی ڈرتی نظریں دیوی کی نگاہوں سے ملا دیں۔ اُن میں اب بھی وہی فاتحانہ اور مفتخرانہ انداز تھا۔ وہی غرور اور وہی تمکنت مگر سراسر وحشیانہ اور بہیمانہ.... عورت نے ایک ہلکی سی زیرِلب چیخ ماری۔ اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

محافظ اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں اندازِ ترحم تھا۔ عورت نے ڈرتے ہوئے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں ..... کتنا فرق تھا سفاک دیوی اور سراپا رحم محافظ کی نگاہوں میں.. ..... وہ حیران تھی——ایک مشفقانہ تبسم محافظ کے خوبصورت ہونٹوں پر کھیل رہا تھا۔ دفعتہً وہ ہونٹ کچھ کہنے کے لئے وا ہوئے۔ مسکراہٹ نطق میں تحلیل ہو گئی۔

"میری بچی! تجھ پر کیا افتاد پڑی......!؟"

مقدس باپ! میں آفت رسیدہ ہوں" عورت نے بے اختیارانہ کہنا شروع کیا۔ اُس کی آواز رقت سے بھرا رہی تھی۔ اس کے خوبصورت اور سڈول اعضا پر تشنج کی حالت طاری تھی۔" وسیع دنیا میں زندگی اور زمانے کے مظالم آفرین لمحات کا صیدِ زبوں...... بالکل زخمی شکار کی طرح جو پڑا دم توڑتا رہتا ہے۔ مگر موت اس کی مشکل کو آسان نہیں کرتی۔ میری ہستی بھی آلام و مصائب، ایک ابدی اذیت کے چکر میں پڑی دم توڑتی ہے...... مگر موت...... نہیں آتی"

رقت سے اُس کی آواز میں انجماد پیدا ہو چلا تھا۔ قدرے توقف کے بعد اُس نے خود کو سنبھالا اور کہا۔

" مقدس باپ میں گنہگار ہوں، محبت کی گنہگار میں نے اس سے والہانہ محبت کی، انجام اور عواقب سے بے خبر اور بے پروا ہو کر ——— دردِ محبت کی کسک ایک غیر شعوری طور پر میرے دل میں داخل ہوئی اور پھر یہ جگہ ایسی پسند آئی کہ اُس نے ہمیشہ یہاں رہنا قبول کیا۔ میں نے محبت کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر ڈالا۔ صبر، سکون، احترام نسائیت، فطری نزاکت، نسوانی انانیت... غرضکہ سب کچھ حتیٰ کہ اپنا اُبلتا شباب اور محشر بداماں حسن بھی ——— وہ ایک شاہزادہ تھا۔ خوبصورت قصر وں، خوشنما کوشکوں اور شاداب و زرخیز وسیع ممالک کا تنہا وارث...... اور میں محض ایک رقاصہ جسے وہ ایک حسین کھلونا سمجھ کر پیار کرتا...... بالکل ایک کم فہم بچے کی طرح جو خوشنما اور شوخ رنگ کھلونے کو محض اس کے الوان کی وجہ سے اُسے زیادہ پائدار کھلونوں پر ترجیح دیتا ہے..... کیونکہ اُس کا معیار حسن نقوش صوری تک محدود تھا۔ اور اسی لئے اس کا پیار محض ایک رنگین شب کی وقتی وارفتگی اور ہنگامی استغراق آفریں مخمورگی تک رہتا۔ وہ مجھ سے اُس "نیم مدہوشانہ کیفیت" کا خواہاں تھا۔ جو اُس کے دل و دماغ پر تلخ و تیز شراب کی سُکر آفرینیوں کی طرح قبضہ جما کر کچھ دیر کے لئے اُس کو کائنات سے بے خبر رکھے..... اور میں بدقسمت بھی جنسیت کے ولولہ سے مخمور ہو کر اپنے آپ کو اُس کی دست درازیوں کے سپرد کر دیتی ——— آہ یہ پُرکیف گھڑیاں نسیم کی سی نرم خرامی سے گزر گئیں اور مجھے اُس وقت خبر ہوئی جب "شام تغافل" کی تند و تیز اور بے رحم ہوائیں بے لاگ میرے نازک جسم کو اپنے تلون سے ایذا دینے لگیں..... شہزادے کا شوقِ التفات کسی دوسری طرف جذب ہو کر رہ گیا۔ اب میری نظریں اُس خواب خلد نما کی سیر سے سیر ہو کر (مجبوراً) حقیقت کے گھناونے چہرے پر جم چکی تھیں۔ ہر طرف بجز یاس کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اُمید پڑی خاکِ مذلت پر ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔ تمنا سرنگوں تھی، آرزو خاک و خون میں لتھڑی ہوئی سسک رہی تھی۔ حسرت و ارماں الگ دم توڑ رہے تھے...... غرضکہ ہر طرف مایوسی اور تاسف انگیزیوں کے سوا

کچھ نہ تھا۔ اب میں بصد حسرت اپنے پُربہار ایام دوشیزگی کے کیف انگیز خواب ہائے جمالیں کو بصد حسرت خیر باد کہہ چکی تھی۔ ایک محرومِ التفات . . . . ایک پرستیدۂ شباب کے باغِ تمنا کی شادابیاں تغافل کی صرصر کے تلون سے مرجھا چکی تھیں ——— اب میری زندگی صرف اضطراب ——— اور آنسوؤں تک محدود تھی۔

انہی بربادگشتہ آرزوؤں اور تصوراتِ جمیل کی پائمالی پر مسلسل پانچ سال تک میں اشک فشاں رہی۔ مگر کل میری رہی سہی طمانیتِ قلبی بھی آنسوؤں کے ہمراہ رخصت ہوگئی جب میں نے شاہزادے کے "قصرِ نشاط" میں بربط و چنگ کی مخمور کن اور کیف انگیز لرزشوں کے ہمراہ دلآویز ترانوں کی مدہوشانہ جھنکاروں کے درمیان اُس کی شادی کا نغمۂ "تہنیت" سُنا ——— میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ . . . . . اسی وقت سے میں دیوی کے قدموں میں سرنگوں اور دوزانو اُس سے اس اذیت کے روح فرسا چکر سے نجات دے دینے کی التجا کر رہی ہوں . . . . . شاید میری شکستِ پندار (وہ پندار جس کے زیرِ اثر میں نے رنگین لمحات میں دیوی کے وجود کو تخلیقِ وآہمہ سے زیادہ اہمیت نہ دی) اور میری مسلسل گریہ زاری سے اُس کا دل نرم ہو جائے۔ اور وہ . . . . . . مجھے . . . . . . اپنے خونیں . . . . . پنجوں سے . . . . . . رہا . . . . . کر . . . . . . دے"۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"صبر کر میری بچی صبر کر . . . . . تجھ پہ دیوی کی رحمت ہو"! محافظ نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

(۳)

قدرے توقف کے بعد محافظ نے اس کا خوبصورت ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ دوسرے ہاتھ میں چراغ تھام کر آہستہ آہستہ چل کر سامنے کی دیوار پر منقش تصاویر کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا اور چراغ ہاتھ سے رکھ دیا۔ تفکر آگیں تصورات کی شکنیں اُس کی بلند اور صاف پیشانی پر اُبھر چکی تھیں۔ چہرے کے انداز و قرائن سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی سخت روحانی کشمکش میں مبتلا ہے۔ آخرش اُس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ ٹھنڈی سانس بھری اور کہنا شروع کیا۔

"میری بچی! دنیا ایک مسلسل اور غیر مختتم ہنگامہ ہے۔ سرد آہوں اور تنفر انگیز قہقہوں سے مرکب۔ یہ آہیں دل کی اتھاہ گہرائیوں میں پوشیدہ غموں کی ترجمان ہیں۔ مگر یہ قہقہے سراسر ریاکارانہ ہیں، محض ضمیر کی درد بھری آواز کو اپنی بلند بانگ شورش میں گم کرنے کے لئے . . . . .

لیکن اگر کسی کے دل میں زندگی کی تلخ حقیقت میں حلاوت پیدا کرنے کی آرزو ہے تو اُسے غیر حقیقی علائق اور زنجیروں کو توڑ کر خدا سے لو لگانا چاہیئے بچی! تو میری ان باتوں کو کسی مجذوب کی بڑ پر محمول نہ کر بلکہ یہ دیکھ ان تصاویر میں جو ہستی تجھے ان دشت ——— و کوہسار اور میدانوں میں مصروفِ عبادت نظر آتی ہے، آج سے ایک صدی پیشتر اسی معبد کی محافظ تھی ——— وہ جوان صورت اور وجیہہ تھا۔ اُس کا گداز جسم ریاضتوں کی سختیوں سے ناآشنا اور صبحِ بہار کی نوخیز کلی کی طرح شاداب اور نظر افروز تھا۔ میں نے سُنا ہے اُس کی ہستی میں ایک البیلا سحر ایک ایسی کشش تھی جو اُس کے ہر ملاقاتی کو کسی اندرونی مقناطیسی قوت کے زیرِ اثر اُس کا گرویدہ کر دیتی تھی۔ سننے والا اُس کے دلکش کلام کے مد و جزر میں خس کے بے کس تنکے کی طرح بہہ جاتا تھا۔ ———

یکایک اُس کی ہستی میں ایک انقلاب رونما ہوا۔ شہزادی عذرا . . . . . شہنشاہِ دوراں کی اکلوتی دختر . . . . . اسی معبد میں ایک قیمتی بھینٹ دینے اپنے خدام اور سہیلیوں کے ہمراہ آئی تاکہ اس کا باپ صحیح و سلامت میدانِ کارزار سے واپس آئے . . . . . . یہ تو فقط عالم الغیب کو ہی معلوم ہے کہ نوجوان محافظ اور خوبصورت شہزادی عذرا کے درمیان کیا گفت و شنید ہوئی۔ لیکن بعد کے واقعات سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے اُس کی پُرسحر گفتگو اور اُس کے انداز و قرائن شہزادی کے تعیش اور تفرج کی آغوش میں پلے ہوئے جذبات پر اثر کئے بغیر نہ رہے"۔

محافظ نے ایک آہ سرد بھری۔ پیشانی سے پسینہ خشک کیا اور کہا "دونوں کے دلوں میں محبت کا مقدس سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ مگر اُن کی محبت صنفی اتصال اور جنسی اشتراک وغیرہ کے "ارضی" جذبوں سے مبرا اور منزا اور "قدسی عشق جمیل" سے تپش اندوز تھی۔ دونوں انجام سے بے خبر اور بے پروا تھے۔ معبد کی تنہا فضاؤں میں وہ ایک دوسرے کی قربت و وجدان پرور سے لطف اندوز ہوتے گھنٹوں اور پہروں باتیں کرتے۔ اور پجاری شہزادی کو اپنے احساسات کا تحفہ حسین و جمیل الفاظ

کا لباس پہنا کر کانپتے ہوئے اور مرتعش ہونٹوں سے پیش کرتا۔ اور شہزادی عذرا صرف ایک سحر انگیز تبسم سے اس کا قصۂ امید مختصر کر دیتی۔ بالکل اسی طرح جیسے بلبل کی روئدادِ الم سن کر منہ بند کلی صرف مسکرا دیتی ہے . . . . وقت بگولے کی طرح گذرتا گیا میری بچی . . . . سہانے دن بہت تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ اور بدبختی اور ادبار سے مملو ایام قوانین فطرت کی طرح لامتناہی معلوم ہوتے ہیں — ہاں تو وہ منحوس گھڑی آئی۔ جب شہنشاہ کو ان دونوں کی مقدس محبت کا علم ہو گیا ——

دنیا خود غرض ہے میری بچی! اور اس کے ساتھ انتہا درجے کی کوتاہ اندیش بھی — شہنشاہ کی دانست میں شہزادی کا "پجاری" سے عشق ایک ایسی شکستِ پندار، ایک ایسا "ہبوط" تھا جسے اُس نے تمام تر جذبات تنفر و حقارت سے ملعون اور مردود کیا . . . . . . اور سخت غم و غصے سے مغلوب ہو کر اُس نے بے گناہ پجاری کو اس جرم کی پاداش میں اپنی قلمرو سے اُسی وقت نکل جانے کا حکم دیا۔ اور سرشارِ محبت جوڑے کو رجن پر یکایک عذاب کی دیوی کی قہر کی بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔ کیونکہ انہوں نے تیری طرح محبت کی فراموش کن وادیوں میں گم ہو کر اذیت کی دیوی کو بھینٹ چڑھانے کا خیال اپنے مدہوش ذہنوں سے اتار دیا تھا۔) آخری ملاقات . . . . . . وہ الم رُبا اور حسرت فزا ہی سہی . . . . . . کی بھی اجازت نہ دی۔

میں نے سنا ہے میری بچی! وہ ایک طوفانی رات تھی۔ رعد کڑک کڑک کر اُن کی بدقسمتی پر نالہ کناں تھی۔ تند و تیز ہوائیں اُن کی زبوں بختی پر ماتم کر رہی تھیں۔ بجلی چمک چمک کر اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے والے جلاوطن مسافر سے اظہارِ ہمدردی کر رہی تھی۔ آسمان پر قدسیانِ جمیل اُن کی اُفتادگی اور سرگشتگی پر اشک افشاں تھے۔ غرضکہ تمام ارض و سما پر ایک "تاسف" محیط تھا۔ اِس حالت میں مقہورِ محبت عذرا، عالی شان قصروں، عطر بیز کمروں اور خواب گاہوں اور نرم اور آرام دہ بستر کو چھوڑ کر بے تابانہ اِسی معبد کی طرف آئی۔ تیری طرح دیوی سے التجا کرے . . . . . کہ وہ اِس کا محبوب واپس لا دے۔ تمام رات وہ دیوی کی قربانگاہ پر جگر خراش آہوں اور خوں آمیز اشکوں کی بھینٹ چڑھاتی رہی۔ مگر دیوی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آخر ش ہنگامِ سحر جب بارش تھم چکی تھی اور ستارۂ صباحی عروسِ نو کی طرح ہنستا لجاتا اپنے آسمانی شبستان سے بساطِ چرخ پر جلوہ گر ہوا۔ تو عشق کے دیوتا کو اُس کی زبوں حالی پر رحم آیا۔ اور اُس نے زہرہ کی وساطت سے یہ پیغام اُسے سنایا "اس جہانِ خراب میں اجتماع کا نتیجہ فراق یقینی ہے۔ لیکن افتراق زدہ اور مہجور روحوں کو ارضی قالب تیاگ کر میری قلمرو میں بود و باش اختیار کرنی چاہیئے۔ میری قلمرو میں آنے کے بعد ان روحوں کو ارضی تفریق کے عذابِ جانگداز سے ابدی نجات مل جائے گی۔ میری بادشاہت قدسی ہے۔ اور رجن سرمدی انوار سے یہ جلوہ پوش ہے اُن کی پاک گرمی اور روشنی سے وصل، قربت اور اتصال کے سدا بہار نہال پروان چڑھتے ہیں" شہزادی نے یہ سن کر اپنا نازک بیش قیمت نکالا۔ ٹھیک دل کے مقام سے گرم تازہ اور محبت آلود خون کی دھار نکلی۔ جو دیوی کے خون آشام چہرے کو ہمیشہ کے لئے رنگین کر گئی"۔

محافظ کی آواز میں رقت تھی۔ بڑے بڑے اشکوں کے قطرے اُس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ عورت یہ روئدادِ تحیر فزا سنتے سنتے نقش بدیوار بن چکی تھی۔ محافظ کی سسکیوں نے اس کا انہماک توڑا۔

"پھر کیا ہوا مقدس باپ . . . . . .؟"

میری بچی۔ شہزادی عذرا تو آسمانی بادشاہت میں پہنچ گئی۔ جہاں ایک جاودانی نور نے اُس کی روح کو منور کر دیا۔ اور اس کی ازلی پیاس شرمندۂ تسکین ہو گئی۔ مگر غریب اور حرماں زدہ پجاری نے برسوں سخت ریاضت کی۔ اپنے وجود کو بھلایا۔ حتیٰ کہ اس فراموش کاری کو بھی بھلا دینے کی سعی کی۔ آخر مدتوں کے بعد اسی جاودانی اور سرمدی انوارِ عشق نے اُس کی روح کو بھی منور کر دیا۔ اور وہ عین حیات میں ہی آسمانی بادشاہت میں درخورِ التفات سمجھے جانے کے منصبِ جلیلہ پر سرفراز ہو گیا"۔

"لیکن مقدس باپ میں . . . . . .؟"

"میری بچی بے تاب نہ ہو . . . . محبت کے دیوتا کا وہ قول یاد کر کہ افتراق زدہ اور ہجر کے صدموں سے ماری ہوئی بدنصیب ہستیوں کو ارضی قالب تیاگ کر میری بادشاہت میں آ جانا چاہیئے۔ جہاں "ارضی تفریق" کی تلون خیز بادِ صرصر کا گزر نہیں . . . . قربانی میری بچی . . . . . . نذرانۂ جان . . . اور پھر ابدی راحت!"

محافظ کی آواز آہستہ آہستہ اس کے گلے میں اٹک گئی۔ معبد میں پھر وہی عمیق سکوت فضا کی گردنوں پر رقص کر رہا تھا . . . . . . !

مختار صدیقی

دنیائے ادب

زندگی میری نظر میں

اختر شیرانی اردو زبان میں محبت اور حُسن کا سب سے نمایاں نغمہ خواں ہے، لیکن اب تک اُس کی ذہنیت کو لوگوں نے اُس کے رسیلے کلام ہی سے جانا ہے، ذیل کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشق کے ایسے لطیف جذبے کا یہ ترجمان اپنے نغموں کی تہ میں کیسے گہرے اور زندہ فلسفے کو لئے ہوئے ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ترقی پسند ادبیات کے متعلق جو کچھ ادبی دنیا کے ادارتی کالموں میں اب تک لکھا جاتا رہا ہے، اس مضمون میں آپ کو اُس کی ایک پُر زور بازگشت ملے گی۔ اختر نے جس زاویے سے زندگی کو دیکھا ہے ہماری رائے میں وہی ایک شاعر کا صحیح زاویۂ نگاہ ہے ۔ شاعر سر تا سر ایک آرٹسٹ ہے وہ رہبرِ وطن یا مصلحِ قوم نہیں۔ وہ ہمیں زندگی کی سنسان رات میں اپنی سریلی بنسری کی ایک مدھ بھری تان سنانے آیا ہے۔ ہمارے شانے جھنجھوڑنا اُس کا کام نہیں۔ اختر کا اندازِ نظر آج کل کے "افادی" ماحول میں کچھ اجنبی سا محسوس ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک سچا شاعر اس سے مختلف اندازِ نظر اختیار کر ہی نہیں سکتا۔

ادارہ

جس زمانے میں میری شاعری کی ابتدا ہوئی، اُس زمانے میں ترقی پسندی کے لفظ یا تخیل کا کہیں وجود نہ تھا۔ اس وقت علامہ اقبال مرحوم زندہ تھے۔ لیکن ان کی شاعری کے خلاف بھی ایک ردِّ عمل ضرور شروع ہو چکا تھا۔ ادبی طبقہ اقبال کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے بھی کوئی "حرفِ دلآویز" سننے کے لئے بے تاب تھا۔ میرے نزدیک یہی وجہ ہے کہ میری نظمیں "اے عشق کہیں لے چل"، "اعترافِ محبت" اور "دیس سے آنے والے بتا" وغیرہ بے حد مقبول ہوئیں۔ اور لوگوں نے میری توقع سے زیادہ ان کی پذیرائی کی۔

میں اقبال کو اپنے زمانے کا ایک بہت بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔ ہم نے صدیوں کے بعد ایک ایسا شخص پیدا کیا جس کا ہاتھ زمانے کی نبض پر تھا اور جو زمانے کے دل کی دھڑکن کو پہچانتا تھا۔ اقبال کی ذہنی توانائی اس کی فراست، اس کے ادراک اور اس کی صناعی کی داد نہیں دی جا سکتی۔ البتہ اس کے کلام میں ایک چیز جس کی خطرناک حد تک کمی نظر آتی ہے، یہ ہے کہ انسان اور فطرت پر اس کی نظر ایک فن کار کی نظر بن کر نہیں پڑتی جس نظر سے وہ انسان اور فطرت اور ان کے باہمی تعلق کو دیکھتا ہے۔ اس کی تہ میں یہ احساس نہیں پایا جاتا کہ تخلیق کا مقصد ایک لازوال حسن، ایک جاودانی مسرت اور ایک ابدی لذت کی پیدائش ہے۔ اقبال فطرت اور انسان کے باہمی آہنگ کو نہیں دیکھتا ان کے مشترکہ سرچشمے کا اُسے احساس نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطرت اور انسان کے درمیان ایک ازلی کشمکش اور ایک دائمی آویزش کا قائل ہے۔ وہ فطرت کو انسان کے لئے ایک آلۂ کار سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا۔ وہ فطرت پر انسان کی برتری کا قائل ہے اور فطرت پر غلبہ پانے کا اُسے حقدار سمجھتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اقبال دنیا کی کسی دو چیزوں میں آہنگ کا قائل نہ

تھا۔ اس کے جس مفروضے پر بھی آپ نظر ڈالیں اس سے یہی پایا جاتا ہے کہ اس کے نزدیک ہر چیز دوسری چیز پر غالب آنے اور اسے گرا کر آگے بڑھنے کے لئے بیتاب ہے۔ اس کی شاعری میں عقل پر عشق کے غلبے، فطرت پر انسان کی حکومت، حسن پر افادیت کی فوقیت اور فرد پر قوم کی فضیلت کے تصورات بار بار آتے ہیں۔ اس کے ہاں خودی اور عمل کے نظریے بھی اسی کشمکش کے احساس کا قدرتی نتیجہ معلوم ہوتے ہیں وہ صرف فطرت ہی پر غلبہ پانے کے لئے انسانوں کو نہیں ابھارتا۔ بلکہ خود انسانوں کے اندر ایک جماعت کو دوسری جماعتوں پر یا زیادہ جماعتوں کو دوسری جماعتوں پر حکومت کرنے کی بھی تبلیغ کرتا ہے اس تمام تخیل میں جو بنیادی اعتراض ہمیں ہے، یہ ہے کہ شاعر کی نگاہ فطرت اور انسان یا انسانوں کے باہمی ربط اور آہنگ کو دیکھ سکتی ہے نہ اُن کے باہمی تعاون کی ضرورت ہی کو سمجھتی ہے۔ اقبال کے فلسفے کا نچوڑ یہ ہے کہ انسانوں کے کسی نہ کسی گروہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی خودی کی تربیت اس طریقے سے کرے کہ دوسرے گروہوں کی خودی پر غلبہ پانے کی راہیں آسان ہو جائیں۔ وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ ہر انسانی ضمیر کی خلوتگاہ میں بقول راشد "خودی کی جو ننھی سی قندیل" روشن ہے اسے بھی چمکنے کا وہی حق حاصل ہے جو کسی بڑے سے بڑے چراغ کو ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک دنیا کے اس نگارخانے کی زینت و آرائش کا بڑا راز یہی ہے کہ اس کی ہر قندیل اپنی جگہ روشن رہے اور دوسری قندیلوں سے مل کر اور اُن سے ہم آہنگ ہو کر اس نگارخانے میں رنگ اور نور کا ایک سیلاب برپا کرتی رہے کوئی ایک قندیل دوسری قندیلوں کو اپنے ساتھ جنگ آزمائی کی دعوت نہ دے نہ اُسے چیلنج کرے۔ نہ اُسے بجھا کر خود شعلۂ جوالہ بن جانے کی خواہش رکھے۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا یہی محسوس کیا کہ دنیا کو پیدا کرنے والی ہستی کا مقصد حسن اور مسرت کو عالمگیر اور دائمی بنانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہمارے چاروں طرف حسن و رنگینی اور نور و سرور کا ایک سیلاب ہے جو ہر چیز پر چھا رہا ہے خدا نے جہاں فطرت کے مناظر کے اندر ایک سادہ اور دلکش حسن پیدا کیا ہے۔ وہیں انسان کے وجود میں بھی ایسی حسین صلاحیتیں رکھ دی ہیں کہ وہ فطرت کی زینت میں اضافے کا باعث ہوں، اور اس کے لئے غازہ و گلگونہ کی گلکاریاں بہم پہنچائیں۔ اس میں شک نہیں کہ انسان نے فطرت کے حسن اور اپنی اہمیت کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے اکثر فطرت کو اپنی ہوس نگاری اور زیاں کاری کا شکار بنایا ہے۔ وہ فطرت کا دوست بننے کی بجائے اس کا رہزن بن گیا ہے۔ یا اس کی رہنمائی کے پردے میں اس کی صورت کو مسخ کرنے میں مصروف رہا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ انسان دنیا بھر کے جذبات سے زیادہ لطیف جذبے کو جس کا نام عشق ہے، اپنی شیطنت اور ہوس کا آلۂ کار بنا کر رہ گیا ہے۔ انسان نے فطرت کی اس نعمت کو فطرت کے حضور میں عبودیت کے اظہار کا ذریعہ بنانے کی بجائے اکثر اس پر غالب آنے کا بہانہ بنا لیا ہے۔ انسان کی اس مکاری یا غلط فہمی کی وجہ سے فطرت کے ساتھ اور اپنے آپ کے ساتھ بارہا اُس کی ٹکر ہوئی ہے۔ یہ ٹکر کہیں جرائم کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے کہیں جنگ کی شکل میں اور کہیں معاشی مقابلہ بن کر یہ سب عصبیتیں اس عقیدے کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ جو ایک انسان کی خودی پر دوسرے انسانوں کی خودی کو غالب دیکھنے کا قائل ہے۔ ہم رنگی اور اتحاد کا نہیں۔

جن لوگوں نے میرے کلام کا توجہ سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ میں نے کبھی اپنی شاعری میں فلسفہ، سیاست یا اس قسم کے دوسرے بیرونی اور دور از کار عناصر کو داخل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ مجھے احساس ہے کہ میری شاعری اس آرزو کی پیداوار ہے کہ میں زندگی کے حسن کو زیادہ روشن کر سکوں۔ مجھے کبھی تو مرجھاتی ہوئی کلیوں کا حسن لبھاتا ہے کبھی نغمے کی دلآویزی اپنی طرف کھینچتی ہے کبھی رنگ اور نور کی فراوانی دیکھ کر دیوانہ ہو گیا ہوں۔ اور کبھی دنیا کے تمام رنگ و بو اور نور و نغمہ کی تمثیل یعنی عورت کے جسم کی دلکشی پر مرمٹا ہوں۔ میری زندگی میں غم انگیز واقعات کی کمی نہیں۔ لیکن ان واقعات نے آج تک مجھے کبھی زندگی سے بیزار نہیں کیا۔ زندگی سے نفرت نہیں دلائی بلکہ شاید زندگی کی ان ہی شوخیوں کو دیکھ دیکھ کر اس کی لازوال حقیقتوں سے قریب تر ہوتا چلا گیا ہوں۔

میں نے جب شعر کہنا شروع کیا تھا تو شاعری کے افادی مقصد کا وہ تصور کہیں موجود نہ تھا۔ جسے آج ترقی پسندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس تخیل نے کافی فروغ پا لیا۔ لیکن میں اسے مغربی فیشن کی تقلید سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتا۔ ترقی پسند

بھی یورپ والوں کی نقالی ہی کا ایک کرشمہ بن کر رہ گئی ہے۔ اسے بھی مغربی عقل و فراست کے خزانوں سے اسی طرح چرایا گیا ہے۔ جس طرح کئی اور عقیدے، رسمیں اور رواج ان کے ہاں سے ہم نے چرائے ہیں اقبال کی افادی شاعری ہیں فطرت، انسان کی ایک کنیز سہی لیکن خوبصورت اور دل سے قریب تر ہے۔ مگر ہمارے ترقی پسندوں کی شاعری کے ہاں تو اس کا چہرہ اتنا گھناؤنا اور مکروہ نظر آتا ہے کہ ایک خوش مذاق شاعر اسے دور سے دیکھنے کی بھی تاب نہیں لاسکتا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ شاعر کا کام زندگی کے حسن کو خود دیکھنا اور دوسروں کو دکھانا ہے۔ زندگی کے ناسوروں کے علاج کی کوشش کرنا اس کا کام نہیں۔ زندگی میں "ہر کارے و ہر مردے" کا اصول ہر جگہ کارفرما ہے۔ اپنی روزمرّہ کی زندگی ہی سے اس کی مثال مل سکتی ہے۔ مثلاً درزی کا کام آپ کے جسم کو چھپانا اور ایسے لباس سے چھپانا ہے جو آپ کے جسم پر خوبصورت معلوم ہو لیکن اگر آپ کے پاؤں پر کوئی زخم ہو تو آپ درزی سے اس بات کی توقع نہیں رکھتے کہ وہ آپ کے جسم پر پوشاک پہنانے سے پہلے آپ کے زخم کا علاج بھی خود کرے۔ کون نہیں جانتا کہ زخموں کو اچھا کرنا جرّاح یا طبیب کا کام ہے۔ اسی طرح شاعر کا کام، زندگی سے حسن حاصل کر کے انسانوں کی روح کو زیبائش دینا ہے۔ اس کا کام ان کی روحوں کے چھپے ہوئے زخموں کو نمایاں کرنا یا ان کے علاج کی کوشش کرنا ہرگز نہیں۔ اسی لئے میں آج تک اس نام نہاد ترقی پسندی کا قائل نہیں ہوسکا۔ جو ہمارے ملک میں بدقسمتی سے رواج پارہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانے نے بعض ایسے ناگوار مسئلے ہمارے سامنے لا رکھے ہیں جن سے گریز ممکن ہے، نہ مصالحت۔ سیاست میں عوام کی آوازادرخیالات کا اثر بڑھ گیا ہے۔ اقتصادی کشمکش ہمہ گیر ہوتی جارہی ہے۔ یہاں تک کہ ہماری دنیا کے نیم وحشی اور پسماندہ سے پسماندہ ملک بھی اس کے تاثرات سے نہ بچ سکے۔ بلکہ شاید مہذب ملکوں سے کہیں زیادہ متاثر ہوئے ہیں تجارتی لوٹ کھسوٹ کی گرم بازاری نے سماج کے ہر ایک طبقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اور بے شمار گروہ اور ملک ہماری دنیا کے خوبصورت جسم پر بڑے بڑے ناسور بن کر رہ گئے ہیں۔ ہم شاعر بھی انسان ہونے کی حیثیت سے ان اثرات کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کر سکتے لیکن ہمارا ان ناسوروں کی جراحی کر کے انہیں ٹھیک کرنے کی کوشش کرنا ایک اناڑی کی کوشش سے کم نہ ہوگا۔ ان کا علاج تو سیاسی اور اقتصادی ماہروں کے ہاتھ میں ہے۔ اور انہیں پر علاج کا فرض بھی عاید ہوتا ہے۔

شاعری افراد اور اقوام کے لئے ایک لطیف اور لذیذ غذا تو بن سکتی ہے۔ جو ان کے ذائقے کی تشفّی کرے اور ان کی عمدگی کو برقرار رکھے لیکن اس سے بیمار اور بوڑھی قوموں کے حق میں "معجون شباب آور" کا کام لینا میرے نزدیک بہت بڑی زیادتی ہے۔ ترقی پسندی کی تحریک کو جس قدر بھی فروغ اب تک حاصل ہوا ہے۔ اس کا باعث اس کے بنیادی تصوّر کی دلکشی نہیں بلکہ اس کے لیبل کی دلکشی ہے اس کے لیبل کو دیکھ کر ذہن سب سے پہلے ترقی کے لفظ کی طرف منتقل ہوتا ہے اور اکثر لوگ اسی وجہ سے ترقی پسندوں کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ اس تخیّل نے مزدور، کسان اور فقیر کی اہمیت کو تو نمایاں کیا ہے لیکن اس نے حکمت اور صنّاعی کے اس مفہوم کا خاتمہ کر دیا ہے جس نے شکسپیر، کالیداس، حافظ، سعدی اور غالب کے نام کو زندہ کیا تھا۔

مجھے اور میرے ہم خیال شعراء کو جن کے فن کا مقصد زندگی کے حسن کی پرستش اور پرورش کرنا ہے۔ عام طور پر رجعت پسند کہا جاتا ہے ہمیں عام طور پر فراری کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور ان ترقی پسند شاعروں کو فراری نہیں کہا جاتا جو زندگی کے بعض مکروہ اور ناگوار پہلوؤں کو نمایاں کر کے زندگی سے نفرت اور بیزاری پیدا کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اگر کوئی چیز ہمیں زندگی کے قریب لاسکتی ہے۔ تو وہ صرف زندگی کے حسن کا احساس ہے۔

میرے نزدیک شاعر کے لئے اپنے آپ کو کسی سیاسی یا اقتصادی نظام سے وابستہ کرنا ضروری نہیں۔ وہ نظام سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت جمہوریت ہو یا فاشیت، شاعر کے لئے ان میں سے ایک بھی قابل توجہ نہیں۔ شاعر کی قدریں یعنی (VALUES) ان سب سے الگ اور آزاد ہیں۔ شاعر کی مثال شہد کی مکھی کی سی ہے۔ جو زندگی کے باغ سے حسن کی شادابیوں اور رنگینیوں کا رس لے کر دوسرے انسانوں کی مسرت اور تسکین کا سامان تیار کرتی ہے۔ اس کا کام باغ کو صیاد یا باغبانی کے نقطۂ نظر سے دیکھنا نہیں، نہ ان کے کام میں دخل دینا اس کے بس کی بات ہے۔

شاعری پر میں نے اس لئے آپ سے مفصل گفتگو کی کہ میں اپنی شاعری کو اپنی زندگی سے علیحدہ نہیں جانتا۔ یہی میری زندگی کا تار و پود اور یہی میری زندگی کی روح رواں ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کو کسی اضافی چیز کے بغیر سمجھنا اور سمجھانا ویسے بھی ناممکن ہے۔ ایک عرصہ ہوا میں نے ایک سائنٹ لکھا تھا جس میں میں نے اس احساس کو واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ زندگی اپنی تمام ہمہ گیری کے باوجود ایک ایسی چیز ہے جسے سمجھنا ہمارے لئے بے حد دشوار ہے۔ یہ سائنٹ میں آپ کو سناتا ہوں، اس میں میں نے زندگی کو ایک پرندے سے تشبیہہ دی ہے جو راستہ بھول گیا ہو، کہیں پہنچنا چاہتا ہو لیکن افق کی پہنائیاں اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوں، اور وہ آخرکار انہیں پہنائیوں کے قفس میں قید ہو کر رہ گیا ہو۔

زندگی مست ہے اُس طائرِ ناداں کی طرح
جو ہو نہا نگراں دور فضاؤں کی طرف
مہ و خورشید کی زرکار ضیاؤں کی طرف
محو نظارہ کبھی نرگس حیراں کی طرح
اور کبھی بال فشاں بوئے خیاباں کی طرح
مسکراتی ہوئی شاداب گھٹاؤں کی طرف
وادیٔ کوہ کی مستانہ ہواؤں کی طرف
نکہت گل کدۂ و سیل بیاباں کی طرح
آرزوئے اڑنے کی کرتی رہے بیتاب سدا
پر نظر آئے نہ تسکین کا انداز اس کو
یوں ہی ترساتی رہے حسرتِ پرواز اس کو
نارسائی کی خلش سے رہے بے خواب سدا
کبھی آرام نہ دے حسرتِ پرواز جیسے
اپنا انجام نظر آئے نہ آغاز جیسے

"ساقی" جون
بحوالۂ آل انڈیا ریڈیو دہلی

اختر شیرانی



مئی ۱۹۴۲ء
جلد ۲۰
نمبر ۵ (۵)

فہرست مضامین

ایڈیٹر۔
صلاحُ الدین احمد
آنریری جائنٹ ایڈیٹر
میراجی

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک و وی پی پانچ روپے۔ ممالک غیر سے دس شلنگ فی پرچہ چھ آنے

[illegible] دفتر [illegible] روڈ لاہور سے شائع کیا۔



دنیائے کاروبار

"ایک رات" جنوبی ہند میں

حیدرآباد میں شاندار افتتاح

حیدرآباد دکن میں ایک رات کا شاندار افتتاح ۴ر جولائی کو زمرد محل ٹاکیز میں ہوا۔ ایک رات کی مقبولیت کی ادنیٰ سی مثال یہ ہے کہ دوسرے روز ہی والاشان ہز ہائی نس پرنس آف برار شہزادہ اعظم بہادر اپنے سٹاف کے ساتھ فلم دیکھنے تشریف لائے اور اسے بے حد پسند فرمایا علاوہ ازیں حیدرآباد دکن کے تمام اعلیٰ افسروں نے "ایک رات" کو پہلے ہفتے میں دیکھا۔

کیپٹن ایم مہدی علی آفیسر کمانڈنگ اے آئی سی ہیڈ کوارٹرز سیف آباد لائنز حیدرآباد دکن فرماتے ہیں کہ ایک رات کا افسانہ اور اس کی ڈائرکشن بے مثال ہے پس منظر موسیقی اپنا جواب نہیں رکھتی۔

میجر کنور شیام سنگھ بہادر کا ارشاد ہے کہ ہم نے ایسی عمدہ صاف ستھری زبان کسی فلم میں نہیں سنی۔ نینا کی اداکاری پر ہم مسٹر احمد کو مبارکباد دیتے ہیں۔

یہ خبر

نہایت مسرت سے سنی جائے گی کہ مسٹر فقیر چند آنند سنٹرل بنک آف انڈیا لمیٹڈ لاہور کے سب ایجنٹ انسٹی ٹیوٹ آف بنکرز لندن کے فیلو منتخب ہوئے ہیں۔

(باقی سلسلہ کاروبار صفحہ ۲۷ پر ملاحظہ ہو)


چلو چائے پئیں
خاندان کے پینے کی چیز
ہندوستانی چائے
ایک گھریلو بیوی جب دوسرے گھریلو بیوی کے
بیٹھ کر بات چیت کرتی ہے تو کہتی کہ چلو چائے پئیں۔ گھر کے
چھوٹے بڑے کاموں کے بعد تازہ دم ہونے کیلئے چائے
ایک ضروری شے ہے۔ آپکو یقین کرنا چاہئے کہ اس
طرح دو عورتوں کا مل کر چائے پینا آج کل
ہندوستانی گھروں میں عام رواج ہو گیا ہے۔ آپ
بھی ہمیشہ اپنے دوستوں سے چائے پر ملاقات کیجئے۔

بزمِ ادب

حال ہی میں لندن سے ڈاکٹر ٹی گراہم بیلی کی افسوسناک وفات کی خبر موصول ہوئی ہے۔ ڈاکٹر بیلی ان قابل ترین مستشرقین میں سے تھے جنہوں نے اپنی عمریں علوم و السنۂ مشرقیہ کی تحصیل میں صرف کر دیں۔ مرحوم ایک عرصہ دراز تک وزیر آباد کے مقام پر مشن ہائی سکول کے پرنسپل کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اور پچیس برس کی اس مدت میں انہوں نے اردو ہندی اور پنجابی کے علاوہ تبتی زبان میں بھی مہارت تامہ حاصل کی۔ وہ پنجابی ایسی روانی اور خوبی سے بولتے تھے کہ اگر ان کی جلد سفید نہ ہوتی تو کوئی شخص انہیں یورپین تصور نہیں کر سکتا تھا۔ کم و بیش ایسی ہی مہارت انہیں اردو میں حاصل تھی جسے وہ نہایت صفائی اور برجستگی سے بولتے اور لکھتے تھے۔ افسوس ہے کہ ۱۹۱۹ء کے ہنگامے میں لسانیات سے متعلق ان کے چند نہایت قیمتی مسودات نذرِ آتش ہو گئے۔ اور وہ دل شکستہ ہو کر واپس انگلستان چلے گئے لیکن وہاں پہنچ کر بھی ان کے ذوقِ علم و زبان میں کوئی کمی نہیں آئی اور لندن یونیورسٹی میں اردو اور ہندی کے استاد کی حیثیت سے بیس برس تک کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۰ء میں وہاں سے سبکدوشی حاصل کرنے کے بعد بھی ان کے علمی مشاغل جاری رہے اور موت کے وقت وہ اردو کی ایک جدید قواعد لکھنے اور کشمیری زبان میں انجیلِ یوحنا کا ترجمہ کرنے میں مصروف تھے۔

ان کی تصانیف میں پنجابی کا ایک جامع فرہنگ، شمالی ہند کی پہاڑی زبانوں پر متعدد کتابچے، اردو ادب کی ایک تاریخ اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے لسانی مضامین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اشاعت زیرِ نظر کے تینوں علمی مضامین نہایت دلچسپ، نتیجہ خیز اور خیال انگیز ہیں۔ مختار صدیقی نے "کتابوں میں مصنف کا پرتو" لکھ کر ہمارے ہاں ایک نئی بحث کا آغاز کیا ہے۔ اور بکمال جرأت سے کام لے کر ایک ایسا موضوع چھیڑا ہے جو بیک وقت نہایت دلکش اور بیحد نازک ہے۔ اگر ہمارے وہ مقالہ نگار احباب جنہیں بعض مصنفین کا قریبی مطالعہ میسر ہوا ہے، اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں تو یہ سلسلہ ہمارے ادب میں ایک یادگار سلسلہ ثابت ہوگا۔

جناب یسین مدنی کا قیمتی مضمون "ریختی کا آخری شاعر" اپنی جامعیت اور صحت کے لحاظ سے خاص توجہ کا مستحق ہے۔ جن حضرات کو ادب کی اس صنف سے دلچسپی ہے، وہ اسے بے حد کارآمد پائیں گے۔

مسعود احمد صاحب قریشی نے "ادب میں نظمِ معرّا کا درجہ" متعین کرنے میں جو زورِ قلم صرف کیا ہے، امید ہے کہ وہ اُن اصحاب کے زاویۂ نگاہ میں ضرور کچھ تبدیلی پیدا کر دے گا جو اب تک اسے اس کا حق دینے پر تیار نہیں تھے۔ اس مضمون کو منطقی لحاظ سے ایک آہنی زنجیر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس کی ہر کڑی دوسری سے مربوط اور بجائے خود بے حد مضبوط ہے۔ ان سطور کا راقم ذاتی طور پر غزل کا بہت بڑا حامی ہے اور اس کی اولیت اور اہمیت کا معترف۔ لیکن اس مضمون میں وہ چند ایسے حقائق سے دوچار ہوا ہے جو قطعاً ناقابلِ انکار ہیں، پڑھیے اور غور کیجیے۔

افسانوں میں جناب عاشق حسین بٹالوی کی کہانی "شادی خانہ آبادی" ایک مزیدار اور ہلکی پھلکی چیز ہے جسے انہوں نے اپنے مشاہدات کے پراسرار مخزن میں سے چپکے چپکے نکالا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عاشق صاحب ایک خوش صحبت ادیب ہیں لیکن حال ہی میں انہوں نے اپنے ملنے والوں کو جس طرح رسوا کرنا شروع کیا ہے اس کے پیشِ نظر یہ توقع رکھنی چاہیے کہ لوگ اب ان سے ذرا سوچ سمجھ کر میل ملاقات بڑھائیں گے۔ ابھی کل کا واقعہ ہے کہ ہمایوں میں ڈاکٹر یزدانی بے طرح بے نقاب کیے گئے تھے آج ادبی دنیا میں ڈاکٹر جمالی منظرِ عام پر لائے گئے ہیں۔ خدا جانے کل ان کا تیرِ نگاہ کس کو نشانہ بنائے گا۔ خدا اپنی پناہ میں رکھے۔

پروفیسر موہن سنگھ صاحب کا افسانہ "گرمی کی چھٹیوں میں" عورت پر سماج کے ظلم کا ایک عبرت انگیز مطالعہ ہے جسے نہایت چابکدستی سے سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ پروفیسر صاحب اردو میں بہت کم لکھتے ہیں لیکن جب لکھتے ہیں تو اپنے موضوع سے پورا انصاف کرتے ہیں۔ امید ہے کہ وہ ادبی دنیا کی محفل میں اب اکثر نظر آیا کریں گے۔

مرزا مسعود الحسن صاحب پہلی بار ان اوراق کو زینت بخش رہے ہیں "سہارا" کے عنوان سے جو دلفریب افسانہ انہوں نے لکھا ہے وہ ان کی نوجوانی اور نومشقی سے قطعاً غیر متناسب ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے طبیعت پر کچھ اور زور دیا تو ان کی تحریر اپنی دلکشی اور روانی کے لحاظ سے قابلِ رشک ہو جائے گی۔ اس نوعمری پر ان کے خیالات کی پختگی خصوصیت سے قابلِ داد ہے۔

افسوس ہے کہ ادبی دنیا کے گزشتہ شمارے کے حصۂ نظم میں سہوِ کتابت سے احمد ندیم قاسمی صاحب کی نظم "شکاری" کا چوتھا اور پانچواں بند مل کر ایک ہو گیا اور اس طرح کچھ مصرعے بے ربط ہو گئے۔ ذیل میں وہ دونوں بند علیحدہ علیحدہ دیئے جا رہے ہیں، ناظرین تصحیح فرما لیں نیز جناب مراتب علی ثاقب کی غزل کے پانچویں شعر میں "فقر" کی بجائے "قمر" چھپ گیا ہے، اصل شعر یوں ہے:

مبارک تجھ کو ذلتِ شاہی کہ میرے فقرِ باطل کو — ملے ہیں جس کے ابلیس لاکھوں ہمدم و دمساز

مذکورہ بند:۔

وہ مجھ کو دیکھتے ہی اپنے راستے سے ہٹ گئی
سمٹ کے یوں پلٹ گئی
کہ جیسے اک پتنگ کی فضا میں ڈور کٹ گئی
مرے خدا یہ کون ہے

وہ پھیلی پھیلی جھاڑیوں کی آڑ میں دبک گئی
دبک کے یوں سرک گئی
کہ جیسے ناگن اٹھی اور گھاس میں لپک گئی
مرے خدا یہ کون ہے

صلاح الدین احمد

ریختی کا آخری شاعر

ادبی دنیا بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۰ء میں میرا ایک مضمون "بیگم کی ریختی" طبع ہوا تھا، معلوم نہیں اس مضمون میں کیا بات تھی کہ اکثر اصحاب کو ناگوار گذرا، چنانچہ سب سے پہلے ایک بزرگ نے جو "آثار غنیقہ" سے واقع ہوئے ہیں جھٹ منہ پر نقاب ڈال صدیقہ بیگم[1] بن کر رسالہ عالمگیر بابت ماہ مئی ۱۹۴۲ء میں "آرسی کی ایک جھلک" کے عنوان سے اپنی بھڑاس نکالی بے چاروں میں اخلاقی جرأت اتنی نہ تھی کہ اپنے نام سے لکھتے، لگے پردے میں بیٹھ کر تبصرہ فرمانے ـــــ صدیقہ بیگم صاحبہ کو اس مضمون میں سب سے بڑی خرابی یہ نظر آئی کہ میں نے شیدا کے ہوتے بیگم کو ریختی کا شاعر اور استاد مانا ہے اور بیگم کا جو کچھ کلام پیش کیا گیا ہے وہ تذکرۂ ریختی وغیرہ سے ماخوذ ہے۔ اور سب سے زیادہ انہیں جس فقرے نے برہم کیا وہ یہ تھا،

"شیدا صاحب دریاباد کے ہیں ان کو بیگم پر صرف ایک فضیلت حاصل ہے کہ انہوں نے دیوان مرتب کر کے چھپوا لیا ہے۔ یوں ریختی خوب کہتے ہیں مگر بیگم کی سی بات اُن میں کہاں۔"

اس فقرے نے بقول انہیں کے ان کا دل الٹ دیا، اب کیا تھی جھٹ بیگم صاحبہ نے اپنی نگارروالی یادداشت نکالی کہ دیکھوں بیگم اور شیدا کے بارے میں صاحب "تذکرۂ ریختی" کا کیا فیصلہ ہے۔ وہاں لکھا پایا۔

"مجموعہ آرسی میں غزل کے علاوہ قصیدہ اور سلام بھی ہیں، زبان میں بیگم جیسا چونچلا نہیں مگر پھر بھی شعر اچھے کہتے ہیں اور آپ کی ریختیوں میں جدید رنگ جھلکتا ہے۔"

اس پر صدیقہ بیگم صاحبہ نے تبصرہ فرمایا ہے۔

"کاش کاظمی صاحب وہ زبانی چونچلے" اور تسکین صاحب وہ "بیگمی بات" مجھے بھی دکھا اور سنا دیتے تو میں ٹھنڈے دل سے ایسے شیدا کے روبرو پیش کرتی اور باادب ان سے درخواست کرتی کہ اب آپ بھی کچھ ویسے چونچلے اور بیگمی باتیں تسکین کی تسکین اور کاظمی کے صبر و تحمل کے لئے گڑھیے مگر یہاں دعویٰ بے دلیل ہے چپکے سے آمنا و صدقنا کہہ کر حلق سے نیچے اتار لیجئے۔۔۔"

ان فقروں کو پڑھ کر تسکین کو تو تسکین ہو گئی، شاید کاظمی صاحب بھی ایک پردہ نشین کے اعتراض پر صبر ہی کر بیٹھے ہوں گے،

صدیقہ بیگم صاحبہ نے اس مضمون میں امکان بھر کوشش شیدا کی استادی جتانے اور بیگم کو گھٹانے کی کی ہے، شیدا میں حسب ذیل محاسن انہوں نے پائے ہیں جن کو اشعار دے دے کر ثابت کیا ہے چونچلا، طنز، جذبات نگاری، مضامین ہجر و فراق، روزمرہ، اور ان محاسن کو دیکھ کر محترمہ صدیقہ اس قدر آپے سے باہر ہو جاتی ہیں کہ ـــــ

روزمرہ کا بادشاہ شیدا ہے اور شیدا ع

پڑا رہے یہ سخن کان میں گہر کی طرح

تک لکھ دیتی ہیں۔

محترمہ صدیقہ کے اس مضمون کا جواب دینا ظلم تھا اس لئے خاموشی اختیار کرنا پڑا محترمہ نے اس کو نیم رضامندی پر محمول کیا ہو گا مگر اپنی دانست میں "جواب جاہلاں" سمجھتے رہے۔

صدیقہ بیگم صاحبہ کو گہر افشانی فرمائے دو مہینے بھی گزرے نہ تھے کہ ادبی دنیا بابت جولائی ۱۹۴۱ء میں "بیگم کی پہیلی" کے عنوان سے "حسانِ سخن" کا ایک مقالہ جو اپنی جگہ نہ صرف بیگم والے مضمون پر اعتراض تھا بلکہ سرے سے بیگم ہی سے انکار کر رہا تھا اور بیک وقت ڈرامہ، تنقید، تبصرہ اور رومانٹ بیومرا تھا طبع ہوا۔ صدیقہ بیگم تو صرف اس لئے خفا تھیں کہ بیگم کو شیدا پر ترجیح دی گئی۔ مگر حسانِ سخن بیگم کے نام ہی سے نعل در آتش تھے، انہیں غصہ اس کا تھا کہ بیگم کا نام ہی کیوں لیا گیا، ان حضرات نے رخدا اس کلام کو

[1] یہ تسکین صاحب کی زیادتی ہے، صدیقہ بیگم صاحبہ سیوہاروی واقعی ایک قابل مضمون نگار خاتون ہیں جن سے ادارہ ادبی دنیا خوب واقف ہے۔ مدیر

سلامت رکھے اور خود ساختہ ڈرامہ نگار صاحب کو بھی) یہ ثابت کر دیا کہ بیگم کوئی شاعر نہیں تھا، ابتدائً دیوان جان صاحب کا مقدمہ لکھتے ہوئے پروفیسر آغا حیدر حسن نے بیگم کا ہیولا تیار کیا اور پھر تذکرہ ریختی میں تمکین کاظمی صاحب نے اسے پڑھا چڑھا دیا۔ رہا سہا کام میں نے بیگم کی ریختی والا مضمون لکھ کر ختم کر دیا ——

اس مضمون کا ماحصل یہ ہے کہ بیگم شاعر ہی نہ تھے اور جو شعر ریختی کے ان کے نام سے پیش کئے گئے ہیں وہ ان کے نہیں ہیں، اس کے علاوہ بیگم کے دو تین اشعار پر اعتراض بھی کیا گیا ہے اور ڈرامے کے چوتھے ایکٹ میں چند بے ہودہ سے شعر بھی بیگم کی ریختی کے طور پر پیش کئے گئے ہیں جو خود ساختہ ڈرامہ نگار کے شکم زاد ہیں، ایک خمسہ میں "لالن" کو کتابت کی غلطی سے لاکن لکھ دیا گیا تھا اسی کو حسان سخن لے دوڑے، دوسرا اعتراض لفظ "لاابالی" پر کیا گیا ہے۔ بیگم کا شعر ہے

اب جواں ہونے کو آئی چھوکری
کب تری یہ لاابالی جائے گی

چونکہ "لاابالی پن" کی جگہ "لاابالی" کہا گیا ہے۔ اس لئے سماعت مشوش ہوگئی، واقعی بات بھی معقول ہے، مگر حسان سخن کو معلوم ہونا چاہئے کہ قادر الکلام شعراء اپنی استادی کی ترنگ میں ایسی بے احتیاطیاں کر جاتے ہیں، چنانچہ استاد داغ کا شعر ہے

پابند وفا ہونا یا ترکِ وفا کرنا
اس سوچ میں بیٹھا ہوں آخر مجھے کیا کرنا؟

ضرورت تھی "کیا کرنا چاہئے" کی مگر استاد نے "کیا کرنا" کہہ کر کام چلا لیا اسی طرح اگر بیگم نے بھی "کب ترا یہ لاابالی پن جائے گا" کہنے کی جگہ "کب تری یہ لاابالی جائے گی" کہا تو کیا گناہ کیا، ایسی بے اعتدالیاں شعراء سے اکثر ہو جاتی ہیں جو بُری نہیں ہوتیں —— بیگم کا ایک شعر ہے

دیکھیں دولہا کیا اسے دیتا ہے نیگ
مانجھے کر چھوٹی سالی جائے گی

اس شعر پر حسان سخن کو اعتراض ہے کہ چھوٹی سالی مانجھے نہیں (اپنا یت میں شادی ہونے) مہندی لے جاتی ہے۔ انہیں مگر اس کا خیال نہیں رہا کہ بعض جگہوں میں بھی مانجھا بھیجا جاتا ہے اور چھوٹی سالیاں عام طور سے جاتی ہیں اور نیگ بھی پاتی ہیں، لفظ دولہا پر حسان سخن نے اس شعر کو قبل شادی تصور فرمایا ہے حالانکہ بعد شادی بھی دولہا میاں دولہا ہی کہے جاتے ہیں چنانچہ غالب مرنے تک مرزا نوشہ ہی رہے —— سمجھے حضور نے!

اس مضمون کے آخر میں خواہش کی گئی ہے کہ

"شیدا کے کلام پر روشنی ڈالنے سے پہلے جواب تک معرضِ التوا میں ہے۔ براہ مہربانی ایسے عدیم المثال ریختی گو کے سنے سنائے مالِ غنیمت میں سے کچھ اور نذر شائقین کر کے خراجِ تحسین حاصل کریں"

ان دو مضامین کے بعد ایک مضمون ادبی دنیا میں کسی بزرگ نے شیدا کے غیر مطبوعہ کلام کو پیش نظر رکھ کر تحریر فرمایا ہے جس میں نہایت متانت سے صرف شیدا کے کلام کو پیش کیا گیا ہے۔

صدیقہ بیگم صاحبہ کا مضمون اور حسان سخن کا مقالہ دونوں بھی اس قابل نہ تھے کہ ان کا جواب دیا جاتا کیونکہ دونوں نے اخلاقی کمزوری کا ثبوت پردے میں منہ چھپا کر اور گھونگٹ کی آڑ لے کر دیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ جب لوگ علمی یا ادبی بحث چھیڑتے اور نیک نیتی کے ساتھ بحث کرنے لگتے ہیں تو پھر مخوف ہو کر فرضی ناموں اور زنانی گھونگھٹوں میں کیوں پناہ لیتے ہیں —— صدیقہ بیگم نے اور حسان سخن نے جو لہجہ اختیار کیا ہے اور جس طرح حملے آغا حیدر حسن صاحب تمکین کاظمی صاحب اور مجھ پر کئے ہیں، ان کا جواب آسان ہے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جا سکتا ہے مگر فائدہ بسوا اس کے کہ تو تو میں میں ہو اور ادبی فضا کو مکدر بنایا جائے۔

میرا معروضہ صدیقہ بیگم اور حسان سخن دونوں سے یہ ہے کہ اگر آپ نے نیک دلی سے اس بحث کو شروع کیا ہے تو میرے اس مضمون کو ٹھنڈے دل سے ملاحظہ فرمائیے۔ کوئی اور بات خاطر میں آئے تو ادبی دنیا کے صفحات پر سنجیدگی سے پیش کیجئے، ورنہ اگر آغا حیدر صاحب یا کاظمی صاحب یا عابدی کی مخالفت منظور ہو تو پھر بیگم کی آڑ میں کیوں؟ —— بسم اللہ تشریف لائیے جس سے جھڑپ یعنی منظور ہو اس کو مخاطب فرمائیے ایک کے پردے میں دوسرے پر حملے کیوں؟

عابد مرزا بیگم پر ایک مبسوط مضمون لکھنے کا ارادہ پہلے ہی سے تھا، کیونکہ ادبی دنیا والے مضمون میں بیگم کے بہت کم شعر میں نے پیش کئے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ راجہ صاحب محمود آباد نے بیگم کا کلیات مانگا تھا اور حضرت جلال اس کی ترتیب میں مصروف تھے، بیگم کی زندگی بھر کی کمائی کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں، نانک اور سینما

کے اشتہاروں، دعوت کے رقعوں وغیرہ پر پنسل یا سیاہی سے لکھی ہوئی تھی، ان کے انتقال کے بعد اجلال صاحب نے بیگم کی اہلیہ سے وہ ذخیرہ لے کر مرتب اور مدون کر کے ایک کلیات مرتب کر دیا جسے راجہ صاحب محمود آباد نے (جبکہ وہ حیدرآباد تشریف لائے تھے) ملاحظہ فرما کر بہت پسند فرمایا اور کلیات لے گئے جس کی طباعت راجہ صاحب کے پیش نظر ہے خدا کرے جلد طبع ہو،

میری استدعا پر گذشتہ مہینے میں بیگم کے نواسے آغا محمد علی صاحب نے بیگم کا ذخیرہ عنایت کیا اور میں نے اس کو مرتب کر کے دوبارہ مدون کر لیا ہے جس کی روشنی میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔

بیگم کی ریختیاں پانچ ایک سو سے کم نہیں ہیں، قطعات، قصیدیاں سلام وغیرہ الگ ہیں، خصوصاً بیگم کی وہ قصیدیاں جو اعلیحضرت غفران مکان کی مدح میں کہی گئی ہیں بہترین قصیدیاں ہیں۔

اب بجائے اس کے کہ بیگم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں بیگم ہی کا کلام پیش کرتا ہوں۔ یہ وہ کلام ہے جو پہلی مرتبہ طبع ہو رہا ہے انشاء اللہ کلیات میں آپ بعد کو دیکھیں گے اس وقت ادبی دنیا کے اوراق پر ملاحظہ فرمایئے ـــــــ اب میں اس کو بیگم ہی کے ایک مطلع سے شروع کرتا ہوں،

سنئے حضور! غور سے میرے کلام کو   قربان جاؤں آئی ہے بیگم سلام کو

بیگم کے دیوان کا مطلع ہے

کہہ کے بسم اللہ وہ مطلع پڑھوں دیوان کا   جس طرح پہلا سبق الحمد ہے قرآن کا
حمد میں خالق کی مطلع کیوں نہ ہو دیوان کا   میں بہن کر آئی ہوں جامہ ہوا قرآن کا

بیگم نے یہ مطلع جان صاحب کے جواب میں کہا ہے جان صاحب کہتے ہیں۔

شان میں اللہ کے مطلع ہو وہ دیوان کا   جیسے بسم اللہ پھاٹک ہی ہوا قرآن کا
ذکر ہر مصرع میں آیا ہے خدا کی شان کا   لو گو بیت اللہ مطلع ہے مرے دیوان کا

اب ذرا شیدا صاحب کا مطلع دیوان بھی ملاحظہ فرمایئے

مطلع پھاٹک بن گیا اللہ کی درگاہ کا   کلمہ کی کنجی ہو باجی قفل بسم اللہ کا

بیگم نے نعت اور منقبت میں سینکڑوں شعر کہے ہیں مگر ایک شعر منقبت میں غضب کا کہا ہے۔

دونوں ہاتھوں سے الٰہی حشر میں کیا کام ہو   ایک میں دامن علی کا دوسرے میں جام ہو

اب آپ ان اشعار کو ملاحظہ فرمایئے جو بیگم کی ذاتیات کا اظہار کر سکتے ہیں اور جن سے اُن کی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ کلکتہ میں بیگم کی کیسی گذرتی تھی انہیں سے سن لیجئے،

کوڑی کو پوچھتا نہیں کوئی یہ حال ہے   ان روزوں ریختی مری مفلس کا مال ہے
کلکتہ میں رئیس ہزاروں ہیں اے بوا   مفلس کوئی نہیں ہے ہر اک مالدار ہے
شہزادہ چمڑے والا، یہودی کوئی مغل   پنجابی دہلی وال ہے کوئی کلال ہے
ہے مارواڑی، کھتری ہمین ہے جوہری   قارون اپنے وقت کا ہر گونٹھی وال ہے
دو دو روپے ہی کر کے جو دیتے مل گئے   مرا ادھار اور سبھوں کا اگال ہے
پہلے بلا کے نقد یہ سنتے تھے ریختی   اب مفت شعر سننے میں ان کو کمال ہے
سردی کے کپڑے گرمی میں پہنے رہی مگر   پوچھا نہ یہ کسی نے کہ کیا تیرا حال ہے
اس شہر بھر کے مردے سب سوم ہوگئے   لیکن مجسٹریٹ کو میرا خیال ہے

یہ مجسٹریٹ جن کا ذکر بیگم نے کیا ہے امیر حسن خاں ستی مجسٹریٹ کلکتہ تھے جن کی لڑکی کا عقد ۱۳۱۳ھ میں ہوا تو بیگم نے تاریخی کہی ہے

بیگم نے بھاگوان یہ تاریخی نذر دی   دو دھوں نہائیں پوتوں پھلیں گھر میں سکھ منائیں

شاید امیر حسن خاں صاحب بیگم سے کچھ سلوک کرتے ہوں ۱۳ گے۔ ان کے علاوہ کوئی باقر مرزا صاحب بھی تھے جو بیگم کو تنخواہ بھی دیا کرتے تھے۔

دیا کرتے ہیں گھر بیٹھے ہوئے تنخواہ بیگم کو   ترقی ہووے باقر میرزا صاحب کی دولت میں

مگر ان کے سوا بیگم کو اور کوئی دینے والا نہ تھا جس کی وجہ سے وہ نالاں تھے۔

کوئی کوڑی نہیں خرچیں تو ہیں کہنے کو امیر   نام لیتی ہوں کسی کا تو گلا ہوتا ہے
مفت میں ریختی سننے کے لئے ہیں موجود   خالی تعریف سے بیگم مرا کیا ہوتا ہے

عشرتی اور آرم نے بیگم کو دعوت دے کر بہار بلایا تھا چنانچہ ان اشعار سے تفصیل معلوم ہوتی ہے۔

عشرتی اور آرم نے یہ بڑھائی عزت   اور کلکتہ سے بیگم کو بلایا کس نے

اے عشرتی تم رہو سلامت   کرتے ہو ہنر وروں کی عزت
خالق سے دعا یہ مانگتی ہوں   بڑھتی رہے عمر اور دولت

کیا چیز ہے ننگ نام کیا ہے   اچھے سے برے سے کام کیا ہے
لائی ہے ارم کی قدر دانی   میں کیا ہوں مرا کلام کیا ہے

سنہ ۱۳۱۱ھ

ایک شعر میں بہار کی استادی کے متعلق تصریح پائی جاتی ہے

استاد جب بہار سے بیگم بنے تھے   پھولوں کی طرح کیوں نہ کھلے صبح شام ور

معلوم ہوتا ہے کہ بیگم بہار سے پھر کلکتہ واپس گئے تھے۔ اور وہاں پھر وہی مفلسی کا سامنا رہا اور خالی تعریف ہوتی رہی۔

پوچھتی ہوں تم سے اے بیوی ذرا   خالی اس تعریف سے بیگم کو حاصل کیا ہوا

کلکتہ سے بنارس گئے تو افلاس اور تنگ دستی بھی جلو میں تھی۔

صد بیگم بنارس میں یہ پایا ریختی پڑھ کر   سند مجھ کو ملی ہے مفلسی کی امتحاں ہو کر

اس کے بعد شاید کلکتہ واپس آکر بھوپال پہنچے۔

بلا سے نے مجھے تکلیف گو دی راستے   رہے آباد یہ بھوپال اسلامی ریاست ہے

اسی سے آئی ہے کلکتہ سے بھوپال میں بیگم   زمانہ بھر میں اب مشہور شیریں کی سخاوت ہے

بیگم نے بھوپال میں کئی ایک غزلیں کہی ہیں۔

بھوپال تک تو لایا موا نا بکار دل   اب دیکھئے کہ جائے کہاں بے قرار دل

ملنے کے شوق سے ہیں سرکار ریختی   قربان ہو رہی ہے یہی امیدوار دل

نکلے جو حسن منہ سے تو لاؤں سر اپنے ہوں   حاضر ہے سر بھی ان بھی اور اعتبار دل

آئی ہوں تو یہی ہے ... سے   کس سے کہوں کہوں ہے مرا بیقرار دل

جو کچھ تھا پاس ... کی بیگم   اب مفلسی کی دیکھ رہا ہے بہار دل

کہتے کی طرح ... تن   نکوں کا ہو رہا ہے وہاں بے قرار دل

بھوپال میں کبھی کوئی خالی نہیں پھرا   سرکار کا بہت ہے سخاوت شعار دل

امید تھی ضرور رہے گی وہ ریختی   ... ابھی بہت مالدار دل

پر کیا کروں کہ سوت تھی ہوئی یہاں   جلدی ادھر ہوا ہے پدر زنگار دل

بیگم جو تا جو رہے سلامت رہے مرا   قربان اس پہ جان تصدق نثار دل

بیگم کو ... کی کنیزی پسند ہے   کیا کام اس کو ہے لو اس آرجہاں سے

معلوم ہوتا ہے کہ بھوپال سے کلکتہ واپس ہو کر بیگم نے لکھنؤ کا سفر کیا تھا۔

بیگم نہ لکھنؤ میں رہے آکے کس طرح   کلکتہ میں اب اس کی کوئی قدرداں نہیں

سنئے ایک بڑے مزے کی چیز ہم آپ کو سناتے ہیں۔ ایک سال بھوپال میں "ملیدے" کے بعد بیگم صاحبہ نے بیگم کو یاد فرمایا۔ ریختی سن کر انعام دیا اور پھر خاموش ہو رہیں۔ اس کے بعد بیگم نے چند روز انتظار کر کے یہ قطعہ پیش کیا۔

میرے جننے کے ہیں پورے دن   آج ہی کل میں ہوئے گا فرزند

کون یاد گئے مراز جانا نہ   سانس پہلو میں ہے نہ کوئی نند

کس طرح ہوئے گا چھٹی کا نہان   کچھ نہ ہاتھ آیا فکر کی ہر چند

اس لئے آئی ہوں حضور کے پاس   کہ خدا نے کیا ہے دولتمند

ہر کجا چشمہ بود شیریں

مردم و مرغ و مور گرد آیند

معلوم ہوتا ہے کہ بھوپال سے جو کچھ ملا جلد ہی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد بیگم نے کسی راجہ جی کونا کا تھا جن کی مدح میں چند شعر نظر آتے ہیں۔

رائے بابو تیج نارائن بوا جگ جاتے ہیں   اُن کے بن سے ان سے محتاج مالا مال میں

جس جگہ قطرے پسینے کے گریں موتی بنیں   ان کے قدموں کے تلے پتھر بنیں ٹکڑے لال ہیر

بیگم آئی ہے پریشاں ہو کے اس دربار میں   رنگ فق ہے زرد ہے آنکھیں نم ہیں الجھے بال ہیر

اس کے بعد کشش آب و دانہ نے بیگم کو دکن پہنچا دیا۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں۔

دکن میں کھینچ لایا رزق میں جو یہیں آئی   یہ لکھا ہے مری تقدیر کے ایک ایک دانے میں

شاید ۱۳۰۵ھ میں بیگم حیدرآباد آئے ہیں، کیونکہ باریابی ان کو ۱۳۱۶ھ میں ہوئی جس کی تاریخ کہی ہے۔

شاہ تک جب پہنچ گئیں بیگم   دوستوں کی مرادیں بر آئیں

ہوئی تاریخ باریابی کی   آج بیگم حضور میں پہنچیں

یہاں آنے کے بعد بیگم کو چنداں فراغت نصیب نہیں ہوئی کیونکہ کوئی تنخواہ وغیرہ سرکار سے مقرر نہیں ہوئی مگر امرا اور عمائد کی طرف سے امداد برابر ملتی رہی۔ استاد داغ کو بیگم اپنی سوت سمجھتے تھے داغ کی زندگی تک انہیں جلی کٹی سناتے رہے چنانچہ کہتے ہیں۔

جو سوت کو ہے کدورت تو ہم نے جانا   لو ہمارے تو دل میں ذرا غبار نہیں

خدا کے فضل سے نصف مزاج ہیں آصف   وہ جانتے ہیں کہ بیگم قصوروار نہیں

کلکتہ سے آنے کے ... ہی سال بعد مہاراجہ سر کشن پرشاد آنجہانی نے بیگم کی تنخواہ مقرر کر دی۔ مشاعرے میں شریک ہوتے عید، بقرعید، ہولی، دیوالی کے انعام لیتے اور ماہوار تنخواہ پاتے رہے۔ نواب سالار جنگ بہادر بھی خبر لیتے تھے۔ سالار جنگ بہادر ماہوار نہیں دیتے تھے مگر سال میں دو تین بار خاصی رقم بیگم کو مل جاتی تھی۔ اسی طرح نواب تہور جنگ مرحوم بھی مدد کرتے تھے۔ نواب خانخاناں بہادر، فخر الملک بہادر وغیرہ بھی کبھی کبھار سلوک کرتے ہی رہتے

تھے اور بیگم ہر ایک کے سامنے اپنے افلاس کا دکھڑا رو کر کچھ نہ کچھ وصول کر ہی کر لیتے تھے، چنانچہ حسنِ طلب ان کی ریختی کی نمایاں خصوصیت بن گئی تھی۔

لڑکی کو دوا میں ہاتھ گلے کیا جہیز ہیں کنگن نہیں ہے طوق نہیں بالیاں نہیں
لائے ہیں تو نے دیتے ہیں باہر ہی سے باہر تنخواہ تو بیگم کی مہاجن کے لئے ہے
چاہتی ہوں کہ سدا گھر مرا آباد رہے بہیر بیٹی ہے مری بہیں دامادہے

بتا کس طرح ہو شہیان کی عید مرے گھر میں تو کوڑی بھی نہیں ہے
کرم فرمائیں گر سرکار مجھ پر تو ہوگی عید یہ مجھ کو یقیں ہے

یہ پریشانیوں کا تذکرہ اور افلاس کا دکھڑا حسنِ طلب ہی تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی ریختی میں ایسے شعر بھی نظر آتے ہیں جن سے استغنا اور اطمینان کی بو آتی ہے۔ ملاحظہ ہو،

قربان جاؤں اس کے ضامن ہو رزق کا گھر بیٹھے بیٹھے دیتا ہے میرا خدا مجھے

مجھ کو دولت کی ہیرل کی طرح حرص نہیں چھپر بڑی میر کہیں ٹھٹھکے ہیں خوش آتے

ازل کے روز سے جو لکھا گیا ہے میری قسمت میں خدا کے فضل سے گھر میں مرے روزانہ آتا ہے

جب کبھی کوئی ضرورت ہوئی مجھ کو بیگم ہو گیا غیب سے سامان خدا کی قدرت

مفلسی میں گزری ہے غنی اشرفی خانم سچ کہتی ہوں کیا مال ہزاروں میں آئے گے

بیگم کے دیوان میں آپ کو سمدھن کے ساتھ چھیڑ چھاڑ بہت نظر آئے گی۔ اس کی وجہ ایک خاص ہے۔ کلکتہ میں بیگم نے اپنی لڑکی کسی موتی کے بیوپاری سے بیاہی تھی داماد کی ماں یعنی بیگم کی سمدھن بیوہ تھیں۔ ان سے چھیڑ چھاڑ ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیگم نے سمدھن سے نکاح کر لیا۔ اب جو بیگم کی بیوہ حیدرآباد میں ہیں جن سے بیگم کو اولاد بھی ہے۔ وہی سمدھن ہیں۔

بیگم آخر عمر میں مالدار نہ تھے لیکن کھاتے پیتے اور خوشحال تھے ان کے جسم پر کبھی خراب اور معمولی لباس نہیں دیکھا گیا۔ مکان کی خرید کے لئے اپنے مربیوں سے روپیہ وصول کرتے مگر مکان خریدتے نہ تھے، چنانچہ یہ قطعہ سر مہاراجہ بہادر آنجہانی، نواب سالار جنگ بہادر، راجہ دھن راج گیر جی تینوں کے پاس یکے بعد دیگرے پیش کیا اور تینوں سے سات سات سو روپیہ علیحدہ علیحدہ وصول ہوا مگر مکان نہ خریدنا تھا نہ خریدا۔

سات سو میں مکان بکتا ہے اسے لے لوں جو ہووے تیرا کرم
در بدری سے ہوں میں گھر والی ہو دوبارہ جو تیرا مجھ پہ کرم
میرے لڑکے کا آج سے سرکار تیرے دفتر میں نام ہووے رقم

بہر حال حیدرآباد کے ہر امیر کا گھر بیگم کا بنک تھا جب ضرورت پڑتی پہنچ جاتے اور نذرانہ لے آتے ـــــ بیگم صاحبہ کھوپال کے پاس جو قطعہ پیش کر کے بیگم نے رقم لی تھی، اس میں کچھ تبدیلی کر کے وہی قطعہ نواب ناظم الدولہ بہادر کے حضور میں پیش کرتے ہیں اور بیٹی کی شادی کے لئے رقم وصول کر لیتے ہیں،

رہیں آباد ناظم الدولہ میرا خالق رکھے سدا خورسند
کون ناداری میں خبر لے تھی گھر بٹھائے رہوں اسے تاچند
جا کے اب اس کا بیاہ کراؤں فیض کا در نہ مجھ پہ کیجئے بند
کس طرح جاؤں میں دکن سے وطن کچھ نہ ہاتھ آیا فکر کی ہر چند
اسلئے آئی ہوں میں آپ کے پاس کہ خدا نے کیا ہے دولتمند
ہر کجا چشمہ بود شیریں مردم و مرغ و مور گرد آیند

انہیں فتوحات پر زندگی گزرتی تھی اور تین مرتبہ مقامات مقدسہ کی زیارت بھی کر آئے تھے،

بیگم کو ایک دھن سرکاری تنخواہ کی تھی مگر وہ میسر نہیں ہوئی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قسمت میں سرکاری تنخواہ نہ تھی ورنہ انہیں تنخواہ ہونا کوئی بات ہی نہ تھی، ابتداءً جب بیگم حیدرآباد پہنچے اور مہاراجہ شاد کے دربار میں باریاب ہوئے اور مہاراجہ نے تنخواہ اپنے اسٹیٹ سے مقرر کی اس وقت مہاراجہ دیوان (وزیر اعظم) تھے، اس کے بعد چند سال کے لئے دیوانی سے علیحدہ ہو کر پھر صدر اعظم ہوئے، مہاراجہ نے اپنی دیوانی اور صدارت عظمیٰ کے زمانے میں ہزاروں آدمیوں کی تنخواہیں مقرر کر دیں مگر معلوم نہیں کہ بات تھی کہ بیگم کی انہوں نے تنخواہ نہیں کی سرکاری تنخواہ نہ ہونے اور دربار شاہ دکن سے غیر متعلق رہنے کے باوجود بیگم کو شاہ دکن اور شہزادگان والاقدر سے بے انتہا عقیدت اور انس تھا، ہر وقت

مداح رہتے تھے اور ہر تقریب میں قصیدیاں، قطعے اور تاریخیاں کہتے تھے، چنانچہ آخر میں قصیدیاں پیش کی جائیں گی۔

ریختی کو جو تفوق ریختہ پر حاصل ہے۔ اس کی خاص اور اہم وجہ یہی ہے کہ ریختی عورتوں اور صرف عورتوں کی زبان میں کہی جاتی ہے اور اس صنف سخن میں عورتوں کے حالات اور مشاہدات ملتے ہیں، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے "ہماری زبان دہلی" کے یکم نومبر ۱۹۴۱ء کی اشاعت میں ایک مضمون "لفظ کیونکر بنتے ہیں" لکھتے ہوئے عورتوں کی زبان کی اہمیت اس طرح واضح کی ہے۔

"جو زبان قواعد سے جکڑی ہوئی نہ ہو اس کی تعزیت اور صحت اور اس کے روزمرہ کی تازگی اور محاورے کی شگفتگی عورتوں کی بدولت ہوا کرتی ہے۔ اردو میں بہت سے ہنگامہ خیز عہد آئے، فارسی، عربی اور سنسکرت نے بڑھ کر اس پر حملے کئے وہ جو ان حملوں سے بچی یہ سب عورتوں کا تصدق ہے۔ وجہ یہ کہ ان کی ذہنیت میں تعزیت اور ان کے مذاق میں لطافت کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور اردو کی خوش نصیبی تھی کہ ان جدید زبانوں سے جن کے نام ابھی لئے گئے عورتوں کو سابقہ نہ ہوا۔ اردو ہی میں وہ سوچتیں اور اردو ہی میں خیالات کا اظہار کرتیں، ان وجوہ سے ان کو اردو کی صحت اور تازگی کا امین سمجھنا چاہیئے، زبان اور بیان میں جس قدر اختراع اور جدت ان کی ذات سے ہوئی اور جو دلکش اور معقول محاورے اور سبق آموز کہاوتیں ان کے ذہن نے پیدا کیں دنیا میں ہمیشہ یادگار رہیں گی اور زبان کے مورخ ہمیشہ ان کا راگ گاتے رہیں گے، یہی وجہ ہے کہ زبان اور لسانی اختراع کے بارے میں عام لوگوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ کیونکہ ان کی معلم ان کی ماں ہوتی ہے۔ کتاب نہیں ہوتی۔"

ہمارے مرشد مولانا عبدالحق (انجمن ترقی اردو) اور پنڈت کیفی کو "یاجوج ماجوج" کہتے ہیں اور آپ کسی طرح ان دونوں حضرات کی اردو خدمات اور ادبی کاوشوں سے انکار نہیں کر سکتے یہ الفاظ جو نقل کئے گئے گو ماجوج (کیفی) کے ہیں مگر یاجوج (مولانا عبدالحق) کے اخبار میں طبع ہوتے ہیں جس کے لئے اڈیٹر (یاجوج) کا مضمون نگار (ماجوج) کی رائے سے متفق ہونا ضروری ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ رائے یاجوج ماجوج دونوں کی ہے۔ میں نے اپنے مضمون "بیگم کی ریختی" میں بھی اسی کو اہمیت دی تھی۔ اب ایک تازہ مقالے سے تازہ رائے نقل کی جا رہی ہے آیئے اس روشنی میں ریختی کو ملاحظہ فرمایئے۔

ریختی گوئی کی ایجاد بہ حیثیت ریختی کے مرزا سعادت یار خاں رنگین نے کی جو دلی کے "روڑے" تھے ان کے ساتھ ہی ساتھ میاں انشاء اللہ خاں انشا نے بھی ریختی کہی جو رنگین کے بعد سند میں لی جاتی ہے۔ ان کے بعد محمد صدیق قیس حیدرآبادی سے لے کر عنقا بیگم اور شیدا تک ہزاروں نے ریختی کہی مگر اساتذہ اور اہل الرائے نے صرف جان صاحب کو سند مانا ہے اور بس۔ واقعہ یہ ہے کہ رنگین نے جس کی ابتدا کی تھی جان صاحب نے اس کو انتہا پر پہنچایا ہے۔ ان کے بعد "قبیلۂ مجنوں" سے کوئی نہیں اٹھا۔ سچ ہے

فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

اس آخری دور میں ہمیں صرف تین ریختی گو نظر آتے ہیں۔ ۱۔ عنقا بیگم۔ ۲۔ شیدا، ۳۔ عابد مرزا بیگم، عنقا بیگم کا نام میں نے پہلے اس لئے لیا ہے کہ وہ عمر میں شاید شیدا اور بیگم کے برابر ہی ہوں مگر انہوں نے پندرہ ایک سال ہوئے کہ اپنا ریختی کلام چھپوا کر شائع کر دیا ہے، شیدا دریابادی کو بیگم پر یہ شرف ضرور حاصل ہے کہ انہوں نے بھی اپنا کلام بیگم سے پہلے شائع کر دیا البتہ اس معاملے میں بیگم پھسڈی ہی رہے کہ ان کا کلام ان کی زندگی میں طبع نہ ہو سکا، حالانکہ دیوان کی طباعت کے لئے مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی۔ نواب سالار جنگ بہادر اور نواب اصغر یار جنگ بہادر سے انہوں نے روپیہ تک وصول کر لیا تھا لیکن قسمت! وہ جو جان صاحب نے کہا ہے۔ ع

بچہ تم پہلے جنیں بیاہ ہوا میرے بعد!

ریختی سے مراد شریفانہ اور بیگماتی زبان کی شاعری لی جاتی ہے۔ اور یہ بھی ریختی میں یہی خصوصیت تھا یہ خصوصیت عنقا بیگم میں عنقا ہی ہے۔ وہ بے چارے ریلوے کے ملازم تھے۔ کسی خان پور نامی قصبے کے رہنے والے اور نرے "دیہاتی زبان" کے شاعر ہیں، ان کی شاعری دیہاتی زبان کی ترجمان ضرور کہلا سکتی ہے اور دیہاتی رسوم و محاورات ان کے کلام میں ضرور ملتے ہیں مگر ریختی کی تعریف میں وہ نہیں آ سکتی رہے شیدا صاحب سو جیسا کہ اس کے پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ حضرت بھی الہ آباد کے باشندے اور دریاباد کے متوطن ہیں۔ گو دریاباد

مرحوم تبریز خطہ ہے۔ مولانا عبدالماجد جیسے سابق فلسفی اور حال صوفی وہاں پیدا ہوتے ہیں مگر افسوس ہے کہ شیدا صاحب میں کوئی خاص بات پیدا نہ ہو سکی، حضرت اکبر بھی الہ آبادی کے تھے۔ مگر ان کی زبان کا کیا کہنا، یہ شیدا صاحب بھی وہیں کے ہیں لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا بُعد ہے۔ محترمہ صدیقہ بیگم نے اور جناب محمد عمر نے شیدا کے عمدہ عمدہ شعر چن چن کر پیش کر دیئے ہیں اور ان کو بیگم سے بڑھانے کی امکانی کوشش کی ہے۔ مجھے بیگم سے کوئی قرابت نہیں۔ کوئی خاص روابط ان سے نہ تھے بارہ ایک سال سے ملاقات ضرور تھی۔ جب کبھی ملتے ریختی سناتے تھے چونکہ میں نے واجد علی شاہ سے متعلق مواد جمع کرنا شروع کیا تھا اس لئے مجھے واجد علی شاہ کے قصے ان کے حالات وغیرہ ہمیشہ سناتے تھے۔ ان کے مرنے کا رنج مجھے اسی قدر ہوا جس قدر کہ ایک دوست کو ہونا چاہیئے، عمر میں وہ مجھ سے بہت بڑے تھے مگر ملاقات بے تکلفانہ تھی ان کی ریختی گوئی کا میں اس لئے قائل تھا اور ہوں کہ ان کا روزمرہ نہایت صاف، زبان ستھری جس میں لوچ اور شیرینی ہوتی تھی ان کی ریختی ہندوستانی شریف گھرانے کی تصویر ہوا کرتی تھی۔ معاملہ بندی میں البتہ وہ "تماش بینی" پر اتر آتے لیکن نہایت مہذب پن سے ۔ افسوس ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی حضرت شیدا میں نہیں ہے۔ ان کا تخیل اس قدر خراب اور کریہہ ہے کہ شاید آپ ان کے اشعار کو جرکین کے شعر تصور کریں جی تو نہیں چاہتا کہ ایسے غلیظ اشعار اپنے قلم سے نقل کروں اور ادبی دنیا کے صفحات ان سے آلودہ ہوں لیکن مجبوراً محض اس لئے نقل کر رہا ہوں کہ آپ شیدا صاحب کا درجہ مقرر کرنے میں سہولت محسوس فرمائیں گے، یہ شعر شیدا صاحب کی آرسی مطبوعہ الہ آباد سے نقل کئے جا رہے ہیں۔

بی بیاں پیدا ہوئی ہیں کھانے ہگنے کے لئے ۔۔۔ اک کماستا پوت دنیا میں یہ جھنڈ رہ گیا؟

آجاتے جو ڈیوڑھی میں کیا جانئے کیا ہوتا ۔۔۔ [illegible]

بہن تو سوتی رہی لونڈے نے ہگ کر گھر بھرا ۔۔۔ دیکھ تو مردار سب سانی کا سوندن ہو گیا

اک نہ اک دن سیانے کوے کی طرح ۔۔۔ گو کھلائے گا تجھے تیرا گھمنڈ

کہیں بچے نے اک دن ہگ دیا تھا لاں کے دامن ۔۔۔ وہ سمجھے پھر گیا پانی لگوڑے او لباپن پر

وہ گو کا نوکرا جو رد کو اب دیں گے کمانے کو ۔۔۔ کمائی اپنی ساری صرف کر دیتے ہیں ہگنگن پہ

میں نہ کہتی تھی کہ یہ ہیں صرف منہ کے پاک صاف ۔۔۔ چار دن میں گو گندیلا کر دیا سارا لحاف

جھاڑو جھتوا ذرا انہیں دینا ۔۔۔ چھوٹے دیور کمانے جاتے ہیں

کاہے کو گھورے خاں کا ملے گا دماغ اب ۔۔۔ سنتی ہوں ہم پلیس کے جمعدار ہو گئے

ساتھ شیطان کے منکر نہیں محشر میں ہوا ۔۔۔ ہنر آئے ہیں یہ حلقے کے جمعدار کے ساتھ

دیکھ لیا آپ نے گویا لعل بیگ کی روح شیدا میں حلول کر گئی ہے۔ یہی نہیں اور بھی سن لیجئے،

سسرال میں جو پادوں تو میکے میں ہو خبر ۔۔۔ اک اشتہار نند ہے اک اشتہار ساس

مل گئی حضرت کی ساری اولیائی خاک میں ۔۔۔ اور نواب کیا کروں نیکی پڑے اس پاد پر

بیٹھنے دیتی نہیں کنجڑن تو مکھی ناک پر ۔۔۔ موئی گاجر اک طرف ہنگا ہی اس کا یاد بھی

اب تو شیدا صاحب کے وہ شاہکار نقل کئے گئے تھے جو بڑے "استنجے" سے متعلق تھے اب چھوٹے "استنجے" والے شہ پارے بھی دیکھ لیجئے

بے طرح تنگ ہوئی رات کو چاول کھا کر ۔۔۔ ٹل پہ ٹل موتنے جاتی تھی ذرا دار نہ تھا

یونہیں لگی ہوئی تھی موی کو متن جھڑی ۔۔۔ چاول کھلا کے اور بھی بے وار کر دیا

خیو پر ہوان کا استنجا پڑوسن کچھ نہ پوچھ ۔۔۔ میرے تر ہونے کی مٹی سب یونہیں برباد کی

رات ہی بھر میں بہادے گی مرا گھر موت کر ۔۔۔ اوئی جرا آج تو کیسی ہے بولائی ہوئی

موتتی ہے کیا چھڑاتی ہے یہ جرے اپھلجھڑی ۔۔۔ دور تک آواز جاتی ہے بہن شش کار کی

موتی ہے کیا چھڑاتی ہے یہ جُرو اپھلجھڑی ۔۔۔ جانور تک بھاگ جاتے ہیں سے مرکے شکار سے

سر سے اترا بال گو ہیں چاہے جاہے موت میں ۔۔۔ ایسی مشاطہ ہو کا اب نہ چرچا کیجئے

استنجے کے لئے نکل آتے ہیں راہ گیر ۔۔۔ مٹی کا ڈھیر جان کے میرے مزار کے

ہاتھ آیا موت کا چلو وہی پھر بعد کو ۔۔۔ عمر بھر ہمدمو نے گو یا جھڑنا بھرا دامادکا

اس گوناچھیچھی پر موقوف نہیں گندے استعارے، ناپاک تشبیہات اور ذلیل محاورات سے آرسی بھری ہوئی ہے ملاحظہ ہو۔

. . . .

تلوار باندھ باندھ کے آتا ہے کس کے پاس ۔۔۔ تجھ ایسے کتنے مارے ہیں ہیجڑی نے ہار پر

شیدا اپنے منہ کے بل یہ تھیکیل اس طرح گری ۔۔۔ گرتی ہے جیسے دو ٹکے مرغی دیکار پر

مردوے نوج ہوا ایسی کسی آزار میں آگ ۔۔۔ موتی ہوں تو نکلتی ہے کی دست آگ بھار میں

اللہ آتشک کسی دشمن کو بھی نہ ہو ۔۔۔ اک آگ سی لگی ہے بدن میں دھواں نہیں

مُنہ میں اُتنا مُوت جا دُت کریں کیا مجال ۔۔۔ ایسے بے ہڈی کے اس دنیا میں اک آئی لال

نہیں جاتا لڑکپن ان کا اب تک ۔۔۔ وہ دیکھو ناک پونچھی آستیں سے

مڑ کھاتے تو ہو پر یاد رکھو ۔۔۔ چنبیے کی طرح ہو لوگے پیں سے

ان تبرکات پر شیدا کو فخر بھی ہے فرماتے ہیں

شیدا کو زباندانی کی کچھ داد تو ملتی ۔۔۔ افسوس کہ اس وقت یہ امیر نہیں ہے

نہ ہوئے بیگم ورنہ سُن کر کہتے "اے نوج مو امیران ہی کی داد تو دیتا؟

——— یہ شیدا کے چوٹی کے شعر تھے جو بال سفید کرنے کے بعد کہے گئے۔ غالباً شیدا نے ۱۸۹۵ء سے شاعری شروع کی ہے۔ اس طرح اب تقریباً پچاس سال کی مشق ہے اور "آرسی" کی ترتیب کے وقت چالیس سالہ مشق تھی خود شیدا فرماتے ہیں۔

چوٹی کے شعر اب بھی نکلیں تو سیتے ۔۔۔ شیدا سفید بال موئے سر کے ہوگئے

حق آخر حق ہے ایک جگہ آرسی میں خود شیدا ریختی کی تعریف میں یوں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

شیدا سے کوئی پوچھے تعریف ریختی کی ۔۔۔ ہو اک گندگی سے دھوئی ہوئی زباں ہو

اب غور فرمائیے گندگی کی کثرت اور زبان کی غلاظت شیدا کی شاعری کو ریختی ٹھہراتی ہے، یا جگتوں کی شاعری! ——— شعر کی تعریف شیدا یوں فرماتے ہیں!

صرف تک بندی سے کچھ ہو نہیں سکتا شیدا ۔۔۔ شعر تو جب ہی کہا جائیگا کچھ بات تو ہو

دیکھئے کوئی بات ڈھونڈ لیے چند شعر پیش ہیں۔

سونٹھ کی ناس لئے بیٹھے ہیں ۔۔۔ کان میں تیل دیئے بیٹھے ہیں

تم نے آنکھوں سے دیکھا ہوگا ۔۔۔ ہم جو ہاتھوں سے کئے بیٹھے ہیں

اور شاطر کسے کہتے ہیں بوا! ۔۔۔ مات پر مات دیئے بیٹھے ہیں

داد دیتا نہیں شیدا کوئی ۔۔۔ سب مٹے ہونٹ سئے بیٹھے ہیں

لکھنے پڑھنے میں مرا لڑکا رواں ہو جائے گا ۔۔۔ سال ہی بھر میں کہیں سی پہ کہاں ہو جائے گا

ایسے مجنوں کو کیا خطرے میں لائی لیلیٰ ۔۔۔ اک لنگوٹی کے سوا تن پہ کوئی تار نہ تھا

مردوے پہ کیا اثر ہو بات کا ۔۔۔ یہ تو گوئیاں آدمی ہے لات کا

ان اشعار پر شیدا کو ناز بھی ہے اور اپنی دانست میں اسے وہ سگھڑاپا کہتے ہیں، محترمہ صدیقہ غور فرمائیں!

تم نے دکھلایا وہ سگھڑاپا کہ اردو کے لئے ۔۔۔ ریختی گوئی بھی شیدا اک بڑا فن ہوگیا

لیجئے جان صاحب اور رنگین ہوا کھا گئے، ریختی کو اس سگھڑاپے سے شیدا صاحب نے ایک بڑا فن بنا دیا۔ اب ذرا اس سگھڑاپے کی چند مثالیں بھی ملاحظہ کیجئے ——— بیگماتی محاورے اور شریف گھرانوں کی بول چال تو شیدا صاحب جانتے ہی نہیں عجیب وغریب محاورے استعمال کرتے ہیں۔

جب نگوڑے کو نہ آئے مرے پھوٹے نصیب ۔۔۔ مردوا بھی ٹھونک کر اپنا مقدر رہ گیا

جلتے دیکھیں میرے گھر سے جب بی بی کی ٹکیاں ۔۔۔ ہو کے مُنہ کٹا سے کھیرے کا منگیتر رہ گیا..

سا ری گرہستی بیچ کے مردار کھا گئی اسباب گھر میں پوچھو تو اک تل نہیں رہا

مٹ گئے اترے دیئے گھٹنوں کے جو کچھ ہی ہو گیا چھوڑ دی خیرن نے بھی جب سے صفا سلامت دیکھنا

ہو گئے تم باپ اس کے، پر ہو دشمن سے سوا بے ادب تو تھا ہی لونڈا اور بھی کتا ہو گیا

باپ کو سینتتے ہیں بیٹے کم بیٹی کرتی ہے ماں کا کام بہت

خصم چھیڑا کسی بھڑوے کا منہ نہیں دیکھا حیا کو کام ہے ہم سے ہمیں حیا سے غرض

کیا جچیں نظروں میں آ جو ہری سا دے یور پوتڑوں کی ہی امیر ہیں یہ تو نگرا آنکھیں

کنجوس مکھی چوس سے امید کیا رکھوں جھنجی نہ دی فقیر کو جس نے اٹھا کے ہاتھ

مشتے نمونہ از خروارے یہ چند شعر نقل کئے گئے ہیں ورنہ ساری آرسی ؎ بھری ہوئی ہے منقولہ بالا اشعار میں منقد ریٹھونا ـ کر رہ جانا، ٹھیکریکا ٹکا سا منہ، اک تل، بجائے تل بھر کے، آگے اترے بجائے آگے آئے کے، کتا کرنا سینتنا، جھٹ کی بجائے چھیڑا، تونگرا آنکھیں، جھنجی کوڑی کے بجائے خالی جھنجی ملاحظہ ہو کتنے صحیح محاورے اور سگھڑاپے کے نمونے ہیں ــــــ یہ گت بنی ہے محاوروں کی اب زبان کا حال ملاحظہ فرمایئے۔

کہوں گی کچھ اگر گوئیاں گدھوں کی لات سمجھو گی مچاتی ہو عبث چیں چیں نہیں یہ کام انسان کا

دیکھئے کیا فصاحت کے دریا بہائے ہیں۔

سمدھن تمہیں نہ کہنا تمہارا شتہ نہار تھا میرا بہنا رتھا تو تمہارا بھی یار تھا

اپنی روانی تو دیکھو چیر کر بھائی بخشے کی جگہ جیلیز نہ ہو

ہمیشہ خوش رہوں اولاد سی بڑھتی رہے دولت ہو خدا کی دین ہے گھر میں مرے دن دن فراغت ہو

اوپر کے تین شعر تو زبان کا بہترین نمونہ تھے ہی مگر جو تھے شعر میں "بڑھتی رہے دولت ہو" اور "دن دن فراغت" کی فصاحت کی داد آپ نہ دیں تو آپ کو خدا سمجھے، لطف خاص یہ ہے کہ ہمارے "خاتم الشعراء ریختی" حضرت شیدا کو "کسی" کے استعمال کی تمیز نہیں، بجائے "کسی" کے "کوئی" فرماتے ہیں۔

بیاہ کے پہلے نہ دیکھا آنکھ دیدہ کوئی نے اس کا رونا کیا ہے اب جو کچھ ہوا اچھا ہوا

میل کوئی چیز کا تل بھر نہ ہو صاف چاول لا ئیو کنکر نہ ہو

اوئی لوگو نہ ادھر ہوتی ہے بازی نہ ادھر ختم ہو کھیل کوئی طرح یہ امات تو ہو

محلہ بھر میں صلاتی پھری میں جل کی صورت نہ تھیبی کوئی نے کوتے سے ڈیا سر ہمرکی

غور فرمایئے جس کو "کسی" اور "کوئی" کے استعمال کا سلیقہ نہ ہو وہ بھلا ریختی کیا کہے گا، خود ہی فرماتے ہیں۔

زبان اپنی ہے شیدا جو چاہو تم بک لو کسی کا زور نہیں اس پہ چلتا نہیں

اور یہی نصب العین ریختی کا رہا ہے۔ فارسی الفاظ اور ترکیبیں چونکہ عورتوں کی زبان پر نہیں ہوتیں اس لئے ریختی میں بالکل استعمال نہیں کی جاتیں لیکن شیدا صاحب بھلا کیا جانیں، وہ ایسے موٹے موٹے الفاظ ریختی میں استعمال کرتے ہیں جو ریختہ میں بھی عام طور پر استعمال نہیں کئے جاتے

میانی کو گریبان ہیں گریبان کو میانی ہیں کہاں کا جوڑ تھا جیا دانے اس کو کہاں ٹانکا

غور فرمایئے خیاط درزی کو روزمرہ میں آپ ہم بھی تو نہیں بولتے بے چاری عورتوں کی زبان پر خیاط کیوں چڑھنے لگا۔

لاڈ سے دونوں کو کر رکھا ہے کیسا گستاخ ماں سے بیٹی ہے تو ہے باپ سے بیٹا گستاخ

چونکہ شیدا کو "خ" کی ردیف میں غزل کہنی تھی اس لئے گستاخ ردیف بنا ڈالی یہ خیال کیوں آتا کہ یہ عورتوں کی زبان کا لفظ نہیں ہے۔

بندی نے تیرے ہاتھ کیا ہے مکان بیع ایمان تو کیا نہیں ادب ایمان بیع

دیکھئے "ع" کی ردیف بیع سے مکمل کی گئی ہے واللہ کیا ابوالکلامانہ ریختی ہے! ــــ یہی نہیں شیدا کی ریختی میں اضافتیں بھی پائی جاتی ہیں،

فضول تہمت لگا رہی ہو کر لگا کیا کوئی شست پر کو کہیں وہ گھوڑے پہ چڑھی ہو گی تمہاری عین نہیں ہے

گو کا استعمال عورتیں مطلق نہیں کرتیں مگر شیدا کی ریختی میں سب کچھ روا ہے۔

چھاپہ دان دیکھی کونے سے خبرن دو لڑکے   مثل سچ ہی یہاں مٹر رکھ کے انسان اک اٹھاتا ہے

خلوت صحیحہ کے معنی ہیں صحبت عورتوں کی اصطلاح نہیں ہے مگر شیدا صاحب اس سے بے نیاز ہیں،

ہری جاتی ہوں صحبت کے اثر سے   جھکا جاتا نہیں اب تو کمر سے

. . . .

کمر ضبط کر دونگی بیری تجھت سی مت بھاگو   نہ گھبراؤ جی لڈو کھلاؤں گی تمہیں تل کے

آوارہ پن اور عیاشی کے لئے ایک خاص ریختی کی اصطلاح ہے "تماش بینی" بے چارے ملا شیدا بچے پڑھانے والے اس سے کس طرح واقف ہوتے ریختی کہنے لگے تو تماش بینی کے معنی میں عیاشی ہی استعمال کر گئے۔

ایسی عیاشی کم سنی ہو گی   بک گیا گھر، دوار کیا کہنا

خیر سے آرسی ہیں استعارے اور تشبیہات بھی ہیں ملاحظہ فرمایئے

دم الجھتا ہے مرا بھابی سنوارو اپنے بال   تم تو اک جھولا لئے پھرتی ہو سر پہ کھاد کا

بالوں نے کر لیا ہے بدن کو حصار میں   گویا پھنسی ہوئی ہے بطخ سوار میں

ہائے کیا تشبیہات ہیں، نہ ہوئے مومن ورنہ دوسرے شعر پر اپنے مایۂ ناز شعر

الجھے ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں   لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

کو نثار کر دیتے — اب شیدا کی ریختی کے چند بہترین نمونے نقل کر کے میں اس حصہ کو ختم کرتا ہوں

ہو چکی لکھا پڑھی سب وہ تو چلا تار رہا   کاغذی گھر بار کا وہ فیصلہ جانا رہا

حضرات ناظرین! اگر آپ میں سے کوئی صاحب کسی یونیورسٹی کے ممتحن مقرر ہوں تو ضرور اس شعر کو سوالات میں شریک فرمائیں!

بچے کھیل میں ادھر سے اُدھر گزرنا چاہتے ہیں تو گاڑی بھر اور بعض مقامات پر پنڈی بھر جگہ مانگتے ہیں لیکن شیدا صاحب کی جدت ملاحظہ ہو

گاڑی بھر میں ٹڈی سے کلائی تھی تیرے بہانے   ہڈی چمڑے کے سوا اب کیا بدن میں رہ گیا

دیکھئے آپ حضرات بھی نماز پڑھتے ہیں اگر کہیں "گنڈیری دار" "نماز چھوڑ" کر مسلسل نماز پڑھنی شروع کی اور رشید اصاحب کو اطلاع پہنچی تو وہ کہیں گے کہ آپ نے نماز سادھی ہے

خدا کا شکر ہے عابد علی نے اے باجی: نماز سادھی ہے جب سے قضا نہیں کرتے

شیدا نے ایک نیا محاورہ گھڑا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

جو گھر میں چھوڑ جاتی ہوں تو روتا ہی مچلتا ہے   عجب لونڈا ہے یہ ضدی کہ پیچھے دم کے چلتا ہے

دُم کے پیچھے چلنا تو آپ نے سن لیا مگر اب دل کے پسیجنے کے بجائے رویوں کا پسیجنا بھی سن لیجئے

بہت کچھ روئی، کُڑھی مردوسے کا   پسیجا تک نہ رویاں بھی کہیں کا

اردو کا محاورہ جوتے میں ہارنا ہے مگر شیدا جوتے میں رکھنا استعمال کرتے ہیں۔

وہ طوق تو رکھ آئے تھے پہلی ہی جوتے میں   اب دیکھتی ہوں آج تو زنجیر نہیں ہے۔

در و دیوار، سقف و بام کے لئے ڈھہنا استعمال ہوتا ہے۔ جان کا ڈھہنا استاد شیدا کی ایجاد ہے۔

جسم کے ساتھ موئی جان نہ شیدا ڈھہ جائے   کہیں مزدور چلا آئے نہ دیوار کے ساتھ

ایک اور نیا محاورہ سن لیجئے۔ "اپنے کو اچھے"

یہاں بنتے ہیں سب اپنے کو اچھے   کھلے گا حال واں نیکی بدی کا

خیر یہ تو زبان اور محاورے کے حال زار پر شیدا صاحب نے کرم فرمایا تھا۔ ان کی اخلاقی حالت بھی دیکھ لیجئے،

شیدا نہ باز آؤں گی مرنے کے بعد بھی   مرقد میں بھی اڑاؤں گی چپ کی مزار میں

شب زفاف یا عروسی کو عورتیں تخت کی رات کہتی ہیں۔ شیدا کو "تخت رات" کیا معلوم یہ اسے پہلی رات کہتے ہیں، سنئے اس شب کا احوال

ایذا ہوئی جو حد سی سوا مجھ کو پہلی رات   کہیا خصم کو کہنے لگی اضطراب میں

اور سنئے اس لطافت تخیل کا کیا کہنا۔ اس شعر کی داد آپ ہم کیا دیں گے۔!

جیسے ہی پیشاب کو میں بیٹھی بچہ ہو پڑا   مجھ نگوڑی کو خبر ہی کیا تھی اس افتاد کی

خیر اب تک آپ نے ادھر اُدھر کے اشعار سن کر وقت ضائع کیا۔ اب ایک شعر سن لیجئے جو شیدا کی شاعری کا حاصل اور ان کے اخلاق و کردار کا آئینہ دار ہے غور فرمایئے۔ اس طبقے کے اخلاق جس شخص کے پیش نظر رہتے ہوں وہ کیا پاکیزہ جذبات ادا کر سکے گا۔!

لیا جاؤں کدھر بھاگوں نصیحت میری جاں سے ہے   کہ میرا باپ ہو کر آبرو کا میری خواہاں ہے

بعض شعر شیدا نے مزیدار بھی کہے ہیں لگے ہاتھوں انہیں بھی سن لیجئے جان صاحب کا شعر ہے۔

کرونگی دھوم سے شادی جو نسبت ٹھہری ہے   گلا ہے مرا اور منجھلی بھابی کی گلہری ہے

اس کا جواب شیدا نے لاجواب دیا ہے۔

پڑوسن کا جو بلا تھا تو بلی تھی شیخانی کی — محلے بھر میں ساری رات تھا کٹ توبل بل کا

کسی کا مشہور شعر ہے۔

میں نے چاہا تھا کہ حالم سے کروں گا فریاد — وہ بھی کمبخت ترا چاہنے والا نکلا

اس کا جواب بھی ریختی میں ادا ہوا ہے جو خوب ہے

منصف نگوڑا دیکھ کے رنڈی پھنسل پڑا — بھڑوے کو کیا خیال ہو رو داد کی طرف

شیدا صاحب کے مزاج میں انصاف اور سچائی کا مادہ معلوم ہوتا ہے کہ خاصا ہے فرماتے ہیں۔

اڑوے بھڑوے نائی دھوبی سب سخنور ہو گئے — ہو گئے شاعر بھی ستنجے کا ڈھیلا کیا کریں

اپنے متعلق بھی نہایت ایمانداری سے فرماتے ہیں،

سبھی اتفاق ہیں باشندے ہیں دریاباد کے شیدا — الہ آباد میں گوئیاں جو اک چھوٹی سی بستی ہے

میرے کلام پہ کیا اعتراض ہو شیدا — نہ لکھنؤ کی نہ دلی کی یادگار ہوں میں

سن لیجئے آج ریختی شیدا کی آپ لوگ — کیا یاد کیجئے گا کہ کوئی گنوار تھا

شیدا غزل میں بات بھی کوئی نہ پوچھتا — کہنے لگے جو ریختی مشہور ہو گئے

ریختی شیدا کی سن کر سب پھڑک اٹھی ہیں — گھونسلوں سی چیلیں، کوئی بھی صدا دینے لگی

شیدا تمہاری ریختی ان کو بھی یاد ہے — مجھ کو ستایا کرتے ہیں مچھر تمام رات

سن کے سب بشاش ہوں وہ خوش بیانی چاہیئے
آج بیگم ریختی ایسی سنانی چاہیئے

اب بیگم کو سنئے! میرے پہلے مضمون سے حسان سخن کو یہ مغالطہ ہوا کہ بیگم کی ریختی کی کمائی بس وہی ہے جو تذکرہ ریختی اور مقدمہ دیوان جان صاحب میں نقل ہوئی ہے۔ لیجئے حسان صاحب ملاحظہ فرمائیے اب میں بیگم کے وہ اچھوتے شعر پیش کرتا ہوں جو آج تک سوا بیگم کے روزمرہ کے ملنے والوں اور ان لوگوں کے جنہیں بیگم ہمیشہ اپنا کلام سنایا کرتے تھے اور کسی کے کانوں تک نہیں پہنچے۔ لیجئے بیگم اجازت چاہتے ہیں۔

کہانی جب تمام اپنی یہ سب ہمجولیاں کر لیں — تو کچھ بیتی ہوئی اپنی کہو ہم بھی بیاں کر لیں

جمالیات سے بیگم کا سارا دیوان بھرا پڑا ہے۔ حسن اور متعلقات حسن بیان کی زبان کلکتہ کی کترنی کی طرح چلتی ہے۔ سنئے

بہار آئی چمن شاداب ہے گلشن معطر ہے — گھٹا اٹھی ہوا سنکی دل اب آپے سے باہر ہے

بیگم کے کلام میں جمالیاتی عنصر جس قدر غالب ہے اس قدر جان صاحب کو یہ غلبہ نصیب ہوا اور نہ رنگین کو تو پھر تا بہ شیدا چہ رسد!

کوئی ساون تو سناؤ بوا بیر بہوٹی سی ہے — آئی برسات زمانے کی ہوا بدلی ہے

آئی رت برسات کی ہے باغ میں جاؤں گی ضرور — پستئی محرم دوپٹہ مجھ کو دھانی چاہیئے

حسن جہاں کہیں نظر آئے بیگم بے چین ہونے لگتے ہیں۔

بوٹا سا جو قد دیکھ لیا سرو نے تیرا — لیں جھک کے بلائیں سر کے کونے کی کمر کی

خدا نے نور کے سانچے میں ڈھالا ہے دوگانا کو — صراحی دار گردن کہت اونچی سر کمر پتلی

کیا جال ہے اس مردوے کے بالوں کا گھونگر — بندی کا بھی دل پھنس گیا اس کالی بلا میں

سبزہ آغاز جواں کا وہ کتابی چہرا — لے بوا جیسے کہ قرآن ہے تفسیر سمیت

چاندنی میں آج تو اندر سبھا کا لطف ہے — میں پری بنتی ہوں میری جان تم گلفام ہو

انگیا کا رنگ بیگم آنکھوں میں کھب رہا ہے — ایسی تو دھوپ چھاؤں کی گل کی قبا نہ ہوگی

ہوئیں ہمجولیاں حیران خدا کی قدرت — گھر ہوا میرا پرستان خدا کی قدرت

تمہاری جان بندی کے تو نقعہ بلا تمہیں یا گورا چٹا — بلا سے سب تو اک نقش زار میں کہ سانولا رنگ

یہی نہیں کہ بیگم کو حسن اور جمال بے قرار کر دیتا ہے بلکہ وہ ناز و ادا پر بھی لوٹ ہو جاتے ہیں

مجھے چھپ چھپ کنکھیاں دکھلا رہے ہیں — نئے انداز سے وہ آرہے ہیں

مضمون لمبا ہوتا جا رہا ہے اور دیوان بیگم کا ہر شعر مجبور کر رہا ہے کہ نقل کر دوں مجبوراً بیگم کے جمالیاتی پہلو کو ختم کر کے آگے بڑھتا ہوں۔

محاورہ اور زبان ریختی کی جان ہیں، تا وقتیکہ زبان پر عبور اور محاورات

کے صحیح استعمال سے واقفیت نہ ہو کوئی شخص ریختی گو نہیں بن سکتا یہ وصف بیگم میں بدرجہ اتم موجود تھا، چند محاورات ملاحظہ ہوں، ہر ایک محاورے کی تشریح کرنے سے مضمون کی طوالت میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ اس لئے صرف اشعار نقل کر کے محاوروں پر لکیر کھینچ دی جاتی ہے، آپ خود غور کیجئے کہ ہر ایک محاورہ بیگم نے کیسا استعمال کیا ہے، نگینہ سے کہ جڑا گیا ہے۔

سیج تو یہ ہے جس کو پیا چاہے سہاگن ہے وہی　　دل اسی کا دل ہے بس ہر ایک ارماں کے لئے

سوت سے جا کے کوئی میری طرف ہو کہہ دے　　کہ برا چھیننے والی کا برا ہوتا ہے

بڑھ کے باتیں نہ کرو دو شر ہیں آدُو نیر!　　پر نکلتے ہیں تو چیونٹی کی قضا آتی ہے

اپنے سے بڑھ کے جو ہوا سے کبھی برا کہو　　آئے گا منہ پہ تھوکو جو کہ آسمان پر

کہنا جو میرا تمہیں باور نہیں میاں　　لو میں اٹھائے لیتی ہوں تیسوں کلام کو

جاتے ہو پیٹھ دے کے تو منہ بھی دکھائیو　　لو سونپتی ہوں میں تمہیں بارہ امام کو

میں اب سمجھی ہائے جھنا بجاں جس نے وہ ٹھرکایا　　وہ باتیں مرزا خونیں ہیں جو میں نے دل میں ٹھانے

دل پھٹا، آئینہ ٹوٹا ہوا جڑتا ہی نہیں　　وہ ہوا صاف مگر اس کی کدورت نہ گئی

مثل مشہور ہے دو دل جو راضی کیا کرے قاضی　　مجھے ان سے محبت ہے، انہیں مجھ سے محبت ہے

بسایا گھر اگر رنڈی کا اس نے میری جوتی سے　　گیا جو آپ سے جگ سے گیا سمجھی کہاوت ہے

پیٹ کے ہلکے ہو سچ ہے پیٹ پوچھے کی بری　　میری رسوائی سے مرزا تم کو حاصل کیا ہوا

گزر جائے نہ حد سے آدمی تولا ہے میں کہتی ہوں　　وہاں تک پاؤں پھیلائے جہاں تک اس کی چادر ہو

بلا سے ہو برے وقت کا حامی ہے خدا　　کام اپنے سے نکلتا ہے نہ بگڑنے سے

عمل اس کے ہوں برے یا کہ بھلے لے بیگم　　ہے غرض ہم کو فقط یار کے یارانے سے

پسی جاتی ہوں اس چکی میں باجی　　زمیں نیچے ہے اوپر آسماں ہے

اب بڑھاپا آگیا چونڈا ہوا بالکل سفید　　کھیل کھانے کے لئے اے بی جوانی چاہئے

شادی کے واسطے کرتی ہو دعائیں بیگم　　جس کا کھاتی ہو اسی کا یہ بوا گاتی ہے

دیکھا آپ نے، بیگم نے محاورات کس عمدگی سے استعمال کئے ہیں اور کسی شعر میں چستی کم ہوئی نہ زبان بگڑی، یہ کمال اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب زبان پر کامل عبور ہو، آئیے اب بیگم کی زبان کا جائزہ لیں! یوں تو سارا دیوان زبان کا آئینہ دار ہے مگر چند شعر نقل کئے جاتے ہیں،

اے تری شان کے قربان! خدا کی قدرت　　میرا ہاتھ اس کا گریبان خدا کی قدرت

خوش قدم آئی نہ ڈولی اب تلک آئی کوئی　　کب سے میں تیار ہوں شادی میں جانے کے لئے

دق کر دیا ہر روز کی اس نیش زنی نے　　جینے نہیں دیں گے نہیں دیں گے مجھے جینے

گھر سے جو رو تو نکالی جائے گی!　　کوئی بازارن بلالی جائے گی!

بی! سبھی لوگوں کے چولہے پہ توا تک نہ رہا　　رہ گئی سوموں کے گھر ہی میں یہ دولت باقی

آنکھوں میں لہو ہے تو دل میں ہے خدا کا قہر　　جھلسا لگاؤں منہ کو میں اس چاہ پیار کے!

بی ٹھہرتی ہی نہیں نسبت کہیں　　میری بچی کی عجب تقدیر ہے!

یہ دوپہر کی ہے قرن شباب میں رونق　　جو دن ڈھلا تو کہاں آفتاب میں رونق

بڑھاپے میں تو جوانی سے بڑھ کے رونق ہے　　غضب کی ہو گی بوا شباب میں رونق؟

دوگانا جان! ایسی شکل بھی ملتی نہیں دیکھی　　تمہارے دونوں بچے ایک ہیں صورت شکل میں

ایک ہی سانچے ڈھالا ہے خدا نے بنو ملتی جلتی ہے بڑی باجی سے صورت میری

آنکھ کیوں نیچی ہے سمدھن مجھے بھر دیتی ہیں! بات کہنے کی ہے داماد کو گھر دیتی ہیں

بڑے گھر کی جو تھی وہ بات بھی آئی بڑے گھر کی نصیبے کی دھنی ہو اے بوا بیٹی سکندر کی

خوشی میرے مقدر میں نہیں ہے اگر ہے بھی تو اس گھر میں نہیں ہے

کبھی جو اپنے گھر سے نکلو بوا کہوں کیا جدھر سے نکلے کوئی یہ بولی ادھر سے نکلی کسی نے پوچھا کدھر سے نکلے

اری ماما! پانی سے بھر دے لگن کو ذرا میں بھی دیکھوں گی سورج گہن کو!

گئے جنازہ اٹھانے کو سوت کا میری اکیلی ڈنڈنی تو رکھی ہے اور کہا نہیں

ملے گا مردوے کیا چل ستا کر ایک عورت کو خبر بھی ہے کہ ہر مردوے کے ساتھ ایک مچھر ہے
ذرا نیچ اونچ بیگم دیکھ کے اپنا قدم رکھنا کہ بستی ہے بیٹر کی یہاں کھائی ہر ٹھوکر ہے

محبت مجھ نگوڑی نے جہاں کی تو اس نے خاک چھنوائی جہاں کی!

گیندہ پھولوں نہیں سماتی ہے یار غنچہ دہن جو پاتا ہے

کون پھر پوچھتا ہے بات آکر جب کسی سے نکل گیا مطلب

میاں مشہور ہے دنیا میں چیتے کی کمر پتلی نہ ویسی ہووے گی میری کمر ہے جس قدر پتلی

خدا کی شان کے صدقے یہ قدرت کی نشانی ہے بوا گوہر کو دیکھو کیا ہے بس اک بوند پانی ہے

ابھی کیا کہتے تھے تم اور ابھی کیا کہنے لگے واہ وا واہ اجی بات بھی کیا بدلی ہے

جگ جگ جئیں خاتی بیندی جو خواہاں ہے اس چاہنے والے پہ قربان دل و جاں ہے

بوا لیلیٰ! ذرا مجنوں کو دیکھو! گریباں چاک دامن دھجیاں ہے

جب کبھی کہتی ہوں مطلب کی کوئی بات ان سے سن کے اس کان سے اس کان اڑا دیتے ہیں

خط کا جواب دیتی ہوں باد چھوکری ٹھہر! دم لے رہا ہے گھوڑے پہ تو تو سوار ہے

فق چہرہ ہے چندو کا ذرا دیکھو تو بہن نکلی جو موئی شام سے آئی ہے سحر کو

یہ بچوں کا کھلونا کیا کروں میں پسند نیا للہ ہو یا پاندان ہے

آخری شعر دیکھئے زبان کا کتنا اچھا نمونہ ہے یوں تو ہر شعر اپنی جگہ لاثانی ہے مگر اس میں ایک چونچلا ہے۔ آج کل کاغذ کی گرانی اور نایابی سے ڈر ہو رہا ہے۔ ورنہ بیگم کے سینکڑوں شعر نقل کر دیتا۔

روزمرہ میں تو بیگم کو کمال ہی حاصل تھا اس سے پہلے بیشتر اشعار ایسے نقل کئے گئے ہیں جو روزمرہ کے عمدہ نمونے ہیں۔ مگر چند شعر یہ بھی سن لیجئے۔

ہو گئی نک سک سے چوتھی کی دلہن آراستہ کوئی الکر ملا کے لچکے کا دو افشاں کے لئے
روز کہتی ہوں میں تم سے بھول جاتے ہو اجی رحل منگوا دو مری بچی کو قرآں کے لئے

سب اپنے گھر کی ہو گئیں کوئی یہاں نہیں جی کس طرح لگے مری ہمجولیاں نہیں

تم نے سلوا کر اناڑی سے یہ انگیا کی خراب دام پورے دو تو بیوی کیوں ادھورا کام ہو

لگے اس پیار کو آگ اے بوا پھر مسی چھڑوا ڈالی ندیدہ میرے ہونٹوں میں سمجھا ہی کہ شکر ہے

چند استعارے اور تشبیہات بھی سن لیجئے

بتیسی جو کھلتی ہے ہنسی میں تری کلو! بجلی سی چمک جاتی ہے اک کالی گھٹا میں

میں سمجھی آگئے بادل کے ٹکڑے چاند کے پہ میری سنبل کے منہ پہ بال جب آئے نہانے میں

نہیں یہ سمجھی دو ستارے چاند کے پہلو میں ہیں اے دوگانا تیری بھوں پہ تل جو کلائی کے پاس

جاری

چندے کے منہ پہ بال نہیں ہیں پڑے ہوئے　　کالی گھٹا نے گھیر لیا آفتاب کو

سفید سانپ نے جفتی کھلائی کالے کو　　لپیٹے ہیں جو یہ چوٹی میں بار بار نہیں

بیگم خود بھی نازک اور نزاکت آفرین تھے اس لئے ان کے کلام میں بھی نزاکت بہت ہے ان اشعار کی نزاکت پر غور فرمائیے۔

پتے پیپل کے چباؤ تمہیں بکری کی طرح　　پان بھاتا نہیں مجھ کو جو ہرا ہوتا ہے

واقعہ یہ ہے کہ بیگم کی ڈبیا میں ہمیشہ پکے پان رہتے تھے، اب ذرا بیگم کے جھومر کی گھوری کی تعریف بھی سن لیجئے

عرق آجائے پیشانی پہ مرزا جی تمہاری ہیں　　مزا دیکھو جو کھا لو اک گھوری میرے جھومر کی

ذرا مہندی لگانے کی نزاکت پر غور کیجئے۔

نہ رہ جائے کہیں پر پور آئے ایکساں رنگت　　نزاکت اس قدر تو چاہیئے مہندی لگانے میں

چور رہ جائے نہ ہاتھوں میں برابر رنگ آئے　　بی نزاکت چاہیئے مہندی لگانے کے لئے

اسی طرح مسی لگانے کے لئے بھی سلیقے کی ضرورت ہے۔

کالا کر لیتی ہیں منہ دنیا میں ساری عورتیں　　بی سلیقہ چاہیئے مسی لگانے کے لئے

ریختی میں سب سے اہم مضامین وہ ہوتے ہیں جو گھریلو کہلاتے ہیں، ریختی گو کا ماحول اور اس کا درجہ اسی کو دیکھ کر متعین کیا جاتا ہے عام طور پر شریف گھرانے کے معاملات رہن رسوم، چال چلن کو نظم کیا جاتا ہے بیگم نے گھریلو معاملات پر بہت کہا ہے۔ چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

در گور کھوپڑی نے مجھے بھاتا نہیں پیسا　　کیا شکل بنا دی ہے دوانے مرے گھر کی
ہمسائی بس اب چپ رہو قصہ نہ بڑھاؤ!　　بھاتی نہیں کل کل یہ مجھے آٹھ پہر کی

اپنی بیوی سے کہو بیٹھے بٹائے میرا ہاتھ　　کوئی دم تو چین سے بیٹھیں ذرا آرام ہو
بال سکھلانے کو تم اوپر تو جاتی ہو مگر　　نیچے کوٹھے سے اتر آتی ہو جب شام ہو
ناک میں دم آگیا پیلی موئی کے ہاتھ سے　　لڑتی ہی رہتی ہے مجھ سے صبح ہو شام ہو

غیروں کے بچوں سے میں کرتی ہوں جب محبت　　کیا مجھ کو اپنے بچے کی مامتا نہ ہوگی
سسرال میں اکیلی ہرگز نہ جاؤں گی میں　　جب تک کہ ساتھ میرے میری ددا نہ ہوگی

دوگانا سمدھی سے کیا آشنائی کرتی ہے　　بہانہ کر کے چلی ہو جو سمدھیانے کو

بہو ساس سے کرنے لگی یہ بے ادبی　　ہاتھ رکھ رکھ کے مرے سر کی قسم کھاتی ہے
تجھ سے ہو روکتری کیا نہیں الفت بیٹا!　　شرم کی بات ہے کہتے ہوئے شرماتی ہے

کب تک میں روز ساس کے طعنے سنوں بہن　　بولوں گی میں بھی، کیا مرے منہ میں زبان نہیں

کہو گی ایک تو میں تم کو دس سناؤں گی　　کسی کی بات اٹھاؤں یہ مجھ میں تاب نہیں

بیاہ بیٹی کا رچے غیب سے ساماں ہو جائے　　دونوں پھولیں پھلیں گھر میرا گلستاں ہو جائے
آئے بوٹا سی دلہن گھر میں جواں ہو میرا لال　　لے بوا دل کا یہ پورا مرا ارماں ہو جائے
موتیوں میں مری بچی تجھے کر دوں گی سفید　　باپ تیرا کہیں نوکر تو مری جاں ہو جائے

سمدھن کے گھر کو بھیج دیا حصہ بس تو نہیں　　ڈھانا نہ طور سے ویسے تو تم نے خوان پر
خالی نہ چونا کیجئے ملتے ہیں دونوں وقت　　بیوی لگاؤ تھوڑا سا کتھا بھی پان پر

مشاطہ واہ لائی ہو کس کے پیام کو　　لے نوج بچی دیں مرے دشمن غلام کو
ملتے ہیں دونوں وقت اتر آؤ بھی کہیں　　کیوں بال کھولے بیٹھی ہو کوٹھے پہ شام کو

بیٹے کا تم نے بیاہ کیا خوب اے بہن　　ٹالا براتیوں کو فقط چائے پان پر

کھا سکتی نہیں اور کوئی بی بی کی صحنک　　بن بیاہی کی خاطر ہے سہاگن کو ڈر ہے

جاتی ہو جاؤ، رہتی ہو رہ جاؤ چپ رہو　　بھاتا نہیں یہ روز کا جھگڑا بوا مجھے

دلہن نے لیا تو پھر الگ چل گئی دو دن میں لڑ بھڑ کر　　رہے جو بیچ ڈالے گالیاں اُن پر پڑیں برسوں

اس کے کہنے سننے سے میں ہلکان ہو گئی　　در گور گھر کے دھندے میں گزرا تمام روز

بات کرنے میں زبان چلتی ہے قینچی کی طرح　　کاٹ چھانٹ ایسی تو پہلے نہ تھی خلافی میاں

تم ایک کہو گے مجھ سے میں لاکھ کہوں گی کیوں چپ ہوں آخر میرے منہ میں بھی زبان ہے

ہندوستانی عورت سوت سے جتنی جلتی بھنتی رہتی ہے آپ کو معلوم ہی ہے۔ ریختی میں سوت ایک مستقل عنوان ہوتا ہے یہ شعر بھی بیگم نے خوب نکالے ہیں،

جیسی ہے سوت میری کالی بلا نہ ہو گی ایسی بھی کوئی شفتل اور مبیوا نہ ہو گی
سوت جلتی رہے پہلو مرا آباد رہے میں یہاں شاد رہوں موئی ناشاد رہے
موت کا پیغام آیا سوت کو پیل نہیں کیوں دوا کرتے ہو حق میں تیرے کچھ حاصل نہیں
سوت کے پاس وہ جس دن سے ہیں دل شاد نہیں گھر ہے اجڑا ہوا پہلو مرا آباد نہیں
پگھل جاتا ہے کیا تو سوت کی کیہ بہا پر ارے مورکھ ارے نادان یہ تریا چلتر ہے
سوت پر جو اس قدر لہلوٹ ہو کیا ٹنکے ہیں لعل اس مردار میں
چورن کے بہانے کوئی لے جا کے پھنکا دو یہ زہر کی پڑیا مری سوکن کے لئے ہے
سوت آ آ کے لڑا کرتی ہے مرزا ہم سے بات بڑھ جائے تو پھر تم نہ بگڑنا ہم سے
گرے بجلی الٰہی سوت جل ککڑی کی جنتری پر نگوڑی کالے بادل کی طرح مجھ پر گرجتی ہے
ہے گالی یوں ہی لڑائی جھگڑا انسا آپس میں ہو گیا مکان ہو جائے پاک میرا جو مرتی سوت گھر سے نکلے
جس نگوڑی نے پڑھائی تمہیں الٹی سیدھی دیکھنا وہ اسی اٹھوارے میں غارت ہو گی

سوت پر بیگم نے خصوصیت سے کرم فرمایا ہے اس لئے سینکڑوں شعر دیوان میں نظر آتے ہیں، زیادہ شعر نقل کرنا مناسب نہیں اس لئے انہیں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

ریختی گوئی میں معاملہ نگاری ایک بڑا ادق باب ہے۔ اس میں ریختی گو کی معلومات زبان اور قابلیت کا پول کھلتا ہے جو جس قدر قابل ہوتا ہے اتنا ہی پردے پردے میں خاص خاص محاورات سے اپنا مطلب ادا کرتا جاتا ہے۔ آپ نے شیدا کا پھکڑ پن دیکھا، اس غریب کو تو معاملہ گوئی کی ہوا بھی نہیں لگی، اب بیگم کو سنئے، اس قسم کے شعر نقل نہیں کئے جانے چاہئیں مگر مجبوراً اس لئے نقل کر رہا ہوں کہ بار لوگ سرے سے بیگم کے وجود ہی سے منکر ہیں اب میں انہیں کس طرح باور کرا سکتا ہوں کہ بیگم نے معاملہ گوئی کا حق بھی پورا ادا کیا ہے اس لئے چند شعر نقل کئے دیتا ہوں، پردے کی بات ہے پردے ہی میں رکھئے نہ میں تشریح کروں گا اور نہ آپ تشریح کی خواہش کیجئے، پڑھئے غور کیجئے اور بس۔

بگڑے گھڑے جی مرزا نصیب ہے کس کو یہ ڈھیلے ہاتھوں کی ہے اور مار مار نہیں
قربان اس ہنسی کے مرے نیل پڑ گیا اس طرح ہاتھ مارتا ہے کوئی ران پر
نیل دیکھو پڑ گیا رخسار میں آگ لگ جائے تمہارے پیار میں
کٹی سب باتوں میں نہ نکلی آرزو دل کی ادھر شرما رہی ہوں میں ادھر وہ پانی پانی ہیں
نوج صاحب کوئی یوں ہونٹ کسی کا چوسے لالی پانوں کی چھٹی مسی کی تحریر سمیت

. . . .

مجھے ہلکان کر ڈالا مٹو بھی! یہی ہوتی ہے خاطر میہماں کی!
میں تو لبریز پسینے میں جو ہو جاتی ہوں خود وہ دامن سے مرے منہ کو ہوا دیتے ہیں
منہ بنا کر جو میں غصے میں بگڑ بیٹھتی ہوں لے بہن گدگدی کر کر وہ ہنسا دیتے ہیں
دل میں جو بات تھی وہ شرم سے میں کہہ نہ سکی مردوا تاڑ گیا دیکھ کے چہرا دیکھو
آنہ جائے کوئی کمبخت یہی دھڑکا ہے رکھ کے تم ہاتھ کلیجے کا اچھلنا دیکھو
دم قلق کرنے لگا مر گئی سر کو بہ سے دیکھو پھر تم نے مجھے زور سے بھینچا دیکھو
چٹکیاں لیتی ہوں اب میں بھی ہٹو دور بھی ہو دھجیاں ہو گئی ہے مری انگیا دیکھو
چوڑیاں ٹھنڈی ہوئیں کھل گیا جوڑا دیکھو سسکیاں بندھ گئیں قے ہو گئی مرزا دیکھو
نہ ضد دلاؤ مجھے ہاتھ چھوڑ سرکو بھی نہ ہو دے گی کبھی وہ بات زینہار نہیں

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

چند شعر نقل کئے گئے ہیں پڑھئے اور لطف اٹھائیے بعض شعر بہت کھلے ہوئے بھی بیگم نے کہے ہیں جنہیں نقل کرنا مناسب نہیں۔

ریختی کے لوازمات میں دائی جنائی اور زچہ خانہ کے مضامین بھی خیال کئے جاتے ہیں بیگم نے ان کو بھی بڑی عمدگی سے باندھا ہے۔

ہاتھ بھاری ہے بہت دائی کا باجی اماں پیٹ ملنے سے تو درد اور سوا ہوتا ہے
کیا کہوں ڈیا مری ناف ٹلی ہے جب سے بے کلی سے کسی کروٹ نہیں کل آتی ہے
وہ بے کلی ہے کل نہیں پڑتی کسی طرح دونوں تلے بھی ام گئے سوجن وہاں بھی ہے
کل کال میری بے کل ہے اجی دائی کو لاؤ کل ہی نہیں پڑتی مجھے پیڑو کے ورم سے
میں چھو نہیں سکتی ہوں ابھی ناف ملوں کیا ہے پیٹ کا دھوکا کہ مجھے پیڑو کے ورم سے
میں باز آئی چھٹی کے نہانے سے دیا کہ چوٹ لگتی ہے للہ مجھ کو دھار نہیں
صدقے ہو دائی کس لئے تم سہمی جاتی ہو نہلاتے ہیں زچا کو یوں ہی دھار دھار سے
جھگڑنے کا نہیں یہ وقت ہے جناب دیا خدا چاہیں اکا سو ہے زچا کی جان فسوس میں
جھگڑے ہیں یہاں مفت کے دائی میں دو ہیں چھٹکارا اول ہو گیا بچے میں رہا ہیں

ہوئی ہوں جن کے لئے اک دفعہ بیاناتواں ایسی   کہ چکر آگیا میں دیکھنے اٹھی جو باروں کو

بیگم کی ریختی میں زبان ہی زبان یاد ائی، نہ چہ کا قصہ یا معاملہ گوئی ہی نہیں بلکہ اخلاق کے عمدہ عمدہ سبق بھی موجود ہیں جو جان صاحب کے علاوہ اور کسی ریختی گو کے پاس نہیں ملتے، چند شعر ملاحظہ ہوں، دیکھئے بیگم بیٹی کی تربیت کس عمدگی سے کرتے ہیں۔

ادب لازم ہے آتو جی کا بیٹی ہوش میں آؤ   کوئی یوں بھی بڑوں کے پاس بے باکانہ آتا ہے
میں لو کے جاؤں گی سر بات پر تجھ بیٹی   نہیں جو کرتی نصیحت تجھے اثر نہ کرے
رہیں جائے جو ماں باپ کے کہنے میں سے ہو   ڈھنگ جس کے ہوں بُرے وہ مبری اولاد نہیں
خدا بچائے بُرا کام ہے یہ لتر ایا   جو بات ہو وے ادھر کی کبھی ادھر نہ کرے
قیامت میں خدا کے گا حسنا ایک ایک قطرے کا   گنہ بے حد ہے ای بیٹی بہت پانی بہائیں
بیاہے بعد جو کچھ ہے خصم ہے   غرض رہتی نہیں کچھ باپ ماں سے
کھلائے اچھے سے اچھا پہنائے خوب سے خوب   یہ سب ہو تجھی کو پر کوئی یوں نذر نہ کرے
وہ نیک زن ہے جسے مرد کا دھیان ہے   وہ گھر گرہست نہیں جو خصم کا ڈر نہ کرے

یہ تو بیٹی کی تربیت تھی اب عام خیالات سنئے۔

جو کہے مانو اسے بس یہی تدبیر ہے   مردوے پر قبضہ کر لینا کوئی مشکل نہیں
آٹھوں پہر کی جھیں ہیں یا تا کس جھانک ہے   بازار میں ہیں یہ تو بہو بیٹیاں نہیں
اگر دنیا میں پالا بیٹ سکتے کی طرح تو کیا   اسی کی آبرو عزت ہے بی جو کنبہ پرور ہے
نہ باز آئے بھلائی سے اپنی اے گویاں   برائیوں پہ کسی کی کبھی نظر نہ کرے
کیونکر میں غیر مرد کے ہو جاؤں سامنے   نامحرموں کو شکل دکھانا گناہ ہے
ہے اپنی زندگی پہ بھروسہ تمہیں بوا   مجھ کو تو ایک دم کا نہیں اعتبار ہے
جو نیک مرد ہیں ان کو یہ چاہئے بیٹا!   تجھے جو آب سے اس کی طرف نظر نہ کرے
مرتے دم اے میرے خالق خاتمہ بالخیر ہو   اور بیگم کی دعا اس کے سوا کچھ بھی نہیں

دیکھئے کیسا قطعہ ہے۔

اچھوں سے ملو لوگ کہیں کے تمہیں اچھا   کیا خوب مثل ہے جو کہی ہے یہ کسی نے!
ہم جنس سے مل جاتے ہیں پانی کی طرح سے   اشرافوں سے اشراف کمینوں سے کمینے!

یہی وجہ تھی جو نئے رنگ سے بیگم کو نفرت تھی، کیونکہ اس رنگ میں انہیں اخلاقی پہلو بہت کم نظر آتا تھا، چند شعر اس رنگ کے بھی سن لیجئے،

اے لو یورپ کی یہ خاتون ہے دیکھو تصویر   بال کترے ہوئے اوڑھے ہوئے سلک گاؤن ہے
بیوی گر گجوایٹ میاں بھی گریجوایٹ   اب عورتوں پہ مرد کوئی حکمراں نہیں
نوکر ہیں مردوں کی طرح عورتیں بھی اب   بیوی دبے میاں سے اب اس کا گماں نہیں
کٹا کے چوٹیاں مردوں میں ہو گئیں شامل   تمہیں بتاؤ بہن کیا یہ انقلاب نہیں
یونہیں یہ سایہ بھی اُٹھ جائے گا بہن اک دن   وہ رُخ پہ میموں کے جالی کی اب نقاب نہیں
پٹھے رکھوایا کریں عورتیں مردوں کی طرح   اے جی کٹوائی نہ جائیگی یہ چٹیا ہم سے
کٹائے چوٹی یہ پردہ اٹھا بھی دو باجی   چلو وہ چال پسند آئے جو زمانے کو
یہ تانک جھانک سے تو لاکھ درجہ بہتر ہے   بنا دو ایک ہی مردانے اور زنانے کو
اے لو مریم نسا کی لڑکی کو   شوق پھر ہو گیا ہے لکچر کا
موؤں میخانے کے رستے پہ اب پہرہ بٹھاتے ہو   کہ سب واقف ہیں یورپ کی شرابیں تم نے پی ہیں سو
بوا شرماتی ہے بیگم تمہارے سامنے آتے   رہیں لندن میں برسوں کالجوں میں تم یہ پڑھیں برسوں

ایک غزل میں مسلسل چند قطعہ بند شعر پیرس سے متعلق کہے ہیں دیکھئے کتنا گہرا طنز ہے۔

چلو ہم بھی چلیں پیرس کو باجی   میں سنتی ہوں وہ دنیا کا جناں ہے
ہیں ساری عورتیں اور مرد آزاد   نہ یہ قیدیں نہ یہ پردہ وہاں ہے
کھلے بندوں بسر ہوتی ہے سب کی   جسے دیکھو وہاں وہ شادماں ہے
ہیں نازک عورتیں گلفام چہرے   وہاں کا مرد وا ہر اک جواں ہے
وہاں سنتا ہے اے باجی   جو ہندوستان میں بے حد گراں ہے
ہیں سب بیباک عورت مرد دونوں   عیاں ہے واں یہاں جو کچھ نہاں ہے
نہ گھونگٹ ہے نہ چونڈا ہے نہ چوٹی   نہ پیروں میں لگی مہندی وہاں ہے

بیگم کا اخلاقی معیار آپ نے دیکھ لیا اور اس جدید رنگ سے ان کی نفرت بھی محسوس ہو گئی، اس تہذیبِ نو کے اثرات جب بیگم کے سامنے آئے تو وہ بے تحاشا چیخنے لگیں،

اے بی نرالا رنگ ہے دنیا کا آج کل   بی بی پھنسی غلام سے باندی میاں سے ہے
جورو انہیں کی یار بلاتی ہے بے دھڑک   جو مردوے رجوع ہیں اغلام کی طرف

چھوڑیئے اس جھگڑے کو یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی بیگم کی اوڑھنی تو سن لیجئے،

میں اوڑھوں گی یہ ململ کی بسنتی اوڑھنی   مرزا منگوا دو جھلاجھل کی بسنتی اوڑھنی
یا تو ہو کشمیر کی ہو یا بنارس کی سنو!   لوں گی پیلے دار آنچل کی بسنتی اوڑھنی
پھٹ پڑا ہے آج گوئیاں پر زمانے کا بسنت   چمپئی کرتی ہے مخمل کی بسنتی اوڑھنی
صوفیانہ پن دوگانا جان کا جاتا نہیں   اوڑھ کر آئی ہیں کیا ہلکی بسنتی اوڑھنی
سوت میری اے بوا کرتی ہے مجھ سے ہمسری   اوڑھتی ہے آج کل ہلکی بسنتی اوڑھنی
کچھ نہ دیکھا ہر کسی نے میں ہی شرما گئی   کیا کہوں سینے سے جب ڈھلکی بسنتی اوڑھنی

دیکھتے ہی ساری محفل بھر کی آنکھیں پھر گئیں   اوڑھ لی بیگم نے جب ہلکی بسنتی اوڑھنی

آپ اکتا گئے ہوں گے اس لئے اب اس مضمون کو بھی ختم کیا جاتا ہے۔ اب صرف چند "شہ پارے" سن لیجئے۔

چمن میں نظم کے کچھ میں بھی گل بوٹے لگاؤں گی !
رنگیلے مردوے سب اپنی رنگ آمیزیاں کرلیں !

ہر اک ہوتا ہے دلسوزی پہ شیدا شمع کو دیکھو   ادھر وہ جلنے لگتی ہے ادھر پروانہ آتا ہے

نفسیات کے اہم مسئلے کو کس عمدگی سے بیگم نے دل سوزی کے پیرائے میں ادا کیا ہے۔ غور فرمایئے۔

خیالی شکل اس کی آنکھ سے اوجھل نہیں ہوتی   تصور جس گھڑی کرتی ہوں آتا ہے وہ خلوت میں

دیکھئے کس قدر بلند شعر ہے۔ مومن خاں کے ایک شعر پر غالب دیوان دینے تیار تھے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن تو خیر مومن ہی ہیں مگر اس کافر بیگم نے بھی مومن سے کچھ ہیٹا شعر نہیں کہا ہے۔

موئی دیوانی سن مجھ سی محبت اس کو کہتے ہیں   پھرا ہے ساتھ ہی لیلیٰ کے مجنوں سارباں ہو کر

دیکھئے سیدھے سادھے الفاظ میں محبت کو کس مزے سے ذہن نشین کرایا ہے۔

قدر انساں کی ہوتی ہے جبھی اے بنو   جب کوئی مرتا ہے یا کوئی جدا ہوتا ہے

اسی مضمون کا ایک شعر جان صاحب نے بھی کہا ہے

کھلتی ہے جبھی ٹھوکریں کھانے کی حقیقت   سر پر جو کوئی چاہنے والا نہیں رہتا

مضمون ایک ہی ہے مگر دونوں نے مختلف طریقوں سے ادا کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دونوں نے واقعہ کہا ہے۔

رکھے تھے چار ہی تنکے نگوڑی بلبل نے   بنا نہ تھا کہ لگی آگ آشیانے کو

نام ساقی کا لیا آگیا آنکھوں میں سرور   ہے غرض بندی کو شیشے سے نہ پیمانے سے

یہ شعر واقعی شعر ہے ساقی کی تعریف اس سے بہتر نہیں کی جا سکتی،

جب تلک جھگڑا لڑائی تھی تو شکوے تھے بہت   مل گئے ہم تم تو پھر شکوہ گلا کچھ بھی نہیں

دیکھئے کس مزے سے ایک نفسیاتی الجھاؤ کو سلجھایا گیا ہے۔

ادھر آ! کلیجے سے تجھ کو لگا لوں   میں قربان مجھ سے خفا ہونے والے

یہ شعر تعریف سے مستغنی ہے غضب کا شعر کہا ہے۔

تمہیں چاہا تو اب سارا زمانہ پھر گیا مجھ سے   نہ اپنا کوئی آتا ہے نہ اب بیگانہ آتا ہے

چاہنے والے کا حال یہی تو ہوتا ہے۔

مجھ کو چاہت کا محبت کا ملا یہ ثمرہ   کام اچھا بھی جو کرتی ہوں برا ہوتا ہے

یہ منزل اختتام محبت کی ہے۔ اس کے بعد کہنا پڑتا ہے۔

محبت کا برا ہوا ہے دوگانا   سزا اپنے کئے کی پا رہی ہیں

اب جو درد اور سوز شروع ہوتا ہے تو آہوں کے دھوئیں کے دل بادل ہو جاتے ہیں۔

یہ جس پر تم کو بادل کا گماں ہے   دوگانا میری آہوں کا دھواں ہے

ظاہر ہے کہ اس درد بھری آہ کا اثر بھی ہوگا چنانچہ کہتے ہیں۔

سوت کے بھی نکل پڑے آنسو   درد ایسا ہے میری بپتا میں

اس منزل پہ آنے کے بعد بقول کسی استاد کے "پہلے تم سے تھی محبت اب تو سب سے ہو گئی" کہنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو فرہاد سے ہمدردی ہوتی ہے۔

یہ تو ہرگز نہ مناسب تھا بوا شیریں کو   شاد خسرو رہے اور غمزدہ فرہاد رہے

نہ صرف فرہاد سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے بلکہ لیلیٰ سے بھی نفرت سی ہونے لگتی ہے اور مجنوں کو سراہنے لگتے ہیں۔

اس پہ مجنوں کا آگیا تھا خیال   ورنہ کیا تھا نگوڑی لیلیٰ میں

ایک بہت ہی "لذیذ" شعر سنئے۔

مزا آگیا روح کو اور تن کو   ملایا جو اس نے دہن سے دہن کو

اگر کوئی مشہور "نفسی" بھی بوسہ کا تجزیہ کر کے بیان دے تو یہی بیان دے گا جو بیگم نے کہا، بات معمولی ہے مگر کتنی دور تک پہنچتی ہے

میں نے بیگم کے دیوان سے مضمون کے لئے جو شعر منتخب کئے تھے وہ چھ سو کے قریب تھے، اس مضمون میں اب تک میں نے (۲۹۲)، شعر نقل کئے ہیں مگر معلوم یہ ہو رہا ہے کہ چند ہی شعر نقل کئے گئے، ان میں تذکرہ ریختی کا ایک شعر بھی نہیں ہے بیگم کے متعلق اب بھی حسان سخن کو شبہ ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں بیگم ہی ان کے شبہ کو رفع کر سکتے ہیں، اس لئے ان کے چند وہ شعر جو تعلی کے سلسلے میں کہے گئے ہیں نقل کئے جاتے ہیں۔

بوا دل کو مزے سے ریختی پڑھتی ہوں صحبت میں   مگر ان مردوؤں سے کم نہیں ہوں کچھ شرافت میں

مردوے دیکھ کے حیرت سے کہا کرتے ہیں   یہ ہے بیگم جو انوکھی ہے زباندانی میں
جان صاحب کو سنا تھا یہ اسی دیکھ لیا   ریختی کہتے ہیں، پڑھتے ہیں غزلخوانی میں

گوئیاں چل پھر کے خوب دیکھا ہی جہاں   جو بات ہے لکھنؤ کی وہ بات کہاں
دعویٰ ہے زباں دانی کا جن مردوں کو   وہ سب مانے ہوئے ہیں بیگم کی زباں

انوکھا طرز ہے اپنا جہاں سے   طبیعت یہ کوئی لائے کہاں سے
وہ بلبل ہوں سنیں سب کان رکھ کر   ترانہ سنجیاں میری زباں سے
نہیں ہے ڈھنگ جن کو بات کا بھی   لڑاتے ہیں زباں میری زباں سے
دو عالم میں پڑی ہیں میری گوئیاں   زباں دانی بھلا لائیں کہاں سے

نت نئے ناز سے انداز ادا ہوتے ہیں   ریختی میں مرے مضمون بلا ڈھتے ہیں

یہ مضمون ادھورا رہ جائے گا۔ اگر بیگم کی قصیدیوں کا ذکر نہ کیا جائے بیگم کے کلیات میں تقریباً چالیس قصیدیاں ہیں جو کلکتہ اور حیدرآباد میں کہی گئی ہیں دکن میں آنے سے پہلے دو ہی تین قصیدیاں نواب صاحب مرشد آباد وغیرہ کی تعریف میں کہی گئی ہیں بقیہ سب کی سب حیدرآباد میں کہی گئی ہیں۔ ان میں زیادہ قصیدیاں حضرت غفران مکاں نواب میر محبوب علی خاں بہادر والئ دکن کی شان میں یا سالگرہ کے موقع پر اور شاہزادگان والاشان کے عقد مبارک وغیرہ کی تقاریب میں کہی گئی ہیں اور بعض قصیدیاں حضور بندگان عالی متعالی نواب میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کی مدح میں، ہر قصیدی ریختی کا مکمل نمونہ ہے اور اس کی تشبیب نہایت عمدہ۔ چند آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

کیا کہوں تم سے دوگانا جان اپنا ماجرا   ناک میں دم سوت جل ککڑی نے میرا کر دیا
زندگی دوبھر ہوئی ہے اور تم سے کیا کہوں   دیکھئے ہوتا ہے کس دن اس سے چھٹکارا مرا
پھنک رہی ہوں اس جلاپے سے نہیں دم بھر قرار   سوت مجھ پر آئی یا یہ روگ آیا جان کا
مرمٹی ہے ایک کلکتہ میں بنگالن اجی   آج کل ریجھا ہوا ہے اس پہ میرا مردوا
اس قدر کالی کلوٹی ہے نگوڑی کیا کہوں   دیکھ کے بھتنی بھی ڈر جائے وہ کالی ہے بلا
بات کرنے میں نرالی چھب انوکھی ہے وہ لغت   "آؤ" "دا لیشو" بیٹھنے کو "بوشو" کہتی ہے سدا
انگیا کرتی سے نہیں محرم ہوئی وہ آج تک   ایک آنچل تو چھپا ہے ایک آنچل ہے کھلا
عورتیں تو عورتیں شرمائیں سارے مردوے   کولے مٹکاتے ہوئی چلتی ہے ایسی بے حیا

ہے بلا کی جادوگرنی خوب منتر یاد ہیں   چار ہی انچھر میں اس کو اپنے بس میں کر لیا
پانی پی پی کر نہ کیوں کوسوں اسے میں رات دن   چھائیں پھوئیں نوج ایسی ہووے کوئی بیسوا
ہو گیا جس دن سے اس مردار کا وہ پا مرید   ایک دن بھولے سے بھی گھر میں نہ آیا مردوا
بیٹھی رہتی آس پر اس کی بھلا میں کب تلک   ہو کے زچ آخر کو باندھا اپنا بدھنا بوریا
گھر سے جو نکلی تو بندی نے دکن کی راہ لی   پھر نہ ٹھہری میں کہیں آ کے یہیں پر دم لیا
شکر ہے خالق کا میں پہنچی یہاں تک خیر سے   شہر جب دیکھا تو جی اندر سے کیا ہی خوش ہوا
تھک گئی تھی اک جگہ بستر لگا کر پڑ رہی   سو گئی غفلت سے میں جس دم لگی ٹھنڈی ہوا
نیند کا تو اک بہانہ خواب آ گئے کیا کہوں   میرے خالق نے مجھے اک باغ میں پہنچا دیا
دیکھتی کیا ہوں خوشی ہے چھائے ہیں ہر طرف   اور اس میں عیش کے سامان سب ہیں جا بجا
ناچتے ہیں مور خوش ہو ہو کے اس ترکاہے سے   ہر کتھک کی روح آئے دیکھنے بن کر ہوا
گا رہی ہیں بلبلیں غزلیں نئے انداز سے   وجد زہرہ مشتری کو جن کے سننے سے ہوا
جھومتی ہیں ڈالیاں شادی سے گلشن ہے نہال   پھول ہنستے ہیں تو غنچے مارتے ہیں قہقہا
کر رہی ہے اے بوا چھڑکاؤ شبنم اس طرح   ٹھنڈی ٹھنڈی چل رہی ہے باغ میں سنکی ہوا
ہر روش سر پر چڑھی اپنی جوبن پر ہے مست   عیش باغ اس کو کہیں سب مردوے تو ہے بجا
یہ سماں آنکھوں سے جب دیکھا تو حیرت ہو گئی   دل سے میں کہنے لگی اے دوست تو مجھ کو بتا
کیا سبب اس کا جو گلشن میں ہیں یہ تیاریاں   جن کو آنکھوں نے کبھی دیکھا نہ کانوں سے سنا
دل نے دی ہنس کر صدا بیگم نہیں تم جانتی   مدتوں کا جو تھا ارمان تھا وہ بر آئے گا
اس قدر غفلت نہیں اچھی ذرا ہشیار ہو   ہے چھٹی تاریخ میراں جی کی سن لے اے بوا
آج ہی ہے تیسویں اس کی گرہ کا سال ہے   اب جو ہے سلطان دنیا میں دکن کے ملک کا

یہ قصیدہ بیگم نے ۱۳۱۶ھ میں کہی ہے۔ ۱۳۱۹ء میں مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی کو خلعت وزارت سرفراز ہوا تو بیگم نے ایک قطعہ "با تقطیع" صنعت توشیح میں کہی تھی جو اپنی وضع کی ایک ہی چیز ہے۔ ملاحظہ ہو ہر شعر کے مصرع اول اور دوم کے سر حرف لئے جائیں تو مصرع بنتا ہے۔

خ۔ خوش ہو کے ارادہ کیا بیگم نے چمن کا   ا۔ انداز چلی دیکھنے پھولوں کی پھبن کا
ل۔ لالہ کی کٹوری میں وہ اٹھتا ہوا جوبن   ق۔ قد سرو کا، لب غنچے کا، رخسار سمن کا
ن۔ نرگس سے اشارے کئے سنبل سے کئے چھل   ی۔ یہ ناز یہ انداز ہے جو تھی کی دلہن کا
ک۔ کیا ہونٹ ہیں نگین کہ جنہیں دیکھ کے شرمائے   ی۔ یاقوت بدخشاں کا ہو یا لعل یمن کا
ا۔ اتراتی ہوئی پھرتی ہے اس طرح سے خوش خوش   ش۔ شاید کہ صلہ مل گیا کچھ اس کو سخن کا
ا۔ اے کیسا صلہ دی مجھی خالق نے مراد آج   د۔ دل بڑھ جو گیا تنگ ہے ملبوس بھی تن کا
ک۔ کیواں کا عروج آج مہاراجہ نے پایا   د۔ دیا داب رہی گھر کی نہ مجھے دھیان وطن کا

د۔ وہ دیکھو وزارت کا ملا شاد کو خلعت ا۔ اب دیکھنا دشمن کا بھی ڈھل جائیگا من کا
ن۔ نکہت تسے اخلاق کی ہر مشک سے بڑھ کر د۔ دیکھا تو دکن ایک نمونہ تھا ختن کا
ک۔ کسریٰ کا تجھے عدل جو خالق نے دیا ہے ن۔ نقشہ نہ رہا شبر کا باقی نہ ہرن کا
ک۔ کیا جوش مسرت کا زمانے میں ہوا ہے ا۔ اب درد کا ہے نام جہاں میں نہ محن کا

توشیح میں بھی سال ہے مصرع میں بھی گن لو
خالق نے کیا شاد کو دیوان دکن کا!

۱۷ مئی ۱۹۲۷ء کو نواب سالار جنگ بہادر نے اپنی روانگی سفر یورپ کی تقریب میں ایک عصرانہ ترتیب دیا تھا جس میں بیگم نے ایک قصیدہ سنائی تھی، چند شعر سنئے

باغ کی ہے بہار جوبن پر جام پہ جام پیجئے بھر کر
چہچہے کر رہی ہے ہر بلبل مور بھی ناچتے ہیں خوش ہو کر
فرش مخمل کا لائی ہے سبزہ چاندخاں آئے چاندنی لے کر
روشیں صاف کر رہی ہے ہوا کہیں شبنم بچھاتی ہے گوہر
کس کے مجرے کو آئی ہے زہرا مشتری کو ہے وجد گردوں پر
میں نے جو دیکھا باغ کا یہ رنگ ٹوہ لی مالنوں سے بس جا کر
آمد آمد ہے باغ میں کس کی آنکھ نرگس کی ہے لگی در پر
ایک غنچہ دہن یہ کہنے لگی بیگم اب تک نہیں تجھے یہ خبر
آئے گا وہ یہاں پہ والا شان نام جس کا جہاں میں ہے اشہر
جس کی بخشش سے ہے جہاں آباد فیض بھی جس کا عام ہے سب پر
میں نے اس گل کا نام جب پوچھا بولی ہر اک کلی یہ ہنس ہنس کر
کہ وہ سالار جنگ ثالث ہے میر یوسف علی فریدوں فر
یہ وہ نواب ہیں میں صدقے گئی فیض کی جن کے دھوم ہے گھر گھر
باغ میں جانے کی ہے باری آج کہ خدا رکھے اب ہے عزم سفر
نام سنتے ہی دل جو شاد ہوا میں نے مطلع یہ پڑھ دیا فرفر
نہیں فیاض تجھ سا نام آور سائلوں کی ہے بھیڑ اس در پہ

اور قصائد کے شعر نقل کئے جائیں تو مضمون بہت لمبا ہو جائے گا۔ اس لئے انہیں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ غرہ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ کو محفل عقد مبارک میں جو میر سلطان علی صاحب (جام باغ دارالشفاء) نے منعقد کی تھی۔ اور مصرع دیا تھا۔ ع بحکم حق دلہن زہرہ بنیں نوشہ بنے حیدر بیگم نے طرح میں بڑی اچھی ریختی کہی تھی جو نقل کی جاتی ہے۔

خدا کی شان ہے بالا خدا کی شان ہے برتر رسول اس کے محمد مصطفےٰ ہم سب کے پیغمبر
محمد کا وصی مولیٰ علی قربان ہو جاؤں کہ جس کا عقد خالق نے پڑھا ہے عرش کے اوپر
کل اُنتیس تھا اور آج ذی الحجہ کی پہلی ہے خوشی کا دن ہے کنگھی چوٹی کر کے پہنو اب زیور
رسول اللہ کے گھر میں رچی ہے آج ہی شادی خدا کے حکم سے زہرہ دلہن دولہا بنے حیدر
ازل کی پینے والی ہوں سنا صاحب نام ساقی کا نشے میں جو پہلے ہی سے تھی قابو نہ تھا دل پر
پکاری بے خودی میں اپنے ساقی کوثر صدقے پلا دے آج تو اک جام کوثر کا مجھے بھر کر
قیامت کا ترا وعدہ ہے دل بے چین ہے میرا جوانی پر جوانی آ رہی ہے دیکھ تو آ کر
مجھے دنیا کے گندے پانی کی ہرگز نہیں خواہش تری الفت کی گھٹی میں پڑی جو ہے وہ ہے بہتر
یہ جتنے پینے والے آج کے جلسے میں حاضر ہیں ہیں متوالے ترے میخانے کے صدقے گئی تجھ پر
اگر ظاہر بہ ظاہر تو نہیں آتا ہے تو اچھا جمال اپنا دکھا ناظر ہیں ہم سب کو ابھی مر کر
بھلا کب تک نہ اپنی شکل تو دکھلائے گا ہم کو قیامت میں پکڑ لیں گی ترا دامن سب آ آ کر
شفاعت کے لئے بی بی ہیں میری فاطمہ زہرا یہ بیگم آپ کی لونڈی ہے اس کو بھی ملے ساغر

چاہتا ہوں کہ مضمون ختم کر دوں مگر "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" کے مصداق بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ لیجئے اب اس خمسہ پر مضمون ختم ہوتا ہے۔ حضرت غفران مکان نواب محبوب علی خاں بہادر آصف کی غزل کو بیگم نے خمسہ کیا تھا سنئے، چیز بڑی اچھی ہے۔

زرا بے غمزے انوکھی تھی ہر جفا ان کی نہ حشر تک کبھی بھولے گی وہ ادا ان کی
بوا جو منتیں کرتا تھا مر دوا ان کی سوال وصل پہ نیچی نظر تھی کیا ان کی
ہماری آنکھوں میں پھرتی ہے وہ حیا ان کی

موئے جو مر گئے اچھا ہوا سزا ان کی واللہ آپ پر اس کا نہیں خطا ان کی
بلائیں چھینئے والے ہیں آپ کیا ان کی؟ ترے جو عشق میں عاشق وہ تھی قضا ان کی
یہ آپ کہہ دیں کرے مغفرت خدا ان کی

نہ آنکھ ٹک سے لگے گھر میں وہ آئے جب سے گئے منا کے لا انہیں میری دوا ترے صدقے
وہ مجھ سے روٹھ گئے ہیں خدا ہی خیر کرے یہ ان کا قول ہے بیری بلا لے تجھ سے
بلائیں اس کی بھی لوں گر لے بلا ان کی

مجھے تو عشق ہے نرگس بوا کی آنکھوں کا! کوئی بتلائے کہاں میں کہاں کا بس ہے مرا!
نظر اٹھا کے جسے دیکھا مر گیا وہ موا ستم ہے غمزہ بلا ناز ہے غضب ہے حیا!
اور اس پہ ڈھاتی ہے آفت ہر اک ادا ان کی

اُدھر وہ سوت کے پہلو میں پی رہے ہیں شراب گر اک کے واسطے جل بھن کر دل ادھر ہے کباب
خطا معاف ہو بندی کا قول ہے یہ جناب نہ اس کا مثل جہاں میں کہیں نہ اس کا جواب

وفا وفا ہے ہماری جفا جفا اُن کی

وہ پیارے پیارے سے قدم وہ بھری بھری بانہیں! کوئی حسین ہے ایسا یہ کس طرح مانیں!
نثار ہوتی ہیں اک اک ادا پہ سو جانیں چلے یہ چال قیامت کی بھی تو ہم جانیں!
بہت اڑائی ہے اٹکھیلیاں صبا اُن کی

اُدھر تو ستو ہیں امیدوار سب کی سب ادھر بلایا ہے ہم نے بھی ان کو آج کی شب!
یہ دیکھنے ہیں کہ کس کا برآتا ہے مطلب عدو بھی وصل کے طالب ہیں دیکھئے یارب!
دعا قبول ہماری ہو یا دعا اُن کی

جوانی ان کی جو اُبھر بنا دکھائے گی جو مہندی پاؤں کی اودھم یونہی مچائے گی
تو میری منت ہیں اک روز جان جائے گی کبھی وہ شوخیِ رفتار رنگ لائے گی
کرے گی خون مرا ایک دن حنا اُن کی

اب ایسے مردوے کے پاس کوئی نوج رہے جو اُن کی ناف ٹلی آم نگئے نلے میرے!
یہی نہیں ہے کہ انگیا ہوئی مری ٹکڑے شب وصال ہیں جو مانگا پانی بھی اُن سے!
مسک گئی ہے سرک جائے سے قبا اُن کی

اڑائیں ہیں نے جو اس کی فضیلتاں اکثر! تو میرے نام سے آنے لگا ہے اس کو عذر
مرے مزاج سے کہتا ہے مرزا وا ڈرکر خدا کے سامنے رکھوں گا ہاتھ کانوں پر
برائی میں نہیں سننے کا برملا اُن کی

نئی دلہن ہوں نہیں گھلا ملا نکلے قابل وہ سوت لائے ہیں جو بنا ہے اب مرا مشکل
ابھی سے دلتے ہیں چھاتی پہ مونگ کھو کر سل وہ ابتدا ہی میں کرنے لگے ستم اے دل!
اب آگے آگے قیامت ہے انتہا اُن کی

کہیں بھی دیکھے نہیں قدرداں بوا ایسے سلامت اِن کو ہزاروں برس خدا رکھے
بہت کلام سے بیگم کے لے رہے تھے مزے ملے تھے آج تو ہم بھی جناب آصف سے
عجیب رنگ میں ہیں پوچھتے ہو کیا اُن کی

دیکھا آپ نے ریختہ کے شعر پر ریختی مصرعے پہنچانا اور پھر اس طرح کہ ہر شعر گویا اپنا لیا، بیگم ہی کا کام تھا ——— اچھا اور ایک خمسہ کے چند بند ملاحظہ فرمائیے۔ یہ خمسہ اعلیٰ حضرت حضور بندگان عالی نواب میر عثمان علی خاں بہادر کی غزل پر کیا گیا ہے اور بڑے اچھے مصرعے پہنچائے ہیں۔

اے میں قرباں گئی تجھ پہ دکن کے سلطان یہ دعا کرتی ہوں خالق رکھے تجھ کو شاداں
ہند بھر میں ترا سکہ چلے تیرا فرمان جیسے تو فخر سلاطین ہے بفضل یزداں
یونہیں ممتاز ترا دورِ حکومت رکھے

شاہ کی عمر میں دولت میں رہے افزونی اپنے خالق سے دعا مانگ رہی ہیں میں بھی
تاقیامت یونہی سرسبز رہے یہ کھیتی آل اولاد کو اللہ دے عمرِ خضری!
ان سے آباد ترا خانۂ دولت رکھے

نام حاتم کا سنا اور نہ کبھی دیکھا تھا! تو ہے عثمان علی خاں، وہ مواکافر تھا!
اس قدر جوش پہ ہی فیض کا تیرے دریا جو وہ حاتم رہے شرمندۂ احسان تیرا!
عدل کسریٰ کو مخجل تیری عدالت رکھے!

تو ہمیشہ رہے خوشحال نظام سابع! رہے بیگم پہ بھی افضال نظام سابع
رنگ رلیاں کرے ہر سال نظام سابع! بن کے ساقی ترا اقبال نظام سابع
تجھ کو صہبا کشِ خمخانۂ عشرت رکھے

بیگم کے (۲۷۰) شعر نقل کر کے میں نے مضمون ختم کر دینا چاہا تھا۔ مگر باتوں باتوں میں خمسوں کو چھوڑ کر قصاید وغیرہ کے تقریباً سو شعر اور نقل ہو گئے، اس طرح آج آپ کے سامنے تقریباً چار سو شعر ہیں۔ غور فرمائیے آغا حیدر حسن صاحب شعر نہیں کہتے، تمکین کاظمی صاحب کبھی شعر کہتے ضرور تھے مگر انہیں شاعری چھوڑے زمانہ ہوا اور پھر انہیں ریختی گوئی کا شوق نہیں رہا۔ مجھے شاعری سے شغف ضرور ہے مشاعروں کا حاضر باش نہیں ہوں لیکن طبیعت لگ جاتی ہے تو کچھ کہہ لیتا ہوں مگر ریختی میں ایک مصرع بھی آج تک نہیں کہا۔ پھر یہ اشعار حسان سخن کس کے حساب میں درج فرمائیں گے، بقول ان کے بیگم کا وجود ہی سرے سے نہیں ہے عجب ثم عجب

خدا کرے راجہ صاحب محمود آباد جلد اپنا وعدہ پورا فرمائیں اور دیوان طبع فرما دیں پھر بھی دیکھ لیں گے کہ بیگم کس پائے کے شاعر تھے، حیدرآباد کا بچہ بچہ ان سے واقف ہے۔ انتقال سے چھ آٹھ مہینے پہلے آل انڈیا مشاعرے میں جو عثمانیہ یونیورسٹی میں منعقد ہوا تھا۔ یوپی کے اکثر شعرا حضرت حفیظ، حضرت جگر، حضرت دانش وغیرہ نے بیگم کو سنا ہے مجھے حیرت ہے کہ حسان سخن جانتے، بوجھتے اور اچھی طرح پہچاننے کے باوجود یہ کچھ کہہ رہے ہیں۔

محترمہ بی صدیقہ صاحبہ! آپ نے اپنے چہیتے شاعر شیدا کے حریف بیگم کا کلام ملاحظہ فرمایا! یہاں سے کہیے بیگم کے مقابلہ میں شیدا کی کوئی ہستی ہے؟ اب میرا وہ فقرہ پڑھیے "یوں تو ریختی خوب لکھتے ہیں مگر بیگم کی سی بات ان میں کہاں" اب دوبارہ اس فقرے پر غور فرمائیے "خوب لکھتے ہیں" جو میں نے لکھا وہ بھی ایک زیادتی تھی لکھنا تو چاہیے تھا۔ یوں تو ریختی کہہ لیتے ہیں مگر بیگم سے دور کی نسبت بھی نہیں افسوس سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست!

تسکین عابدی

دُھن

بُجھی سی آنکھیں، اُداس جی، تن بدن ہے مدت سے ایک چھالا
لگی ہے دل سے، اِدھر بھی ساقی، رہے نہ خالی مرا پیالا
جگا کے جیون، ابھار دے من، سدا رہے تیرا بول بالا !

بہا دے امرت کے آج دھارے، چھکا دے جی بھر کے آج پیارے
بھر اس طرح سے کہ بہہ چلے میری دونوں آنکھوں سے رس کا نالا
جگا کے جیون، اُبھار دے مَن، سدا رہے تیرا بول بالا!

لگی ہے اب تجھ سے ڈور من کی، زباں پہ ہے تیرے نام کی رٹ
کہاں کی سُمرن، کہاں کی پُوجا، نہ مرگ چھالا نہ ڈور مالا
جگا کے جیون، اُبھار دے مَن سدا رہے تیرا بول بالا!

تری نظر بن کے اک کِرن، اس طرح سمائی ہے میرے مَن میں
کہ میرے جیون کے جگ میں اک دم سے ہو گیا ہر طرف اُجالا
جگا کے جیون، ابھار دے من، سدا رہے تیرا بول بالا !

نہ پوچھ پیارے کہ اس اُجالے نے میری آنکھوں کو کیا دکھایا
کہ اس کے بدلے میں اپنا جی جان اور جو کچھ تھا بیچ ڈالا
جگا کے جیون اُبھار دے من سدا رہے تیرا بول بالا!

پیا ہے جب سے یہ گھونٹ رس کا، کہاں کی سدھ اور کہاں کا جیتا
بہک کے بگڑا، بگڑ کے کچھ اور بن گیا آج بننے والا !
جگا کے جیون، اُبھار دے من سدا رہے تیرا بول بالا!

سید مقبول حسین احمد پوری

شوق بے تابانہ

نقاب روئے منور سے اب اُٹھا بھی کہیں
کرشمہ حُسنِ جہاں سوز کا دکھا بھی کہیں
فسونِ ناز سے برقِ بلا گرا بھی کہیں
غضب کی آگ دلِ سرد میں لگا بھی کہیں
جنونِ شوق میں بے خود مجھے بنا بھی کہیں

نظر فریب مناظر دکھائے گا کب تک؟
حیات و موت کے پردے گرائے گا کب تک؟
جہاں میں ٹھوکریں در در کھلائے گا کب تک؟
چراغِ ہستیٔ موہوم کا بجھا بھی کہیں
جنونِ شوق میں بے خود مجھے بنا بھی کہیں

متاعِ صبر کے دھوکے میں لا رہا ہے کیوں؟
تمیز و ہوش کا جادو جگا رہا ہے کیوں؟
خیال و وہم کی دنیا بسا رہا ہے کیوں؟
سرِ نیاز سے بارِ گراں ہٹا بھی کہیں
جنونِ شوق میں بے خود مجھے بنا بھی کہیں

ریاضِ دہر کے نقش و نگار دیکھ چکا
فلک کے سائے میں باغ و بہار دیکھ چکا
ہزار بار نہیں لاکھ بار دیکھ چکا
نشاط و عیش کی رنگینیاں چھپا بھی کہیں
جنونِ شوق میں بے خود مجھے بنا بھی کہیں

طلسم ریز نواؤں کا اہتمام فضول
شمیم بیز ہواؤں کا اہتمام فضول
حجاب خیز فضاؤں کا اہتمام فضول
دلا نہ یاد یہ بزمِ طرب بھلا بھی کہیں
جنونِ شوق میں بے خود مجھے بنا بھی کہیں

مری نظر میں تماشائے رنگ و بو بے کار
شباب حُسن کے جلووں کی گفتگو بے کار
گلِ حیات کی رنگینیوں میں تو بے کار
نکل کے قیدِ تعیّن سے دل میں آ بھی کہیں
جنونِ شوق میں بے خود مجھے بنا بھی کہیں

دکھا رہا ہے ازل سے مجاز کا پردہ
نوائے حسن یہ کیسا ہے ساز کا پردہ
نگاہِ ناز ہی کافی ہے راز کا پردہ
بُھلا بُھلا تو سہی ماسوا بُھلا بھی کہیں
جنونِ شوق میں بے خود مجھے بنا بھی کہیں

اندرجیت شرما

تصور کے دھندلکے میں

شام کی راہ پہ جلنے لگے تاروں کے چراغ
اب بھی دھندلے ہیں مگر میرے تصور کے نقوش
جیسے پائے نہ کوئی راہِ محبت کا سراغ
سُرخ تحریر پہ جس طرح سے پانی پڑ جائے
نقش جمتا بھی نہیں شکل بدلتی بھی نہیں
ڈوبتی بھی نہیں یہ ناؤ سنبھلتی بھی نہیں

سُرمئی ابر کے ٹکڑے پہ طلائی تحریر
میز پر جیسے کسی دوست کی دھندلی تصویر
اور وہ دوست جسے غم نے بھُلا رکھا ہے
(صرف تخیل ہے، تخیل میں کیا رکھا ہے!)

چھو گئے ہاتھ سے میرے ابھی اُس شوخ سے ہاتھ
جسم بیدار ہوا جاتا ہے، آنکھیں رنگیں —

. . . .

(صرف اک وہم ہے اے شوق! نہیں، کوئی نہیں!)

اور یہ کون چلا آتا ہے کمزور و نزار
اس کو تو چھوڑ کے زنداں میں ابھی آیا تھا
اس کا پیغام بھی تسلّی کے لئے لایا تھا
اب تو تسلّی نہیں پہنچاؤں وہ پیغام کیسے؟
(چھوڑ سکتی ہے بھلا گردشِ ایام کسے!)

گھر میں روتے ہوئے بچوں کی صداؤں کا گداز
دُور پر بھونکتے کتوں کی پریشاں آواز
ہر صدا ذہن میں دھنستی ہی چلی جاتی ہے
نیم روشن کسی گوشے میں جگہ پاتی ہے

اور باتیں بھی چلی آتی ہیں بے عذر و سوال
یہی جینے کی تمنا، یہی مرنے کا خیال
اُن کے وعدے کی خوشی، اُن کے نہ آنے کا ملال

کتنے غمناک و طرب ناک خیال آتے ہیں
اور پھر وقت کی آغوش میں سو جاتے ہیں
ہو گی فرصت تو کسی رات کی تاریکی میں
انہیں چھیڑوں گا کہ یہ روح کو گرماتے ہیں

وہ بگل جنگ کے بجنے لگے اب جاتا ہوں
خود کو اک اور ہی جادے پہ رواں پاتا ہوں
پھر ہے میدانِ عمل سامنے مسرور ہوں میں
اب خیالات کی دنیا سے بہت دور ہوں میں

احتشام حسین

شادی خانہ آبادی

ہاشم کو لاہور میں رہتے ہوئے تین سال گذر گئے تھے۔ اس سے پہلے بھی طالب علمی کے زمانے میں وہ چار سال یہاں رہ چکا تھا۔ اگرچہ ان دنوں اس کا قیام کالج کے ہوسٹل میں تھا اور اس کی ملاقات زیادہ تر کالج کے طلبہ اور پروفیسروں تک محدود تھی۔ بی اے کے بعد اُسے ملازمت مل گئی تھی۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ ملازمت حاصل کرنے کے بعد بھی وہ لاہور ہی میں بیٹھا رہے۔ لیکن بعض وجوہ سے اُس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور اُسے فیروزپور جانا پڑا۔ فیروزپور رہتے بمشکل ایک سال ہوا تھا کہ حالات سازگار ہو گئے اور اس کا تبادلہ لاہور ہو گیا۔ اب وہ مسلسل تین برس سے یہیں تھا۔ فلیمنگ روڈ پر ایک مختصر سا مکان اُس نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ گردوپیش متوسط درجے کے لوگ آباد تھے۔

ہاشم نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اس لئے دفتر کے علاوہ فارغ اوقات میں اُس کا مشغلہ سیر و تفریح کرنا یا دوستوں سے گپ لڑانا تھا۔

جس مکان میں ہاشم رہتا تھا اس کے قریب ایک کیمسٹ کی دکان تھی۔ یہ کیمسٹ گذشتہ جنگِ یورپ میں کسی فوجی ہسپتال میں کمپاؤنڈر تھا۔ جنگ ختم ہونے پر باقی لوگوں کی طرح اُسے بھی ملازمت سے جواب مل گیا تھا۔ فلیمنگ روڈ پر دکان کھولنے سے پہلے یہ شخص لاہور کے مختلف محلوں اور بازاروں میں قسمت آزمائی کر چکا تھا۔ لیکن اس زمانے میں کہ باقاعدہ سند یافتہ ڈاکٹر دن بھر مطب میں بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے ہیں، ایک کمپاؤنڈر اس پیشے میں کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے۔ بہرحال فلیمنگ روڈ پر اس کا کاروبار چلتا تھا یا نہیں چلتا تھا اس سے بحث نہیں۔ اُس کی ڈسپنسری میں یار لوگوں کا جمگھٹا ضرور لگا رہتا تھا۔ اس کا نام جمال الدین تھا اور عام لوگوں میں وہ ڈاکٹر جمالی کے نام سے مشہور تھا۔ ڈاکٹر جمالی کی دکان کے ایک حصے میں دواؤں کی دو الماریاں رکھی تھیں اور دوسرے حصے میں ایک میز اور چند کرسیاں پڑی تھیں۔ ہاشم جب صبح دس بجے دفتر جاتا اور شام کو چار بجے وہاں سے لوٹتا تو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بہت گرمجوشی سے علیک سلیک ہوتی تھی۔ یوں بھی ڈاکٹر جمالی ہر شخص کے ساتھ بہت تپاک سے ملنے کے عادی تھے۔ رات کو دیر تک اُن کے دواخانے میں محفل جمی رہتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے کئی مرتبہ ہاشم کو بھی بلایا لیکن وہ یونہی معذرت کر کے گذر جاتا تھا۔ کبھی کبھار ہاشم کو کسی معمولی سی دوا کی ضرورت پڑتی تو وہ ڈاکٹر جمالی کی دکان پر چلا جاتا تھا اور کھڑے کھڑے چند باتیں ہو جاتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب بہت مروّت سے پیش آتے تھے اور عموماً دوا کی قیمت لینے سے انکار کر دیتے تھے۔ ہاشم کو یہ گوارا نہ تھا اس لئے وہ اصرار کرتا تھا کہ قیمت ضرور لی جائے ورنہ دوا واپس کر دی جائے گی۔ اصرار و انکار کی اس کشمکش میں بعض اوقات ہاشم ہنس کر کہتا "یہ صحیح ہے کہ آپ دوستوں سے دوا کی قیمت نہیں لیتے۔ لیکن اس میں بھی تو کوئی شک نہیں کہ آپ کی دکان پر سوائے دوستوں کے اور کوئی آتا بھی نہیں۔ پھر یہ راز اب تک سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کی آمدنی کا ذریعہ کیا ہے"۔

ڈاکٹر صاحب نے اسی طرح ہنس کر جواب دیتے "حضور! میں تو دوستوں کا خادم ہوں۔ آپ کی نظرِ عنایت ہی کافی ہے۔ خدا رازق ہے۔ ہر شخص کو روٹی دئیے جاتا ہے"۔

ہاشم اور ڈاکٹر جمالی کے تعلقات بس اسی قدر تھے۔ ہاشم کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ڈاکٹر جمالی کا اصلی وطن کہاں ہے اور لاہور کے کس محلے میں اُس کی رہائش ہے۔ نہ ہی اُس نے یہ جاننے کی کبھی کوشش کی تھی کہ ڈاکٹر جمالی کی خانگی زندگی کیونکر گذر رہی ہے۔ بس ایک رسمی سی ملاقات تھی جو دھیمے دھیمے چلی جا رہی تھی۔ ایک روز ہاشم دفتر سے آیا۔ ابھی چائے پی کر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اُٹھ کر دیکھا تو ڈاکٹر جمالی تھے۔ ڈاکٹر صاحب آج پہلی مرتبہ

ہاشم کے مکان پر آئے تھے۔ ہاشم نے ادب سے انہیں کمرے میں بٹھایا وہ خلافِ معمول نیا سوٹ زیبِ تن کئے ہوئے تھے۔ سر پر ٹوپی بھی نئی تھی۔ یہاں تک کہ نکٹائی اور بوٹ بھی نیا تھا۔ ہاشم نے مسکرا کر کہا "ڈاکٹر صاحب، آج تو آپ دولہا معلوم ہوتے ہیں"۔

ڈاکٹر نے کہا "واقعی آپ درست کہتے ہیں۔ آج شام کو میرا نکاح ہے اور میں آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ مہربانی فرما کر اس تقریب میں شرکت فرمائیے"۔

ہاشم جمالی نے حیرت سے منہ کھول کر کہا "کیا کہا آپ نے؟ آپ کا نکاح ہے؟ واللہ میں تو اب تک یہ سمجھے ہوئے تھا کہ آپ بال بچوں والے ہیں۔ کیا آپ بھی اب تک ہماری طرح ڈانواں ڈول زندگی بسر کر رہے ہیں؟ یہ تو بہت اچنبھے کی بات ہے"۔

ڈاکٹر صاحب نے ذرا متانت اختیار کر کے کہا "اسی طرح بس تم (؟) گذر رہی تھی۔ ہندوستان میں شادیاں بھی تو لاٹری اور جوئے کا ایک کھیل ہیں۔ قسمت اچھی ہوئی تو بیوی بھی اچھی مل گئی ورنہ تمام عمر جوتیوں میں دال بٹتی ہے۔ میں نے تو ارادہ کر رکھا تھا کہ پسند کی بیوی ملے گی تو شادی کروں گا ورنہ یونہی زندگی کاٹ دوں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ قسمت نے یاوری کی اور مجھے حسبِ خاطر بیوی مل گئی ہے"۔

ہاشم نے کہا "واللہ ڈاکٹر صاحب آپ خوش نصیب ہیں۔ ہمارے سر پر بھی ہاتھ رکھئے"۔

ڈاکٹر جمالی نے کہا "بھائی، مذاق کو پھر کسی وقت پر اٹھا رکھئے۔ اب تو آپ تیار ہو جائیے گھنٹے، ڈیڑھ گھنٹے تک میرے ہمراہ چلنا ہوگا نکاح بہت سادگی سے ہوگا۔ آپ کی شرکت میری عزت کا باعث ہے۔ امید ہے میری خاطر یہ تکلیف آپ گوارا فرمالیں گے"۔

ہاشم نے جواب دیا "آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ میں تیار ہوں"۔

ڈاکٹر جمالی نے کہا "آپ کی مہربانی کا بہت بہت شکریہ۔ میں ایک ڈیڑھ ایک گھنٹے تک حاضر ہوں گا"۔

شام کو جب ڈاکٹر جمالی نکاح کے لئے روانہ ہوئے تو ہاشم نے دیکھا کہ صرف دو آدمی ان کے ہمراہ تھے۔ ہاشم نے تعجب کا اظہار کیا۔ کہ اتنی مختصر جماعت کے کیا معنے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر تسلی کر دی کہ فریق ثانی کا منشا ہے کہ نکاح کی رسم بے حد سادگی سے ادا کی جائے۔ ہاشم کو پھر بھی حیرت ہی رہی کہ ڈاکٹر صاحب کے جملہ احباب میں سے جو ہر وقت ان کے دواخانے میں دھما چوکڑی مچائے رکھتے تھے ایک بھی ساتھ نہ تھا۔ پھر اسے خیال گذرا کہ شاید ڈاکٹر جمالی کسی بیوہ سے عقد کر رہے ہیں اور اسی لئے ہر قسم کا تکلف ترک کر دیا گیا ہے۔ چند گلیوں میں گھومتے ہوئے یہ لوگ ایک چھوٹے سے مکان پر پہنچے۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا۔ ہاشم کو پہلی ہی نظر میں صاحبِ خانہ کے متعلق غربت اور افلاس کا احساس ہوا اس دوران میں ڈاکٹر جمالی ہر وقت ہاشم کو اس انداز سے آگے آگے رکھتے تھے۔ گویا وہی اس جماعت کا بڑا رکن ہے خود ہاشم بھی یہ محسوس کر رہا تھا کہ اسے خواہ مخواہ بزرگی کا جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ جب مکان میں داخل ہونے لگے تو بھی ڈاکٹر جمالی نے اس طرح کہ دوسرا شخص یہ خیال کرے کہ یہ سب کچھ اتفاقیہ ہو رہا ہے۔ ہاشم کو آگے کر دیا اور خود اس کے پیچھے پیچھے داخل ہوئے۔ ایک چھوٹا سا صحن تھا جس کے ایک طرف برآمدہ تھا اور دوسری جانب ایک کمرہ تھا۔ کمرے میں روشنی تھی جس کے اندر سے چند آدمیوں کے آہستہ آہستہ بولنے کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں ہاشم صحن میں ٹھٹک گیا۔ اُسے کچھ عجیب، نامعلوم سے تاثرات نے گھیر لیا تھا۔ اس کے دل میں بلا وجہ ایک اندیشہ سا پیدا ہو رہا تھا کہ یہ نکاح ہے یا خفیہ طریق پر کسی جرم کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ وہ خود اپنے خیالات کو ابھی اچھی طرح سمجھ بھی نہ سکا تھا کہ اُس کمرے میں سے ایک شخص باہر نکل آیا اور سب کو اندر لے گیا۔ کمرے میں اُجلی چاندنی بچھی تھی اور دیوار کے ساتھ دو سفید تکئے رکھے تھے۔ ڈاکٹر جمالی اور اس کے ساتھیوں نے باہر جوتے اتار دیئے اور فرش پر جا کر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر جمالی نے ہاشم کے چہرے پر فکر کے آثار دیکھ لئے تھے اس لئے انہوں نے محفل میں زندہ دلی پیدا کرنے کی غرض سے خواہ مخواہ مسکرانا شروع کیا تاکہ باقی لوگ بھی خوش باش نظر آئیں۔ ڈاکٹر جمالی نے چپکے سے ایک شخص کے کان میں کچھ کہا۔ اور وہ اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ ڈاکٹر صاحب بدستور اس کوشش میں مصروف تھے کہ محفل پر خاموشی اور افسردگی طاری نہ ہونے پائے۔ چنانچہ وہ اِدھر اُدھر کے لطیفے اور چٹکلے بیان کر کے بذلہ سنجی میں وقت گذار رہے تھے۔ کبھی ہاشم سے بھی نوک جھونک اور فقرہ بازی ہو جاتی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ شخص جو باہر چلا گیا تھا ملا کو لے کر آگیا۔

چھپا ہوا نکاح نامہ پہلے سے موجود تھا۔ جمالی ایک ضروری بات کرنے کے لئے ہاشم کو باہر صحن میں لے گئے۔ ایک گوشے میں کھڑے ہو کر انہوں نے کہا۔

"میں آپ کا بے حد شکرگذار ہوں کہ آپ نے یہاں تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اب میرے حال پر ایک اور عنایت کیجئے تو عمر بھر آپ کا ممنون رہوں گا۔"

ہاشم نے بے تابی سے جواب دیا "کہئے۔"

جمالی نے کہا "جس لڑکی سے میرا عقد ہونے والا ہے۔ وہ لاوارث ہے۔ از راہِ کرم آپ اس کے ولی بن جائیے تاکہ رسم نکاح مکمل ہو جائے۔"

ہاشم نے پیشانی پر شکن ڈال کر جواب دیا۔ "ڈاکٹر صاحب یہ نہیں ہوسکتا۔ میں نہ لڑکی سے واقف ہوں نہ اُس کے حسب نسب سے آگاہ ہوں میں کیا جانوں کہ وہ کون ہے۔ کس کی بیٹی ہے۔ کہاں کی رہنے والی ہے۔ میں زبردستی اُس کا ولی کیونکر بن جاؤں۔ بہتر ہے کہ اس خدمت کے لئے آپ حاضرین میں سے کسی اور کو منتخب کیجئے۔"

جمالی نے ہاشم کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر بہت لجاجت سے کہا جو کچھ آپ فرماتے ہیں صحیح ہے لیکن آپ مجھ پر اعتبار کیجئے۔ لڑکی یتیم ہے۔ اس کا کوئی والی و وارث نہیں۔ یہ تو غنیمت جانئے کہ میرا اُس کے ساتھ نکاح ہو رہا ہے ورنہ وہ تو عیسائی مشن کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ بڑی جدوجہد کے بعد ہم اس کو وہاں سے نجات دلانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ مسلمان والدین کی بیٹی دوبارہ مسلمانوں میں آگئی ہے۔ ہاشم صاحب! مجھ پر تو آپ کا احسان ہوگا ہی لیکن یقین کیجئے کہ یہ بہت بڑا کارِ ثواب بھی ہے مجھے پختہ امید ہے کہ آپ میری نیازمندانہ گذارش کو قبول فرمانے سے گریز نہیں کریں گے۔"

ہاشم حیران و ششدر کھڑا سوچ رہا تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا فیصلہ کرے۔ وہ دل ہی دل میں افسوس کر رہا تھا کہ کیوں یہاں چلا آیا۔ پھر اُس نے ارادہ کیا کہ جمالی کا ہاتھ جھٹک کر بھاگ جائے لیکن ڈاکٹر جمالی کی عاجزی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی اور وہ برابر منت سماجت کئے جاتے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"دیکھئے نا ہاشم صاحب۔ آپ معزز آدمی ہیں۔ صاحب حیثیت ہیں۔ اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ ولی آپ بنیں۔ خدانخواستہ اور تو کوئی بات نہیں۔"

خدا جانے ہاشم کے جی میں کیا آئی۔ ڈاکٹر جمالی کے عجز سے اس کا دل پسیج گیا یا کوئی اور وجہ ہوئی کہ اُس نے یکایک کہہ دیا۔ "بہت اچھا ڈاکٹر صاحب۔ میں تیار ہوں۔ آئیے شروع کیجئے۔"

ڈاکٹر جمالی خوش خوش اندر گئے۔ نکاح پڑھا گیا۔ دو شخص گواہ بنے۔ نکاح نامہ کی خانہ پری ہوئی۔ ہاشم نے دلہن کے ولی کی حیثیت سے دستخط کئے اور ڈاکٹر جمالی کو مبارک مبارک ہونے لگی۔ اس تقریب سے فارغ ہو کر وہیں کھانا کھایا گیا۔ اور چند آدمی جو ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ گئے تھے۔ اپنے اپنے گھر لوٹ آئے۔ ہاشم اُس رات بستر پر لیٹے ہوئے اس واقعہ کے متعلق سوچتا رہا۔ ڈاکٹر جمالی کے ساتھ اُس کے مراسم بہت معمولی تھے۔ وہ فرصت کے وقت محلے کے اور آدمیوں کی طرح اُس کی ڈسپنسری میں جا کر گپ شپ لڑانے کا عادی بھی نہیں تھا۔ پھر ڈاکٹر نے نکاح ایسے اہم معاملہ میں کیوں اُسی پر اعتماد کیا اور خود اُس نے کس مصلحت اور جذبے کے ماتحت ایک نامعلوم لڑکی کا ولی بننا منظور کر لیا۔ ہاشم کو بات کریدنے کی عادت تو نہ تھی لیکن یہ واقعہ بجائے خود اتنا عجیب تھا کہ اُس کی توجہ خواہ مخواہ اس طرف منتقل ہو ہو جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ ہاشم کی فطری ظرافت اور بے پروائی غالب آگئی اور اُس نے اس واقعہ کو بھی ایک دلچسپ تجربہ سمجھ کر قبول کر لیا اور بات آئی گئی ہوئی۔

ہاشم بدستور دفتر جاتے اور وہاں سے لوٹتے وقت ڈاکٹر جمالی کی دکان کے سامنے سے گذرتا تھا۔ اور دونوں میں بڑی سرگرمی سے علیک سلیک ہوتی تھی۔ دو ایک دفعہ وہ تھوڑی دیر کے لئے دواخانے میں جا کر بیٹھا بھی تھا۔ ڈاکٹر جمالی سے بے تکلفی بڑھ گئی تھی۔ اور آپس میں اچھا خاصا مذاق شروع ہو گیا تھا۔ ہاشم ہر روز ڈاکٹر جمالی سے دعوت کا تقاضا کرتا تھا اور ڈاکٹر صاحب

بھی ہر روز دعوت کا وعدہ کر لیتے۔

ایک دن یکایک فلیمنگ روڈ پر بجلی کی طرح یہ خبر پھیل گئی کہ ڈاکٹر جمالی کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے ہیں اور پولیس ڈاکٹر صاحب کی دکان پر گرفتاری کے لئے موجود ہے۔ ہاشم نے یہ خبر اپنے مکان میں سنی۔ اُسے شروع میں یقین نہیں آتا تھا لیکن جب وہ حقیقت معلوم کرنے کے لئے خود ڈاکٹر صاحب کے دواخانے میں گیا تو دیکھا کہ پولیس واقعی موجود ہے اور وارنٹ بھی ساتھ ہیں ڈاکٹر جمالی کوشش کر رہے تھے کہ ضمانت دے کر گرفتاری کی ذلت سے بچ جائیں لیکن دوڑ دھوپ کے باوجود کوئی معقول ضامن نہیں ملتا تھا۔ ہاشم کو دیکھ کر انہیں قدرے حوصلہ ہوا۔ لیکن ہاشم نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔ وہ کسی صورت میں بھی ضمانت دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ ہاشم نے دریافت کیا کہ جمالی کی گرفتاری کس جرم میں ہو رہی ہے تو اُسے بتایا گیا کہ عدالت نے زیر دفعہ ۳۶۶ تعزیرات ہند وارنٹ جاری کئے ہیں۔ اُسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ دفعہ ۳۶۶ کیا بلا ہے۔ اُس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا کہ دفعہ ۳۶۶ کیا جرم ہے تو پولیس افسر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ "یہ دفعہ کسی نابالغ لڑکی کو اُس کے جائز ولی کے گھر سے اغوا کر لینے پر استعمال کی جاتی ہے"

ہاشم نے گھبرا کر پوچھا "تو کیا ڈاکٹر جمالی نے کسی نابالغ لڑکی کا اغوا کیا ہے؟"

پولیس افسر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "جی ہاں۔ عدالت تو یہی کہتی ہے۔"

ہاشم کا رنگ ایک لمحہ میں پھیکا پڑ گیا۔ ڈاکٹر جمالی کے نکاح کا سارا واقعہ بجلی کی تیزی کے ساتھ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اس رات کی تمام باتیں ایک ایک کر کے اُس کے دماغ میں چکر لگانے لگیں۔ وہ خود اُس نامعلوم لڑکی کا ولی بنا تھا۔ یہ خیال آتے ہی ہاشم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ اندر ہی اندر خوف سے کانپنے لگا۔ کیا وہ بھی گرفتار کر لیا جائے گا۔ کیا اُس کی عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔ یا اللہ اب کیا بنے گا۔ ہاشم قانون کے گورکھ دھندے سے واقف نہیں تھا۔ اس لئے وہ اپنے متعلق کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔

ڈاکٹر جمالی کے دواخانے سے اُٹھ کر وہ سیدھا اپنے ایک وکیل دوست کے ہاں گیا اور اُس کو سارا قصہ سنایا۔ اُس کے قانون دان دوست نے اُس کی گھبراہٹ دیکھ کر اس کے ساتھ تسلی آمیز گفتگو کی اور اُسے اطمینان دلایا کہ اُس کے خلاف کسی قسم کی قانونی چارہ جوئی نہیں ہو سکتی۔ اس کے باوجود ہاشم کو اطمینان نہ ہوتا تھا اور وہ دل ہی دل میں پریشان ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر جمالی نے ضمانت کا انتظام کر کے پولیس سے رہائی پا لی تھی۔ اور مقدمہ باقاعدہ عدالت کے سپرد ہو چکا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ جمالی نے جس لڑکی سے نکاح کیا تھا اُس کا باپ مر چکا تھا اور وہ اپنی بیوہ ماں کے پاس رہتی تھی۔ علاج معالجے کے سلسلہ میں جمالی کی اُس گھرانے میں آمد و رفت ہو گئی تھی۔ جمالی نے شروع شروع میں اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی باقاعدہ تحریک کی لیکن لڑکی کی ماں رضامند نہ ہوتی تھی۔ جب جمالی نے دیکھا کہ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلتا تو انہوں نے لڑکی پر ڈورے ڈالنے شروع کئے اور آخر کار اُس کو لے بھاگے۔ عدالت میں بیان شروع ہوئے تو جمالی نے نکاح نامہ پیش کر دیا جس پر ہاشم نے لڑکی کے ولی کی حیثیت سے دستخط کئے تھے۔ ہاشم کو بھی عدالت میں طلب کیا گیا۔ جب یہ مرحلہ پیش آیا تو ہاشم کے ہاتھ سے صبر و ضبط کا دامن بالکل چھوٹ گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ پریشانی سے دیوانہ ہو جائے گا۔

اُس کا وکیل دوست اُسے بار بار یقین دلاتا تھا کہ لڑکی بالغ ہے۔ اس لئے ہاشم کا ولی بننا یا نہ بننا قانون کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اُسے محض رسمی شہادت کے لئے عدالت نے بلایا ہے لیکن ہاشم کی گھبراہٹ تھی کہ کسی صورت کم ہونے میں نہ آتی تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ اعلیٰ تعلیم پا کر بھی وہ دنیا کے ہتھکنڈوں سے غافل ہی رہا۔ یہ جہالت کس قدر تکلیف دہ ہے۔ لوگوں کی زبان پر اعتبار کر لینا کتنی بڑی حماقت ہے۔ اُس نے ساری عمر کبھی کچہری کا منہ نہ دیکھا تھا۔ وہ دل ہی دل میں توبہ کر رہا تھا کہ خدا اُسے اس جھگڑے سے نجات دلا دے تو شادی بیاہ تو الگ رہا وہ کسی کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہو گا۔

عاشق حسین بٹالوی

جب اور اب

(۱)

۱
نالوں میں گذرتی تھی، آہوں میں گذرتی تھی   جب عہدِ جوانی تھا چاہوں میں گذرتی تھی
گھر گھاٹ سے تھی چھٹی یہ شان تھی وحشت کی   کلیوں میں بسیرا تھا راہوں میں گذرتی تھی

۲
کھانا نہ قرینے سے، کچھ ہوش نہ پینے کا   یہ رنگ تھا رہنے کا یہ ڈھنگ تھا جینے کا
تھا ذکر حسینوں کا "مہتاب جبینوں" کا   تھے چاک بہت لیکن کب ہوش تھا سینے کا

۳
تاروں بھری راتیں تھیں اور پیار کی باتیں تھیں   کچھ عشق کی چالیں تھیں کچھ حسن کی گھاتیں تھیں
طوفان سا طوفاں تھا ہیجان طبیعت کا   لیکن وہی دن دن تھے راتیں وہی راتیں تھیں

۴
وہ عہدِ جوانی کا آشفتہ بیانی کا   سودا ہمہ بینی کا غوغا ہمہ دانی کا
تصویر تھی اک گویا اُمڈے ہوئے دریا کی   ریلا سا وہ ریلا تھا برسات کے پانی کا

(۲)

کیفیتِ ہیجانی ندی کی وہ طغیانی   ہنگامۂ آنی تھا برسات کا وہ پانی
ہے شوقِ جنوں پرور اب ذوقِ سکوں پرور   یعنی دلِ مضطر ہے اب خوگرِ حیرانی

۲
جب نار کا جویا تھا اب نور ہے پہلو میں   جب برق تھی رگ رگ میں اب طُور ہے پہلو میں
میں قیسِ زمانہ تھا وہ نجد کی وادی تھی   اب شورِ انا الحق ہے منصُور ہے پہلو میں

۳
وہ خواب کی دنیا تھی یہ عالمِ بیداری   مستی کے وہ لمحے تھے یہ ساعتِ ہشیاری
آغازِ بہاراں وہ یہ وقتِ برومندی   یعنی ہے شجر میں اب "خود دار نگونساری"

۴
اب دیدۂ بینا کو جلووں کا تقاضا ہے   پنہاں تھا ابھی اب تک جو راز وہ پیدا ہے
بے باک نہیں آنکھیں، ناپاک نہیں نظریں   اب بھانپ چکا ہوں میں قدرت کا جو منشا ہے

امین حزیں سیالکوٹی

گرمی کی چھٹیاں

میں خالصہ کالج امرتسر میں ملازم ہوں اور ہر سال گرمی کی چھٹیاں گذارنے کے لئے راولپنڈی چلا جاتا ہوں، وہیں میرا آبائی گھر ہے۔ پہلے سال جب میں پنڈی گیا تو ہمارے پڑوس میں ایک لڑکی کی شادی تھی۔ اس لڑکی کا نام تھا راجاں اور وہ اپنی لاابالی طبیعت کی وجہ سے مجھے بے حد پسند تھی۔ سولہ سترہ برس کی ہونے کے باوجود وہ ایک آٹھ نو سال کی چھوکری کی طرح میرے ساتھ ہنس کھیل لیتی تھی مجھے یقین تھا کہ بیاہ تو ایک طرف، بال بچے ہو جانے پر بھی راجاں اسی طرح معصوم الھڑ اور بے جھجک رہے گی۔

سفر کے کپڑے تبدیل کر کے، نہانے دھونے کے بعد شام کے قریب میں راجاں سے ملنے گیا۔ اس کے ہاں باہر آنگن میں چولھوں پر دیگیں چڑھی ہوئی تھیں اور آگ کے باؤلے شعلے، دوزخ کے فرشتوں کی طرح دیگوں کو گلے تک چاٹ رہے تھے۔ ہر عمر کی لڑکیاں ٹولیوں میں بیٹھی تھیں —— کچھ میدے کے پیڑے بنا رہی تھیں، کچھ ان پیڑوں کو بیل رہی تھیں اور کچھ پھلیوں میں سے مٹر نکالتی ہوئی جی ہی جی میں خوش ہو رہی تھیں۔ ان کے چہروں سے مسرت اور آنکھوں سے انبساط کے سوتے پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہے تھے۔ کیا شادی شدہ اور کیا کنواری چھوکریاں سبھی خوش تھیں —— بیاہی ہوئی لڑکیاں اس دن کی یاد میں اور کنواری اسی کی آس میں۔ راجاں کی ماں ایک سرخ دوپٹہ اوڑھے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اندر باہر گھوم رہی تھی۔ دیگوں میں سے اٹھنے والی خوشبو سے سارا گھر مہک رہا تھا۔

میں اس صحن کی مختصر لیکن گنجان دنیا میں سے گذرتا ہوا اندر چلا گیا۔ سامنے راجاں اپنی سہیلیوں میں زینت محل بنی بیٹھی تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے جسم پر اتنے قیمتی کپڑے دیکھے تھے شاید انہی کپڑوں کی وجہ سے مجھے راجاں پہلی کی بہ نسبت کچھ بدلی ہوئی دکھائی دی۔ اُن کے ہاں کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد میں گھر لوٹ آیا۔

رات، راجاں کے شوہر کو کھانا کھلاتے ہوئے میں نے اس پر کچھ فقرے چست کئے۔ راجاں کا شوہر ایک گورا چٹا، خوش مزاج نوجوان تھا۔ اگلے دن شام کے قریب دلہن اُس کے ساتھ رخصت کر دی گئی۔

(۲)

دوسرے سال جب میں گرمی کی چھٹیوں میں گھر گیا تو راجاں ہمارے ہاں صحن میں بیٹھی تھی۔ اس کے کپڑے غلیظ تھے اور چہرہ مرجھایا ہوا۔ اُس کے پاس میری بہن اور گلی کی تین چار اور لڑکیاں بھی بیٹھی تھیں۔ اُن کے چہروں کے رنگ بھی اڑے ہوئے تھے۔ سارے آنگن میں گھومتی ہوئی میری نظر یکایک راجاں پر جا رکی۔ اُس کی کالی پلکیں اُس کے پیلے گالوں پر گویا سو رہی تھیں اور اُس کا جسم پتھر کی طرح ساکت تھا۔ البتہ بالوں کی ایک لٹ تین چار حصوں میں بٹ کر اُس کے ماتھے پر آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔

بہن کے سر پر ہاتھ پھیر کر میں راجاں کے قریب بیٹھ گیا لیکن وہ اُسی طرح مبہوت بیٹھی رہی۔ میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ راجاں اور خاموشی! —— اسی حیرانی کے عالم میں میں نے خشک گلے میں سے آواز نکالتے ہوئے کہا —— "راجاں!"

راجاں نے اپنی نگاہیں مجھ پر جما دیں۔ اس کی آنکھیں اُن بادلوں کی طرح تھیں جن میں سے تمام پانی برس چکا ہو۔ پھر ان چھوٹے چھوٹے سے آسمانوں میں شفق کی سی سرخی دوڑ گئی

اور پھر جلد ہی سینکڑوں دھندلے دھندلے تارے گلابی پردوں کے نیچے سے اپنی چمک دکھانے لگے۔ میرا ہاتھ راجاں کے سر پر چلا گیا اور اس کے تاروں بھرے دو آسمان میرے گھٹنوں کے ساتھ لگ گئے۔ قریب سے کسی لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ "بھیّا! آپ کا دوست چل بسا!"

(۳)

تیسرے سال گرمی کی چھٹیاں گذارنے کے بعد میں امرت سر واپس جانے کے لئے گھر سے نکلا۔ بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس تھامے اور دایاں ہاتھ اپنے ایک دوست کے کندھے پر رکھے۔ میں سڑک کی طرف ہو لیا۔ دھوپ تیز ہونے کی وجہ سے گلی میں آمد و رفت بہت کم تھی۔

ابھی میں سڑک سے پچاس قدم کے قریب ورے ہی تھا کہ کسی نے پیچھے سے آ کر میرے کندھوں کو زور سے ہلایا۔ جب میں نے مڑ کر دیکھا تو راجاں آنکھوں میں ایک تبسمِ رقصاں لئے کہہ رہی تھی ——"آپ تو چوروں کی طرح دبے پاؤں نکل گئے تھے بھیّا! پر میں نے بھی پکڑ ہی لیا نا —— بھلا اسی میں ہے کہ الٹے پاؤں لوٹ چلو گھر کو ...... میں نہیں جانے دوں گی ابھی"۔

یہ کہہ کر وہ ایک شیرنی کی طرح لپکی اور میرے ہاتھ سے اٹیچی کیس چھینتے ہوئے بولی۔ "بھلا میں بھی دیکھوں کس طرح جاتے ہیں آپ امرت سر۔ ضدی سے اچھا ہے کیا!"

میں راجاں کی طرف دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ اس کا جسم سوکھ کر سرکنڈے کی طرح ہو گیا تھا۔ اس کے بال بہت روکھے اور کپڑے بے حد کثیف تھے۔ لیکن زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ اس کے چہرے پر اتنی بھی اداسی نہ تھی جتنی ماش کی دال پر سپیدی ہوتی ہے جیسے اسے اپنے شوہر کی موت کا بالکل کوئی خیال ہی نہ ہو۔ پچھلے سال وہ جیسی اداس، جتنی خاموش اور غمگین نظر آتی تھی۔ اس سال اتنی ہی خوش، باتونی اور بے قابو ہو رہی تھی۔

"مجھے افسوس ہے راجاں میں تم سے ملے بغیر امرت سر چل دیا" میں نے اپنے آپ کو حیرانی کی ایک لطیف سی الجھن میں مبتلا پاتے ہوئے کہا اور اپنا ہاتھ اٹیچی کیس حاصل کرنے کے لئے بڑھایا لیکن وہ اٹیچی کیس کو کبھی بائیں ہاتھ کبھی دائیں ہاتھ میں کبھی آگے اور کبھی پیچھے ہلاتے ہوئے مجھے چڑاتی رہی۔ کیا کیا جائے، یہ میرا دوست بھی کچھ دور حیرانی کے عالم میں جامد و ساکت کھڑا تھا۔ آخر خدا جانے راجاں کے جی میں کیا آئی۔ اس کی آنکھیں پپوٹوں میں بڑی تیزی سے حرکت کرنے لگیں۔ اس کے لب پھڑکنے لگے۔ اس نے اٹیچی کیس میرے قدموں میں پھینک دیا اور گھر کی طرف مڑتے ہوئی بولی "لیجئے، یہ لیجئے اپنا اٹیچی کیس۔ مجھے کوئی اس کا اچار تھوڑے ہی ڈالنا ہے"۔

ابھی ہم مشکل سے پندرہ بیس قدم ہی بڑھے ہوں گے کہ راجاں نے پیچھے سے آ کر پھر میرا شانہ ہلایا۔ اس کی خفگی بالکل دور ہو چکی تھی اور وہ پہلے کی طرح ایک اندرونی مسرت کے احساس سے کہہ رہی تھی۔ "اچھا بھیّا! اگر آپ کو آج ضرور ہی جانا ہے تو اگلے سال امرت سر سے میرے لئے ایک چیز تو لیتے آئیں"۔

"کیا چیز؟" میں نے اظہارِ تشکر کے ساتھ کہا کیونکہ راجاں کو خفگی کی حالت میں چھوڑ کر چلے جانے کا مجھے بہت قلق تھا۔

"بھیّا میرے لئے تین ازاربند لیتے آنا —— ریشمی —— کہتے ہیں امرت سر میں بہت اچھے بنتے ہیں۔

میرے پاس تین شلواریں ہیں۔ ایک اودی شاہی کی، اس کے لئے اودے رنگ کا، ایک خونی مخمل کی، اس کے لئے سرخ ایک سفید بوسکی کی اس کے لئے سفید" —— یہ کہہ کر اس نے میرا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ پھر میری انگلیوں کو باری باری دبا کر بولی "ایک اودا، ایک سرخ اور ایک سفید"۔ اس کے بعد میرا ہاتھ چھوڑ کر وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہوئی بولی۔ "اگر نہ لائے تو گھر میں قدم نہ رکھنے دوں گی"۔

"کیوں نہیں لاؤں گا، راجاں" میں نے کچھ حیران اور کچھ بے چین سا ہو کر کہا کیونکہ راجاں اس دن مجھ سے کچھ ضرورت سے زیادہ کھل رہی تھی۔

"اتنے اتنے چوڑے ہوں، اتنے اتنے" راجاں نے اپنی انگلیوں کو کھولتے ہوئے اشارہ کیا۔ "کہیں سادہ ہی نہ لے آنا"

یہ کہہ کر وہ پیچھے مڑی اور ہم بھی سڑک کی طرف ہو لئے لیکن ابھی بمشکل مڑے ہی تھے کہ کسی کی انگلیاں میری پگڑی کے ساتھ

چھوتی ہوئی اور مجھے اپنا شملہ سرکتا ہوا محسوس ہوا پگڑی کو سنبھالتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا اور قدرے تلخ ہو کر بولا "پاگل تو نہیں ہو گئی راجاں، چھوڑو شملہ، چھوڑا بھی دو۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے کہا جو ہے لے آؤں گا ازاربند، ایسے ہی پیسے تم نے تباہ کئے ہیں"

میں نے سوچا کہ پگڑی میں گرہ لگا دوں تاکہ آپ کو یاد رہے ...... راجاں بولی۔ اُس کی پتلی بے خون انگلیاں سرعت سے اپنا کام کر رہی تھیں۔ ایک دو گانٹھیں دے چکنے کے بعد اُس نے اپنے ہی ہاتھ سے شملہ درست کر دیا۔ اور پھر "ضرور لانا، ضرور لانا" کی رٹ لگاتی ہوئی وہ لوٹی اور ہمارے دیکھتے دیکھتے گلی کا موڑ مڑ گئی۔ میں اور میرا دوست راجاں کی حرکتوں پر حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے، اپنے خیالات میں غرق اسٹیشن کی طرف چل دئیے۔

(۴)

چوتھے سال چھٹیاں ہوتے ہی میں راولپنڈی جانے والی رات کی گاڑی سے سوار ہو گیا۔ شام کے قریب کچھ پانی برس جانے کی وجہ سے ہوا قدرے سرد ہو گئی تھی۔

ہمارا ڈبہ بالکل چھوٹا سا تھا۔ میاں بیوی اور دو بچوں کے ایک مختصر سے کنبے کے سوا اور وہاں کوئی نہ تھا اور نہ کسی اور کے لئے جگہ تھی۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی بچوں کی متجسس نگاہوں نے بھانپ لیا کہ میں ان کی دوستی کے قابل ہوں۔ یہ بھانپ کر وہ دزدیدہ نگاہوں سے مسکرائے۔ یہ اُن کی طرف سے پہلی بات تھی۔ میں نے بھی مسکرا کر انہیں جواب دیا اور پھر پل بھر میں ہم یوں گھل مل گئے جیسے برسوں کے ساتھی ہوں۔ بہت دیر تک وہ مجھے چڑیا اور کوے، ماتو اور سدھورانی کی کہانیاں سناتے رہے۔ گوجرانوالہ کے قریب پہنچ کر وہ سو گئے اور میری بھی آنکھ لگ گئی۔

سوتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ہماری گلی کے لڑکے اور لڑکیاں آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ میں اور راجاں اپنے گھر کے پیچھے اُگی ہوئی گندم میں چھپے بیٹھے ہیں اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ چاند کی شفاف کرنیں گندم کی بالوں پر ناچ رہی ہیں۔ باتیں کرتے ہوئے راجاں ہنس پڑتی ہے میں بہت روکتا ہوں۔ راجاں بھی منہ میں دوپٹہ ٹھونستی ہے لیکن بچپن کی بے اختیار ہنسی روکے نہیں رکتی۔ آخر راجاں کا غنچۂ دہن کھل جاتا ہے اور اس کے چٹخنے کی آواز سن کر داؤ والا لڑکا راجاں کو چھو لیتا ہے

کچھ دیر کے بعد میں دیکھتا ہوں کہ چار آدمی ایک ڈولی کو اٹھائے لئے جا رہے ہیں۔ اور دلہن اپنی حنائی انگلیوں سے مجھے اشارہ کرتی جا رہی ہے۔ میں ڈولی کا تعاقب کرتا ہوں لیکن ڈولی لحظہ بلحظہ آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ آخر میں مایوس ہو کر ڈولی کا پیچھا چھوڑ دیتا ہوں۔

اس کے بعد ایک دبلی اور مریل سی عورت آتی ہے۔ کپڑے تار تار، بال منتشر، منہ ہلدی کی طرح زرد ہونٹوں پہ پیڑیاں رخساروں کی ہڈیاں، پتلیاں بے نور۔ اور ڈراؤنی۔ میں گھبرا کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن میرے پاؤں من من بھر کے ہو جاتے ہیں جیسے ان کے ساتھ لوہا باندھ دیا گیا ہو۔ میری گھبراہٹ دیکھ کر وہ ایک قہقہہ لگاتی ہے۔ اور زیادہ قریب ہو کر اونچی آواز سے کہتی ہے "میں یوں بھاگنے دیتی ہوں۔ میں پہلے ہی جانتی تھی تم بھی ایسا ہی کرو گے۔ سب مرد اسی طرح کرتے ہیں۔ تین ازاربند بھی بھلا کوئی چیز تھی۔ غضب خدا کا! کہنے لگے راجاں، جیسے کہوگی ویسے ہی لاؤں گا۔ پھولوں والے لاؤں گا۔ اچھے لائے ہو ازاربند میرے لئے —— حیف ہے مردو، افسوس ہے بھائیو، تف ہے بیٹو، شوہرو باپو تم پر۔ تم سراسر دھوکا ہو۔ بالکل چھل اور فریب —— خدا بچائے تم سے، تمہارے فریبوں سے...."

اس کے منہ سے جھاگ چھٹنے لگتی ہے اور انگلیاں سلاخوں کی طرح تن جاتی ہے۔ پھر وہ ازاربند ہاتھوں میں اچھال کر کہتی ہے "یہ دیکھو، میں آپ ہی لے آئی ہوں۔ امرتسر کوئی دور ہے۔ لیکن میں نے شلواروں میں ڈالنے کے لئے نہیں خریدے، تمہیں باندھنے کے لئے خریدے ہیں، تمہارے گلے میں پھندا ڈالنے کے لئے....." یہ کہہ کر وہ آگے بڑھتی ہے اور نیلے ازاربند کے ساتھ میری ٹانگوں کو جکڑ دیتی ہے۔ میں بھاگ جانے کے لئے جدوجہد کرتا ہوں لیکن اعصاب حرکت سے جواب دے

دیتے ہیں۔ اس کے بعد زرد ازاربند سے وہ میرے بازو باندھ دیتی دیتی ہے۔ اور میری چھاتی پر گھٹنا رکھ کر سرخ سا ازاربند میرے گلے گلے میں ڈال، میرا گلا گھونٹتی ہے۔

میں گھبرا کر جاگ پڑا اور میں نے دیکھا کہ ان دونوں بچوں نے میری ہی پگڑی سے میرے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے ہیں۔ اور اب پگڑی کو میرے گلے میں لپیٹنے کا جتن کر رہے ہیں۔ میں نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اُن بچوں کی ماں کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولی، "ہم کیا کریں بھائی، خود ہی تو تم نے انہیں رات منہ لگایا"——

ان کی ماں کو کوئی جواب نہ دینا مناسب سمجھ کر میں نے گھور کر بچوں کی طرف دیکھا۔ بڑا چھوکرا تو ڈر کر ماں کی گود میں جا گھسا لیکن چھوٹا ڈپٹ کر بولا "نہیں جانتے تم، ہم چور چور کھیل رہے ہیں۔ میں اور سونی سپاہی ہیں اور میری ماں تھانیدار ہے"۔

میں نے ہنستے ہوئے بچے کو کلیجے سے لگا لیا اور پھر ٹانگوں میں سے پگڑی کو کھول کر سر پر باندھنے لگا کیونکہ پنڈی کا سٹیشن قریب آ چکا تھا۔ بچے میری ٹانگوں سے چمٹ چمٹ کر کھیل رہے تھے اور میں بھی ہنس ہنس کر اُن سے باتیں کر رہا تھا لیکن میری ہنسی سطحی تھی کیونکہ رات کے بھیانک خواب نے میرے اندر ایک ہیجان سا برپا کر دیا تھا۔ میں اپنے آپ سے بھی کچھ خفا ہو رہا تھا اور راجاں سے اپنی وعدہ خلافی پر پشیمان۔

اسٹیشن سے میں تانگے کو سیدھا بازار کی طرف لے گیا اور راجاں کے لئے تین خوبصورت ریشمی ازاربند خرید کر گھر کی جانب مڑا۔ اب میری طبیعت کچھ پُرسکون ہو گئی تھی۔ اگرچہ میں ازاربند امرت سر سے نہیں لایا تھا۔ لیکن اس بات کا راجاں کو کیا پتہ چل سکتا تھا۔

جب میں گھر کے دروازے پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ گلی میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے اور بہت سی عورتیں بیٹھی راجاں کو رو رہی ہیں۔ مجھے بھی وہاں بیٹھنا پڑا۔ میرے آنسو ایک سیلِ رواں کی طرح بہہ رہے تھے۔ جب سب لوگ رو رُلا کر فارغ ہوئے تو راجاں کے کب اور کیسے مرنے کا تذکرہ چھڑا اور اس کی نیک خصلت اور دُکھ سُکھ کے قصے دہرائے گئے۔ میں نے بھی بتایا کہ راجاں نے کیسے پچھلے سال مجھے امرت سر سے کچھ ازاربند لانے کے لئے تاکید کی تھی اور میں کیسے اس کی دیوانہ حرکتوں سے متعجب ہوا تھا۔ یہ سن کر میری تائی اماں جو کہ قریب ہی بیٹھی تھیں بولیں۔ "بیٹا! وہ تو اُس وقت سچ مچ ہی پاگل تھی اور وہ دیوانوں کی طرح باتیں کرتی تو کیا کرتی تم تو ابھی اپنے ہی تھے وہ تو بیگانوں کو بھی یہاں سے گذرتے گذرتے پکڑ لیتی تھی۔ اسی طرح ایک دن اس نے ایک مرد کو پکڑ لیا اور کہنے لگی "ے چل مجھے اپنے ساتھ! تیری شکل میرے شوہر سے ملتی جلتی ہے"۔ وہ بیچارا حیران و بے بس کھڑا رہ گیا۔ بےچاری کرتی بھی کیا؟ اس میں اس کا کوئی بھی قصور نہیں تھا بیٹا!—— یہ رنڈاپا بُرا، بہت بُرا...... خدا کسی کو رنڈاپا نہ ڈالے......" اور میری تائی کا گلا رُندھ گیا۔ اور اُس کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو چھم چھم بہنے لگے کیونکہ وہ خود بھی سولہ سترہ برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی اور آج راجاں کی باتوں نے اُس کے مندمل زخم پھر سے ہرے کر دئے تھے۔

موہن سنگھ ایم اے

رُباعی

اٹھے وہ فضا میں ہلکے ہلکے بادل
رقصاں تہِ افلاک سے پیہم ڈھلکے بادل
مخمور جہاں ہوا ہے دو چھینٹوں سے
ساغر کوئی چھلکا ہے کہ چھلکے بادل

جگن ناتھ آزاد

آدرش

مکان اور مکیں سے دور ایک ایسا باغ ہے۔
ہر اک روش سجی ہوئی دُلھن بنی یہ سوچتی ہے راہرو اب آئے گا
اب آئے گا، اب آئے گا، وہ آگیا، نہیں — یہ اک خیال — ایک خواب تھا دبا ہوا۔
شگاف کوہ میں جو چشمہ سو رہا تھا۔ آنکھ کھُل گئی — اُبل پڑا۔
مگر چمن تو پُرسکوں فضا کو گود میں لئے یہ کہہ رہا ہے دل کی دھڑکنیں شمار کیجئے۔
کوئی کلی کھلی ہوئی، کوئی سمٹ کے پتیوں کی گود میں چھپی ہوئی۔
کہیں روش کا خم اچانک ایک ایسے منظر نہاں کو گدگداتا ہے
جو اک تڑپ کے ساتھ کھلکھلا کے یوں نگاہوں کو لبھاتا ہے۔
کہ اس کو دیکھتے ہی ایک رات کا فسانہ یاد آتا ہے،
لو دیکھنا! وہ بیتی رات اب تو کنج باغ سے نکل کے سامنے ہی آگئی
یہ اک ہجوم نرم بازوؤں کا، گرم گیسوؤں کے سائے لے کے آیا ہے
صدائے ساز کوئی بھی نہیں مگر یہ ناچ ایسے ہے کہ جیسے کنج باغ جھوم اُٹھے یک بیک
کبھی کسی نے دیکھا ہے کہ برشگال میں
ہر ایک قطرہ ابر سے ٹپکتا ہے
ردائے آب اس کو اپنے سینے میں سموتی ہے
مگر یہ کوئی سوچتا نہیں کہ لوگ جلترنگ کس طرح بجاتے ہیں۔
ہر ایک اپنے اپنے دل میں یہ سمجھتا ہے کہ ساز ہے۔ ہمارا ساز اور ساز کوئی بھی نہیں۔
مگر جب ایک پل میں نرم بازوؤں سے گرم گیسوؤں کے سائے ڈھل کے مٹتے ہیں۔
تو آنکھ دیکھتی ہے اور دل میں دھیان آتا ہے
یہ کنج باغ غنیہ گر ہے آرزوئے خواب کا،

اور اس کے آگے ایک جھیل، سوئی سوئی مست جھیل کے کنارے پر کھڑا ہے ایک پیڑ جس کی ایک ایک شاخ
سوچتی ہے ناؤ لوٹ آئے گی

مگر وہ ناؤ لوٹتی نہیں، دوسرے کنارے پر وہ دُور سے دکھائی دیتی جاتی ہے۔
بطلیں یہاں تو تیرتی ہیں، اُن کے پر چمکتے ہیں
برس کے بوند بوند ان پروں پہ گرتی ہے، جھیل کے ساتھ کے کنول پہ جاتی ہے
اور اک صدا تڑپ کے ایک تیر کی طرح نکل کے آتی ہے
اور اس کی گونج پے بہ پے سنائی دیتی جاتی ہے۔
کہاں چلی گئی، یہی صدا۔ کہاں چلی گئی؟
مکان مٹ گیا، مَیں بھی رفتہ رفتہ گھُلتے گھُلتے ایک روز مٹ کے کھو ہی جائے گا۔
دُلھن سجی بنی چھپی رہے کوئی بھی راہرو نہ آئے گا
بس اب تو ایک اجنبی ہجوم سامنے ہے، اور میں ہوں، اور کوئی بھی نہیں،
وہ باغ اک خرابہ ہے کہ جس میں جھیل کے جزیرے پر محل دکھائی دیتا تھا
محل کہاں، بس اب تو چوکھٹیں، شکستہ فرش کہہ رہا ہے — ہم بھی تھے،
ہر ایک شے کو شب کی تیرگی نے اپنی گود میں چھپا لیا ہے
اندھیری رات گھات میں لگی ہے۔ اب وہ چاہتی ہے مجھ کو مجھ سے چھین لے
میں دیکھتا ہوں تیرگی کی لہر لہر رینگتی سمٹ سمٹ کے پھیلتی ہوئی، مری ہی سمت آتی ہے۔
سیاہی اپنے دل میں ایک بھید کو چھپاتی ہے۔
ہر ایک لہر رفتہ رفتہ گھُلتے گھُلتے ایک دھندلی شکل بنتی جاتی ہے۔
اور ایک پل میں دائیں بھوت، بائیں بھوت، سامنے چڑیل ناچتی دکھائی دیتی ہے۔
چڑیل کب ہے، اک صدا ہے تلخ، سرد، بے رخی کے بوجھ سے دبی ہوئی، گھُٹی ہوئی، کسی کراہتے ہوئے مریض کی صدا
یہی صدا اور اس کی گونج پے بہ پے سنائی دیتی جاتی ہے۔
کہاں چلی گئی، وہ اب کہاں چلی گئی، یہی صدا، — کہاں چلی گئی؟

میراجی

کتابوں میں مصنّف کا پرتو

ایک مشہور مصنّف کا قول ہے کہ کوئی لکھنے والا بھی اپنے صحیح خیالات کا چربہ دیانتداری سے کاغذ پہ نہیں اُتار سکتا۔ بادی النظر میں یہ بات ان معنوں کی حامل معلوم ہوتی ہے کہ خیالات اور احساسات کی ترجمانی ایک بہت ہی کٹھن کام ہے نفیس سے نفیس اسلوب بیان اور اعلیٰ سے اعلیٰ عکاسی بھی کسی خیال یا احساس کی اس حدتک مظہر نہیں ہوسکتی جس حدتک اس کے روپ کی لیلا نے مصنف کے دل و دماغ میں جنم لیا۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی نظم "نقادِ فن" میں کم و بیش اسی مقبولِ عام نظریے کی آڑ لے کر ایک طرح سے قوّتِ اظہار کا عجز بیان کیا ہے۔

دل پہ جب اشعار کی ہوتی ہے بارش بے شمار
نطق پہ بوندیں ٹپک پڑتی ہیں کچھ بے اختیار
ڈھال لیتی ہے جنہیں شاعر کی ترکیبِ ادب
ڈھل کے گو وہ گوہرِ غلطاں کا پاتی ہیں لقب
اور ہوتی ہیں تجلی بخشِ تاجِ زرفشاں
پھر بھی وہ شاعر کی نظروں میں ہیں خالی سیپیاں!
جن کے اسرارِ درخشاں روح کی محفل میں ہیں
سیپیاں ہیں نطق کی موجوں پہ موتی دل میں ہیں!

لیکن تحلیلی طور پر یہ اظہارِ عجز اِس لاشعوری بزدلی یا رکاوٹ کا نتیجہ ہے جس کے زیرِ اثر کھری سے کھری کہنے والے مصنّفین بھی جرأت نہیں کرتے کہ اپنے لاشعوری یا تحت الشعوری فشار اور ان کے ساتھ اپنے سفلی جذبات، اذیت پرستیوں، ظالمانہ افتاد یا فحشائم کو اپنی تحریر میں بار پانے دیں۔ تہذیب و شائستگی، علم اور تمدن اور تہذیب ہی سے وہ نام نہاد اور مولنا ہی جنہیں تربیت کہا جاتا ہے لاشعور اور تحت الشعور کو اتنا پابند بنا دیتے ہیں کہ کئی نسلی یادیں اور واقعات نہیں اظہار نہیں پا سکتیں۔

تاہم گاہے گاہے کوئی غیر معمولی افتاد کسی حدتک اس لاشعوری رکاوٹ کے تمام بندھن توڑ دیتی ہے اور اسی لئے ہمیں ادب میں مخرّبِ اخلاق یا مجرمانہ طور پر فحشائم تحریروں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مگر یہ حادثہ کبھی کبھار ہی ہوتا ہے عام طور پر لکھنے والوں کی مصلحت کوشی اس بات کی ضامن بنی رہتی ہے کہ یہ خطرناک لاشعوری ناسور تحریروں میں نہ پھوٹ بہے اور بلاواسطہ طور ادب کو مسموم نہ کر دے، مگر اس کا کیا علاج کہ اس پردگی کے باوجود بھی تحلیلی عینک یہ دیکھ سکنے پر قادر ہے کہ کہاں مصلحت کا ٹھینگا زبردست ہے اور کہاں ذرا ہلکا ہے چنانچہ جہاں یہ سنسر ذرا نرم ہو جائے وہیں ہمیں مجرمانہ فحشائم، مخرّبِ اخلاق، اور رنجیدہ ذہن صنفِ ادب کا سراغ ملنے لگتا ہے اور یہ وہ صنف ہے جسے آپ اور ہم زبانی کوستے ہیں مگر پرائیویٹ طور پر سینے سے لگا کر رکھتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ ادب، لکھنے والوں کی آئینہ برداری اس حدتک کرتا ہے کہ انہیں خود بھی اس انتہا کا شک نہیں گذرتا۔ ہر مصنّف چند ایسے احساسات، خیالات اور نظریات کا جیتا جاگتا مجموعہ ہے جو اُس کی تحریروں میں ڈھل کر اس کی انفرادیت، اُس کا اسلوبِ بیان اور اس کی موضوعاتی افتاد کا نام پاتے ہیں ــ تحلیلی طور پر ہسٹریا کے مریض کو دلداری سہارے اور تسکین کی خاطر کسی خاص آدمی کی خواہ وہ اُن کا محبوب یا معالج کوئی دوست یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو تلاش میں رہتے ہیں۔ یہی حال لکھنے والوں کا بھی ہے۔ ان کے بعض نظریے ان کی لکھی ہوئی کہانیوں، نظموں یا دوسری کتابوں میں بعض کرداروں کا اور دھار کر ان کے لئے سہارے اور تسکین کا موجب ہوتے ہیں۔ کیونکہ حقیقی دنیا میں نظریوں کی موافقت یا ہمدرد شنوائی ہر ایک کے لئے ہر وقت ممکن نہیں ہوتی۔

چنانچہ سوانح نگار صرف ان شخصیتوں کی زندگی بیان کرنے میں اپنا زورِ قلم صرف کرتے ہیں جو نفسی طور پر ان کی افتادِ طبع سے کسی طرح مماثلت رکھتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حیاتِ سعدی مولانا حالی کی بجائے آزاد یا مولوی شبلی اس کامیابی سے لکھنے پر قادر نہ تھے۔ اس سوانح عمری کا عمیق مطالعہ ہمیں حالی اور سعدی کے بہت سے یکساں نفسی پہلوؤں سے روشناس کراتا ہے۔ یہ یکسانیت ممکن ہے کہ بعض اوقات بلاواسطہ ہو یا بالواسطہ، تحت الشعوری ہو یا لاشعوری۔ مگر اس کا وجود یقینی طور پر ہے۔ اس کے برعکس حیاتِ جاوید فنِ سوانح اور کامیاب انداز کے لحاظ سے حیاتِ سعدی سے کہیں کمتر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سرسید اور حالی کی نفسی مناسبت اتنی مکمل اور گہری نہ تھی جتنی کہ سعدی اور حالی کی۔

یہاں ہمیں ان داخلی رجحانات سے قطع نظر کرنی چاہیئے۔ جس کے تحت ہم ہر ادب میں ناول یا نظمیں سوانحاتی چیزوں کی شکل میں لاتی رہتی ہیں۔ اس لحاظ سے اردو شاعری کا بیشتر حصہ جو داخلی موضوعات پر مرکوز رہا ہے۔ زیرِ بحث لانے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے گی کیونکہ اس میں ذاتی ناکامی یا کامرانی آدرش یا کمزوریاں اور لاشعوری نفسی عمل صاف طور پر آسودہ نظر آئے گا۔ اس میں شاعر اور فنکار کی تمام تر توجہ اس بات پر رہتی ہے کہ جذباتی تعلقات میں اپنی حرماں نصیبی [illegible] زندگی کبھی نورانی یادوں اور کبھی رات کی بات کے گہرے اور [illegible] میں پلک جھپکاتی دکھائی جائے۔ جہاں کہیں یہ واقعاتی رنگ [illegible] ہو جاتا ہے وہیں اظہار کا خلوص اس تحریر میں اثر پیدا کر دیتا ہے۔ اس لئے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے والے کے کلام میں ہمیں تاثیر کا "خداداد" جوہر دکھائی دینے لگتا ہے ـــــ یہی سوانحاتی رنگ ہی میر و فانی کے اثر و تاثیر کا ضامن ہے مگر اس کے علاوہ بہت سے غیر فانی اور بظاہر غیر سوانحاتی ادب پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو پھر بھی ہمیں اس ادب میں لکھنے والوں کی شخصیت کرداروں اور نظریوں کا بھیس بدلے کامیاب چور کی طرح ہر سطر میں نقب لگاتی اور پھر گم ہو جاتی معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر حکیم محمد علی کا ناول "نشتر" موجودہ ناول کے پہلے دور میں اتنی کامیاب ٹریجیڈی ہے کہ اب بھی اس کا مقابلہ ہارڈی کے کسی اعلیٰ خالص المیہ سے کیا جا سکتا ہے اور عین ممکن ہے کہ ہیرو کی مصیبت زدگی، اور جذباتی ناکامیابی حکیم صاحب کی اپنی زندگی کا کوئی دل شکن بہروپ ہو۔ مگر چونکہ ہمیں اس دور کے اور اب کے بیشتر لکھنے والوں کی پرائیویٹ زندگی کے متعلق اتنا ہی علم ہے جتنا کہ تذکروں اور ادب کی تاریخوں میں مرقوم ہے۔ اس لئے قطعی طور پر کوئی فیصلہ بعید از وقت بات ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حکیم صاحب کی اپنی زندگی جذباتی کامرانی اور دنیاوی آسودگی کا آدرش ہو مگر پھر بھی انہوں نے ایسا ناول لکھا۔ اس کی توجیہہ بڑی آسان اور عام فہم ہے۔ دوسروں کی المناک زندگی سے اس حد تک متاثر ہو سکنا ہی اس بات کا ضامن ہے کہ اثر لینے والے کی نفسی افتاد خود صحت مند نہیں۔ اور اس پر کسی بے نام المناکی کا بھوت اپنا منحوس سایہ ڈال رہا ہے لہذا اس ناول میں کرداری اظہار ممکن ہے ان کے دوستوں، عزیزوں یا بزرگوں کی زندگی کے کسی باب کا احسان مند ہو۔ اسی طرح راشد الخیری کے ناولوں میں عورتوں کی ضرب المثل مظلومی اور جاں خراش مصیبت زدگی اصل میں ان کی اپنی اس افتاد کا پرتو ہے جو عورتوں کی طرح موقع بے موقع شہید، مظلوم، صابر و شاکر اور حلیم تھی۔ سنتے ہیں کہ بڑھاپے میں کسی بچے کے گھر میں وقت بے وقت آنے جانے پر ان کے فقرات ایک مامتا کی ماری اور ڈرپوک ماں کی فطرت کے آئینہ دار تھے۔ اسی طرح نواب مرزا شوق کی مثنوی زہرِ عشق بھی جیسا کہ ان کے نواسے حکیم تصدق حسین صاحب لکھنوی ہمیں بتلاتے ہیں۔ ہماری اس توجیہہ کا ایک بڑا ثبوت ہے کہ کسی عزیز کی زندگی کے المناک واقعے سے انہوں نے اتنا اثر لیا کہ اسے اپنایا، اور "ہم" اور "مہ جبیں" کے پردے میں بیان کیا۔

یہاں تک تو تھا المناکی کا اظہارِ شخصیت، اب عام کردار نگاری کو لیا جائے تو یہاں بھی مواد کافی بصیرت افروز ہے ـــــ لکھنے والا چاہے قصداً اپنے کو سات پردوں میں چھپائے مگر ایک دفعہ اس پردگی کا سراغ ہمیں مل جائے پھر یہ پردے ایسے نہیں جنہیں اٹھائے نہ بنے۔ "بے لاگ" (IMPERSONAL) تحریریں صرف ظاہری طور پر ہی ایسی نظر آتی ہیں۔ حالانکہ بعض اوقات تو قصداً اور بعض دفعہ غیر ارادی طور پر لکھنے والے کسی کردار کی حرکات سکنات، چال ڈھال اور عادتوں میں اپنے متعلق کافی کچھ بیان کر دیتے ہیں۔ شہاب کی سرگزشت میں نیاز فتح پوری کی فلسفیانہ مولویت اور عجیب و غریب لاشعور،

شہاب کے غیر معمولی کردار میں اس نفسی کشمکش سے آسودگی حاصل کرنے کا کوشاں ہے جو نہ معلوم کتنی مدت تک اسے اور بے چین رکھتی ، اگر شہاب کی سرگزشت وجود میں نہ آتی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں خطابت اور مرکزی کرداروں کی زبان سے لمبی چوڑی تقریریں، ان کی حیثیت اور ان میں قرآن کریم اور احادیث کے حوالے نیز مسلمانوں کی عام پستی اور موجودہ تعلیم کی ضرورت ان کی اپنی شخصیت کا ایسا واضح عکس ہے جس کو نہ تو ابن الوقت اور نصوح اور نہ مبتلا اور صادق کے ظاہری طور پر مختلف کردار، دھندلا سکے۔ بلکہ کئی نقادوں کی رائے میں ابن الوقت اور نذیر احمد مرحوم ایک ہی تصویر کے دو رپرٹ ہیں۔ انھوں نے بھی پرانے لوگوں میں پہلے پہل انگریزی پڑھی، اور معقول عہدہ حاصل کیا۔ میری گزارش یہ ہے کہ اگر ایسی "وجودی وحدت" [illegible] میں کچھ مبالغہ بھی ہے تاہم اس میں صداقت کی جھلک کافی حد تک موجود ہے بلکہ ابن الوقت میں ایک ضمنی کردار کی انگریزوں کی مدارات کی شکایت تو خاص ڈپٹی صاحب مرحوم کے اپنے تلخ تجربات ہیں جو ان کو اپنی اعلیٰ ملازمت کے سلسلے میں ہوئے۔ مولانا عبدالحلیم شرر کا حد سے فزوں عاشقانہ رنگ طبیعت، جن کو ان کی مولویت اور زمانے کی عام روش زندگی میں مصلحت کوشی کے پردے میں چھپائے رکھتی تھی، ان کے ہر ناول سے بے طرح چھلکا پڑتا ہے۔ یعنی اپنے ناولوں میں جہاں کہیں بھی ہیروئن یا کسی اور ضمنی نسائی کردار کا ذکر ہے وہیں بڑی فراخدلی سے "پری چہرہ"۔ "نازنین"، ملائک فریب اور ایسے توصیفی مرکب استعمال کئے گئے ہیں۔ عام طور پر کسی کا سراپا اور اس کے ساتھ کے توصیفی مرکب صرف اسی وقت لکھے جاتے ہیں جب کسی کہانی میں کوئی کردار پہلی بار متعارف ہو۔ مگر مولانا کا ہر بار ہر ناول میں یہ مرکبات استعمال کرنا ان کی طبیعت کے بانکپن اور رنگینی کا ایک ایسا سراغ ہے جو ہر جگہ نہاں ہے۔ اور اس کی عریانی آپ کا کام ہے۔ اسی طرح اُن کے پہلے ناول دلکش میں ہیرو کے اونچے خیالات، یورپ جانے کے منصوبے اور چھوٹے موٹے رومان ان کی اپنی باتیں ہیں جن میں بعض کا ثبوت (مثلاً یورپ جانا) لوگوں کو مولانا کی بعد کی زندگی سے عملی طور پر مل سکتا ہے۔ سرشار کے متعلق تو کچھ کہنے سننے کی حاجت ہی نہیں، ان کی وضع قطع اور طبیعت اور علمی ذوق کے جو حالات ہمیں دستیاب ہوتے ہیں وہ ان کے رائیدہ کردار آزاد میں ڈھل گئے۔ مرزا محمد سعید نے صرف دو ہی ناول لکھے ہیں جو خاص طور پر تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ بعد کو اُن کی توجہ مختلف مذہبوں کے تقابلی مطالعہ جیسے مہتم بالشان اور خشک موضوع کی طرف پھر گئی ورنہ اگر وہ لکھتے رہتے تو ان کی منجھی ہوئی طبیعت اور اعلیٰ تعلیم نیز لطیف جذباتی افتاد ان کے ناولوں میں ان کی طبیعت کے زیادہ سے زیادہ چربے چھوڑتی۔ یاسمین میں ہیرو یعنی اختر کا کردار اس کی منجھی ہوئی طبیعت کی وارفتگی، نظریے اور کرزوریاں مصوری سے شغف، سبھی کچھ کہیں کہیں اس طور سے بیان ہوا ہے کہ ہمیں اختر کے پردے میں خود مرزا صاحب کی ذات کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہی حال خواب ہستی کا بھی ہے۔ اس کے ہیرو اختر کا آخر میں محبت میں ناکامی جسمی طور پر قبول صورت نہ رہنا اور آخر میں ایک کا مذہب میں تسکین حاصل کرنا اور دوسرے کا اپنی بیوی کی ذات میں آسودگی پانا۔ مرزا صاحب کی نفسی افتاد اور لاشعور کے نفسی اعمال پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ مگر اس سلسلے میں پریم چند کا مطالعہ مجھے سب سے کٹھن کام معلوم ہوا۔ حالانکہ اُن کی پرائیویٹ زندگی بھی کسی حد تک لوگوں کے سامنے آ ہی چکی ہے۔ مرحوم بھولے بھالے مرنجاں مرنج آدمی تھے ـــــ جن کا ذہن موجودہ سماجی اور سیاسی کشمکش، غربت اور امارت، تعلیم اور اس کے نتائج، ہندوستانیوں کے اب کے رجحانات سے بہت دلچسپ طور پر واقف تھا۔ عسرت کے نقشے ان کے ہاں اس لئے اچھے ہیں کہ مرحوم کی اپنی زندگی مالی لحاظ سے زیادہ خوشگوار نہ تھی۔ اس لئے ہمدردِ ردِ عمل نے ان نقشوں کو اور بھی پُر تاثیر کر دیا۔ زندگی کی کشمکش میں پیہم جدّ و جہد کا مقولہ قطع نظر اس کے کہ ناکامی ہو یا کامیابی، ان کے بیشتر کرداروں کا مطمح نظر ہے۔

یہ ان کا اپنا نظریہ تھا جس پر وہ قابل رشک رغبت اور خلوص سے کاربند تھے۔ تیاگ اور قربانی ان کا اپنا آدرش تھا جو زندگی بھر رہا، اسی لئے ان کے کردار کہیں تو آئی سی ایس کی ملازمت چھوڑتے ہیں اور کہیں تعلقہ داری اور ریاست کے ہوتے ہوئے بھی راہبانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ سیاسی طور پر حسب اتحاد اور یگانگت کے وہ قائل تھے۔ اسی کو انہوں نے کتابوں میں کہیں دو مرکزی ہندو اور مسلمان کرداروں کی دوستی میں نبھایا ہے (مثلاً پردہ مجاز اور میدانِ عمل میں) اور کہیں ایک ہندو کردار کی اعلیٰ قربانی پر ایک مسلمان کو جان سے ہاتھ دھوتے دکھایا ہے

جیسے چوگان ہستی ہیں لیکن ان کی نفسی اتحاد جہاں تک میں نے غور کیا ہے کردار نگاری کے معاملے میں بڑی پیچیدا رہے۔ مثلاً چوگان ہستی میں ہیرو ونے سنگھ اور ضمنی کردار سورداس کی بے نظیر قربانیوں سے میں پریم چند کا تیاگی آدرش سورداس میں زیادہ آسودہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ پریم چند کی سی مفلس تسپورتی میں شرپ" ونے سنگھ کی بہ نسبت سورداس کے کوائف میں زیادہ جھلکی پڑتی ہے۔ یہی حال ان کے اصلاحی جذبوں کا ہے۔ چنانچہ سیوا سمتی بہت سے ناولوں میں کام کرتی ہے مگر ان کے جذباتی رجحانات بہت سے ناولوں اور کہانیوں کے مطالعے کے بعد بھی مشکل سے متعین ہوتے ہیں۔ عورتوں کے متعلق وہ سیدھے خیالات اور ہو سکے تو افلاطونی محبت کے قائل ہیں۔ بلکہ درپردہ اسی محبت کو بعض جگہ واقعات کی ترتیب سے مجرمانہ فعل اور بری بات ثابت کرتے ہیں اور اس کی جگہ ہنسی تن والی صحت مند شادی شدہ محبت "Heal They married Laue" کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ دونوں نظریوں میں ان کا اپنا پرتو اس طرح ہے کہ ونے سنگھ (چوگان ہستی کے ہیرو) کی مثل وہ افلاطونی محبت کرنے کے قابل ضرور تھے، کیونکہ تیاگ ان کا آدرش تھا مگر فطری طور پر جب اس محبت میں جسمانیات کا پہلو آگودے تو ان کی جان ضیق ہونے لگتی تھی۔ چنانچہ ونے سنگھ کا راجپوتانے کے پہاڑوں میں صوفیا سے تنہائی پاکر دل ہی دل میں پاکیزگی سے ہاتھ دھو بیٹھنا اس بات کا ضامن ہے کہ مرحوم کو نوجوانی کے کسی ایسے ہی واقعہ سے شاید سابقہ پڑا ہو۔ یا یہ بچپن کی غیر شعوری تاثر پذیری کا کرشمہ ہو۔ ثانیاً شادی شدہ محبت کی صحت مندی تو ان کی اپنی زندگی کی تصویر تھی۔

مرحوم عظیم بیگ چغتائی کا مطالعہ اب ان کی ہمشیرہ محترمہ عصمت صاحبہ چغتائی کی بدولت آپ کے سامنے آچکا ہے۔ اس سے مصنف کی پرائیویٹ زندگی سے قطعاً ناواقف طالب علم کی حیثیت سے چغتائی کی مزاح نگاری پر میرے اپنے مضمون (مطبوعہ ساقی اپریل ۴۲ء) کی تشنگی اور ادھورا پن جاتا رہا۔ ان مضامین کے روبرو یہاں چغتائی صاحب پر کچھ مزید غور و فکر تحصیل حاصل سی بات بن جاتی ہے، ناظرین یہ دونوں مضامین ملاحظہ فرمائیں۔

عورتوں میں نذر سجاد حیدر اور عصمت چغتائی کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔ خاتون اکرم اور زاہدہ خاتون شروانیہ کا تذکرہ بعد میں آئے گا، نذر سجاد حیدر کا تمدن ہمیں حیرت انگیز طور پر مغرب زدہ معلوم ہوتا ہے چنانچہ اس کے کرداروں کا اونچے طبقوں سے تعلق رکھنا۔ کوٹھیوں میں رہنا، شملے اور نینی تال کی سیریں۔ جہاز "ملتان" اور "رعغاب ہند" سے ہندوستان واپس آنا، چائے، ڈنر، میل جول، سبھی کچھ ہمیں موصوفہ کی اعلیٰ سماجی پوزیشن کی یاد دلاتا ہے۔ خصوصاً اس طبقہ کو لوگوں کی جو ہندوستانی افسر ہیں اور جدید طرز پر سوسائٹی میں رہتے سہتے ہیں۔ ظاہرا طور پر موصوفہ کے کرداروں میں کوئی قدامت پرستی نہیں معلوم ہوتی سبھی کی تراش خراش اور جلت پھرت جدید ترین قسم کے صناعوں کی مرہون منت ہے۔ مگر ان کے نسائی کردار اپنے جدید کلچر کے باوصف بھی اپنی طبیعتوں میں قدیم ہندی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ مثلاً یورپ زدگی کا حیا، وفاداری اور عصمت کے نظریوں سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ مگر موصوفہ کے نسائی کردار عام طور پر حیادار، اور باوفا ہیں۔ جن سے ان کی اپنی ذات کی یہ خوبیاں روشن ہوتی ہیں کم و بیش یہی حال مردوں کا بھی ہے۔ ان کے جدید مردوں کی لغزشیں اتنی ہی ہیں جتنی ہماری پرانی تہذیب میں چلتے پھرتے مومی مجسموں کی۔ ایک اور بات کہ مردوں میں عادتیں اور خصائص ان کے ناولوں میں کم و بیش ایک جیسے ہیں۔ سنجیدگی، مغرب زدگی، اعلیٰ ملازمت یا سماجی پوزیشن، عمدہ تعلیم۔ اور وفاداری سب میں کم و بیش ایک جیسی ہے۔ شاید یہ خود سید سجاد حیدر صاحب کا عکس ہو۔ البتہ عصمت صاحبہ کا معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ ان کے افسانے ترقی پسندی کی آڑ میں ان کی اپنی افتاد پر جو روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ بڑی نتیجہ خیز ہے، یہ مطالعہ ان کے سلسلے میں اور بھی اس لئے آسان ہے کہ وہ خود بحیثیت ایک کیریکٹر کے اکثر افسانوں میں اپنا پارٹ بڑی خوبی سے نباہتی ہیں۔ "بیلا" قسم کے افسانے اوائل عمری ہی میں ان کی جنسی بیداری پر دال ہیں۔ ہیرو کا ان کی سہیلی سے آنکھ لڑانا اور اپنی ناجائز اولاد کی اسے ماں بنا دینا جس عجب اور وارستگی سے بیان ہوا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کی طبیعت میں ابھی تک بچپنے کی سی تعجب پذیری بڑی حد تک ہے۔ یہی عجب ان کے بیداری میں سپنے دیکھنے کی طرف

بھی توجہ منعطف کراتا ہے اور زندگی میں ان کی جذباتی ناکامرانی کے قریب قریب کسی چیز کا اطلاق اُن پر کراسکتا ہے۔ "لحاف" اور کئی اسی قسم کے افسانے یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ جادۂ اعتدال سے ہٹی ہوئی افتاد کی حامل ہیں "شادی" میں کئی انداز سے ہیروئن کی ایک آئی سی ایس مختار سے شادی نہ کرسکنے یا اس کے التفات کا سزاوار نہ بن سکنے کی وجہ جذباتی تعلقات میں اپنی محرومی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح "بچے" میں ہیرو کی رشتہ دار لڑکی کا اسے بے طرح چاہنا اور اس سے ٹھوکریں کھانا، پٹنا، مصنفہ کی اپنی اذیت پرست یا اذیت کوش افتاد کا ایک زندہ پلٹا ہے۔

خاتونِ اکرم کی تحریریں مولانا راشد الخیری کی طرح عورتوں کی مظلومی کی داستان ہیں۔ مگر مجھے اُن میں راشد الخیری مرحوم کی نسبت عورت کی مظلوم شخصیت میں زیادہ خلوص اور بلاواسطہ تعلق نظر آیا۔ وجہ یہ کہ مولانا مرحوم جسمانی طور پر مرد تھے خواہ ان کی نفسی افتاد کے ترکیبی اجزا میں عورت کا عنصر زیادہ تھا۔ خاتونِ اکرم خود ایک بیدار مغز عورت تھیں جس کی اپنی زندگی خوش قسمتی سے ان مصائب سے دور تھی جن کا جاں خراش ہیولا اصلاح کے سلسلے میں ان کی کتابوں میں ہے، یہ اُن کی تاثر پذیری اور حساس فطرت کی دلیل ہے۔ ان کی شخصیت جو اُن کی تحریروں سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ بڑی قابلِ رشک ہے۔ وفادار، صابر، حلیم الطبع اور سلجھے ہوئے مذاق کی زندہ تصویر خاتونِ اکرم کی ذات تھی، افسوس ہے کہ وہ بہت جلد چل بسیں۔ یہی حال زاہدہ خاتون شروانیہ کا تھا۔ ان کی نظموں سے ایک حیادار فرض شناس عورت بولتی ہے جو مذہبی ماحول اور امارت کے گھرانے میں پل کر جوان ہوئی تھی۔

نثری کارناموں کے طاغوت، ولیلن اور شاعری کے "رقیب روسیاہ" بھی اس لحاظ سے بڑی دلچسپ سٹڈی ٹھہرتے ہیں کہ آیا ان کی کردار نگاری میں خود مصنف کی اپنی افتاد کا حصہ کتنا ہے۔ اصل میں ہمارا لاشعور عجیب و غریب بہروپ اور علامتوں کی آڑ لے کر ادب میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر شیطان دنیا کی جن نظم و نثر کی کتابوں میں ایک کردار کی حیثیت سے نمایاں ہوا ہے اصل میں علامیت کے پردے میں ہمارے اپنے لاشعور کی ایک رونمائی ہے۔ اس کی کارکردگیاں، ادھر ادھر گردانی اصل میں ہمارے لاشعور کے جن کی بے نام عمل میں لائی ہوئی خواہشوں کا روپ ہیں۔ اسی طرح ناولوں اور کہانیوں میں ولیلن اور اردو شاعری کا رقیب روسیاہ اس لئے ہماری خاص دلچسپی کا مرکز ہیں کہ ان کی ذات میں خود ہمارا لاشعور ایک مدت کے بھولے بسرے بھائی کا کھوج لگا لیتا ہے۔ چنانچہ اس کے افعال، اقوال، کامرانیاں، اور سرخروئی اصل میں ہمارے اُن دبے ہوئے لاشعوری فساد آمیز خیالوں کا نتیجہ ہیں۔ جن کو سنسر کی تربیت اُبھرنے اور بلاواسطہ عمل کا موقع نہیں دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہمارا اخلاقی احساس ولیلن یا رقیب کی کامیابیوں پر ہماری دلچسپی کو لعن طعن کرتا ہے۔ تو ہم ولیلن اور رقیب کو کیفرِ کردار تک پہنچاتے ہیں۔ اور خوش ہوتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جو آدمی ایک خاص عیب سے سخت متنفر ہو۔ اس کی اپنی ذات میں ہی اس عیب یا برائی کا عنصر موجود ہوتا ہے اور اس عنصر کو دبانے کی خواہش اور کشمکش ہی یہ تنفر پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا یہ شک ہمیشہ حق بجانب ہے کہ اگر ایک لکھنے والا اگر ایک عیب یا برائی پر جلی کٹی کہتا سنتا رہے۔ تو یہ ممکن ہے کہ وہی اپنے لاشعور میں اس عیب کا مرتکب ہوا ہو۔ یہاں تک کہ ولیلن کے ساتھ مناسبت بعض لکھنے والوں میں شعوری اور تحت الشعوری بھی ہوسکتی ہے۔ اس کی عمدہ مثال انگریزی میں بائرن اور اردو میں مرزا رسوا ہیں۔ بائرن تو اس کی اتنی مکمل مثال ہے کہ اس کی کتابوں کی نفسی تحلیل اس کے حقیقی اعمال کے ساتھ ہمیں انگشت بدنداں کردیتی ہے۔ اس کی کتابوں کے مجرم ہیرو جنہیں ظلم و ستم، اذیت پرستی اور اعتدال سے باہر اعمال کا خاص لپکا ہے ہمیں بائرن کی زندگی سے بہت قریب نظر آتے ہیں چنانچہ اس کے اذیت پرست مجرم ہیرو اس لحاظ سے خود بائرن کی ذات ہیں کہ اس کی جذباتی زندگی انہی جرموں سے بھرپور تھی۔ حتیٰ کہ اُس کے ایک مشہور اور کامیاب ناول میں ہیرو کا اپنی بہن کے ساتھ ازدواجی تعلقات پیدا کرلینا لوگوں کے لئے اس سازش کا مواد بنا کہ بڑے بڑے صاحبِ فن نقادوں نے بڑے طمطراق سے دن دہاڑے یہ بات جھنڈے پر چڑھا دی کہ بائرن کے تعلقات اپنی بہن کے ساتھ بھی ایسے ہی تھے۔ اس کے برعکس مرزا رسوا کی زندگی اُس کی بندھن توڑ افتاد کے باوجود ہندوستانی رسم و رواج اور قدامت پرستی میں جکڑی ہوئی تھی۔ ایک فرانسیسی محبوبہ سے تمام عمر ناکام محبت کے باوجود مرزا صاحب مرحوم

وکٹورین زمانے کے آدمی تھے۔ مگر ان کے مجرم کردار حیرت انگیز طور پر ان کی طبیعت کے پرتو ہیں۔ وہی اذیت پرستی، وہی عذاب آفرینی ان کے "خونی شہزادے" میں ہے جو ان کا خاصہ تھی۔ بلکہ میری گزارش تو یہ ہے کہ مرزا صاحب مرحوم کی کتابیں اپنی نفسیاتی علامتیت کی بدولت ہمارے ادب میں ایک یگانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ "بہرام کی فراری" میں ان کی مجرمانہ لاشعوری ذہنیت عمر رسیدگی کی بنا پر اس اسٹیج پر آچکی تھی جہاں اخلاقی بندشیں ایسی تخلیقات کے لئے لعن طعن پر اتر آتی ہیں۔ اسی لئے یہ کتاب کرداری قوت کی بجائے کرداری مجبوری کا نمونہ ہے اور اسی لئے انہوں نے ظفر عمر کے بے مثال کردار بہرام کو یہاں ایک پرشکستہ عقاب دکھایا ہے۔ یعنی بہرام کے کارناموں کا جو عروج ظفر عمر نے تیار کیا مرزا رسوا نے اسے "فراری" کے پہلو میں زوال کا پیش خیمہ بنا دیا۔

ظفر عمر کی "نیلی چھتری"، "لال کھٹور"، اور "بہرام کی گرفتاری" خواہ فراسیسی ادب کا چربہ ہی ہوں مگر اس کا اپنانا اور اُسے اور بھیل کر دکھانا بھی اسی مجرمانہ لاشعور کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو بہت بلند پایہ ہے بہرام کی عدیم المثال شخصیت۔ اعلیٰ ذہانت بڑے پیمانے پر سلجھے ہوئے مذاق کے جرم، اور ایجادیں اصل میں ظفر عمر کی اپنی لاشعوری کیفیتیں ہیں جن کو زندگی دینے میں مبالغہ، بہروپ اور آدرش کا ہاتھ نمایاں ہے۔ حقیقتاً مجرمانہ کرداروں کو زندگی دینے میں ہمیشہ لاشعور کے فراہم شدہ مواد کو انہی خرادوں پر ڈھالنا پڑتا ہے تاکہ کردار بول اٹھیں۔ کون کہتا ہے کہ ظفر عمر اگر سپرنٹنڈنٹ پولیس نہ ہوتے تو بہرام نہ سہی۔ اُس سے کم رتبے کے نفیس مجرم نہ بن سکتے تھے؟

آخر میں خیال رہے کہ اس طول طویل عرضداشت سے یہ مقصود نہیں کہ ایک تحریر میں بکھرے واقعات یا ایک نظم میں جستہ جستہ تجربات لازماً اس کے لکھنے والے کو ہوئے۔ اصل میں جب ایک لکھنے والا ایک خاص موضوع، یا خاص افتاد یا خاص انداز نظر پر بار بار زور دے اور بہت سی کتابوں میں وہی تان پلٹے ذرا سی تبدیلی سے آتے رہیں۔ صرف اسی وقت ہمیں یہ شک ہونا چاہئے کہ کہیں یہ لکھنے والا "سرِّ دیگراں" کے پردے میں "حدیثِ دلبراں" تو نہیں بیان کر رہا؟

چنانچہ اس مضمون کے تحلیلی مطالعہ میں اسی بنیادی چیز کا خیال رکھا گیا ہے۔

مختار صدیقی

کلرک!

زندگی ایک بوجھ! ایک تھکن!
روح کچھ چور چور، جسم نڈھال!
ایک مبہم۔ گھٹی گھٹی سی فضا
اور احساسِ چاکری کا دباؤ
ذہن پر فائلوں کے بارِ گراں
چور جن سے ذہانتوں کے وجود

افسری کے حسین جال میں قید
چند زائد ٹکوں کے حلقہ بگوش
یعنی چاندی کی چند زنجیریں
جسم کی قید پر بڑھائے ہوئے
اپنے آقا کی ذلتوں کے شرار
اپنے محکوم پر اگلتے ہوئے
اس پہ احساسِ برتری کا تناؤ!
یہ تفاوت کی آہنی دیوار
چند ٹیڑھے اصول جن کی نہاد
میرے جذبات کو کچلتی ہے
میرا سرمایۂ حیات تو دیکھ!

ایک نفرت بدوش بیزاری
تلخیوں۔ حادثوں۔ کا پالا ہوا
عزم۔ دکھیا جہاں بدلنے کا
اور پھر اپنی بے کسی کا خیال!
ڈھیر مرحوم آرزوؤں کے
چند نوخیز ولولے۔ سوغمیں
اُن سے مایوسیاں ٹپکتی ہوئیں
اپنے جینے کو جرم سمجھے ہوئے

ہوں وہ مجبور راہرو جس کی
کوئی منزل۔ نہ دل میں ذوقِ سفر
پھر بھی چلتا ہوں۔ کیوں؟ نہیں معلوم
دل میں کوئی امنگ۔ نہ آس۔ نہ یاس
زیست اک ناگوار یکسانی
جس کے کل اور آج، فرق سے دور
پھر بھی جیتا ہوں۔ کیوں نہیں معلوم!
میرا کیا ذکر اک کلرک ہوں میں

مسعود احمد قریشی

دنیائے ادب

نیرنگِ خیال کے متعلق چند تازہ انکشافات

اگر نیرنگِ خیال کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آزاد اسے لکھتے وقت ایک سخت ذہنی اُلجھن میں مبتلا تھے۔ یہ کش مکش کچھ اُسی قسم کی ہے جو ہارڈی کے اکثر کردار اپنی زندگی کی اُن پُر آزمائش گھڑیوں میں محسوس کرتے ہیں جب مدت العمر کی بدنصیبی کے بعد انہیں اپنی زندگی میں امید کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس وقت اُن کی عقلِ سلیم اور فطری انصاف پسندی اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ وہ اپنی گذشتہ زندگی کی تمام رُوداد جس کا بیشتر حصہ صنفی کمزوریوں سے متعلق ہوتا ہے، کہہ سنائیں لیکن ان کے بڑھتے ہوئے جذبات اور زندگی کی خواہش یا تو انہیں ان واقعات کو چھپانے پر مجبور کرتی ہے یا وہ انہیں ایسے ادھورے اور مبہم طریقے سے بیان کرتے ہیں جس سے اُن کا مفہوم اچھی طرح ظاہر نہیں ہوتا۔ بعد میں جب یہ واقعات آشکار ہوتے ہیں تو اُن کا اثر طرفین کے لئے نہایت ناخوشگوار ثابت ہوتا ہے۔ بعینہٖ یہ حالت آزاد کی ہے۔ وہ نیرنگِ خیال کے ماخذوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت کچھ کہہ بھی گئے ہیں لیکن ایسے انداز میں کہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ پھر بھی کوئی شخص اب تک ان کے اصلی مفہوم سے آگاہ نہیں ہو سکا۔

نیرنگِ خیال، مصنف کی طبعزاد تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ بجز اس کے کہ اس کا مواد غالباً ڈاکٹر لائٹنر نے بہم پہنچایا۔ یہ رائے بیرسٹر شیخ عبدالقادر نے (جو بعد میں سر کے خطاب سے مفتخر ہوئے) آزاد کے متعلق اپنے ایک خطبہ میں ظاہر کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں "میں نے بعض لوگوں کی زبانی سُنا ہے اور غالباً اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت بھی ہے کہ مصنف کو اس کتاب کا ڈھانچ ڈاکٹر لائٹنر سے ہاتھ آیا جو بذاتِ خود یونانی اور انگریزی ادبیات کا عالم تھا۔ اس نے آزاد کو اپنے خزانۂ معلومات سے معتدبہ طور پر بہرہ مند کیا اور مولانا مرحوم نے اسی مواد کی بنا پر نیرنگِ خیال کی عمارت تعمیر کی۔"

اس کتاب کے متعلق آزاد کے اپنے بیان تین ہیں اور وہ سب کے سب بر سبیل تذکرہ اور مبہم ہیں۔ پروفیسر مرحوم مقدمے میں لکھتے ہیں۔

"یہ چند مضمون جب لکھے گئے ہیں، نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کئے گئے ہیں ہاں جو کچھ کانوں نے سنا اور فکرِ مناسب نے زبان کے حوالے کیا، ہاتھوں نے اسے لکھ دیا۔"

اگر اس طولانی اور پیچیدہ عبارت کو سیدھی سادی نثر میں ادا کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جو باتیں مجھے سمجھائی گئی ہیں، میں نے انہیں قلمبند کر لیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر آپ نے ان مضامین کو ترجمہ نہیں کیا بلکہ محض اس مواد پر حاشیہ آرائی کی ہے۔ جو انہیں مہیا کیا گیا۔ اسی مقدمے میں وہ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

"انگریزی میں یونان اور روما کے مضامین کے ساتھ وہاں کے مذہب اور رسومِ قدیم کی باتیں اب تک انشا پردازی کا جزو ہیں یعنی اور یونانی ستارہ ہائے فلکی اور اکثر قوائے رُوحانی کو دیوتا جانتے تھے۔ چنانچہ انگریزی میں بڑے بڑے انشا پرداز وہی کہلاتے ہیں جن کی چشمِ سخن ہر بات میں ان کے قصوں پر اشارے کرتی جائے مگر اردو کے باغ نے فارسی و عربی کے چشموں سے پانی پایا ہے۔ وہاں دیوی دیوتا کا گذر نہیں، اور یہ سخت دشواری ہے۔ کیونکہ لکھتے ہیں۔ اگر تصرف کریں تو ترجمہ نہ رہا اور اگر اصل کی رعایت کی تو کتاب معمائے دقیق ہو گئی نہ کہ رفیقِ تفریح۔" ظاہر ہے کہ یہاں آزاد ان دشواریوں کا ذکر کر رہے ہیں جو انگریزی عبارات و خیالات کو اردو میں منتقل کرتے وقت پیش آتی ہیں۔ یہاں قابلِ غور امر یہ ہے کہ آزاد ذاتی مشکلات کا ذکر نہیں کر رہے

ہیں بلکہ ان تکالیف کا جو یونانی علم الاصنام کی بھرمار کی وجہ سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت پیش آتی ہیں۔

تیسرا بیان علمیت اور ذکاوت کے مقابلے کے فٹ نوٹ میں دیا گیا ہے جو ان الفاظ پر مشتمل ہے۔

" انگریزی میں وٹ اور لرننگ کا مباحثہ تھا میں نے وٹ کے واسطے بہت خیال کیا۔ کوئی لفظ نہ ملا، ناچار ذکاوت لکھ دیا۔"

مجھے ان مضامین کے انگریزی سے ماخوذ ہونے کا شبہ اس صریح مشابہت سے پیدا ہوا جو آزاد کے مضمون "سیر زندگی" اور جانسن کے " دی وائیج آف لائف" میں دکھائی دیتی ہے۔ جب میں نے ان کا موازنہ کیا تو آزاد کا مضمون انگریزی مضمون کا آزاد ترجمہ ثابت ہوا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی وہ زمانہ ہے جب انگریزی زبان میں تمثیلی موضوعات پر مضمون لکھنے کا مشغلہ اپنے پورے زور پر تھا چنانچہ جب میں نے اس صدی کی نثر کا مطالعہ کیا تو میرا شک یقین کے درجے تک پہنچ گیا۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ نیرنگ خیال کے تمام مضامین انگریزی مضامین کا ترجمہ ہیں۔ ان میں اصل سے جس حد تک استفادہ کیا گیا ہے، اس کا درجہ مختلف ہے۔ ان میں سے اکثر لفظی تراجم ہیں۔ اگرچہ بعض جملوں میں کسی قدر حاشیہ آرائی سے بھی کام لیا گیا ہے اور ایک یا دو مقامات پر اصل سے قصداً انحراف کیا گیا ہے۔ مثلاً سیر زندگی کا آخری حصہ یا شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار، کا پہلا اور تیسرا پیرا آزاد نے اصل پر اضافہ کئے ہیں۔ شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار اور ایڈیسن کے مضمون میں جس سے وہ ماخوذ ہے صرف یہ فرق ہے کہ ایڈیسن اپنے مضمون میں مشاہیر یورپ کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے برعکس آزاد کا مضمون ہندوستانی مشاہیر پر مشتمل ہے دوسرے لفظوں میں مضمون کا درمیانی حصہ آزاد کا اپنا ہے اور باقی حصے ایڈیسن سے ماخوذ ہیں۔

اب میں آپ کی خدمت میں ایک ایک کرکے آزاد کے مضامین اور انگریزی مضامین کے نام پیش کرتا ہوں جن سے وہ ترجمہ کئے گئے ہیں:

۱۔ آغاز آفرینش میں باغ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا۔	1. An Allegorical History of Rest and Labour (Johnson)
۲۔ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ	2. Truth, Falsehood and Fiction an Allegory (Johnson)
۳۔ گلشن امید کی بہار	3. The Garden of hope (Johnson)
۴۔ سیر زندگی	4. The Voyage of Life (Johnson)
۵۔ انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔	5. The Endeavour of Mankind to get rid of their Burdens (Addison)
۶۔ علوم کی بدنصیبی	6. The Conduct of Patronage (Johnson)
۷۔ علمیت اور ذکاوت کے مقابلے	7. The Allegory of Wit and Learning (Johnson)
۸۔ جنت الحمقا	8. Paradise of Fools (PARNELL) (Speetator)
۹۔ خوش طبعی	9. False Wit and Humour the Spectator No: 35 (Addison)
۱۰۔ نکتہ چینی	10 Allegory of Criticism (Johnson)
۱۱۔ مرقع خوش بیانی	11. Allegory of Several Schemes of Wit Spectator, No. 63. May 12, 1711
۱۲۔ سیر عدم	12 The Spectater: No 501, Oct 4, 1712
۱۳۔ شہرت عام و بقائے دوام کا دربار	13 The Vision of the Table of Fame Addison, Tatleer: No: 81, Oct 15, 1709

آپ پوچھیں گے کہ جب اکثر لوگوں کی رائے میں مولانا انگریزی زبان سے ناآشنا تھے، یا انہیں کم ازکم انگریزی زبان پر اس قدر عبور نہ تھا کہ وہ اس کی عبارت کا اپنی زبان میں ترجمہ کر سکتے ہیں تو پھر انہوں نے ان مضامین کا ترجمہ کیسے کیا؟ مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اگر آزاد کی تصانیف کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انہیں انگریزی زبان پر اپنے معاصرین کے اندازے سے کہیں زیادہ قدرت حاصل تھی۔ یہ درست ہے کہ ہمارے پاس آزاد کے انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف ہونے کی کوئی بلاواسطہ اور قطعی شہادت نہیں۔ مولوی خلیل الرحمٰن کا بیان ہے کہ آزاد انگریزی سمجھ تو سکتے تھے لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے انہیں اس پر زیادہ عبور نہ تھا۔ چونکہ اس مسئلے کے متعلق ہمارے پاس کوئی معلوم شہادت نہیں۔ اس لئے ہمیں چاروناچار ان کی تصانیف اور ادبی سرگرمیوں ہی سے بالواسطہ شہادت تلاش کرنی پڑتی ہے۔

یہ امر کہ آزاد انگریزی زبان سے کافی واقفیت رکھتے تھے نیرنگِ خیال کے ان اقتباسات سے ظاہر ہے جنہیں میں اس سے پہلے پیش کر آیا ہوں۔ اس رائے کی تائید میں ہمیں اس کتاب سے اور بھی شہادت ملتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"میں نے انگریزی انشا پردازوں کے خیالات سے اکثر چراغِ شوق روشن کیا ہے۔ بڑی بڑی کتابیں ان مطالب پر مشتمل ہیں جنہیں [illegible] کہتے ہیں۔"

اس خیال کی مندرجۂ ذیل امور سے مزید تائید ہوتی ہے۔

(۱) آزاد نے انگریزی سے چھ یا اس سے زیادہ نظمیں اردو میں ترجمہ کی ہیں۔

۲۔ جیسا کہ آبِ حیات اور سخندانِ پارس کے مباحث سے ظاہر ہے آپ کو لسانیات کی تاریخ کا پورا پورا علم تھا۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ آپ نے اس کا تمام مواد انگریزی کتابوں سے حاصل کیا۔ وہ آبِ حیات پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مصنف نے اس تذکرہ کے اول میں دو مضمون زبان اردو اور نظم اردو کی تاریخ پر لکھے ہیں۔ پہلا جو زبان اردو سے متعلق ہے اس نے انگریزی مورخوں کی کتابوں سے نہایت کوشش کے ساتھ چھان بین کر کے مدد دی ہے۔۔۔۔۔"

۳۔ سخندانِ پارس کے پہلے حصے کا وہ جزو جس کا تعلق تقابلی لسانیات اور ہند ایرانی صوتیات سے ہے انگریزی کتابوں سے حاصل کیا گیا ہے اسی طرح سخن دانِ پارس حصہ دوم سے صاف ظاہر ہے کہ آزاد نے ژند، پاژند اور اوستا کے متعلق اپنی بیشتر معلومات انگریزی گرامروں اور ڈکشنریوں سے حاصل کی ہیں۔ پاژند کے سلسلے میں وہ نہ صرف ویسٹ صاحب [illegible] کے مینوئے خرد کے ترجمہ کا ذکر کرتے ہیں بلکہ اس سے بعض کوائف اور اقتباسات بھی درج کرتے ہیں۔

۴۔ وہ اپنے ایک مکتوب میں ڈاکٹر لائٹنر کو لکھتے ہیں۔

"میں کئی دن سے سنتا ہوں کہ سنینِ اسلام میں کسی عالم نے بہت غلطیاں نکالی ہیں۔ آج ایک بات سنی کہ سنین اسلام کی ترکیب ہی غلط ہے۔ مجھے ضبط کی طاقت نہ رہی۔ چنانچہ اس ضرورت نے مضطرب کر دیا اور یہ مختصر عرضداشت انگریزی میں لکھتا ہوں۔"

میری رائے میں اکثر خود آموز لوگوں کی طرح آزاد مرحوم انگریزی زبان اچھی طرح سمجھ سکتے تھے۔ اگرچہ اس میں بول یا لکھ نہ سکتے تھے۔ آج بھی ہندوستان میں ہزاروں لوگ موجود ہیں جو جرمانی، فرانسیسی اور ہسپانوی زبانوں سے اچھا خاصا ترجمہ کر سکتے ہیں۔ اگرچہ ان میں بول یا لکھ نہیں سکتے مضمون کے آخر میں آپ کے سامنے میں انگریزی مضامین اور نیرنگِ خیال کے دو متوازی اقتباسات پیش کرتا ہوں تاکہ آپ پر بخوبی واضح ہو جائے کہ ان میں کس قدر مشابہت ہے۔

There are two kinds of immortalality, that which the soul really enjoys after this life, and that imaginary existence by which men live in their fame and reputation. The best and the greatest actions have proceeded from the prospect of the one or the other of these; but my design is to treat only of those which have chiefly proposed to themselves the latter

as the principal reward of their labours. It was for this reason that I excluded from my tables of fame all the great founders and votaries of religion, and it is for this reason also that I am more than ordinarily anxious to do justice to the persons of whom I am now going to speak; for since fame was the only end of their enterprises and studies, a man cannot be too scrupulous in allotting them their due proportion of it.

بقائے دوام دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی کہ اس کے لئے فنا نہیں۔ دوسری وہ عالم یادگار کی بقا جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں اور شہرتِ دوام کی عمر پاتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے یا تو ثوابِ آخرت کے لئے یا دنیا کی ناموری اور شہرت کے لئے۔ لیکن میں اس دربار میں انہیں لوگوں کو لاؤں گا جنہوں نے اپنی محنت ہائے عرق فشاں کا صلہ اور عزم ہائے عظیمہ کا ثواب فقط دنیا کی شہرت اور ناموری کو سمجھا اسی واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے اُن کے نام شہرت کی فہرست سے نکال ڈالتا ہوں۔ مگر بڑا فکر یہ ہے جن لوگوں کا ذکر کرتا ہوں اُن کی حق تلفی نہ ہو جائے کیونکہ جن بے چاروں نے اتنی جاں فشانی اور عمر بھر کی محنتوں کا اجر فقط نام کو سمجھا اُن کے حصے میں کسی طرح کا نقص ڈالنا سخت ستم ہے۔

It is a celebrated thought of Socrates that if all the misfortunes of mankind were put into a public stock, in order to be publicly distributed among the whole species, those who now think themselves to be most unhappy would prefer the share they are already possessed of, before that which would fall to them by such a division. Horace has carried this thought a great deal further in the motto of my paper which implies that the hardships and misfortunes we lie under are more easy to us than those of any other person would be, in case we change condition with them. As I was ruminating upon these remarks in my elbow-chair, I insensibly fell asleep, when on a sudden, methought there was a proclamation made by Jupiter that every mortal should bring his grief and calamities and throw them together in a heap

سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لا کر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ اب اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔
ایک اور حکیم اس لطیفہ کے مضمون کو اور بھی بالاتر لے گیا ہے اور وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا۔ میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا اور آرام کرسی کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان الافلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہل عالم اپنے اپنے رنج و الم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔ (ہمایوں جولائی ۱۹۲۲ء) ڈاکٹر محمد صادق

حصۂ نظم

برساتیں

بھیگی بھیگی یہ چاندنی راتیں
لائی ہیں زرنگار سوغاتیں

زمزموں میں صنمکدے کا غرور
قہقہوں میں شراب کی باتیں

کپکپاہٹ میں احمریں جلوے
مسکراہٹ میں چمپئی گھاتیں

لب پہ سوز و گداز کی جنت
آنسوؤوں میں رواں مناجاتیں

خلوتوں میں عیاں تمنّائیں!
جلوتوں میں نہاں ملاقاتیں

ہائے یہ دل فریب نظارے
ہائے یہ دل نواز برساتیں

ہر سمے اُن کے حُسن کے قصّے
ہر گھڑی ان کے پیار کی باتیں

ہر نظر اعتبار کے قابل،
ہر ادا میں نگار کی گھاتیں

کچھ خطاؤں میں لُٹ گیا موسم
کچھ گناہوں میں کٹ گئیں راتیں

اک قیامت سی ہو گئی برپا،
ہجر کی جب شمار کی راتیں

حُسن سرمایۂ حیات بنیں
آپ کی ایک دو ملاقاتیں

تیرا ہنسنا، گلاب کا ہنسنا،
میرا رونا چمن کی برساتیں

(احسان)

منیر کمال

جون ۱۹۴۲ء
جلد ۲۰
نمبر ۶

فہرستِ مضامین

ایڈیٹر
صلاح الدین احمد
آنریری جائنٹ ایڈیٹر
میراجی

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک وری پی پانچ روپے، ممالک غیر سے دس شلنگ فی پرچہ آٹھ آنے

نیشنل لیبارٹریز لاہور کی شہرت اب پنجاب سے نکل کر ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئی ہے

کیونکہ اس کی بنائی ہوئی تمام چیزیں اپنی عمدگی اور قیمت کی کفایت کے لحاظ سے ولائتی اشیا کو مات کرتی ہیں

نیشنل لیبارٹریز کے اور بیج اور لیمن سکویش عرقیات عطر سینٹ تیل کریم اور دینٹی سیلٹاں سوپ اپنے مقابلے کے ولائتی مصنوعات سے ہزار درجہ بہتر اور قیمتاً میں بھی باکفایت ہیں یہی وجہ ہے کہ تمام معقول دکاندار اس کا سٹاک رکھتے ہیں اور اپنے گاہکوں کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔

شاعر کا مقولہ توڑ دیا گیا دردسر کے واسطے کہتے ہیں صندل ہے مفید اس کا گھسنا اور لگانا دردسر یہ بھی تو ہے صندل آئیل جس کے استعمال سے دائمی دردسر دور ہو جاتا ہے۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے بے نظیر تحفہ ہے۔

سونا سنو پرجلال بادشاہ سے لے کر بے خانماں گدا تک خوبصورتی ہے۔ اس کے چند روزہ استعمال سے کیل چھائیاں۔ جھریاں اور ہر قسم کے داغ دور ہو جائیں گے اور چہرہ چاند کی مانند نکل آئے گا ایک دفعہ ضرور استعمال کریں۔

سول ایجنٹ

بیلی رام اینڈ برادرز سوداگران ادویات انارکلی۔ لاہور



بروولین روغنے

کھانسی اور زکام کو فنا کرتی ہے

خواتین کے لئے

ناول اور افسانے۔

عورتوں کے لئے افسانے ۸ر
تحفے اور دیگر افسانے ۸ر خانم ۱۲ر
شریر بیوی ۸ر شام زندگی ۸ر
شب زندگی کے دو حصے ۸ر
ماہ عجم ۸ر شاہین دراج ۸ر لاشوں کا شہر ۸ر نرملا ۸ر یوسف بخمہ ۸ر
بنات النعش ۸ر یاسمین ۸ر
آئینہ حرم (نظمیں) ۶ر شمع خاموش (نظم) ۶ر آئینہ جمال ۱۲ر

بچوں کے لئے کہانیاں

ولائتی تحفی ۶ر دادا لال بجھکڑ ۸ر بچوں کا انصاف (ڈرامہ) ۳ر حاجی امیر علی ۲ر

منیجر کتب خانہ ادبی دنیا مال روڈ لاہور



پیالہ کا مہمان نوازی

بزمِ ادب

ادبی دنیا کے ناظرین کے لئے یہ خبر دلچسپی کا باعث ہوگی کہ لاہور میں عنقریب ایک اردو کانفرنس منعقد ہونے والی ہے جو پنجاب اور اس کے اکناف میں اردو کے تحفظ و بقا اور اس کی ترقی و ترویج کے اہم مسائل پر غور و خوض کرے گی۔ پنجاب نے جہاں اردو کی خدمت میں غیر معمولی سرگرمی دکھائی ہے وہاں یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ اردو کو اس صوبے میں اب تک وہ مرتبہ حاصل نہیں ہوا جو ہماری قومی زبان ہونے کے اعتبار سے اس کا حق ہے۔ اس کے علاوہ زبان کے مسئلے میں ہمیں چند ایسی مشکلات اور اُلجھنیں بھی درپیش ہیں جو یہاں کے سیاسی اور سماجی حالات و رجحانات کا نتیجہ ہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اخبارات و رسائل مصنفین اور ناشرین، اور دوسرے ہمدردانِ اردو خواہ وہ افراد ہوں یا انجمنیں، اپنی اپنی جگہ اردو کی خدمت اور اس کی حفاظت و ترویج میں کوشاں ہیں، لیکن پیش نظر مسائل کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک اجتماعی کوشش کی جائے بلکہ ایک متحد محاذ قائم کیا جائے۔ مجوزہ کانفرنس سے توقع ہے کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے ہماری رہنمائی کرے گی اور صوبے کے ہمدردانِ اردو جب سر جوڑ کر بیٹھیں گے تو اپنی مشکلات کے حل اور امیدوں کی تکمیل کے لئے کوئی صحیح راہِ عمل تجویز کر کے ہی اُٹھیں گے۔

کانفرنس کے انتظامات کے لئے ایک مجلسِ استقبالیہ کی بنیاد ڈالی جا چکی ہے۔ اور اس کے اراکین میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے ناظرین میں سے جو صاحب اس مقصدِ عالی سے عملی ہمدردی رکھتے ہوں وہ مجلسِ استقبالیہ کی رکنیت حاصل کر سکتے ہیں اور اس غرض سے انہیں سکرٹری پنجاب اردو کانفرنس بالکشن بلڈنگز مال روڈ لاہور سے مراسلت کرنی چاہیئے۔

اشاعتِ زیرِ نظر کے مضامین میں جناب جگن ناتھ آزاد کا قیمتی مضمون اردو کی ایک بلند پایہ مثنوی "رامائن فرحت" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جنابِ آزاد ہمارے ان نوجوان لکھنے والوں میں سے ہیں جنہوں نے قلم اٹھانے سے پیشتر ادبیات کے مطالعہ میں خاص کاوش سے کام لیا ہے اور یہ مضمون اُن کے مذاقِ سخن اور دقتِ نظر کا ایک نہایت روشن ثبوت ہے۔ ہمارے پنجاب میں جہاں اچھے افسانہ نگاروں کی کوئی کمی نہیں، اچھے مقالہ نگاروں کا تو گویا قحط ہے نوجوان مصنف عموماً ریسرچ اور مطالعے سے گھبراتے ہیں۔ حالانکہ یہی وہ عناصر ہیں جن کے خلطِ باہم سے ادبیاتِ عالیہ کی تخلیق ہوتی ہے۔

رامائن ہندوستان کی پاکیزہ ترین روایات کا وہ لازوال سرچشمہ ہے جس کی شیرینی اور لطافت میں زمانے کی ہزارہا گردشیں آج تک کوئی فرق پیدا نہیں کر سکیں۔ سنسکرت کے علاوہ بھاشا اور بھاشا کے بعد ہندی اور اردو اور ہندوستان کی دیگر زبانوں میں یہ انمول خزانہ جوں کا توں موجود ہے، فرحت نے اسے اردو مثنوی کے قالب میں ڈھال کر درحقیقت اردو ادب کی ایک گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔ مثنوی کی زبان اور روانی حقیقتاً قابلِ داد ہے۔ اور یہ آج سے اسّی سال پیشتر کے شرفا کی زبان کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اور اس کا غالباً سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ یہ ان تنگ نظر لوگوں کا ایک جیتا جاگتا اور مسکت جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے ـــــ آزاد نے ہمیں اس بیش بہا تصنیف سے آشنا ہونے کا موقع دے کر ایک نہایت مفید کام کیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ ان کے اس مضمون کو اسی دلچسپی سے پڑھا جائے گا جس کا یہ حقدار ہے۔

عورت مشرق و مغرب میں ایک خیال انگیز مقالہ ہے جو

معنف کے گہرے تفکر، سلجھے ہوئے اندازِ بیان، اور جرأتِ اظہار کا آئینہ دار ہے۔ ریاض احمد صاحب ہماری بزم میں پہلی مرتبہ شریک ہو رہے ہیں۔ اور حقیقت ہے کہ ہمیں اُن کی اس اولین شمولیت سے بے حد مسرت ہوئی ہے۔

جنابِ دیوندر ستیارتھی آخر کار افسانہ نگار بن ہی گئے۔ اور اپنے چوڑے چوڑے شانوں کی مدد سے انہیں ہمارے نئے لکھنے والوں کی پہلی صف میں جگہ مل ہی گئی۔ آٹوگراف بک ایک نہایت دلکش اور کامیاب مطالعہ ہے جس کی بنیاد مصنف کے بوقلموں مشاہدات پر مضبوطی سے قائم ہے۔ ستیارتھی کا طرز اپنی مخصوص مٹھاس اور نرمی کو لئے ہوئے اس افسانے کی ہر ہر سطر سے عیاں ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ ان کی یہ صناعی اُن کے اندازِ تحریر کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جنسیات کی چاشنی سے محروم افسانے بے کیف ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آٹوگراف بک کے مطالعہ کے بعد انہیں اپنی رائے پر نظرِ ثانی کرنی پڑے گی۔

سادھو رام صاحب تاجور سامری اردو کے ایک [illegible]ش گو نظم نگار [illegible] حیثیت سے دنیائے ادب میں خوب متعارف ہیں۔ آج [illegible] انہیں [illegible]ثیل نگار کے بھیس میں دیکھئے اور داد دیجئے کہ اُن کی بد دعاً اپنے زو[illegible] اور لطفِ زبان کے اعتبار سے اُن کے اشعار آبدار سے کسی صورت کم نہیں۔ تاجور صاحب اگر قدرے سُست نہ ہوں تو بڑے کام کے آدمی بن سکتے ہیں۔ پھر کیا ہم امید رکھیں کہ وہ اردو کے لئے ا[illegible] اہلیتوں سے کچھ زیادہ کام لینے کی طرف توجہ فرمائیں گے۔

صلاح الدین احمد

ایک بلند پایہ مثنوی

رامائن فرحت

شعرائے قدیم نے جب تاریخی یا افسانوی واقعات بزم و رزم کو نظم میں بیان کرنا چاہا تو اصنافِ نظم میں ان کی نظرِ انتخاب مثنوی پر پڑی اور یہ میدان اُن کی جولانیٔ فکر کے لئے ایسا موزوں ثابت ہوا کہ ہر زبان کے سخن طراز اس میں اشہبِ فکر کو دوڑاتے چلے آرہے ہیں اور آئندہ بھی ایسے موضوعات کے لئے اس روش سے انحراف ناممکن نظر آتا ہے۔ وسعتِ بیان کے لئے مثنوی مسلّمہ طور پر شاعری کی بہترین صنف قرار دی جا چکی ہے۔ بقول مولانا شبلیؒ انواعِ شاعری میں یہ صنف تمام انواعِ شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے۔ شاعری کے جس قدر انواع ہیں سب اس میں نہایت خوبی سے ادا ہو سکتے ہیں۔ جذباتِ انسانی، مناظرِ قدرت، واقعہ نگاری، تخیئل ان تمام چیزوں کے لئے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا .... ہر قسم کی واقعہ نگاری کا کمال دکھایا جا سکتا ہے۔ مناظرِ قدرت، بہار و خزاں، گرمی سردی، صبح و شام، باغ، جنگل، بیابان، کوہ و صحرا، سبزہ زار وغیرہ کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔ اخلاق، فلسفہ، تصوف کے مسائل نہایت تفصیل سے ادا کئے جا سکتے ہیں"۔ جنابِ عبدالقادر سروری "جدید اردو شاعری" میں لکھتے ہیں "مثنوی اردو ادب کی بہترین اصناف میں سے ہے۔ قافیہ اور ردیف کی قید سب سے کم مثنوی میں رکھی گئی ہے۔ اس لئے دنیا کی بعض طویل ترین لازوال نظمیں اسی صنف میں لکھی گئی ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے بھی اس میں اتنی ہی وسعت ہے جتنی خود کائنات میں ہے"۔

فارسی ادبیات میں مثنویاں بہت کافی تعداد میں موجود ہیں جن میں سے شاہنامہ، سکندر نامہ، شیریں خسرو، حدیقۂ سنائی، بوستاں، ہفت پیکر، ہشت بہشت، مثنوی مولانا روم اور جامِ جم وغیرہ کے نام ہندوستان میں بھی ہر صاحبِ ذوق کی زبان پر ہیں۔ اردو میں میرؔ، سوداؔ، شوقؔ، میر حسنؔ، نسیمؔ، آزادؔ اور حالیؔ کی مثنویاں کافی نام پا چکی ہیں۔ ان میں سے میر حسن اور نسیم کی مثنویوں کو جو ہر دلعزیزی حاصل ہوئی ہے۔ وہ شاید ہی کسی اور مثنوی کو نصیب ہو سکے۔

مختلف انواع کی تصنیفاتِ نظم و نثر میں ایسی مثنویوں کی تعداد بھی کم نہیں جو ملک کے کسی نہ کسی حصے میں اشاعت پذیر ہونے کے باوجود اب تک گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں۔ اور گمان غالب ہے کہ اگر ملکی علم و ادب کی طرف اہلِ وطن کی بے اعتنائی کا یہی عالم رہا تو شاید سالہا سال تک بے شمار نادر اور گراں بہا تصانیف منظرِ عام پر نہ آسکیں۔

فرحت کی رامائن بھی انہیں غیر معروف تصانیف کی ذیل میں آتی ہے۔ اور یہ افسوس کا مقام ہے کہ اس گراں قدر مثنوی کو صوبجاتِ متحدہ کے باہر وہ قدر و منزلت نصیب نہ ہو سکی جس کی یہ مستحق تھی۔

رامائن فرحت ۱۸۶۲ء میں پہلی مرتبہ نولکشور پریس کانپور سے شائع ہوئی اور ۱۹۱۵ء تک چھ بار چھپ کر اس نے صوبجاتِ متحدہ کے قدر شناس طبقہ سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اُسے اُردو کی ایک گمنام مثنوی کہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس مضمون کو دیکھنے والے حضرات اس سلسلے میں میرے ہم خیال ہوں گے۔

مہاراجہ رام چندر ساری دنیا میں بالعموم اور ہندوؤں میں بالخصوص

بہت احترام اور توقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

روشن خیال ہندو بھگوان رام کو ایک بہت مقدس ہستی تصور کرتے ہیں ان کی رائے ہے کہ رام چندر جی ایک آئیڈیل انسان تھے ایسے انسان جن کی تقدیس کی کھاتے ہیں فرشتے بھی قسم۔ لیکن راسخ العقیدہ ہندو سری رام چندر کو ایشور کا اوتار مانتے ہیں۔ منشی شنکر دیال فرحت بھی اسی عقیدے کو ماننے والے تھے۔ لہذا انہوں نے مثنوی کا آغاز اس طرح پر کیا ہے

زباں پر ہر نفس ہے رام کا نام　　نمو رام و نمو رام و نمو رام
سدا روشن چراغ جاں ہو اُن سے　　فروغ مشعل ایماں ہے اُن سے
دوئی سے دور یکتا ہے وہی ذات　　وجود جود و احسان و کرامات
کبھی قالب میں ہے خود صورت دم　　مجسم ہے وہ روح نامجسم
وہی گم ہے وہی ہے آشکارا　　وہی مردم کی عین آنکھوں کا تارا
چراغ آسا جو ذرے سے لگے لَو　　تو مثل نیر اعظم ہو پر تو
کرے گر مثل صندل جبہ سائی　　تو ہو اس گل میں بوئے آشنائی
بیانِ پاک کیا ناپاک سے ہو　　صفت کیا خاک مشتِ خاک سے ہو

قلم تفتیش وحدت کی نہ کیجیو　　یہ وہ دریا نہیں جس کی ملے تھاہ
زمیں صفحہ پہ فرط طرب سے
برائے بندگی جھک جا ادب سے

اس کے بعد بالمیک رشی (مصنف رامائن بزبان سنسکرت) سنت تلسی داس (مصنف تلسی کرت رامائن) کیشو داس اور دیگر شعرائے قدیم کا ذکر آتا ہے۔

مشہور ہے کہ والمیک رشی نے رامائن کا واقعہ رام چندر جی کے ظہور سے بہت پہلے چشم باطن سے دیکھ کر لکھا اور روایت ہے کہ جب چودہ برس کے بن باس کے بعد اجودھیا میں واپسی پر سیتا جی کو دوبارہ غیر معین عرصے کے لئے جلاوطن کر دیا گیا تو بن باس میں انہوں نے والمیک رشی کے زیر سایہ زندگی کے ایام گزارنے شروع کئے۔ لو اور کُش (بھگوان رام کے دو فرزند) مہارانی سیتا کی اس جلاوطنی کے دنوں میں پیدا ہوئے۔ مہرشی والمیک نے انہیں لکھنا پڑھنا سکھایا۔ اور اُن تمام علوم و فنون سے آراستہ کیا جو اُس زمانے میں شاہزادوں کے لئے ضروری سمجھے جاتے تھے کہا جاتا ہے کہ جب اشومیدھ یگیہ کے سلسلے میں لو اور کُش کی سری رام چندر سے ملاقات ہوئی تو انہیں رامائن گزشتہ اور آئندہ زبانی یاد تھی۔ اس واقعہ کو فرحت نے یوں بیان کیا ہے۔

. . . .　　. . . . .

مگر پیش از ظہور جلوۂ ذات　　لکھے مضمون اعجاز و کرامات
جو تھے واقف ہزاروں سال پہلے　　مفصل لکھ دیا احوال پہلے
لکھا ماضی میں استقبال کا حال　　دکھایا روئے معنی کا خط و خال
ہوا بارے ظہور جلوۂ ذات　　وہی صورت، وہی قدرت وہی بات
کھلے سب جوہر آئینۂ دل　　سند ٹھہری وہ دستاویز کامل
وہ پیش آئی جو کی تھی زیب قرطاس　　برنگ نقش پیشانی ہوئی راس

رامائن فرحت گو سحر البیان اور گلزار نسیم کی طرح مشہور نہ ہو سکی۔ لیکن ایک سرسری مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا مرتبہ ان دو مثنویوں سے کچھ بہت کم نہیں۔

جہاں تک انداز بیان کا تعلق ہے۔ یہ مثنوی سحر البیان کی مانند سادہ، رواں اور روزمرہ اور محاورہ کی سخن آفرینیوں سے لبریز ہے۔ لیکن جابجا نسیم کی نازک خیالی، بلند پروازی، شوکت الفاظ اور تشبیہوں کی پختگی سے بھی مزین ہے۔ میں ذرا آگے چل کر اپنے بیان کا ثبوت بہم پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ چونکہ نفس مضمون کے اعتبار سے رامائن فرحت سحر البیان اور گلزار نسیم سے بہت مختلف ہے۔ لہذا اس میں ایسے مضامین بکثرت دستیاب نہیں ہوتے جو مندرجہ بالا دو مثنویوں کے مضامین سے سو فی صدی مشابہت رکھتے ہوں۔ لیکن تینوں مثنویوں کی انفرادی حیثیت سے طوالت کے باعث کہیں کہیں تقریباً ایک ہی قسم کے مضامین مہیا ہو گئے ہیں۔

مثنوی گلزار نسیم پر بحث کرتے ہوئے پنڈت برج نرائن چکبست دیباچہ گلزار نسیم میں لکھتے ہیں سخن شناس جانتے ہیں کہ نسیم نے گو کہ میر حسن کے مقابلے پر مثنوی کہی لیکن بالکل دوسرے رنگ میں کہی۔ کوئی نسیم کو میر حسن کے خرمن کا خوشہ چین نہیں کہہ سکتا۔ اگر وہ اپنے رنگ میں فرد ہیں تو یہ اپنے طرز میں یکتا ہے۔ اگر کلام کی سادگی اور بے تکلفی کا لطف اٹھانا ہے تو میر حسن کی مثنوی دیکھو اگر

سُہ جھکنا سجدہ کرنا۔

باریک بینی اور معنی آفرینی کا رنگ پسند ہے تو گلزارِ نسیم کی سیر کرو دیکھو فراقِ یار میں صدمہ گزرنے کا مضمون ایک ہی ہے۔ دونوں اُستادوں کی طبیعت اس مضمون پر برابر لڑی ہے۔ مگر دونوں کے اندازِ سخن کا خیال کرو۔

میر حسن

دِوانی سی ہر سمت پھرنے لگی　　درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب　　لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
خفا زندگی سے ہونے لگی　　درختوں میں جا جا کے رونے لگی
یہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اُسے　　محبت میں دن رات گھٹنا اُسے
کسی نے اگر بات کی بات کی　　بہن کی جو پوچھی کبھی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے　　کہا خیر بہتر ہے منگوائیے
جو پانی پلایا تو پینا اُسے　　غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے

نسیم

سنسان وہ دم بخود تھی رہتی　　کچھ کہتی تو ضبط سے تھی کہتی
کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں　　آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامہ سے جو زندگی کی تھی تنگ　　کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ
یک چند جو گزری بے خور و خواب　　زائل ہوئی اس کی طاقت و تاب
صورت میں خیال رہ گئی وہ　　ہیئت میں مثال رہ گئی وہ
آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر　　فانوسِ خیال بن گیا گھر

دونوں نے اپنے اپنے رنگ میں حقِ سخنوری ادا کیا ہے۔ میر حسن کے اشعار کا بے ساختہ پن اور سادہ پن دل میں عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے شبِ ہجراں کی بے قراری کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے نسیم کے اشعار ایک دوسری ہی حالت پیدا کرتے ہیں۔ الفاظ کی شوکت، بندش کی چستی، اشعار کی نزاکت، تشبیہوں کی پختگی سے مصنف کا زورِ طبع معلوم ہوتا ہے"۔

اب اسی مضمون پر فرحت کے اشعار ملاحظہ ہوں جب رانی سیتا کو راون اُن کی کٹیا سے رام اور لچھمن کی عدم موجودگی میں اٹھا لے گیا اور انہیں لنکا میں لے جا کر اشوک باٹکا میں نظر بند کر دیا۔ راون نے ہزار کوشش کی کہ کسی طرح سیتا کے دل سے رام کا خیال محو ہو جائے اور وہ اُس کی شاہ بانو بننا منظور کر لے لیکن پاکباز اور عصمت شعار مہارانی نے بدخصال راجے کے خوابِ آرزو کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔ اُن کے دل میں اگر خیال تھا تو رام کا۔ آنکھوں کے سامنے اگر کوئی تصویر تھا تو رام کا۔

یہاں یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل مثال اور پہلی دو مثالوں میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ کہ گلزارِ نسیم اور سحر البیان دونوں خالص جذباتی اور نفسیاتی چیزیں ہیں۔ فرحت کی مثنوی ایک تاریخی واقعہ ہے جس میں مذہبی اور روحانی تقدیس کا عنصر بدرجۂ اتم موجود اس مضمون میں سیتا جی کا بکاولی یا بدر منیر سے مقابلہ ہرگز مقصود نہیں چونکہ مضمون ایک ہی قسم کا نظر آیا ناظرین کی خدمت میں پیش کر دیا۔

جنابِ جانکی با دیدۂ تر　　فراقِ رام میں بیٹھی تھیں مضطر
جو پہلو میں دلِ غمناک دیکھا　　تو رو کر جانبِ افلاک دیکھا
کہا اے چرخ اکید چکر دکھایا　　نجومِ بخت کو گردش میں لایا
بہارِ زیست تھی شوہر کے دم سے　　سو پہ ہندی کی گردش چھٹی قدم سے
یہ بہتر ہے نکل جائے مرا دم　　نہیں ہے تاب قیدِ کلفت و غم
کہا پھر ترجٹا سے اے وفا ساز　　انیس و ہمدم و ہمدرد و ہمراز
نہیں مخفی کوئی اسرار تجھ سے　　بیاں کرتی ہوں اے غمخوار تجھ سے
سہا جاتا نہیں بارِ جدائی　　نہیں ممکن ہے شوہر تک رسائی
ہر اک دم درد ہے غم ہے ستم ہے　　لبوں پر جان ہے تقدیر میں کم ہے

نہ آپ آئے نہ خط آیا نہ پیغام　　نظر آیا نہ کوئی قاصدِ رام
کہوں کیونکر کہ وہ ماہر نہیں ہیں　　یہ اسرار ان سے پنہاں بھی نہیں ہیں
وہ ہیں دانائے رمزِ پردۂ غیب　　سزاوارِ پرستش ہیں بلا ریب
دلِ اقدس مگر برہم ہے مجھ سے　　حقیقت میں حصولِ غم ہے مجھ سے
چھپی یعنی ہیں ہماری سی بدیاں　　نہ گم ہوتی جو رہ جاتی [illegible]
خطا بھی اک مری لا انتہا ہے　　اسی کی مل رہی شاید سزا ہے
کہ یعنی جب شبیہ پاک بن سے　　اٹھا لایا مجھے نیرنگِ فن سے
نہ چھوڑا میں نے ہمدم اس مہ صد افسوس　　اٹھایا سر پہ بارِ غم صد افسوس
سوا اس کے مری ہے اک خطا اور　　نہیں وہ لائقِ بخشش کسی طور
جدا ان سے دلوں رہ کر قدم سے　　ابھی تک سلسلہ توڑا نہ دم سے
اسی پر ہوں جو برہم کیا عجب ہے　　بظاہر یہ تامل کیا سبب ہے

دل کی بے تابی کا اظہار کس قدر صبر و تحمل کے ساتھ کیا ہے۔ یاس کی سیاہ رات میں کبھی کبھی اُمید کی بجلی چمک جاتی ہے اور وہی اس قید تنہائی میں دکھارانی سیتا کی زندگی کا سہارا ہے۔ سیتا جی کا پتی برت دھرم اپنی مثال آپ ہے لیکن مجھے ان اشعار سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ شاعر نے لکھنؤ اور دہلی سکول کا کتنا حسین امتزاج پیش کیا ہے ان اشعار میں سادگی و پرکاری میر حسن اور نسیم کے کمالات کو یک جا کر رہی ہیں۔ بندش کی چستی، الفاظ کی شوکت، اور معنی آفرینی کے ساتھ صورت حالات کا بیان دیکھئے کتنا سادہ ہے اور کس قدر دلکش۔ صنعت آمیزئ فن کے ساتھ کلام کا بے ساختہ پن فرحت کی قادر الکلامی کا بین ثبوت ہے۔

مولانا شبلی شعر العجم میں لکھتے ہیں "مثنوی میں اکثر کوئی تاریخی واقعہ یا کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر زندگی اور معاشرت کے جس قدر پہلو ہیں سب اس میں آجاتے ہیں عشق و محبت، رنج و مسرت غیظ و غضب، کینہ و انتقام۔ غرض جس قدر انسانی جذبات ہیں سب کے سماں دکھانے کا موقع مل سکتا ہے"۔ اب آپ دیکھیں کہ مندرجہ بالا چند اشعار اس کسوٹی پر کس کامیابی سے پورے اُتر رہے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ چند شعر مشتے نمونہ از خروارے نہیں بلکہ خروار میں ایک دانۂ بے مقدار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اب ایک اور مضمون ملاحظہ فرمایئے۔

میر حسن

وہ بیٹھی تھی سج دھج بنائے ہوئے   دل اس چاندنی پر لگائے ہوئے
ادھر آسماں پر درخشندہ ماہ   ادھر یہ زمیں پر مہ چار دہ
[illegible]س دونوں کا جو نہر میں   لگے لوٹنے چاند دو نہر میں
عجب طرح کا حسن تھا جانفزا   کہ مہ رو پری جس کے تھا [illegible]
کروں اس کی پشواز کا کیا بیاں   فقط ایک پشواز آبِ رواں
زبس موتیوں کی تھی سنجاب کل   کہے تو وہ بیٹھی تھی موتی میں تل
اور اک اوڑھنی جون تھا یا حباب   جسے دیکھ شبنم کو آوے حجاب
صباحت صفا اس میں جھلکی ہوئی   پڑی سر پہ کاندھے پہ ڈھلکی ہوئی
گریباں میں تکمہ اس الماس کا   ستارہ سا جنباں کے پاس کا
وہ کرتی وہ انگیا جو اک رنگ کا   نیا باغ اور ابتدائی بہار

جھلک پائنچوں کی دامن سے یوں   کہ روشن ہو فانوس میں شمع جوں
صفائی یہ پوشاک کی دیکھیے   فقط سوزنی بس ہے کہ میلی نہ ہو
وہ ترکیب اور چاند سا وہ بدن   وہ بازو پہ ڈھلکے ہوئے نورتن
جڑاؤ وہ بالے کہ ہالے کا رشک   وہ موتی سے مالے کہ عاشق کا اشک
وہ آنکھوں کی مستی وہ مژگاں کی نوک   کرن پھول کی اور بالے کی جھوک
وہ موتی کا دولڑا وہ موتی کا ہار   سدا اشک شبنم رہے جس پہ نثار
لگا دھکدھکی پچلڑا ست لڑا   سراسر گلے حسن اس کے پڑا
جڑاؤ دمکتی وہ چمپا کلی   رہے جس سے الماس کو بے کلی
تلے اس کے موتی لگے گرد گل   کہ جوں شبنم آلودہ ہو برگ گل
جہانگیریوں کا کروں کیا بیاں   کہ اٹھتی تھی ہاتھوں سے بن بن فغاں
جواہر سے سینے کی ہیکل جڑی   کمر اور کولے کے نیچے پڑی
فقط موتیوں کی کڑی پائے زیب   کہ جس کے قدم سے گہر پائے زیب
کسی کے کہاں ہاتھ وہ پاؤں آئے   جواہر جہاں پاؤں پڑ پڑ کے جائے
سراپا اگر ہوں زباں میرا تن   سراپا میں اس کا کروں کیا سخن
سب اعضا بدن کے موافق درست   ہر اک کام میں اپنے چالاک و چست
جہاں راستی چاہیے راستی   کجی جس جگہ چاہیے واں کجی
وہ چہرا جسے دیکھ مہ داغ کھائے   وہ نقشہ کہ تصویر کو حیرت آئے
جو کچھ چاہیے ٹھیک تک سک سے انگ   نزاکت بھرا سیوتی کا سا رنگ
کچھ اک تمکنت اور کچھ اک بانکپن   غرض ہر طرح میں انوکھی پھبن
کرشمہ ادا غمزہ ہر آن میں   غرض دلبری اس کے فرمان میں
تغافل حیا غمزہ ناز و غرور   ہر اک اپنے موقع پہ وقتِ ظہور
تبسم تکلم ترحم ستم   موافق ہر اک حوصلے کے کرم
وہ ابرو کہ محرابِ ایوانِ حسن   جھکی شاخ نخلِ گلستانِ حسن
نگہ آفت و چشم عین بلا   مژہ دیں صفوں کو الٹ بر بلا
دُرِ گوش جب اس کا تابندہ ہو   صدف کا دل صاف شرمندہ ہو
ہنسی وہ کہ جس کی نہیں کچھ نظیر   ہے انگشتِ قدرت کی سی [illegible] لکیر
وہ رخسارِ نازک کہ ہو جائے لال   اگر اس پہ بوسے کا گزرے خیال
نہیں لب وہ یا لعل کا ہاں کچھ حساب   بیاضِ گلو سب کی سب انتخاب
وہ ساعد وہ بازو بھرے گول گول   برابر ہو الماس کے جن کا مول
وہ دستِ حنا بستہ [illegible] کا باب   شفق میں ہو جوں پنجۂ آفتاب

زبس مثلِ آئینہ تھا اس کا تن   کہے تو کہ تھی ناف عکسِ دہن
کمر کو کہوں کیونکہ ہیں اس کی پیچ   نہ آئے نظر تو ہے قسمت کا پیچ
وہ ساقِ بلوریں وہ انداز پا   پھرے ہے سحر چشم و دل میں سدا
قدِ قامت آفت کا ٹکڑا تمام   قیامت کرے جس کو جھک کر سلام
وہ اٹھکھیلیاں اور وہ اس کی چال   کہ دل جس سے عالم کا ہو پائمال
بنا ایک کبکِ دری گو چال لائے   کہاں پر وہ رفتار کو اس کی پائے
الگ چال اس کی کوئی کیا چلے   یہ انداز سب اس کے پاؤں تلے
عجب پشت پا تھا انگشتِ پا   کوئے یاد کھائے سرِ پشتِ پا

میر حسن جس کامیابی سے جزئیات کی تفصیل میں گئے ہیں وہ قابلِ تعریف ہے لیکن نسیم نے ہر موقع پر اختصار سے کام لیا ہے اور اسی کو کمالِ فن سمجھا ہے۔ اس ساری تفصیل کو نسیم نے ان چھ مصرعوں میں ختم کر دیا ہے۔

دن دن اسے ہو گیا قیامت   بڑھاسی بڑھی وہ سرو قامت
چلتی تو زمیں میں سرو گڑتے   باتیں کرتی تو پھول جھڑتے
خواہاں ہو چشم و ناز اس کے   دہقاں ہوئے خوشہ گاہ اس کے

فرحت اس میدان میں میر حسن کے ہم رکاب ہیں لیکن رامائن کے واقعہ کی طوالت نے انہیں اختصار سے کام لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اس امر کا ثبوت ہیں کہ فرحت کی نگاہ میں جزئیات کی تفصیل کمالِ فن ہے لیکن اس تفصیل کے رستے میں اگر کوئی رکاوٹ ہے تو تاریخی واقعہ کی بجائے خود طوالت ہے۔ افسانہ نہیں کہ حسبِ منشا موڑ توڑ کر سلسلہ جوڑ دیا جائے۔ تاریخ ہند کا ایک طویل باب ہے جس میں رد و بدل کسی طرح ممکن نہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

گئی بن میں وہ محبوبِ زمانہ   زبانِ پُر تکلم پُر فسانہ
وہ رُخ جس پر عروسِ گُل ہو مفتوں   گلستاں صورتِ بلبل ہو مفتوں
روش پر مبتلا کبکِ دری تھی   شرارت جسمِ نازک میں بھری تھی
لباسِ پُر تکلف تن میں پہنے   تنِ خوش رنگ میں پھولوں کے گہنے
بہار آسا رُخِ گلگوں پہ آنچل   کمر میں بار گیسو پڑے بل
غرض گت ناچتی آئی جو بن میں   بہار آئی ہر اک نخلِ کہن میں

گئی بن میں جو وہ غارت گرِ ہوش   تو وحشی ہو گئے از خود فراموش

بہارِ حسن سے کمھلا گئے پھول   غزالے چوکڑی بھرنا گئے بھول

رامائن فرحت کی سب سے بڑی خوبی اس کا اختصار ہے۔ رامائن کا واقعہ درحقیقت بہت طویل ہے لیکن فرحت نے "مغز را برداشتم" کے مصداق جن واقعات کو داستان کے تسلسل کے لئے غیر ضروری سمجھا، انہیں نظر انداز کر دیا۔ مگر اس اختصار کے باوجود نظم کی دلکشی، روانی اور تسلسل میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ پڑھنے والے کو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ فلاں واقعہ فلاں مقام سے حذف کر دیا گیا ہے۔ جہاں کہیں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی ہے، فرحت نے ایک شعر سے اس کمی کو پورا کیا ہے۔ مثلاً جب اپسرا بن سنور کر جنگل میں جاتی ہے کہ ادا و فریب سے شرنگی رشی کو مسحور کر کے مہاراجہ دسرتھ کے محل میں لے آئے تو اپسرا کے حسن و نمائش کی تعریف کے بعد رشی کے محل میں ورود کو فقط ایک شعر میں بیان کر دیا ہے

اسیرِ حلقۂ گیسو ہوا جو دل   ہوئے رکھ محفلِ سلطاں میں داخل

مہاراجہ دسرتھ شرنگی رشی کے ساتھ نہایت ادب و احترام سے پیش آئے لیکن فرحت اس تمام عزت و توقیر اور اس کے نتائج کو دو اشعار سے زیادہ وسعت نہیں دیتے۔

ادب سے اُٹھ کے دسرتھ نے اُٹھالا   پہنایا خوشنما پھولوں کا مالا
بچشم و سر جو کی مہماں نوازی   تو رکھنے کی نگاہِ سرفرازی

اسی رامائن کے ابتدائی اشعار میں ہرن کشپ اور پرہلاد کے واقعہ کو بھی (ضروری سمجھ کر) بیان کر دیا گیا ہے۔ لیکن فقط پانچ اشعار میں۔

ہرن کشپ تھا مغرور بد انجام   سراسر دشمنِ نامِ ہری رام
ہوئے پرہلاد پیدا اس کے گھر میں   ثمر آیا نہالِ بے ثمر میں
سدا ورد زباں تھا ان کو ہر نام   یہی تھا دل میں نقش کالحجر نام
ہوا غصہ دیتِ بد گہر کو   ستونِ سنگ سے باندھا پسر کو
ہوا تب جلوہ نرسنگھ اوتار   کیا شق سینۂ جسمِ ستمگار

جہاں تک اختصار کا تعلق ہے فرحت نسیم سے کسی صورت کم نہیں ہے۔ نسیم نے اگر صحرا کی تصویر ان دو اشعار میں کھینچ دی ہے۔

سایہ کو پتا نہ تھا شجر کا   عنقا تھا نام جانور کا
مرغانِ ہوا تھے ہوش راہی   نقشِ کفِ پا تھے ریگ ماہی

تو فرحت نے جنگل کا منظر ان چار مصرعوں میں پیش کر کے دادِ کلام دی ہے۔

بہارِ لالۂ خودرو عجب تھی ۔۔۔ نگاہِ نرگسِ شہلا غضب تھی
بھرا کلیوں سے سارا دامنِ دشت ۔۔۔ بہارِ جانفزا تھی محوِ گلگشت

راجہ بالی کی موت پر اس کی بیوی اور فرزند نے جس بے قراری اور اضطراب کا اظہار کیا۔ اسے فرحت نے ان تین اشعار میں قلمبند کر دیا ہے۔

سنے اس نے جو شیون سرا کے ۔۔۔ سرِ لاشہ پہ آئی بادلِ زار
تپِ فرقت سے نالاں صورتِ ابر ۔۔۔ چھٹا دستِ خرد سے دامنِ صبر
مچایا نالۂ دُسریادوزاری ۔۔۔ سرشکِ خوں کئے آنکھوں نے جاری

شاہزادے کے غائب ہو جانے پر میر حسن نے پسماندہ لوگوں کی پریشانی کا حال اس صورت پہ نظم کیا ہے۔

کھلی آنکھ جو ایک کی واں کہیں ۔۔۔ تو دیکھا وہاں شاہزادہ نہیں
کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی ۔۔۔ کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی بلبلاتی سی پھرنے لگی ۔۔۔ کوئی ضعف کھا کھا کے گرنے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو ۔۔۔ گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو

ہوا گم جو یوسف پڑی یہ جو دھوم ۔۔۔ کیا خادمانِ محل نے ہجوم
کہا شہ نے واں کا مجھے دیتا ۔۔۔ عزیزو جہاں سو وہ یوسف گیا
گئیں لے وہ شہ کو لبِ بام پر ۔۔۔ دکھایا کہ سوتا تھا وہ سیم بر
مرے نوجواں! میں کہاں جاؤں پیر ۔۔۔ نظر تو نے مجھ پر نہ کی بے نظیر
عجب بحرِ غم میں ڈبویا مجھے ۔۔۔ غرض جان سے تو نے کھویا مجھے

پھول کے غائب ہو جانے پر بکاؤلی کے اضطراب کی تصویر نسیم نے اپنے رنگ میں یوں کھینچی ہے۔

دیکھا تو وہ گُل ہوا ہُوا ہے ۔۔۔ کچھ اور ہی گُل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہیں کدھر گیا گُل ۔۔۔ جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون ۔۔۔ ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے ۔۔۔ بو ہو کے تو گُل اڑا نہیں ہے
آنکھوں سے عزیز گُل مرا تھا ۔۔۔ پُتلی دہی چشم حوض کا تھا
نام اُس کا صبا نہ لیتی تھی ہیں ۔۔۔ اُس گُل کو ہوا نہ دیتی تھی ہیں

گلچیں کا جو ہلے ہاتھ ٹوٹا ۔۔۔ غنچہ کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار! پڑا نہ تیرا چنگل ۔۔۔ مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
او بادِ صبا! ہوا نہ بتلا ۔۔۔ خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے ۔۔۔ گُل تو ہی بتا چہک کدھر ہے

——— میر حسن کے اشعار کا اثر بجلی کی طرح دل میں دوڑ جاتا ہے جو حالت وہ بیان کرتا ہے اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے نسیم کے اشعار زبان کی پاکیزگی اور ترکیبِ الفاظ کی چستی کے لحاظ سے تاثیر کا طلسم بنے ہوئے ہیں۔ ایک کی زینت حسنِ صورت سے ہے۔ دوسرے کی شان حُسنِ معنی سے قائم ہے۔ میر حسن سخن آفریں نسیم معنی آفریں ہیں۔ میر حسن محاورہ اور روزمرہ کے بادشاہ ہیں استعارہ اور تشبیہ نسیم کا حصہ ہے۔" (دیباچۂ گلزارِ نسیم)

اب زیرِ بحث مثنوی کی جانب توجہ کیجئے۔ سری رام چندر جی کو چودہ برس کا بن باس ملتا ہے۔ لچھمن اور سیتا بھی اُن کے ہمراہ جانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ان کا ارادہ دیکھ کر مہاراجہ دسرتھ کے دل کی جو کیفیت ہوتی ہے۔ اُسے فرحت کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔

شہنشہ نے رئیس کی آہ وزاری ۔۔۔ رہا کوئی نہ بہرِ غمگساری
ہوئے آنکھوں سے لختِ دل روانہ ۔۔۔ ملا آنسو بہانے کا بہانہ
جو پہلو میں دلِ محزوں کو دیکھا ۔۔۔ زمیں دیکھی کبھی گردوں کو دیکھا
کہا اے آسمانِ فتنہ پرور! ۔۔۔ کئے کیا کیا ستم جانِ حزیں پر
سمنتِ صاحبِ عقل و خرد سے ۔۔۔ یہ فرمایا کمالِ شد و مد سے
دکھا کر چار دن سیرانِ کو بن میں ۔۔۔ مرے پھولوں کو لے آنا چمن میں

دسرتھ ہندوستان کے مہاراجہ تھے۔ ہر طرف اُن کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ کسی کو مجال و تاب نہ تھی کہ حکم عدولی کر سکے۔ خیال تھا کہ اب بھی سب کچھ حسبِ منشا ہوگا۔ لہٰذا سومنت سے یہ کہہ کر بہت حد تک مطمئن ہو گئے کہ

دکھا کر چار دن سیرانِ کو بن میں ۔۔۔ مرے پھولوں کو لے آنا چمن میں

لیکن جنگل میں دو چار دن پھرنے پھرانے کے بعد جب سومنت نے اُن سے مراجعت کی درخواست کی اور رو رو کر یوں کہا کہ

دمِ رخصت یہ تھا حکمِ شہنشاہ ۔۔۔ رہو تم سایہ ساں قدموں کے ہمراہ
تماشا چار دن دکھلا کے بن میں ۔۔۔ بنے جس طرح سے لانا وطن میں

بس اب تشریف لے چلئے مہاراج! اودھ ہے آپ کے درشن کا محتاج
پھلے سلطاں کا نخلِ زندگانی پڑے سوکھے ہوئے دھانوں میں پانی
ضعیفی میں نہ شہ کو دیجئے داغ وطن کیجئے پھر غیرتِ باغ۔

تو رام نے یہ کہہ کر کہ

قدم راہِ وفا میں دھر چکے ہم بس اب عزم مصمم کر چکے ہم

انہیں لاجواب کر دیا۔ اب چار و ناچار سومنت تنہا اجودھیا واپس آئے۔

ہوئے آکر وہ پابوسِ شہنشاہ کہی سب داستانِ رنج جانکاہ

مہاراجہ دسرتھ اس وقت تک تو امید و یاس کی کشمکش میں تھے لیکن اب سومنت کی تنہا واپسی نے اُن کی رہی سہی امید دل کا خاتمہ کر دیا۔ دنیا نگاہوں میں تاریک نظر آنے لگی اور ہندوستان کا چکرورتی مہاراجہ بے بسی کے عالم میں سراپا اضطراب کی تصویر بن گیا۔ اب نسیم کی پُرکاری، اور میر حسن کی سادگی فرحت کی زبان سے ملاحظہ فرمایئے اور ساتھ ہی اندازِ بیان کے اختصار پر بھی غور کیجئے۔

دلِ پُر غم میں رقت نے کیا جوش ہوا سلطاں خموش از خود فراموش
کمالِ ضعف سے دو تین دن تھا وہ دم گویا کہ وقتِ واپسیں تھا
جنابِ رام کی تھی انتظاری رہا کرتا تھا محوِ دم شماری
فقط جہاں تھا وہ دیوانۂ رام چراغِ صبح تھا پروانۂ رام

فراقِ رام میں بھر بھر کے آہیں سرک سوئے فلک سے کہیں نگاہیں
غرض رو رو کے چھوڑا قالبِ خاک سوئے سرگ گئی روحِ تن پاک

صاحب شعر العجم نے حسنِ ترتیب کو مثنوی کی پہلی خوبی بیان کیا ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں شاعر کو کسی تاریخی واقعہ میں جو مسالہ ہاتھ آتا ہے وہ صرف چند اجمالی، خام اور غیر مرتب واقعات ہوتے ہیں۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ اُس نے داستان کا خاکہ کیونکر قائم کیا وغیرہ وغیرہ۔

یہ اصول کہ وہ اجمالی، خام اور غیر مرتب واقعات ہوتے ہیں سحر البیان اور گلزار نسیم پر تو عاید ہو سکتا ہے کیونکہ وہ دونوں فرضی افسانے ہیں۔ لیکن رامائن فرحت پر نہیں۔ کیونکہ اس کا ماخذ ایک مستند تاریخی کتاب ہے جو اُس زمانے سے آج تک تقریباً محفوظ حالت میں چلی آئی ہے۔ کیریکٹر کے متعلق علامہ شبلی قمطراز ہیں "شاعر کا کمال یہ ہے کہ جس شخص کا بیان کرے۔ اُس کے تمام امتیازی خصوصیات کو قائم رکھے ...... ہر شخص کا ایک خاص کیریکٹر قائم کیا جائے۔ اور جہاں کہیں اس شخص کا ذکر آئے یہ کیریکٹر بدلنے نہ پائے۔ کم سے کم یہ کہ ایسی کوئی بات نظر نہ آئے جو قائم کردہ کیریکٹر کے خلاف ہو۔"

اگر اس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو میر حسن اور نسیم دونوں کی مثنویوں میں خامیاں موجود ہیں۔ مختلف واقعات کو بیان کرتے ہوئے وہ وہاں کے لوازمات کے اثر سے اس قدر مغلوب ہو گئے ہیں کہ انہیں قائم کردہ کردار کی خصوصیات کا خیال ہی نہیں رہا نسیم نے مثنوی کے ابتدائی اشعار میں زین الملوک کے بیٹوں کے متعلق کہا ہے۔

خالق نے دیئے تھے چار فرزند[1] دانا، عاقل، ذکی، خردمند

لیکن شاہزادوں کی دانائی، عقل، ذکا اور خردمندی کا یہ عالم ہے کہ

دو ہاتھ میں چار دل اس نے لوٹے پنجے میں پھنسے تو چھکے چھوٹے
ایک ایک سے رات بھر چھوٹا پو پھٹتے ہی جگ انہوں کا ٹوٹا
زنداں کو چلے مچل مچل کر زندوں کی طرح بھسن جل کر

اب میر حسن کی مثنوی کو لیجئے۔ بادشاہ کے وزرا بادشاہ سے یوں خطاب کرتے ہیں۔

عجب کیا کہ ہووے تمہارے خلف کرو تم نہ اوقات اپنی تلف

"تم" اور "تمہارے" عام بول چال کے الفاظ ہیں۔ شاہی درباروں میں گفتگو کا یہ طریقہ نہیں ہوتا اور خاص کر وزرا تو ان الفاظ میں کبھی بادشاہ کو خطاب نہیں کر سکتے۔ لیکن ان خامیوں پر چشم پوشی ضروری ہے ہر شخص ہر چیز سے مکمل طور پر واقف نہیں ہو سکتا۔ اسی ناواقفیت کے باعث بڑے بڑے شعرا کا کلام بھی ان کمزوریوں سے پاک نہیں ایران کے ملک الشعرا نظامی دارا کے خط میں جو اُس نے سکندر کے نام لکھا لکھتے ہیں۔

وگرنہ چنانت دہم گوش پیچ کہ دانی تو ہیچی و کمتر ز ہیچ

شاہانہ آداب داطوار اور اندازِ گفتگو میں "گوش پیچ" کا استعمال قطعاً بے جا اور غیر ضروری ہے۔

---

[1] چار کی رعایت سے اوصاف بھی چار قائم کئے ہیں۔ (ر)

فرحت نے ایسے موقعوں پر بھی اپنے آپ کو اس کمزوری سے دور اور بلند رکھا ہے۔ لنکا کے راجہ راون کے نام مہاراجہ رام چندر جی کے خط کا ذکر کرتے ہوئے فرحت لکھتے ہیں۔

طلب فرما کے کلکِ عنبر افشاں کیا خطِ زیبِ قرطاسِ زر افشاں
کہ اے سر حلقۂ سردارِ لنکا! شہِ دربارِ گوہر بارِ لنکا!
بہم شاہی ہے تدبیرِ خرد سے کہ ہے واقف جہاں نیک و بد سے

اور راون نے اس مکتوب کا جو جواب لکھا اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے۔

لکھا اے سرورِ دانش پسنداں فہیم و سرگروہِ عقلمنداں

شہزادہ بے نظیر ابھی شہزادگی کی حالت میں تھا کہ بدر حسن نے اسے شہِ بے نظیر کہہ دیا۔

گیا حوض میں جب شہِ بے نظیر پڑا آب میں عکسِ ماہِ منیر

لیکن فرحت نے اپنے قائم کردہ کیریکٹر کو بدلنے نہیں دیا۔ اس نے کردار کے اتحاد کو شروع سے آخر تک بطرزِ احسن نباہا ہے مثلاً بھگوان رام کا ذکر جہاں بھی آیا ہے انہیں انتہائی طور پر سنجیدہ متین، صابر، بردبار، شہ زور، اور بہادر بیان کیا ہے اُن کے روزِ پیدائش سے ہی فرحت نے

جبیں سے جلوۂ اعجاز پیدا تبسم سے نیا انداز پیدا
خطِ لوحش جہاں بخشندۂ غیب جلا بخشِ رموزِ پردۂ غیب
نمایاں قدرتِ کامل جبیں سے شجاعت جلوہ گر ابرو کی چیں سے

کہہ کر اپنے لئے ایک معیار مقرر کر دیا اور آخر تک اسے پیشِ نظر رکھا ہے۔ لچھمن جی میں شجاعت، جوانمردی، بلند اخلاقی سب اوصاف تھے۔ لیکن ان میں اور رام میں نمایاں فرق یہ تھا کہ لچھمن تیز مزاج تھے۔ فرحت نے اس حقیقت کو کہیں بھی فراموش نہیں کیا۔ اور جا بجا حسبِ ضرورت اُن کے اس وصف کا اظہار کھلے طور پر کیا ہے۔

غرض جب وحشی انسانوں کے مظالم سے تنگ آکر سوامی بسوامتر مہاراجہ دسرتھ کے پاس آئے اور بھگوان رام اور لچھمن کو اپنی حفاظت کے لئے ہمراہ لے گئے جنگل میں جا کر اُن کی تاڑکا سوباہ اور ماریچ سے لڑائی ہوئی۔ راکھشسوں نے جس قدر شور و شر برپا کیا رام نے اسی قدر صبر و تحمل سے کام لے کر ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جنگل میں رام اور لچھمن کی آمد کی خبر پا کر تاڑکا دیونی بہت غضبناک ہوئی اور لگی قیامت برپا کرنے۔

مچایا شور و شر ہو کر غضبناک اڑائی دشت میں چاروں طرف خاک
وہ مارا رام نے تیرِ سبک سیر گرا دھڑ سے تنِ بے جاں بہ یک تیر
سوباہِ فتنہ گر پہنچا جفا کیش کیا زیر و زبر جس دم ہوا پیش
بنایا تو وہ خاک اس کو پل میں سلایا یعنی آغوشِ اجل میں
خبر ماریچ راکھشس نے جو پائی تو پہنچا صورتِ تیرِ ہوائی
جنابِ رام نے ناوک وہ مارا لبِ قلزم گرا جا کر صف آرا

راجہ بالی کو کیفرِ کردار کو پہنچانے کے بعد بھگوان رام نے پمپاپور کا تاج و تخت اس کے بھائی سگریو کے حوالے کیا۔ سگریو نے بھگوان رام سے سیتا جی کی تلاش میں امداد کا وعدہ کیا۔ لیکن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ تاج و تخت پا کر سگریو کاروبارِ سلطنت اور عیش و عشرت میں ایسا مشغول ہوا کہ اُسے اپنے وعدے کا خیال نہ رہا۔

ہوا سرگرم کارِ بادشاہی رہا محوِ بہارِ بادشاہی
بہارِ عیش و عشرت کا جما رنگ کہیں طبلہ کہیں تھا نغمۂ چنگ
خوشی سے جامۂ تن میں گیا پھول وہ اقرار و قسم دل سے گیا بھول

سری رام چندر جی کو سگریو کے طریقہ کار پر بہت افسوس آیا اور لچھمن سے کہا

کہو سگریو سے جا کر کے بھائی یہی شایاں ہے رسمِ آشنائی
درِ مقصد نہ مطلق ہاتھ آیا سراغِ جانکی اب تک نہ پایا
نہیں اچھی ہے یاں مردوں کو سستی وفائے وعدہ میں لازم ہے چستی

بھگوان رام نے ایسے کڑے وقت میں بھی دامانِ صبر و حلم کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ فرحت نے نظم کے آغاز میں رام اور لچھمن کے کردار کا جو معیار قائم کیا ہے اُسے اس نے کہیں بھی نظر انداز نہیں کیا جس طرح ان تین اشعار میں رام کے تدبر اور حلم کا اظہار کیا گیا ہے اسی طرح مندرجہ ذیل اشعار میں لچھمن کی تیز مزاجی ملاحظہ کیجئے کردار کا اتحاد داستانِ فرحت میں شروع سے آخر تک موجود ہے۔

قدم چھو کر چلے لچھمن سوئے شہر جبیں سے آشکارا جلوۂ قہر
تو بہرِ مقدمِ لچھمن جو پائی گیا راجہ برائے پیشوائی
تنِ سگریو کانپا صورتِ بید گرا جا کر قدم پر با صد امید

غبارِ پا کو ماتھے پر لگایا   قدم پر سر بہ چشم و سر جھکایا
کہا لچھمن نے اے سگر بونادان   یہی ہے شیوۂ عالی نژاداں
مئے عشرت سے ہو کر مست مخمور   تو دل سے کیا پاسِ سخن دور
جنابِ رام کے احساں کو بھولا   بہارِ جشنِ سلطانی پہ پھولا
یہی جب تھا اے احساں فراموش   بہ رنگِ شمع بیٹھا بن کے خاموش
خبر کچھ جانکی جی کی نہ لایا   نہ آئینہ کی صورت منہ دکھایا
جنابِ رام نے شاہی عطا کی   عطائے تازہ پر تو نے خطا کی
یہی تھا جب سے اے برگشتہ تقدیر   کروں تجھ کو اسی دم کشتۂ تیر
اتاروں فرق نخوت سے ترے تاج   کروں تختِ خلافت تاخت و تاراج

جب سیتا جی نے سنِ بلوغت میں قدم رکھا تو راجہ جنک کو ان کی شادی کی فکر دامنگیر ہوئی سوئمبر کا واقعہ بہت مشہور واقعہ ہے۔ لہٰذا تفصیل میں جانا بے سود ہے۔ مختصر یہ کہ جب بڑے بڑے شہ زور سرداروں سے دھنش (کمان) اٹھایا جا سکا تو راجہ جنک کو بہت افسوس ہوا۔ اور حاضرینِ محفل سے کہنے لگے کہ آپ کی بہادری اور جوانمردی دیکھ کر میری امیدوں پر پانی پھر گیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم میں سے کوئی شہ زور اس بوسیدہ کمان کو توڑ سکے گا۔ اور میں اپنی بیٹی اس سے بیاہ دوں گا لیکن اب سیتا کو تمام عمر کنوارا رہنا پڑے گا۔ یہ سن کر لچھمن کو طیش آ گیا لیکن رام اس تقریر سے قطعاً غیر متاثر رہے۔ حالانکہ آہنی کمان کو توڑنا ان کے لئے بازیچۂ اطفال سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔

سری لچھمن اٹھے جوشِ غضب سے   سری رگھناتھ سے بولے ادب سے
بدولت آپ کے حاصل ہو گر زور   کرے ہے جس کا میداں بحرِ پر شور
بہ تسلیم ہے پشتِ جہاں خم   ہلال آسا ہے قوسِ آسماں خم
اگر ہو مرضیِ اقدس تو جاؤں   جہاں کو جلوۂ قدرت دکھاؤں
کماں کو توڑ کر پھینکوں فلک پر   چھٹے لرزہ تنِ جن و ملک پر
سرِ ناخن پہ از راہِ صفائی   اٹھا لوں صورتِ رنگِ حنائی
جنابِ رام نے ہنس کر نظارا   دکھایا اپنے ابرو کا اشارا
وہ بیٹھے ہوئے لب چشمۂ ہیں پہ   رخِ شفاف پر ابرو کی چیں پہ
میانِ گوشۂ پہلو دل آسا   بٹھایا لطف سے ہنس کے دلاسا

جب بھگوان رام نے آہنی کمان کو ہاتھوں میں اٹھاتے ہی توڑ دیا تو شکست کی آواز سن کر کمان کے مالک پرسرام فی الفور وہاں پہنچے کمان کی حالت دیکھ کر وہ غصے سے لال ہو گئے اور حاضرینِ محفل میں سے ایک ایک کو للکارنے لگے کہ جس نے اس کمان کو توڑا ہے۔ وہ محفل سے باہر نکل آئے تا کہ اُسے شجاعت اور زور آوری کا مزا چکھا دوں۔

کہا شاہِ جنک سے اے جفاکار   کیا کیا فتنۂ محشر نمودار
ترا نابود تخت و تاج کر دوں   جنک پور کو ابھی تاراج کر دوں
مناسب ہے یہی اے فتنہ ایجاد   مٹا دوں سلطنت کی بیخ و بنیاد

باوجودیکہ رام شجاعت اور جوانمردی میں پرسرام سے کئی گنا زیادہ تھے۔ لیکن اس موقع پر انہوں نے جس صبر و تحمل سے کام لیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

گزارش کی ادب سے اے نکوکار   نہیں شاہِ جنک ہرگز خطاوار
خطا کی، صاحبِ تقصیر ہوں میں   بلا شک واجب التعزیر ہوں میں
مجھے جو چاہیے کہئے مہاراج   کہ ظلِ امن و دولت ہیں یہاں آج

لچھمن اور پرسرام تیز مزاجی اور غیظ و غضب میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ پرسرام کی سخت کلامی پر لچھمن مشتعل ہو گئے۔ اور انہیں اسی طرح جواب دینا شروع کر دیا۔ فرحت نے لچھمن اور پرسرام ان دونوں کے کیریکٹر کے اتحاد کو یوں نبھایا ہے۔

سری لچھمن نے فرمایا عجب ہے   شکستِ قوس پر جوشِ غضب ہے
جنک کا پاس ہی رگھناتھ جی کا   نہیں جرم اس میں دونوں میں کسی کا
زبس قوسِ کہن تھی کرم خوردہ   پڑی تھی صورتِ بسمل فسردہ
کھنچے تھے خود بخود گوشے کماں کے   جدا تھے بند بند اس ناتواں کے
بچی بارِ نقاہت سے جو ٹوٹی   اگر سچ پوچھئے سختی سے چھوٹی
گراں تھی زندگی سینے میں تھا جوش   ہوئی اب ناتوانی سے سبکدوش
مقامِ حیرت و جائے عجب ہے   عتابِ بے سبب کا کیا سبب ہے
بصد جوشِ غضب بولے پرسرام   کہیں برگشتہ ان دونوں کے ایام
بڑے کو کچھ ادب مدِ نظر ہے   مگر چھوٹا بنائے شور و شر ہے
بظاہر خوشنما، باطن میں ہے قہر   سبوئے زر میں ہو جس طرح سے زہر
اگر کر بات میں لیتا ہے دل کی   مگر خواہش ہے پیکانِ اجل کی
متاعِ زندگانی ہو جو درکار   نظر سے دور ہو جائے گنہگار

کہا لچھمن نے اے پیرِ خردمند! بس اب اپنی آنکھیں کیجئے بند
جہاں آنکھوں سے گویا دور ہو جائے سحر مثلِ شبِ دیجور ہو جائے
کہا دیکھو وہ پھر گرمِ سخن ہے ابھی تک ہر ادا میں بانکپن ہے
نہایت بے ادب ہے طفلِ گمراہ نہیں شاید مری طاقت سے آگاہ
مجھے سیدھا برہمن جانتا ہے تبر مطلق نہیں پہچانتا ہے
تبر وہ ہے کہ جس نے سر تراشے عقابِ موت کے شہپر تراشے
مٹا کر راجھسانِ اہلِ کیں کو کیا صاف اس نے دامانِ زمیں کو
نہیں معلوم کیا اے شوخ پُر فن کہ نسلِ کھشتری کا ہوں میں دشمن
کہا لچھمن نے بس طاقت عیاں ہے دلیری تندیِ خو سے عیاں ہے
سنے جب یہ کلامِ عبرت انجام تو خورشیدِ غضب آیا لبِ بام
تبر بجلی سا چمکا یا کڑک کے کہا یوں صورتِ آتش بھڑک کے
جھلک اس کی نگاہِ شر تو دیکھو! جبیں پر چین ہے تیور تو دیکھو
بہت کی درگذر میں نے پر افسوس جدا ہوتا ہے دم بھر میں سر افسوس
مری ہرگز نہیں ثابت ہے تقصیر قضا ہے اس کی طوق آسا گلوگیر
اسے خود خواہشِ جامِ اجل ہے سخن گویا یہ پیغامِ اجل ہے
سری لچھمن قضا را مسکرائے پرسرام اور بھی غصہ میں آئے
کہا اب تک وہی بل ہے وہی بات وہی چتون وہی تیور وہی گات
مجھے در پردہ سنتا ہے یہ گستاخ قلم سر اس کا ہوگا صورتِ شاخ
بڑھاتا ہے یہ اک جوشِ تعصب اور سوا ہوتا ہے رہ رہ کر غضب اور

ان اشعار میں کیریکٹر کا اتحاد جس انداز سے نمایاں ہے اس کی توصیف میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے لیکن ساتھ ہی یہ اشعار بہت حد تک مکالمے کی سادگی۔ الفاظ کی موزونیت اور بندشوں کی برجستگی پر روشنی ڈالتے ہیں جو مثنوی میں اول سے آخر تک فرحت کے کلام کی خاصیتیں رہی ہیں۔ جہاں تک مکالمہ کے اختصار کا تعلق ہے نسیم سے زیادہ بلندی پر شاید ہی کوئی پہنچ سکے نسیم نے اس سلسلے میں واقعی دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

بولا وہ کہ خواب دیکھتا تھا آتش پہ کباب دیکھتا تھا
بولی وہ کہ ہم بتائیں تدبیر دل سوزی کرے گا کوئی دلگیر
بولا وہ کہ رات کو افق میں خورشید تھا آتشِ شفق میں
بولی وہ کہ مہر سے شب اندوز عالم میں رہو گے رونق افروز
بولا وہ کہ اک مقام ہو تھا گلزارِ خلیل رو برو تھا
بولی وہ کہ بشر ہو تم دلاور سرسبز ہو قوم آتشی پر
بولا وہ دیکھی اک شبستاں شعلہ سا انگن میں رقصاں
بولی وہ کہ شعلہ میں پری ہوں جو ناچ نچاؤ ناچتی ہوں
بولا وہ کہ جب ہوا اُجالا بخشا مہِ انجمن نے ہالا
ہالہ مہِ انجمن کا کیا تھا وہ ہار تھا جو گلے پڑا تھا
گھبرائی پری کہ ہیں یہ کیا ہے بولا وہ کہ ہار تو لکھا ہے

لیکن فرحت کے کمال سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ "رامائن" میں جس قدر بھی مکالمے ہیں سب اپنی نظیر آپ ہیں۔ سر دست ایک اور مختصر سا مکالمہ ملاحظہ ہو۔ مہارانی سیتا اشوک باٹکا میں نظر بند تھیں۔ ہنومان بھگوان رام کا قاصد بن کر ان کی خدمت میں پہنچا۔ جب دونوں کی ملاقات ہوئی تو مہارانی سیتا فریاد و زاری کے بعد ہنومان سے یوں مخاطب ہوئیں۔

بھلا یہ تو کہو اے انجنی زاد! مری بھی وے کرتے ہیں کبھی یاد
پون سُت نے کہا اے فخرِ عالم کئی درجہ سوا ہے رام کو غم
فغاں ہونٹوں پہ دل میں شدتِ درد رواں صحرا بہ صحرا ہیں جہاں گرد
نہیں گو فرقتِ یک دم گوارا مگر تھا جز شکیبائی نہ یارا
سنیں گے آپ کی جب مجھ سے روداد خوشی سے خانۂ دل ہوگا آباد
چڑھیں گے لے کے اک فوجِ گراں وہ دکھائیں گے بہارِ جاوداں وہ

سنے سیتا نے جب یہ کلمۂ ہوش ہوئیں عیش و طرب سے دوش بر دوش
دلِ پُر غم سے نکلا غم کا آزار ہوئیں پھر فرطِ حیرت سے گہربار
تمہیں سے جملہ زور آور وہاں ہیں زیادہ اس سے باجوشِ قلب جواں ہیں
پون سُت نے کہا فرطِ ادب سے کہ میں زور آوری میں کم ہوں سب سے
وہاں پہ جملہ جرار و جری ہیں نہنگِ قلزمِ زور آوری ہیں

کہا قاصد نے اے فخرِ زمانہ! کئی دن سے ہوں میں بے آب و دانہ
اجازت ہو تو اس گلشن میں جاؤں بقدرِ اشتہا پھل چن کے کھاؤں
کہا ہنس کر کہ اے راحتِ جاں! ہزاروں اس کے گلشن میں نگہباں
کہا مجھ کو نہیں خوفِ زیاں ہے مدد کو خالقِ ہر دو جہاں ہے

شاعری دل کے جذبات کا اظہار ہے۔ زندگی کیا ہے۔ احساسات و جذبات کا مجموعہ جس میں عیش و مسرت اور رنج و غم دونوں موجود ہیں احساسات اور جذبات کی مصوری منظر نگاری سے زیادہ لطیف و نازک ہوتی ہے۔ اس کا اثر فقط دل و دماغ تک ہی محدود نہیں رہ جاتا بلکہ رُوح کی گہرائیوں تک پہنچتا ہے۔

میر حسن کی جذبات نگاری کا ایک نمونہ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ایک اور ذیل کے اشعار میں دیکھئے۔

وہ شب اس کو اندوہ و غم میں کٹی   گھڑی جو کٹی سو الم میں کٹی
کچھ امید دل میں کچھ اک دل میں یاس   لبوں پر ہنسی لیک چہرہ اُداس

لگی رہنے نپ جانِ بیتاب میں   لگا فرق آنے خور و خواب میں
خموشی اٹھانے لگی دل میں شور   جتانے لگی ناتوانی بھی زور

اب فرحت کی جذبات نگاری کی چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں۔

فراقِ رام میں با دیدۂ زار   برنگِ ابرِ نیساں تھی گہربار
سراسر جامۂ تر کا نہ تھا ہوش   کبھی گریاں کبھی رقت سے خاموش
کبھی سوئے فلک حسرت سے تکنا   اگر چپکے نہ رہ سکنا سسکنا

ایک اور تصویر دیکھئے۔

سنا راون نے احوالِ برادر   ہوا محوِ فغاں با دیدۂ تر
گریبانِ شکیبائی کیا چاک   گرا فرشِ زمیں پر صورتِ خاک
کہا اے قوتِ بازو کہاں ہے   کدھر تو چشمِ ظاہر سے نہاں ہے
ترے بن ہے ہجومِ دردِ دلِ زار   زمانہ ہے نظر میں تیرہ و تار
کیا راون کو تیرِ غم سے خستہ   بنایا طائرِ بازو شکستہ

جب بھگوان رام اور لچھمن مہارانی سیتا کی تلاش میں پھرتے پھراتے صحرائے پنپا پور میں پہنچے تو وہاں ہنومان کے ذریعے اُن کی دکن کے راجہ سگریو سے ملاقات ہوئی۔ سگریو بھی رام اور لچھمن کی طرح گردشِ چرخ کے ہاتھوں سخت نالاں تھا۔ بھگوان رام نے اُس کی پورے طور پر امداد کی اور سگریو کو کھویا ہوا تاج و تخت اس کے ظالم اور جابر بھائی بالی کے ہاتھ سے واپس دلوا دیا اور سگریو سے یہ کہہ کر

نہ ہونا دولتِ دنیا پہ مغرور   کہ تا شمعِ خلافت میں رہے نور
رعیت کو کرم سے شاد رکھنا   میانِ گوشۂ دل یاد رکھنا

خود لچھمن سمیت پہاڑ کی جانب چلے گئے۔ جب وہ روانہ ہونے لگے تو سگریو نے اُن سے وعدہ کیا کہ برسات ختم ہو جانے کے بعد میں مہارانی سیتا کی تلاش میں نہایت سرگرمی اور تندہی سے آپ کی امداد کروں گا۔ اور خدا نے چاہا تو ضرور مقصد میں کامیابی ہو گی۔

لیکن مہارانی سیتا کی فرقت ایسا جانکاہ صدمہ تھا کہ اُس نے انہیں برسات میں دم بھر کے لئے بھی چین نہ لینے دیا۔ فرحت نے اس تمام کیفیت کو جن الفاظ میں قلمبند کیا ہے اُس کی صحیح تعریف ممکن نہیں۔ موسمِ برشگال کی آمد اور رام اور لچھمن کے جذبات کی تصویر جن الفاظ میں فرحت نے کھینچی ہے اسی کا حصہ ہے۔ واقعہ نگاری، جذبات نگاری، جزئیات کی تفصیل ان سب کا کمال مندرجہ ذیل اشعار میں یکجا ملاحظہ فرمائیے۔

ہوائے موسمِ گرما جو بدلی   تو ابرِ تر نے بارش کی سندلی
ہوئے نخلِ کہن تازہ چمن میں   جوانانِ چمن پھولے بدن میں
معنبر تھی زمین چادرِ عرش   ہر اک سو سبزۂ خود رو کا تھا فرش
ہر اک جانب بہارِ لالہ و گل   صدائے قمری و آوازِ بلبل
پئے نظارۂ کیفیتِ عام   خراماں تھے جنابِ لچھمن و رام
جو دیکھا آسمانی خیمۂ ابر   بڑھا دریائے بیتابی گھٹا صبر
طپش دیکھی جو برقِ برشگر کی   تو شدت ہو گئی دردِ جگر کی
بھری جھیلیں نظر آئیں جو یکسر   بھر آئے چشمۂ چشمِ منور
جنابِ جانکی جی کی ہوئی چاہ   کئے نالے تپ و غم سے بھری آہ
کہیں بلبل کو دیکھا گل سے ہمدوش   کہیں قمری صنوبر سے ہم آغوش
کہیں طوطی خوشی سے تر زباں تھی   صدائے نغمہ میں رطب اللساں تھی
کہیں پر قیدِ غم سے ہو کے آزاد   اکڑ دکھلا رہے تھے اپنی شمشاد
کہیں نسرین کہیں شبو کی بو تھی   ہوائے عنبر آگیں چار سو تھی
ہجومِ مرغِ خوش آواز دیکھے   چکوروں کے خرامِ ناز دیکھے
کہیں پر عین شوخی سے سرِ دست   اشارے کر رہی تھی نرگسِ مست
چنبیلی سے بہارِ جاں فزا تھی   کہیں البیلے بیلے کی فضا تھی
نشیلی آنکھیں سرخی کو دکھائے   کھلے تھے چشمِ نرگس کو کٹوارے
ہوئی دل میں دوبالا شدتِ درد   وہ رنگِ عارضِ تاباں ہوا زرد

جمالِ گل تھا ماہ آنکھوں میں اُن کی — خزاں تھی سب بہار آنکھوں میں اُن کی
چڑھا نالوں دل پہ بحرِ نالہ و رنج — رہے برسات بھر جوشش و پیچ

واقعہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں "شاعری کی اقسام میں ایک قسم واقعہ نگاری ہے یعنی شاعر خارجی واقعات کی تصویر کھینچتا ہے۔ لیکن اس حیثیت سے نہیں کہ فی نفسہ وہ کیا ہیں۔ بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ ہمارے جذبات پر کیا اثر ڈالتے ہیں شاعر ان اشیا کے سادہ خط و خال کی تصویر نہیں کھینچتا بلکہ ان میں قوتِ تخیل کا رنگ بھرتا ہے۔"

سری رام اور لچھمن سوامی بسوامتر کی ہمراہی میں جنک پور میں تشریف لائے۔ اور راجہ جنک کے مہمان ہوئے۔ صبح کے وقت دونوں بھائی گلگشت کے لئے باہر نکلے۔ اُن کی سیرِ چمن کا نظارہ فرحت کے آئینۂ تخیل میں دیکھئے۔

صبا صدقے ہوئی لطفِ روش پر — زمیں میں گڑ گئے سرو و صنوبر
ہوا قد دیکھ کر نخلِ سہی پست — شرابِ دید سے نرگس ہوئی مست
شجر ملتے تھے باہم دستِ افسوس — جوانانِ چمن پر پڑ گئی اوس
کھلی حیرت سے چشمِ چشمۂ آب — دلِ ہر حوض امڈا ہو کے بیتاب
جدھر وہ نخلِ قد سایہ فگن تھے — ہجومِ عندلیبانِ چمن تھے۔

جنک پور کی تصویر دیکھئے۔

جنک پور ایک تھا شہرِ طرب خیز — دل آرا، دلکشا، دلکش، دلآویز
نظیر اُس کا نہ تھا باغِ جہاں میں — ایسا تھا کشورِ ہندوستاں میں
عمارت صاف آئینہ کی صورت — مثالِ چشمِ باطن بے کدورت
چمن سرسبز و شاداب و مطرّا — غبارِ گرد و کلفت سے مبرّا
بھرا چشموں میں آبِ زندگانی — تصدق جس پہ ہو نیساں کا پانی

بھگوان رام کے ہاتھ سے آہنی کمان کی شکست۔

دھنک کو توڑ کر پھینکا زمیں پر — اندھیرا چھا گیا عرشِ بریں پر
ہوا آثارِ محشر مچ گیا شور — چھپے گوشوں میں مرغ و ماہی و مور
درندے چھپ رہے سب جی چھپا کر — پرندے اڑ گئے اوجِ ہوا پر
پرندوں کے اڑے ہاتھوں کے طوطے — یکایک چونک اٹھے دریا کے سوتے
رخِ خورشید پر زردی سی چھائی — قمر کے منہ پہ اڑتی تھی ہوائی
یقیں تھا تختۂ گردوں پلٹ جائے — زمیں شق ہو قمر دو شقہ ہو جا

محاکاتی شاعری کی ایک مثال اور ملاحظہ کیجئے۔ ولیعہد کی جلاوطنی کی خبر نے اہلِ ایودھیا کو دانۂ اسپند کی مانند تڑپا دیا۔ جب رام لچھمن اور سیتا بن باس کو روانہ ہونے لگے۔ تو سارا شہر ماتم کدہ بن گیا۔ فرحت نے اہلِ ایودھیا کی بے بسی کی تصویر جن الفاظ میں کھینچی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

چلے گھر سے جو وہ سرمایۂ ہوش — تماشائی ہوئے از خود فراموش
در و دیوار پہ چھائی اُداسی — ہوئی خلقت کو مسلوب الحواسی
لبِ دریا پہ تھے رقت کے نالے — حباب آسا پڑے نالوں میں چھالے
تڑپتیں مچھلیاں قدم بوسی کو ہر سُو — بھریں جل سیپیوں کی آنکھیں آبِ زر سُو
پیالے چاہ سے منزل پہ تا لب — نظر آتا تھا کوسوں عالمِ آب
کیا موجوں نے دریا سے کنارا — سرِ شوریدہ کو پتھر سے مارا
رخِ گلشن پہ تھا آثارِ زردی — صبا کو تھی ہوائے کوچہ گردی
شفق نے صبح سا پھاڑا گریباں — ہوا دن غیرتِ شامِ غریباں
بڑھے جس دم وہ دروازے سے باہر — گرا غش کھا کے فوراً سایۂ در
جدائی رام کی از بس ہوئی شاق — کھلیں حسرت سے چشمِ روزنِ طاق

راجہ دسرتھ کی موت کے بعد محل میں جو کہرام برپا ہوا اس کا بیان، پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بسشٹ رشی کا جنگل سے آنا۔ رانیوں کو تسلی دینا۔ بھرت کو ننہال سے بلوانا۔ بھرت کی پریشانی و گریہ زاری اور ستروگھن کے ہمراہ صحرا کو روانگی۔ بھرت ملاپ کا منظر ان تمام واقعات کی تصویر فرحت کی مثنوی میں دیکھنے کے لائق ہے۔

کھر اور دوکھن کے مر جانے کے بعد سروپ نکھا روتی پیٹتی راون کے پاس گئی اور اسے اپنا اور کھر دوکھن کا بدلہ لینے کے لئے اکسایا۔ شہنشاہ اس وقت اضطراب کی حالت میں خواب گاہ میں چلا گیا۔

سحر کو جب کہ خورشیدِ جہانگیر — چلا تھا کرن کی لے کے شمشیر
اٹھا بستر سے راون با دلِ زار — سرورِ بادۂ نخوت سے سرشار
لبسِ جستی سلاحِ جنگ پہنے — لباسِ صاف و زرنگار پہنے
کئے تاجِ مرصع زینتِ سر — [illegible] تیر و گرز و خنجر
بصد شوکت وہ رتھ پہ ہو کے اسوار — چلا لنکا سے صحرا کو صبا وار

نظر آیا سمجھ کر دھارِ حیلہ پاک | گراں سرخ کھاکے زمیں پر گرا

اس طرح کامیابی کی صورت نہ دیکھ کر اُس نے رام اور لچھمن کو دھوکا دے کر سیتا کو چُرا لے جانے کا ارادہ کیا۔ بھگوان رام زریں آہو کی تلاش میں کٹیا سے بہت دور نکل گئے اور لچھمن مہارانی سیتا کی غلط فہمی کے باعث رام کی امداد کو روانہ ہوئے لیکن حفاظت کے طور پر کٹیا کے اردگرد ایک حد قائم کر گئے اور سیتا کو ہدایت کر گئے کہ اس حد سے باہر قدم نہ رکھنا

دکھا اس حلقۂ خط میں یہ اب تم | رہیں پنہاں مثال قوت گردم

بہ رنگِ رُوح تم اس تن میں رہنا | بدن کی طرح پیراہن میں رہنا

محافظ ہے یہی نقشِ مدوّر | قدم رکھنا نہ اس حلقے سے باہر

اب راون نے دیکھا کہ میدان صاف ہے۔ جھٹ کمین گاہ سے نکل کر اس نے شاہانہ لباس اتار دیا اور فقیرانہ لباس زیب تن کر کے بھیک مانگنے کے لئے سیتا کے پاس آیا۔

بدن میں جامۂ زر تار زیبا | گلے سے تا کمر زنار زیبا

ہوا شقّہ صندل جبیں پہ | غبار آلودہ گیسو بل جبیں تک

وہ جانتا تھا کہ سیتا کی حفاظت کا ضرور کوئی نہ کوئی سامان موجود ہوگا۔ لہٰذا کٹیا سے دور رہا اور مطالبہ کیا کہ سائل کے پاس آکر اُس کے دامن میں خیرات ڈالی جائے۔ مہارانی سیتا بغیر کچھ سوچے سمجھے اُس نقشِ مدوّر سے باہر آگئیں۔ راون نے موقع کو غنیمت سمجھا اور بغل میں لے کے سیتا کو وہ پُرجوش ہوا سے غائب ہو ورنہ موش

ایک رومنا کار جنگ سے متعلق بھی ملاحظہ ہوں۔ بہروپ نکھا کا حلیہ دیکھ کر اس کے بھائی کھرا اور دوکھن بھڑک اٹھے اور فوج لے کر رام اور لچھمن پر حملہ آور ہوئے۔

چڑھا اژدر دل پیر دریا دراز | چلے شور شوں کرا اژدر شرارت

کمان دار دلیر و ناوک انداز | صف آگنوں بعد دشمن ستم ساز

لئے چودہ ہزار افسر زرہ پوش | چلے جوشاں غرش بار گرز بردوش

سارک جانب کی ہیروں کی بوچھاڑ | ہوا میدان سراسر تیرہ و تار

کوئی بھڑکا بہ رنگِ آتش تیز | کوئی کڑکا لیاں برقِ خونریز

کسی نے میان سے خنجر نکالا | کسی نے سرکے بل بھالا سنبھالا

جو دیکھی رام نے تیروں کی بوچھاڑ | برابر سر گئے تیر شرر بار

سوار سنگ دل گھوڑوں کی زین سے | گرے جل جل کے تیر آتشیں سے

گرے کٹ کٹ کے دشمن بار و دو | کہیں جیغہ کہیں کلغی کہیں سر

سواروں نے ریس کی تیز دوڑی | ولیکن ہو سکا جانبر نہ کوئی

ہوئی آخر تباہی فوج ناکام | بھرے جوش تبسم سے سری رام

افواج سگریو کی لنکا کو روانگی۔

جوان و کودک و پیر کہن سال | قوی ہیکل قوی بازو قوی بال

گراں بالا جسیم و کوہ تن سب | قوی قامت صف آرا صف شکن سب

بہ رنگِ شیر سب تیزی کے مشتاق | ہر کی طرح خونریزی کے مشتاق

اسیر جنگی لئے گرز گراں سب | سر افگن قاتل گردن کشاں سب

غضب لشکر بپھرا از لشکر دانا | قوی زور آور و صفدر و توانا

جدا لشکر کیا سردار سب کو | دیا اک لشکر جرّار سب کو

گیا دکّہ سری مانند مہابیر | نل و نیل و رسکند نیک تدبیر

یہ لشکر جوش جوق در جوق خیل خیل | چلے جوشاں مثالِ صورِ نیل

سکا نقارہ نہفت بعد سازِ | کڑاکے کی صدا اب کر آ کہ دم

گئی گوسوں تک آوازِ طنبور | جو اندر دل کے رنگ پر چھا گیا نور

زمیں تھرّا گئی شور طبل سے | دہل اُٹھا فلک بانگِ دہل سے

سگھنا واد لچھمن جی کی جنگ اور سگھنا دکی شکست۔

بجا میدان بجا میں جو طنبور | بھڑک اٹھے بہ رنگ چشم تر شور

پیادے فوجِ جرأت ابسوار | لپٹے مانند موج بحرِ ذخار

سواروں کے پرے شمشیر در دست | ہراک جام شجاعت سے سر مست

لچھمن جی حسب ارشاد سری رام | سوئے میدان چلے با عزّ و اکرام

اُدھر سے آیا صد جوش | لئے فوج سواران زرہ پوش

جوانانِ جری بجلی سا کڑکے | نقیبوں نے نقیبوں کو کیا کڑکے

جوا اٹھے بہار عرصۂ جنگ | جما رنگ مہندی کی روش

کر دلیری بہاں جمیع تمام | لڑو مارو و رہو پیدا کرو نام

یہی ہے جوہرِ تیغِ سعادت | کہیں تن پر گلِ زخمِ شہادت

مقامِ آزمائش ہے سنبھل جاؤ | اکڑ کر سامنے تیروں کے بل جاؤ

تجھے ایسا قدم ہٹنے نہ پائے | ستارۂ آبرو گھٹنے نہ پائے

سلہ جانباز بہادر

دلیر و صاحبِ جرأت ہو تھی فوج　　بڑھی لہرا کے آگے صورتِ موج
گھسے فوجِ عدو میں صف شکن سب　　چلے جوشِ غضب سے پیلتن سب
چلے دونوں طرف سے تیر پر تیر　　رواں تھے خنجر و تیغ و تبر تیر
ہوئی یہ بارشِ تیرِ شرر بار　　کہ تھا گرم آتشِ محشر کا بازار
چلے لشکر میں دکھلاتے ہوئے بل　　کہیں نیل اور کہیں انگد کہیں نل
کسی نے رزم میں مارا کسی کو　　کسی نے بڑھ کے للکارا کسی کو
تراشا سر کوئی تیغِ دو دم سے　　کسی کے سر کو دی ٹھوکر قدم سے
مخالف بحرِ غیرت میں گئے ڈوب　　زبانِ تیغ نے چاٹا لہو خوب
ہزیمت لشکرِ راچھس نے پائی　　اڑے سب صورتِ تیرِ ہوائی
برنگِ شبنم از اشک ریزاں　　ہوئے میداں سے خیموں کو گریزاں
پریشاں، بے قرار و چشم تر سب　　گئے خیموں کو اپنے نوحہ گر سب
ادھر سب جمع فوجِ نیکو نام　　ہوا آ کر قدم بوسِ سری رام

کنبھ کرن کی مع فوج کے آمد۔

لئے گرز و کماں و ترکش و تیر　　علم نیزے، چمک بر برقِ شمشیر
کڑک کر سب برنگِ برقِ تاباں　　سوئے میدانِ رزم آئے شتاباں
برنگِ لشکرِ انجم اک انبوہ　　جما آ کر زمیں پر صورتِ کوہ
نشے میں چور مثلِ بادہ نوشاں　　غضب سے کنبھ کرن آیا خروشاں
سیہ کاکل تھی سر پر شامِ شامت　　قدِ بالا میں آثارِ قیامت
برنگِ آتش آنکھیں سرخ سب لال　　بلا زلفِ مسلسل چال بھونچال
دہن ہم صورتِ گلخن زباں قہر　　غضب مژگاں وہ آنکھیں ساغرِ زہر

کنبھ کرن اتنا تنو مند، دلیر اور بہادر تھا کہ اُس نے تنہا رام کی فوج میں کھلبلی مچا دی اور سگریو کو گرفتار کر لیا۔ پانسہ پلٹتا دیکھ کر انگد گرز ہاتھ میں لئے کنبھ کرن پر حملہ آور ہوئے لیکن انگد کے حملے سراسر بے اثر ثابت ہوئے کنبھ کرن کی شجاعت کا اندازہ فقط ایک شعر سے کیجیے۔ انگد نے گرز سے کنبھ کرن پر حملہ کیا

کمال زورِ بازو سے جڑا گرز　　بدن پر برگِ گل سا آ پڑا گرز

راون کی موت۔

مقابل جب وہ آپہنچا سیہ کام　　زمیں پر رتھ سے صاف آ گرا ظالم
کیا اک ناوکِ آتش فشاں سر　　تن اُس کا قلزمِ خوں میں ہوا تر
گرا فرشِ زمیں پر صورتِ کوہ　　ہوا پسپا دیتوں کا سب انبوہ

کہیں تاج اور کہیں مغفر تھا کہیں فرق　　سراسر خوں میں تھا عضوِ بدن غرق

فرحت کی منظر نگاری میں نمایاں خوبی یہ ہے کہ شاعر نے جس چیز کی تصویر کھینچی ہے۔ اس کے ماحول کا بیان بھی اسی نقطۂ نگاہ سے کیا ہے۔ مثلاً جنگ کا منظر بیان کرنے سے پہلے اُس وقت، سماں اور ماحول کی تصویر کھینچی ہے اور ایسی تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے ہیں جن سے منظر نگاری کی بنیاد خود بخود مضبوط ہو جائے۔ چند ایک مثالیں لیجئے۔

سحر کو جب کہ خورشید شفق پوش　　سوئے میداں چرخ آیا بصد جوش
شعاعِ مہر کا چمکا جو بھالا　　رہا ثابت نہ ثابت کا رسالہ
سوارِ توسنِ شب گم ہوا صاف　　پریشاں لشکرِ انجم ہوا صاف

سحر کو جب کہ شاہنشاہِ خاور　　ہوا فوجِ قمر پر حملہ آور

سحر کو جب سوارِ مہرِ تاباں　　ہوا میدانِ گردوں پر شتاباں

سحر کو جب کہ خورشید صف آرا　　ہوا قصرِ فلک سے آشکارا

قمر مغرب کو بھاگا بارُخِ زرد　　سوارانِ ثوابت ہو گئے زرد

ہوا تاباں شہنشاہِ اُفق جب　　تو بھاگا شہسوارِ ظلمتِ شب
ثوابت نے شکستِ فاش پائی　　پھری خورشیدِ اعظم کی دہائی

سوارِ رخشِ گردوں درخشاں　　ہوا جب گوشۂ مشرق سے افشاں
تنزل پر ہوا اوجِ کواکب　　پریشاں ہو گئی فوجِ کواکب
شکستِ فاش سے بھر کے اک آہ　　قمر نے گوشۂ مغرب کی لی راہ

رام، لچھمن اور سیتا کی بن سے مراجعت کی خبر سُن کر اہلِ اجودھیا کو جو مسرت ہوئی اسے اشعارِ ذیل میں بیان کیا ہے۔

بھرت نے مژدۂ مقدم جو پایا　　تو سب کو قصۂ عشرت سنایا
اجودھیا میں یکایک مچ گئی دھوم　　بدن میں پھول اٹھے سب پیر و معصوم
عزیز و مونس و ہمدم ہوئے شاد　　ہوئے ویرانۂ خاطر سب آباد

پھلا خلقت کا باغِ زندگانی پڑا سوکھے ہوئے دھانوں میں پانی
بپا کی ہر طرف بزمِ طرب خیز کیا آغاز رقصِ فرحت انگیز
کئے سب کوچہ و بازار رنگیں برنگِ تختۂ گلزار رنگیں
کئے قصر و مکاں مرغوبِ آفاق رنگے سارے رواق و روزن و طاق
ہوئی آئینہ بندی شہر بھر میں مچا شورِ طرب ہر کس کے گھر میں

زمیں کی جاگ اٹھی تقدیرِ خفتہ بیاباں بن گئے باغِ شگفتہ
ہوئی ہر سو بہارِ رونق و لطف ہوئی رونق نثارِ رونق و لطف
ہوئے سب فیضِ مقدم سے شجر سبز معطّر، تازہ و سیراب و سرسبز
ہوئی جس دم خبر آمد کی معلوم چلے اہلِ تماشا مچ گئی دھوم
برائے حاصلِ نظارۂ رام ہوا کوسوں تلک اک مجمعِ عام
یہ تھی کثرت میانِ شہر و بازار ہوا کو کشمکش تھی وقتِ رفتار
سرِ اقدس پہ آئینِ سلف سے گل افشانی ہوئی چاروں طرف سے
یہ تھی چاروں طرف پھولوں کے انبار ہوا فرشِ زمیں ہمرنگِ گلزار

راماین فرحت اُس زمانے کی تہذیب و تمدن اور آداب و اطوار پر بھی بہت کچھ روشنی ڈالتی ہے۔ مہاراجہ دسرتھ کی ذات بابرکات اور اُن کے عدل و انصاف کا ذکر فرحت نے نمایاں طور پر کیا ہے۔ گو اس میں شاعرانہ تخیل کو بہت حد تک دخل ہے۔

وہاں اک راجۂ عالی گہر تھا بنامِ نیک دسرتھ مشتہر تھا
جہانگیر و جہاں دار و جہاں بخش فلک قدر و فلک تخت و فلک رخش
شجاعت وہ کہ جس کی ہر طرف دھوم سخاوت وہ کہ راضی ہیر و معصوم
مٹایا صاف طرزِ خود پرستی زبردستی نہ تھی بستی میں بستی

ستاتے تھے نہ مرغِ تیر پرواز عقابِ ایذا رسانی سے رہے باز
چرندوں کو بیاباں میں نہ ڈر تھا ہرن کا بچہ ضیغم میں گھر تھا
عدالت کا یہ تھا چاروں طرف شور چرا کر آنکھ بھاگے شہر سے چور
رعیت گھر میں سوتی فارغ البال حفاظت کیلئے کافی تھا اقبال
کھلے بندوں کھلے خلقت کے رستے طلا بہ میں رواں شمس و قمر سے

اس زمانے میں رشی منی اور سنیاسی، فقیر و درویش جس عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس کا اندازہ آج کل ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ مہاراج اس قدر نیک اور خدا ترس تھے کہ رشیوں کے نام سے کانپتے تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ رشی محل میں داخل ہوتے ہیں۔

ادب سے اُٹھ کے دسرتھ نے بٹھالا پہنایا خوشنما پھولوں کا مالا

بشسٹ سوامی کی آمد۔

بشسٹ نکتہ داں محفل میں آئے وہ خورشیدِ طرب منزل میں آئے
قدم پر گر پڑا سلطانِ والا سرِ تختِ زمرد پر بٹھالا

راکھشس لوگ عبادت کے حظ و کیف سے آشنا ہونے کے باعث رشیوں اور سنیاسیوں کی عبادت میں خلل انداز ہونا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ہر وقت عبادت میں مصروف رہنے والے فقیر و درویش ان سے بہت نالاں تھے۔ آخر ایک دن سوامی بسوامتر کے جی میں آئی کہ مہاراجہ دسرتھ سے امداد طلب کی جائے چنانچہ وہ اس غرض کے لئے شاہی محل میں تشریف فرما ہوئے۔

اُٹھے شاہنشہِ دسرتھ ادب سے قدم پر گر پڑے فرطِ طرب سے
خوشی سے رسمِ مہمانی ادا کر بٹھالا اُن کو سنگھاسن پہ لاکر
قدم کو شہ نے آبِ تر سے دھویا غبارِ آئینۂ خاطر سے دھویا
کہا کیا اوج پر آیا ستارہ جو دیکھا میں نے روئے عالم آرا
یہ عاجز لائق اس لطف کب ہے تمہاری چشمِ رحمت کا سبب ہے،
کرو رازِ نہاں سب مجھ سے ظاہر نہ ہوں گا حلقۂ طاعت سے باہر

فرحت کو اس امر کا پورا احساس ہے کہ وہ ایک تاریخی واقعہ نظم کر رہا ہے۔ لہٰذا حسبِ دستور اُس نے اپنا ماخذ بیان کرنا ضروری سمجھا ہے۔

سلف میں کچھ تھی اک اہلِ کرامت نکو صورت، نکو سیرت، نکو ذات
گلِ شادابِ گلزارِ سعادت دُرِ نایابِ دریائے عبادت
سخن سنج و سخندان و سخنور جنابِ بالمیکِ نکتہ پرور
کتھا لکھی سری رگھناتھ جی کی جو مشہورِ جہاں ہے بالمیکی

بالمیک رشی نے راماین سنسکرت زبان میں لکھی جسے موجودہ عہد میں عام فہم اور سلیس تصور نہیں کیا جاتا۔ شاہنشاہ اکبر کے عہد میں گوسائیں تلسی داس نے اس واقعہ کو ہندی (برج بھاشا) نظم کا جامہ پہنایا فرحت نے اس امر کا ذکر بھی ضروری سمجھا ہے۔

گوسائیں تھے جو تلسی داس ذی ہوش — وفادار و وفا کار و وفا کیش
انہوں نے بھی براہ ہوشیاری — ذر مضموں کو بخشی آبداری
بجائے دیوبانی لکھ کے بھاشا — دکھایا حسن معنی کا تماشا
چلا آب سخن مضموں نے پلٹی — سخن نے اک نئی صورت دکھائی
سنوار اوصاف گیسوئے سخن کو — کیا تازہ مضامین کہن کو

ملک الشعرا کیسوداس کی رامائن بھی مستند خیال کی جاتی ہے چنانچہ اپنا ماخذ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ملقب تھے جو کیشوداس نامی — انہوں نے بھی لکھا نسخہ گرامی

بہت سے نکتہ بینوں نے اسی طور — بدل کر طرز مطالب میں کئے غور
جہاں تک تھی غرض جس کی رسائی — بقصد فکر رسا جودت دکھائی
وہی مطلب ہے سب کی بولی میں — وہی تاکہ وہی گیتا ولی میں
کتھا سب ہیں وہی اک منضبط ہے — تفاوت حسن بندش میں فقط ہے

آخری شعر شاعر کے ذوق تنقید کا آئینہ دار ہے۔

فرحت کو رام سے بے حد عقیدت ہے یہاں تک کہ اس عقیدت کے جوش میں اس نے رام سے متعلق ہر چیز مثلاً فوج وغیرہ کی تعریف بھی دل کھول کے کی ہے لیکن جنگ میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ راون کے شکتی بان سے زخمی ہو کر لچھمن بے ہوش ہو گئے لچھمن اس وقت فوج کے ایک بڑے دستے کی کمان کر رہے تھے کماندار کے بے ہوش ہو جانے پر فوج میں بھاگڑ مچ گئی اور راون کی سپاہ کا پلہ بھاری رہا۔ فرحت نے اس حقیقت پر پردہ پوشی کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنی ذمہ داری کا خیال کرتے ہوئے اس نے لچھمن کی غشی اور افواج رام کی شکست کو صاف طور پر بیان کیا ہے۔

چھپا گل پردۂ جسم کہن پہ — غشی طاری ہوئی لچھمن کے تن پہ
گرے فرش زمیں پہ ہو کے غمناک — ہوا اُن رونق آئے سر خاک
ہلال آسا گھٹا ماہ جہاں گرد — رخ مہر درخشاں ہو گیا زرد
سنبھلے عین غفلت میں وہ تنگ — فلک کا غم سے نیلا ہو گیا رنگ
ہوا ایسی سی پسپا لشکر رام — فروغ صبح پر غالب ہوئی شام

میں نے عرض کیا ہے کہ بھگوان رام کو راسخ العقیدہ ہندو خدا کا اوتار مانتے ہیں منشی شنکر دیال فرحت بھی اسی عقیدے کو مانتے والے تھے۔ اور سری رام چندر جی جب عام انسانوں کی طرح زندگی کے مختلف مدارج طے کرتے ہیں تو فرحت کا انداز بیان نہایت دلچسپ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں اپنے عقیدے کو کس خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ نظم کیا ہے۔

غرض یاں پرورش پاتے تھے چاروں — دکھاتے تھے کرامتیں ہزاروں
ترقی پہ تھا ہر دم جوش مادر — عجب تھی رونق آغوش مادر
وہ ہنسنا، کھیلنا، رونا، مچلنا — جھجکنا، چونکنا، اٹھنا سنبھلنا
میان دامن مادر پلے وہ — بڑھا دل ماں کا جب گھٹنوں چلے وہ
ہوئے جب سیکھنے پڑھنے کے لائق — ہوئے منت کش استاد فائق
رکھیں کیا وید پڑھنے کی وہ امید — کہ تھے وید ان سے لرزاں صورت بید
بنایا جس نے علم و حلم سب ہو — وہ کب محتاج تعلیم ادب ہو
ولیکن حسب آئین بشر سب — کئے حاصل قوانین ہنر سب

فرحت کی تشبیہیں بھی اس پایہ کی ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے بہترین قسم کی تشبیہات فرحت کی رامائن میں بیسیوں نہیں سینکڑوں ہیں۔ فقط چند ایک ملاحظہ فرمائیے۔

محل میں جتنی تھیں بانوئے سلطاں — جلیس بزم و ہمراز سلطاں
وہ جتنی انتخاب چارسو تھیں — گلستان اود میں مثل گل تھیں

اولاد نہ ہونے کے باعث راجہ دسرتھ کے دل کی حالت۔

تہی گوہر سے دامان صدف تھا — اندھیرا برج بیت الشرف تھا
نہ کھلتا تھا کسی دم غنچۂ دل — ہمیشہ خشک لب تھا مثل ساحل
نہ دل کی روشنی غمناک رہتا — گریباں بے کلی سے چاک رہتا
پڑی پاؤں میں زنجیر ہوس تھی — مگر عقل رسا بے دسترس تھی

مرا غنچہ ہے نقد زر سے خالی — صدف ہے جلوۂ گوہر سے خالی
ثمر نخل تمنا میں نہ آیا — گلستان جہاں سے پھل نہ پایا

رعیت جب ہوئی شاکی سگر سے — غبار آسا نکالا اس کو گھر سے

گئے دونوں کپل منی کے مکاں میں — بہا آسا دھ بیچ بوستاں میں

ملک الشعرا

قدم چھو کر وہ دونوں ناز پرور   چلے مثلِ خرامِ بادِ صرصر

تب رفتن سے پیراہن کیا چاک   بہ رنگِ برگِ گل دامن کیا چاک
کھلے گیسو پریشاں مثلِ سنبل   ہوئے محوِ فغاں مانندِ بلبل

تھکے ماندے لوگوں پر نیند کا غلبہ۔
ہجومِ واقفانِ لذتِ غم   پڑا فرشِ زمیں پر مثلِ شبنم

اُٹھائے سایہ آسا تارِ گیسو   نزاکت سے گراں تھا بارِ گیسو

بہ رنگِ موجِ تر ساحل پہ پہنچے   سفر طے ہو گیا منزل پہ پہنچے

شمارِ تسبیح سے جب حرف نکلا   ہوا گیسو صفت برہم سبہ کار

یہ تشبیہات ابتدائی چند صفحات سے لی گئی ہیں ع تب اس کو رنگستانِ چمن بہار مرا۔ ساری مثنوی قریباً آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ خود اندازہ کیجئے کہ اس اتنی بڑی کان میں ان جیسے اور ان سے زیادہ آبدار جواہر ریزے کتنی تعداد میں موجود ہوں گے۔

اسی طرح قوافی و ردائف کی لطافت و خوبی کا اندازہ بھی پانچ سات اشعار سے نہیں ہو سکتا۔ گو رسمی طور پر دو چار شعر پیش کئے دیتا ہوں۔

جنابِ بشن نے دیکھا جو یہ رنگ   کہ شیشہ صورت آتش سے ہے دل تنگ

یکایک ساغرِ جرأت جو چھلکا   ہوا دھوکا پسر کو لال پھل کا

سبب کیا ہے کہ بار خسارہ زرد   یہ شکلِ جوگیاں پھرتے ہو پردرد

پدر کے حکم سے از بہرِ گلگشت   ہوئے تھے رونق آرا جانبِ دشت

سری رنگھبر گل مضموں ہو سرسبز   سخن ہو صورتِ برگِ شجر سبز

بہ رنگِ موجِ دریا دولے تھے   حبابِ آسا قدم میں آبلے تھے

تلاشِ جانکی میں ہر طرف تم   پھرو صحرا بہ صحرا سر بکف تم

مکان و کوچہ و بازار ڈھونڈے   سراسر تختۂ گلزار ڈھونڈے

پھرے صحرا بہ صحرا کوہ در کوہ   نہ کچھ حاصل ہوا جز لقد اندوہ

ہر اک تیرتھ میں جا کر لکھا دی   نشانی جہاں جھاڑی وہ جھاڑی

[illegible] ل کر [illegible] عمر   اسی میں جانکی ہو جان آخر

وہ [illegible] سی نور جہاں تھی   سمیّز نام مشہور جہاں تھی

بہار [illegible] گلگوں پہ آنچل   کمر میں بارِ گیسو سے پڑے بل

ملے تم کو سرا سے خنثمنا کی   رہے دم اور رتنا ہو جسم خاکی

مضمون بہت طویل ہو گیا ہے لہٰذا ایک دو اشعار کا ذکر کر کے اسے ختم کرتا ہوں۔

مگر یہ سچ ہے بشر بیدل نہ ہو جائے   کبھی تقدیر سے غافل نہ ہو جائے
نہ چھوڑے ہاتھ سے تقدیر سیدی   تو ہو گی قرب منزلت سے دوری
اگر پائے تحمل شل نہ ہو جائے   یہ کیا معنی کہ مشکل حل نہ ہو جائے
ہر ملک کہ ہمت بستہ گرد د   اگر خارے بود گلدستہ گرد د

غرض سب اپنے اپنے دھیان میں مست   بموجب شعر استادِ زبردست
بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد   کسے را با کسے کارے نہ باشد

میں اہلِ حسن ہوں تم صاحبِ ناز   کند ہمجنس با ہمجنس پرواز

میں نے رامائن فرحت کا ایک دھندلا سا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس بلند مرتبہ مثنوی کے محاسن سے صحیح طور پر آگاہ ہونے کے لئے مکمل مثنوی کا مطالعہ ضروری ہے۔ کیونکہ دو چار پھولوں سے گلشن کی خوبصورتی، دلفریبی اور اس کی فرحت انگیز فضا کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

جگن ناتھ آزاد

مسائلِ لطیف

چلا ہوں محفلِ ساقی سے لہلہائے ہوئے
غمِ زمانہ کو اک دو گھڑی بھلائے ہوئے

تری نظر کا ارادہ ذرا درست نہیں
معاملات ہیں کچھ پیچ سے ہیں آئے ہوئے

ملا ہے ہم کو وفا کا معاوضہ کیا خوب
کہ وہ جفا سے بھی اب ہاتھ ہیں اٹھائے ہوئے

نگاہِ ہوش سے ثابت قدم یہ شکوہ ہے
قدم تو دیر سے ساقی ہیں لڑکھڑائے ہوئے

تبسم ایک تصور ہے وہ بھی دھندلا سا
زمانہ گزرا مرے غم کو مسکرائے ہوئے

گلا نہیں ہے کسی کے سلوک کا ساقی
چلے ہیں روزِ ازل سے فریب کھائے ہوئے

غمِ حیات و دلِ ناتواں معاذ اللہ
ہے ایک لہر سمندر کا بوجھ اٹھائے ہوئے

شراب لا کہ مجھے دیکھنے کی تاب نہیں
کلی کے جسم کو دیکھا ہے زخم کھائے ہوئے

یہیں کہیں مرے دل میں قیام فرما لو
کہاں چلے ہو اداسی سے سر جھکائے ہوئے

عدم سے ہم نہیں کہتے کہ مے کدہ کو چلیں
وہ دیکھ لیں کہ ذرا ابر سے ہیں چھائے ہوئے

عدمؔ

مِری حیات

نہ پوچھ کیوں بھٹک رہا ہوں دشتِ کائنات میں
کسی حسین شے کی ہے کمی مری حیات میں
تمیز ہو سکے نہ کوئی دن میں اور رات میں
مری حیات آہ! ایک بے مزہ سا خواب ہے

حیات کی مصیبتوں سے روح پاش پاش ہے
نفس نفس مرے جگر کی آہ دلخراش ہے
یہ قلبِ غمزدہ ہے یا مسرّتوں کی لاش ہے
مری حیاتِ رنج و غم کا مستقل عذاب ہے

وہ بے حسی محیط ہے کہ قابلِ بیاں نہیں
لہو بھی منجمد کے جسم میں خموش ہے رواں نہیں
مری حیات میں کوئی حیات کا نشاں نہیں
مری حیات موت کے سوال کا جواب ہے

باقیؔ صدّیقی

آٹو گراف بک

میز پر آٹو گراف بک پڑی تھی۔ وہ سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ متواتر پانچ منٹ تک وہ اس کتاب کو گھورتا رہا پھر اس کی جلد اس کی آنکھوں میں کھبنے لگی۔

ساری جلد پر رنگا ہوا لیدر لگایا گیا تھا جس پر مغلیہ طرز کی نقاشی کی گئی تھی۔ اور جلد کی ساخت سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے کسی سیانے جلد ساز نے تیار کیا ہے۔ اس نے کتاب کو چھونا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ یہ اس بوڑھے نتھنوں والے ٹورسٹ کی کتاب ہے جس کے چہرے پر چیچک کے بڑے بڑے گہرے داغ پڑے ہوئے ہیں اور ان کی زندگی میں ابھی تک اتنی اشتراکیت نہیں آئی کہ وہ کسی کی کتاب کو یوں چھو سکے لیکن وہ اس جذبے کو دیر تک نہ روک سکا۔ اس نے کتاب اٹھائی اور اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔

خاصہ موٹا ہاتھی کاغذ تھا۔ کاغذ کی چکنی دودھیا سفید سطح پر حروف اپنے مخصوص انداز سے ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔

اس نے کاغذ کو ہاتھ میں لے کر مسلا۔ اس کے دل میں ایک طرح کی گدگدی سی ہوئی۔ پھر اچانک اس کی نظر دائیں کونے پر پڑی۔ بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا ـــــ ابراہیم حکمت اللہ۔

وہ چونک پڑا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ ایک بڑے پہاڑ کے قدموں میں کھڑا ہے اور یہ پہاڑ اتنا اونچا ہے کہ اس کی چوٹی کی طرف نگاہ اٹھاؤ تو سر چکرا جائے۔ یقیناً یہ وہی سر ابراہیم حکمت اللہ ہیں جنہوں نے پانچ لاکھ روپے خرچ کر کے بمبئی میں ایک نئی لائبریری کی عالیشان عمارت کھڑی کی ہے۔ بمبئی کے گورنر نے لائبریری کا افتتاح کرتے ہوئے کہا تھا کہ سر حکمت اللہ ہندوستان کے وسیع المطالعہ اشخاص میں سے ہیں۔ اور نئی نئی لائبریریاں کھولنے کی انہیں دھن سی لگی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے پیدائشی گاؤں میں بھی اپنے مرحوم باپ کے نام سے ایک چھوٹی سی لائبریری قائم کر رکھی ہے ..... دفعتاً اسے یوں معلوم ہوا جیسے آسمان پر ایک نیا تارا چمکنے لگا ہے۔ اس نے سوچا کہ اتنے بڑے شخص کا آٹو گراف رکھنے والا شخص بھی کچھ کم وقعت نہیں رکھتا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تارا اس ٹورسٹ کی آنکھ سے بدل گیا۔ یہ آنکھ اسے گھور رہی تھی۔ وہ ڈر گیا۔ اجازت کے بغیر کسی چیز کو ہاتھ لگانا ایک بہت برا فعل ہے ...... اسے یاد آیا، جیسا کہ اس نے اخبار میں پڑھا تھا، بمبئی کے گورنر نے سر ابراہیم حکمت اللہ کے گلے میں چنبیلی کے پھولوں کا ہار ڈالا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ اگر وہ ٹورسٹ اسی وقت یہاں آ نکلے تو ہو سکتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں قدر شناسی کی چمک دیکھ کر کہنے لگے ـــــ خوب، خوب! آپ کو میری آٹو گراف بک بہت پسند آئی ہے۔ اگر ٹورسٹ یوں رائے زنی کرے تو وہ یہی سمجھے گا کہ وہ بھی ایک حکمت اللہ ہے۔ اور وہ ٹورسٹ بمبئی کے گورنر کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے بعد اپنے گلے میں چنبیلی کا ہار نہ دیکھ کر اسے جھٹ یہ خیال آئے گا کہ ہر شخص اتنا خوش قسمت نہیں ہوتا کہ بمبئی کا گورنر اس کے گلے میں ہار ڈالے۔

پھر اس نے یکلخت دو تین ورق الٹے اور اس کی نگاہ ایک ایسے شخص کے نام پر پڑی جس کے متعلق اس نے کبھی کچھ نہ سنا تھا ـــــ امرت ساگر۔ یہ نام کچھ برا تو نہ تھا لیکن اسے ٹورسٹ کی عقل پر ہنسی آ گئی۔ خوب آدمیوں میں آدمی چنا۔ خود امرت ساگر کو چاہئے تھا کہ اپنا آٹو گراف دینے سے پرہیز کرتا۔ مگر وہ تو پھولا نہ سمایا ہوگا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ یوں وہ مشہور ہو جائے گا اور جو کوئی اس آٹو گراف بک میں اس کا دستخط پڑھے گا من ہی من میں سمجھ لے گا

کہ امرت ساگر ہندوستان کا کوئی بڑا آدمی ہے یہیں تو اسے بڑا گاؤدی سمجھتا ہوں۔

امرت ساگر کو کوستا ہوا وہ پھر ورق پلٹنے لگا۔ وہ کسی اچھے سے نام پر رُکنا چاہتا تھا۔ چار پانچ چھوڑ، دس پندرہ ورق پلٹنے پر بھی اس کی خواہش پوری نہ ہوئی۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ معاً وہ رُک گیا۔ لکھا تھا ـــــ ابیندر ناتھ ٹیگور۔

وہ رت جگے کے لئے تیار ہو گیا۔ اب اور ورق پلٹنا نری حماقت ہو گی۔ اچھا ہے کہ اس ایک ہی آٹوگراف کا رس لیا جائے ایک ہی نام کی مالا جپی جائے رات بھر۔ پھر اُسے یوں محسوس ہوا کہ سنتھال لوگ اپنے قومی ناچ کا جشن منا رہے ہیں۔ ابیندر ناتھ اس ناچ کی تصویر بنانے میں مگن ہیں۔ رنگ اُٹھا اُٹھا کر وہ کینوس پر رکھتے جاتے ہیں۔ برش کی سحر کاری کی کچھ نہ پوچھئے۔ پھر اُسے یوں محسوس ہوا کہ وہ بھی سنتھالوں میں مل کر ناچنے لگا ہے تاکہ کسی طرح اس تصویر میں شامل ہو جائے۔

اُسے وہ دن یاد آ گئے جب جدید ہندوستانی مصوری کے اولین رہنما ابیندر ناتھ ٹیگور کا کام اُسے رنگوں کا ایک بے فائدہ کھیل معلوم ہوا کرتا تھا۔ اس کے بھائی نے اُن کے نام ایک سال کے لئے مشہور ہندی ماہنامہ وشال بھارت جاری کرا دیا تھا۔ تقریباً ہر ماہ نیا پرچہ آنے پر وہ اسی بات پر حیران ہوا کرتا تھا کہ یہ لوگ اتنے اچھے مضامین دے سکتے ہیں تو مصوری کے اچھے نمونوں کا انتظام کیوں نہیں کرتے۔ اس سے تو یہی بہتر ہو کہ ان رنگین پہیلیوں کی بجائے اعلیٰ فوٹو گرافی کے چند نمونے ہی پیش کر دیئے جایا کریں۔ پھر جب ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور بھی برش اُٹھا کر مصور بن گئے اور ان کے اس نئے فن کے بھی اس ماہنامہ میں درشن ہونے لگے تو شروع شروع میں اُسے یہی محسوس ہوتا تھا کہ رابندر ناتھ ٹیگور رول کے ساتھ لکیریں کھینچ کر برش سے رنگ بھر دیتے ہوں گے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی تصویروں کے متعلق تو اب بھی اُس کی [illegible] رائے تھی۔ لیکن ہندوستانی جدید مصوروں کا فن اُسے اب بہت عظیم نظر آتا تھا۔ اور وہ حیران تھا کہ رابندر ناتھ ٹیگور نے شاعری سے وقت نکال کر اُلٹی سیدھی مصوری میں کیوں وقت ضائع کرنا شروع کر دیا ہے۔

پھر جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ آٹوگراف بک کھلی پڑی ہے۔ اور ہندوستان کے عظیم الشان مصور کا آٹوگراف اپنے خوبصورت زاویوں سمیت اُس کے سامنے موجود ہے ـــــ ابیندر ناتھ ٹیگور۔

اوپر یہ قمقمہ لگا ہوا تھا۔ بہت سے پروانے قمقمے کے گرد دیوانہ وار منڈلا رہے تھے۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ وہ خود بھی ایک پروانہ ہے۔ اور ابیندر ناتھ کا نام آٹوگراف بک کے ورق پر بڑے قمقمے کی طرح روشن ہو اٹھا ہے۔

نئے زمانے کے تفریحی مشغلے عجیب ہیں۔ اس نے سوچا زندگی کے بندھے ہوئے کاموں کے بیچوں بیچ کوئی تفریحی مشغلہ تو ہونا ہی چاہئے۔ بندھے ہوئے کاموں سے من اُکتا جاتا ہے۔ تن ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ تفریحی مشغلے برابر کایا پلٹ کرتے رہتے ہیں، نڈھال جذبوں کو سہلاتے رہتے ہیں۔ مگر اس ٹورسٹ کی تو ساری زندگی ہی تفریحی مشغلہ بن گئی ہے۔ وہ نئے نئے مقامات پر پہنچتا ہے بڑے بڑے آدمیوں کے آٹوگراف حاصل کرتا ہے۔ کبھی تو وہ بھی تھک جاتا ہو گا کبھی کیوں، اکثر۔ کیونکہ خواہ کوئی کام تفریحی مشغلے کے طور پر ہی شروع کیا جائے، جب وہ ساری زندگی پر چھا جاتا ہے تو یہ بھی بندھے ہوئے کاموں کا روپ دھار لیتا ہے، اس سے بھی من اُکتا سکتا ہے۔

دل سے باتیں کرتا ہوا وہ کمرے کے حبس کو پوری طرح سے بھول نہ سکا تھا۔ پہلے تو اُس کے جی میں آئی کہ آٹوگراف بک کو بند کر کے پرے اپنی جگہ پر رکھ دے اور بجلی بجھا کر باہر جا بیٹھے یا شانتی نکیتن کے کسی طالب علم کے ساتھ باہر سیر کرنے نکل جائے۔ مگر آٹوگراف بک نے اُسے نہ چھوڑا۔ بات یہ تھی کہ اُس دن پہلی بار یہ کتاب اس کی نظر پڑی تھی۔ حالانکہ وہ ٹورسٹ اس کے شانتی نکیتن آنے کے تیسرے روز ہی آ پہنچا تھا اور پورے ہفتے سے اس کے ساتھ پانتھ نواس کے اس کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ کتاب دیکھنے سے پہلے وہ یہی سمجھتا تھا کہ وہ ٹورسٹ یونہی کوئی سرپھرا نوجوان ہے اور کسی طرح ماں باپ کی رضامندی کے بغیر گھر سے نکل آیا ہے۔ مگر

آٹوگراف کے بہانے سے بڑے بڑے لوگوں سے ملنا کیا کچھ کم اہمیت رکھتا ہے۔ کیا یہ زندگی سچ مچ ایک سراب ہے؟ نہیں تو یہ آٹوگراف تو سراب کے فلسفے کو صاف جھٹلاتے نظر آتے ہیں سر ابراہیم حکمت اللہ کا نام یہاں موجود ہے۔ اگرچہ یہ یہاں نہیں لکھا کہ انہوں نے بہت سی لائبریاں ... اور خود بمبئی کے گورنر نے ان کے گلے میں چنبیلی کے پھولوں کا ہار ڈالا امرت ساگر صاحب بھی یہاں جگمگا رہے ہیں ——— صبح کے تارے کی طرح۔ گو میں نے کسی سلسلے میں ان کی زندگی کا مطالعہ قبول نہیں کیا شاید انہوں نے بھی کوئی بڑا کام کیا ہو ...... اور پھر ابندرناتھ ٹیگور کا نام! یہ سب سراب نہیں ہو سکتا۔ خاص کر ابندرناتھ ٹیگور کا آٹوگراف اپنے روبرو دیکھ کر مجھے اتنی ہی خوشی ہو رہی ہے جتنی کسی کو تاج محل دیکھ کر ہو سکتی ...... اگر وہ شانتی نکیتن کی بجائے گھر پر ہوتا اور وہاں یہ ٹورسٹ اس کے پاس آکر ٹھہرتا تو وہ ابندرناتھ کا آٹوگراف دیکھ کر اپنے پاؤں میں گھنگھرو باندھ لیتا اور ناچتا ہوا بلند آواز سے گانے لگتا۔ اور اسے اس مستی کی حالت میں دیکھ کر یہ ٹورسٹ کہتا ——— ارے کبھی اہم ایک ابندرناتھ کا نام پڑھ کر ناچنے لگ گئے ابھی اور ورق گردانی کرو۔ اس آٹوگراف بک کی ان سے بھی بڑے بڑے نام ملیں گے ...... اور وہ اس کا منہ بند کر دیتا ——— چپ، میاں! بس سمجھ لیا تم نے صرف آٹوگراف جمع کئے ہیں تم یہ نہیں جانتے کہ حقیقی عظمت کن کن ناموں کے ساتھ وابستہ ہے پھر تم یہ بھی توقع رکھو گے کہ میں امرت ساگر کا آٹوگراف پڑھ کر بھی ناچوں ناچنا ہی ہے تو امرت ساگر بھی ہندوستان کا ستارہ ہے

ہوا بند تھی۔ کمرے میں دم بدم حبس بڑھ رہا تھا۔ معاً اس کے جی میں آئی کہ ہو گئی یہ آٹوگراف بک اور رہوں نے یہ سب بڑے آدمی جنہوں نے اپنا نام اپنے اپنے ہاتھ سے لکھ رکھا ہے! کیا فائدہ ہے کہ اتنی گرمی میں یہاں بیٹھا جائے۔ پھر جب غیر ارادی طور پر اگلا ورق پلٹا تو ایک بار پھر آٹوگراف بک نے اپنا جادو چلا دیا۔ لکھا تھا ———

میرا من گویا اجنتا کی ایک غار ہے اور تمہارا آٹوگراف اس غار کی لازوال تصویر۔

اس کے نیچے مانک لال رسک لال راول کا آٹوگراف نظر آرہا تھا۔ وہ سوچنے لگا یہ راول صاحب کون ہیں؟ اپنے ان الفاظ میں انہوں نے کسے مخاطب کیا ہے؟ شاید یہ کوئی کنواری ہو، کنواری نہ سہی کسی بھی طرح کی ایک عورت۔ عورت کی تو ہر چیز ایک تصویر ہوتی ہے۔ صرف اس کا آٹوگراف ہی نہیں لیکن خود راول صاحب نے کیسے سمجھ لیا کہ ان کا من اجنتا کی غار کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ تو خود بینی کی انتہا ہے۔ انہیں اس عورت سے عشق تھا تو یوں اپنے اس آٹوگراف کے ذریعے اس کا پردہ فاش کرنے میں انہیں کیا فائدہ نظر آیا؟ شاید وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ اس ٹورسٹ کا من بھی ان کے آٹوگراف کو ایک لازوال تصویر کے روپ میں قبول کرے۔ اور یہ صرف آٹوگراف بک تک ہی محدود نہ رہے۔

اس نے آٹوگراف بک کو بند کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اٹھ کر باہر کھلی ہوا میں چلا جائے۔ اسے ایک عربی کہاوت یاد آگئی ——— انسان کپڑوں میں چھپے ہوئے بھیڑیے ہیں! کیا یہ سب بھیڑیوں کے آٹوگراف ہیں؟ یہ ٹورسٹ خود بھی ایک بھیڑیا ہے۔ کیا؟ میں بھی بھیڑیا ہوں؟ ...... نہیں نہیں، یہ میں کیا سوچ رہا ہوں! اس آٹوگراف بک میں تو ایک دعوت شیراز جلوہ آرا ہے۔ اور بلاشبہ یہ سب آٹوگراف اچھے اچھے آدمیوں ہی کے ہیں۔ حب الوطنی بھی زیادہ خود غرضی ہی کی ایک صورت ہے مگر اس کے بغیر گذارہ بھی تو نہیں ہے۔ حب الوطنی کے شیدائی شہرت کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ کیا یہ پاپ ہے؟ گمنامی ہی کو بڑا دھرم مان لیا جائے؟ کیا وہ گمنام لوگ جن سے کبھی اس ٹورسٹ نے آٹوگراف کی درخواست نہیں کی، ان لوگوں سے بہت اچھے ہیں جن کے نام اس آٹوگراف بک میں موجود ہیں؟

وہ پھر بھول گیا کہ کمرے میں حبس بڑھ رہا ہے۔ کاش یہ آٹوگراف بک میری ہوتی، وہ سوچنے لگا تو مجھے کتنی خوشی ہوتی لیکن یہ میری کیسے ہو سکتی ہے! میں نے اس کے لئے کچھ بھی تو محنت نہیں کی بس اسے دیکھ رہا ہوں اور خوش ہو رہا ہوں۔ یہ خوشی بھی تو کچھ کم نہیں۔ پھر یہ چھینے کی خواہش کیوں؟ اسے اٹھا کر بھاگ جاؤں۔ یہ تو پاپ ہوگا ——— چوری لیکن چوری کی خواہش ہی تو پاپ ہے۔ اونہہ! چوری کی خواہش بھی پاپ ہے، تو اب تک میں اسے اٹھا کر بھاگ

کیوں نہیں گیا؟ ...... اس آٹو گراف بک میں ایسی کیا چیز ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے؟ کسی کسی آٹو گراف کے حروف تو بوڑھے ہندوستان کی نمناک آنکھوں کو میرے روبرو لے آتے ہیں۔ کیا کیا اشارے کرتی ہیں یہ آنکھیں! کیسی کیسی کہانیاں سناتی ہیں یہ آنکھیں!

کھڑکی کے باہر اندھیرا چھایا تھا۔ دور، بہت دور آسمان پر ایک تارا ٹوٹا۔ یہ تارا دھرتی کی طرف لپکا۔ اُسے فوراً یاد آیا کہ اس نے روسی ادب کی کسی کتاب میں پڑھا تھا۔ جب کوئی ستارا گرتا ہے تو وہ اس بات کی ترجمانی کرتا ہے کہ کوئی مظلوم روح درد میں مبتلا ہے یا کوئی ماں اس دھرتی پر بسی ہوئی دنیا کو یاد کر رہی ہے اور حق تو یہ ہے کہ جب کوئی تارا ٹوٹ کر زمین پر گرتا نظر آئے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اسی گھڑی کسی نیک مرد یا عورت نے جنم لیا ہے۔ اور یہ بھی تو غیر اغلب نہیں کہ اس نیک مرد یا عورت کا آٹو گراف بھی کسی دن اس کتاب کے کسی ورق پر اس دعوت شوق میں آ شریک ہو۔

اُسے دیرینہ کھانسی کی شکایت تھی۔ آٹو گراف بک میں وہ اتنا کھو گیا تھا کہ کھانسی کے جھٹکوں نے اُسے ذرا نہ ستایا۔ کبھی کبھی تو اس کا گلا او کھلی کا روپ دھار لیا کرتا تھا جس میں زور زور سے موسل چل رہے ہوں۔ اس کھانسی نے اُسے چڑچڑا کر دیا تھا۔ اس کے گلے میں خراش سی پیدا ہوئی۔ وہ کھوں کھوں کرنے لگا۔ آٹو گراف بک بند کر کے اُس نے میز پر رکھ دی اور اپنے بستر پر چت لیٹ گیا۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ خیال آیا کہ وہ وقت مقررہ پر دوا پینا بھول گیا ہے۔ دوا پی کر وہ باہر نکل آیا اور برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ ذرا ذرا ہوا چلنے لگی تھی۔ اس کا دماغ پھر ہلکا ہونے لگا۔

سانس چلنے سے تو اتنا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ آدمی زندہ ہے۔ اچھے بُرے کا امتیاز تو اُس کے کام دیکھنے سے ہوتا ہے۔ وہ سوچنے لگا، اچھا ہے کہ یہ ٹورسٹ اس کی طرح دائمی کھانسی میں مبتلا نہیں اور اپنا آٹو گراف بک اُٹھائے شہر شہر گھومتا پھرتا ہے۔ جسم کی تندرستی کے بغیر کون دور دور اڑ سکتا ہے؟ طبیعت کے لحاظ سے بھی وہ بھلا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ بچوں کے ساتھ وہ بچہ بن جاتا ہے۔ اُنہیں کی طرح گلا پھاڑ کر قہقہہ لگاتا ہے، اور اس وقت وہ یہ بھول جاتا ہے کہ وہ تو دراصل ایک ریشم کا کیڑا ہے کیونکہ سینکڑوں آٹو گراف جمع کرتے کرتے اس کے گرد جیسے ایک خول سا بن گیا ہے۔

وہ ٹورسٹ کا انتظار کرنے لگا۔ کدھر نکل گیا؟ واپسی کا خیال ہی بھول گیا ہے۔ صبح سے ایسا گیا ہے کہ بس دوپہر کا کھانا بھی کہیں باہر ہی کھایا ہو گا۔ اور کیا عجب کچھ ملا بھی یا انتڑیاں یونہی کلبلاتی رہیں۔ کسی گاؤں کی طرف گیا ہو گا۔ ورنہ آٹو گراف بک کمرے میں نہ چھوڑ جاتا۔ گاؤں تو ٹھہرا گمنام لوگوں کا گھونسلا۔ وہاں وہ کس سے آٹو گراف کی درخواست کر سکتا تھا؟

ٹورسٹ یہ رات کہیں باہر ہی گزارے گا، یہ سوچ کر وہ اندر اپنی چارپائی پر آبیٹھا۔ اب یہاں حبس نہ تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ آئینے میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک عجیب سی اداسی دیکھ کر وہ سہم گیا۔ ٹورسٹ کی آنکھیں تو سدا مسکراتی نظر آتی ہیں۔ آئینے کے سامنے بیٹھا بیٹھا وہ کھانسنے لگا۔ اور ایک پھیکی سی ہنسی اس کے ہونٹوں کے کونوں پر پھیل گئی۔ یہ کھانسی مجھے کھا کر چھوڑے گی۔ وہ سوچنے لگا۔ گلے ہی میں نہیں میرے سر کے اندر بھی جانے کون موسل چلا رہتا ہے؟ حساس تو میں بچپن ہی سے ہوں۔ یہ کھانسی نہ جانے کیسے میرے اندر گھس آئی ہے؟ یوں تو زندگی کی پگڈنڈی پر چلتے وقت ہمارے پاس کئی بیماریاں چلی آتی ہیں۔ چھوٹی بیماریاں، بڑی بیماریاں! یہ کھانسی کہلاتی تو ہے چھوٹی بیماری مگر میں اس کے ہاتھوں کتنا پریشان ہو رہا ہوں!

غیر شعوری طور پر اُس نے آٹو گراف بک پھر اٹھا لی اور کسی ایسے آدمی کا آٹو گراف کرنے لگا جو اُس کی طرح کھانسی میں مبتلا ہو۔ یہ پتہ چلنا کچھ مشکل تو نہیں، حروف کی بناوٹ ہی یہ ظاہر کر دے گی۔ عین ممکن ہے کسی صاحب کو ٹھیک آٹو گراف دیتے وقت کھانسی کا زبردست دھچکا لگا ہو۔ وہ جھنجھلا اُٹھا۔ ایسا کوئی آٹو گراف نظر نہ آرہا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ اس کی پیشانی پر ان گنت چیونٹیاں رینگ رہی ہیں اور وہ اس کے سر تک سرنگ کھودنے کی فکر میں

سرگرداں ہیں۔۔۔۔۔ پھر اس نے سوچا کہ کھانسی کے بیمار کا آٹوگراف ڈھونڈنے کی کوشش بڑی جہالت ہے۔ کسی کی مجروح انفرادیت اتنا اوچھا کام کرنے پر اتر آئے اور اس میں اسے رس آنے لگے تو سمجھ لیجئے کہ وہ آدمی آدمی نہیں رہا۔

وہ برابر آٹوگراف بک کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ جس طرح پرانی شراب زیادہ نشہ آور ہوتی ہے، اسی طرح ایک آٹوگراف بک بھی جتنی زیادہ پرانی ہوتی جاتی ہے اتنی ہی اس کی قدر و قیمت بڑھتی جاتی ہے۔

معاً اس کی نگاہ ایک جگہ جم گئی۔ لکھا تھا ——— ایم۔ کے گاندھی

اس کی آنکھیں پست ہو گئیں۔ یہ کتاب مہاتما گاندھی نے پکڑی ہوگی۔ اپنے ہاتھ سے اپنا نام لکھا ہوگا ——— ایم۔ کے گاندھی یعنی موہن داس کرم چند گاندھی۔ اپنے ہاتھ سے۔ یہ حروف ساکن و خاموش ہیں ——— شانت آتما کی طرح، لیکن ان کا اثر اس قدر وسیع ہے۔ وہ لکھے گئے ہیں کالی سیاہی سے مگر مجھے وہ زریں معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے اپنا یہ آٹوگراف دیا ہوگا اپنے ہاتھ سے! آج ان کا شمار دنیا کی عظیم ترین ہستیوں میں ہے۔ اپنی انگلیوں میں قلم پکڑ کر اس کاغذ پر لکھا ہوگا! اپنی انگلیوں میں قلم پکڑ کے۔۔۔۔

وہ سوچنے لگا کہ سمندر کی لہریں بھی ساحل پر اپنے نام لکھتی رہتی ہیں۔ ٹھیک تو ہے۔ وہ نقش، جو لہروں کا ایک ریلا آنے کے بعد ساحل کی ریت پر خواہ مخواہ ہمارا دھیان کھینچ لیتے ہیں، لہروں کے آٹوگراف ہی تو ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ لہروں کا دوسرا ریلا پہلے آٹوگراف مٹا کر ان کی جگہ نئے آٹوگراف چھوڑ جاتا ہے لیکن اس آٹوگراف بک کی شان الگ ہے۔ یہاں ہر آدمی نئی جگہ پر اپنا نام لکھتا ہے۔ چنانچہ سر ابراہیم حکمت اللہ کے آٹوگراف کے بعد امرت ساگر کو اپنا نام لکھنے کے لئے الگ جگہ ملی۔ مانک لال رسک لال راول کو بھی الگ جگہ ملی اور مہاتما گاندھی کے لئے پورا صفحہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ تو ضروری تھا۔ چاروں طرف سفیدی نہ ہوتی تو مہاتما جی کے آٹوگراف کی خوبصورتی ہی ماری جاتی۔

اسے یاد آیا کہ مہاتما گاندھی بھی آج کل بڑے کاروباری آدمی بن گئے ہیں۔ پچھلے مہینے کی بات ہے ایک پریس فوٹوگرافر نے نزدیک سے ان کا فوٹو کھینچنا چاہا۔ انہوں نے اس سے پندرہ روپے وصول کر لئے۔ ہریجن فنڈ میں چلا گیا یہ روپیہ۔ خود ان کے پاس نہیں رہا لیکن روپیہ حاصل کرنے کی ترکیب تو کاروباری اصول پر مبنی ہے۔ آٹوگراف کی بھی فیس مقرر کر رکھی ہے انہوں نے ——— پانچ روپے۔ ایک طالب علم کسی ریلوے سٹیشن پر ان کے پاس آیا۔ اس نے دس روپے کا نوٹ ان کے ہاتھ میں دیا اور آٹوگراف حاصل کر لیا۔ گاڑی چلنے میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ باقی کے پانچ روپے مانگتے اسے شرم آتی تھی۔ انجن نے سیٹی دی۔ گاندھی جی مسکرا کر بولے۔ باقی کے پانچ روپے بھی میں ہی رکھ لیتا ہوں ہریجنوں کے لئے۔ اور گاڑی چل دی۔ ہا ہا ہا۔ ہی ہی ہی۔ وہ طالب علم تکتا کا تکتا رہ گیا ہوگا۔ مگر [illegible] اتنا بے وقوف نہ ہوگا۔ اس نے صرف پانچ ہی کا نوٹ دیا ہوگا۔ تاریخ تو لکھی ہی نہیں۔ پانچ روپے تو دے لیے پورا فائدہ نہیں اٹھایا۔ اسی کو تجربہ کاری کہتے ہیں۔ بلکہ اس صورت میں تو محض آٹوگراف سے ہرگز مطمئن نہ ہونا چاہیئے۔ کوئی ننھا سا پیغام لینے کے لئے اصرار کرنا چاہیئے اور اس کے ساتھ تاریخ کے علاوہ اس مقام کا نام جہاں یہ آٹوگراف دیا گیا اور وہ وقت بھی جب قلم اپنا کام کر کے رکے، درج ہونا چاہیئے۔ مگر یہ سب باتیں تجربہ ہی سکھاتا ہے۔

اس نے اپنی آنکھیں موند لیں اور پلکوں کی درزوں میں سے مہاتما گاندھی کے آٹوگراف کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے من کی عجب کیفیت تھی۔ جب وہ کشمیر گیا تھا تو اس کے پاس ایک دوربین تھی۔ اسے یاد آیا کہ کس طرح وہ دوربین اٹھائے گھوما کرتا تھا۔ اب آنکھیں بند کر کے درزوں میں سے آٹوگراف کے حروف دیکھتے وقت اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ دوربین لگا کر دور، بہت دور اونچے پہاڑ دیکھ رہا ہے جن کی برف پوش چوٹیاں سرے سے دھندلی نظر آتی ہیں۔۔۔۔۔ یہ کتاب مہاتما گاندھی نے پکڑی ہوگی۔ اپنے ہاتھ سے اپنا نام لکھا ہوگا۔ اپنے ہاتھ سے!

[illegible] صرف ایک لفظ اس کی سمجھ میں آیا ——— بلیدان۔۔۔۔ بلیدان۔۔۔۔ بلیدان! مہاتما کا نام لیتے ہی بلیدان کا مفہوم سمجھ میں آ جاتا ہے ——— قربانی

بھینٹ، نذر کس کی قربانی! اپنے آپ کی، اپنے تن کی، اپنے من کی قربانی! دنیا کی سیاسیات میں آج جو ہندوستان کا اتنا چرچا ہے۔ اہنسا کی بدولت ہے؟ ـــــ مہاتما گاندھی کی قربانیوں کی بدولت! وہ اپنی انگلیوں میں قلم پکڑ کر اس کاغذ پر نام لکھا ہوگا! اپنی انگلیوں میں قلم پکڑ کر.....

اگلے ورق پر امرت بازار پتریکا کے ایڈیٹر کا آٹو گراف نظر پڑا۔ پہلے اس نے سوچا کہ یہاں بھی تھوڑی دیر رُکا جائے۔ لیکن ہندوستانی اخبار نویسی کا ہلکا سا تجزیہ کرتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔ پھر اس کی نگاہ سیٹھ داموردراس کے آٹو گراف پر پڑی۔ بھدے سے ہندی حروف میں سیٹھ جی نے اپنا نام لکھا تھا۔ اُسے بہت غصہ آیا۔ یہ کہاں کا بڑا آدمی ہے؟ سرمایہ دار وہ ضرور ہے۔ ذرا کم مغرور ہوگا۔ اس ٹورسٹ کی تھوڑی بہت خاطر تواضع کر دی ہوگی۔ خاطر تواضع کیا کی، رشوت دی۔ ورنہ یہ ٹورسٹ کب اُسے آٹو گراف بک میں نام لکھنے دیتا۔

سیٹھ جی کو صلواتیں سناتا ہوا وہ ورق پلٹتا رہا۔ اُسے اتنا بھی خیال نہ آیا کہ یوں بغیر غور کئے ورق پلٹنے سے وہ کسی عظیم الشان ہستی کا آٹو گراف دیکھنے سے محروم رہ جائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ بڑے آدمیوں کے نام تاریخ کی سیاہ چادر پر تاروں کی طرح نمودار ہوتے ہیں یا یہ سمجھئے کہ وہ افشاں کے ان ننھے چمکدار ذرّوں کی طرح ہوتے ہیں جو بڑی احتیاط سے دلہن کی مانگ میں جمائے جاتے ہیں۔ بڑے آدمیوں ہی کے آٹو گراف جمع کرنے چاہئیں۔ سیٹھ داموردراس کونسا تاروں میں تارا ہے۔ یا کونسا عروسِ حیات کی مانگ پر جما ہوا افشاں کا ذرّہ ہے! اُس نے تو محض جونک کی طرح غریبوں کا لہو چوسنے کی مشق کی ہوگی اب تک۔ کس منہ سے اُس نے اپنا نام لکھ دیا اس آٹو گراف بک میں جہاں سر ابراہیم حکمت اللہ اور مہاتما گاندھی جیسی ہستیوں کے نام موجود ہیں! اُسے اتنا غصہ آرہا تھا کہ اُس نے پھر سے وہ ورق نکال لیا جہاں سیٹھ صاحب نے بھدے ہندی حروف میں اپنا نام لکھ ڈالا تھا۔ وہ اس پر قلم پھیر دینا چاہتا تھا۔ مگر پھر غیر شعوری طور پر اسے اس کے حال پر چھوڑ کر ورق گردانی کرنے لگا ـــــ کبھی پیچھے سے آگے کی طرف اور کبھی آگے سے پیچھے کی طرف۔ اس وقت اُس کی انگلیوں میں نہ جانے کہاں سے اتنی تیزی آگئی تھی۔ اس وقت اس کا من اُس جھیل کی طرح تھا جس میں سے گذر کر دریائے جہلم اپنے راستے کو نہ بھولتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ ادھر ادھر اونچے اونچے پہاڑ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ ہوا نے زور پکڑ لیا ہے۔ پندرہ پندرہ بیس بیس فٹ اونچی لہریں اُٹھ رہی ہیں ـــــ طوفانی لہریں! یہ لہریں ڈونگوں اور کشتیوں کو آغوش میں لے لینے پر آمادہ ہیں جیسے روز دن دیہاڑے سرمایہ داری کی مشینیں دھرتی کے بیٹوں کی کمائی کو اپنے حلق میں انڈیلتی رہتی ہیں۔ اس کے من میں جذبات کی دہشتناک لہریں اُٹھ رہی تھیں اور یہ سیٹھ داموردراس کی خوش قسمتی تھی کہ اس نے میز پر پڑا ہوا بلیڈ اٹھا کر سیٹھ جی کا نام آٹو گراف بک میں سے کھُرچ نہیں ڈالا۔

کئی آٹو گراف باسی پھولوں کی طرح اداس پڑے تھے ـــــ اپنی بے بضاعتی پر خود ہی نادم۔ کچھ پھیکے پھیکے تاروں کی طرح تھے کچھ آنکھوں پر جھکی ہوئی موٹی موٹی سیاہ بھنوؤں کی طرح، کچھ تر و تازہ ہونٹوں کی طرح باریک، کچھ انگلیوں کی طرح موٹے!..... پھر اُس نے سوچا کہ ان تشبیہوں کے پیچھے پڑنے سے تو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

معاً اُس کی نگاہ پھر ایک جگہ جم گئی۔ لکھا تھا ـــــ

آٹو گراف کے لئے کسی کو دق نہ کرو

جواہر لال نہرو

پنڈت جواہر لال نہرو کا آٹو گراف!... "آٹو گراف کے لئے کسی کو دق نہ کرو" ـــــ پنڈت جی نے یہ روکھا سا جملہ کیوں لکھ دیا! اور پھر اپنا آٹو گراف بھی دے دیا۔ حیرت کا مقام ہے۔ پنڈت جی تو ہندوستان کی ایک عظیم الشان ہستی ہیں۔ اتنے عظیم الشان انسان کے قلم سے اتنا روکھا پن! اس ٹورسٹ کو دیکھ کر وہ جھنجلا اٹھے ہوں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بیسیوں ٹورسٹ ہمارے لیڈروں کو آٹو گراف کے لئے دق کیا کرتے ہیں۔ لیڈر بھی آخر انسان ہوتے ہیں تنگ آجاتے ہیں۔ پنڈت جی نے یہی مناسب سمجھا ہوگا کہ اپنی ذہنی کیفیت کا اظہار کر دیں تاکہ کم از کم یہ ٹورسٹ آئندہ دوسرے لیڈروں کو تنگ نہ کرتا پھرے۔ مگر پنڈت جی کو یوں جھنجلانے سے گریز کرنا چاہئے تھا۔ ردک تمام درکار ہو تو پنڈت جی بھی آٹو گراف کے لئے کوئی

فیس مقرر کردیں یوں کانگرس فنڈ کی مدد بھی کی جاسکتی ہے تو کیا ایک دن سب لیڈر آٹو گراف کے لئے فیس مقرر کردیں گے! ......

پھر وہ ایک سوچ میں کھو گیا۔ پنڈت جی نے یہ جملہ کیوں لکھا —— آٹو گراف کے لئے کسی کو دق نہ کرو! .... ہو سکتا ہے، پہلے پنڈت جی نے اپنا نام لکھ دیا ہو اور پھر یہ ٹورسٹ ان کے قلم سے ایک آدھ جملے کے لئے اصرار کرنے لگا ہو۔ پنڈت جی نے کہا ہوگا —— "کچھ بھی لکھ دوں۔ منظور ہوگا؟" اور اس ٹورسٹ کے اثبات میں سر ہلانے پر انہوں نے یہ جملہ لکھ دیا ہو —— آٹو گراف کے لئے کسی کو دق نہ کرو!

معاً اُسے خیال آیا کہ دنیا میں ہر انسان کسی بڑے نصب العین کے لئے جی رہا ہے۔ یہ ٹورسٹ بڑے آدمیوں کے آٹو گراف لیتا پھرتا ہے۔ مگر وہ خود بھی کم بڑا نہیں ہے۔

پھر اس کی نگاہ بلیو بلیک سیاہی سے لکھے ہوئے ایک آٹو گراف پر پڑی۔

کوئی بھی آدمی دراصل حقیر نہیں ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھے تو یقیناً وہ بڑا ہے۔

پریم چند

یقیناً یہ مشہور افسانہ نگار پریم چند کا آٹو گراف تھا۔ اُس نے پریم چند کے بہت سے افسانے پڑھ رکھے تھے۔ اس وقت اُسے پریم چند کے اس پیغام سے بڑی تسلی نصیب ہوئی۔ اُس نے سوچا کہ وہ خود بھی ایک بڑا آدمی ہے۔ اپنے گاؤں میں آریہ پتری پاٹھ شالہ چلا کر اس نے ایک نمایاں کام کیا ہے۔ کھولی ہونگی۔ سر ابراہیم حکمت اللہ نے بڑی بڑی لائبریریاں۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے سکول کھول لینا، چاہے یہ سکول صرف پانچویں درجے تک ہی ہو، کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا......

اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ پرے چاند کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ سوچتا کہ اس کی زندگی بھی اس چاند کی طرح پھیکی پڑ گئی ہے۔ مگر اب تو وہ ایک نئی ہی زندگی محسوس کر رہا تھا۔ گویا وہ چاند کو بھی با آواز بلند کہہ سنانا چاہتا تھا کہ پھیکا پڑنے سے کیا فائدہ ہے، یوں اپنے کو حقیر سمجھنے سے کیا فائدہ ہے؟

اگر وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھے تو وہ یقیناً بڑا ہے۔

وہ سوچنے لگا کہ یہ پریم چند کا طبعزاد خیال معلوم نہیں ہوتا۔ شاید یہ کسی بزرگ کا پرانا قول ہے۔ وہ یہ بھول گیا کہ وہ دیرینہ کھانسی میں مبتلا ہے۔ اُس کی روح کا ذرّہ ذرّہ جاگ اٹھا اور یہ خیال کہ وہ بھی ایک بڑا آدمی ہے، اس کی روح کی گہرائیوں میں گونجنے لگا.....

بڑا تو میں ہوں ہی، ایک پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے اُس نے اپنے من سے کہا، بڑا تو میں ہوں ہی۔ میں ہی کیوں؟ ہر آدمی بڑا ہے۔ گویا ہر آدمی کو سمجھنا چاہیئے کہ وہ بڑا آدمی ہے۔

ایڈ گر ایلن پو نے ٹھیک ہی تو لکھا ہے، وہ سوچنے لگا —— "مجھے شہرت سے محبت ہے۔ میں شہرت کو پوجتا ہوں۔ شہرت کا ساغر میں تلچھٹ تک پینے کو تیار ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس دھرتی کے ہر شہر اور ہر قصبے سے، ہر میدان اور ہر گھاٹی سے میرے اعزاز میں خوشبو کے دھوئیں کی لپٹیں بلند ہوں۔ شہرت اور ناموری! ان کا سانس زندگی بخش ہے۔ یہ جیتا جاگتا درخشاں لہو ہے۔ جب تک آدمی شہرت نہیں پالیتا وہ گویا زندہ ہی نہیں ہوتا" —— مگر وہ صرف شہرت ہی کو بڑا ہونے کی کسوٹی نہیں مان سکتا۔ عظمت کا جوہر تو ہر آدمی کے پاس ہوتا ہی ہے۔ بس اُسے خود اس سے واقف ہو جانا چاہیئے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں گھومنے لگا۔ اس پر وجد کی سی حالت طاری تھی۔ کھڑکی کے باہر پھیکا چاند اب زیادہ سے زیادہ چمکا کرے گا میں بھی چمکوں گا..... مگر اس ٹورسٹ نے مجھ سے میرا آٹو گراف کیوں نہیں مانگا اب تک؟ امرت سا گر میں اس نے کونسی عظمت دیکھ لی تھی؟...... نہیں نہیں، میں نہیں کہتا کہ وہ بڑا نہیں ہے۔ اگر وہ سمجھے کہ وہ بڑا ہے تو ضرور وہ بڑا ہے لیکن میں بھی بڑا آدمی ہوں۔ میرا آٹو گراف اس کتاب میں ضرور درج ہونا چاہیئے۔

وہ پھر بیٹھ گیا۔ اُس نے آٹو گراف بک اٹھا لی۔ خالی ورق گنے۔ ان پر اڑیسہ اور آندھرا دیس کے بڑے آدمیوں کے آٹو گراف درج ہوں گے۔ خود ٹورسٹ نے اُسے بتایا تھا کہ وہ باقی سارے ہندوستان کی سیر و سیاحت ختم کر چکا ہے۔ یہ آٹو گراف بک بنواتے وقت اس نے سرسری طور پر یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہر صوبے

کے لئے کتنے ورق درکار ہوں گے۔ ان میں سے ایک صفحہ اب میرا ہے۔

اس نے قلم اٹھا لیا۔ اُس کی عجیب حالت تھی۔ وہ ایک نیا آدمی تھا ــــ آدھا آدمی، آدھا دیوتا! کھڑکی سے باہر سر نکال کر اُس نے اوپر آسمان پر نظر ڈالی۔ کہکشاں کی طرف وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ یہ بھی کسی کا آٹو گراف ہے، ہاں ضرور کس کا آٹو گراف ہے یہ؟ خدا کا آٹو گراف ہے۔ نہیں نہیں، شیطان کا آٹو گراف ہے۔ لیکن یہاں تو دو آٹو گراف ہیں ــــ خدا اور شیطان دونوں کے! مگر ابھی یہ سوچنے کی فرصت نہیں۔ کبھی پھر سہی .....

وہ آٹو گراف بک لے کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جہاں سے خالی ورق شروع ہوتے تھے، وہاں سے پہلے صفحے پر ہی اُسے لکھنا ہو گا۔ کس طرح شروع کرے؟ وہ سوچنے لگا۔

ایک منٹ، ڈیڑھ منٹ، دو منٹ۔

اب یہ صفحہ تو میری ملکیت ہے۔ ہاں ضرور۔ جو چاہوں لکھوں صرف اپنا آٹو گراف ہی کیوں نقش کر دوں؟ اُس صورت میں کہیں یہ ٹورسٹ پانچ سات دیگر آدمیوں کے آٹو گراف کے لئے جگہ نہ نکال لے۔ اس جمگھٹ میں میرا نام دب جائے گا۔ نہیں، نہیں، صرف آٹو گراف کا خیال درست نہیں۔ یہ سارا صفحہ میرا ہے۔

وہ لکھ رہا تھا ــــ

"یہ ٹھیک ہے کہ ٹورسٹ صاحب نے مجھ سے میرا آٹو گراف نہیں مانگا لیکن میں نہیں سمجھتا کہ کسی کام کے لئے اپنی خدمات پیش کرنے میں کسی طرح کی بُرائی کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت میں ایک مست دیوانہ ہوں۔ مجھے اپنی عظمت کا احساس ہے، یقین ہے۔ کوئی میری عظمت مجھ سے چھین نہیں سکتا۔

عظمت، شہرت، آٹو گراف۔

"اپنے گاؤں میں میں نے ایک پتری پاٹھ شالہ چلا رکھی ہے یہ ایک حقیقت ہے۔ میں نہیں کہتا کہ میں نے کوئی عظیم الشان کام کیا ہے۔ یہی کافی ہے کہ میں نے ایک بڑا کام کیا ہے۔

"عظمت اور شہرت دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ عظمت اور شہرت آٹو گراف بک کی زینت ہیں۔

یہ آٹو گراف بک پہلی بار میری نظر پڑی۔ خود ٹورسٹ کہیں باہر چلا گیا ہے۔ کون جانے اُسے آج کچھ کھانے کو بھی ملا یا نہیں۔

...... عظمت، شہرت اور خدا ..... اور پھر آٹو گراف بک!....."

وہ لکھتا گیا۔ سارا صفحہ بھر گیا۔ اس کا قلم نہ رکا۔ دوسرا صفحہ، تیسرا صفحہ۔ پھر اور، پھر اور۔ وہ ایک نیا آدمی بن گیا تھا۔ آدھا آدمی، آدھا دیوتا!

"ٹورسٹ صاحب نے ان گنت جگہوں کا سفر کیا ہے۔ یہ جو اتنے آٹو گراف دکھائی دے رہے ہیں۔ اس بات کا بدیہی ثبوت ہیں کہ اُس نے سیر و سیاحت کی ہے، ضرور کی ہے۔

کون جانے وہ سیر و سیاحت کے لئے کہاں سے روپیہ حاصل کرتا ہے۔ اس غریب ملک میں کون پہچانتا ہے ٹورسٹ کو اور اُس کی قدر و منزلت کو!

"اس آٹو گراف بک میں اڑیسہ اور آندھرا دیس کو چھوڑ کر سارے ہندوستان کی روح تھرکتی ہے اور جب اڑیسہ اور آندھرا دیس کے بڑے آدمیوں کے آٹو گراف بھی اس کتاب میں شامل ہو جائیں گے تو یہ کتنی بیش بہا چیز ہو گی، سچ مُچ کتنی بیش بہا.....!"

شدتِ تاثر کے باعث وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ یوں ہی بیچارے ٹورسٹ کی کتاب خراب کر رہا ہے اور جن اوراق پر وہ اپنا لمبا مضمون لکھ رہا ہے۔ اُن پر اڑیسہ اور آندھرا دیس کے سینکڑوں بڑے آدمیوں کے آٹو گراف لئے جانے تھے۔ جب ٹورسٹ نے یہ کتاب بنوائی ہو گی۔ اس وقت اسے ضرور یہ سوچا ہو گا کہ اس کتاب کی ضخامت میں سارے ہندوستان کے بڑے آدمیوں کے آٹو گراف سما سکیں اور جلد تو ڑ کر نئے کاغذ نہ لگانے پڑیں۔ جس سے خواہ مخواہ یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ بعد کے اوراق کے آٹو گراف اس نے خود حاصل نہیں کئے بلکہ کسی دوست کے ذریعے اس کے پاس آئے اور نہ ہی وہ اِس خیال کا حامی تھا کہ جب یہ بڑی کتاب بھر جائے تو کسی دوسری کتاب میں آٹو گراف لینے شروع کر دیئے جائیں۔

جب سب کے سب خالی اوراق بھر گئے۔ مطلب یہ کہ جب وہ پورے اڑیسہ اور آندھرا دیس کے طول و عرض سے بھی بڑا بن گیا، اُس نے اپنا نام لکھ ڈالا ــــ دھرمیشری داس، پریزیڈنٹ آریہ پتری پاٹھ شالہ، موضع بدوکے، تحصیل بھوہر گاؤں، ضلع شیخوپورہ۔

دیوندر ستیارتھی

غزل

مری آنکھوں سے ظاہر، خوں فشانی، اب بھی ہوتی ہے
نگاہوں سے بیاں دل کی کہانی، اب بھی ہوتی ہے

بہشتوں سے خفا، دنیائے فانی، اب بھی ہوتی ہے
جنوں کو حرصِ عُمرِ جاودانی، اب بھی ہوتی ہے!

سرور آرا، شرابِ ارغوانی، اب بھی ہوتی ہے
مرے قدموں میں دنیا کی جوانی، اب بھی ہوتی ہے!

کوئی جھونکا تو لاتی، اے نسیم، اطرافِ کنعاں تک!
سوادِ مصر میں عنبر فشانی، اب بھی ہوتی ہے!

وہ شب کے مشکبو پردوں میں چھپ کر آ ہی جاتے ہیں
مرے خوابوں پر اُن کی مہربانی، اب بھی ہوتی ہے

کہیں سے ہات آجائے تو ہم کو بھی کوئی لادے!
سُنا ہے اس جہاں میں شادمانی، اب بھی ہوتی ہے!

ہلال و بدر کے نقشے، سبق دیتے ہیں انساں کو
کہ ناکامی، بنائے کامرانی، اب بھی ہوتی ہے!

کہیں اغیار کے خوابوں میں چھپ چھپ کر نہ جاتے ہوں
وہ پہلو میں ہیں لیکن بدگمانی، اب بھی ہوتی ہے

سمجھتا ہے شکستِ توبہ، اشکِ توبہ کو زاھد
مری آنکھوں کی رنگت ارغوانی، اب بھی ہوتی ہے

وہ برساتیں، وہ باتیں، وہ ملاقاتیں کہاں ہمدم!
وطن کی رات ہونے کو سہانی، اب بھی ہوتی ہے!

خفا ہیں، پھر بھی آ کر چھیڑ جاتے ہیں تصور میں
ہمارے حال پر، کچھ مہربانی، اب بھی ہوتی ہے!

زباں ہی میں نہ ہو تاثیر تو میں کیا کروں، ناصح!
تری باتوں سے پیدا، سرگرانی، اب بھی ہوتی ہے!

تمہارے گیسوؤں کی چھاؤں میں اک رات گزری تھی
ستاروں کی زباں پر یہ کہانی، اب بھی ہوتی ہے

پسِ توبہ بھی پی لیتا ہوں، جامِ غنچۂ گُل سے
بہاروں میں جنوں کی میہمانی، اب بھی ہوتی ہے

کوئی خوش ہو، مری مایوسیاں فریاد کرتی ہیں
الٰہی! کیا جہاں میں شادمانی، اب بھی ہوتی ہے؟

بتوں کو کر دیا تھا جس نے مجبورِ سخن اختر
لبوں پر وہ نوائے آسمانی، اب بھی ہوتی ہے

اختر شیرانی

بد دُعا

افراد:

چندر ——— ایک دیوتا
اندر ——— دیوتاؤں کا راجہ
گوتم ——— ایک رشی
اہلیا ——— گوتم کی حسین و جمیل سادہ لوح بیوی

مقام۔ گنگا کے کنارے ایک جنگل
زمانہ۔ آج سے ہزاروں برس پہلے

پہلا منظر

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے۔ چاند کی سہانی روشنی اور پراسرار خاموشی دونوں مل جل کر ایک عجیب سماں پیدا کر رہی ہیں جنگل کے ایک گوشے میں پھولوں اور بیلوں سے ڈھکی ہوئی گوتم کی جھونپڑی ہے۔ اندر اور چندر کچھ دور کھڑے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔

چندر۔ رات غضب کی سہانی ہے۔ خاموش اور سنسان جنگل پر عجیب حسن چھایا ہے۔ اس وقت جبکہ زمین و آسمان پر خواب کا عالم ہے۔ مرت لوک کی دلفریبی سورگ کو بھی مات کر رہی ہے۔

اندر (کھوئے ہوئے لہجے میں) میں بھی کس قدر دھوکے میں مبتلا رہا۔ اس فانی حسن کے سامنے جمال تھا تو کچھ بھی نہیں یہ.... حسن ایک جیتا جاگتا ہنگامہ ہے۔ جس سے دل کے سمندر میں بیشمار طوفان بیدار ہوتے ہیں۔ مگر جمال تھا..... اگرچہ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔ مگر دلکشی اور شوخی سے دور ایک پھول مگر رنگ و بُو سے محروم..... چندر! تم سچ کہتے تھے۔ زندگی کا لطف سورگ کے روح پرور باغوں میں نہیں عالمِ فنا کے سبز و خرم جنگلوں میں ہے..... موت کے عذاب سے تو میں دیوتاؤں کا راجہ ہو کر بھی بری نہیں ...... برہما نے اس خوف کو چھپانے کے لئے سہانے گیتوں اور اپسراؤں کے دلفریب حسن کا پردہ ڈھکنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ دل کی آگ نہ دبی۔ جی چاہتا ہے۔ سورگ کے دمکتے ہوئے زرنگار سنگھاسن کو لات مار کر عالمِ فنا کے کسی خاموش گوشے میں آبسوں۔

چندر۔ ایسے خیالات مہاراج کے شایاں نہیں۔ آپ کے سے گیانی کے لئے ملمع کی ظاہری جھلک پر سونے کا گمان کرنا نامناسب ہے۔ ذرا غور کیجے مہاراج کہاں دیولوک اور کہاں ت لوک۔ وہ ہمیشہ روشن رہنے والا ایک آفتاب اور یہ تھوڑی دیر میں بجھ جانے والا ایک شعلہ۔

اندر۔ تم بھی دردمند نہیں ہو اس لئے احساسات کے گہرے سمندر کی تہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ تمہاری طرح میں بھی جب دل اور اس کی حقیقت سے بے خبر تھا۔ محبت کے سوز سے ناآشنا تھا کئی جگ اس کی لذت ناآشنائی میں بیت گئے۔ مگر اب ایک حورِ ارضی کے عشق نے مجھے اس کی اصلیت سے واقف کر دیا ہے۔ چندر! کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہم دیوتا ہو کر بھی محبت کے لطف سے محروم ہیں۔ ذرا سوچو تو روشنی کے بغیر اندھیرے اور گرمی کے بغیر سردی کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔

چندر۔ آپ گیانی ہیں۔ میں آپ کے گہرے خیالات کو نہیں سمجھ سکتا۔ مگر اس قدر عرض کر دینا بھی میرے کرم میں شامل ہے کہ ایک فانی ہستی کے لئے سورگ کی دائمی زندگی کو ٹھکرانا ٹھیک نہیں۔

اندر۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ تم ایک جسد نور کے سوا اور کچھ نہیں ہو۔ تم محبت کے سوز سے اسی طرح خالی ہو جس طرح دن کے وقت آسمان تاروں سے اور پتھر دل سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سُنو ندی پار کے درختوں سے کسی پرند کی درد بھری صدا آرہی ہے۔ اُف کیا تیر کی طرح دل میں اتری جاتی ہے

چندر۔ مہاراج یہ مرت لوک ہے۔ اس میں آہ و نالہ کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔ میری مانیں تو یہی اچھا ہے صبح ہونے سے پہلے دیولوک کو لوٹ چلیے۔

اندر۔ چندر تم خود مجسم نور ہو مگر دل تاریک احساس سے خالی میری نگاہوں میں ایک ارضی دیوی کی صورت سما چکی ہے میرے لئے اب سورگ کی تمام دلفریبیاں بے کیف اور سونی ہیں۔ چندر بھلا وہ حسن خود کس قدر روشن اور دلکش ہوگا جو صرف اپنی شہرت کی روشنی ہی سے دیولوک اور پاتال کو جگمگا رہا ہے۔

چندر۔ اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ اُس عورت کے حُسن کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اندر۔ اور برہما سے کس قدر فاش غلطی ہوئی۔ ایک رتن جو تاج شاہی میں جڑنے کے قابل تھا۔ کنکروں میں پھینک دیا گیا۔ وہ پھول جو باغ کے لئے رونق کا باعث تھا۔ وائے قسمت کہ قدر شناس آنکھوں سے دور ایک ویرانے میں پھولا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چندر تم نہیں جانتے۔ کسی ارضی ہستی پر میرا مائل بہ التفات ہونا معمولی بات نہیں۔ یہ ہیرا جو سنگریزوں میں پڑا ہوا اپنی آب و تاب سے بے خبر ہے میں اس کی ٹھیک طور پر قدر کروں گا۔

چندر۔ جی ہاں بجا ارشاد ہے۔ ہیرے کی قدر ایک جوہری ہی جان سکتا ہے مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اندر۔ اب بحث میں وقت ضائع نہ کرو۔ صبح ہونے میں ایک پہر باقی ہے۔ ابھی وقت ہے کہ ہم اپنے مقصد کو سرانجام دے سکیں۔ آؤ خاموشی سے میرے ساتھ چلے آؤ۔ تاکہ دن نکلنے سے پہلے اپنا کام ختم کرکے دیولوک کو لوٹ سکیں۔

چندر۔ (اُس کے پیچھے چلتا ہوا اچانک رُک جاتا ہے) مہاراج نہ جانے آج میرے قدم کیوں نہیں اُٹھتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُف بدن کا رُواں رُواں مارے خوف کے کانپ رہا ہے۔

اندر۔ (مڑکر) دل کو مضبوط کرکے آگے بڑھے آؤ۔

چندر۔ حکم عدولی کی مجال نہیں۔ جب سے دنیا کو روشن کرنے کی خدمت میرے ذمے لگی ہے۔ ایک لمحہ کی بھی کوتاہی نہیں کی۔ اب سے پہلے لاکھوں بار اس بن میں آچکا ہوں۔ مگر آج جیسی گھبراہٹ اور کپکپی مجھ پر کبھی نہیں چھائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مہاراج آثار بے ڈھب نظر آتے ہیں۔ وہ دیکھئے نیلے آسمان میں ستارے اس طرح جھلملا رہے ہیں۔ جس طرح بلی کی موت پر اندھیرے میں چوہوں کی مسرت بھری آنکھیں چمکتی ہیں۔

اندر۔ اتنے ڈرپوک نہ بنو۔ تمہاری پست ہمتی سے میرا پائے استقلال بھی ڈگمگا جاتا ہے۔ تمہیں یہ جان لینا چاہئے کہ آج چاہے کچھ ہو۔ میں اُس حُسن سامری کے جلووں سے اپنی آنکھوں کو ضرور روشن کروں گا۔ جس کی شہرت بسنت کے پھولوں کی طرح اپنی خوشبو سے نرلوک اور پاتال کو مہکا رہی ہے۔ تم آگے بڑھ کر حال معلوم کرو۔ وہ نازنین کٹیا میں کس حالت میں ہے۔ پھر سوچیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

(چندر مجبوراً آگے بڑھتا ہے) مگر ہاں ذرا ٹھہرو (وہ قدم روکتا ہے)

تم اُس حُسن کی ملکہ کے پاس جا رہے ہو۔ محتاط رہنا وہاں جاکر تیزی سے اپنی کرنیں نہ ڈالنا۔ مبادا وہ حور جس کی چاہ کی کشش نے ستاروں کی محفل سے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ خوفزدہ ہو جائے اور اس جسم نازنیں کو جس پر سے معطر ہوا کے نرم رو جھونکے بھی ڈر ڈر گزرتے ہوں گے، کوئی ایذا پہنچے۔ میں سمجھتا ہوں تم وہاں اس طرح جاؤ گے جس طرح آدھی رات

کا حسین سپنا ایک محوِ خواب کے پاس جاتا ہے۔

(چندر آگے بڑھتا ہے اور جھونپڑی کے ایک شگاف سے اندر جھانک کر خوف زدہ لوٹتا ہے)

اندر۔ (ہمہ تن اشتیاق) دیکھ آئے؟

چندر۔ اُف تن کا رواں رواں کانپ رہا ہے۔

اندر۔ (پریشان ہوکر) کیوں کیا ہوا۔ اس قدر پریشان کیوں ہو۔

چندر۔ مہاراج جان بچی لاکھوں پائے۔ سچ پوچھو تو جان ہی جان آئے تو عرض کروں آپکے محبوب کی تلاش کرتے ہوئے نظر غلطی سے گوتم جی کے خوابیدہ چہرے پر پڑ گئی۔ اف وہ برہم تیج تھا کہ ایک شعلہ جوالہ..... جبھی سے جان پر بن رہی ہے۔

اندر۔ خیر اچھا ہوا کہ زندہ سلامت تو لوٹ آئے مگر یہ تو کہو۔ اُس شعلہ حسن کو بھی دیکھا جس نے میرے سکون کو درہم برہم کر رکھا ہے۔

چندر۔ وہاں تو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ خوف کے مارے اوسان خطا تھے۔ اتنی سوجھ ہی کہاں تھی کہ نظر بھر کر کسی اور طرف دیکھ سکتا۔ مگر ایک جھلک سی دیکھی تھی۔ جس طرح گہرے اندھیرے میں شہابِ ثاقب چمکتا ہے۔ کچھ بیان نہیں کر سکتا۔ وہ حور اس طرح نیند کی گود میں آسودہ تھی جس طرح پہاڑ کے دامن میں ایک نوخیز ندی۔ مہاراج اگرچہ وہ سو رہی تھی۔ مگر کافر حسن سوتے میں بھی قیامت برپا کئے تھا۔

اندر۔ تمہارے یہ الفاظ میرے شوق کی آگ پر تیل کا کام کر رہے ہیں۔

چندر۔ مگر اس دُھن میں جان بچنا محال ہے۔ جس طرح سشروت گرما کی آندھی خاک پتوں کے ساتھ بڑے بڑے تناور درختوں کو بھی لے اڑتی ہے۔ ڈرتا ہوں برہمن کے غصے کی آگ کہیں مجھے بھی راکھ نہ کر دے۔

اندر۔ اب یہ حیلے بہانے فضول ہیں۔ خیر اسی میں ہے۔ میرے ہر حکم کی تعمیل کے لئے تیار رہو۔ جاؤ پچھم کی طرف سے اپنے وجود سے صبح کا ہونا ظاہر کرو۔ میں مرغِ سحر کی آواز نکال کر گوتم کو یہاں سے دور کرتا ہوں۔ وہ منہ اندھیرے گنگا کنارے عبادت کرنے کا عادی ہے۔ وہ سادہ لوح ہمارے اس فریب سے نہ بچ سکے گا۔ بس پھر میدان ہمارے ہاتھ ہے۔ اب دیر کرنا جان بوجھ کر شامت کو دعوت دینا ہے۔ جاؤ کھڑے کھڑے کیا سوچ رہے ہو۔

(چندر جاتا ہے اندر ایک طرف چھپ جاتا ہے)

دوسرا منظر

(جھونپڑی کے بند دروازے اور چھت کے روزنوں سے روشنی چھن رہی ہے۔ گھر کا مختصر سا سامان بخوبی نظر آرہا ہے۔ ایک طرف اونچے فرش پر گوتم جی محوِ خواب ہیں۔ ہموار زمین پر گھاس پھوس کے بستر پر اہلیا بے خبر سو رہی ہے۔ اور اچانک کوئی ہولناک خواب دیکھ کر چونکتی ہے)

اہلیا۔ دوڑو۔ بچاؤ۔ آہ میں چلی۔ میرے سوامی۔ ...آہ یہ اجگر...

گوتم۔ (بڑبڑا کر اٹھتے ہیں) کیوں۔ کیوں کیا ہوا...... ہوش کرو دیکھو میں تو تمہارے پاس ہوں۔

اہلیا۔ (ہوش میں آکر خوفزدہ لہجے میں) اف کس قدر بھیانک سپنا تھا۔

گوتم۔ اس قدر پریشان کیوں ہو۔ تمہاری گھبرائی ہوئی آنکھوں میں کسی خوفناک منظر سے دہشت کے آثار جھلک رہے ہیں۔

اہلیا۔ میرے سوامی مجھے اپنے قدموں سے لپٹا لیجئے میں اس طرح محسوس کر رہی ہوں۔ گویا کوئی فولادی ہاتھ مجھے زبردستی آپ سے الگ کرنا چاہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مصیبتوں کی آتشناک بجلی غضبناک ادا سے ہماری زندگی کی پریم بھری پھلواری پر گرنے کے لئے کسی غیبی اشارے کی منتظر ہے۔

گوتم۔ (فکر کے لہجے میں) میرا خیال درست نکلا۔ تم نے واقعی کوئی ڈراونا سپنا دیکھا ہے۔ اور خواب کی باتیں چنداں اعتبار کے قابل نہیں۔ مگر تم گھبرا رہی ہو۔ ابھی تک چہرہ زرد اور تن پر کپکپی ہے۔

اہلیا۔ آہ میں کیونکر یقین دلاؤں کہ مجھے آئندہ مصیبت کا احساس ہو رہا ہے۔ جب سے اس بھیانک خواب سے چونکی ہوں۔ عجیب بدشگونیوں اور منحوس وہموں کا شکار ہو رہی ہوں۔ داہنی آنکھ رہ رہ کر پھڑکتی ہے۔ کلیجہ بس میں نہیں آتا۔ ایک نامعلوم سا خوف روح پر چھایا ہوا ہے۔ میں نہیں جانتی

کہ میرے اس خواب کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے۔

گوتم۔ (اٹھ کر دروازہ کھولتے ہوئے) رات پھنکارتی ہوئی ناگنی کی طرح آہستہ آہستہ نور کے دریا کی طرف بڑھ رہی ہے تم روح کی لغزشوں کی پروا نہ کرتے ہوئے بھگوان کے چرنوں میں من کو لگاؤ پھر یہ حالت نہ رہے گی —— وہ دیکھو چاند پچھم میں درختوں کی اوٹ سے جھانک رہا ہے۔ (مرغ کی اذان سنائی دیتی ہے) صبح کے آثار پیدا ہیں سنو مرغ سحر بانگ دے رہا ہے۔ وقت آپہنچا ہے کہ میں اپنے ٹھکانے پر جاؤں۔

اہلیا۔ (اس کا ہاتھ پکڑ کر) میں آج آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ آج مجھے بنوبن کی وسیع فضا سے ڈر لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا ہر چیز مجھے تیز اور خوفزدہ کرنے والی نظروں سے گھور رہی ہے۔

گوتم۔ میں حیران ہوں۔ آج خلاف معمول یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے مجھے جانے دو۔ وہ دیکھو پورب میں پو پھٹا چاہتی ہے رات کا مسافر تیزی سے قدم مارتا ہوا مقام مقصود کی دھن میں جا رہا ہے۔ تم میرا راستہ کیوں روکتی ہو —— مجھے جانے دو۔ دور گنگا کے خاموش کنارے پر فرض مجھے بلا رہا ہے۔

اہلیا۔ میرے سوامی یقین کیجئے —— آج ضرور کچھ ہو کر رہے گا میں نے خواب میں راہو کو سورج کو اگلتے دیکھا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ میں آپ سے بچھڑ کر ایک اندھیرے جنگل میں اجگر کا شکار ہو گئی ہوں۔ مجھے یقین ہو چلا ہے کہ ہم پر کوئی ناگہانی آفت ٹوٹنا چاہتی ہے۔

گوتم (فکر یہ لہجے میں) بائیں آنکھ میری بھی پھڑک رہی ہے۔ دل گواہی دیتا ہے کہ غیب کے پردے سے ضرور کچھ ظاہر ہو گا مگر چاہے کچھ ہو میں اپنے معمول کو نہیں چھوڑ سکتا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ صبح کی دیوی نور کے لباس میں نغموں اور بیداریوں کا لشکر لئے۔ بڑھی آ رہی ہے۔ لو پرماتما کے حوالے۔

(جاتا ہے۔ اہلیا ایک غم میں کھوئی ہوئی بیٹھ جاتی ہے۔ میدان خالی پاکر اندر گوتم کے بھیس میں گھات سے نکلتا ہے۔ پاؤں کی آہٹ سن کر اہلیا سر اٹھا کر حیرانی سے دیکھتی ہے)

اہلیا۔ آپ اتنی جلدی لوٹ آئے۔

اندر۔ دل سے مجبور ہو کر —— دھیان تمہاری طرف لگا ہوا تھا پاؤں نے آگے بڑھنے سے جواب دے دیا۔ ناچار تمہاری محبت اور دلفریب حسن کی کشش سے کھنچتا ہوا لوٹ آیا۔

اہلیا۔ (گہری حیرت بھری نظریں اس کے چہرے پر گاڑے ہوئے) عادت کے خلاف آج آپ یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں آپ کی طبیعت کا اچانک اس طرح بدل جانا میرے لئے غیر معمولی حیرانی کا باعث ہو رہا ہے۔

اندر۔ (اصلیت کو چھپاتے ہوئے) مجھ سے تمہاری یہ پریشانی نہیں دیکھی جاتی۔ میری جان تمہارے سامنے آج مجھے دنیا کی ہر چیز ہیچ معلوم ہوتی ہے —— آؤ۔ میرے پاس آؤ کہ یہ پیاسی آنکھیں اس پیارے مکھڑے کو چومنے کے لئے بے تاب ہیں۔

اہلیا۔ (پریشانی سے) میں کہیں بھاگی جاتی ہوں۔ ہری بھجن آپ پر ایک ضروری فرض ہے۔ میں نہیں چاہتی آپ میرے لئے اور اس حسن کی خاطر جو فانی ہے جس کی عمر ایک شعلہ کی بھڑک سے بھی کم ہے۔ آپ اپنی عبادت اور سادھن میں خلل ڈالیں۔

اندر۔ یہ نصیحت بے کار ہے۔ اگر پریم کرنے سے سادھن میں رخنہ پڑتا ہے تو پڑنے دو۔ آؤ کہ اب مجھے صبر و ضبط کی تاب نہیں میرے لئے اب تمہیں ایشور روپ ہو۔ پریم دیوتا کی پوجا کے بعد اس کو بھی دیکھ لیا جائے گا۔

اہلیا۔ نارائن۔ نارائن۔ آپ کے خیالات کتنی جلدی بدل گئے ہیں۔ نہ جانے قسمت کیا گل کھلانے کو ہے۔ آپ کی عقل پر کیوں پردہ پڑ گیا۔ بھگوان کے لئے کچھ سوچئے —— اب سورج کو چراغ کون دکھائے۔

اندر۔ میرا سینہ محبت کی آگ سے جل رہا ہے۔ تمہارے حسن کے شعلے اس کو اور بھی تیز کر رہے ہیں۔ اب مجھے کچھ نہیں سوجھتا۔ زمین و آسمان تمہارے روپ میں میرے آگے ناچتے معلوم ہوتے ہیں اس خود فراموشی اور وجدان کے عالم میں تم یہ کیا وعظ کر رہی ہو میری جان! (آگے بڑھتا ہے

(چندر گھبرایا ہوا داخل ہوا)

چندر۔ مہاراج ـــ (اہلیا سہم جاتی ہے)

اندر (چونک کر مڑتے ہوئے) تم بغیر اجازت اس طرح کیوں آئے یہ تمہارے لئے اچھا نہ ہوگا!

چندر۔ (خوفزدہ ہوکر) مہاراج..... مصیبت..... برساتی ندی کی طرح بڑھتی آرہی ہے۔

اندر۔ (اطمینان دلاتے ہوئے) ابھی دِلّی دور ہے۔ جاؤ تم رتھ پر ہمارا انتظار کرو (چندر گیا)

اہلیا۔ (گہرے تعجب سے نظریں اندر کے چہرے پر گاڑ کر) میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور اس میں کیا بھلا ہے۔ میرے سرتاج آپ مجھے ایک عجیب رنگ میں نظر آتے ہیں جب سے وہ پُرجلال چہرے والا شخص آپ سے پُراسرار گفتگو کرکے گیا ہے۔ آپ کا چہرہ ایک گہرے تفکر اور بے پایاں خوف اور اضطراب کا مظہر ہے۔ میں نہیں جانتی کہ آپ کو کیا سمجھوں۔

اندر۔ (گھبراہٹ چھپاتے ہوئے) اے توبہ..... عورتیں بھی کس قدر شکی مزاج واقع ہوئی ہیں میں حیران ہوں تم اتنی پریشان کیوں ہو ـــ اور۔ اور۔ یہ تم اس قدر تیز اور خوفناک نظروں سے مجھے کیوں گھور رہی ہو۔ اُف ان اسرار شکن آنکھوں کو میرے چہرے سے ہٹا لو۔

اہلیا۔ میں جس قدر آپ کو معلوم کرنے کی کوشش میں غور سے دیکھتی ہوں۔ آپ مجھے اُسی قدر پُراسرار نظر آتے ہیں ہے بھگوان یہ کیا بھید ہے۔

اندر۔ میرے دل کی رانی۔ میں تمہیں زیادہ دیر تک دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ سنو کہ تم جو کچھ مجھے اب تک سمجھے ہوئے ہو میں اصل میں وہ نہیں ہوں ـــ لو اب میں حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھا کر۔ تمہیں اپنا اصلی روپ دکھاتا ہوں۔ (جوگیوں کا لباس اتار کر) دیکھو اور خوب غور سے دیکھو کہ میں کیا ہوں۔ کون ہوں اور اے حورِ ارضی تمہارے حسن کے جادو نے مجھے کیا کیا کرنے پر مجبور کیا۔

اہلیا۔ (انتہائی حیرت اور خوف کے عالم میں) اُف میں بھی کس قدر دھوکے میں مبتلا رہی۔ کیا معلوم تھا روشنی کے پیچھے اندھیرے کا سمندر لہریں مار رہا ہے (غصہ سے) عیّار۔ بہروپئے۔ سچ بتاؤ تم کون ہو بدکار! تو بن میں اس کرتوت سے تمہیں موت کا خوف بھی باز نہ رکھ سکا!

اندر۔ (قہقہہ مار کر) نادان حسینہ۔ تو واقعی دھوکے میں ہے ـــ اپنی حقیقت کو تو کس قدر غلط سمجھ رکھا ہے۔ سندری اندھیرے میں نہ رہو۔ اور سنو میں دیوتاؤں کا راجہ اندر ہوں۔ میری ذات پُن اور پاپ سے اسی طرح بری ہے جس طرح ہنس کے دریا میں رہتے ہوئے بھی نم نا آشنا ـــ اُس فریبی سادھو نے تمہیں کس قدر گمراہ کر رکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے میرے اعلیٰ مرتبے اور ملکوتی طنطنے سے تم محض نا آشنا ہو۔ ورنہ میری پہلی جھلک ہی تمہاری کج فہمی اور غرور کے جال کو تار تار کر دیتی ـــ

اہلیا۔ دیوتاؤں کا راجہ ہونے کا غرور نادرست ہے۔ میرے پتی کی ایک قہر بھری نظر تمہارے شاہی طنطنے اور دیوتا ہونے کے تکبّر کو جلا کر راکھ کر سکتی ہے۔ اور تمہیں سمجھنے میں بھی بھاری غلطی ہوئی ہے کہ عورت ان ظاہری طنطنوں اور پُرزور الفاظ سے مرعوب ہو سکتی ہے۔ یہی بہتر ہے کہ ٹھنڈے ٹھنڈے دیولوک لوٹ جاؤ۔ ورنہ میرے پتی دیوتا آئے تو تمہیں جان بچانی دشوار ہو جائے گی۔

اندر۔ سادہ لوح نازنین! اول تو میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ کوئی ارضی ہستی بھی اس قدر پُرجلال ہو سکتی ہے لیکن اگر یہ مان لیا جائے تو ذرا سوچو تمہارا کیا انجام ہوگا۔ مجھ پر تو کسی قسم کے جسمانی یا روحانی حربے کا وار کارگر نہیں ہو سکتا۔ مگر تم اُس کے غضب سے نہ بچ سکو گی۔ بہتر یہی ہے کہ اس سنسان جنگل کو اُس کے حال پر چھوڑ کر میرے ساتھ دیولوک چلو تاکہ یہ حسن جو اس بے قدری سے جنگل کے ایک ویران گوشے میں پڑا ہے وہاں حقیقی قدر پائے۔

اہلیا۔ (مرعوب ہوکر) یہ ٹھیک ہے میں اُن کے غضب سے نہ

سکوں گی میں یہ سمجھتی ہوں باوجود کوشش کے اُن پر اپنی بے گناہی ثابت نہ کرسکوں گی۔ مگر آپ کے ساتھ جانے پر بھی تو میری جان بچنی مشکل ہے۔ اُن کی غضب انگیز بد دعا سے میں پاتال میں بھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔

اندر۔ یہ اندیشے فضول ہیں۔ پارس پتھر کے چھونے سے لوہا بھی سونا ہو جاتا ہے۔ میری صحبت میں تم اداگون کے بندھن سے بری ہو جاؤ گی۔ میں اپنے جواہرات سے مرصع سونے کے رتھ پر جس میں آسمانی فضا میں اڑنے والے گھوڑے جوتے جاتے ہیں۔ جس کو بہلانے صرف میری سواری کے لئے بنوایا ہے۔ تمہیں لے کر بادلوں اور ستاروں کو روندتا ہوا اچھال کی سی تیزی سے ان آسمانوں سے کہیں دور نکل جاؤں گا۔ جہاں بد دعا تو کیا۔ خیال کا پرند بھی پر نہیں مار سکتا۔

اہلیا۔ چل اے میرے آسمانی ساجن میں تیار ہوں تمہاری پُر جلال صورت اور جادو بھری گفتگو نے مجھے اس قدر بے بس کر دیا ہے کہ میں اب انکار نہیں کر سکتی۔

اندر۔ اے حور صفت نازنین میں تمہیں اپنے خاص محل میں پٹ رانی بنا کر رکھوں گا۔ جہاں گلچہرہ اپسرائیں اور دیوتا امرت پیالے ہاتھوں میں لئے ہر وقت تمہاری خدمت میں حاضر رہیں گے۔ وہاں وہ سبھی چیزیں تمہارے قدموں میں ہوں گی جس کے لئے رشی منی برسوں ریاضت کرتے ہیں ـــــ اب وقت کم ہے ہمیں جلدی یہاں سے چلنا چاہئے۔ آؤ ـــ سامنے برگد کے سائے میں رتھ ہمارا انتظار کر رہا ہے۔

(دونوں قدم اٹھاتے ہیں چندر گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

چندر۔ مہاراج۔

اندر۔ (گھبرا کر) ـــ کیوں ـــ

چندر۔ وقت تنگ ہے اور مصیبت قریب۔

اندر۔ (اہلیا کی طرف دیکھ کر) پیاری۔۔۔۔

اہلیا۔ (اس کی نیت بھانپ کر) آہ جلدی بھاگو۔

(تیزی سے بڑھتے ہیں۔ گوتم قہر وغضب کی تصویر بنے داخل ہوتے ہیں۔ تینوں سہمے کھڑے ہیں)

گوتم۔ زمین و آسمان ٹکرا جائیں۔ ہوائیں شعلے برسائیں۔ ندی نالے بہتی ہوئی آگ بن کر دنیا کے نظام کو تباہ کر دیں۔ ہائے افسوس یہ تپوبن کی سرزمین پر گناہ کی اس قدر ارزانی۔ دیوتا ہو کر یہ نیچ کرتوت۔

اندر۔ (خوف وندامت کے عالم میں) مہاراج ۔۔۔

گوتم۔ خاموش بے حیا۔ دیوتاؤں کا راجہ ہو کر اس قدر نالائقی ـــ نارائن نے تجھے نور کی دنیا کا سلطان بنا کر پاپ اور پُن سے بری کر کے تیرا رتبہ سب سے بلند کیا۔ مگر افسوس تو نے وہ نعمت اور رفعت اس قبیح حرکت سے کھو دی۔ جا ـــ مری بد دعا ہے کہ تو جگوں تک انسانی جسم میں کوڑھی ہو کر جنگلوں میں بھٹکتا رہے (اہلیہ کی طرف تحقیر اور غصہ آمیز نظر سے دیکھ کر) بے وفا عورت تو نے میری امانت کو غیر کے ہاتھ سونپ دیا۔ تپسوی ہو کر اندریوں پر قابو نہ رکھ سکی۔ اور میری طرف سے بالکل پتھر ہو گئی۔ جا میں تجھے بد دعا دیتا ہوں کہ صبح ہوتے ہی تیرا یہ خوبصورت جسم پتھر ہو جائے اور تو اس وقت تک زمانے کی ٹھوکریں کھاتی رہے۔ جب تک بھگوان وشنو۔ رام اوتار لے کر تری مکتی نہ کریں (چندر کی طرف مڑ کر) تجھے پُر نور جسم دیا گیا کہ بھولے بھٹکے لوگوں کو روشنی ملے مگر تو نے اپنے فرض اور دھرم سے انحراف کیا۔ اور اس سازش میں شامل ہو کر خود کو اپنے اعلیٰ مرتبے سے گرا دیا۔ جا مری دُعا کے اثر سے ہمیشہ کے لئے اداگون کے چکر میں مبتلا رہ اور یہ سیاہ داغ جو اس گناہ کا شاہد ہے تیری روشن پیشانی کو بدنما بنائے رکھے ـــ اُف ـــ اتنی ریاضت کا پھل لمحوں میں ضائع ہو گیا۔ پُو پھٹ گئی۔ اے پاپ آتماؤں اپنے کئے کی سزا بھگتو۔ ہموان پربت کی برف پوش چوٹیاں مری راہ دیکھ رہی ہیں۔

(گوتم گئے ـــ مشرق سے صبح طلوع ہو رہی ہے۔ اندر کا جلال کوڑھ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور چندر کا نور زائل۔ بڑھتی ہوئی روشنی کے ساتھ ساتھ اہلیا پتھر ہوتی جا رہی ہے۔ وہ دونوں اس پر ایک نظر ڈال کر کٹیا سے نکل جاتے ہیں۔ اہلیا چہرے پر حزن وملال اور حسرت کے آثار لئے پتھر کا بت ہو جاتی ہے ـــ)

تاجور سامری

نادان

یہ کیسے منظر ہیں، — کیسی باتیں ہیں مجھ سے جو کہنا چاہتی ہو؟
سرود میں نے سنے ہیں پیڑوں کی ٹہنیوں سے —
چھلکتے نغمے،
فلک پہ بہتے ہیں بادلوں کے جو ننھے ٹکڑے —
پھسلتے نغمے،
ہوا کے جھونکوں سے میرے کانوں نے سُن رکھے ہیں —
مچلتے نغمے،
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔

ہوا سے بادل کے چند ٹکڑے بہے چلے جا رہے تھے، میں نے
اُنہیں جو دیکھا تو میرے دل میں جھجکتی آشا نے آہ بھر کر
کہا کہ یہ کیسی بات مجھ سے کہے چلا جا رہا ہے بادل؟
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔

مری نگاہوں نے شرم سے جھک کے دیکھا بہتی ہے ایک ندی
اور اس میں لہریں، اور اس میں کچھ بلبلے سناتے ہیں اک اچھوتا، عجیب نغمہ
سرود میں نے سنے تھے پتوں سے، شاخ سے، ابر سے، ہوا سے
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔

میں تنگ آ کر اُٹھا اور اُٹھ کر چلا، اُسی غم کدے میں پہنچا۔
مجھے جو لے کر گیا تھا ندی کی پھیلی پھیلی، کھلی فضا میں
مگر وہاں بھی وہی تھے — بادل، سیاہ، تاریک، چپ، ہٹیلے،
وہاں تھیں لہریں اُداس باتوں کی، بلبلے تھے، — کسی میں کوئی
نہ تھا دھندلکا،
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی
میں دیکھ کر اُن کو پوچھتا ہی رہا کہ آخر یہ بھید کیا ہے،
یہ کیسے منظر ہیں، کیسی باتیں ہیں، مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔

میراجی

بلّو کی بیر

بلّو ٹھاکر تھا اور بوگھا چمار۔ لیکن وہ دونوں قیدی تھے۔ دونوں کو ایک ہی لوٹا پیالہ ملا تھا اور دونوں کا کھانا بھی ایک ہی لنگر سے پک کر آتا تھا۔ پھر بھی سماج نے ذات پات کی جو دیوار ان کے درمیان کھڑی کر دی تھی وہ گر نہ سکی۔ ہاں، پاس رہتے ہوئے دو مصیبت زدہ انسانوں میں جو قدرتی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے وہ ان میں بھی ہو گئی تھی بلکہ اس ہمدردی نے اس رفاقت کا درجہ حاصل کر لیا تھا جو آپس کی فضول باتیں بھی برداشت کر لیتی ہے۔

اس کا سبب شاید یہ ہو کہ بوگھا کی بہ نسبت بلّو کو اس کی ہمدردی کی زیادہ ضرورت تھی۔

بلّو رہتک کے پاس موضع متھوالا ریاست جیند کا رہنے والا تھا۔ اُس کی شادی ہوئے چار پانچ روز ہوئے تھے۔ گونے کے آنے میں ابھی پندرہ بیس دن باقی تھے کہ اس کی پانی دینے کی باری آگئی۔ جب وہ کھیت میں پہنچا تو اس کا پڑوسی اپنے کھیت میں پانی دے رہا تھا۔ بلّو نے اسے پانی چھوڑنے کے لئے کہا کیونکہ اس کا پہر ختم ہو چکا تھا۔ مگر اس نے اپنا کھیت مکمل طور پر سیراب کئے بغیر پانی چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا۔ پانی کمزور پڑ رہا تھا۔ نہر نہ جانے کب بند ہو جاتی۔ بلّو کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ پے در پے صدموں کے باعث اس میں لڑنے کا بل نہ رہا تھا۔ مگر اب پانی نہ ملا تو کھیت سوکھ جائیں گے۔ اور فصل ضائع ہو جائے گی۔ اس نے منت سے کہا:۔

"دیکھو بھائی! یہ زبردستی ٹھیک نہیں۔ تمہارا وقت ختم ہو گیا۔ اب پانی مجھے دے دو۔"

"وقت ختم ہو گیا! کون کہتا ہے ختم ہو گیا؟ ابھی تو آدھا پہر بھی نہیں ہوا۔ بڑا آگیا وقت والا۔" پڑوسی نے بھنویں سکیڑ کر کہا۔

"غصے کیوں ہوتے ہو بھائی۔ مانس مانس سب ایک ہیں اور سبھی جان رکھتے ہیں۔"

"اوں سبھی جان رکھتے ہیں۔ جان رکھتا ہے تو لے لیا ہوتا بدلہ۔ تمہارا تو آدمی مار رکھا ہے۔"

بڑے عرصے کی بات تھی کسی بات پر لڑائی ہوئی تو اس کے دادا نے بلّو کے دادا کو مار ڈالا تھا۔ تب سے عداوت چلی آتی تھی۔ بلّو نے اسے بھول جانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنے غصے کو ضبط کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ چاہتا تھا کہ جاٹوں کی عام روش سے ہٹ کر آرام سے زندگی بسر کرے۔ لیکن سمندر سوکھے گا بھی تو کہاں تک۔ جاٹ کا غصہ تھا بھڑکانے پر پھر ابھر آیا اور پانی کو جتنا روک کر رکھا جاتا ہے، بند ٹوٹ جانے پر وہ اتنا ہی تیز چلتا ہے۔ بلّو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لٹھ کا ایک بھرپور ہاتھ چلایا۔ پڑوسی کی کھوپڑی پھٹ گئی اور وہ اوندھے منہ زمین پر ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھ سکا۔

بلّو کے خلاف قتل کا مقدمہ چلا۔ شہادتوں سے ثابت کیا گیا کہ بلّو مقتول کے کھیت میں اس کا وقت ختم ہونے سے پہلے گیا اور اُس نے محض بدلہ لینے کی غرض سے اسے قتل کر ڈالا۔ ارادتاً قتل کے جرم میں اُسے بیس سال قید کی سزا ہوئی۔

بلّو کو جیل میں آئے سات سال سے کچھ اوپر عرصہ ہو گیا۔ تب سے اب تک وہ تل تل کر کے گھلتا جا رہا تھا۔ اس کا سڈول جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ بیوی کا غم اسے اندر ہی اندر کھائے جاتا تھا۔ چونتیس پینتیس سال کی عمر میں یہ تیسری شادی ہوئی تھی۔ اس شادی کے آٹھ نو سال پہلے تین سال کے اندر اندر اس کی دو بیویاں — ایک ہیضے سے اور دوسری زچگی میں۔ موت کا شکار ہو چکی تھیں۔ جب سے بلّو گاؤں میں اور آس پڑوس کے دیہات میں بیوی خور

مشہور ہو گیا تھا اور کوئی آدمی اسے اپنی لڑکی دینے کے لئے تیار نہ تھا
آخر اس کے چچا نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اپنے سالے کی لڑکی
سے اس کی شادی کر دی تھی۔ شادی ہوتے ہی اس پر یہ مصیبت
ٹوٹی۔ ایک نوجوان عورت کا غم اور وہ بھی ڈھلتی جوانی میں۔ بلو
کو بخار رہنے لگا۔

پہلے وہ لکڑی گھر میں کام کرتا تھا مگر اب سخت مشقت کے نااہل
نظر آیا تو اسے بوگھا کے ساتھ ڈیوڑھی پر لگا دیا گیا۔ یہاں کام صرف
اتنا ہی تھا کہ کوئی افسر آئے تو اُٹھ کر سلام کر دے، ڈیوڑھی کھول
دے یا گھنٹی بجا دے۔ یہ بھی زیادہ تر بوگھا ہی کر لیتا تھا۔ بوگھا اگرچہ
بوڑھا آدمی تھا پھر بھی اپنا کام بڑے شوق سے کرتا تھا اور اسے
بلو کو تکلیف دینا بھی منظور نہیں تھا۔

یہ دونوں جلد ہی آپس میں گھل مل گئے ایک دن بلو نے اپنی
کہانی بوگھا کو سنا کر کہا:۔

"اگر اس وقت بات سہہ لیتے تو یہ نوبت کیوں آتی"!

ٹھاکر! بات ہی تو سہی نہیں جاتی۔ جو ناج کھاتا ہے اسے
غصہ بھی ضرور آئے گا" بوگھا نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

اس طرح بوگھا اکثر بلو کو تسلی دیا کرتا تھا۔ جب کوئی بوگھا کے
گھر سے ملاقات کرنے آتا تو بلو کو اپنے گھر کی یاد اور بھی ستانے
لگتی۔ لیکن اسے اس یاد سے چھٹکارا تو کبھی نہیں ملتا تھا۔ بوگھا رفتہ
رفتہ جیل کی زندگی سے مانوس ہو گیا اور وہ اپنے کام میں خوب دلچسپی
لینے لگا۔ اس نے گھنٹی بجانے میں وہ دسترس حاصل کر لی تھی۔
کہ قیدی اس کے انداز ہی سے سمجھ جاتے تھے کہ یہ گھنٹی پریڈ،
ڈاکٹر، روٹی یا کس چیز کی ہے۔ مگر بلو جب کبھی گھنٹی بجاتا تو ڈھیلے
ہاتھ سے دو چار بار ٹن ٹن کر دیتا۔ جب اسے اپنے دل کی دھڑکن
ہی میں کوئی لطف محسوس نہ ہوتا تھا تو وہ گھنٹی بجانے میں کیا لطف
حاصل کرتا۔

وہ ڈیوڑھی کے سامنے دیوار کا سہارا لئے بیٹھا رہتا تھا۔
سامنے سفیدے کا ایک درخت تھا۔ کچھ دنوں سے اس پر ایک
مینا آکر بیٹھنے لگی تھی۔ بلو بیٹھا اسے دیکھا کرتا تھا۔ بوگھا نے جب دیکھا
کہ بلو کی نگاہیں متواتر ایک ہی زاویہ پر پڑتی ہیں تو وہ بھی اس طرف
دیکھنے لگا۔

"یہ ہمیشہ اکیلی ہی بیٹھتی ہے"، بلو نے کہا

"ہاں، اکیلی ہی بیٹھتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کا ابھی جوڑا
نہیں بنا" بوگھا نے جواب دیا۔

"جوڑا تو غالباً بن گیا ہے لیکن شاید اس کے محبوب کو کسی
نے پکڑ لیا"!

"ایسا بھی ہو سکتا ہے"۔

"تو کیا اب وہ نہیں آئے گا"؟

"جب اسے پکڑ ہی لیا تو اب وہ کیا کرے گا"۔

بلو نے گہری سانس لی۔

اس کے بعد جب کبھی اسے موقع ملتا۔ وہ اس گفتگو کو دوہرایا
کرتا تھا۔ اس کے غمگین دل کو باتیں کرنے ہی سے قدرے تسکین
حاصل ہوتی تھی۔ وہ بوگھا سے ویسے ہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا
تھا۔ مثلاً ڈیوڑھی کے اوپر ایک مور تھا جس کی وجہ سے اسے مور ڈیوڑھی
بھی کہتے تھے۔ بلو نے ایک دن اوپر دیکھتے ہوئے پوچھا:۔

"یہ مور دھات کا بنا ہوا ہے"؟

"ہاں، دھات ہی کا ہے"۔ بوگھا نے جواب دیا۔

"جست ہوگا"؟

"اور کیا۔ اگر جست نہ ہوا تو لوہا ہوگا"۔

"اندر سے کھوکھلا ہے"۔

"ہاں کھوکھلا ہے اور بہت پرانا ہے۔ اب تو یہ سمجھو اس
کی میعاد ہی ختم ہو گئی۔

"اس کا یہ ایک بازو کیسے ٹوٹ گیا"؟ بلو نے دریافت کیا۔

بوگھا نے اسے بتایا کہ ایک دفعہ جیل میں قیدیوں کی دو پارٹیاں
تھیں۔ ان کی آپس میں لڑائی ہو گئی۔ افسروں کو پلٹن بلانی پڑی
اس وقت قیدیوں کو ڈرانے کے لئے گولی چلائی گئی تھی اور وہ
گولی اس مور کو لگی تھی جس سے یہ بازو ٹوٹ گیا تھا۔ بلو نے اس بات
کو تسلیم کر لیا۔ لیکن کچھ ٹھہر کر پوچھا۔

"بوگھا! یہ جیل کب سے بنا ہوگا"؟

"ٹھیک تو کچھ معلوم نہیں۔ پر جب یہ شہر بسا ہوگا تبھی یہ جیل

بھی بنا ہوگا۔"

"نہیں بوگھا!" بلّو نے قدرے مسکرا کر کہا۔ "میں اس جیل کی بابت نہیں پوچھتا۔ میں تو یہ پوچھتا ہوں کہ آدمی نے آدمی کو جیل میں رکھنا کب سے شروع کیا؟"

اب بوگھا اس کا کیا جواب دیتا۔ وہ سوچنے لگا کہ غم سے آدمی کی عقل تیز ہو جاتی ہے۔ وہ بولا :۔

"ٹھاکر! اتنا غم نہ کیا کرو۔ یہ غم اچھا نہیں ہوتا۔"

"بوگھا! میرے کیا بس کی بات ہے۔ بیر جوان ہے۔ اس کا غم تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"کیوں کرو تم اس کا غم؟ وہ تو تمہیں یاد بھی نہ کرتی ہوگی۔"

"نہیں بوگھا، نہیں۔ یہ کہہ کر میرا دل نہ توڑو۔"

بوگھا کو اب معلوم ہوا کہ بلّو کا غم کتنا گہرا ہے کہ وہ اس کا ساتھی بھی اس سے مذاق نہیں کر سکتا۔

مئی کا مہینہ تھا۔ بگلے جیل کے احاطے میں نیم کے درختوں پر گھونسلے بنا رہے تھے اور دن بھر سفیدے کی پھنگیوں پر سے تنکے توڑا کرتے تھے۔ مگر مینا وہیں بیٹھی رہتی تھی کبھی کبھار ادھر ادھر اڑنے چلی جاتی تھی اور پھر وہیں آ بیٹھتی۔ اب بلّو کے ساتھ بوگھا بھی فرصت کے وقت ادھر ہی دیکھا کرتا تھا۔

بلّو نے بوگھا سے کہا :۔

"بوگھا یہ گھونسلہ بھی تو نہیں بناتی۔"

"کیا کرے گی گھونسلہ بنا کر؟ اکیلی ہے جہاں ہو سکا بیٹھ گئی۔ آندھی مینہ آیا تو کسی درخت یا دیوار کے شگاف میں جا گھسی۔ گھونسلہ بنا کر وہ کیا لے گی۔"

"ٹھیک کہتے ہو بوگھا! اکیلے کا کیسا گھونسلہ؟" بلّو نے مایوس لہجے میں دہرایا اور پھر پوچھا: "اچھا! یہ بتاؤ کچھ لڑائی کی خبر بھی سنی؟"

"ٹھاکر! کون سنتا ہے ہمیں لڑائی کی خبر۔ ہو رہی ہوگی کہیں ہمیں تو اس سے فائدہ ہے نہ نقصان۔"

"فائدہ تو کیوں نہیں۔ کہتے ہیں کہ بہت فائدہ ہوگا۔ ذرا دیکھتو جاؤ۔"

"اچھا، دیکھ لیں گے۔ کسی نے پوچھا تھا۔ نائی بال کتنے ڑے۔ ہیں۔ وہ بولا۔ ججمان آگے ہی گریں گے۔"

بلّو کو زور کی کھانسی آئی۔ وہ اٹھ کر ایک طرف کو تھوکنے گیا اور واپس آ کر بولا :۔

"بوگھا حالت خراب ہو گئی ہے۔ تھوک کے ساتھ خون آیا ہے۔"

"خون آنا تو بہت برا ہے۔ معلوم ہوتا ہے تمہیں دق ہو گئی۔ علاج کرو۔ بہت برا مرض ہے۔"

"علاج کی ایک ہی کہتے ہو۔ جیل کی خوراک اس پر تیل کی سبزی اور بھی نقصان پہنچاتی ہے۔"

"یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ جیل کی سبزی نقصان پہنچاتی ہے۔ مگر گھوڑا گھاس سے نفرت کرے تو کھائے کیا۔"

"ٹھیک کہتے ہو بوگھا تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ قیدی اور گھوڑے میں فرق ہی کیا ہے۔ گھوڑے کو تھان پر باندھ کر کچھ کھلا دو اور قیدی بے چارہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

بلّو کو پھر کھانسی آئی اور اس نے خون کا لوندا تھوکتے ہوئے چھاتی پکڑ لی۔ تھوڑی دیر میں اسے بخار ہونے لگا اور اتنا تیز ہوا کہ بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ وہ چھٹی لے کر اپنے بستر پر جا لیٹا۔ شام کو ڈاکٹر آیا تو اس نے ہسپتال میں داخل کر لیا۔

بلّو کو ہسپتال میں پڑے لگ بھگ دو مہینے گذر گئے۔ اس کا جسم خون اور کھانسی کی شکل میں تبدیل ہو کر گلتا چلا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر دو وقت آتا اور تھرما میٹر لگا کر چلا جاتا تھا۔ بہت ہوا ایک آدھ مذاق کر دیا۔ بوگھا تقریباً ہر روز بلّو کی خبر کو آتا اور جتنا وقت اسے ملتا، بلّو کے پاس بیٹھا رہتا۔ بلّو جب بھی پوچھتا یہی پوچھتا :۔

"کیا اب بھی وہ وہیں بیٹھتی ہے؟"

"ہاں وہیں۔"

"اس کا جوڑا نہیں بنا؟"

"جوڑا تو شاید بن چکا ہے۔ لیکن اس کے محبوب کو کسی نے پکڑ لیا۔"

"تو کیا اب وہ نہیں آئے گا؟"

"جب اسے پکڑ ہی لیا تو اب وہ کیا آئے گا۔"

بلّو ایک گہری سانس لے کر رہ جاتا۔ بوگھا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا اور ان جھروکوں میں سے اسے پتہ چل جاتا کہ بلّو کے

سینے میں کتنی حسرتیں تڑپ رہی ہیں اور کتنے ارمان کروٹیں لے رہے ہیں۔ مگر وہ مجبور تھا اور بیمار تھا اس نے اپنی بیر کے لئے زندگی کی بازی لگا دی تھی۔

آخر اس کی حالت ناقابل علاج ہو گئی۔ سول سرجن نے معائنہ کیا اور حکم لگایا کہ اس کے پھیپھڑے خراب ہو چکے ہیں اور بیماری دل پر اپنا اثر ڈال رہی ہے۔ اب بلو کوئی دن کا مہمان تھا لیکن جب تک ایک بھی سانس بھی باقی ہے قانون اپنا بدلہ لے گا۔ انصاف اور قانون رحم و کرم سے واقف نہیں ہیں!

ایک شام پروا چل رہی تھی اور آسمان پر ہلکے ہلکے بادل منڈلا رہے تھے جس طرح مُردہ گھاٹ کے قریب گدھ منڈلایا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر بلو کو دیکھنے آیا اور اسے دوا پلاتے ہوئے کہنے لگا:۔

"کہو! اب طبیعت کیسی ہے"؟

"آج تو کچھ ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب"۔

"ہوں" ڈاکٹر نے معنی خیز انداز میں کہا اور پوچھا کسی بات کی تکلیف تو نہیں؟"

"حضور!" بلو نے کروٹ لیتے ہوئے کہا "یہ بیڑی بہت تنگ کرتی ہے"۔

"میں نے رپورٹ کر دی ہے۔ یہ کل اتر جائے گی"۔

"حضور مائی باپ ہیں۔ آپ نے بڑا رحم کیا۔ میں آپ کا یہ احسان عمر بھر نہ بھولوں گا" بلو نے صدق دل سے کہا اور پوچھا "میں کل ضرور چھوٹ جاؤں گا نا ڈاکٹر صاحب"؟

ریاست کے جیل میں بیڑی یا تو قیدی کی رہائی پر کٹتی ہے یا موت پر۔ یا پھر کسی خطرناک بیماری میں ڈاکٹر کی سفارش پر۔ بلو نے بیڑی اترنے کو اپنی رہائی پر محمول کیا اور یہ سوال کر بیٹھا۔ ڈاکٹر پہلے تو کہنا چاہتا تھا کہ بے وقوف تم سے رہائی کی بات کسی نے کہی ہے۔ مگر پھر کچھ سوچ کر وہ دل ہی دل میں اس کی سادگی پر ہنسا اور بولا:۔

"ہاں، کل تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔ اپنی بیر کے پاس جا کر اچھے ہو جاؤ گے نا"؟

مدقوق بلو مسکرا دیا۔

ارجن سنگھ بیماروں کی تیمارداری پر مقرر تھا۔ ڈاکٹر کی آخری بات اس نے بھی غور سے سنی اور یقین کر لیا کہ بلو کو کل رہا کر دیا جائے گا۔ پھیلتے پھیلتے بات سب میں پھیل گئی اور قیدیوں کے منہ چڑھی بات جلد نہیں چھوٹتی۔ وہ تو ذرا ذرا سی بات کو اس طرح کھوجتے رہتے ہیں جس طرح مرغیاں کیڑوں مکوڑوں یا دیمک کی تلاش میں لگی رہتی ہیں اور ہر ایک بات میں خوب تنقیحیں نکالتے ہیں۔ ایک ساتھی کے رہا ہونے کی بات تو خاص اہمیت رکھتی تھی۔ دو تین گھنٹے خوب چرچا رہا اور یہی چرچا کرتے وہ سو گئے۔

آدھی رات کے قریب ہوا اتنی تیز ہو گئی کہ آندھی چلنے لگی اور نہ جانے کہاں سے اتنے بادل اٹھا لائی کہ گھٹا چھا گئی۔ سارا ماحول تیرہ و تاریک ہو گیا۔ درختوں کے ٹہنے ہلنے اور بادل گرجنے لگے۔ سب قیدی اپنے اپنے بستر اٹھا کر بارکوں میں لے گئے۔ اور مچھروں کے خوف سے چادریں تان کر لیٹ رہے۔ ہوا کا زور بڑھتا گیا۔ بادل کی بھیانک گرج بڑھتی ہی گئی۔ درختوں کے ٹہنے ٹوٹنے لگے۔ آندھی مینہ اور اولے۔ ساری کائنات یوں کانپنے لگی گویا پانچوں عناصر آپس میں ٹکرا کر نظام ہستی کو پاش پاش کر دیں گے۔ اسی وقت بلو بڑبڑا اٹھا:۔ "بیر! بیر! ڈر دمت میں آیا۔ مجھے رہائی مل گئی۔ بیر! مت ڈرو میں ابھی آیا"!

اسے یوں بڑبڑاتا دیکھ کر ارجن سنگھ جس نے تھوڑی دیر ہوئی اپنا بستر اندر لگایا تھا بولا: "کیا بات ہے بلو"؟

"بیر! بیر! میں آیا"! بلو پھر چلایا۔

"کیوں بہکتا ہے آدھی رات کو۔ صبح چلا جائیو اب سو جا"!

بلو سو گیا!

صبح ہوئی نیم کے بہت سے ٹہنے ٹوٹ گئے۔ بگلوں کے گھونسلے اور شکستہ انڈے زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ ان میں نامکمل بچوں نے زندگی سے منہ موڑ کر موت کی چونچ سے چوگا لینا پسند کیا تھا۔

قیدی بارکوں سے نکلے اور بیڑیاں جھنکارتے ہوئے مشقت پر چلے گئے۔ بوگھے نے بھی اپنا لوٹا پیالہ اور کمبل اٹھا کر ڈیوڑھی کا راستہ لیا اور جمعدار سے تالی لے کر دروازہ کھولا۔ مگر اس کے دماغ میں آج غیر معمولی انتشار تھا۔ دروازہ کھولنے میں کسی دلچسپی یا انسانی

حس کو دخل نہیں تھا۔ اس نے بالکل ایک مشینی کل کی طرح اسے کھول دیا۔ کواڑ خلافِ معمول کھٹ سے دیوار میں لگا اور اتنا دھما کا ہوا کہ پرانی ڈیوڑھی کی چوکھٹ تک ہل گئی۔ مینا ٹوٹے ہوئے پر کے راستے رات کو اس کھو کھلے موری میں آ بیٹھی تھی۔ اب یہ شور سن کر اُڑی اور سامنے سفیدے پر جا بیٹھی۔

دروازہ کھول کر بوگھا نے اپنا آسن جمایا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ رہا۔ اُس کی نظر دہیں سفیدے کے درخت پر جا کر ٹکی اور مینا اپنی جگہ بیٹھی دکھائی دی۔ یہ سوچنے کی بجائے کہ کیا وہ رات آندھی اور مینہ کے طوفان میں بھی یہیں بیٹھی رہی۔ اس نے سوچنا شروع کیا۔

"یہ ہمیشہ اکیلی بیٹھتی ہے۔"

"اس کا ابھی جوڑا نہیں بنا۔"

"جوڑا تو شاید بن چکا ہے لیکن اس کے محبوب کو کسی نے پکڑ لیا ہے۔"

"تو کیا اب وہ نہیں آئے گا؟"

"جب اسے پکڑ ہی لیا۔ تو اب وہ کیا آئے گا۔"

آج بوگھا نے خود ہی گہری سانس لی۔

رہبر۔ بی اے

شعر

آغاز ہوا ہے الفت کا اب دیکھئے کیا کیا ہونا ہے
یا ساری عمر کی راحت ہے یا ساری عمر کا رونا ہے

حامد اللہ افسر

غزل

کبھی انجام سے خالی نہیں ہوتی خوشی میری
کوئی دیکھے! فروغِ دیدۂ تر ہے ہنسی میری

سرود و چنگ و نے کا دردِ دل سے کام لیتا ہوں
نہیں منت پذیرِ سازِ عشرت زندگی میری

میں ہمدم! اس لئے خاکسترِ سوزِ محبت ہوں
کہ منزل تک یہیں سے ہو سکے کچھ رہبری میری

کسی معصوم صورت پر تڑپ کر جان دے دوں گا
مرے ہمدرد! اک دن دیکھ لینا سادگی میری

شبانہ روز کی بیداد سے آگاہ اے ظالم!
خدا ناخواستہ کچھ رنگ لائے بے کسی میری

مری برہم زدہ حالت پہ دنیا کو نہ حیرت ہو
رہا کرتی ہے طوفانوں سے اکثر دل لگی میری

کہاں میں خاطرِ گلگشت جا نکلا، معاذ اللہ!
خزاں بن کر چمن پر چھا گئی افسردگی میری

بہ وصفِ قیدِ ہستی درد و غم کا اک نمونہ ہوں
جہانِ عشق میں اللہ رے آشفتہ سری میری

شمارِ جنبشِ یک دو نفس اور وہ بھی لا حاصل!
ارے اللہ! کوئی زندگی ہے زندگی میری؟

جو وہ چاہیں تو مرتا ہوں، نہ وہ چاہیں تو جیتا ہوں
غرض اک مضحکہ ہے ناخوشی میری، خوشی میری

مجھے کیا کام حرماںؔ کینۂ و بغضِ حریفاں سے
کہ میرے دردِ دل کا آئینہ ہے شاعری میری

حرماںؔ خیرآبادی

"عورت مشرق و مغرب میں"

لیفکیڈیو ہرن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مغربی ادب کی تفہیم و تنقید میں اہل مشرق کی راہ میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ وہ مغربی ماحول کو جہاں تک عورت کا تعلق ہے نہیں سمجھ سکتے۔ اور اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ مغربی تہذیب میں سب سے بلند مقام جنسی اتحاد و رفاقت ہے اور اسی لحاظ سے ازدواجی رشتہ تمام دوسرے رشتوں سے اہم سمجھا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مرد پر ہر حالت میں عورت کا احترام لازم ہے۔ تہذیب و شرافت کا تقاضا ہے کہ وہ عورت کی آسائش کو اپنی ضروریات پر مقدم سمجھے۔ عورت کو مغرب میں کم و بیش ایک دیوی کا سا مرتبہ حاصل ہے۔ لیکن مغربی تہذیب اس خصوصیت کے لئے خلافِ معمول رومن اور یونانی تہذیب کی زیر بار احسان نہیں۔ بلکہ یہ ان شمالی قوموں کی تہذیب کا اثر ہے جو قرونِ اولیٰ میں تمام دنیا میں پھیل گئی تھیں۔ اور جن کے ادبِ قدیم میں عورت کے اس بلند مرتبے کا اثر نمایاں طور پر موجود ہے۔ سکنڈے نیویا کا ادب خصوصاً اس کا مظہر ہے۔ بعد ازاں عیسائیت کے فروغ اور مریم عذرا کی پرستش نے ان احساسات کو اور بھی ترقی دی۔

اس جگہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی عورت کی یہ حیثیت مشرقی قوموں کے لئے اجنبی ہے۔ اور کیا واقعی مشرق و مغرب میں عورت کی حیثیت میں کوئی بنیادی فرق موجود ہے؟ ہمارے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ ہنود کے ہاں عورت کی قدر و منزلت مذہبی طور پر فرض ہے اور اس کا اندازہ اس چیز سے لگایا جاسکتا ہے کہ عام بول چال میں ان کے ہاں عورت کے لئے دیوی کا لفظ مستعمل ہے۔ رہا یہ سوال کہ آیا ازدواجی رشتے کو یہاں اہمیت حاصل ہے یا نہیں تو ہندی ادب میں خاوند بیوی کی باہمی محبت اور وفاداری کے تذکرے کثرت سے ملتے ہیں۔ ستی کی رسم بھی کسی حد تک اس مسئلے پر روشنی ڈالتی ہے۔ اہلِ اسلام میں اس رشتے کی اہمیت کا اندازہ قرآن کریم کی اس آیت سے ہو سکتا ہے۔ جس میں منصوص ہے کہ عورت مرد ایک دوسرے کا لباس ہیں۔ رہی یہ بات کہ مغربی تہذیب میں یہ تخیل کہاں سے داخل ہوتا ہے۔ تو غالباً پروفیسر موصوف کا یونانی اور رومن تہذیب کے اثرات سے انکار کرنا بھی کسی حد تک حقائق کو جھٹلانا ہے۔ اس جگہ یہ امر قابلِ غور ہے کہ جہاں تک نظری حیثیت کا تعلق ہے۔ مغربی عورت کو شاید مشرقی عورت کی بہ نسبت زیادہ آزادی حاصل ہو لیکن عملی زندگی میں اس کی تقدیر میں وہی محکومی و ذلت ہے جس کی وجہ سے مشرقی تہذیب کو اہلِ مغرب نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مغربی تہذیب میں عورت کو کوئی خاص فوقیت حاصل نہیں۔ البتہ عام طریق بود و باش میں جو آزادی ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ اس کے اعتبار سے وہ مشرقی عورت کے مقابلے میں زیادہ آزاد اور بہتر حالت میں نظر آتی ہے۔ یہ فرق خاص عورت کے لئے مخصوص نہیں بلکہ مشرق و مغرب کی تہذیبوں میں جو عام تفاوت موجود ہے۔ اسی کا ایک مظہر ہے چنانچہ اگر اہلِ مشرق مغربی ادب کو سمجھنے سے معذور رہے ہیں تو اس کا باعث عام ماحول کا اختلاف ہے نہ کہ اس ماحول میں صرف عورت کی حیثیت۔ مندرجہ ذیل امور اس نظریے کی کہ مشرق و مغرب میں عورت کی حیثیت کم و بیش یکساں ہے وضاحت کرتے ہیں:-

رومن کیتھولک نظریے کے مطابق تجرد کی زندگی سب سے پاکیزہ زندگی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مذہب کی رو سے جنسی تعلقات نہ انسانی ضرورت میں شامل ہیں۔ اور نہ انہیں مرد و عورت کی جائز مسرت کا ذریعہ ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ ان تعلقات کو صرف

اسی صورت میں حلال قرار دیا جا سکتا ہے جب ان سے مقصود افزائش نسل، بلکہ "بقائے نسل" ہو چنانچہ انسان میں ان جذبات کی ودیعت کا باعث بھی یہی ضرورت سمجھی گئی ہے۔ لیکن اگر ان اثرات سے ہٹ کر دیکھا جائے اور صنفی جذبات کی صحیح نوعیت کو جانچا جائے تو یہ امر واضح ہو جائے گا کہ جنسی تعلقات کی مسرت اور اولاد کی خواہش دو مختلف چیزیں ہیں۔ مرد و عورت کے تعلقات میں بنیادی چیز محض ان تعلقات کی لذت ہے۔ لیکن چونکہ اولاد ان کا قدرتی حاصل تھی۔ اس لئے وہ مسرت جو اولاد نے انسان کے لئے بہم پہنچائی۔ بعد کے تجربات نے اس کو بھی خالص جنسی مسرت میں مدغم کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اولاد کا نہ ہونا بدقسمتی تصور ہونے لگا۔ اولاد گویا ازدواجی رشتے کی کامیابی کا معیار بن گئی۔ یہ تخیل زراعت اور پیداوار کے اثرات سے اور بھی محکم ہو گیا۔ یہ مسئلہ کہ کیا انسان میں اولاد کی خواہش جبلی ہے اور کیا اس کے لئے غیر شعوری تحریکات فطرت انسانی میں موجود ہیں، ایک جدا بحث ہے یہاں اتمام حجت کے لئے اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ چیز انسانی فطرت میں موجود ہے۔ لیکن اس کا دار و مدار جنسیات کی بہ نسبت عضوی نشوونما پر زیادہ ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مغرب میں ازدواجی تعلقات کی اہمیت بھی انہیں وجوہ پر مبنی ہے جو اس کے لئے مشرق میں ذمہ دار ہیں۔ قبائلی زندگی میں چونکہ ذمہ داری اور مصائب دونوں کا عنصر موجود ہے۔ اس لئے عیسائی مذہب نے اس چیز کو صنفی جذبات کی وجہ جواز قرار دیا۔ گویا یہ اس مسرت کی ایک قسم کی قیمت تھی۔ سماج میں خانہ داری کے فرائض کو اسی لئے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ مرد و عورت کے تعلقات میں یہ فرائض کسی طرح بھی مسرت انگیز نہیں سمجھے جا سکتے۔ اس کے ساتھ ہی صنفی جذبات کی مذمت گویا اس بات کی دلیل ہے کہ سماج نے اس ضرورت کو تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن اپنے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے جنسیات کو اعلانیہ قبول نہیں کیا۔ شادی اور خانہ داری کے وہ قوانین جن کی آہنی گرفت سے مغربی زندگی بھی آزادی کے اس ڈھونگ کے باوجود آج تک آزاد نہیں ہو سکی۔ اسی حماقت کے پردہ پوش ہیں۔

ہماری بلند پایہ شاعری۔ فنون لطیفہ۔ جرأت و ایثار۔ اور ہمارے خواب ہی جنسیات کے مظاہر نہیں ہیں بلکہ انسانی زندگی میں یہ ایک اور بھی اہم تجربے کی اساس ہیں۔ جنسی محبت میں جسمانی اتصال، باہم مخلصانہ اتحاد۔ ایک دوسری انسانی ہستی کا علم و معرفت ہمیں یہ احساس دلاتی ہے کہ دو مختلف وجود آپس میں ایک گہرا ربط اور بے نظیر ہم آہنگی پیدا کر کے جی سکتے ہیں۔ اس احساس کی زندگی کی تلخیوں کو کم کرنے کے لئے کتنی ضرورت ہے اسے ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔ اسی احساس کی عالمگیری موجود سماج کی پیدا کردہ مشکلات کا حل ہے۔ یہی وہ احساس ہے جو انسان کو اشتراک محبت کی دعوت دیتا ہے۔ اور حصول مسرت کے لئے ایک دوسرے پر اعتبار کرنا سکھاتا ہے۔ مذہبی طور پر بھی شادی کا مقصد بے شک یہی باہمی مفاہمت و اختلاط ہے لیکن یہ حقیقی تعلقات اپنے استحکام کے لئے مذہبی احکام کے منت پذیر نہیں۔ ان کے عدم و وجود کے ذمہ دار اسباب مذہبی احکام سے جدا کچھ اور ہی ہیں۔ لیکن ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ان جذبات کی نشوونما کے لئے نہ مغربی ماحول سازگار ہے۔ نہ مشرقی۔ جنسی رجحانات کو بروئے کار لانے سے پہلے یہ سمجھ لینا کہ ان جذبات میں گناہ یا سفلی تحریکات کو کوئی دخل نہیں، لازمی ہے۔ صدیوں کی تعلیم نے جنسیات کے متعلق مغربی ذہن میں بھی ایک نہایت بیہودہ تخیل پیدا کر رکھا ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو مذہب کے قائل نہیں اور اپنے آپ کو وہم و تعصب سے بالاتر جانتے ہیں۔ جب صنفی مسئلے سے دوچار ہوتے ہیں تو ان کے دل و دماغ میں مشکوک اور متضاد خیالات کا ایک پریشان کن ہجوم پیدا ہو جاتا ہے۔ اخلاق کے علمبردار سرے سے جنسیات کا ذکر ہی معیوب سمجھتے ہیں۔ اور اس مسئلے کو چھیڑنے والے ان کے نزدیک جنسی آزادی کے محرک ہیں، لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جنسی تعلقات کی فراوانی جنسی آزادی مہیا نہیں کر سکتی۔ جنسی آزادی سے مراد موجودہ متعفن اور مضر ذہنیت کی اصلاح ہے۔ جنس سے متعلق احساسات میں پاکیزگی اور بلندی اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک جنسی میلانات سے گناہ کا تصور قطعاً علیحدہ نہ کر دیا جائے۔ اہل

فرانس عموماً جنسی معاملات میں بہت زیادہ آزاد اور مہذب خیال کئے جاتے ہیں لیکن وہاں بھی ان تعلقات کے متعلق ابھی تک تنگ نظری پائی جاتی ہے۔ عاشق۔ خاوند۔ بیوی اور اسی قسم کے دوسرے قدیم تصورات کا وجود وہاں بھی موجود ہے۔ اور ایزادِ مسرت کے لئے گناہ کی چاشنی وہاں بھی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ نوجوان عورتوں کی عفت اور ماں کی حیثیت سے اُن کی طہارت فرانسیسیوں کی نگاہوں بھی ویسی ہی قابلِ احترام ہے جیسی یہاں۔

ہر دوسرے دبے ہوئے جذبے کی طرح جنسی جذبہ بھی مغربی تہذیب میں بار بار ابھرتا ہے۔ مذہبی خوف کے زیرِ اثر اور جنسی جذبات کی شدت کے پیشِ نظر جنسیات کو خطرناک حد تک بغاوت انگیز سمجھا گیا ہے۔ اور یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اگر مرد و عورت کو تنہا چھوڑ دیا جائے تو وہ یقیناً بداخلاقی کے مرتکب ہوں گے۔ حالانکہ ایک نوجوان میں آزاد نشوونما کے دور میں یہ آخری ممکن چیز ہے۔ مخلوط نوجوان طبقہ کی صحیح تعلیم و تربیت۔ ان کے فرائض کی ذمہ داریاں محنت و مشقت کا ان کی عملی قوتوں پر اثر۔ ایسی چیزیں ہیں جو مخصوص اور مکمل جنسی تجربے کو اس وقت تک التوا رکھیں گی۔ جب تک وہ ان کی نشوونما کے لئے مضر ہے۔ صحیح تعلیم سے ان جذبات کو دبانا مقصود نہیں بلکہ ایک مطمئن زندگی کے لئے مختلف جذبات و افعال میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جب مرد و عورت پہلے پہل جنسی تجربات شروع کریں گے تو وہ بہت حد تک انہی کے ہو رہیں گے۔ لیکن اس کی مدت بہت قلیل ہے۔ کیونکہ تجربے سے سلیقۂ انتخاب بہت جلد پیدا ہو جائے گا۔ اس صورت حالات میں عورت کی آزادی نہایت اہم نتائج کی ذمہ دار ہوگی۔ معلمِ اخلاق کی نظر میں آزاد محبت اور جنسی تعلقات کی عام اجازت ایک ہی چیز ہے۔ خیر یونہی سہی۔ لیکن اس کے باوجود مرد و عورت میں زیادہ تعداد ان کی ہے جو آزادی کے باوصف نہ صرف جنسی انتخاب کے قائل ہیں بلکہ اس انتخاب کے بعد اکثر شادی بھی کر لیتے ہیں۔ اور پھر عمر بھر جنس ثانی کے کسی فرد کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ تھوڑی تعداد ان کی ہے جو گاہے گاہے اس مستقل رشتے سے باہر بھی ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور بہت کم ایسے ہیں جو سرے سے اس رشتے کی پابندی کے قائل نہیں۔ لیکن ان کی تعداد ہمارے مذہبی اور صوفی منش رہبروں کے اندازے سے کہیں کم ہے۔ کیونکہ جنسیات کے علاوہ اور بھی مسرتیں ہیں جن کے لئے انسان کوشش کر سکتا ہے۔ اس قسم کی آزادی میں بجز اس کے کہ وہ ہمارے روایاتی تعصب کی ضد ہے اور کوئی عیب نہیں۔

ادب مصوری اور دوسرے فنونِ لطیفہ پر مغرب میں بھی جہاں تک ان میں جنس کے اظہار کا تعلق ہے کافی پابندیاں پائی جاتی ہیں۔ آزاد اور تربیت یافتہ قوم کو جنسی جذبات کی اس طور پر نمائش سے کسی نقصان کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ قانونی تشدد کا عموماً ادب اور فنونِ لطیفہ ہدف بن جاتے ہیں لیکن عیارانہ کنائے بچ نکلتے ہیں۔ ایک رسالے کو تھوڑا عرصہ ہوا محض اس وجہ سے ضبط کر لیا گیا تھا کہ اس میں ازدواجی زندگی میں عورت کے لئے جنسی مسرت کو جائز کہا گیا تھا۔

اس بحث سے مسئلہ حقوقِ نسواں کا مسئلہ حل نکلتا ہے۔ کیونکہ عورتوں کا مردوں سے ہمسری کا دعویٰ مغربی تہذیب کی بعض پریشان کن مشکلات کا پیش خیمہ ہے۔ عموماً جب ایک جنس دوسری جنس پر حاوی نظر آنے لگتی ہے تو مغلوب جنس کی زندگی کا مقصد محض جنسیات اور عیالداری تک محدود رہ جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ مصرِ قدیم میں جب عورتیں مردوں پر غالب تھیں تو انہوں نے تمام کاروبار خود سنبھال رکھے تھے۔ اور مرد خانہ داری اور بچوں کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ یہ عورتیں بچوں کو دودھ بھی خود نہیں پلاتی تھیں۔ ان دنوں مرد عورتوں کو ملتفت کرنے کے لئے جنسی عوامل اور بناؤ سنگار کے اسی طرح غلام تھے جس طرح عرصے سے صنفِ نازک چلی آتی ہے۔ ٹیوٹن نسلوں میں اور کسی حد تک سپارٹا میں بھی عورتیں مردوں پر غالب رہی ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر یونانی اور رومن عورتیں مسلمان۔ چینی اور عیسائی عورتوں کی طرح مردوں کی غلام ہی چلی آتی ہیں۔ یونان اور چین میں البتہ عورتیں محض جنسی کھلونا ہی نہیں سمجھی جاتی تھیں بلکہ ماں اور گھر کی مالک کی حیثیت سے ہمیشہ ان کا احترام کیا گیا ہے۔ موجودہ چین کے حالات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مرد اور عورت کی زندگی میں ایک خلیج ضرور حائل ہے

عورتیں مکان میں اگرچہ اپنے علحدہ کروں کی مالک ہیں۔ وہ باہر بھی آجا سکتی ہیں۔ لیکن قریبی خون کے رشتہ داروں کے علاوہ عام مردوں سے میل جول نہیں رکھ سکتیں۔ متمول گھرانوں میں جہاں مرد اپنی زندگی کا معتدبہ حصہ باہر اپنے مرد دوستوں میں بسر کرنے کے عادی ہیں، وہ اپنی بیویوں کو جو انہیں آغازِ جوانی میں والدین کے ذریعے مل جاتی ہیں۔ زیادہ تر جنسی تسکین کا ذریعہ ہی سمجھتے ہیں لیکن چونکہ جنسیات کو مذموم نہیں سمجھا جاتا اس لئے عورت اس حیثیت میں بھی اپنی ہتک محسوس نہیں کرتی۔ اس کی زندگی زیادہ تر جبلی تحریکات سے وابستہ ہے۔ اور یہ چیز اسے کچھ ایسی ناپسند نہیں قرونِ وسطیٰ کی عیسائی عورتوں کی زندگی (اور کسی حد تک اس زمانے میں بھی) اس کے برعکس ایک مسلسل ذلت کی زندگی تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اس کی زندگی زیادہ تر جذباتی ہے لیکن مسئلہ گناہ اسے ان جذبات سے ہمیشہ ہراساں رکھتا تھا۔ خاوند سے اس کے جنسی تعلقات مذہب کی ایک خاص رعایت تھی۔ اور مادرانہ فرائض کی انجام دہی کے بعد اس کا جسم اس وقت تک ناپاک رہتا جب تک کلیسا کی متبرک رسوم اسے پاک نہ کر دیتیں۔ وہ سدا اس تذبذب کا شکار رہتی کہ اگر اس کی ازدواجی زندگی کامیاب ثابت ہوئی تو وہ یقیناً کسی گناہ کی مرتکب ہوگی۔ وہ چینی اور یونانی عورتوں کی طرح اتنی خوش قسمت نہ تھی کہ اپنی جبلی تحریکات کی تسکین میں مسرت محسوس کر سکے۔ اس قید و بند کی زندگی سے نجات کا ذریعہ صرف نفس کشی اور خانقاہوں کے تاریک گوشے تھے۔ قرونِ وسطیٰ کی اس خاردار شرع سے بچ نکلنے کی صرف تین ہی راہیں تھیں۔ چنانچہ صنفِ جمیل نے تینوں راہیں اختیار کیں۔ بعض نے ان زنجیروں کو علی الاعلان توڑ ڈالا اور معتوب ہوئیں۔ بعض نے اس مرحلے کو عیاری سے طے کیا۔ اور بعض نے تہذیب و نفاست کا جال پھیلا کر اپنے دین و دنیا دونوں بچا لئے۔ اور سماج نے انہیں خاتونِ محترم کا لقب دیا عیسائیت کے اس طلسم کو توڑنے کے لئے کئی طرح کی قربانیاں لازم ہیں تاہم عزتِ نفس کا تقاضا یہی ہے۔ اس دور کی عورتیں جتنی جلدی اس قسم کی مذہبی قیود سے بچ نکلنے کی کوشش کریں گی۔ اتنی ہی جلدی جنسی اور ازدواجی زندگی کی پریشانیوں کو مٹا کر

زندگی میں ہم آہنگی پیدا کی جا سکے گی۔ سماج کی تجدید اور ان افراد کی تخلیق جو اس جدید سماج کے علمبردار ہوں گے اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے۔ عورتوں کے ان حقوق کو محدود رکھ کر انہیں آزادی دینا یقیناً بے معنی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو انہیں پھر غلامی کی پرانی زنجیروں میں جکڑ کر حرم سراؤں میں بند کر دیا جائے گا، اور یا پھر وہ خود بڑھ کر علم و سائنس کے سرمایہ پر قبضہ کر لیں گی۔

ہمیں بار بار بتایا جا رہا ہے کہ فی زمانہ عورت کو مرد کے برابر حقوق حاصل ہیں۔ اور عورتوں کو ان کی نسوانیت کے اظہار کے لئے مطعون کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ اُن کی سیاسی آزادی کے منافی ہے لیکن عورت کا وہ تصور جو ہمارے ذہن میں موجود ہے۔ اور جسے آغاز ہی سے ہر لڑکی کے ذہن پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔ اسے مٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی جا رہی تعلیم نسواں کی ترقی کا بہت چرچا ہے لیکن صحیح معنوں میں تعلیم ابھی شروع بھی نہیں ہوئی۔ سکولوں اور کالجوں میں لڑکیوں کو مردوں جیسی تعلیم بے شک دی جاتی ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں کہ اس نسائی فطرت کو جو بہت حد تک انہیں ورثے میں ملی ہے اور جسے بعد میں ماحول کے اثرات اور بھی پختہ کر دیتے ہیں۔ خواہ مخواہ مردانہ پن ٹھونسا جاتا ہے۔ جسے وہ کسی حالت میں بھی قبول نہیں کر سکتیں۔ نادانستہ طور پر مائیں پیدائش کے دن ہی سے لڑکیوں کو نسائی شرم و حیا۔ نزاکت، احساس کمتری اور رضا بالہی کی تعلیم دینا شروع کر دیتی ہیں۔ اس سے بڑھ کر انہیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ کس طرح وہ اپنے آپ کو اس کردار میں پیش کر سکتی ہیں۔ جو حقیقتاً اُن کا نہیں ہے بجائے اس کے کہ ان میں صحیح کیریکٹر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ والدین اور تمام متعلقین کا لطف و مہر کا سلوک ان کے جسم اور دماغ میں قدرتی طور پر ایک نزاکت اور نرمی پیدا کر دیتا ہے۔ خواہ لڑکوں کو لڑکیوں کی خاطرداری پر مجبور کیا جائے یا بہنوں کو بھائیوں کے لئے ایثار کی تعلیم دی جائے۔ مساوات کا تخیل مجروح ہوئے بغیر نہیں رہتا اور لڑکیاں سمجھنے لگتی ہیں کہ اُن کی ذاتی قدر و قیمت تو کچھ ہے نہیں اور جو وہ کچھ ہیں تو محض اپنی نسائیت کی وجہ سے۔ عورتوں کے لئے عام رسم و رواج میں تہذیب جس احترام کا تقاضا

کرتی ہے۔ اس کا باعث جماعتی نہیں بلکہ جنسی امتیاز ہے۔ وہ عورتیں جو اپنی معیشت کے لئے مردوں کی مرہون منت نہیں۔ جو زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے برابر قدم اٹھاتی ہیں۔ اور ہر وقت حقوق نسواں کے لئے جنگ آزما نظر آتی ہیں۔ وہ بھی اس بات پر فخر کرتی ہیں کہ وہ عورت ذات ہو کر یہ سب کچھ کر رہی ہیں۔ گویا وہ زبان حال سے پکار رہی ہیں کہ ان کے لئے یہ مقام مسرت ہے کہ عورت ہر حال میں عورت ہی رہے گی۔ اور یہ ہے بھی سچ جب تک اسے عورت بننے کی تعلیم دی جاتی رہے گی۔ وہ عورت ہی رہے گی۔ تعلیم کا مقصد یہی ہے تا کہ ہم زندگی میں اپنا پارٹ ادا کرنا سیکھیں۔ چنانچہ جس نسبت سے لڑکوں کو مردانہ پن کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اسی نسبت سے لڑکیوں کو نسائیت کی تعلیم بھی ملتی ہے۔ اور ستم یہ ہے کہ اکثر کو اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں سکھایا جاتا۔

چینی اور یونانی عورتیں اس لحاظ سے بھی عیسائی عورتوں کی بہ نسبت بہتر ماحول میں تھیں۔ جس نسوانیت کی انہیں تعلیم دی جاتی تھی وہ کم از کم صحیح قسم کی نسوانیت تو تھی۔ عورت جنس کو اور اولاد کو پیار کرتی ہے چنانچہ وہ آزاد تھی کہ ازدواجی اور مادرانہ زندگی کی طرف بہ رضا و رغبت قدم اٹھا سکے۔ اور اپنی ان حسیات کو کھلے لفظوں میں بیان کر سکے۔ (ٹرائے ق م ۴۲۵) کی عورتیں اس بات پر کھلم کھلا اظہار افسوس کرتی ہیں کہ یونانی سپاہیوں کی آغوش میں ان کے جنسی جذبات انہیں اپنے وطن کی طرف سے غافل کر دیں گے۔ غم و مسرت میں یکساں طور پر جذبات کے دامن میں پناہ لینا۔ مرد و عورت کے درمیان جسمانی اختلاط سے ان کی روح میں جرأت۔ نزاکت احساس اور رحم کی شاہراہیں وا کر دیتا ہے۔ یہ نسوانی فطرت کی بے بہا دولت ہے جسے عیسائیت اپنی مجوزہ غیر فطری نسائیت کے تصور سے تباہ کر دینا چاہتی ہے۔ اور عورت کا ان احساسات سے رشتہ توڑ کر اسے مجروح اور منفعل جذبات کے ماتحت ایک ایسے رشتے پر مجبور کرتی ہے جو سراسر فرائض اور مصائب سے لبریز ہے۔

اپنی معیشت کے لئے ان باتوں کی نمائش جن پر ایمان نہ ہو ایک اخلاقی کمزوری سمجھی گئی ہے لیکن عورت کے معاملے میں اس چیز کو خدا جانے کیوں روا رکھا گیا ہے۔ مثلاً جو عورتیں مردانہ زندگی بسر کرتی ہیں۔ انہیں یہ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ وہ جنس سے بے نیاز ہیں اور جو عورتیں ازدواجی اور مادرانہ فرائض کو اپنے ذمے لے لیتی ہیں۔ انہیں اخلاقاً یہ جتانا پڑتا ہے کہ ان چیزوں میں ان کے لئے کوئی جذباتی ترغیب موجود نہیں بلکہ وہ انہیں فرض جان کر سرانجام دے رہی ہیں حالانکہ یہ دونوں چیزیں غلط ہیں۔ مرد کو اخلاق کی پابندیوں کے باوجود بھی اظہار جنس کا حق حاصل ہے لیکن عورت کے لئے شرم اور حیا داری کی پابندیاں اسے گھٹ کے مر جانے پر مجبور کرتی ہیں۔ مردوں میں بھی ان ہیجانات کے وجود سے انکار جن کو اچھا نہیں سمجھا جاتا اور حقائق کی تکذیب بعض حالتوں میں اخلاقاً اور تہذیباً جائز ہے۔ لیکن عورتوں پر اس کی پابندیاں بہت زیادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ریاکاری اور چاپلوسی کو عورت کی فطرت ثانیہ قرار دیا گیا ہے۔ عورت کو پہلے پہل تو یہ احساس دلایا جاتا ہے۔ کہ مردوں کے ہاں اس کی نسوانیت کی بہت قدر ہے۔ بعد ازاں وہ یہ بھی سیکھ لیتی ہے کہ جنسی ذرائع مرد کی جانب سے مالی امداد بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ شادی کے بعد یا بعض حالتوں میں جنسی بد اخلاقی کے ارتکاب پر عورت کو ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا ہے۔ فی الحقیقت عورت نے جب بھی جنسی یا مادرانہ جذبات کا اظہار کیا ہے اسے اس بات پر مجبور کیا گیا ہے کہ وہ مردوں کے سہارے جینا بھی سیکھے۔ مختصر یہ کہ عورت کے لئے اب بھی دو ہی طریقے ہیں یا مرد کی غلامی یا جذباتی تشنگی۔

اس بحث سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں تک ماحول کی عام آزادی کا تعلق ہے مغربی عورت مشرقی عورت کی بہ نسبت قدرے مختلف مقام پر نظر آتی ہے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ مغرب میں عورت کا تخیل مشرق سے جدا کچھ اور ہے۔ یا وہاں جنسی مسئلہ کو کسی مختلف نکتۂ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ماحول کا ذوق موجود نہ ہو تو مغربی عورت بھی انہیں زنجیروں میں جکڑی ہوئی نظر آئے جو مشرق میں عورت پر حاوی ہیں۔ ظاہر میں عورت وہاں آزاد اور مسرور نظر آتی ہے لیکن اس کے جذبات وہاں بھی جابرانہ پابندیوں کے بار سے نیم مردہ ہو رہے ہیں۔

(باجازت حلقۂ ارباب ذوق)

ریاض احمد

کشمکش

پھر وہی شورشیں اٹھیں وہی طوفان آئے
جانے کیوں خود کو فراموش کئے جاتا ہوں
کس لئے کس کے لئے زہر پئے جاتا ہوں
کھول لیتا ہوں جو نہی زخمِ جگر کے ٹانکے
کس تمنا میں انہیں پھر سے سئے جاتا ہوں

مجھے آغازِ محبت ہی میں انجام کی فکر
ہر گھڑی درد کے پیغام سنا دیتا ہے
میری محبوب ترے حُسن کا مبہم سا خیال
میری امیدوں کے خرمن کو جلا دیتا ہے

تو کہاں عرش کی پُر کیف فضاؤں کا خمار
تیری بھرپور جوانی پہ دل و جاں سے نثار
ترے ابرو۔ تری پلکیں۔ تری روشن آنکھیں
رنگ رخسار سے ملتی ہوئی مخمور بہار

اور کہاں میں! کسی مایوس تمنا کا نشاں
مرے آنسو مری آہیں، مری فریاد و فغاں
ان ڈھلکتے ہوئے قطروں کی حسیں لرزش میں
جھلملاتی ہے مرے درد کی تصویر نہاں

چاہتا ہوں کہ نہ چاہوں مری محبوب تجھے
تیری محدود سی دنیا میں خلل کیوں ڈالوں
تیرے معصوم حسیں رنگ گلستانوں کی
وحشتِ عشق سے ترتیب بدل کیوں ڈالوں

وائے ناکامی کہ مجبور ہوں لاچار ہوں میں
ہر گھڑی کشمکش غم میں گذر جاتی ہے
دیکھتا ہوں میں کبھی رات کی تاریکی میں
اک ابھرتا ہوا سایہ تری تصویر کے ساتھ
اور پھر رات کی تاریکی میں کھو جاتا ہے
گھورتا سایہ مری خواں شدہ تقدیر کے ساتھ

چیختی رات میں یہ گونجتی آوازیں کیا ؟
بے وفا میں تو نہیں کس لئے تاریکی میں
گھورتا سایہ ابھرتا ہے گذر جاتا ہے

لٹ گیا وقت کے ہاتھوں مرا سامانِ حیات
میں نے چاہا تھا بچا لوں پہ بچا بھی نہ سکا
دل کے ویران محلات کی تاریکی میں
شمع امید جلا لوں نہ جلا بھی نہ سکا

سسکیاں لیتی ہوئی نیم شبانہ آہیں
لب پہ آ آ کے پلٹتی ہوئی فریادیں چند
گھورتا سایہ۔ صدائیں۔ تری تصویر وہ رات
دلِ ناکام میں باقی ہیں ابھی یادیں چند
زندگی کشمکش غم میں گذر جائے گی

الطاف گوہر

بیوی جو زندگی سے بیزار ہو چکی تھی

اس کا مزاج سخت اور طبیعت چڑچڑی بن چکی تھی۔ کروشن کے استعمال سے اُسکی صحت بحال ہوگئی

ایک عورت لکھتی ہے "میری عمر ۳۹ برس کی ہے۔ اس کے باوجود کچھ ایام پیشتر میں سو سالہ بوڑھی محسوس کرتی اور دکھائی دیتی تھی اور بلا وجہ میں تھکاوٹ محسوس کرتی تھی۔ میں زندگی سے بیزار ہو چکی تھی۔ کیونکہ میرا مزاج اس قدر کرخت بن چکا تھا۔ میں ہر وقت اتنی تھکی ہوئی رہتی تھی کہ مجھے خیال پیدا ہوگیا کہ یہ زندگی میرے لئے مصیبت بن چکی ہے۔

میں نے کروشین کا استعمال شروع کردیا اور تب سے میں ایک مختلف عورت بن چکی ہوں۔ اور میں اب زندگی کو ایک بہترین نعمت سمجھتی ہوں۔

(مسز ایم۔ جی)





نوّے میں سے ننانوے کیس کے بدمزاج ہونے کا باعث خرابی صحت ہے۔ تند مزاجی کی وجہ اندرونی خرابی ہے۔ اندرونی اعصاب کے قدرتی افعال میں کوتاہی فاسد مادہ کا اجتماع اور خون میں زہر کا پیدا ہونا ہے۔ کروشین کی ایک چھوٹی سی روزانہ خوراک اس تکلیف کا خاتمہ کرتی ہے۔ تمام اعصاب کے قدرتی افعال کو بحال کرتی ہے کیونکہ ان کو روزانہ انتباہ کرتی ہے اور کام پر رجوع کرتی ہے۔ خون کو صاف کرتی اور طاقت دیتی ہے جو تمام سسٹم میں دورہ کرتا ہے۔ فرحت پھیلاتا ہے جس سے ہر رگ و ریشہ تنومند بن جاتا ہے۔ آپ محسوس کرتے ہیں۔ خوش و خرم ہیں اور آپ یقین کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز میں خوشی پنہاں ہے جو بھی دنیا میں آپ کے لئے ممکن ہے۔

کروشن سالٹ ہر دوا فروش اور سٹور سے مل سکتا ہے

KRUSCHEN SALTS



ٹھکانے

تیرا حلیہ ترے کردار کا آئینہ ہے
تیرا تانگہ ہے ترے حالِ پریشاں کی دلیل
چیختے پہیے، پھٹے گدّے، لرزتا گھوڑا
چغلی کھاتے ہیں تری بے سر و سامانی کی
تیری باتوں سے مجھے نشے کی بو آتی ہے
اٹھ رہی ہیں تری باتوں سے مہکتی لپٹیں
کتنا بازاری زباں پر تجھے حاصل ہے عبور
دھڑکنیں تیز ہوئی جاتی ہیں میرے دل کی
لطف اندوز فسانے ہیں زباں پر تیری
جی میں آتا ہے کہ بند اپنی میں آنکھیں کر لوں
اور جا پہنچوں سحر زار شبستانوں میں

تجربے تیرے تری بیش بہا دولت ہیں
حسن کے جادۂ زرّیں کے پرانے رہبر!
کتنے چمکیلے، رنگیلے ہیں یہ تیرے الفاظ
”بابو جی! ہاتھ جو چھو جائیں تو میلی ہو جائیں
ایسی خوش رنگ، پُرانوار، بلوریں کرنیں
میرے تانگے کی بنا کرتی ہیں زینت اکثر

اور لرزتے ہوئے آہستہ سے کہہ جاتی ہیں
”دلی دروازے کی تاریک گلی کے اندر
گھنگروؤں والے میاں شاہ کے تکیے کے قریب
نیم کی دائیں طرف زرد مکاں ہے میرا
منتے چڑھ جائے جو آسامی کوئی لے آنا“
دنیا، بابو جی!! خدا سے بھی نہیں ڈرتی ہے
ایسے کتنے ہی پتے اور بھی ہیں یاد مجھے“

کتنے چمکیلے، رنگیلے ہیں یہ تیرے الفاظ
دھڑکنیں تیز ہوئی جاتی ہیں میرے دل کی
آئی جاتی ہے تری منزلِ مقصود قریب
اور اے دوزخِ رنگیں کے پرانے رہبر!
تیری یہ طنزِ دل آزار، یہ پھیکی تنقید
”دنیا، بابو جی خدا سے بھی نہیں ڈرتی ہے“
میرے بے خوف جنوں کا، عزائم کیلئے
ایک سخت آہنی زنجیر بنی جاتی ہے
آج یہ جادو مگر مجھ پہ نہیں چل سکتا

مخمور جالندھری

[redacted]

حصۂ نظم:۔

آخری سجدہ

مری زندگی ترے ساتھ تھی، مری زندگی ترے ہات تھی
مری روح میں ترا نور تھا، مرے ہونٹ پر تری بات تھی
مرے قلب میں ترا عکس تھا، مری سانس میں تری باس تھی
ترے بس میں میرا شباب تھا، مری آس بھی ترے پاس تھی

ترے گیت گاتی تھی جب بھی میں مجھے چھیڑتی تھیں سہیلیاں
مگر اُن پہ کھل نہ سکیں کبھی مری زندگی کی پہیلیاں
میں ترے جمال میں محو تھی میں ترے خیال میں مست تھی
مجھے کیا سمجھتیں وہ لڑکیاں کہ میں اپنے حال میں مست تھی

تری شان میں مری شان تھی ترا دبدبہ مرا ناز تھا
تری دلبری مری جان تھی تری عاشقی مرا راز تھا
مگر اب شباب گزر گیا تو ترا نیاز بھی مر گیا
مرے رُخ پہ جھریاں دیکھ کر تو پلٹ کے جانے کدھر گیا

میں تری تلاش کروں مگر، مرا پستیوں میں مقام ہے
تو امیر ہے تو بلند ہے تو فلک پہ محوِ خرام ہے
اگر ایک پل کے لئے کبھی تو بلندیوں سے اُتر سکے
مرے اُجڑے اُجڑے دیار سے اگر ایک بار گزر سکے

تو مرے خلوص کا واسطہ، مری آرزو، مری آس، آ
مری بات سُن، مری بات سُن، مرے پاس آ مرے پاس آ،
نہ طلب کروں گی کرم ترا کوئی دوش بھی نہ دھروں گی میں
ترے پائے ناز پہ سر گرا کے بس ایک سجدہ کروں گی میں

(ہمایوں؟)

احمد ندیم قاسمی



ایڈیٹر صلاح الدین احمد پرنٹر پبلشر نے کمرشل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ادبی دنیا دی مال لاہور سے شائع کیا

[redacted]

جولائی ۱۹۴۲ء جلد ۲۰ - نمبر ۷

فہرستِ مضامین

ایڈیٹر: صلاح الدین احمد آنریری جائنٹ ایڈیٹر: قیوم نظر

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ فی پرچہ آٹھ آنے

مرکنٹائل پریس ... روڈ لاہور میں صلاح الدین احمد ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے چھپوا کر دفتر ادبی دنیا مال روڈ لاہور سے شائع کیا

BALANCE
AND THE BALANCE WHEEL



بیلنس اور بیلنس کی کمانی

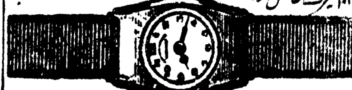
ایک گھڑی کی حرکت کے لئے ان کا وجود نہایت ضروری ہے کیونکہ صحیح وقت اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جبکہ بیلنس سپرنگ کی طاقت بیلنس کے وزن کے عین مطابق ہو۔

ویسٹ اینڈ کی گھڑیوں کے تمام ضروری پرزے عمدہ مکمل اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتے ہیں کیونکہ یہ سب سے جدید سائنٹفک اصولوں کے مطابق نہایت بڑے بڑے تجربہ کار کاریگروں کے ہاتھوں بنتے ہیں جو بہترین مال اور اعلیٰ کاریگری اس کی پائداری اور عمدگی کا بین ثبوت ہے۔



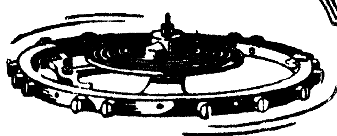
سیکنڈس مینچر چکور

رولڈ گولڈ کوالٹی دس سال .... ۵۳/-/- روپے
۹ کیرٹ خالص سونا " " ...... ۷۵/-/- روپے
۱۸ کیرٹ خالص سونا " ..... ۹۵/-/- روپے



سیکنڈس مینچر مستطیل

ویسٹ اینڈ پیٹنٹ یو ریراٹ سٹیل -/-/۵۷ روپے
رولڈ گولڈ دس سال کوالٹی -/-/۵۳ "
۱۸ کیرٹ خالص سونا " -/-/۹۵ "



اپنے فائدے کے لئے ہمیشہ ویسٹ اینڈ کی گھڑیاں خریدیے۔
مکمل اور باتصویر فہرست طلب کرنے پر ارسال ہوگی۔

ویسٹ اینڈ واچ کمپنی
بمبئی اور کلکتہ

WEST END WATCH Co
BOMBAY CALCUTTA

ترجمان حقیقت

حضرت علامہ

اقبال

کی

یادکو تازہ

رکھنے کے لئے

ان کی بہترین عکسی تصویر

سے اپنے کمرے کی

زینت بڑھائیے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

محصول ڈاک علاوہ

پیکنگ معاف

منیجر کتب خانہ ادبی دنیا
لاہور

دنیائے کاروبار

ایک رات

دو محبت بھرے دلوں کی دلگداز کہانی

شالیمار پکچرس کی کامیاب تصویر "ایک رات" شملہ اور منصوری میں نمائش کے لئے پیش کر دی گئی ہے۔ اسے ہر مذاق کی پبلک نے بے حد پسند کیا۔ شمالی ہند کے دیگر شہروں میں "ایک رات" جلد ریلیز کی جانے والی ہے۔ "ایک رات" کی کہانی زندگی کی کشمکش اور محبت بھرے دلوں کی تڑپ لئے ہوئے تھی اور ایک ایسی سوتیلی ماں کے احساسات کی آئینہ دار ہے جو اپنی لڑکی کی دنیا بنانے کے لئے سوتیلی لڑکی کی دنیا اجاڑنے پر تلی ہوئی ہو۔ ماں جانتی تھی کہ اس کی سوتیلی لڑکی ایک خوبصورت نوجوان کے ساتھ بچپن کی سادگیوں اور محبت کی سہانی چھایاؤں میں پل کر جوان ہوئی ہے۔ وہ دونوں پریم بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو پوجنے کی حد تک پیار کرتے ہیں لیکن وہ انہیں سرسبز نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے صحیح معنوں میں کانٹوں کا جال بچھایا اور اسے ہزار چیخ پکار کے باوجود اس میں دھکیل دیا۔ وہ اپنی دانست میں اسے زندہ درگور کر چکی تھی لیکن قدرت نے لڑکی کی سچی محبت برباد نہ ہونے دی اور حیرت انگیز طور پر اس کی ناکامی کامرانی سے بدل گئی وہ اپنے بچپن کے ساتھی کے ساتھ باہوں میں باہیں ڈالے پھر محبت کی چھایا میں پھرنے لگی۔ یہ سب کچھ بہترین نغموں اور مکالموں کے ساتھ آپ "ایک رات" میں ملاحظہ فرمائیں گے جو ڈائرکٹر ڈبلیو زیڈ احمد کے نکتہ رس قلم اور اشارات سے منسوب کی گئی ہے "ایک رات" آپ کے لئے شہر میں بہت جلد ریلیز کی جانے والی ہے۔

"یاد"

ایشیاٹک پکچرز کی ایک یادگار فلم ہوگی

"مظہر خاں نے اپنی زندگی میں ایک نیا قدم اٹھایا ہے۔ میں آپ کی عظیم الشان کامیابی کا خواہشمند ہوں"۔

یہ وہ الفاظ ہیں جو ہندوستان کے مایہ ناز ڈائرکٹر دی شانتا رام نے "یاد" کی مہورت کے موقعہ پر کہے۔ اور جہاں تک ہمیں اطلاعات پہنچی ہیں "یاد" واقعی ہندوستانی فلموں میں ایک یادگار فلم ہوگی۔

"یاد" کی کہانی انسانی زندگی کی طرح آنسوؤں اور قہقہوں کا مجموعہ ہے۔ جس کے مکالمے پنڈت شو کمار کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں اور گانے حضرت آرزو لکھنوی نے لکھے ہیں۔

"یاد" کے اداکاروں کا انتخاب بڑی چھان بین کے بعد کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے نامور کیریکٹر ایکٹر مظہر خاں ایک انوکھا اور اہم کردار انجام دے رہے ہیں۔ لاہور کی سندری حسن دینا اس فلم کی ہیروئن اور مسٹر ستیش ہیرو ہیں۔ ان کے علاوہ فلمی دنیا کی مشہور رقاصہ ازوری۔ "جھولا" کی شہرت یافتہ شہزادی۔ اندرا دیوی۔ ہادی کانتا کماری، ہارون اور چندا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

"یاد" کی ڈائرکشن مظہر خاں کر رہے ہیں اور ان حقائق کے پیش نظر یہ توقع کی جاتی ہے کہ "یاد" صحیح معنوں میں ایک یادگار فلم ہوگی۔

"روٹی" بمبئی میں "روٹی" کا شاندار خیر مقدم۔ محبوب دلمن ڈائرکٹر محبوب کو خراج تحسین و آفرین۔

نیشنل سٹوڈیوز کی ہنگامہ خیز پیشکش "روٹی" بالآخر منگل ۵ ۲؍اگست کو سوا سنک ٹاکیز کے پردہ سیمیں پر پیش کر دی گئی۔ افتتاح کے موقع پر شائقین کے عظیم الشان اجتماع کے متعلق صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ گذشتہ اٹھائیس سال میں آج تک کسی فلم پر پبلک کا اس قدر رش نہیں ہوا۔ (منیجر)

بزم ادب

آج میراجی ادبی دنیا کے ادارے سے رخصت ہوتے ہیں ہمیں اُن کی علیحدگی کا دلی افسوس ہے۔لیکن ہم سب حالات وکیفیات کے اسیر ہیں اور اُن کے عمل سے مجبور۔ میراجی کے زمانۂ معاونت میں ہمارے حصۂ نظم نے ترقی کے جو مختلف مراحل طے کئے اُن کے وجود یا اہمیت سے شاید بہت کم حضرات کو اختلاف ہوگا۔ اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ ہر جدید تحریک کی طرح نظم اردو کی اس نئی کروٹ کی حمایت بھی غلو و مبالغے کے عناصر سے مبرا قرار نہیں دی جاسکتی۔ جہاں تک ادبی رسائل کا تعلق ہے، وہ نہ صرف اپنے دور کے رجحانات کے آئینہ دار ہوتے ہیں بلکہ ایک حد تک ان رجحانات کی تخلیق اور رہنمائی کا فرض بھی ملک کے سنجیدہ رسائل ہی کے ذمے عائد ہوتا ہے۔ ادبی دنیا اس سلسلے میں اپنی ناچیز مساعی سے جو خدمات بجالاتا رہا ہے وہ اس کے ناظرین سے مخفی نہیں۔

مقامِ مسرت ہے کہ میراجی کی جانشینی ہمارے قابل دوست مولوی عبدالقیوم صاحب بٹ المتخلص بہ نظر کے حصے میں آئی ہے۔ اور انہیں اس ماہ سے ادبی دنیا کا اعزازی نائب مدیر مقرر کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ مولوی صاحب موصوف میرے دستِ راست ثابت ہوں گے۔ اور اگر ایک طرف وہ اردو نظم کے جدید رجحانات کے تحفظ و ترقی پر اپنی پوری توجہ صرف فرمائیں گے، وہاں دوسری جانب ہم قدامت پرستوں کے ذوقِ سخن کی تواضع سے بھی دریغ نہیں فرمائیں گے۔

اشاعتِ زیرِ نظر کے دونوں طبعزاد افسانے صفِ اوّل کے افسانوں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ مدھوسودن صاحب اپنی کم عمری کے باوجود ترقی کی منازل بڑی تیزی سے طے کر رہے ہیں۔ ان کے مطالعے کی گہرائی بڑھ رہی ہے۔ اور اندازِ بیان نکھر رہا ہے۔ اُن کی فنی تخلیق کا غالباً سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ ہمارے بعض دیگر افسانہ نگاروں کے خلاف نامانوس راہوں میں کبھی نہیں بھٹکتے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے اُن کا میدانِ عمل محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔لیکن یہ تو نہیں ہوتا کہ وہ ایسی چیزیں لکھ جائیں جن پر حقیقت خندہ زنی کرے اور مشاہدہ اپنا سر پیٹے۔ مدھوسودن صاحب کو ہمارا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ وہ اپنے لکھنے کی رفتار ذرا کم رکھیں۔ اب تک جو چیزیں وہ لکھ رہے ہیں، یقیناً بے حد قابلِ قدر ہیں، اور ہم نہیں چاہتے کہ بیش نویسی ان کے فن میں کسی قسم کی کمزوری پیدا کر دے۔

مہندر ناتھ صاحب کا دوسرا افسانہ ملاحظہ فرمائیے اور داد دیجئے۔ اگرچہ ہمارے ہاں چھپنے والا اُن کا پہلا افسانہ بھی اپنی طرز کی لاجواب چیز تھا لیکن موجودہ افسانے کی بے پناہ کنائیت اور اس کی نفسیاتی طغیانی اردو افسانہ نگاری میں ایک معرکۃ الآرا حیثیت رکھتی ہے۔ مہندر ناتھ نے ایک سماجی مسئلے کو ایسی نزاکت سے چھیڑا ہے جس طرح ایک ہوشیار سرجن اپنے تیز نشتر سے کسی کچے پھوڑے کو چھیڑتا ہے۔ الفاظ کا کلوروفارم شاید پڑھنے والے کو وہ ٹیس محسوس نہ ہونے دے جو افسانہ نگار نے مجبوراً پیدا کی ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ فنکار نے جس جرأت کا اظہار کیا ہے، وہ رائگاں جائے گی اور کسے خبر ہے کہ وقت کے ساکن تالاب میں یہ ننھا سا کنکر ایسی لہریں پیدا نہیں کرے گا جو بالآخر کناروں تک جا پہنچیں۔

صلاح الدین احمد

نوائے وقت

اب ابلقِ ایام نے بدلا ہے چلن جاگ — آفاق میں ہے بارشِ آلام و محن جاگ
یکبار گی جاگ اٹھے ہیں یارانِ کہن جاگ — اے صف شکن اے تیغ زن اے رُوئیں تن جاگ

اے فخرِ زمن نازِ وطن شیر فگن جاگ
اے فخرِ زمن جاگ

ممکن نہیں زندانِ مصیبت سے رہائی — مخلوق خدا دیتی ہے اب تیری دہائی
دشمن نے جہاں بھر میں ہے اک آگ لگائی — اس آگ سے محفوظ نہ گلشن ہے نہ بن جاگ

اے فخرِ زمن نازِ وطن شیر فگن جاگ
اے فخرِ زمن جاگ

نرگس ہے نہ لالہ ہے نہ سنبل نہ صنوبر — گم ہو گئے مٹی میں بہت آئینہ پیکر
مارے گئے حورانِ پری چہرہ کے شوہر — ماں بیٹے کو روتی ہے تو بھائی کو بہن جاگ

اے فخرِ زمن نازِ وطن شیر فگن جاگ
اے فخرِ زمن جاگ

تو اُٹھے تو ہو ظالموں پہ صاعقہ باری — تو نکلے تو اعدا پہ ہو اک زلزلہ طاری
تو جاگے تو گلشن میں چلے بادِ بہاری — مرغانِ چمن تنگ ہیں اے جانِ چمن جاگ

اے فخرِ زمن نازِ وطن شیر فگن جاگ
اے فخرِ زمن جاگ

بے کیف ہے اب کوثر و تسنیم کی خواہش — بے کار ہے تحصیلِ زر و سیم کی خواہش
بے فائدہ ہے عزت و تکریم کی خواہش — خطرے میں ہے اب آنِ وطن شانِ وطن جاگ

اے فخرِ زمن نازِ وطن شیر فگن جاگ
اے فخرِ زمن جاگ

آفات سے خالی نہ ہوا ہے نہ سمندر — ہر ذرے کی آغوش میں ہے فتنۂ محشر
میداں میں تڑپتے ہیں ہزاروں تنِ بے سر — اب تجھ کو ہے سوگندِ شہیدانِ وطن جاگ

اے فخرِ زمن نازِ وطن شیر فگن جاگ
اے فخرِ زمن جاگ

تو بسترِ غفلت پہ پڑا سوئے گا کب تک — گلشن میں بصد ناز و ادا سوئے گا کب تک
طوفانِ بلا میں بخدا سوئے گا کب تک — کانپ اُٹھے ہیں ایوانِ سلاطینِ زمن جاگ

اے فخرِ زمن نازِ وطن شیر فگن جاگ
اے فخرِ زمن جاگ

غمگیں ہے نظیرِ جگر افگار کی آواز — یہ مرنے کے ہیں طور یہ مٹنے کے ہیں انداز
ہنگامِ مسیحائی ہے دکھلا دے اب اعجاز — اے صف شکن، اے تیغ زن، اے رُوئیں بدن جاگ

اے فخرِ زمن نازِ وطن شیر فگن جاگ
اے فخرِ زمن جاگ

اصغر حسین خان نظیر

غالب کے اردو خطوط کی امتیازی خصوصیات

مرزا غالب شاعر کی حیثیت سے ایک خاص اہمیت کے مالک ہیں مگر مرزا جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ہی اچھے نثر نگار بھی تھے۔ گو ان کی اردو نثر کی شہرت اُن کی شاعری کے برابر نہیں مگر اردو نثر کی اہمیت بہت ہے بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ غالب کے اردو کلام کی شہرت زیادہ ہے اور اہمیت کم اور اُن کی اردو نثر (اردو خطوط) کی اہمیت زیادہ ہے۔ اور شہرت مقابلتاً کم۔ اصلاً نظم اور نثر دونوں کے اعتبار سے غالب سرآمدہ روزگار تھے۔ مرزا صاحب کی شاعری کو نقادانِ سخن نے ہر پہلو سے ٹھوکا بجایا ہے۔ مگر نثر کی جانب باوجودیکہ اُس کے مداح اور مقلدین بکثرت ہیں تنقیدی نظر سے کم توجہ کی گئی ہے۔ "اردوئے معلّٰی" کی مقبولیت اور شہرت عام نے اسے ملک کے طرز انشا کا معیار قرار دے دیا ہے اور ہر شخص جتنا اس کی تقلید میں کامیاب ہو جاتا ہے اتنی ہی مقبولیت حاصل کر لیتا ہے۔ عام ناظرین اس کو غالب کی جدت طرازی اور بے مثل ظرافت اور عدیم المثال بذلہ سنجی سے وقتی حظ اٹھانے کے لئے پڑھتے ہیں۔ عام طلبا اور نو مشق انشا پرداز اسے نمونۂ مشق بنا کر پیش نظر رکھتے ہیں مگر بایں ہمہ جس پہلو سے راقم نے اردو لٹریچر کے اس بیش بہا ذخیرے پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے اُس نگاہ سے ذرا کم اصحاب دیکھتے ہیں۔

"اردوئے معلّٰی" کی مثال بالکل ایک تاریک رات کے ستاروں کی سی ہے جن کو بعض شکم سیر بے فکرے آغوش خواب میں جانے سے پہلے لیٹے لیٹے دیکھا کرتے ہیں اور ان کی چمک دمک سے لطف اٹھاتے ہی اٹھاتے سو جاتے ہیں۔ اور بعض رہروانِ شب ہائے تار ان کی دھیمی غیر محسوس روشنی سے مشعل ہدایت کا کام بھی لے لیتے ہیں اور بعض شب زندہ داران کی گردش و رفتار کا ذرا غور سے مشاہدہ کر کے ان سے وقت کا تعین کرتے ہیں اور اپنے مشاغل کے انضباط وقت میں امداد لیتے ہیں اور بعض ان ہی اجرام فلکی کی رفتار اور دور سے موسمی تغیرات و اثرات کی پیشینگوئیاں کرتے ہیں۔ اور پھر کچھ ایسے بھی ہیں جو اس خصوص میں ذرا اور پیش قدمی کر کے نہ صرف دنیا کے عام حالات بلکہ ہر متنفس کے متعلق علیحدہ علیحدہ واقعات و حادثات کی پیشینگوئیاں کر دیتے ہیں۔ یہی مثال کم و بیش اس قیمتی اس لٹریچر کے بے بہا متروکہ کی ہے جو مرزا صاحب سے ورا۔ثتاً قوم کے افراد کو ملا ہے۔ بہر حال اس میں بہت کچھ ہے اور اس کے دیکھنے کے لئے آنکھ چاہئے۔ مجھ جیسے ہیچمداں سے جو ابھی طالب علمی کے مدارج طے کر رہا ہے۔ اس باب میں کچھ تحقیقات و انکشاف کی توقع تو کیا ہو سکتی ہے مگر ہاں! میری یہ ناچیز کوشش اگر نقادانِ سخن و محققین ادب کو اس طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوئی تو میں یہ سمجھ لوں گا کہ میری خامہ فرسائی بے کار محض ثابت نہیں ہوئی۔

غالب کی شخصیت اور ادبیت کو سمجھنے کے لئے ان کے اردو خطوط کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اتنا ضروری کہ اردو ادب کا طالب علم فورٹ ولیم کالج کی نثر اور سر سید کی ادبی تحریک کو اس کے مطالعے کے بغیر مکمل طور پر سمجھ ہی نہیں سکتا۔ مگر ان خطوط کی اہمیت پر ہم بعد میں روشنی ڈالیں گے سب سے پہلے ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ یہ گراں بہا خزینہ اردو نثر کو کیسے ہاتھ لگا یعنی مرزا غالب نے اردو

میں خطوط نویسی کیوں شروع کی۔ اور پھر وہ خطوط ہم تک کیسے پہنچے۔

مرزا صاحب ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے رہے اور جیسا کہ ان کے فارسی خطوط سے ظاہر ہے وہ یہ خطوط نہایت کاوش و جانکاہی سے لکھا کرتے تھے اور اس میں رنگینی عبارت اور تصنع کا خاص خیال رکھتے تھے۔ مگر ۱۸۵۰ء ہی سے غالب کے اردو خطوط کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسی سال وہ مرزا فخرو کے استاد بھی مقرر ہوئے اور اسی سال اُن کے سپرد عہدِ مغلیہ کی تاریخ نویسی کا اہم کام بھی ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس سال سے غالب کی آزاد طبیعت پر مصروفیت کے ساتھ ساتھ پابندی وقت کا بھی بارِ گراں پڑا اور اس لئے محمد یحیٰی تنہا سیر المصنفین میں لکھتے ہیں کہ مرزا غالب کو اپنی جدید مصروفیتوں کی وجہ سے فارسی میں خط و کتابت کرنے کا وقت نہ ملتا ہوگا اور اسی لئے وہ مجبوراً اردو میں خطوط لکھنے لگے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں تنہا نے حالی کی رائے پیش کی ہے۔

مزید ثبوت کے لئے وہ غالب کا ایک خط بھی پیش کرتے ہیں۔ جس میں مرزا غالب لکھتے ہیں "زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے پیرانہ سالی اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور اب یہ حال ہے ؎

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب ۔۔۔ اب عناصر میں اعتدال کہاں ۱۸۵۷ء

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ غالب نے اردو خطوط نویسی وقت کی قلت یا کمزوری کی وجہ سے نہیں شروع کی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ دربار سے رشتہ تعلقات قائم ہو جانے کی وجہ سے انہیں اردو شاعری اور اردو زبان سے زیادہ سابقہ پڑا اور ایک طرف انہوں نے اردو غزلیں کہنی شروع کیں اور دوسری طرف اردو خطوط نویسی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس دوران میں جو غزلیں لکھی گئی ہیں ان کی خاص شان سادگی ہے اور اکرام غالب نامہ میں لکھتے ہیں کہ یہ غزلیں اس وقت کہی گئی ہیں جبکہ شاہی کلام کی اصلاح کا بار بھی سر پر اٹھائے ہوئے تھے لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ یہ خطوط قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں اور غالب کا ارادہ ان کی اشاعت کا نہ تھا جیسا کہ ان کے چند خطوط سے صاف صاف مترشح ہوتا ہے، مثلاً منشی شیو نراین کو لکھتے ہیں "اردو رقعات بھی جو آپ چھاپا چاہتے ہیں۔ یہ زائد بات ہے کوئی رقعہ ایسا ہو گا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہو ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ ان کی اشاعت میری سخن وری کے شکوہ کے منافی ہے"۔ دوسری جگہ منشی ہرگوپال تفتہ کو یہ جواب لکھا تھا "رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے لڑکوں کی سی ضد نہ کرو اور اگر تمہاری اسی میں خوشی ہے تو مجھ سے نہ پوچھو تم کو اختیار ہے"۔

اشاعت سے انکار اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ واقعی انہوں نے یہ خطوط وقت کی قلت کی وجہ سے لکھے مگر اشاعت سے انکار کی وجہ کچھ اور ہی ہے یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس انکار کی پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ خطوط غالب کی "شخصی زندگی" سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن کی خودداری گوارا نہیں کرتی کہ "اپنے معاملات دوسروں پر ظاہر ہونے دیں" اور دوسری وجہ یہ ہے کہ غالب اپنے فارسی کلام کو اپنے اردو کلام سے بہتر سمجھتے تھے اور اسی طرح اپنے فارسی خطوط کو اردو خطوط سے بہتر سمجھتے تھے چنانچہ اس کی تصدیق انہیں کے ایک قطعہ سے ہو سکتی ہے جس کی نسبت مشہور ہے کہ انہوں نے ذوق سے خطاب کیا ہے۔

فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است
راست می گویم من از راست سر نتواں کشید
آنچہ در گفتار فخر تست آں ننگِ من است

ڈاکٹر زور کی رائے ہے کہ غالب نے عمداً اردو اسلوب کی طرف توجہ نہیں کی مگر ضمناً اردوئے معلّیٰ اور عودِ ہندی جیسا گرانبہا خزانہ جمع کر دیا۔ یہ کتابیں تاریخ اسلوب بیان میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ خطوط میں وہ سادہ اور دلی کی روزمرہ زبان استعمال کرتے تھے۔ گو ان کی تقریظیں اور دیباچے بالکل مقفّیٰ اور مسجّع ہیں۔ ظرافت کی موجوں سے مخاطب کے دامن کو سرور و انبساط سے بھر دیتے ہیں۔ وہ ایک ترکیب لفظی یا چھوٹے جملے ہیں وہ بلت کہہ جاتے ہیں کہ آدمی پڑھے اور مزہ لیا کرے"۔

ان تمام باتوں پر نظر کرتے ہوئے یہ ہی کہنا پڑتا ہے کہ درباری

تعلقات کی بنا پر غالب کا رجحان اردو زبان کی طرف زیادہ ہو گیا اور انہوں نے اردو میں خط و کتابت شروع کر دی۔ ممکن ہے کہ اس میں ان کی عدیم الفرصتی اور ضعف پیری کو بھی دخل رہا ہو۔ مگر اس سے بھی زیادہ دلچسپ سوال ان خطوط کی اہمیت کا ہے جو کہ ہمارے اس مختصر مضمون کا اصل موضوع ہے

ان خطوط کی تین نہایت کھلی اہمیتیں ہیں یعنی ۱ سوانحی ۲ تاریخی اور ۳ ادبی، اب ہم ان تینوں سے بالتفصیل ترتیب وار بحث کرتے ہیں۔

سوانحی۔ ان خطوط میں غالب نے اپنی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے اپنے بارے میں کیا خیالات تھے؟ اپنے دوستوں کا کس قدر لحاظ کرتے تھے، اور ان کا برتاؤ اپنے دوستوں اور شاگردوں کے ساتھ کس محبت کا تھا؟ شاگردوں کے کلام کی اصلاح کا کیا اہتمام تھا؟ خطوط کا جواب لکھنے میں کتنی پابندی سے کام لیتے تھے؟ حتیٰ کہ یہ خطوط صاف صاف بتلاتے ہیں کہ غالب کیا کھاتے تھے اور کیا پیتے تھے اور آمدنی کے ذرائع کیا تھے؟ مالی پریشانیوں کا مقابلہ کس طرح کرتے تھے اور اپنے خاندانی وقار کا کس حد تک پاس رکھتے تھے؟

تاریخی۔ ۱۸۵۷ء کے سانحۂ عظیم سے دہلی پر جو کچھ آفت نازل ہوئی اس کی حالت بتلانے سے غالب کا اردو کلام بالکل قاصر ہے۔ مگر ان خطوط سے دہلی کی اس اجڑی ہوئی حالت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ انہوں نے اکثر خطوط میں دہلی کی اس المناک حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ ان کے اکثر دوستوں نے ان سے دہلی اور اہل دہلی کے متعلق سوالات کئے ہیں جن کے جواب غالب کے مجموعۂ اردو خطوط میں موجود ہیں۔ اس سے ایک اور اہم نکتہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ بعض حضرات غالب کو قومی شاعر سمجھتے ہیں اور ثبوت میں ان کے کلام سے اشعار پیش کرتے ہیں۔ مگر ان خطوط میں غالب جو دہلی کی اجڑی ہوئی حالت پر اشک افشاں ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ مسلمانوں پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا یا اُن کی ہفت صد سالہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا بلکہ یہ سارا ماتم شخصی اور ذاتی ہے غالب اس لئے گریاں ہیں کہ اُن کا شہر ویران ہو گیا ان کے احباب تباہ حال ہو گئے۔ اُن کی سوشل زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اُن کے مربی رؤسا کا نام و نشان نہیں باقی رہا۔ اُن کا شہر بے رونق ہو گیا۔ اُن کے دوست نان شبینہ کو محتاج ہو گئے اور بستر بزم سے خاکستر گرم پر بٹھا دیئے گئے۔ غرض اُن کے ماتم میں کہیں قوم پرستی کی شان نہیں پائی جاتی اور یہ چیز اُن کے قومی شاعر ہونے کے منافی ہے

ادبی۔ یہ خطوط اپنی ادبی اہمیت کی وجہ سے خاص طور پر مشہور ہیں۔ یہ انہیں خطوط کا اثر تھا کہ اردو مکتوب نویسی میں ایک نئی راہ کی داغ بیل پڑ گئی ورنہ بہت ممکن تھا کہ اردو مکتوب نویسی بھی انشائے مادھو رام اور رقعات بیدل کی تقلید کا شکار ہو کر ایک معما یا دفتر پارینہ بن جاتی اور لوگ ان کی شاعری کی طرح ان کی نثر کی مشکل پسندی کے بھی شاکی ہو جاتے۔ نثر اردو کی تاریخ میں یہ خطوط فورٹ ولیم کالج کی نثر اور سرسید کے دور کو ملاتے ہیں یعنی یہ خطوط اس زنجیر کی "درمیانی کڑی" ہیں۔ غالب کے خطوط براہ راست اردو نثر کی ترقی کے معاون ہوئے ہیں۔ سادگی، صفائی، سلاست، روانی، جدت تحریر، ظرافت بیان، بلاغت، معانی، محاورہ اور روزمرہ کی چاشنی کے لئے اردو نثر انہی کے طرز تحریر کی مرہون منت ہے۔ حالی جیسے عقیدتمند شاگرد مرزا غالب کی شاعری سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ مگر غالب کی نثر سے وہ بہت متاثر ہوئے ہیں۔ ان کی نثر میں بھی یہی سادگی اپنی بہار دکھاتی ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ غالب کے طرز تحریر کی تقلید بہت آسان ہے۔ اصلاً صحیح معنی میں غالب کے طرز تحریر کی ہو بہو نقل کوئی بھی نہیں کر سکا۔ مگر پھر بھی ہر شخص صرف خطوط ہی نہیں بلکہ نثر بھی سادہ اور صاف طریقے پر لکھنے لگا۔ اور یہ وہ دیرپا مستقل اور مفید اثر ہے جو اُس نے ہماری زبان کے لٹریچر پر ڈالا۔ مرزا غالب طرز جدید کے آدمی تھے اور آج زمانہ صاف ان کے انداز تحریر کی پیروی کر رہا ہے وہ اپنے عہد کی معمولی سطح سے بلند تھے اور اس لئے ہر شعبۂ زندگی میں تقلید سے عاری تھے۔ وہ صرف نئی نئی تشبیہات و استعارات ہی تلاش کرنے پر قانع نہ تھے بلکہ ان کی عادت تھی کہ لباس، پوشاک، رہائش خورد و نوش

غرض ہر چیز میں جدت پیدا کر کے نئی شاہراہ نکالتے تھے۔ اور اس لئے ان خطوط میں انہوں نے اپنے معاصرین اور پیشروؤں کی پیروی ضروری نہ سمجھی۔ اور اپنے لئے نئی شاہراہ نکالی جو آج تک مقبول ہے۔ غالب کے اردو خطوط اور اُس عہد کے اردو کلام اور غالب کے محبوب میں ایک چیز مشترک ہے، یعنی ان کے کلام کی عجیب بیخودی اور ہوشیاری"۔ اور عجیب تر "سادگی اور پرکاری" انتہائے کمال ہے، اور یہی حالت ان کے محبوب کی ہے۔ ؎

سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

یہی "سادگی اور پرکاری" ان کے اردو خطوط کا طغرائے امتیاز ہے۔ ان میں ایک ادبی شان پائی جاتی ہے۔ باوجود سادہ ہونے کے ان کی عبارت بالکل سپاٹ اور بے نمک نہیں ہے ان میں ظرافت کا چٹخارہ مزہ دیتا ہے۔

غالب اپنے رنگ کے موجد اور مجتہد دونوں ہیں۔ ان کی تقلید ان کی زندگی میں شروع ہو گئی مگر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، سوائے میر مہدی مجروح کے کوئی بھی قابل ستائش تقلید نہ کر سکا۔ چنانچہ میر مذکور کی خود مرزا صاحب نے بھی تعریف کی ہے اور لکھا ہے "میرا روزمرہ دلی کا رہنے والا ایک سید زادہ لے اڑا"۔

یہ خطوط خشکی، تصنع اور تکلف سے قطعاً معرا ہیں۔ عبارت کا تسلسل اور روانی شاہد ہے کہ قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں اور مضامین کی کثرت پتہ دے رہی ہے کہ ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آ رہا ہے۔ "تاریخ ادب اردو" میں عسکری لکھتے ہیں کہ "مرزا کی تحریر میں بالکل باتوں کا مزہ آتا ہے۔ اور بعض خطوط تو انھوں نے فی الواقعی مکالمے کی صورت میں لکھے ہیں۔ مرزا اس طرح کے خطوط میں سائل اور مجیب کا نام نہیں لکھتے بلکہ سوال و جواب کے درمیان ایک خاص لفظ ایسا رکھ دیتے ہیں کہ سوال و جواب میں فوراً امتیاز ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ مرزا نے القاب و آداب کا پرانا طریقہ بالکل اڑا دیا۔ وہ خط کو کبھی "بھیا"، کبھی "میاں"، کبھی "حضرت"، کبھی "مہاراج" یا کسی اور مناسب لفظ سے شروع کرتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو ابتدا ہی سے نفس مطلب لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک جگہ خود بھی اس معاملے پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کا بیان ان ہی کی زبانی سنیئے "خطوط نویسی میں میرا طریقہ یہ ہے کہ جب خط لکھنے کے لئے قلم کاغذ اٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ سے جو اس کی حالت کے موافق ہوتا ہے پکارتا ہوں اور اس کے بعد ہی مطلب شروع کر دیتا ہوں۔ القاب آداب کا پرانا طریقہ اور شکوہ و رنج شادی و غم کا پرانا رویہ میں نے بالکل اٹھا دیا ہے"۔ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں "میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ دو ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو"۔

غالب نے بعض اردو خطوں میں اور تقریظوں میں مقفیٰ اور مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ آج کل ایسا طرز تحریر تصنع اور تکلف کی علامت سمجھا جاتا ہے، اور اصلاً قدرتی طور پر ایسی عبارت میں تصنع اور تکلف کا پایا جانا ضروری ہے۔ مگر مرزا کے اردو خطوط میں جہاں کہیں بھی ایسی عبارت پائی جاتی ہے وہاں دوسرے فقرے میں بھی بالکل وہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جو کہ پہلے فقرے میں یعنی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ خواہ مخواہ قافیہ تلاش کر کے ٹھونس دیا ہے۔ مولانا حالی کے بقول یہ بات اس شخص سے بن پڑتی ہے جو باوجود خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجہ کا کمال رکھتا ہو اور وزن اور قافیہ کی جانچ تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو"۔ مگر ایک قابل غور بات یہ بھی ہے کہ مرزا غالب مقفیٰ اور مسجع عبارت ایسے خطوط میں لکھتے تھے جن سے مبنی ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا ورنہ تعزیت وغیرہ کے خطوط وہ ہمیشہ سیدھی سادھی زبان میں لکھا کرتے تھے۔ تقریظوں اور دیباچوں کی تصنع آمیز نثر کی ذمہ داری مرزا غالب پر نہیں عائد ہو سکتی بلکہ اس کا اصلی باعث وہ لوگ تھے جو تقریظیں لکھواتے تھے کیونکہ اس زمانے میں لوگ مقدمات اور تقریظوں کو نثر عاری میں بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔

مرزا کے خطوط کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا خطوط لکھتے وقت اس چیز کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے جسے پڑھ کر مکتوب الیہ خوش ہو۔ ظرافت غالب کا جزو غالب تھی۔ شوخیٔ کلام دور سے ان کی نثر کی بلائیں لے رہی ہے۔ ان کی شوخی کی اصل بنا جدت طرازی اور "بات میں بات" پیدا کرنے کی عادت تھی۔ ان کے اردو کلام اور نیز اردو نثر کی چاشنی کا انحصار اس پر ہے۔ مرزا "بار الم" اور "رنگ نشاط" دونوں سے دوچار ہو چکے تھے مگر چونکہ وہ اپنی سطح سے ذرا بلند تھے۔ اس لئے وہ عوام کی طرح بے حسی کا شکار ہونے سے بچ گئے کیونکہ وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر تسکین دیتے تھے ؎

تاب لائے ہی بنے گی غالب واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

انہوں نے بعض خطوط میں اپنے اوپر بھی جو تبصرہ کیا ہے اور تعزیت کے خطوط جس رنگ میں لکھے ہیں۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ غالب کی خودداری طبیعت اور چشم بصیرت سختی و سستی رنج و آلام سب ہموار کر چکی تھی۔"

غالب کی ظرافت میں "حور کی دوشیزگی" اور "قلب مومن کی صفائی و پاکیزگی" پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں قہقہے کی گونج نہیں بلکہ زیر لب مسکراہٹ کی موجیں پائی جاتی ہیں۔ اور اس خصوصیت کی بنا پر ان کا مقابلہ ایڈیسن سے کر سکتے ہیں۔ "ایڈیسن کا دلکش رواں اور متبسم طرز تحریر انگریزی نثر کی معراج سمجھا جاتا ہے" ایڈیسن اور غالب دونوں زندگی کو ایک تماشائی کی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں وہ علو اور معنویت پائی جاتی ہے جو ذرا بلندی ہی سے دیکھنے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر اس بلندی تک پہنچنا کس و ناکس کا کام نہیں۔ غالب اور ایڈیسن دونوں کا رنگ شوخ نہیں بلکہ وہ ہلکے ہلکے چھینٹوں سے تصویریں تیار کرتے ہیں مگر ان ہلکے رنگ کی چھینٹوں پر سو رنگینیاں قربان ہیں۔

اگرچہ غالب ہمیشہ اپنے اردو کلام سے اپنے فارسی کلام کو بہتر سمجھتے تھے اور بالکل اسی طرح اپنے اردو خطوط سے اپنے فارسی خطوط کو کہیں بڑھا ہوا خیال کرتے تھے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا اردو کلام ان کی فارسی کلام کو نہیں پہنچا بالکل اسی طرح ان کے فارسی خطوط ان کے اردو خطوط کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ غالب نے اگرچہ اردو خطوط کو اپنے "شکوہ سخنوری کے منافی" سمجھا مگر ان ہی خطوط نے غالب کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ اس کی وجہ اکرام یوں بیان کرتے ہیں "مرزا کی زبردست شخصیت جو اردو خطوط میں عریاں اور بے نقاب ہے۔ اس کو فارسی میں تکلفات اور رسمی انشا پردازی کے پردے پڑے ہوئے ہیں"۔

غالب کے خطوط کا پہلا مجموعہ ان کی زندگی میں عود ہندی کے نام سے اکتوبر ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ اردوئے معلیٰ کے نام سے مارچ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ کسی رسالے میں ان کے خطوط "غالب کے غیر مطبوعہ خطوط" کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ایک نیا مجموعہ مطبع مجتبائی میں چھپ کر شائع ہوا ہے جس میں ایک سو سترہ خطوط ہیں۔ یہ خطوط غالب اور دربار رام پور کے تعلقات معلوم کرنے میں مشعل ہدایت کا کام دیتے ہیں۔

ابو مسلم صدیقی

شعر

کوئی بوجھ سکے جب بوجھے ایسی پہیلی بات سمجھے
آنکھ بتائے آنکھ اٹھا کے بھید چھپا کے بھید بتائے

آرزو لکھنوی

دوراہا

عجیب رنگ بدلتی ہے خاکِ پروانہ!
یہ مقبرہ، یہ کسی کی جوان خلوتِ خواب
کسی کے ماتمی سپنے کا عکسِ لافانی
یہ پُرشکوہ، مجلّٰی، دفینۂ اُلفت
یہ سنگِ سُرخ میں ڈھلتی کسی کی من مانی

یہ بانئ نوشِ محبت کا سونا میخانہ
ہے اب بھی نقش بدیوار جس کا پیمانہ!

وہ جس کو وحشتِ الفت نے دی جہانگیری
اسی کی آنکھیں سکندر نہیں کہ جن کے قریں
اُمڈ کے آیا تھا اشکوں کا چشمۂ حیواں
اسی کے عشق کی ادنیٰ سی بھینٹ انار کلی
اسی سے چینی کی مورت میں آیا "نورجہاں"

عجیب بات ہے، باوصف رنگِ نخچیری
کسی کو دور سے لے آئی اس کی دلگیری!

زمینِ شعر سے شاہیں جگر کوئی آیا
نیازِ عشق کے عرفاں سے بن گیا عُرفی
خودی کے پُتلے کو الفت سے یہ اڑان ملی
ستارے ذرّۂ ناچیز اس کی راہوں کے
خدائے عشق سے خوددار کو یہ آن ملی!

وہ عاشقوں میں تھے فرعون، یہ بنے موسیٰ
جو رتبہ اُن کا مسلّم تھا، ان کے نام چڑھا!

وہ حضرات جن کا اثر مجھ پر ہوا

انسان کی زندگی مختلف اثرات کا مجموعہ ہے پہلا اثر ہر شخص پر اس کے ماں باپ کا ہوتا ہے۔ پھر ان حالات کا جو اس کے گرد و پیش ہیں پھر استاد کا جس سے پڑھنا لکھنا یا کوئی ہنر سیکھے۔ ان اثروں کے علاوہ اکثر ہوتا ہے کہ آدمی کی اخلاقی یا علمی نشو و نما پر اُس وقت کے بڑے آدمیوں کا اثر ہوتا ہے جن کے حالات وہ سنتا ہے یا جن کے کمالات وہ دیکھتا ہے اور اُن سے متاثر ہو کر اُس کے دل میں قدرتی طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ اُن کی مثال کی کسی حد تک پیروی کرے۔ خوش قسمتی سے مجھے بہت سے ایسے بزرگوں کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقعہ ملا جن کی اچھی خصلتوں کا گہرا نقش میرے دل پر ہے۔

یہ تو ممکن نہیں کہ ایک مختصر صحبت میں ان سب بزرگوں کا تذکرہ ہو سکے جن کا اثر مجھ پر ہوا۔ اس لئے بغرض اختصار میں نے چند نام چنے ہیں اُن میں ہر شخص امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ اور سینکڑوں ہزاروں اشخاص پر اپنا اثر چھوڑ گیا ہے۔

اب وہ سب اصحاب دنیا سے رحلت فرما چکے ہیں۔ اس وقت کے زندہ مشاہیر میں بھی کچھ اصحاب ایسے ہیں جن کی خوبیوں کا میں مداح ہوں اور اُن کے اثر سے میں مستفید ہوا ہوں۔ لیکن زندہ مشاہیر کی تعریف کی بجائے "نام نیک رفتگان" کا تذکرہ میں نے زیادہ مناسب سمجھا ہے۔

ابھی میں اپنی زندگی کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا تھا۔ جب ایک موقعہ پر تعلیمی کانفرنس کے لئے سر سید احمد خاں مرحوم لاہور تشریف لائے یہ وہ بزرگ تھے۔ جن کی شہرت میں نے اپنے بچپن ہی میں سنی تھی کہ بڑے محب وطن ہیں۔ اور مسلمانوں کی تعلیمی کشتی کے ناخدا ہیں۔ میرے دل میں شوق ہوا کہ ان کو دیکھنا چاہیے ایک بنگلہ کے وسیع احاطہ میں شامیانہ نصب کر کے اور اس کے گرد قناتیں لگا کر جلسے کا انتظام کیا گیا تھا۔ چھوٹی جماعتوں کے طالبعلموں کو جلسے کے اندر کون جانے دیتا تھا میں انہیں دور سے دیکھنے کی اُمید سے دور جا کھڑا ہوا۔ اتنے میں دیکھا کہ کچھ لوگ قناتوں کے رخنوں میں جھانک رہے تھے۔ میں نے بھی ایک رخنہ ڈھونڈ کر جھانکنا شروع کیا۔ اندر جلسہ گاہ کے وسط میں ایک بزرگ جلوہ افروز تھے۔ جن کی لمبی سفید داڑھی تھی۔ اور جن کے چہرے سے شانِ بزرگی عیاں تھی کسی نے بتایا کہ یہی سر سید احمد خاں ہیں یہ دیدار اُن کی بڑائی کا پہلا اور بیرونی نقش تھا۔ جو میرے صفحہ دل پر کھچ گیا گفتار سننے کی نوبت کئی برس بعد آئی۔ جب میں سکول سے کالج میں گیا۔ اور کالج سے فارغ ہو کر اخبار لکھنے لگا تو مجھے شاہجہان پور کے جلسہ کانفرنس میں پہلی دفعہ سر سید صاحب سے ملنے کا موقعہ ہوا۔ اور اس کے بعد کئی اور ملاقاتیں میرٹھ کانفرنس میں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں کا اثر آج تک جاگزیں ہے۔ سر سید کے پاس بیٹھنا اور اُن کی باتیں سننا گویا ایک درس میں شریک ہونا تھا۔ اُن کی طبیعت میں ظرافت بھی مگر متانت کے ساتھ ملک و قوم کا جذبہ جو اُن کے دل میں تھا رنگ رُخ اُس کی ہر وقت غمازی کرتا تھا۔ اگر امید غالب ہوتی تو چہرے پر انبساط ہوتی اگر مایوسی کا غلبہ ہوتا تو چہرہ بھی افسردہ ہوتا تھا محنت کی عادت اس قدر تھی کہ کام کرتے کرتے صبح سے شام ہو جاتی تھی اور وہ کام سے نہ تھکتے تھے۔ مضامین لکھتے تھے۔ خطوط لکھواتے تھے۔ کالج اور کانفرنس کے نظم و نسق میں مصروف رہتے تھے۔ دن رات قوم اور ملک کی بہتری کی فکر رہتی تھی۔ اتنی شہرت اور کامیابی کے باوجود کبھی اپنی کوئی جائداد نہ بنائی۔ یہاں تک کہ وہ جب اس جہان سے گزرے تو ان کے پرانے دوست اور رفیق نواب محسن الملک نے اُن کی تجہیز و تکفین کا خرچ ادا کیا۔ سر سید کے مضامین اور خطوط علمی اور ادبی لحاظ سے اردو میں اعلیٰ

درجے کی کتابیں ہیں۔ غالب کے رقعات کی نثر کو چھوڑ کر اردو نثر نگاری میں طرز نو کی ایجاد کا سہرا سر سید صاحب ہی کے سر پر ہے۔

سر سید کے ہمراہ اردو کے مصنفین کا ایک گروہ جمع ہو گیا تھا جس میں مولوی نذیر احمد صاحب نثر نگاروں میں مولانا شبلی کتب سیر و تاریخ میں اور مولانا حالی قومی شاعری میں ممتاز تھے۔ مجھے ان تینوں کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ اور میں تینوں سے کسی طرح اثر پذیر ہوا۔ مگر یہاں فقط مولانا حالی کا ذکر آسکے گا۔ کیونکہ ان کا تخیل شاعری اور اس پر ان کا عمل میرے مذاق شاعری کے لئے دلیل راہ ثابت ہوئے حالی کے اشعار نے مجھے سادگی زبان کا دلدادہ بنایا۔ اور مجھے یہ سکھایا کہ شعر میں جاذبیت کے علاوہ تاثیر اور مقصد ضروری ہے۔ ان کے کلام نے اس زمانے کا انداز شاعری بدل دیا۔ مولانا حالی کے معاصروں میں سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی اس اصول پر کاربند رہے تو اُن کی شاعری میں ظرافت کا عنصر غالب تھا اور اُن سے بعد کی پود میں سر محمد اقبال مرحوم نے اس اصول کو اور بھی قابل عمل بنا دیا۔ مولانا حالی پرانے علما کی بہترین صفات کا مجموعہ تھے۔ اُن کی طبیعت انکسار پسند تھی اور شیخی اور بے جا تعلی سے وہ نفور تھے اپنے "کلیات" میں اگر کہیں "سخن گسترانہ" بات کسی مقطع میں کہی بھی ہے تو انکسار کا پہلو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مثلاً فرماتے ہیں۔

اگرچہ حالی اگلے اُستادوں کے آگے ہیچ ہیں
کاش ہوتے ملک میں ایسے بھی اب دو چار ہیچ

یہ دونوں بزرگ ہمارے ملک کے علما میں سے تھے اب جس عالم کا ذکر کروں گا۔ وہ ہندوستان کے رہنے والے نہ تھے بلکہ سمندر پار کے باشندے تھے۔ یہ ڈاکٹر جے۔ سی۔ آر۔ ایونگ تھے لہ مجھے لاہور کے فورمن کالج میں اُن کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ وہ کالج کے پرنسپل تھے۔ اور ایک بے نظیر معلم ادب و اخلاق۔ آپ غیر معمولی طور پر ذہین اور طباع تھے۔ قدرت نے انہیں شکل و شباہت بھی رُعب دار عطا کی تھی۔ اُن کے ساتھ کے پروفیسر بتاتے تھے کہ اگر وہ چاہتے تو امریکہ میں جہاں سے وہ آئے تھے۔ پبلک معاملات یا کاروباری زندگی میں اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکتے تھے۔ مگر انہوں نے اتنی دور آکر ہندوستان کی تعلیمی خدمت اختیار کی۔ اور ساری عمر بہت معمولی معاوضے پر کام کرتے رہے جس سے بمشکل بسر اوقات ہو سکتی تھی۔ پنجاب کی تعلیمی ترقی میں ان کی کوششوں کا خاص حصہ ہے۔ وہ کئی سال یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے اور یونیورسٹی کی ترقی بھی ان کی مساعی کی ممنون ہے۔ ڈاکٹر ایونگ بڑے منتظم تھے مگر انتظام کرتے نظر نہیں آتے تھے۔ اُن کی ایک نگاہ کسی اور کی جھڑکی یا تشدد سے زیادہ موثر تھی۔ میں ان کے سامنے کھڑے ہوئے یہ محسوس کرتا تھا کہ میرے دل کا حال پڑھ رہے ہیں۔ انہیں اپنے شاگرد کے حالات سے بے حد دلچسپی رہتی تھی۔ اور ہر وقت اُس کو صلاح و مشورہ اور امداد دینے کے لئے آمادہ رہتے تھے۔ اُن کو ہندوستان کی ترقی سے دلی ہمدردی تھی۔ اور ہمارے ملک کو اپنے وطن کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ ۱۹۰۷ء میں وہ رخصت پر ہندوستان سے امریکہ جاتے ہوئے لندن سے گذرے۔ میں ابھی وہیں تھا کئی برس ہندوستان سے باہر رہنے کے بعد اُن سے ملاقات ہوئی تو ڈاکٹر ایونگ صاحب نے نہایت خوشی کے لہجے میں یہ مژدہ مجھے سنایا کہ جب وہ ہندوستان سے روانہ ہوئے تو انہیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سارے ملک میں آزادی کی نبض میں حرکت پیدا ہو گئی ہے۔ میں اس کے بعد جلدی اپنے وطن میں واپس پہنچا۔ اور میں نے خود بھی مشاہدہ کیا کہ ہندوستان میں آزادی کی لہر دوڑنے کو تھی جو اُس دن سے آج تک روز افزوں زور سے بڑھ رہی ہے۔

یہ تینوں بزرگ جن کے اثر کا اعتراف میں نے کیا ہے۔ میدان علم کے شہسوار تھے۔ اب میدانِ سیاست کے ایک یکہ تاز کا حال سناتا ہوں جس کی فراست، حب الوطنی اور بے مثل جذبات کا میں خصوصیت سے قائل ہوں۔ یعنی مسٹر گوکھلے آنجہانی، آپ نہایت خوش رو اور خوش خو تھے۔ اور ہندوستان کی ترقی کے دلدادہ۔ افسوس کہ اُن کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ عین اُس وقت ہم سے جدا ہوئے جب ملک کو ان کی بے حد ضرورت تھی۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ چند سال اور جیتے رہتے تو ہندوستانِ جدید کی سیاسی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ مسٹر گوکھلے اپنی جوانی میں مسٹر جسٹس راناڈے کے

لہ DR. J. C. R. EWING

اثر سے مستفید تھے اور انہوں نے اپنی زندگی وطن کی خدمت کے لئے وقف کردی۔ پہلے فرگسن کالج پونا میں برائے نام معاوضہ پر پروفیسری کرتے تھے پھر جب سیاست کی طرف میلان بڑھا تو سیاسیات میں استاد مانے گئے۔ انہوں نے آئینی جدوجہد کے فن کو ایسے درجے پر پہنچایا کہ اُس سے بلند تر پہنچنا مشکل ہے۔ واضعان قانون کی بڑی کونسل میں اُن کی تقریریں، بیان کی خوبی، دلائل کی پختگی اور معلومات کی درستی کا نمونہ ہوتی تھیں۔ اُن کی تقریر دل نے بارہا لارڈ کرزن جیسے خود پسند وائسرائے سے داد تحسین حاصل کی ۱۹۰۵ء میں وہ ہندوستان کے معاملات کی طرف انگلستان کے مدبرین کو متوجہ کرنے کے لئے کانگرس کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ لارڈ مارلے اُن دنوں وزیر ہند تھے۔ ان سے ملے اور چند مطالبات پیش کئے۔ ان میں ایک یہ تھا کہ انگلستان کی پارلیمنٹ میں چند ممبر ہندوستان کی طرف سے منتخب ہوا کریں۔ یہ بات تو نہ مانی گئی۔ مگر اُن کی دو تجویزیں منظور ہوئیں۔ یعنی وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں میں ہندوستانیوں کا حصہ اور وزیر ہند کی کونسل میں ہندوستانیوں کی شرکت۔ لارڈ مارلے نے مسٹر گوکھلے کو دونوں میں سے ایک ممبری سب سے پہلے پیش کی مگر انہوں نے شکریہ ادا کر کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ وہ اپنے لئے کچھ مانگنے نہیں آئے۔ ان کے مطالبات اپنے ملک کے لئے ہیں اور یہ بھی کہا کہ اگر مدبرین برطانیہ بخوشی ان کے سب مطالبات منظور کر لیتے جو بہت اعتدال کے ساتھ پیش کئے گئے تھے تو کچھ عرصے کے لئے ہندوستانی اُن پر شاید قناعت کر لیتے مگر اب اس سے بہت زیادہ مطالبات کی منظوری بھی ان کو مطمئن نہیں کر سکے گی۔ میں اس زمانے میں لندن میں تھا اور بیرسٹری کے ساتھ انگریزی اخبارات میں مضمون نگاری بھی کیا کرتا تھا۔ ایک دوست کے ذریعے میں مسٹر گوکھلے سے ملا اور ان کے دوران قیام میں کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ پبلک جلسوں میں اُن کی کئی تقریریں سنیں اور کئی مسئلوں پر اُن سے گفتگو اور بحث ہوتی رہی۔ ہندوستانیوں کے ایک جلسے میں جو مسٹر دادا بھائی نارو جی کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس بات پر گفتگو تھی کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد کس طرح پیدا کیا جائے۔ میں نے کہا کہ سیاسی رہنماؤں کو اس مقصد کے حصول کے لئے خاص طور پر کوشش کرنی چاہیئے اور اس سلسلے میں مسٹر گوکھلے سے میں نے درخواست کی کہ وہ اپنی خداداد قابلیت کو اس کام کے لئے کچھ عرصے تک وقف کر دیں۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ وطن میں واپس جا کر اور چند ضروری کاموں کو ختم کر کے اس مقصد کو اپنا بنائیں گے مگر افسوس کہ ابھی انہیں دیگر مصروفیتوں سے فراغت پانے کا وقت نہیں ملا تھا کہ ان کو پیغام اجل آگیا۔ اور ہندوستان ان کی خدمات سے محروم ہوگیا۔

ایک اور بزرگ جن کی سیاست دانی اور طریق کار کی پسندیدگی سے میں اول متاثر ہوا۔ وہی مشہور پارسی مدبر ہیں جن کا نام ابھی لیا گیا ہے یعنی مسٹر نارو جی۔ یہ سب سے پہلے ہندوستانی ہیں۔ جو انگلستان کی پارلیمنٹ میں ممبر ہوئے مگر انہیں انگریزوں کی لبرل پارٹی نے اپنے ایک حلقہ کی طرف سے اور اپنے ووٹوں سے منتخب کرا کے وہاں بھیجا تھا۔ مسٹر گوکھلے نے جو جگہیں ہندوستان کے لئے مانگی تھیں۔ وہ ایسی تھیں کہ ہندوستان کا حق تسلیم کیا جائے اور اس کے اپنے انتخاب کئے ہوئے نمائندے اس مجلس میں شریک ہوں۔ جو ہندوستان کے نظم و نسق کے اہم امور کا فیصلہ کرتی ہے۔ مسٹر نارو جی گو دوسرے راستے سے پارلیمنٹ میں گئے مگر انہوں نے اپنے حلقے کی نمایندگی بھی خوب کی اور ہندوستانی ہونے کا حق بھی اچھی طرح ادا کیا۔ وہ اپنی تقریروں سے ہندوستان کے حالات اور خیالات پر ہمیشہ روشنی ڈالتے تھے۔ اور ہندوستان کے متعلق ارکین پارلیمنٹ کی معلومات میں انہوں نے بہت اضافہ کیا۔ ان کے علاوہ نوجوان ہندوستانی طلبہ کے معاملات سے انہیں گہری دلچسپی تھی اُن کی مجالس میں شریک ہوتے تھے۔ اور اُن کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اس لئے سب ہندوستانی جو انگلستان میں مقیم تھے۔ ان کی عزت کرتے اور اُن کا اثر مانتے تھے اُن کے متعلق ایک دلچسپ بات قابل ذکر ہے۔ جب وہ منتخب ہوئے تو انگلستان کے وزیر اعظم لارڈ سالسبری نے کسی جلسے میں یہ کہہ دیا کہ نارو جی پہلا Black man یعنی کالا آدمی ہے

جو پارلیمنٹ میں بیٹھے گا۔ اس پر خود انگریزوں نے اخباروں میں خوب لے دے ہوئی اور ہندوستانیوں کو لارڈ سالسبری کا یہ فقرہ قدرتی طور پر ناپسند ہوا۔ ایک انگریزی باتصویر رسالے نے لارڈ سالسبری اور مسٹر ناروجی کی تصویریں ایک صفحہ پر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چھاپ دیں۔ اور اس فقرے کی ہنسی اڑائی اُس تصویر میں مسٹر ناروجی لارڈ سالسبری سے ذرا صاف نظر آتے تھے۔ اور ان کی تصویر کے نیچے یہ لفظ لکھے تھے" ذرا دیکھئے یہ لارڈ سالسبری کا کالا آدمی ہے"۔ مسٹر ناروجی پارسی نژاد ہونے کے باعث تھے بھی گورے چٹے۔ اس لئے یہ چوٹ اور بھی زوردار ہو گئی۔

آخر میں مجھے ایک ایسی بزرگ ہستی کا ذکر کرنا ہے جس سے میں روحانی طور پر اثر پذیر ہوا۔ جب میں ۱۹۰۶ء کی تعطیلات گرما میں لندن سے استنبول گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ایک صاحب وہاں رہتے ہیں، جو سلطان عبدالحمید خاں کے پیر طریقت ہیں۔ اور تصوف میں رفاعی مسلک رکھتے ہیں۔ اُن کا نام نامی حضرت ابوالہدیٰ تھا۔ آپ سادات عرب میں سے تھے اور آپ کا وطن مالوف بغداد تھا۔ معلوم ہوا کہ سلطان المعظم نے اپنی تخت نشینی کے بعد انہیں بغداد سے بلوایا اور نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ ایک شاہی محل اور اُس کا باغ انہیں رہنے کو دیا۔ اُس وقت انہیں کوئی تیس سال استنبول (قسطنطنیہ) میں رہتے گذر چکے تھے۔ اور اپنی زبان میں عربی کے علاوہ ترکی میں بھی اچھی مہارت ہو گئی تھی۔ سلطان کے مزاج میں انہیں بہت دخل تھا۔ مگر انہیں اس اثر کا کوئی فخر یا کوئی غرور نہ تھا۔ باوجود ہر قسم کی آسائش مہیا ہونے کے وہ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے گرد اہل دل کا ہجوم۔ وہ اس وقت بھی خود لکڑی کے ایک بنچ پر بیٹھے تھے جس پر کوئی گدیلہ وغیرہ نہیں تھا۔ دن رات یاد الٰہی اُن کا مشغلہ تھا۔ صرف تین چار گھنٹے سوتے تھے۔ مذہبی علوم اور رفاعی طریق تصوف پر عربی میں کئی کتابیں اُن کی تصنیف کردہ تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ترکی کے اس انقلاب کے وقت جو ۱۹۰۸ء میں ہوا۔ جب جوان ترک جماعت کی طرف سے آئینی حکومت کا مطالبہ پیش ہوا تو سلطان اعظم نے اپنے وزرا کو جمع کیا اور ان کے ساتھ شیخ الاسلام کو اور حضرت شیخ ابوالہدیٰ کو بھی مشورے کے لئے بلایا اور ان کو اپنی رعایا کے مطالبہ سے آگاہ کیا۔ اور پوچھا کہ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے۔ ان کے دلوں میں یہ خیال ہو گا کہ آئینی حکومت دینے کی صلاح دیں۔ مگر کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہیں پڑتی تھی۔ حضرت شیخ سب سے پہلے لب کشا ہوئے اور فرمایا کہ اس اصلاح کا وقت آگیا ہے دینی چاہئے۔ پھر بعض اور مشیروں نے بھی یہی خیال ظاہر کیا۔ اور جدید ترکی کا وہ انقلاب بغیر کشت و خون کے ہو گیا۔ حضرت شیخ اس واقع کے کچھ عرصہ بعد اس جہان فانی سے سفر کر گئے۔ مگر مشرق وسطیٰ کے بہت سے ممالک میں اُن کی یاد باقی ہے اور ان کی طریقت کے بے شمار پیرو ہیں۔ آہ کیا لوگ تھے جو جب تک زندہ تھے لوگوں کے لئے شمع ہدایت تھے اور جب وفات پا گئے تو اُن کی روشن مثالیں ہزاروں لاکھوں کے لئے دلیل راہ ہیں۔

(مرسلہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

سر عبدالقادر

شعر

سینے پہ رکھ دیئے ہیں گھبرا کر وہ ہاتھ اپنا
سمجھے ہیں کہ تسکین مجھ کو اضطراب دل سے

متین مچھلی شہری

دائرے

دائرے بنتے چلے جاتے ہیں تا حدِّ نظر
اجلے اجلے، دھندلے دھندلے مٹتے مٹتے دائرے
کون سے نقطے سے ہے آغاز ان کا کیا خبر
اور کہاں انجام ہے یہ بات بھی پوشیدہ ہے
دائرے ہیں یہ کہ زنجیریں تخیل کے لئے
فکر کو پابند کرنے میں جو ہیں ناکامیاب
دائرے ہیں یہ کہ سیمیں جال ہیں پھیلے ہوئے
طائرِ اوراک جن سے اڑ رہا ہے دور دور
دائرے ۔۔۔ روشن کہیں دھندلے کہیں اوجھل کہیں
جیسے ماضی کے دھندلکوں میں نمایاں ہو کبھی
یاد اُن بھولے ہوئے بسرے ہوئے احباب کی
گردشِ دورِ زماں نے آج پھینکا ہے جنہیں
دُور آنکھوں سے تمنا کی رسائی سے پرے
دائرے تابندہ و رخشندہ و بے نور سے
ہاں یونہی بنتے چلے جاتے ہیں تا حدِ نظر
دائرے اُلجھے ہوئے باہم ۔۔۔ سمٹتے پھیلتے
تیز رفتار ان میں کوئی اور کوئی سُست رَو
پھر بھی سب باہم رواں انداز ہم آہنگ سے
ابتدا اور انتہا کی قید سے آزاد ہیں
چشمِ بینا کو گماں ہوتا ہے ان کو دیکھ کر
دائرے جن کے تسلسل کا سرا نایاب ہے
بس یونہی بنتے چلے جاتے ہیں تا حدِ نظر۔

جگن ناتھ آزاد

گلابی بادل

صبح کے سات بجے تھے۔ کرائی ڈون کے ہوائی اڈے پر مسافروں کی کافی چہل پہل تھی۔ کچھ لوگ گھبراہٹ میں ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے شاید ان کا یہ پہلا ہوائی سفر تھا۔ لیکن اکثر کمال بے پروائی سے پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔ اتنے میں جہاز تیار ہوا۔ مسافر قطار باندھ کر میدانِ پرواز کی طرف جانے لگے۔ میں بھی اُن کے پیچھے ہولیا۔ ابھی چند قدم ہی گیا تھا کہ جہاز گھر کے ایک افسر نے آگے بڑھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجئے گا جناب! اس جہاز میں اتنے مسافروں کے لئے جگہ نہیں ہے۔ ہم نے آپ کے لئے دوسرے جہاز میں انتظام کر دیا ہے۔ اور آپ کو اُس میں سہولت بھی رہے گی۔ اُس میں صرف ایک اور مسافر ہے۔ آپ ہوں گے اور بس۔"

"تو کیا میں زوریخ کو جانے والی گاڑی کو پکڑ سکوں گا؟" میں نے پوچھا۔

"ضرور! ضرور! صرف آپ کو پیرس سے بدلنا پڑے گا۔"

میں دوسرے جہاز کا انتظار کرنے لگا۔

کوئی پندرہ منٹ میں دوسرا جہاز بھی تیار تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ میرا ہم سفر جہاز کے پچھلے حصے میں چلا گیا اور میں اگلے حصے میں جا بیٹھا۔ اتنے میں جہاز کا طیارچی مع اپنے نائب کے آپہنچا۔ مجھے یہ دیکھ کر از حد مسرت ہوئی کہ جہاز ران میرا پرانا واقف جیکسن ہے دو سال ہوئے ہم افریقہ میں ملے تھے۔ اُس وقت وہ ہوائی فوج میں ملازم تھا۔ اُس نے بھی مجھے پہچان لیا۔ دو ایک منٹ کی گفتگو کے بعد جیکسن اور اُس کے نائب نے اپنی اپنی سیٹ لی اور جہاز کو پرواز کیا۔ مطلع صاف تھا اور سارے دل مطمئن تھے کہ سفر بآرام گزرے گا۔ تھوڑی دیر میں ہم ساحلِ انگلستان کو پیچھے چھوڑ رہے تھے۔ سمندر کے کنارے شہروں کے سفید سفید مکانات آفتاب صبح کی زریں شعاعوں میں چمک رہے تھے۔ میرے لئے ہوائی جہاز کا سفر ایک معمولی بات تھی۔ وقت کو گزارنے کے لئے میں نے کتاب کھول کر پڑھنی شروع کر دی۔ کوئی آدھ گھنٹہ کے مطالعہ کے بعد میں نے نظر اٹھائی جہاز کے کلاک میں آٹھ بج کر سینتیس منٹ تھے۔ اور اُس کے پاس ہی آلہ ارتفاع نما میں ہزار فٹ ظاہر کر رہا تھا۔ میں پھر کتاب پڑھنے میں محو ہو گیا۔

یکلخت ایک بڑے زور کا جھٹکا لگا۔ میں چونک پڑا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ جہاز حسبِ معمول پرواز کر رہا تھا۔ انجنوں کی گھرر گھرر باقاعدہ کانوں میں آرہی تھی۔ جیکسن اور اس کا ساتھی کمال اطمینان سے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ کسی قسم کا تغیر نظر نہیں آتا تھا۔ سوائے اس کے کہ جہاز ایک بادل میں سے گذر رہا تھا جس کا رنگ گہرا گلابی تھا۔

یہ ایک معمولی بات تھی اور کسی نے بھی پروا نہ کی۔ میں پھر کتاب پڑھنے لگا۔

اتنے میں بیرا کھانا لے کر آگیا۔

"حضور کھانا حاضر ہے۔"

"ہم اس وقت کہاں ہوں گے؟" میں نے کتاب سے نظر اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

باہر سخت اندھیرا ہو رہا تھا۔ سوائے گلابی بادل کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

"باہر تو کچھ نظر نہیں آتا لیکن میں اپنے روزمرہ کے تجربے سے کہہ سکتا

ہوں کہ ہم رودبار کو عبور کر چکے ہیں، اور کہیں ایسوولا کے نزدیک ہوں گے۔"

بیرا کھانا رکھ کر چلا گیا۔

میں نے کلاک کی طرف دیکھا، اس میں اب بھی آٹھ بج کر سینتیس منٹ ہو رہے تھے۔ میں نے جیب سے اپنی گھڑی نکالی، لیکن اس میں بھی آٹھ بج کر سینتیس منٹ تھے۔ گھڑی بند تھی۔

میں نے چنداں خیال نہ کیا اور آرام سے کھانا کھاتا رہا۔ اتنے میں بیرا پھر آیا۔

"اب کیا وقت ہوگا؟" میں نے اُس سے کہا۔ "عجیب اتفاق ہے کہ جہاز کا کلاک اور میری گھڑی بیک وقت ۳۷ - ۸ پر بند ہو گئے ہیں۔"

"جہاز کا کلاک بند ہو گیا ہے! بڑی حیرانی کی بات ہے، میں نے خود صبح اس کو چابی دی تھی۔ خیر اس وقت کوئی نوکا عمل ہوگا۔ اور میری گھڑی میں (گھڑی دیکھ کر) .... اوہ!

وہ میری طرف دیکھنے لگا۔

"صاحب کوئی جادو تو نہیں چل گیا۔ یہ بھی بند ہے اور ...

.... اور ۳۷ - ۸ پر۔"

"کوئی حرج نہیں" میں نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا "صرف ایک غیر معمولی اتفاق ہے۔"

بیرا چلا گیا

جہاز کے باہر اندھیرا بدستور تھا۔ گلابی بادل اُس کو چھپٹا نظر نہیں آتا تھا۔ یک دم جہاز ۵۰۰ فٹ نیچے گرا۔ جہاز راں شاید بادل سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن گلابی بادل بے کراں تھا۔ جہاز اوپر اُٹھا اور ۳۵۰۰ فٹ کی بلندی پر اُڑنے لگا۔ لیکن بادل چاروں طرف محیط تھا۔ گہرا گلابی بادل! جہاز اور اوپر اُٹھا۔ ۵۰۰۰، ۶۰۰۰، ۷۰۰۰، ۸۰۰۰، ۹۰۰۰ فٹ لیکن گلابی بادل وہاں بھی موجود تھا۔ سردی سے دانت بجنے لگے۔ جہاز کا رُخ نیچے کی طرف کیا گیا۔ جہاز پتھر کی طرح نیچے لڑھکا اور ۳۰۰۰ فٹ کی بلندی پر سنبھل کر پرواز کرنے لگا۔ باہر گلابی بادل موجود تھا۔

اتنے میں بیرا واپس مڑا۔

حضور کیا میں سچ نہ کہتا تھا! یہ جادو نہیں تو جادو سے کم بھی نہیں۔ جہاز میں تمام گھڑیاں ۳۷ - ۸ پر کھڑی ہیں۔ اور یہ گلابی بادل شیطان کی طرح پیچھے پڑا ہوا ہے۔ ہاں تو جناب! جہاز کے کپتان آپ کو یاد فرماتے ہیں۔"

میں بھی کچھ حیران سا ہو گیا کہ آخر یہ کیسا اتفاق ہے کہ سب گھڑیاں ایک ہی وقت پر بند ہو جائیں۔ اور یہ گلابی بادل! کیا تمام فضا میں بادل ہی بادل ہے؟ کیا ہم کبھی بھی اس سے باہر نہیں نکلیں گے؟

جب میں جیکسن کے پاس پہنچا تو وہ بوکھلایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

"جان!" جیکسن نے میرے جاتے ہی سوال کیا "تم نے کچھ دیکھا ہے؟" اُس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"ہاں" میں نے ذرا سنبھلتے ہوئے کہا۔ "جہاز کی تمام گھڑیاں بند ہیں، اور سب ۳۷ - ۸ پر۔ شاید یہ اُس زبردست جھٹکے کا اثر ہو جس نے ابھی ابھی جہاز کو بے طرح ہلا دیا تھا۔"

"اور کچھ؟"

"اور یہ گلابی بادل! جہاز کے سب لوگ اس سے تنگ آ گئے ہیں۔"

اُس کا چہرہ اور اتر گیا۔

"بس؟" اُس نے بمشکل آواز نکالتے ہوئے کہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں پڑا ہوا تھا۔ "اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے جان!" اُس نے کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "جس کو جہاز کے دوسرے آدمی نہیں جانتے۔ قطب نما ایک ہی سمت میں کھڑا ہے، جنوب جنوب مشرق۔ اور اب یہ دیکھو وائرلیس اپنا کام نہیں کر رہی۔"

میں نے وائرلیس مشین کو دیکھا۔ بالکل درست تھی۔

"لیکن سب سے حیران کن امر یہ ہے" جیکسن نے کہا "کہ ہم پٹرول بالکل استعمال نہیں کر رہے۔ جہاز باقاعدہ چل رہا ہے، اور کسی طرح بند ہوتا نظر نہیں آتا۔ انجن بالکل خاموش کھڑے ہیں لیکن یہ بدستور اپنی پہلی رفتار سے جا رہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس کا کیا حشر ہوگا۔ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ اور یہ سفر کب اور کہاں ختم ہوگا! اور پھر یہ بادل ہے کہ اس سے کسی طرح چھٹکارا نہیں۔ میں اپنے سب جتن کر چکا ہوں لیکن اس سے نجات ملتی نظر نہیں آتی۔ میرے خیال میں ہمیں جہاز کے دوسرے لوگوں کو اس کی خبر کر دینی چاہئے

یہ کام تمہارے سپرو ہے"

میں اُٹھ کر جہاز کے پچھلے حصے کی طرف گیا۔

جہاز کے پچھلے حصے میں میرا دوسرا ساتھی نہایت دلجمعی سے کتاب کے مطالعہ میں منہمک تھا۔ میں نے اُس کو تمام ماجرا سنایا۔

"میرے لئے یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ میں نے اس سے زیادہ مافوق الفطرت اور خرق عادت حالات میں سفر کیا ہے اور میرا اپنا تجربہ ہے کہ ایسے مواقع پر انسان پہلے سے زیادہ عقل مند ہو کر نکلتا ہے۔" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا

ہم دونوں پہلی بار ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرا ہمسفر ایک مشہور و معروف ہستی سر اینڈریو سان فورڈ ہے۔ جس نے چین کی دشوار ترین گھاٹیوں میں سفر کیا ہے جہاں مارکو پولو کے بعد کسی گورے آدمی کا گذر نہیں ہوا۔

میرے اشتیاق معلومات نے ہماری اس گفتگو کو طول دیا میں سر اینڈریو کے چین کے سفروں کے متعلق نہایت انہماک سے سُن رہا تھا۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ کس طرح جبکہ وہ قراقرم کی چوٹیوں پر سفر کر رہا تھا۔ وہاں کے قبائلی لوگ اُس کا پیچھا کر رہے تھے اور اُس کی شومئی قسمت سے اُس کے آگے تمام راستے برف سے مسدود تھے۔ کہانی نہایت دلچسپ تھی اور میں ہمہ تن گوش اُس کو سُن رہا تھا۔ یہاں تک کہ جہاز کے دوسرے جھٹکے کو جو بعد میں معلوم ہوا پہلے سے کسی طرح کم نہ تھا میں نے بالکل محسوس نہیں کیا اور نہ ہی شاید سر اینڈریو نے۔ باہر بادل کم ہو رہا تھا لیکن ہم بالکل بے خبر تھے۔

جب بات ختم ہوئی تو سر اینڈریو نے باہر جھانکا۔

"میرے خیال میں ہم اپنے سفر کے دوسرے مرحلے پر پہنچ گئے ہیں۔ باہر دیکھو ـــــ بادل جا چکا ہے اور کلاک پھر چل رہا ہے۔"

میں نے جلدی سے باہر دیکھا۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ ہم انگلستان کے ساحل پر اُڑ رہے تھے۔

جیکسن نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا "ہم پھر انگلستان کے ساحل پر ہیں۔ اور ہر ایک چیز باقاعدہ کام کر رہی ہے۔ وہ دیکھو سامنے ساحل نظر آ رہا ہے۔ لیکن یقیناً وہ پہلے کا سا نہیں۔ بہت تغیر و تبدل معلوم دیتا ہے۔ مثلاً وہ دیکھو سامنے پہاڑی ہے اس پر ایک سفید مکان ہونا چاہئے جو اکثر ہمیں سنگ میل کا کام دیتا رہا ہے۔ لیکن اب وہ وہاں نہیں ہے اور وہاں پر ریلوے لائن ہونی چاہیئے۔ اس کی بجائے وہاں ایک پکی سڑک نظر آ رہی ہے۔

"یہ دیکھو وائرلیس اپنا کام کر رہی ہے لیکن جواب میں ہم جو آواز سُن رہے ہیں وہ بالکل غیر مانوس ہے۔

"میں کرائی ڈون واپس جا رہا ہوں۔ اس کے سوا میں کچھ نہیں کر سکتا۔ یا تو میں پاگل ہو گیا ہوں یا میرے گرد دُنیا میں فتور آ گیا ہے"

اُس نے اپنے نائب کو اشارہ کیا اور جہاز کرائی ڈون کی طرف پرواز کرنے لگا۔ ہم کرائی ڈون پہنچ گئے۔ لیکن وہاں کوئی ہوائی اڈہ نہ تھا۔ جہاز اِدھر اُدھر چکر لگانے لگا لیکن اترنے کی کوئی مناسب جگہ نظر نہ آئی۔ لوگ کاروبار کے لئے چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ سڑکوں پر آنے جانے والوں کی کافی بھیڑ تھی لیکن کرائی ڈون سے ہوائی میدان اس طرح غائب تھا جس طرح گدھے کے سر سے سینگ

جہاز پھر اوپر اُٹھا۔ جیکسن خود جہاز کو چلانے لگا۔ اور لندن کا رُخ کیا۔

ہمارے نیچے لندن کی شاندار عمارتیں سورج کی شعاعوں میں چمک رہی تھیں۔ لیکن ایک بھی تو دیکھی ہوئی معلوم نہ ہوتی تھی۔ ایسا نظر آ رہا تھا کہ گویا لندن پھر سے تعمیر ہوا ہے۔ پرانی عمارتیں مثلاً کرسٹل پیلیس۔ لندن ٹاور۔ ہاؤس آف پارلیمنٹ کی عمارتیں، گرجا سینٹ پال تمام اپنی پرانی شان سے کھڑے تھے لیکن اطراف و جوانب میں ہیئت بالکل تبدیل تھی۔

جہاز کو اتارنے کی کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔ ہم نے لندن کے کئی چکر لگائے لیکن کوئی مناسب جگہ نہ ملی۔ لوگ سڑکوں پر کھڑے ہو کر، گھروں کی کھڑکیوں میں سے، عمارتوں کی چھتوں پر سے نہایت تعجب سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے آخر کار لندن کے ایک ایسے حصے میں جہاں مزدور لوگ رہا کرتے تھے۔ ایک کھلی جگہ نظر پڑی۔ جیکسن نے انجنوں کو بند کیا اور "آناً فاناً" نہایت پھرتی سے جہاز کو اُس میدان میں اُتارا۔

ہمارے اترنے کی دیر تھی کہ لوگوں نے ہمیں چاروں طرف

سے گھیر لیا۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔

ہم جہاز سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ جس پلیٹ فارم پر ہم اترے تھے۔ آس پاس کی عمارتوں سے اونچا پختہ سیمنٹ کا بنا ہوا تھا اور ہوائی اڈے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اُس کے نیچے ہوائی جہازوں کے ٹھہرنے کے گودام تھے۔

"جان! عجیب معاملہ ہے"، جیکسن نے باہر نکل کر مجھ سے کہا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبح سے ہر ایک چیز تبدیل ہو گئی ہے"۔

لوگوں کی وضع قطع بالکل مختلف تھی۔ اُن کا لباس مختلف، اُن کی طرزِ گفتگو مختلف تھی۔

"تم کون ہو اور کہاں سے آرہے ہو؟" اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کر سوال کیا۔ اُس کی انگریزی زبان بالکل مختلف تھی۔ جس میں امریکی رنگ کی آمیزش صاف نمایاں تھی۔

جیکسن نے تمام ماجرا کہہ سنایا اور دریافت کیا کہ ہم کہاں اترے ہیں۔

"یہ سنچری ایرپورٹ لندن (Century-Air Port London) ہے۔ اگر تم یہ بھی نہیں جانتے تو تم آ کہاں سے رہے ہو؟ اور تم نے یہ جہاز کہاں سے لیا ہے؟"

جیکسن نے جواب دیا کہ جیسا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ہم کرائی ڈون سے صبح کے وقت روانہ ہوئے تھے۔ اور ہمارے پاس جدید ترین نمونے کا ہوائی جہاز ہے۔ اس بات پر سب ہنسنے لگے آخر اُن میں سے ایک نے ہمیں ایک کمرے کی اشارہ کرکے جانے کا حکم دیا

کمرے کا سامان نہایت قیمتی اور زیبائشی تھا فرنیچر کے ڈیزائن ہمارے نمونوں سے بالکل مختلف تھے۔ ہم سب بُت بنے بیٹھے تھے لیکن سر انڈریو کی چلبلی طبیعت نے اُس کو بیٹھنے نہ دیا۔ وہ کمرے میں اِدھر اُدھر چیزوں کا معائنہ کر رہا تھا۔

"ہائیں! یہ کیا؟" اُس نے اچانک حیران ہوکر کہا اور ایک مجلد کتاب ہمارے سامنے لاکر رکھ دی۔ اس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ "ہوائی روزنامچہ ۲۰۴۲ء" ہم مبہوت ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اوراق کو الٹ پلٹ کر دیکھا ہر ایک صفحے پر ۲۰۴۲ء لکھا ہوا تھا۔ طباعت کی غلطی کا کوئی احتمال نہ رہا۔

جیکسن نے بالآخر خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا اگرچہ میں اس کو دلیل سے ثابت نہیں کر سکتا تاہم میرے خیال میں ہم کسی طرح ایک سو سال پھلانگ کر مستقبل میں آگئے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر میں دو آدمی جو وضع قطع سے افسر معلوم ہوتے تھے۔ اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے ہماری شناخت وصداقت کے متعلق بہت سے سوال کئے۔ ہمارے پاس پورٹ ہمارے سکے۔ ہمارے کاغذات۔ اور لندن ٹائمز کا ایک پرچہ جو اتفاقاً میرے پاس تھا۔ سب کو انہوں نے نہایت غور سے ملاحظہ کیا۔ ان میں سے بعض کو انہوں نے اپنے عجائب گھر کے لئے منتخب کر لیا۔

"گو تمہاری کہانی سچی معلوم ہوتی ہے" اُن میں سے ایک نے کہا "اور ہم تم کو آزاد کرتے ہیں لیکن یہ بات یاد رہے کہ قانونی طور پر ہمیں تم پر پختہ شکوک ہیں۔ اگرچہ تمہیں کسی قسم کی روک ٹوک نہیں مگر تمہاری ہر نقل وحرکت کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔ اب تم جا سکتے ہو"۔

ہم کمرے سے باہر نکلے اور سیڑھیوں سے نیچے اُتر کر بازار میں آکھڑے ہوئے۔ لوگ حیران ہوکر ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

سب سے پہلے ہمیں اپنے پیٹ کی پڑی ہم سب کی آنتیں بھوک کی شدت سے قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ ہم نے ایک آدمی سے کسی عمدہ ہوٹل کے متعلق استفسار کیا۔ اُس نے ایک ہوٹل کا نام بتایا لیکن رائے دی کہ چونکہ ہم اجنبی ہیں۔ ہمیں کسی کار میں بیٹھ کر جانا چاہئے۔

سر انڈریو نے ایک کار کو ہاتھ دیا وہ رُک گئی۔ اُس میں بیٹھ کر ہم ہوٹل پہنچے۔ راستے میں ڈرائیور پوچھنے لگا۔

"آپ وہی حضرات ہیں نا جو پچھلی صدی سے آئے ہیں"۔

بات کو یہیں ختم کرنے کے لئے میں نے بے توجہی سے "ہاں" کہا اور چپ ہو رہا۔

کار ہوٹل کے دروازے پر رُکی۔ ہم نیچے اُترے میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"کتنا کرایہ؟"

"کیسا کرایہ؟" وہ حیران ہوکر ہماری طرف دیکھنے لگا لیکن جاہل مطلق خیال کرتے ہوئے اُس نے اپنے سر کو جھٹکا اور آگے نکل گیا۔

ہوٹل میں ہم نے رہائش کے لئے دریافت کیا۔ ہم سب کو ایک ایک آراستہ پیراستہ کمرہ دے دیا گیا۔ تھوڑی دیر میں ہم کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے۔ نہایت نفیس نفیس کھانے ہمارے آگے میزوں پر چنے گئے۔ جب ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو مسٹر انڈریو نے بیرے سے کہا۔ "بل لاؤ"

وہ حیرانی سے ہمارا منہ تکنے لگا۔

"کیسا بل؟ کس چیز کا بل؟ یہاں کوئی بل ول نہیں ملتا۔

"اوہ! میں بھول گیا" مسٹر انڈریو نے اپنی لاعلمی کو چھپاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "دراصل ہم بہت مدت کے بعد واپس آئے ہیں"

کھانا کھانے کے بعد ہم ابھی ایک کمرے میں باہم اپنی حالت پر غور کر رہے تھے کہ ایک خوش پوش آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ "حضرات معاف کیجئے گا۔ آپ وہی صاحبان ہیں نا جو کل لندن کے سینچری ایرپورٹ میں اُترے تھے اور پچھلی صدی سے آئے ہیں۔ میں اپنے اخبار کے لئے آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ تضیع اوقات معاف!

"بسر و چشم" ! جیکسن نے اس کو اپنے پاس کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔

مدیر اخبار نے بیسویں صدی کے متعلق بیسیوں سوالات کئے۔ طرزِ حکومت، تجارت، اقتصادیات، سائنس، بود و باش وغیرہم تمام کے متعلق اُس نے استفسارات کئے۔

آخر جب وہ جانے کے لئے اُٹھا تو مسٹر انڈریو نے کہا:

"ہم نے آپ کے تمام سوالوں کا جواب دیا ہے۔ اب ذرا ہمارے لئے بھی تکلیف گوارا کریں اور ہمارے لئے چند ایک امور پر روشنی ڈالیں"۔

"ہاں، ہاں۔ بصد شوق! مجھے چنداں جلدی نہیں۔ اور آپ کے سوالات کے جواب سے مجھے گونہ خوشی ہوگی"۔

وہ بیٹھ گیا اور میں نے پوچھنا شروع کیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں ہمیں ہر چیز بلا قیمت کیوں مہیا کی جا رہی ہے۔ کار کے ڈرائیور نے ہمارے کرایہ دریافت کرنے پر سخت حیرانی کا اظہار کیا۔ یہاں ہوٹل میں ہر شے مہیا ہے لیکن کوئی قیمت طلب نہیں کرتا"۔

اخبار کا مدیر ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"ہاں میں سمجھ گیا۔ آپ اس مسئلہ اشتراکیت کو جاننا چاہتے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہماری دنیوی زندگی میں بعض ایسی ضروریات ہیں جو انسانی زندگی کا جزو لاینفک ہیں۔ اور بلا استثنا ہر ایک انسان کو درپیش آتی ہیں۔ آتی رہی ہیں اور آتی رہیں گی۔ مثلاً ہر ابن آدم کو رہنے کے لئے مکان کا ہونا ضروری ہے۔ اس امر میں امیر و غریب سب یکساں محتاج ہیں۔ پھر کونسا انسان ہے جس کو بھوک نہ لگتی ہو۔ ہر ایک کے ساتھ پیٹ موجود ہے۔ اور اس کا بھرنا قدرت کا اٹل تقاضا ہے تو کیوں نہ اس مشترکہ مسئلے کا مشترکہ حل سوچا جائے۔ اس کے بعد سفر کو لیجئے۔ کونسا ایسا شخص ہے جو اپنی مدت الحیات اپنے گھر کی چار دیواری میں ہی گذار دے۔ اُس کو اپنی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے۔ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے لئے ضرور بالضرور چلنا پڑتا ہے۔ اور سفر کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ بعض آدمی کم سفر کرتے ہیں اور بعض زیادہ۔

پس معلوم ہوا کہ یہ تمام باتیں انسانی زندگی کے لئے اتنی ہی ضروری اور اہم ہیں جتنی ہوا اور روشنی۔ لیکن ذرا سوچئے روشنی اور ہوا کے لئے کون قیمت ادا کرتا ہے؟ اور ان کے مفت استعمال میں کس کا نقصان ہے؟ ایک زمانہ تھا جب خود انسان کی زندگی پر ٹیکس لگتا تھا۔ اس کے بعد لوگوں نے محسوس کیا کہ زندگی پر ٹیکس بے معنی اور ناجائز ہے اور ہر ایک کو آزادانہ رہنے کا حق حاصل ہے پھر ایک ایسا زمانہ آیا جو تمہارے اپنے زمانے سے کچھ ہی قبل تھا جبکہ سڑکوں پر چلنے والوں کو ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد اس ٹیکس کو اڑا دیا گیا۔ آہستہ آہستہ جوں جوں عوام نے زندگی کی ضروریات عامہ کو محسوس کیا اُن پر سے ٹیکس کم کرتے گئے اور آج وہ چیزیں جو زندگی کے لئے لازم و ملزوم ہیں روشنی اور ہوا کی طرح مفت اور عام کر دی گئی ہیں۔

"قطع کلام معاف" مسٹر انڈریو نے کہا "کیا یہ نظام خوش اسلوبی سے چل رہا ہے؟"

"اب تک تو اس میں کوئی دقت پیش نہیں آئی" مدیر اخبار نے

جواب دیتے ہوئے کہا "اور بحیثیتِ مجموعی یہ نظام نہایت ہم آہنگی سے چل رہا ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے، اور آپ شاید اس کو بطور اعتراض پیش کریں کہ جب کھانا، پینا، چلنا پھرنا، رہنا سہنا سب مفت ہو گیا ہے تو بہت سے ایسے اشخاص ہوں گے جو کام سے جی چراتے ہوں گے۔ میں اس کے جواب میں کہہ سکتا ہوں کہ اس سے پیشتر بھی تو ایسے طفیلی موجود تھے جو خود بالکل نکھٹو تھے اور جائز و ناجائز طریقوں سے مزدور لوگوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی ہضم کر جاتے تھے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ اُس وقت وہ نکھٹو پن اور عیاری دونوں گناہوں کے مرتکب تھے لیکن اب صرف سستی اور کاہلی کا الزام ہی اُن پر عائد ہوتا ہے۔

کام کرنے کے لئے اب بھی محرکات موجود ہیں، اور ہر ایک شخص اپنی مزدوری کی اجرت پاتا ہے اور اپنی کمائی سے اپنی اور اپنے اعزہ و اقربا کی زندگی کو خوش سے خوش تر بناتا ہے"۔

اس کے بعد جیکسن کی باری آئی۔ اُس نے ایرو پلین، موٹر اور دیگر ذرائع آمد و رفت کے متعلق کئی سوالات کئے۔ ان میں گو چنداں تبدیلیاں نہ آئی تھیں لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ اُن میں پہلے کی نسبت کافی ترمیم تھی اور اُن کو نسبتاً زیادہ مفید اور کار آمد بنا دیا تھا۔ جیکسن نے ایرو پلین کے متعلق کئی ٹیکنیکل سوالات کئے۔ چونکہ وہ اس ذریعہ آمد و رفت سے بہت دلچسپی لیتا تھا اس لئے موضوع پر اُس نے کافی وقت لیا۔

"ایک اور سوال اور بس!" جیکسن نے کہا "جیسا کہ میرے دوست جان پہلے بیان کر چکے ہیں ہم سے کار والے اور ہوٹل والوں نے کوئی پیسہ وصول نہیں کیا لیکن حیرانی کی بات ہے کہ اس کے علاوہ کسی نے ہمارا نام تک بھی نہیں پوچھا۔ جس کا معلوم ہونا میری رائے میں ضروری ہے"۔

"اس کی بھی چنداں ضرورت نہیں" اُس نے جواب دیا "کیونکہ ایسی تمام جگہوں پر لوگوں کی خود بخود تصویریں اُتر جاتی ہیں یقین جانئے آپ کے ایرپورٹ میں اترنے سے لے کر کم از کم ایک درجن آپ کی تصویریں لی جا چکی ہوں گی"۔

اس کے بعد سر انڈریو نے معلوماتِ عامہ کے متعلق سوالات کئے۔

مدیر اخبار نے ہم کو بتایا کہ کس طرح کرۂ ارضی کے مختلف حصوں میں لوگ مختلف اشیائے زرعی و معدنی پیدا کر رہے ہیں، اور یہ کہ بعض ایسے ایسے مقامات معرضِ علم میں آ گئے ہیں جن کے متعلق بیسویں صدی کے سائنسدان گمان تک نہ کر سکتے تھے۔ میں نے یہ بات نہایت اشتیاق سے سنی کہ قراقرم کی چوٹیاں جن کے متعلق سر انڈریو نے صبح کے وقت اپنی آپ بیتی سنا رہا تھا، اب تمام ممالک کی ایک مشترکہ سیر گاہ ہیں۔

"اگر ذرائع آمد و رفت اس قدر آسان ہو گئے ہیں" سر انڈریو نے دریافت کیا "اور دنیا کا نظام بہت حد تک یکساں اور مشترکہ ہو گیا ہے تو ضروری ہے کہ دنیا میں اب بالکل امن و آشتی ہو گی اور لڑائی کا وجود دنیا سے اُٹھ گیا ہو گا"۔

"بادی النظر میں تو ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا" مدیر اخبار نے جواب دیا "اور کسی حد تک ہے بھی ایسا لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کشت و خون اب بھی ہوتے ہیں مگر بہت تھوڑے۔ اور اُن میں اکثر کی بنا انفرادی رنج و بغض اور کینہ پر ہوتی ہے اس کے علاوہ قومی امتیاز ابھی تک کلی طور پر نابود نہیں ہوا مثال کے طور پر اس وقت بھی رُوس کے جاسوس ہمارے ملک میں باعثِ خوف و ہراس ہیں۔ اور آپ لوگ بھی عوام کی نظروں میں جاسوس ہی خیال کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ آپ آزاد ہیں اور آپ کی نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں لیکن کیا حکومت اور کیا پبلک سب آپ کو ہر وقت نظروں میں رکھتے ہیں۔

اس کے بعد مدیر مذکور نے رخصت چاہی اور چلا گیا۔

ہم سب لوگ اپنے بچاؤ پر غور کرنے لگے۔ مدیر کی بات درست تھی۔ ہم جہاں کہیں بھی جاتے تھے۔ لوگ بُری طرح گھور گھور کر ہمیں دیکھتے تھے۔ ہمیں ڈر تھا کہ جاسوسی کے سلسلے میں کہیں گرفتار نہ ہو جائیں۔

اگلی صبح کو جب ہم اُٹھے تو باہر بہت شور و غل تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ لوگ اکٹھے ہو کر ریڈیو سن رہے ہیں۔ ہمارے کان بھی آواز کی طرف لگ گئے۔ ہم نے سُنا۔

وہ پانچ آدمی جو کل لندن کے سنچری ایرپورٹ میں اُترے تھے اور اپنے آپ کو پچھلی صدی کے باشندے بیان کرتے ہیں شاید جاسوس ہیں۔ حکومت آج اُن کا فیصلہ کرے گی۔"

ہم دروازے تک باہر نکلے۔ ہزاروں زہر آلود نظریں ہماری طرف جُھک گئیں۔ چند ایک نے ہم پر حملہ کر دیا اور جہاز کے بیرے غریب ولکن کو بُری طرح زخمی کر دیا اور گرفتار کر لیا۔ ہم واپس ہوٹل میں بھاگ گئے۔ ہم کو اب اپنی خیر نظر نہیں آتی تھی۔ بے چارے ولکن کا انجام صاف دکھائی دیتا تھا۔ جاسوسی کی سزا بہت سخت تھی۔ ہم کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ آخر سر انڈریو نے کہا کہ ہمارا لباس ہمیں سب کی نظروں میں مشتبہ بنا رہا ہے ہمیں جلد اپنا لباس تبدیل کر دینا چاہیئے اور بھاگنے کی تدبیر کرنی چاہیئے۔

جوئندہ یابندہ، ہوٹل کے ایک ملازم کی وساطت سے ہم ایک کلوک روم میں پہنچے جہاں مختلف سائز اور مختلف ڈیزائن کے بیسیوں سوٹ لٹک رہے تھے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی پسند کا سوٹ منتخب کیا اور پہن کر ہم فرار کے متعلق سوچنے لگے۔

ہوٹل کافی بڑا تھا۔ گھومتے گھومتے چھپتے بچتے ہم اس کی پچھلی طرف دوسرے بازار میں جا نکلے جیکسن نے ایک کار کو کھڑا کیا اور لندن ٹاور جانے کے لئے حکم دیا۔ لندن ٹاور کا جہاز گھر بھی وہاں سے نزدیک ترین تھا۔ ڈرائیور ہمیں وہاں اُتار کر آگے نکل گیا۔

جلد جلد قدم اٹھاتے ہوئے ہم پلیٹ فارم کی طرف بڑھے۔ پلیٹ فارم بہت وسیع تھا۔ اُس کے دوسرے سرے پر ہوائی جہاز نظر آئے۔ ہم نے ٹھان لی کہ ہماری نجات اسی میں ہے کہ ان میں سے ایک جہاز کو لے اڑیں اور باقی خدا پر چھوڑ دیں ہم نے جہازوں کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ نزدیک جا کر معلوم ہوا کہ جہازوں میں صرف دو دو آدمیوں کے لئے جگہ ہے۔ فیصلہ ہوا کہ جیکسن سر انڈریو کو لے کر ایک جہاز میں پرواز کر جائے اور اُس کا نائب مجھے دوسرے جہاز میں لے اُڑے۔

ابھی ہم اپنی مجوزہ سکیم کے مطابق جہازوں میں داخل ہی ہونے والے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ پلیٹ فارم کی دوسری طرف سے سینکڑوں آدمی "پکڑ لو" "پکڑ لو۔ جاسوس ہیں۔ جاسوس ہیں" کے نعرے لگاتے ہوئے ہماری طرف دوڑ رہے ہیں یک دم بندوق کے چلنے کی آواز آئی۔ دوسرے لمحے نائب جہازراں پرائس زمین پر لوٹ رہا تھا۔

سر انڈریو نے پرائس کو زمین سے اٹھایا اور جہاز میں رکھ دیا اور جیکسن کو اُس کے پیچھے دھکیل کر بھاگ جانے کا حکم دیا۔

"جلدی! جلدی!! زندگی اور موت کا سوال ہے۔ پرائس بے بس ہے اُس کو بچاؤ"۔

جیکسن کی مدبر سے گفتگو آڑے وقت کام آئی۔ اُس نے آن واحد میں انجن کو رواں کیا اور ہوا میں اُڑ گیا۔

"اب ہم اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کرتے ہیں" سر انڈریو نے میری طرف دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

معاً میرے دل میں خیال گزرا۔ کیوں نہ کوشش کی جائے! قسمت نے یاوری کی تو شاید بچ نکلیں ورنہ موت تو یقینی ہے ہی۔ عرصہ ہوا میں نے ہوا بازی کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا تھا لیکن بعد میں جہاز اڑانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔

میں نے فیصلہ کر لیا۔ سر انڈریو کو اپنے پیچھے گھسیٹتا ہوا میں داخل ہوا۔ لوگ اب ہمارے بہت نزدیک آ گئے تھے۔ جیکسن کو میں نے پہلا جہاز چلاتے نہایت غور سے دیکھا تھا۔ خوش قسمتی سے ہاتھ ٹھکانے لگا۔ اور انجن چالو ہو گیا۔ لوگ اب قریباً قریباً ہمارے سر پر تھے۔ اُن کے چہروں سے آثار غیظ و غضب عیاں تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اگر قابو آ گئے تو وہیں تکا بوٹی کر دیں گے۔

چار آدمی جو سب سے پیش پیش تھے۔ صرف دس گز کے فاصلے پر رہ گئے۔ یک دم جہاز اوپر پھدکا اور ہم ہوا میں تھے۔

پلیٹ فارم پر کوئی دوسرا جہاز نہ تھا۔ پیچھے گودام سے جہاز کو اوپر لانے میں وقت کی ضرورت تھی ہمیں یقین تھا کہ تعاقب سے پہلے ہم کافی دور پہنچ چکے ہوں گے۔ جہاز کو کنٹرول کرنے میں بڑی دقت پیش آئی نیچے۔ اوپر۔ دائیں۔ بائیں جہاز ہچکولے کھا رہا تھا لیکن رفتار کو میں نے کافی تیز کر رکھا تھا کیونکہ اسی پر ہماری آزادی کا انحصار تھا۔ بالآخر میں نے کنٹرول کو اچھی طرح

قابو کر لیا اور جہاز کی رفتار کو انتہائی درجے پر کر دیا۔

اب ہمارے پیچھے قریباً نصف درجن ہوائی جہاز تعاقب کر رہے تھے۔ ہم ہر گھڑی پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے تھے۔ جہاز قریب سے قریب تر آ رہے تھے۔ وہ ہمارے جہاز کی بہ نسبت زیادہ تیز رفتار تھے۔

آدھ گھنٹہ۔ پون گھنٹہ۔ پورا گھنٹہ۔ تعاقب جاری تھا۔ شکاری جہاز بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ صرف ایک اور گھنٹہ میں ہم اُن کے نرغے میں ہوں گے۔

آدھ گھنٹہ اور گذر گیا۔ چالیس منٹ۔ پچاس منٹ۔ سب سے اگلے جہاز میں سے ایک سُرخ شعلہ نمودار ہوا۔ اس نے شاید فائر کیا۔ کیوں؟ نامعلوم۔ جہاز کو نہایت زور سے ایک جھٹکا لگا۔ اور ہم ایک بہت گہرے بادل میں جا رہے تھے۔

بادل کا رنگ گہرا گلابی تھا۔ شکاری جہاز نظروں سے اوجھل تھے۔ اور یقیناً ہم بھی اُن کی زد سے باہر۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

میں نے دیکھا۔ گھڑی پر ۳۷۔۸ بجے تھے اور سوئیاں کھڑی تھیں۔ جہاز کا کلاک بھی بند تھا۔ سر انڈریو کی پاکٹ واچ بھی ۸.۳۷ پر ٹھہر رہی تھی۔ قطب نما بھی ساکت تھا۔ اور وائرلیس پہلے دن کی طرح کچھ کام نہ کر رہی تھی۔ انجن بغیر پٹرول کے چل رہے تھے۔ جہاز کا رُخ پھر وہی جنوب مشرق تھا۔

میں حیران تھا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ کیا ہم ایک صدی اور آگے جانے والے ہیں؟ لیکن سر انڈریو کو اور ہی خبط لگا ہوا تھا۔ بدیہ نے دورانِ گفتگو میں بتایا تھا کہ عرب میں ہیروں کی ایک زبردست کان معلوم ہوئی ہے اور سر انڈریو اُس پر غور کر رہا تھا۔ اس سے پیشتر اُس نے کبھی اس جگہ کا نام نہ سُنا تھا۔

گلابی بادل بدستور محیط تھا اور باہر کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

جہاز کو دوبارہ جھٹکا لگا۔ گلابی بادل جا چکا تھا۔ اور ہم صاف فضا میں اُڑ رہے تھے۔ ہمارے نیچے رودبارِ انگلستان کا پانی آفتاب صبح کی کرنوں میں سنہری چادر کی طرح چمک رہا تھا۔ میں نے کرائی ڈون پہنچنے کے لئے شمال کا رُخ کیا۔ اور تھوڑی دیر میں ہم پرانے میدانِ پرواز کے اوپر گھوم رہے تھے۔

جہاز کو اُتارنے میں سخت مشکل کا سامنا پڑا۔ میں بالکل ناتجربہ کار تھا۔ جہاز تھڈ سے زمین پر لگا۔ زور کا دھماکا ہوا۔ بعد کا مجھے کچھ علم نہیں۔

بہت دنوں بعد جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔ سر انڈریو سے مہینوں بعد ملاقات ہوئی۔ جیکسن مفقود الخبر تھا۔ شاید اُس کا جہاز بھی دوبارہ گلابی بادل میں پھنس گیا ہو اور وہ ہماری طرح واپس آنے کی بجائے شاید ایک صدی اور آگے مستقبل کی طرف پرواز کر گیا ہو۔ بہرکیف سر انڈریو کا یہی خیال تھا۔

ہم نے لوگوں کو تمام واقعات سنائے اور ایک سو سال بعد کے لوگوں کے حالات بتائے لیکن سب ہم پر ہنستے تھے۔ اور مضحکہ اڑاتے تھے۔

"دماغی چوٹیں اکثر ایسے ایسے نتائج پیدا کر دیتی ہیں۔" اُن سب کا خیال تھا۔

ان تمام واقعات کی صحت خواہ کچھ بھی ہو لیکن میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جب میں سر انڈریو کے ساتھ عرب کی سیاحت کو نکلا تو ہم نے ہیروں کی ایک ایسی کان پالی جو دنیا کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

(ماخوذ)

علی محمد

استفسار

میں حضرت امیر مینائی کے حالات و تصنیفات پر ایک محققانہ مقالہ جامعہ عثمانیہ کے لئے ترتیب دے رہا ہوں۔ میں شکر گذار ہوں گا اگر امیر کے تلامذہ کے بارے میں کوئی صاحب معلومات روانہ فرمائیں گے۔

محمد وصی احمد بی اے
نبیرہ نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل سلطانپورہ، حیدرآباد دکن۔

غزل

بگڑ نہ جائے گا اے دل بہار کا نقشہ
کہ نقش گُل سے بُجھلا ہے خار کا نقشہ

فنا کے رنگ سے کچھ اور ہو گیا روشن
ہماری ہستئ ناپائیدار کا نقشہ

شگفتہ پھول ہیں جب تک چمن میں اے بلبل!
نہ جم سکے گا ترے اعتبار کا نقشہ

کسی نے اُس کو پکارا نہ حشر کے دن بھی
عجیب تھا ترے اُمیدوار کا نقشہ

ہے اختلاف جسے ناخدا سے طوفاں میں
نظر میں اُس کی نہیں آر پار کا نقشہ

ہم ایک حال میں بیٹھے ہیں مطمئن لیکن
بدلتا رہتا ہے لیل و نہار کا نقشہ

وبالِ دوش نہ ہو جائے اپنا سر ہم کو
نہ محو ذہن سے ہو تیغِ یار کا نقشہ

وفورِ درد سے اے کاش کھُل سکیں آنکھیں
کہ دیدنی ہے دلِ بے قرار کا نقشہ

وہ رنگ لایا مرا خونِ دل کہ اے انور
ہر ایک سانس بنی کھنچ کے دار کا نقشہ

لطیف انور

ملاقاتیں

ملاقاتیں دو طرح کی ہوسکتی ہیں —— اختیاری اور جبری، یہ تو خیر سیدھی سی بات ہے کہ اختیاری ملاقاتیں وہ ہونگی جو کی جائیں اور جبری جو کرائی جائیں البتہ ذرا خیال افروز طریق پر کہنا چاہیں تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ اختیاری ملاقاتوں کا تعلق دل سے ہے اور جبری کا عموماً پیٹ سے دیکھئے. بات یونہی الجھ گئی، کہنے کا مطلب صرف یہ تھا کہ جب ملاقات کرنے کو دل چاہے یا ملاقات کی خاطر ملاقات کی جائے تو دل علامت ٹھہرتا ہے اور جہاں ملاقات کا مقصد بالواسطہ فراہمی معاش ہو تو پیٹ علامت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ایک سیدھی سادی ملاقات اور بھی ہوتی ہے جسے اتفاقیہ کہا جاتا ہے۔ اس پہ کوئی علامت پوری نہیں اترتی بس جھٹ ہی سے ہو جاتی ہے۔ ایسی ملاقات بالعموم کتوں سے ہوا کرتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ کتے ہم سے کیا کرتے ہیں۔ قرض خواہوں سے ملاقاتیں بھی اسی زمرہ میں آتی ہیں۔ اس سے یہ ہرگز مطلب نہیں کہ کتا کیا قرضخواہ ایک ہی بات ہو گئی۔ البتہ ہم یہ جانتے ہیں کہ بعض اوقات ایسا مقام پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ فیصلہ نہیں کیا جاتا کہ ملاقاتی کو آ ھاہ کیا جائے یا دھتکارا جائے اور دُم کٹے کتے اور ہکلاتے ہوئے قرض خواہ کے ناگہاں برآمد ہو جانے پر یہ جاننا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ ملاقاتی خوش آمدید کہنا چاہتا ہے یا حملے کی تیاری کر رہا ہے۔

ملاقاتیں تو آپ نے بھی کی ہوں گی اور ممکن ہے کہ چاندنی راتوں میں کی ہوں اور "لب آب جو" کی ہو۔ لیکن ہم ہیں کہ ہر رنگ دیکھ چکے ہیں۔ اختیاری، جبری اور کیا اتفافیہ، ہر قسم آزمائی گئی ہے۔ ماحصل یہ ہوا کہ آج جب ہم اپنا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے بیٹھے ہیں۔ اتفاقیہ ملاقات کے سلسلے میں ہم کسولی گئے تھے (صحت افزا مقام ہے ضرور جائیے گا) جبری ملاقاتیں ہمیں موسمی دارالخلافے دکھاتی رہیں۔ (گرمیوں میں شملہ اور سردیوں میں دہلی جاتے رہے) اختیاری ملاقاتیں یہ بتاتی رہیں کہ لاہور فی الحقیقت ایک وسیع شہر ہے۔ جس میں صرف ایک ماڈل ٹاؤن اور بہت سی گمنام سڑکیں اور بے نمبر کوٹھیاں ہیں،

جبری اور اتفاقیہ ملاقاتوں کو چھوڑیے وہ تو ہم پہ نازل ہوتی رہیں۔ ان میں کیا دلچسپی ہوسکتی ہے اور ہو بھی تو زخموں کے کریدنے سے حاصل ہی کیا ڈھانگ پہ ہوں یا دل پہ اختیاری ملاقات کی بات کیجے جو ہم خود کرتے ہیں اور سر کے بل پہنچ کر کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا نا کہ ملاقاتیں تو آپ نے بھی کی ہوں گی اور کرتے رہیں گے۔ لیکن ہماری ملاقاتیں انوکھی اس لحاظ سے ہیں کہ تجرباتی ہیں مثلاً یہی دیکھئے کہ اختیاری ملاقات میں ایک گونہ تکلف کی ضرورت ہے بورژوا ماحول کی پیداوار ہے اور اس کے ساتھ خاص قسم کے لوازم وابستہ ہیں۔ لیکن ہم نے ملاقات کرنے کے لئے کبھی فون پر وقت طلب نہیں کیا اور ملاقاتی کارڈ چھپوائے ہی نہیں اور اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ ہمیں تکلفات سے شاید کد ہو۔

ہم ایک مشہور ڈرامانگار سے ملنے گئے۔ برآمدے میں کھڑے اِدھر اُدھر جھانک رہے تھے کہ آپ کی ملازمہ نے ہمیں دیکھ پایا۔ قریب آئیں اور بولیں —— "صاحب باہر ہی آنے والے ہیں میں ابھی کرسی لائی، آپ انتظار کیجے"۔ کرسی نہ آنا تھی نہ آئی ہم کھڑے رہے۔ عاشقوں نے انتظار کی گھڑیوں کے اضطراب

کا تو یونہی ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ کوئی ہم سے پوچھے کہ کیسے کیسے سخت مقام آتے ہیں۔ عاشقوں نے تو انتظار کی رات تارے گن گن کے کاٹ لی، ملاقاتی غریب برآمدے کی اینٹیں گنے کیا؟ تنگ پاجامہ پہنے ہوئے کوئی بھاگتا ہوا بچہ بھی برآمدے میں نہ آیا جس سے باز و بکڑ نام ہی پوچھا جاتا اور تعلیم کی تفصیل دریافت کی جاتی (بات خواہ اردو ہی میں کرنا پڑتی) برآمدے میں ایک آئینہ تھا۔ ناچار ہم اسے دیکھنے میں منہمک ہو گئے۔ گورکی یاد آیا کہ وہ تنہائی میں آئینے کے سامنے بیٹھ کر کیا کیا حرکات کیا کرتا۔ چہرے پر اقلیدس کی مختلف شکلیں بنا تا مٹاتا رہتا۔ لیکن برآمدے کو مقام تنہائی کب کہا جا سکتا ہے۔ ہمیں نہ جانے یہ خیال کیوں آیا کہ اللہ میاں نے جو صناعوں کا صناع ہے۔ دو آنکھوں اور ایک ناک کی بجائے ایک آنکھ اور دو ناک لگا دی ہوتیں تو اس جانب کا کیا حلیہ ٹھہرتا۔ مطلب یہ کہ نتھنے چار ہوتے ——— دو بھی ہو سکتے تھے۔ اور جو عینک لگواتے تو ایک ہی شیشہ ہوتا۔ لغت میں کانے۔ کا لفظ تو ہوتا ہی نہ۔ جو ہوتا اندھا ہوتا۔ مطلب یہ کہ اندھوں میں کانے راجا کا وجود ہی نہ ملتا۔ ہم اسی ہونے نہ ہونے میں ڈوبے ہوئے تھے کہ زور سے کھانسنے کی آواز سے تمام طلسم ٹوٹ گیا۔ اس آواز کا ذہنی اثر کچھ اس لئے بھی زیادہ ہوا کہ ہم ایکٹر بھی گمبھیر کھانسنے سے آشنا تھے، حضرت پچھلے دنوں ریڈیو کے ڈرامے میں حصہ لیتے ہوئے اسی انداز میں کھانسے تھے۔ بغلی کمرے میں کسی نے زور سے پکارا ——— "لڑکی ——— لڑکی"۔ آواز پہ پھر ایکٹنگ کا شبہ ہوا۔ جیسے ایک انگریزی خواں صرف انگریزی ہی میں سوچ سکتا ہے۔ اور ایک مصور ہر بات کا اظہار رنگوں ہی میں کرنے کی کوشش کرتا ہے، ہو سکتا ہے کہ ایک اچھا ایکٹر (یعنی جو پیدائشی ہو) اپنی بول چال میں بھی ایکٹ ہی کرتا ہو۔ پھر سوچا آخر دنیا بھی تو ایک سٹیج ہے اور ہر انسان ایک ایکٹر، یہی کہا تھا شاید شیکسپیئر نے۔ بغلی کمرے سے بدستور آوازیں آتی رہیں ——— "لڑکی، بجنتو، او بجنتو" یقیناً کوئی بیر کھو گئی تھی۔ ہمارا اندازہ ہے کہ کالر بٹن گم تھا۔ اس لئے کہ ایک بار دھما کا سا ہوا اور آواز پیدا ہوئی ——— "میں ٹائی تیرے سر سے باندھوں" ——— کمرے کی فضا گویا سہم سی گئی۔ آوازیں آنا بند ہو گئیں اور منہ سے سیٹی بجانے کی آواز آنے لگی۔ ہمارا اندازہ ہے کہ ٹائی باندھی جا رہی تھی۔ ہم ابھی انتظار کر رہے تھے۔ سوچا اگر بغلی کمرے کی آواز برآمدے میں آ سکتی ہے تو یقیناً برآمدے کی آواز بغلی کمرے میں بھی جا سکتی ہے۔ ہم کھانسے ——— کوئی جواب نہ ملا۔ فرش پر جوتا بھی رگڑا۔ جب آپ اکتا جاتے ہیں تو انگڑائیوں پر اتر آتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے بھی انگڑائی لی۔ خیال تھا کہ دو ایک اور لیں گے۔ لیکن جلدی ہی یہ بات سوجھ گئی کہ انگڑائی کا تعلق آنکھوں سے ہے اور ہم ایک ایسے ڈراما نگار کے مکان پر ہیں جو ریڈیو ٹیکنیک کا ماہر ہے۔ لہٰذا جو حرکت بھی کی جائے صوتی اعتبار سے کی جائے۔ انگڑائی کا ریڈیو سے کیا تعلق یہ تو خالص سٹیج اور فلم کی چیز تھی۔ ہم اٹھے اور صوتی تجربہ کرنا چاہا۔ آئینہ کے قریب ہماری ٹوپی پڑی تھی۔ ہم نے نیچے گرا دی اور وہ زمین پہ آ رہی، تجربہ ناکام رہا۔ کوئی آواز پیدا نہ ہوئی ——— کہیں پتھر ہوتا اور آئینے پہ پڑتا تو خوب تجربہ رہتا ——— ہم کچھ اور کرنے ہی والے تھے کہ بغلی کمرے سے کھانسنے کی آواز آئی اور حضرت تشریف لے آئے۔ ہاتھ میں "555" کے سگرٹ کا گول ڈبہ تھا۔

"معاف کیجئے گا انتظار کرانا میری عادت نہیں۔ مجھے ریڈیو اسٹیشن جانا تھا۔ ریہرسل کے لئے ——— تو میں کپڑے پہن رہا تھا، آیئے"۔

ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

"اجازت ہو تو ایک پیالہ چائے پی آؤں۔ ابھی حاضر ہوا"۔

ہم مسکرا دیئے۔

ڈرائنگ روم میں آئینہ بھی نہ تھا۔ ہم نے جینی تصویروں کے الٹے سیدھے نقوش پہ گھورنا شروع کیا۔ تصویریں بھی خوب تھیں لیکن ان کے چوکھٹے تو بہت ہی اچھے تھے..... ہم نے سوچا کہ ایسے خوبصورت قالین فرش پہ بچھانے کی بجائے اگر دیواروں پہ لٹکائے جائیں تو بہتر نہ ہوگا.... اور اگر ہرن کا شکار محض اس لئے کیا جائے کہ بعد میں ان کے سینگوں پر ٹوپیاں ٹانگی جائیں تو کیوں نہ مصنوعی سینگ بنا لئے جائیں۔ سیاہ لکڑی بھی تو آخر دستیاب ہو جایا کرتی ہے۔

حضرت تشریف لے آئے اور بیٹھتے ہوئے فرمایا —

"ارشاد! کیا حکم ہے؟"

"ایک تو آپ کی آواز معمول سے زیادہ بھاری ہے۔ اور پھر صوتی اعتبار سے "حکم" کا لفظ ہوا بھی ذرا بوجھل ہی۔ جس سماعت پر دوہرا اثر ہوا۔ یہ حضرت ہماری بات نہیں تو نرم نرم الفاظ استعمال کیا کریں — "کہئے — مزاج بخیر — طبیعت کیسی ہے — میں کیا خدمت کرسکتا ہوں — چائے حاضر ہے — ایسے کومل الفاظ ہوں تو توازن قائم رہے۔ مگر ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ "شکریہ" کی بجائے "تشکر" اور "گزر رہی ہے" کی جگہ "میگذرد" استعمال ہوتا ہے۔

"سنا ہے آپ فلم لائن اختیار کر رہے ہیں" میں نے عرض کیا

"جی ہاں ارادہ (؟) تو تھا۔ ایک فلم کمپنی سے بات چیت بھی ہوگئی تھی لیکن پھر بات کچھ بنی نہیں۔ خیال ہے بمبئی چلا جاؤنگا"

"جی ہاں آپ ایسے ماہرین کی تو ہماری فلم انڈسٹری کو ضرورت ہے اور پھر ایسے ماہر کی جس نے اپنی عمر ہی اسی کام کے لئے وقف کردی ہو اور ہماری فلمیں تو —

"انہیں چھوڑیئے اللہ ہی بیلی ہے ان کا"۔

"آپ جو یورپ میں —

ہم بات بھی ختم نہ کرنے پائے تھے کہ ایک کار آگئی۔

ڈرائیور نے کہا — "چلئے"

حضرت نے فرمایا — "چلئے — اچھا پھر ملاقات ہوگی صاحب"۔

اور کار سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔

ہم ایک ڈاکٹر صاحب سے ملنے گئے۔ آپ نے اردو ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے (ڈاکٹریٹ میں لندن لکھو ہیں) آپ کا Thesis انگریزی میں ہے۔ انگریزی میں تھیسز پیش کرنے کی وجہ یہ سننے میں آئی ہے کہ اردو رسم الخط کے ٹائپ رائٹر ابھی اتنے عام نہیں ہوئے جتنی خود ڈاکٹریٹ ہے۔ اور سنا ہے لندن سے ڈاکٹریٹ اس لئے لی جاتی ہے کہ لندن دنیا کی سب سے بڑی تجارتی منڈی ہے۔ کاغذ سستے داموں ملتا ہے۔ ورنہ اردو ہندوستان ہی کی زبان ہے۔ لندنی ڈاکٹر اس بات سے کب انکار کرتے ہیں۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کا چکر کاٹنا شروع کیا۔ مقصد یہ تھا کہ شاید ڈاکٹر صاحب ہمیں چک یا کسی شیشے میں سے دیکھ پائیں تو سمجھ لیں کہ کوئی ملاقاتی آیا ہے۔ ہمارے پاؤں میں چکر تھا ہم چکر کاٹتے رہے۔ ڈاکیہ آیا اور اس نے بے دھڑک آواز دی۔ ہم حیران ہو گئے کہ کوٹھیوں پر آواز بھی لگائی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب خود ہی ڈاک لینے نکلے (نام تو نوکر کا تھا — خیر) ہمیں بھی دیکھ لیا۔ اور ڈاک کے ساتھ ہی اندر لے گئے۔ آپ نے ایک خط کھولا اور فرمایا —

"سنائیے کیا حال ہے"۔ ہم نے کہا "میگذرد"۔ آپ مسکرا دیئے۔ خط پڑھتے ہوئے پھر فرمایا — "اور سنائیے کیا حال ہے" ہم نے کہا جی وہی "میگذرد"۔ ایک آدھ منٹ کے بعد پھر پوچھا — "ہوں — اور سنائیے کیا حال ہے" ہم نے پھر کہا — "میگذرد"۔

"کیوں میگذرد" ڈاکٹر صاحب نے کہا اور خط پڑھتے جارہے تھے اور پھر بار بار کہنا شروع کردیا — "ہوں۔ میگذرد ...... ہوں ......"

اس طرف خاموشی تھی۔ یکایک ڈاکٹر صاحب چونکے خط میز پر رکھتے ہوئے از سر نو پوچھا — "سنائیے صاحب کیا حال ہے"۔

ہم مسکرا دیئے اور کہا — "میگذرد"

"آپ باہر کب سے کھڑے تھے؟"

"ڈاکٹر صاحب حق تو یہ ہے کہ کوٹھیوں میں رہنا ہمیں تو پسند نہیں"۔

"کیوں؟"

"قبلہ ہم مکانوں میں رہتے ہیں۔ اور مکان پر بے دھڑک آواز دی جاسکتی ہے۔ کوٹھی پر آواز لگاتے ہوئے جھجک محسوس

ہوتی ہے۔ اطلاع دینے کا کوئی وسیلہ سوجھتا نہیں۔ ڈاکٹر
صاحب برآمدے میں گھنٹی ضرور ہونی چاہیئے۔"
"ہم نے تو ایک خاص ملازم اسی کام کیلئے مقرر کر رکھا ہے کہ
مہمان آئیں تو اطلاع کر دیا کرے۔"
"معاف کیجئے ڈاکٹر صاحب آپ ہی کی کوٹھی سے خیال آیا
کہ برآمدے میں گھنٹی ضرور ہونی چاہیئے۔"
ترقی پسند ادب کی باتیں ہونے لگیں۔ فرمایا "یہ ترقی پسندوں
کو ہو کیا گیا ہے۔ انہیں جنس کے علاوہ اور موضوع سوجھتا ہی
نہیں۔ جہاں دیکھو رنڈیوں ہی کے افسانے ملتے ہیں۔ یہ ایک
رسالہ ہے اس میں اسی فی صدی افسانے رنڈیوں کے متعلق
لکھے ہوئے ہیں۔ میں اس پر ایک مضمون لکھوں گا۔"
"ضرور لکھئے" ہم نے کہا۔
فرمایا ۔۔۔ "یہ کالج کے کام چھوڑیں تو لکھیں۔ آپ نے
وہ کتاب دیکھی "ROMANTIC Agony"
"کس نے لکھی ہے؟" ہم نے پوچھا
آپ نے اسی وقت اپنے نوکر کو آواز دی اور آپ کا
Thesis آ گیا۔
اشاریہ میں سے مصنف کا نام ڈھونڈنا شروع کیا۔ آپ
ایک ایک کتاب کا عنوان، مصنف کا نام، ساتھ ہی پبلشر کا نام
اور پتہ اور تاریخ اشاعت بیک وقت پڑھتے جا رہے تھے۔
نہ جانے EMINENT VICTORIANS کی Strachy
پر کہاں نظر پڑ گئی فرمایا ۔۔۔ "آپ نے یہ کتاب پڑھی ہے؟"
ہم نے کہا ۔۔۔ "کچھ حصے دیکھے ہیں"
"اپنے Thesis میں میں نے Biography پر
بڑے مزے کی باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً دیکھئے ۔۔۔ (ایک صفحہ، دو،
تین، چار ۔۔۔۔ تو بھلا انگلستان میں Thesis کا ایک باب
آخر پچیس صفحے کا کیوں منظور کیا جاتا ہے)
"..... تو شاید ہم ROMANTIC Agony
کے مصنف کا نام ڈھونڈ رہے تھے۔ خوب کتاب ہے
صاحب ضرور پڑھئے گا۔"

ہم نے کہا ۔۔۔ "جی ضرور۔"
"..... یہ دیکھئے Principles of Literary Criticism by Richards
بہت اچھی کتاب ہے۔ آپ رچرڈز کو تو جانتے ہی ہیں نا"
"کہتے ہیں انگریزی ادب کا ایک بڑا نقاد ہے۔"
"ہاں اور میرا دوست بھی ہے" اور ساتھ ہی دوسرا باب
شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب سے جب بھی نظریں چار ہوتیں تو ہم
زور سے سر ہلا دیتے کبھی کہتے "ڈاکٹر صاحب وہ
ROMANTIC Agony اچھی کتاب ہے" فرماتے ۔۔۔
"ضرور پڑھئے گا" اور باب پلٹنے میں پھر مشغول ہو جاتے۔ باب
ختم ہونے پر پھر اشاریہ کا دھیان آیا۔ اور مصنف کا نام ڈھونڈنا
شروع کیا۔ اشاریہ ختم ہو چکا تو ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ
ROMANTIC Agony خوب کتاب ہے ضرور پڑھی جائے
مصنف کون ہے اس سے غرض نہیں۔ اور اس کا نام درج
نہیں تو نہ سہی۔
یہ تو ایک انتہا تھی۔ دوسری انتہا ملاحظہ ہو۔ ہمارے ایک
مہربان پروفیسر ہیں۔ ہم کبھی اُن کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ آپ کا
اصول ہے کہ ملاقاتی آئے، خود ہی بات کرے، خود ہی اس کا جواب
دے۔ تھوڑی دیر سینہ سہلائے اور پھر سائیکل پر سوار ہو جائے۔
ہمیں آپ سے بے حد عقیدت ہے۔ اور اسی عقیدت کی بنا
پر حاضر خدمت ہوا کرتے ہیں۔ ایک روز حاضر ہوئے ۔۔۔
"آداب عرض"
"آداب عرض۔ سناؤ بھئی کیا حال ہے۔"
"می گذرد"
(چپ)
ہم ماتھے پر ہاتھ پھیرے جا رہے ہیں اور آپ سگریٹ
کے کش لگا رہے ہیں۔ تا بہ کے سوچا کوئی بات کی جائے ۔۔۔
"پروفیسر صاحب وہ جو آپ اس روز گورنمنٹ کالج کے
پاس سے گزر رہے تھے .....
میرا مطلب ہے کسی مشاعرے سے آ رہے تھے۔"

"ہوں! ۔۔۔۔ ہوں ہوں"۔
"مشاعرہ کب تھا، کس وقت گزر رہا تھا، کب؟ کہاں؟ کیوں؟
یہ باتیں پوچھنے کی شاید ضرورت ہی نہ تھی۔
پھر چپ۔
"قبلہ سنا ہے آپ کے پرچے کا سالنامہ نکل رہا ہے،
مکمل تو ہو چکا ہوگا۔ پریس میں ہی ہوگا غالباً۔ ٹائٹل بھی چھپ گیا ہوگا
.....میرا مطلب ہے کب تک نکل آئے گا"۔
اتنا لمبا سوال کیا اس غرض سے کہ کاغذ کی نایافت وغیرہ ہی
کے قصے چلیں گے۔ لیکن آپ نے "عنقریب" کہا اور چپ ہو رہے
آخر ہم نے بھی اجازت چاہی کبھی چھت پر اور کبھی دیواروں پر
غیرملکی سیاحوں کی طرح کب تک دیکھتے رہتے۔ لیکن جب
اٹھنے لگے تو فرمایا ۔۔۔۔
"بیٹھو نا کوئی بات کرو"۔
ہم بیٹھ گئے اور کہا ۔۔۔۔ "آپ ہی کچھ کہیئے نا" پھر
فرمایا ۔۔۔ "کیا حال ہے"؟
ہم نے کہا ۔۔۔ "گزر رہی ہے، کوئی تازہ نظم لکھی آپ نے"؟
آپ مسکرا دیئے اور سر ہلا دیا۔ اب کے "ہوں" بھی نہ کہہ سکے۔
خوب آدمی ہیں مختصر سے، مختصر سی نظمیں لکھتے ہیں، مختصر
سی بات کرتے ہیں۔ اس رائے سے ہمارے دوست بھی
متفق ہیں۔

ایک اور بزرگ ہیں۔ یہاں دس درجن افسانوں کے مجموعے
شائع کر چکے ہیں۔ بیس پچیس ناول لکھ چکے ہیں۔ علیٰ ہٰذالقیاس چند مزاحیہ
کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ انہیں جب بھی ملئے یہی شکایت
کریں گے کہ فلاں نقاد نے ناول اور افسانے پہ مضمون لکھا سا اس
نے بھی ہمیں فراموش کر دیا۔ رسالوں کے ایڈیٹر بھی تو ان کی نئی
کتابوں پر ریویو نہیں کرتے بھلا نقاد اتنی کتابیں کیسے پڑھے۔
سنا ہے ایک شاعر ہیں۔ کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ پنجاب
کے "شاعر خیز خطہ" سے تعلق رکھتے ہیں۔ صاحب دیوان بھی
ہیں۔ ہمارے ایک دوست ان کے شہر میں ایک مشاعرے
پر گئے۔ آپ ایک موقر جریدے کے مدیر معاون تھے، کھاتے
پیتے شاعر نے انہیں بلا بھیجا۔ ہمارے دوست کا بیان ہے
کہ ایک نوکر پلا کے پھل سے تواضع کرتے ہیں اور پھر نظمیں سناتے
ہیں۔ ایک نہیں دو نہیں ان کے ہاں درجنوں کا حساب چلتا
ہے۔ اور ہر درجن کے بعد فرماتے ہیں ۔۔۔ "صاحب! خون
جگر پیتے ہیں تو نظم لکھتے ہیں"۔ ان سے کوئی کہے ۔۔۔ صاحب
سننے والے بھی پھل ہی کھاتے ہیں تو سنتے ہیں"۔
ہم نے شروع ہی میں ملاقاتوں کی تین قسمیں کہیں ۔۔۔ اختیاری
جبری اور اتفاقیہ لیکن اب الجھن یہ ہے کہ ایک ملاقات ایسی بھی ہے
جو ان تینوں کے ماتحت نہیں آتی۔ اور ہمارے ملنے والوں کا آئے
دن اس سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہ ملاقات کچھ ایسی ہے ۔۔۔
آپ دفتر سے لوٹے ہی ہوں گے کہ آپ کے دروازے پر
ایک مدھم سی دستک ہوگی۔ آپ جراب اتارتے ہوئے دروازہ
کھولیں گے۔ ایک صاحب داخل ہوں گے۔ کچھ عرصہ بیٹھنے کے
بعد آپ کے کان میں اپنی باریک آواز میں کہیں گے ۔۔۔ "صاحب
مجھے آپ سے کچھ کام ہے"۔ لازماً آپ کہیں گے ۔۔۔ "ارشاد"۔ فرمائیں گے
ذرا میرے مکان تک چلیئے"۔ آپ یہ جانتے ہوئے کہ چائے تیار ہے۔ ایک آدھ
منٹ میں پی جا سکتی ہے، ان کے ساتھ ہو لیں گے۔ راستے میں آپ کی تفریح
طبع کے لئے ایسی پرلطف باتیں کی جائیں گی کہ آپ یہ جان سکیں گے کہ کس
راستے اور کب ان کے مکان پر پہنچ گئے۔ پھر پوچھا جائے گا ۔۔۔ کیا پئیں
گے چائے ۔ آپ ضرور تکلف کریں گے۔ اور کہیں گے "شکریہ" پینے پلانے کی بات
ختم ہو جائیگی۔ پھر ایک خوبصورت عینک چڑھائی جائیگی اور آپ کو ایک طویل
مختصر افسانہ سنایا جائے گا۔ افسانے کے دوران میں آپ کا ہاتھ بھی دبایا
جاتا رہے گا۔ آپ کو محسوس تو ہوگا کہ آپ کی انگلیاں ایک دوسرے
سے پیوست ہو رہی ہیں لیکن آپ یہ ہرگز نہ کہیں گے "یہ ہے میرا ہاتھ"
ہے ہی یہ جب وہ افسانہ پڑھ چکیں گے تو فرمائیں گے ۔۔۔ چلیئے
میں آپ کو گھر تک ہی چھوڑ آتا ہوں"۔ جب آپ اپنے گھر واپس پہنچ جائیں
گے تو وہ الوداع ہوتے ہوئے اپنی باریک آواز میں فرمائیں گے۔
"اچھا جی پھر ملاقات ہوگی جی"۔
اب کہیئے اس ملاقات کو آپ کیا نام دیں گے۔

امجد حسین

ارتقا

مری شریکِ سفر اس قدر نڈھال نہ ہو
دکھا نہ پاؤں میں ٹوٹے ہوئے مجھے کانٹے
گذشتہ راہ کی پُرہول داستاں نہ سنا
— وہ غار بھوکے درندوں کی طرح منہ کھولے'
— جھکی ہوئی وہ چٹانیں کہ جیسے پر تولے
کسی شکار پہ گرنے کو ہو عقاب کوئی'
سفر کے بیتے مصائب نہ لا تصور میں
مہیب وادیوں ٹیلوں کی یاد جی سے بھلا۔
ٹھٹھک گئی تھی جنہیں راستے میں دیکھ کے تو۔
نہیں نہیں، کسی انساں کی ہڈیاں تو نہ تھیں،
گریلا یا کوئی بندر کبھی مرا ہوگا۔
اور اب تو ہم انہیں پیچھے ہی چھوڑ آئے ہیں
وہ دیکھ سامنے کی گھاٹیوں پہ اونچے درخت
جھکی ہوئی وہ پھلوں سے لدی ہوئی شاخیں
کہ جیسے پہنے ہوں تو نے سہاگ کے گہنے
ہماری منزلِ مقصود ہے وہی وادی
ذرا سی دیر میں ہم ہوں گے وہ فضا ہوگی۔
انہیں درختوں کی ٹھنڈی گھنیری چھاؤں میں
تھکن کا تجھ کو نہ آئے گا بھول کر بھی خیال،
میں جانتا ہوں ترے پاؤں تھک چکے ہیں مگر
مری شریکِ سفر اس قدر نڈھال نہ ہو
ہمارے خواب کی تعبیر کوئی دور نہیں۔

شریف کنجاہی

جاگ

تو ابھی نیند کی آغوش میں آسودہ ہے
منزلیں رات کی طے کر بھی چکا ماہِ تمام
اپنی بے نور سمٹتی ہوئی کرنوں کو لئے
اُفقِ غرب سے یوں جھانک رہا ہے جیسے
مٹتی اُمیدوں کو لپٹائے ہوئے سینے سے
بسترِ مرگ پہ بدحال ہو دوشیزہ کوئی —
نور کے سیلِ فراواں سے ہراساں ہو کر
غم کے طوفاں میں کسی ڈوبتے ارماں کی طرح
مبتلا کشمکشِ زیست میں ہے اخترِ صبح
تو مگر دور بہت دور ہے ان باتوں سے
کہ ترا ذہن ہے آئینہ شبِ رفتہ کا،
لذّتِ دوش کی خوشبو ہے تری سانسوں میں
جو مسرّت کے شگوفوں میں بسی رہتی ہے
لوریاں دیتے ہیں شاید تجھے راحت بھرے خواب
تیرے رخسار پہ بکھری ہوئی کالی زلفیں
چھیڑ دیتی ہیں کوئی بات شبِ رفتہ کی —
نیند کا بار اٹھائے ہوئے بوجھل پلکیں
تیری مستی بھری آنکھوں کا دل آویز نقاب
دیکھ کر شوخ نگاہیں مجھے یاد آتی ہیں —
ایک منظوم فسانہ ہے تمناؤں کا
مرمریں سینے کا خاموش اتار اور چڑھاؤ

شبِ رفتہ سے لپٹ جاتا ہے پھر ذہن مرا
چاندنی، ابر، ترا جسم، تری زلفِ دراز
زندگی بھر کی تمناؤں کا حاصل تھی یہ رات
گویا فردوس شبستاں میں اُتر آیا تھا
لیکن اب وقت نہیں گذری ہوئی باتوں کا
پل میں جاگ اُٹھنے کو ہے شاہسوارِ مشرق
انگلیاں تند شعاعوں کی ابھی چھیڑیں گی
آسماں بوس پہاڑوں کی ہر اک چوٹی کو
تو مگر نیند کی آغوش میں آسودہ ہے
ایسے میں کس لئے بیدار نہ کر دوں تجھ کو
جھک کے میں رکھ ہی نہ دوں ہونٹ تری آنکھوں پر
مضطرب ہو کے تری نیند تو اُڑ جائے گی
لیکن اس وقت مرے ہونٹوں میں یہ تاب کہاں
رات کی بات تھی کچھ اور مگر اب دن ہے
کیوں نہ سلجھاؤں تری اُلجھی ہوئی زلفوں کو
اور کہوں دیکھ کہ اب وقت نہیں سونے کا
پھر بھی تو نیند کی آغوش میں آسودہ ہے
میں جگا دوں گا کسی طرح جگا دوں گا تجھے

سیّد ضیا جالندھری

(۲)

ہمارا بیرا

کانگریسیوں کو انگریزوں سے شکایت ہے کہ ہندوستان کو آزادی سے محروم کر دیا۔ مسلم لیگ شاکی ہے کہ ہماری حکومت چھین لی۔ گاندھی جی کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی صنعت کو برباد کر دیا۔ کمیونسٹ کہتے ہیں کہ مزدور کو لوٹ لیا۔ لیکن انگریزی حکومت کے سب سے بڑے ظلم کا کوئی بھی شاکی نہیں۔ یعنی اس نے ہندوستان میں دو ایسی مکروہ چیزیں پیدا کیں جو دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں یعنی آیا اور بیرا۔ مشرق کی تہذیب کو مغرب کے تصادم سے جو نقصان پہنچا یہ ان کی زندہ مثال ہیں۔ ان کی ذہنیت، ان کی زبان، ان کی طرزِ معاشرت، ان کا نقطۂ نگاہ پکار پکار کر اس بات کی فریاد کر رہا ہے کہ دیکھو مغرب نے مشرق کے ساتھ کیا کیا۔ آپ کہیں گی میں مبالغہ کر رہی ہوں نہیں جناب آپ نے شاید کبھی اس مضحکہ خیز ہستی یعنی "بیرا" کی ذہنیت، گفتگو کے نقطۂ نگاہ سے غور نہیں فرمایا۔ میں آپ کی خدمت میں اس طبقہ کے ایک فرد کی تصویر پیش کرتی ہوں اس کو پڑھئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ میرا یہ کہنا صحیح ہے یا غلط کہ سب سے بڑا ظلم ہندوستان پر ان ہستیوں کی تخلیق ہے۔

کچھ روز ہوئے مجھ کو ایک اصل نسل بیرا دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے اس سے قبل بھی اس قسم کی مخلوق کو دیکھا ہے لیکن چند روز بعد ہی مغرب کی تہذیب کی یہ پیداوار میرے گھر کے مشرقی ماحول میں نہ پنپ سکنے کی وجہ سے رخصت کر دی جاتی تھی۔ لیکن آج کل دہلی میں نوکروں کی قلت کی وجہ سے مجھے اس دفعہ اسے پورے دو مہینے رکھنا پڑا۔

ہمارا بیرا "بیریت" کی مکمل تصویر تھا۔ مغربیت اس کی رگ رگ میں پیوست ہو چکی تھی۔ اس نے بڑی کوششوں سے صاحبوں کے رہنے کے طور طریقے سیکھے تھے اور مجھے یقین ہے کہ میرے یہاں کے "میٹو پن" سے بے چارے کے جذبات سخت مجروح ہوئے ہوں گے۔ اور دنیا کی نیرنگی پر اپنے دل میں حیران ہوگا کہ نئی دہلی میں رہنے والے، آئی سی ایس کہلانے والے لوگ اور "نیٹو" اِٹ

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

پہلا دھچکا جو اس بے چارے کی مغرب پسند طبیعت کو میرے یہاں لگا وہ یہ تھا کہ جب اس نے رات کے کھانے کے بعد نہایت ادب سے جھک کر اپنے سر کو میرے صاحب کے کانوں کے قریب لا کر پوچھا "بلنگ چائے کے بجے مانگتا؟" اور اس کا جواب اسے یہ ملا کہ ہم لوگ "بلنگ چا" سرے سے پیتے ہی نہیں۔ تو اس کو یقین نہ آتا تھا کہ اس نے صحیح سنا۔ "کچھ فروٹ بسکٹ مانگتا" اس نے پھر لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں پوچھا۔ "نہیں کچھ بھی نہیں"۔ جواب سن کر اس نے ذرا دیر بعد اپنے دل کو قابو میں لا کر پھر پوچھا "چھوٹا حاضری کے بجے مانگتا؟" ہم نے جواب دیا۔ "ہم لوگ ناشتہ صبح ۸ بجے کیا کرتے ہیں"۔ اس نیٹو جواب کو سن کر اس بے چارے نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہمیں سلام کیا اور یہ سوچتا ہوا کہ میں کیسے جنگلیوں میں آ پھنسا کمرے سے چلا گیا۔

لیکن یہ اس کی ناکامیوں کی ابتدا تھی۔ دو مہینہ میں اس نے ہمارے گھر میں وہ وہ رنج اٹھائے کہ اس کا دل چھلنی ہو گیا ہوگا۔ دوسرے ہی دن صبح کو اس نے چائے دان میز پر رکھتے ہوئے اُن سے پھر کانا پھوسی کی "انڈا کیسا مانگتا صاب"؟ انہوں نے اخبار پڑھتے ہوئے سرسری طور سے کہا "خاگینہ" بے چارا بھونچکا ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "خاگینہ نہیں جانتے؟ انڈے کو توڑ کر پیاز کتر کتر ......" ابھی میں جملہ ختم بھی نہ کرنے پائی تھی کہ اس نے کہا "ہم ہندوستانی رتن نہیں جانتا، انگریزی رتن بنا سکتا"۔ میں نے کہا "اچھا انڈے تل لاؤ"۔ وہ ہنوز کھڑا تھا۔ میں نے دوبارہ کہا "انڈے تل لاؤ" میں نے دیکھا وہ اپنے دماغ پر بہت زور

دے رہا ہے کہ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے چڑھ کر کہا "جاؤ انڈا فرائی کرلاؤ۔" انگریزی لفظ سنتے ہی اُس کی جان میں جان آگئی۔ وہ سرعت کے ساتھ کھانے کے کمرے سے باہر چلا گیا۔

روزانہ یہی تماشہ ہوتا تھا اور ہمارے میٹوپن سے بچارے کو رنج پر رنج پہنچتا رہتا تھا ادھر ہم اس کی انگریزیت سے جل جل کر کوئلہ ہو ہو جاتے تھے۔ جتنے دن وہ رہا گھر کی فضا وہی ہی تھی جیسے یورپ کی فضا کرائسس کے زمانے میں۔

میری کمزوریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں اردو کو قتل ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ میں کبھی دہلی کی کوثر سے دھلی بامحاورہ چٹخارہ دار زبان بولتے سنتی ہوں تو دل چاہتا ہے کہ گھنٹوں سنتی رہوں۔ چاہے گفتگو کا مقصد کچھ ہو یا نہ ہو اسی طرح کسی کو اردو کو توڑ مروڑ کر بولتے سنتی ہوں تو دل چاہتا ہے کہ اس کا گلا گھونٹ دوں۔ ددد تین دن تک تو میں ایسے جملے سنتی رہی اور برداشت کرتی رہی مگر "آپ کو ٹیلی فون پر منگتا" "چائے آپ کے بجے لے گا؟" "بابا لوگ کا سپر میز پر ہے" "فلاں نے آپ کو سلام دیا ہے" لیکن تیسرے دن تو میں نے ٹوک ہی دیا "بیرا تم مرادآباد کے رہنے والے ہو کر ایسی زبان بولتے ہو تمہاری بیوی تو بہت صاف اردو بولتی ہے تم کیوں نہیں ویسی باتیں کرتے؟" "ہم چھوٹا وقت سے ساب لوگ کے ہاں کام کیا اس لئے ایسا بولتا" میں نے کہا "انگریز کے ہاں کام کرنے کی وجہ سے زبان خراب ہونے کی تو کوئی وجہ نہیں۔ بہرحال اب تو ہندوستانی کے یہاں ہو اس لئے ہم سے تو ایسی بولی مت بولا کرو۔" بے چارے نے خون کے گھونٹ کی طرح اس حکم کو پی لیا اور ایک آدھ دفعہ کوشش کی بھی کہ سیدھی طرح بولے لیکن اُس کی گھٹی میں انگریزیت پڑی ہوئی تھی وہ کہاں سے جاتی۔ "چائے لے گا" کے بدلے اس نے دو ایک دفعہ ہمت کرکے "آپ چائے پئیں گی" تو کہہ لیا اس کے علاوہ اس کی مغرب زدہ طبیعت اور کوئی ترمیم اپنے طرزِ گفتگو میں برداشت نہ کرسکی۔

کھانا کھلاتے وقت بے چارے کو سخت تکلیف ہوتی تھی اگر انگریزی کھانا ہوتا تو وہ بڑی خوشی سے کھلاتا تھا۔ لیکن ہندوستانی کھانا ہوتا تو اس کو سخت تکلیف ہوتی تھی اول تو اسے یہ طریقہ ہی معلوم نہ تھا یا کم از کم اس بات کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ جانتا ہے کہ ہندوستانی کھانا کس طرح کھایا جاتا ہے۔ اس لئے وہ روٹی، دال سالن ہر چیز کے بعد لایا کرتا اور جہاں ہم نے دو نوالے کھائے کہ پلیٹ غائب!! اور نوالہ ہاتھ کا ہاتھ میں!! بھلا آپ غور فرمایئے وہ بغیر پلیٹ بدلے کھانا کھلانا کس طرح گوارا کرسکتا تھا۔ اس کو سب سے زیادہ رنج ہمارے فنگر بولوں میں ہاتھ نہ ڈالنے سے ہوتا تھا۔ وہ روزانہ ڈیوٹی لگا لگا کر فنگر بول میز پر لاتا اور ہم کہتے نہیں آفتابہ چلمچی اٹھا لاؤ۔ آفتابہ چلمچی جیسی چیزوں کا چھونا بھی اس کے لئے کسرِ شان تھا۔ اور آفتابہ سے پانی ڈالنا تو اس کو دو مہینہ میں آیا ہی نہیں۔

لیکن اس کی زندگی کا شاید سب سے تاریک دن وہ تھا جب کہ میں نے اس کی توجہ پاندان کی صفائی کی طرف کروائی اور جس وقت لوگ ملنے آتے اور وہ نہایت مودبانہ طریقے سے پوچھتا "پینے کے واسطے کیا لائے گا حضور" اور میں اس سے پاندان منگواتی تو اس کا دل بیٹھ جاتا۔ اُف نئی دہلی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر پان کھایا جائے۔ "بوُم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب" کا معاملہ نہیں تو کیا ہے۔

اور جس دن اس نے ایک کرنل کی وردی میں ملبوس دوست کو اپنے ہاتھوں سے پان لگا کر کھاتے دیکھا۔ شاید اس روز اس کو قربِ قیامت کا یقین آگیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے یا خواب دیکھ رہا ہے ہمیں تو اس نے شاید عجیب الخلقت سمجھ کر صبر کرلیا تھا۔ لیکن ہمارے ہاں کے مہمان بھی ایسے ہی نکلے اور نہ صرف یہ بلکہ جو بھی ہمارے یہاں ملنے آتا تھا وہ اسی رنگ میں رنگا ہوتا تھا اور ہمارے یہاں ڈنر، پارٹیز بھی اس کے لئے رنج دہ ہوتی تھیں آنے والوں میں ایک بھی ڈنر جیکٹ میں نہ ہوتا تھا۔ ایک یہی نہیں!! انگریز تک بغیر ڈنر جیکٹ کے ہوتے تھے اور ہندوستانی کھانا شوق سے مانگ مانگ کر کھاتے تھے اور ہائے غضب ان انگریزوں کے آگے بھی ہم اپنی نیٹوپن سے شرمایا نہیں کرتے تھے اور جیسے ہی ہندوستانی کھانا پیش ہوتا ہاتھ سے کھانا شروع کردیتے تھے اور کھانے کے بعد پان کھاتے ہمارے نیٹوپن سے اُسے ندامت سے عرق عرق ہونا پڑتا تھا۔ اُد

ہمارے یہاں کیسے نیٹیوں کی اس کو خاطر کرنی پڑتی! برقعے پوش عورتیں مولوی، منشی، بزرگ، کھدر پوش حضرات!! اور مزہ تو یہ ہے کہ نئے فیشن کے لوگوں کی بہ نسبت ان کی دوگنی خاطر تواضع ہوتی تھی۔ دروازے تک جا کر ان کا خیر مقدم کیا جاتا تھا اور گاڑی تک جا کر ان کو سوار کرایا جاتا تھا۔ اس بے خبر کو کیا معلوم کہ سیدھے سادے لباس میں ہندوستان کی کیسی مقتدر ہستیاں ہوتی تھیں۔

غرض اس کی انگریزیت سے ہم بیزار اور ہمارے نیٹو پن سے وہ نالاں جتنی دفعہ وہ آپ کو ٹیلی فون پر مانگتا، کہتا میرا خون کھول جاتا اور جتنی دفعہ اُسے پاندان اٹھا کر لانا پڑتا اس کے دل پر سانپ لوٹ جاتا۔ بھلا دیکھئے تو سہی جن ہاتھوں نے کاک ٹیلز کے ٹرے اٹھائے ہوں، شیری کے گلاس دھوئے ہوں وہ پاندان اٹھائیں!! آفتابہ چلمچی چھوئیں!!

بالآخر ایک روز میرے صبر کا پیمانہ چھلک ہی گیا۔ اور یہ اس طرح کہ ان بیرا صاحب نے ایک دھوبی کی سفارش ہم سے ان لفظوں میں کی "حضور بہت اچھا کپڑا دھوتا ہے۔ بڑا بڑا صاحب لوگ کے کام کیا۔ کبھی کالے آدمی کے کام نہیں کیا"۔ میں نے کہا "بہت اچھا اس کو اب بھی اس شرف کے کھونے کی ضرورت نہیں تم بھی یہ ذلت کیوں اٹھاؤ۔ اس سے آج ہی کے دن نجات حاصل کر لو"۔

لیکن سچ پوچھئے تو ان بے چاروں پر ہماری خفگی فضول ہے ان کا مضحکہ اڑانا بے جا۔ ان کا کیا قصور۔ قصور اس ماحول کا ہے جو غلام قوم کے ملک میں پیدا ہو جاتا ہے اور یہ ماحول لازمی طور پر ایسی ذہنیت کی تخلیق کرتا ہے۔

شائستہ اختر سہروردی

"عصمت" دہلی

حصۂ نظم

افکارِ تازہ

دیدۂ عاشق حیراں حیراں، جلوۂ جاناں گلشن گلشن
تابِ نظارہ داماں داماں، حسن کا طوفاں ایمن ایمن

مست نگاہیں میٹھی میٹھی، طرفہ ادائیں پیاری پیاری
دوش پہ گیسو مشکیں مشکیں، چاک گریباں روشن روشن

آبِ مصفا شیریں شیریں، ارضِ گلستاں رنگیں رنگیں
نخلِ مسرت بوٹا بوٹا، شاخِ تمنا مالن مالن

سازِ محبت ہستی ہستی، شہرِ ترنم بستی بستی
وجد میں عاشق کوچے کوچے، رقص میں پریاں مسکن مسکن

برقِ درخشاں خنداں خنداں، بارشِ رحمت طوفاں طوفاں
مست گھٹائیں گردوں گردوں، سب کی زباں پر ساون ساون

گوشۂ خلوت صحرا صحرا، عاشقِ شیدا تنہا تنہا
دل کی حرارت پنہاں پنہاں، آنکھ کا پانی دامن دامن

درد کا معدن پہلو پہلو، غم کا سمندر آنسو آنسو
یاس کا دریا نالہ نالہ، سوز کی دنیا شیون شیون

غم ہے نظیریؔ لشکر لشکر، عیش و مسرت کمتر کمتر
بارشِ رحمت دانہ دانہ، میری خطائیں خرمن خرمن

اصغر حسین خاں نظیر

(روزنامہ احسان)

نومبر ۱۹۴۲ء جلد ۲۰ نمبر ۱۱

فہرست مضامین

ایڈیٹر: صلاح الدین احمد۔ آنریری جائنٹ ایڈیٹر: قیوم نظر

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ فی پرچہ آٹھ آنے

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر رسالہ ادبی دنیا [illegible] سے شائع ہوا۔

دنیائے کاروبار

یاد

ایشیاٹک پکچرز کی "یاد" میں مظہر خاں ایک نعل بند کی حیثیت سے

ایشیاٹک پکچرز کی "یاد" ڈائرکٹر مظہر خاں کے زیر ہدایت بڑی تیزی سے مکمل ہو رہی ہے۔ اور اس میں مظہر خاں ایک نعل بند کی حیثیت سے زندگی کے نشیب و فراز سے نبرد آزما ہوتے ہوئے عجیب رنگ میں دکھائی دیں گے۔ ۱۲۰ سے زاید فلموں میں وہ اپنی اداکاری کے جوہر دکھا چکے ہیں لیکن باوجود اس کے "یاد" میں اُن کا کردار اپنی وضع کا انوکھا کردار ہے۔

واڈیا مووی ٹون

مسٹر شانتارام کے واڈیا مووی ٹون اسٹوڈیو مع سازو سامان خرید لینے سے پبلک میں یہ غلط فہمی پھیل رہی ہے کہ واڈیا مووی ٹون ختم ہو گئی ہے لیکن مسٹر جے بی ایچ واڈیا ایم اے ایل ایل بی مالک واڈیا مووی ٹون کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو واقعات واڈیا مووی ٹون میں رونما ہوئے وہ صرف شخصیت اور اصول میں فوری اور اہم تبدیلیوں کے سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اس ادارہ کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ نہیں بلکہ اس کے برعکس یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ادارہ ایک نئے میدان میں ایک نئی شان کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ ہندو مسلم اتحاد پر تیار کی ہوئی پہلی سندھی فلم ایکتا کے علاوہ بہتر سے بہتر اخلاقی اور نغماتی فلمیں مثلاً شو بھادسو بھدا سمر تھا ورساہو مودک) آنکھ کی شرم (پرتھوی راج اور کوشلیا) میٹھی مادھوری (سریندرا وہبے بیا مادھوری) اس کمپنی کے زیر تکمیل ہیں۔ اس کے علاوہ اخلاقی اور مذہبی فلم تیار کرنا اس کمپنی کا سال آئندہ کا پروگرام ہوگا۔

دس لاکھ کا ایک فلم

"خزانچی"۔ "خاندان" اور "زمیندار" جیسی شاندار پکچرز پیش کرنے والے سیٹھ دل سکھ ایم پنچولی اب "شیریں فرہاد" جیسی حسن و عشق سے لبریز داستان کو پردہ فلم پر لانے کے لئے کمربستہ ہیں۔ مسٹر پنچولی کا یہ پہلا شاہکار ہے جس میں آپ نے ان تمام خوبیوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو آپ کے احاطہ اختیار میں ہیں۔ آپ کی کوشش محض اس پر ہی منحصر نہیں کہ ایک اعلیٰ درجے کی کہانی معیاری ڈرامائی رنگ میں پیش کی جائے بلکہ پنچولی کے "شیریں فرہاد" کے تخیل حسن اور موسیقی میں ایک ایسی دنیا ہوگی جہاں ہر دوشیزہ پری کی صورت اختیار کرے گی اور ہر دل اس کا خواستگار ہوگا۔ فلم کی تیاری پر لاکھوں روپیہ صرف کیا جائے گا جس کا ہر حصہ جذباتی کی رعنائیوں کا مظہر ہوگا۔ دنیائے ادب کے نامور ادیب سید امتیاز علی تاج اس کی کہانی اور مکالمے لکھنے میں مصروف ہیں موسیقی مشہور و معروف میوزک ڈائرکٹر ماسٹر غلام حیدر کے سپرد ہے جو اپنی شہرت اور ہردلعزیزی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ دنیائے فلم کا نامور عکاس پرھلاد دت اس کی فوٹوگرافی کر رہا ہے۔

پنچولی پکچرز کے بہترین اداکار اس فلم میں حصے رہے ہیں اس کے علاوہ چند نئے چہرے بھی حصہ لیں گے۔

مینجر
صیغہ اشتہارات

بزم ادب

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی

اردو کے دل میں ابھی حکیم آزاد انصاری کا غم تازہ تھا کہ منشی دیانرائن نگم بھی چل بسے۔ مرحوم گذشتہ چالیس برس سے اردو کی خدمت میں دل و جان سے مصروف تھے۔ اور حق یہ ہے کہ رسالہ زمانہ نے بے حد نامساعد حالات اور بے شمار مخالفتوں کے باوجود جس انداز سے اردو کا پرچم بلند رکھا، وہ اس زبان کے ہر نام لیوا کے لئے باعثِ رشک ہے۔ منشی صاحب موصوف کی سرپرستی میں اردو کے بے شمار مصنفین پروان چڑھے۔ اور ان کے ہاتھوں اردو کی جو جو خدمات انجام پذیر ہوئیں وہ ایک بڑی حد تک ایڈیٹر زمانہ کی جوہر شناسی اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ قرار دی جا سکتی ہیں۔ کم و بیش گذشتہ چالیس برس سے صفِ اول کے متعدد ادباء اور شعراء رسالہ زمانہ میں لکھتے رہے اور یہیں اُن کا فن اپنے عروج کو پہنچا۔ اور یہ امر ہمارے لئے فخر و مباہات کا موجب ہے کہ جہاں پنجاب میں مخزن نے اردو کے دورِ جدید کا آغاز کیا، وہاں صوبجات متحدہ میں زمانہ نے اس عظیم الشان خدمت کا بار اپنے شانوں پر لیا اور نگم صاحب کے ذوق و شوق اور جذبۂ خدمت کی بدولت سرزمین گنگ و جمن میں اردو کی شمع مخالفت کے طوفان اور جہالت کی صرصر کے باوجود آج تک روشن رہی۔ نگم صاحب سرگباش ہوئے لیکن اُن کا کام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور ہمیں امید ہے کہ جو آواز انہوں نے بلند کی تھی، اُس کی بازگشت زمانہ کے ایوانوں میں ہمیشہ تک گونجتی رہے گی۔

شمارۂ حاضر کے مضامین میں تہذیب و تمدن ایک خیال انگیز مضمون ہے جسے پڑھ کر انسان کی موجودہ مدنیت پر رونے کو جی چاہتا ہے۔ مظہرعزیز صاحب نے جو ہماری بزم میں پہلی بار شریک ہو رہے ہیں فانی کی قنوطیت پر ایک دلچسپ مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے اور برمحل اور واضح مثالوں سے اس کی افادیت میں اضافہ کیا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین ادبی دنیا آئندہ بھی اُن کی علمی کاوشوں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

افسانوں میں ہمارے عنایت فرما جناب چودھری ابوالفضل صاحب صدیقی کا افسانہ دفینہ ایک معرکے کی چیز ہے۔ صدیقی صاحب نے ادب میں ترقی پسندی کا کبھی دعوے نہیں کیا۔ لیکن ان کی یہ کہانی ترقی پسند ادبا کی بعض بہترین کوششوں پر بھاری ہے۔ صاحب افسانہ خود ایک بہت بڑے زمیندار ہیں اور ظاہر ہے کہ اس طبقے کی مالکانہ اور جاگیردارانہ ذہنیت انہیں ورثے میں ملی ہے لیکن جب ہم اُن کی حیرت انگیز صحتِ مشاہدہ و تجزیہ سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور ان کی بے پناہ طنز کی نشتریت محسوس کرتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص جو خود جاگیردارانہ نظام کا ایک نمائندہ ہے، اپنے جگر میں کسان کے کلیجے کی ٹیس کیونکر محسوس کرتا ہے۔ لیکن جیسا کہ راقم الحروف نے ایک اور موقعہ پر عرض کیا تھا، ادب کسی رہبری کا محتاج نہیں۔ وہ بہتے پانی کا ایک ریلا ہے جو اپنی سطح خود تلاش کر لیتا

ہے۔ ضرورت احساس کی صداقت اور مطالعے کے نمو کی ہے۔ افکار کی قید اور موضوعات کی تخصیص لاحاصل چیزیں ہیں۔

ہمارے قدیم کرمفرما جناب ممتاز مفتی جوار دو کے "فلسفی افسانہ نگار" ہیں ایک مدت کے بعد ہمارے اوراق کو زینت دے رہے ہیں۔ سیانی ان کی ایک ایسی دلآویز کہانی ہے جس کی ان کہی باتیں اُن کی فنی خصوصیت کی پوری آئینہ داری کرتی ہیں۔ صاحبِ افسانہ کی خاموش کنائیت اُس کی اپنی شخصیت کی غماز ہے۔ اور اس لحاظ سے اُس کا فن خلوص اور قوت کے دوگونہ محاسن سے ممتاز ہے۔ ممتاز صاحب کا ایک اور افسانہ اندھا جوان کی بے رحم کنائیت کا ایک بے نظیر مرقع ہے۔ ادبی دنیا کی کسی قریبی اشاعت میں ہدیہ ناظرین کیا جائے گا۔ ہماری ناچیز رائے میں وہ فن کی ایک ایسی حد پر آ رہے ہیں جہاں سلامتی کے پیش نظر قدم سنبھال سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہے، جہاں فن کار صرف فن کا ہو کر رہ جاتا ہے، اور جہاں اُس کا مخاطب وہ خود ہوتا ہے یا وہ چند نفوس جن کی فنی تربیت اس کی ہم آہنگی پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ یہ مرحلہ اُن دو چار سخت مقاموں میں سے ہے جن سے ہر سچے فن کار کو کبھی نہ کبھی گذرنا پڑتا ہے۔ اور جہاں بیشتر کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ اب جناب ممتاز کی باری ہے۔ دیکھئے آپ کا اور آپ کے ساتھ ہمارا کیا حشر ہوتا ہے۔

صلاح الدین احمد

نام کتاب	مصنف	قیمت
افسانے		
حسن کی قیمت	حکیم احمد شجاع	عہ
فردوس خیال	منشی پریم چند	سہ
نظارے	کرشن چندر	سہ
طلسم خیال	رر	سہ
ہاسی پھول	سید علی عباس حسینی	سہ
سحر فرانس	طاہر قریشی	سہ
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	۸ عہ
شعلے	پروفیسر احمد علی	عہ ر
ڈاچی	اپیندر ناتھ اشک	عہ
ساز فطرت	حسن عزیز جاوید	سہ
ماتا ہری	خلیل احمد	عہ ر
خواب و خیال	منشی پریم چند	۸ عہ
چغتائی کے افسانے	عظیم بیگ چغتائی	سے
ہمارا سپاہی	لفٹنٹ کرنل سید نذیر علی	۸ ر

نام کتاب	مصنف	قیمت
مزاحیہ		
پطرس کے مضامین	احمد شاہ بخاری	۸ عہ
حاجی لق لق کے افسانے	حاجی لق لق	عہ ر
جدید جغرافیہ پنجاب	سندباد جہازی	عہ
منظومات		
بانگ درا	اقبال	۸ ہ
سوز و ساز	حفیظ جالندھری	۸ ر
نغمہ زار	رر	سہ
گیت مالا	صلاح الدین احمد و میراجی	۸ ر
نغمہ حرم	اختر شیرانی	سہ
سریلی بانسری	آرزو لکھنوی	۸ ر
نور مشرق	ضیا فتح آبادی	عہ ر

منیجر کتب خانہ ادبی دنیا سال روڈ۔ لاہور

غزل

اپنے لبِ خموش سے جادو جگا کے دیکھ
بے لفظ کی حدیث تمنا سُنا کے دیکھ

دُنیا و دیں، بہشت و جہنّم، قصور و حُور
کیا کیا ہیں معجزے مرے ذہنِ رسا کے دیکھ

کس طرح کٹ رہی ہے اسیری میں زندگی
اک دن مرے حدودِ تعین میں آ کے دیکھ

ذروں سے بے شمار، ستاروں سے بے حساب
ساماں ہیں کس قدر غمِ لاانتہا کے دیکھ

تو لاکھ بار شوق سے پامال کر مجھے
تیرے مٹائے سے نہ مٹوں گا مٹا کے دیکھ

چومے گی آ کے خود تری منزل ترے قدم
دل سے نقوشِ دوریٔ منزل مٹا کے دیکھ

مجبوریٔ حیات کا دستور ترک کر
ممکن نہ ہو جو بات اُسے ممکن بنا کے دیکھ

پیمانہ و سبُو سے تو جی سیر ہو چکا
اب اپنی چشمِ مست کا ساغر پلا کے دیکھ

اب دل میں ضبط کرنے کی ہمت نہیں رہی
للہ بار بار نہ یوں مسکرا کے دیکھ

یہ بے خودی، یہ رات کا پچھلا پہر شفقؔ
اس وقت سازِ دل پہ کوئی گیت گا کے دیکھ

شفق ٹونکی

غزل

جینا ہے غم سہنا ہے غم سہہ کر مر جانا ہے
دل اور دل کی دنیا کا بس اتنا افسانہ ہے

ہم وہ رند ہیں جن کے لئے بزمِ جہاں میخانہ ہے
بادل اپنی مینا ہے اور فضا پیمانہ ہے

پھولوں کے متوالو کیا باغ سے پیار بڑھانا ہے
شاخ پہ دو دن رہنا ہے گانا ہے اڑ جانا ہے

دیوانہ ہے دیوانہ، دیوانے کا ذکر ہی کیا
دل کے ذکر سے کیا حاصل دل تو اک دیوانہ ہے

تیری اس روداد میں ہے کس کی تمناؤں کا خوں
مان لیا روداد تری اک رنگیں افسانہ ہے

بزم میں آنے کا مقصد پروانے یوں کہتے ہیں
دوست کے دلکش جلووں میں آتے ہی کھو جانا ہے

اس میخانے میں اپنے شوقِ طلب کی بات نہ پوچھ
روزِ ازل سے شوقِ طلب ایک نگوں پیمانہ ہے

راہِ سفر کی دشواری اور منزل سے بیزاری
یہ تو روز کی باتیں ہیں ان سے کیا گھبرانا ہے

عالمِ فانی میں اے دل! ان کا تبسم دیکھ جنہیں
صبح کو شاخ پہ کھلنا ہے شام کو مرجھا جانا ہے

یہ آباد سا ویرانہ، یہ ویران سی آبادی
دل بھی عجب آبادی ہے دل بھی عجب ویرانہ ہے

جینا اک طوفان سہی، دل میں بڑے ارمان سہی
مثلِ حرفِ غلط اک دن ہر شے کو مٹ جانا ہے

زیر و زبر ہیں آج مری سب بیدار تمنائیں
جو دنیا خوابیدہ ہے کیا اس کو بھی جگانا ہے؟

راہِ سفر دشوار سہی، یہ وادی پُرخار سہی
چلنا اک آزار سہی لیکن چلتے جانا ہے

جگن ناتھ آزاد

دفینہ

جگو میرے کاشتکار تو بالکل نہ تھے ــــ صرف میری آبائی زمینداری میں آباد ہونے کے آبائی خطا وار خصوصی ــــ خصوصی اس وجہ سے کہ پرانی مشہور مثل کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کہ "گھوڑے کی پچھاڑی اور حاکم کی اگاڑی بچائے رہنا چاہئیے" جگو بین میری گڑھی کے سامنے آباد تھے ــــ جہاں سے میں ہر شام سورج غروب ہونے سے چند منٹ پیشتر سے رات کے آٹھ نو بجے تک مختلف اناجوں کے بھننے کی سوندھی سوندھی خوشبو اور اس کے ساتھ ساتھ بھڑ بھڑ سنتا رہتا ــــ اور ہر بھڑ بھڑ سے پیشتر متواتر ایک نہ ایک نئی آواز میں تیز تیز جو جگو اور اناج بھنوانے والے کے درمیان جو بالعموم ایک بچہ یا عورت ہوتی تھی۔ بھنائی کی مزدوری کی مٹھی کے چھوٹے بڑے ہونے پر اتنی ہی ضروری تھی جتنا کہ دانے بھننا ــــ

پتلا دبلا ہڈیوں کا ڈھانچہ ــــ جس میں محض لمبائی تھی تمام جسم پر تقریباً بالکل سیاہ مٹیالی سی چینت دار کھال ــــ آنکھوں میں غیر معمولی تیزی آواز میں درد ــــ مزاج میں قدرے ظرافت اور آزادی ــــ جگو کا دنیا میں کوئی رشتہ دار نہ تھا سنا ہے کہ جوانی میں ایک بیوی تھیں جو انہیں دنوں میں پڑوس کے ایک گڈریے کے ساتھ ایسی تیرتھ کرنے تشریف لے گئیں کہ پورے چالیس سال جگو ان کے منتظر رہے ــــ

حالانکہ جگو کو ان کے جانے کے سال بھر بعد معلوم ہو گیا تھا کہ گڈریہ کانپور کی کسی مل میں مزدوری کرتا ہے اور بیوی اس کی بیوی ہے ــــ مگر دنیا بہ امید قائم ہے۔ لہٰذا اس امید میں کہ جب گڈریے کا بڑا بھائی مرے گا تو ضرور بہ موروثی زمین کے بے دخل ہو جانے کے خوف سے گاؤں میں آ کر بسے گا اور پنچایت کے دباؤ اور مکھیا کے جوتے کے زور سے اپنی امانت واپس لے لے گا" جگو نے پورے چالیس سال گذارے حالانکہ ان کا یہ رومانی خواب ان کی زندگی میں شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

جگو نے اپنی عمر میں کبھی ریل گاڑی نہ دیکھی تھی ایک مرتبہ پختہ سڑک البتہ دیکھی تھی ــــ جب وہ بلسی گئے تھے تو آتے جاتے دونوں دفعہ پار کی تھی ــــ ان کی بیوی کے جانے کے بعد کئی مہینے تو انکی یہی تمنا رہی کہ بیوی جب واپس آئیں گی تو پختہ پتھر کی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی موٹر کاروں اور لوہے کی پٹری پر چلتی ہوئی ریلوں کے قصے سنائیں گی ــــ جگو ہمیشہ اپنا بھاڑ مغرب سے چند منٹ پیشتر گرم کر کے تیار کر جاتے اور اس صورت میں سارے کا سارا کام رات ہی میں ہوتا ــــ کیونکہ بھنائی کی مزدوری کے دانوں کے گڑھے کے ترتیب والی چوڑی درز کے کنارے پر جو بھاڑ کے ٹمٹماتے ہوئے تاریکی نما چراغ کے عین نیچے واقع کی گئی تھی۔ اناج سے بھرے ہوئے چھلنے کو ایک ایسا جھٹکا دیتے کہ گرم بالو والے ٹھیکرے میں گرنے کے بجائے اناج کا ۱/۴ حصہ چوڑی درز کے پیٹ میں کھیل جاتا اور وہی جھٹکا اپنے ردِ عمل میں بقیہ اناج کو ٹھیکرے میں گرا دیتا اور اناج بھن جاتا۔ ــــ پھر یہ کام اس صفائی سے ہوتا کہ اس کو علم الحرکات کا کوئی ماہر خاص بھی تمیز نہ کر سکتا تھا بھلا لمبا گھونگھٹ نکلنے والی عورتوں اور گاؤں کے بھولے بچوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ یہ بازیگر والا جھٹکا جگو نے اپنے باپ سے سیکھا تھا اور ان کے باپ نے اپنے باپ سے ــــ غرض حساب لگاتے لگاتے اس کا بھی سلسلۂ نسب جگو کے سلسلۂ نسب کے ساتھ قدیم آرین تک پہنچتا تھا ــ جب جگو کے جدِ امجد کو شودر کی یہ گرما گرم خدمت تفویض ہوئی تھی ــ اور ساتھ ہی چراغ کے طاق کی جائے وقوع اور کام شروع کرنے کے وقت میں بھی یہی پشتینی اور پرانی حکمت مضمر تھی ــ مشہور بات تھی کہ جگو کا یہ جھٹکا جو جگو کو نسلاً بعد نسلاً ورانت میں پہنچا تھا۔ ابھی تک اسی تناسب پر تھا جیسا کہ ہندوستان میں پہلا بھاڑ گرم ہونے پر پہلا جھٹکا ان کی نسل کے پہلے فرد نے دیا ہوگا۔ اور چراغ کی جگہ بھی بال بھر ادھر سے ادھر نہیں ہوئی ہے اور نہ کام شروع ہونے کے وقت میں ایک منٹ کا فرق پڑا تھا ــــ وہ اپنے جھٹکے کو وقت اور چراغ کی مدد سے اناج کے وزن کے ساتھ ایسا متناسب رکھتے کہ بال کیا

کہ پرانی متمدّن حکومتوں کی طرح عشر سے زیادہ چور دروازیں پہنچ تو جائے۔

جب آٹھ نو بجے بھاڑ ٹھنڈا کرتے تو بھنائی کی مٹھی کے دانوں کے علاوہ کافی مقدار اناج کی اس چور دروازے سے بھی برآمد کرتے ـــــ جگو اصول کے نہایت پکے تھے اور یہ پُراسرار سرقہ اُن کی خلقی عادت میں شامل ہو کر ان کا ایک اصول عمل بن گیا تھا ـــــ یہی نہیں کہ جگو جھٹکا ہی دینے کے لئے اصول کے پابند ہوں بلکہ اور معاملات میں بھی اصول کی پابندی میں نے ان کی خلقی عادت پائی۔ ایک مرتبہ میری گڑھی کے ملحق باغ میں مجھے ایک چار سالہ چونسے کے پودے کی چند نہایت تندرست اور ہونہار شاخیں ٹوٹی ہوئی ملیں۔ فوراً مالی سے باز پرس کی ـــــ مالی نے دہائی دینا اور چلانا شروع کیا۔ اور تمام گاؤں سر پر اٹھا لیا ـــــ اس کی بیوی نے درخت کے تنے سے لپٹ کر بڑے زور سے دہاڑ ماری اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کیونکہ گاؤں کے آدمی ہر اس درخت کو جس کی وہ پرورش کرتے ہیں اپنا بچہ خیال کرتے ہیں خصوصاً گاؤں کی عورتیں آم کے درخت کو خاص طور پر کیونکہ یہ بات ان کے توہمات میں قدیم سے چلی آتی ہے کہ درخت نہ صرف جان ہی رکھتے ہیں بلکہ اپنی فیض گستر خلقت کی بنا پر معصوم اور بے ضرر دیوتاؤں کے زمرے میں آجاتے ہیں ـــــ اور آم کے لئے جہلا میں لفظ "انبیا" "اولیا" زبان زدِ خاص و عام ہے۔

غرض جس طرح ایک بوڑھے صاحب اولاد کے جنازے پر اُس کی اولاد "اولیں" ماتم اور کہرام سے تھک کر اک ذرا کی ذرا سکون پر آتی ہے جب مالی اور اس کی عورت کے ساتھ ساتھ میرے ایک درجن بھر ملازمین چیخنے چلانے اور ہٹر لینگ سے فارغ ہوئے تو صورت حال پر غور کرنے لگے۔ درخت تقریباً نصف ختم ہو گیا تھا۔ بھلا چار سال کے قلمی آم کے پودے کی بساط ہی کیا۔ ہر شخص مصروف تحقیقات تھا اور مختلف قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ مالی اور اس کی بیوی کچھ درخت ٹوٹ جانے کے رنج سے اور کچھ سختی سے غفلت کا جواب طلب ہونے کے خوف سے اس قدر غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے کہ میں بھی مرعوب سا ہو گیا نہ مجھے مالی کی غفلت پر غصہ آیا اور نہ درخت کے ضائع ہونے کا کچھ زیادہ افسوس ہی ہوا ـــــ میں نے زمین پر نظر کی تو اندازہ کیا کہ درخت کسی جانور نے توڑا ہے ـــــ "سوائے بھینس کے اور کون ہو سکتا ہے؟" معاً میرے دل میں خیال آیا جس طرح شکار میں میلوں ہرنوں کے نشانات قدم پر جاتا ہوں۔ اسی طرح بھینس کے نشانات قدم پر چلتا ہوا جگو کے مکان کے اندر ان کی بھینس کے تھان پر جا کر کھڑا ہو گیا ـــــ جس کے سینگ اور سر چونسے کے سبز خون میں رنگے ہوئے تلوار اور گرز کی شکل بنے ہوئے تھے۔ میں نے ایک زہرخند مسکراہٹ کے ساتھ اپنی چھڑی سے بھینس کے سینگ اور سر کی جانب اشارہ کیا اور اپنے پیچھے مجمع پر ایک متحدانہ نظر ڈال کر اپنی سراغرسی کی داد طلب کی۔ جگو مجھے اپنے گھر کے اندر دیکھ کر تعجب اور خوف سے کانپ رہے تھے ـــــ اور دونوں ہاتھ میرے بوٹوں کی نوک پر رکھے ہوئے تقریباً پیٹ کے بل پڑے ہوئے اوپر کو دیکھ رہے تھے ـــــ اس کے چہرے کا وہ انداز تھا جیسا اُس کمزور کتے کا ہوتا ہے جس پر اس کا زبردست اور بڑا ہم جنس حملہ کرنے کے لئے اوپر سوار ہو جاتا ہے ـــــ پرنم آنکھیں پھٹی ہوئی سی ـــــ خوف اور خوشامد کے احساس سے دانت باہر کو نکلے ہوئے، تمام جسم سکڑا ہوا اک مشتِ استخواں کی صورت آواز باوجود پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کے بالکل بند، رنگت زرد مٹیالی سی، تمام جسم پر ہلکا رعشہ اور پسینہ اور مجموعی طور پر کل چہرہ پر مردنی کی جھلک اور تمام مجمع پر وہ عالم طاری تھا جیسے کسی آدمی کے ہاتھ پیر کاٹنے کی تحقیقات ہو رہی ہے۔

غرض جگو اور اُن کی بھینس دونوں کشاں کشاں گڑھی کے پھاٹک پر لائے گئے میں نے فوراً حضرت داؤد والا فیصلہ صادر کیا جس کی تائید تمام گاؤں نے پرزور الفاظ میں کی یعنی کم از کم بھینس بحق سرکار ضبط" ـــــ مگر جگو کی خوش قسمتی کہ عمِ مکرم قبلہ میرے مہمان تھے ـــــ غدر کے اردگرد کی پیدائش ـــــ آج تک سر سید علیہ الرحمۃ اور ان کے پیروؤں پر الحاد کا فتویٰ صادر کرنے والے ـــــ اور انگریزی دوا سے شراب اور ہر ولایتی چیز سے سور کا قریبی تعلق ثابت کرنے والے ـــــ بجائے پانچ وقت

کے آٹھ سات وقت نماز پڑھنے کے عادی — اور صبح سے دوپہر تک بامعنی قرآن کریم پڑھنے کے پابند — پھر والد صاحب قبلہ سے پچیس سال عمر میں بڑے سوائے خدا لگتی کے اور کیا کہتے — فوراً حضرت سلیمان والا فیصلہ صادر کر بیٹھے "جس وقت تک تینوں شاخیں نئی پیدا نہ ہو جائیں جگو بلاناغہ دو مرتبہ پانی دیا کریں۔ اور اس شرمار بھینس واپس دلائی جائے" انہوں نے فیصلہ کن آواز میں کہا۔ شاخیں درخت کے تنے سے ملی ہوئی کچھ ایسی جگہ سے ٹوٹی تھیں کہ وہاں پر نئی شاخ پیدا ہونے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ اور نہ کبھی وہ جگہ سرسبز ہوئی۔ جگو اس حادثے کے بعد پورے تیرہ سال زندہ رہے اور نہایت پابندی سے صبح شام پانی دے کر شاخوں کا انتظار کرتے رہے حتیٰ کہ تین چار سال بعد ٹوٹی ہوئی شاخوں کے زخم بھر کر تنے کی موٹائی میں غائب ہو گئے۔ درخت پودے سے نودھا اور نودھے سے پورا قد آور درخت بن گیا اور خوب پھل لانے لگا اور ابتدائی مدارج طے کر کے آبپاشی کی احتیاج سے بڑی حد تک بالاتر ہو گیا۔ اس بھینس کی تیسری چوتھی پشت جگو کے تھان پر دودھ دینے لگی مگر جگو صبح شام اپنے اصول کے مطابق اُس کی جڑ میں پانچ چھ گھڑے پانی نہایت پابندی سے ڈال دیتے۔ یہ ان کی زندگی کا معمول اور خلقی عادت سی بن گئی تھی۔ بغیر اس کا لحاظ کئے ہوئے کہ بعض دفعہ برسات کا پانی گھٹنوں گھٹنوں کھڑا ہے۔ وہ اس کے ایسے پابند تھے جیسے کوئی پنڈت پروہت نیم یا پیپل کے مقدس درخت کو جل چڑھانے کا۔

جگو کی زندگی کے اس اہم واقعے سے میں نے اندازہ کیا کہ جگو واقعی اصول کے پکے ہیں۔ جب سب آدمی اناج بھنوا کر لے جاتے اور جگو کے گھر میں مکمل سکون ہو جاتا تو جگو پہلے چور درز کا غلہ نکالتے اس پر نہایت پُر اشتیاق نگاہیں ڈالتے اس میں ہاتھ گرڑا گرڑا کر اس کے وزن کا اندازہ کرتے۔ اس کے بعد مزدوری والا غلہ گڑھے سے برآمد کرتے چور درز کا غلہ چھلنے میں ڈالتے۔ گول اور لمبا اناج علیحدہ علیحدہ ہو جاتا اس کے بعد نہایت حفاظت سے بھر کر مٹکوں میں رکھ دیتے اور مزدوری والا غلہ چھلنے میں ڈال کر گول اور لمبا اناج علیحدہ کرتے اور صبح تڑکے چکی سے سر دھنے بیٹھ جاتے پہلے اس میں گول اناج کو دلتے۔ اور اُس کو سوپ میں ڈال کر تھوڑی سی دال صاف کر کے نکال لیتے باقی سب بھینس کے برتن میں ڈال کر اس میں پانی بھر دیتے اس کے بعد لمبا اناج لے کر پھر چکی سے منہ جوتے اور آٹا پیستے۔ اس کے بعد چولھا گرم کرتے اور دال کی ہانڈی چڑھا کر آم کی خشک پتیاں اس کے نیچے جلاتے اور پھر آٹا گوندھ کر روٹی پکاتے اور روٹی پکانے کے بعد پہلے بھینس کو صبح کے بھیگے ہوئے دانے کی ایک سانی کھلاتے تب کہیں جا کر قریب ایک یا ڈیڑھ بجے خود کھانا کھاتے اور جو کچھ بچتا وہ شام کو کھا لیتے ورنہ شام کو بھنے ہوئے اناج کے دو تین پھنکے لگا لیتے۔ غرض جتنا غلہ بھنائی کی مزدوری کا ہوتا وہ تو اس صورت سے صبح سے شام تک ختم کر لیتے اور درز والا غلہ اگر قدرے نم یا سبز ہو تو دن بھر دھوپ دکھاتے ورنہ براہِ راست مٹکوں میں سے لے کر تیسرے پہر کے وقت اپنی ہٹری دار کوٹھیا کو تالا لگاتے، کوٹھری کے کواڑ بند کرتے، اور دروازے پر ارہر کی لکڑیوں کی ٹٹی لگا کر دونوں پوٹلیاں بغل میں دبا کر پینٹھ جاتے اور سورج غروب ہونے سے ایک گھنٹہ بیشتر فروخت کر کے واپس آ جاتے اور بھاڑ گرم کرنے میں مشغول ہو جاتے۔ میں گرمی کے موسم میں اکثر اپنے گڑھی کے درمیانی کمرے کی چھت سے جگو کے گھر کی ہر بلند و پست آواز سنتا رہتا۔ اور تاریک و روشن ہر گوشہ دیکھ سکتا تھا۔

میں نے جگو کو اپنے عمر کے بیس سال اسی طرح دیکھا تھا۔ اور اس سے پہلے کے بیس سال میرے والد صاحب قبلہ نے اسی طرح دیکھ کر گذارے تھے اور ہمیشہ جگو کی چوری کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھا تھا۔ حالانکہ جگو کو چوری کرتے آج تک کسی نے پکڑا تو تھا ہی نہیں مگر گاؤں میں ہر شخص کی آمدنی خرچ کا حساب زبان زد خاص و عام رہتا ہے۔ اور گاؤں کے ہر گھر کا حساب ہر آدمی اتنی تفصیل سے سنا سکتا ہے کہ شاید اتنی تفصیل سے خود صاحب خانہ بھی نہ سنا سکتا ہو۔ اور اگر کوئی شخص ذرا بھی غیر معمولی اخراجات کا مظاہرہ کرے تو فوراً چہ می گوئیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ "دو گیہوں تو سب کھیت میں ہی میاں نے کنکوت کرا کے نیلام کرا لیا تھا۔ یہ آج رمداں کے یہاں بوریاں کہاں سے ہوئیں —

ضرور اس نے کھڑے کھیت میں سے کنکوت سے پہلے چرا لیا تھا — دیکھو تو میاں کا لگان رہ گیا اور یہ بوریاں کھا رہے ہیں۔" "ہا ہا — معلوم ہو گیا ڈپا چوٹٹا ہے۔ یہ اس کے بیل بھوسہ کہاں سے کھا رہے ہیں بھوسہ اور غلہ تو جیبوں کا تیوں کھلیان میں سے بھر وا کر لالہ نے بھیج دیا تھا — بھلا بتاؤ — لالہ نے سود میں پچیس روپے چھوڑ دیے اور اس وقت اُس نے گنگا جلی اٹھائی تھی۔ آج یہ بھوسہ اُسے کہاں مل گیا۔" "ابن گڑ! یہ گڑ اس کے یہاں کہاں سے کھایا جا رہا ہے — گنا تو سب اسٹیشن پر لگا ہے۔ اور یہ ہفتہ کے ہفتہ حساب کر کے منشی جی نے اسٹیشن پر ہی لے لیا تھا — یہ بلدیو کے یہاں گڑ کہاں سے آ گیا۔ ان سب جرائم کی خبر دیہات کا غدارِ فرقہ زمیندار اور اس کے کارندوں کے کانوں تک پہنچاتا ہے اور وہ لوگ نہایت سرگرمی سے تحقیقات کر کے دھوکا، چوری، خیانت مجرمانہ اور نہ معلوم کن کن جرائم میں ماخوذ سمجھ کر نہایت سخت سزائیں جسمانی اور جرمانے کی صورت میں عائد کرتے ہیں۔

مگر ان سب پر خار وادیوں سے تو جگو کے جدِ امجد پہلے ہی گذر چکے تھے اور سب گاؤں جانتا تھا کہ بھنائی کی مزدوری (وہ) دالا غلہ جگو روز کا روز کھا لیتے ہیں اور جو غلہ پینٹھ میں فروخت ہوتا ہے وہ چوری کا ہے۔ مگر چوری کو اتنی قدامت حاصل ہو گئی تھی کہ اب یہ عین ساہوکاری شمار کی جاتی تھی۔

جگو کو میرے ساتھ شاید اس وجہ سے کہ سوائے کبھی کبھی دلیا بھوننے کے ان پر میری موجودگی کا کوئی بار نہ پڑتا تھا ایک طرح کا دلی لگاؤ تھا۔ کیونکہ جس طرح وہ گاؤں کے لوہار، بڑھئی، بھنگی فقیر، دہت کے اناج میں سے مٹھی مزدوری کی نہ بھر سکتے تھے۔ اس طرح میرے دلیے کے گیہوں میں بھی بھنائی کی مٹھی نہ بھر سکتے تھے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ہم سب کے اناج کو جھٹکا تو ذرا کڑا ہی دیتے ہوں گے۔ بس اس کے علاوہ جگو پر نہ تو ششماہی دار لگان تھا اور نہ سالانہ جنس، نہ سائر کا بل اور کنواں اور نہ بے گار کی گاڑی — نہ عید بقر عید کی "عیدی" اور نہ ہولی دیوالی کا "نذرانہ" نہ میرے دیہاتی موٹر کے پٹرول کا "موٹرانہ" اور نہ ہاتھی کے روٹ کا "فیلانہ" اور نہ ہفتے کے ہفتے ایک دن کا دودھ میرے کتوں کو دیتے تھے۔ اور نہ ایک دن کا گھی میرے گھوڑوں کو دینا پڑتا تھا — اور نہ اپنے لڑکے یا میرے دادا کی موت کے وقت نذرانہ اور نہ اپنے مکان کی مرمت کے وقت اجازت نامہ اور نہ میرے مکان کی تعمیر کے نذرانہ۔ الغرض جگو میرے علاقے کے صدر مقام میں رہتے ہوئے بھی ان سب مذکورہ بالا قیود کے علاوہ نہ معلوم اور کتنی قیود سے آزاد تھے محض کاشتکار نہ ہونے کی وجہ سے — اور کیوں نہ ہوتے کاشتکار نہ ہونا ہی اُن کی سب سے بڑی آزادی تھا۔

ع۔ میں دامن ہی نہیں رکھتا جو اُلجھے خار دامن سے

نہ کاشتکاری کے سب کھڑاگ ان کے پاس تھے اور نہ ان سے بازپرس ہوتی تھی۔ صدیوں سے ان کے باپ دادا نے میرے باپ دادا کی دلیا بھون کر خدمت کی تھی اور اب میرے لئے بھی سال میں دو چار مرتبہ دلیا بھوننے کے سوائے اور کوئی خدمت ان کے ذمے نہ تھی اور باقی اور لوگوں پر مذکورہ بالا تمام ذمہ داریاں۔

اس میں شک نہیں کہ جگو کو میرے ساتھ دلی لگاؤ تھا۔ اور اس کی بنا پر کچھ آزادی بھی — جو بعض اوقات گستاخی کی حد تک پہنچی تھی اور میرے ہم نوالہ دوست اس کو گستاخی سے تعبیر کر کے مجھ پر معترض ہو جاتے۔ یعنی سارے علاقے میں ساتوں قوم آباد تھی مگر یہ شرف جگو کو ہی حاصل تھا کہ بغیر توسل کے منہ در منہ بات کر سکتے تھے۔ مثلاً یہ کہ جب کسی کے وکیل بن کر آتے تو بجائے اطلاع کرانے کے سپاہی سے محض استفسار کرتے اور اگر انہیں معلوم ہوتا کہ میں صحن یا باغ میں ہوں تو سیدھے سامنے پہنچ کر ایک فرشی سلام کرتے اور سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے اور میرے آنکھوں کی جنبش استفسار پر مطلب بیان کرنا شروع کر دیتے۔ علاقہ بھر میں علاوہ میرے ملازمین کے جگو ہی ایک ایسا آدمی تھا جو چند منٹ مجھ سے کھل کر بات کر سکتا تھا اور میرے جواب دینے اور میری آواز سننے پر اپنے اعصاب اور زبان پر قابو رکھ سکتا تھا۔ البتہ جب میں کبھی نگاہ اٹھا کر اس سے مخاطب

ہوتا تو یک دم گردن جھک جاتی اور چہرے کا رنگ متغیر سا ہو جاتا۔

مجھے کچھ خوشبودار گھی سے بہت شوق ہے اور یہ بات انہیں میری ہمسائگی کی وجہ سے معلوم تھی۔ لہذا بغیر میری تحریک کے ہفتہ میں دو مرتبہ اپنی بھینس کا مکھن پگھلاتے اور میرے خانساماں کے ہاتھ اکثر تو فروخت کر جاتے اور کبھی کبھی میری ذاتی بھینسوں یا علاقے سے آئے ہوئے معمولی بغیر خوشبو کے گھی سے بدل کر لے جاتے اور بدلتے وقت یا خریداری میں اس کا بالکل خیال نہ کرتے کہ یہ گھی لیا میاں کی خریداری والی ڈھبیا سے جا رہا ہے اور اس کے بدلے میں دیا فروخت والی ڈھبیا سے جا رہا ہے اور بڑے سرکار کی جج والی ٹلیا لیتے وقت پیچھے تھی۔ اور دیتے وقت آگے ہو۔ مگر ان سب کی تنبیہوں کے باوجود جگو خوشی سے میرے قیام کے دوران میں اپنا خوشبودار گھی دیتے ہی رہے۔ دوسری جسارت جو جگو کرتے وہ یہ تھی کہ بغیر کسی کام کے اور دربان کی بلا اجازت کبھی کبھی گڑھی میں چلے آتے اور میرے ملازمین سے مذاق کرتے۔ اور اکثر کہا کرتے کہ "سب آسامی تو میاں کی اولاد ہیں۔ مگر میاں ہماری اولاد ہیں۔ جب ہم مریں گے تو ہمارا جو کچھ ہے وہ میاں کو ملے گا" میں نے بھی اکثر اندر کمرے میں بیٹھے ہی بیٹھے دو ایک مرتبہ جگو کا یہ فلسفہ سنا۔ اور اپنے چپک رو ملازم کو نیچے کا ہونٹ لٹکا کر حقارت سے یہی کہتے سنا کہ "کیا ملے گا میاں کو سو پچاس بیگھہ زمین موروثی بھی تو نہیں ہے۔ آئے بڑے وہاں سے لکھ لٹ بن کے"

علاوہ بھرجی ہونے کے جگو دراب نگر اور ارد گرد کے دیگر مواضعات کے ساہوکار بھی تھے اور ایک روپے سے لے کر دس روپے تک کا بیوپار کرتے تھے مگر ان کے سود کا شیڈیول ریٹ ایک روپیہ پر اکنی ماہوار تھا۔ اب خواہ مہینہ تیس دن کا ہو یا تیس سکنڈ کا۔ جس وقت روپیہ جگو کی چٹکی سے نکل کر ضرورتمند کی ہتھیلی پر پہنچ گیا۔ جگو کو خواہ اسی وقت کھلی ہتھیلی واپس کرے خواہ مہینہ بھر بعد دے اکنی کے ساتھ واپس کرنا پڑتا۔ یہی وجہ تھی کہ جگو کے بہت ہی تھوڑے سے آسامی تھے جن میں جگو ڈبوڑھیا کے نام سے مشہور تھے۔

جب کوئی غریب حاجتمند کاشتکار رزق اور موت دونوں کے دروازے سے ٹھوکریں کھا کر جگو کے در پر جبہ سا ہوتا تو جگو اپنی عادت کے برخلاف نہایت خشک اور فیصلہ کن لہجے میں گفتگو کرتے۔ اول تو انہیں اس کے آنے سے پہلے ہی اس کی ضرورت کی اہمیت کا علم ہو جاتا ورنہ اپنی تیز اور جہاندیدہ آنکھوں سے اس کی ضرورت کا اندازہ لگاتے۔ اور چلم بھر کر لاتے اور کش لے کر دھوئیں میں گھٹی ہوئی آواز میں اپنی مری ہوئی سود کی رقوم کے افسانے اور بے ایمان قرضداروں کی حکایتیں سناتے اور اس کے بعد زمانے کی خرابی کی عام شکایت اور وصولیابی کی مشکلات کا دفتر پیش کر دیتے۔ ان سب کو سن کر غریب پانی پانی ہو جاتا اور خود کو بے ایمان سا تصور کرنے لگتا ــــ پہلے تو کچھ گھبراتا سٹپٹاتا ــــ پھر ذرا امطھار کر اپنے حلق میں پھنسی ہوئی آواز درست کرتا اور جگو کو اپنی خوش دہندی اور دیانتداری کی پچھلی نظیریں یاد دلا دلا کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتا۔ اس صورت میں کبھی کبھی جگو شیڈیول ریٹ بڑھانے میں بھی کامیاب ہو جاتے ورنہ احسان کے مارے تو اس کی سات پشت کو خرید ہی لیتے۔

(۲)

کلب میں ایک شام پہنچا تو عجیب قصہ درپیش دیکھا۔ برج اور ٹینس والے سب ایک جگہ جمع ہیں اور درمیان میں ایک پنڈت جی بڑا لمبا چوڑا قشقہ لگائے براجمان ہیں۔ اور ہر ایک کے سوالات انگلیوں پر حل کر کے بتا رہے ہیں اور اچھے خاصے شہنشاہ عالم الغیب بنے ہوئے ہیں اور آئندہ کے بجائے پچھلے گزشتہ واقعات پر روشنی ڈال کر کلب کے سب ممبروں پر رعب جما چکے ہیں اور اشتہار بازی کر رہے ہیں۔

میرے دوست وکیل سرکار نے تعارف کیا کہ الموڑہ کے ضلع کے مشہور تجربہ کار نجومی ہیں۔ نجومیوں کو دیکھ کر میری طبیعت مذاق کے لئے خاص طور پر موزوں ہو جاتی ہے۔ میں نے ازراہ مذاق اپنی ہتھیلی پنڈت جی کے آگے کر دی۔ پنڈت جی نے پہلے تو کچھ گزشتہ اور کچھ آئندہ کی پیٹینٹ تک بندیاں کیں

اور بتاتے ہی بتاتے ذرا ٹھہر کر بولے۔" دفینہ ملے گا ____ تیس سال کی عمر میں" ____ تو پنڈت جی کی آواز بلند قہقہوں کی گونج میں غائب ہوگئی یارانِ طریقت نے قہقہے بلند کئے۔ میں نے ذرا سنجیدہ ہوکر کہا کہ پنڈت جی نومبر کی ۵ تاریخ تک میری عمر کے تیس سال پورے ہوجائیں گے اور ۶ نومبر میری عمر کے اکتیسویں سال کا دن ہوگا اس کے معنی یہ ہوئے کہ ۵ نومبر تک مجھے دفینہ مل جانا چاہیئے۔

پنڈت جی نے جو قہقہوں سے ذرا خفیف سے ہوگئے تھے پہلے میرے چہرے کو بڑے غور سے دیکھا اور جب انہوں نے اندازہ کرلیا کہ میں بھی تمسخر کے ساتھ سوکھے مُنہ سے بول رہا ہوں تو اپنے مُنہ پر ہاتھ پھیر کر اور ذرا مٹھار کر خفت رفع کرکے بولے "ہاں دیکھئے" پھر کچھ حساب لگایا اور بولے "جی نومبر سے پہلے ہی پہلے حساب میں نکلتا ہے۔"

پھر ایک قہقہہ پڑا ____ سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس بولے بھائی کیش سرٹیفکیٹ خرید لینا۔

سول سرجن صاحب بولے۔ "بھائی سچ بتاؤ کلب کو کیا دو گے؟ ____

حاکم پرگنہ صاحب نے فرمایا۔ اجی کلب کو تو درکنار کلب کے کسی ممبر کو پیالی چائے کی مل جائے تو بہت ہے۔

"اجی نہیں جناب کسی کو ہوا بھی نہیں ملے گی۔ بھائی جوکھ کو رسید بھی مل جائے" وکیل سرکار نے کہا۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس نے کہا "جی وہ تو جرم ہے اگر مجھے کچھ نہیں دیں گے تو میں چالان بھی کردوں گا۔"

مجسٹریٹ ضلع صاحب نے فرمایا "اجی بڑا ہیبٹ ہے جس وقت ہمارے سپرنٹنڈنٹ صاحب جاکر مکان کی تلاشی کا وارنٹ دکھائیں گے تو اس وقت جتنا دفینہ ملا ہوگا وہ اور اس سے تین چار گنا اور باپ دادا کے زمانے کا جمع کیا ہوا گھر سے نکال کر اور دکھا دیں گے ____ ایسے دو چار دفینوں پر ڈکار بھی تو نہیں آنے کی۔"

میں نے کہا کہ اگر ایسا دفینہ ملنے والا ہے کہ جس کا تگنا چوگنا میں گھر سے نکال کر دکھا سکوں تو میں ایسے دفینے سے باز آیا۔

ہیلتھ آفیسر صاحب نے جو کلب کے سکرٹری تھے کہا "اجی ہمیں اس سے کیا لیڈیز کلب کا سنگ بنیاد آپ کے چودھری صاحب کے ہاتھ سے رکھوانا ہے" پنڈت جی تو رخصت ہوگئے۔ اور شام تک موضوعِ گفتگو یہی رہا۔ اور ہر شخص ایک نہ ایک دفینہ ملنے کی شنیدہ حکایت سناتا رہا اور پھر میں نے بھی اپنی دیدہ اپنے سائیس کو دس سیر سونا ملنے کی کہانی نہایت تفصیل سے بیان کی اور یہ کہ کس طرح سونا ملتے ہی اس نے میری ملازمت کو خیرباد کہا اور کس طرح اس نے اپنی اناج تولنے والی ترازو میں گاؤں کے ساہوجی کے ہاتھ روپے سے برابر سونا فروخت کیا اور نتیجہ پر دو سال قید کی سزا بھگتی اور کل سونا پولیس نے برآمد کیا اور آخیر پر وہی گھاس کی گٹھری اور گھوڑے کی باگ ڈور ہاتھ میں رہ گئی یعنی جیل خانے سے رہائی ہونے کے ایک ہفتہ بعد میرے یہاں عہدۂ سائیسی پر بحال ہوگئے۔

غرض رات تک دفینہ ملنے کے قصے اور پرانا دولت کو زیرِ زمیں رکھنے کا طریقہ اور دفینے پر سانپ کی موجودگی کا فلسفہ موضوعِ بحث رہا اور مجھ پر جملوں کی بوچھاڑ ہوتی رہی

ایک روز جبکہ آسمان پر ابر محیط تھا اور ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی۔ میرے پاس میرے علاقے کے صدر مقام دراب نگر سے سپاہی آیا اور اس نے مجھ سے کہا کہ جگو بھڑبھوجے کی حالت بہت خراب ہے اور بالکل اخیر وقت ہے اس کی خواہش ہے کہ آپ اس سے مل لیں ____ ایک نئی بات ہی۔ تمام علاقہ میں موت زندگی کا بازار گرم ہے مجھے کبھی کسی کی ہمت بلانے کی نہ ہوئی۔ یہ مرنے والا ابھی کس قدر بے تکا ہے ____ بھلا جگو کو مرتے وقت میری کیا ضرورت لاحق ہوئی۔ عجیب مسخرہ آدمی ہے بھلا میرے بلانے کی کیا تُک ہے۔ کلب میں کپتان صاحب کی رخصتی پارٹی ہے ____ مسز گھوش نے سینما کے لئے مدعو کیا ہے۔ غرض یہ ہفتہ پورے کا پورا گھرا ہوا ہے۔ اب بھلا جگو ہفتہ بھر سے زیادہ کیوں انتظار کرنے لگے اور پھر برسات میں میں کبھی گاؤں جاتا ہوتی اور انشاءاللہ گاؤں

بھی کونسا دراب نگر ـــــ یہ نام جدا مجد نے برسات میں اس کا منظر دیکھ کر رکھا ہوگا ـــــ اچھا خاصا جزیرہ ہو جاتا ہے۔ غرض میں نے آدمی کو ٹال دیا۔

چند دن بعد میرے مدد کارندے لالہ بحال رائے نے رپورٹ دی جگو مر گئے۔ اور چونکہ دنیا میں کوئی ان کا عزیز نہ تھا اس لئے ان کی تجہیز تکفین میرے ملازمین نے کی ہفتہ بھر انہوں نے اپنا لین دین صاف کیا نہ کسی پر اپنا ایک پیسہ چھوڑا نہ کسی کا اپنے اوپر رکھا۔ حساب کتاب میں دماغ آخر وقت تک اتنا صحیح رہا کہ ایک کاشتکار پر چار آنے اور ڈھائی پیسہ سود کا اور ایک روپیہ اصل کا تھا۔ اس نے لاکر ایک روپیہ ساڑھے چار آنے حوالے کئے تو دھیلا اصرار کر کے منگوالیا۔ لالہ بحال رائے نے یہ بھی بتایا کہ مرنے سے بیشتر اور تو سب لین دین صاف کر لیا تھا ایک مراؤ پر سود کے آٹھ آنے پیسے باقی رہ گئے تھے وہ مراؤ بہت غریب تھا اور اخیر وقت تک انتظام نہ کر سکا۔ جگو پر تین دن سکرات طاری رہی اور حالت نزع میں اس مراؤ کا نام اور ۸ر پیسے کا تقاضہ رہا۔ آخر جب لوگوں نے اندازہ کیا کہ جگو کا دم اٹکا ہوا ہے تو اس مراؤ کو بلا کر قائل معقول کیا اور وہ ایک دوسرے مہاجن سے ۸ر پیسے ۸ر کے سود پر لایا اور جگو کے حوالے کئے تب کہیں مرتے ہوئے کے چہرے پر اطمینان پیدا ہوا اور چند منٹ سانس چلی اور ختم ہو گئے ـــــ دوا جگو نے اس لئے نہیں کھائی کہ وید جی تین پیسے یومیہ دام مانگتے تھے اور پھر اس پر اچھا کرنے کا ٹھیکہ بھی نہیں لیتے تھے لالہ بحال رائے نے بالتفصیل یہ بھی بتایا کہ مرنے سے چند گھنٹے بیشتر اپنے سرہانے کی دیوار کھدوائی جس میں سے ایک کلیا برآمد کی جس میں دس روپے کی ریزگاری تھی وہ اپنے کفن دفن کے خرچ کے لئے میرے ملازمین کے حوالے کر دی۔ اور ایک خاص چیز جو جگو نے لالہ بحال رائے کی امانت میں دی وہ بھینس تھی۔ اور یہ کہا کہ اس بھینس کی بزبانی نے میاں کے درخت کی تین شاخیں توڑ ڈالی تھیں۔ میاں نے بھینس اس وقت ضبط کر لی تھی مگر بڑی سرکار نے چھڑا دی تھی سو وہ جس شرط پر چھڑالی تھی وہ شرط بارہ تیرہ برس پانی دے کر بھی پوری نہ ہوئی یعنی نئی شاخیں پیدا نہ ہوئیں اور اب میں مر رہا ہوں۔ لہذا بھینس میاں کو دے دی جائے اور منشی بحال رائے نے یہ بھی بتایا کہ یہی کام تھا کہ جگو نے جس کی وجہ سے مجھے بلانے کی ہمت کی تھی۔

جگو کے مرنے کے بعد میرے کارندے لالہ بحال رائے او میرے دوسرے ملازمین نے سوائے ڈھاڑیں مار کر رونے کے ہر فرض انجام دیا اور کوٹھڑی میں گاؤں کے بچوں کی موجودگی میں تالہ لگا دیا۔ تقریباً دو ماہ بعد برساتی کاشتکاروں کی وصولیابی کے سلسلے میں میں نے علاقے کا پہلا دورہ شروع کیا اور دراب نگر پہنچا۔ ملازمین نے نہایت اہمیت کے ساتھ جگو کے مرنے اور وصیت کرنے کا کل قصہ بیان کیا اور جگو والی بھینس پیش کی جو میں نے اندازہ کیا کہ دبلی ہو گئی ہے اور تہمنت نے ایک زنگ آلودہ کنجی پیش کی۔ اس موضوع پر بہت کچھ چہ می گوئیاں ہو رہی تھیں کوئی کہتا تھا کہ دو ہزار نقد نکلے گا کسی کا اندازہ تھا کہ چار ہزار سے کم نہ نکلے گا میں گڑھی کے وسطی کونے میں ایک صوفے پر بیٹھا تھا اور بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا مگر کان باہر چہ میگوئیوں پر لگے ہوئے تھے۔ بوڑھے کھیا نے اپنی پنچایتی اور فیصلہ کن آواز میں کہا "بچار دو بچار کی تو ہم کہہ نائے سکت ساری عمر کی کمائی ہے جا ہی گھر میں"

بچار دو بچار کی کیوں نہ کہہ سکت ہو عمر بھر جوڑتا جو بچار ہو ہے ـــــ بید جی نے تین پیسہ روج کی دوائی بتائی سو جھائی سے نائے کھلے" مقدم بولا، پنڈت جی ذرا کھانس کر بولے تارے ان نے کبھو کھتا لو تو کری نائے ـــــ بڑا ڈشنٹ تھا ڈشنٹ ـــــ مایا کو سانپ ـــــ کاؤ بامن دربہمن، کو تو کھانا جانتا ہی نہ تھا"

میں نے غور کیا کہ گفتگو کی حدت ترقی پذیر ہے۔ لہذا میں نے آہستہ سے ملازم لڑکے کو آواز دی جس پر خانساماں اور تہمنت بھی دروازے کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور باہر مجمع پر خاموشی ہو گئی میں لڑکے سے حقے کی آگ درست کرنے کو کہا

اور دروازے پر کھڑے ہوئے تہنیت سے مخاطب ہوا اور جگو کی کوٹھڑی کھولنے کا حکم دیا۔ جب سب سامان باہر نکال کر رکھ دیا گیا تو مجھے اطلاع دی گئی۔ چونکہ معاملے کی اہمیت بہت رنگین کر دی گئی تھی۔ لہذا مجبوراً مجھے خود جانا پڑا۔ سامان پر نظر کر کے میں نے غور کیا کہ مرزا غالب کے گھر سے تو چند تصویریں بتوں کی اور چند حسینوں کے خطوط نکلے بھی تھے۔ مگر جگو کے مرنے کے بعد یہ بھی نہیں نکلا دو بانس کی پٹیوں کی سیاہ باندوں والی جھلنگا چارپائیاں دو ایک گدڑی جن کی تعمیر جگو کے باپ دادا کے وقت تک کے پشتینی چیتھڑوں سے کی گئی تھی۔ ایک اسی قدامت کی نمک کی گنجی مٹکی دو تین چھوٹے بڑے اناج کے ٹیکے۔ و چھوٹے بڑے سوراخوں کے چھلنے ایک اناج بھوننے کا لوہے کا کڑھلا جس پر زنگ لگ گئی تھی۔ ایک دال پکانے کی مٹی کی ہانڈی جس کا تلا سیاہ تھا اور اندر پھوڑی لگی ہوئی تھی میں نے ایک بار گی سوال کیا جگو کی چکی کہاں گئی۔ جو پہر بھر رات سے بھیروں کے سروں میں چل کر مجھے بیدار کر دیتی تھی۔ مگر معلوم ہوا کہ جس طرح ولایت کا سفر کرنے سے پیشتر صاحب لوگ اپنا سارا فرنیچر نیلام کر جاتے ہیں۔ اسی طرح سفر آخرت سے چند دن پیشتر جگو نے اپنی چکی پیتل اور پھول کے برتن تمام چیزیں گاؤں کے مختلف آدمیوں کے ہاتھ جس نے زیادہ سے زیادہ قیمت لگائی فروخت کر دیئے۔ پنڈت جی کو حالانکہ یہ پیشتر سے معلوم تھا مگر اس وقت سُن کر اور بھی جل گئے اور آہستہ سے ایک گالی دے کر بڑبڑائے "بڑا سارا سوم تھا۔ دینے کے نام پر کوڑا بھی دینا نہ جانتا تھا"

میں تقریباً کھڑا دو منٹ ہر چیز پہ غور کرتا رہا جگو کے پھاڑ کی چور درز توڑوا کر دیکھی اور چلا آیا۔

(۳)

اکتوبر کا مہینہ ختم ہونے آیا۔ اور گاؤں میں عام بے کاری رونما ہو گئی۔ کاشتکار جتائی اور تخم ریزی ربیع سے تو فارغ ہو گئے تھے اور فصل خریف کی کٹائی کا کام شروع نہیں ہونے پایا تھا۔ میرا دوسرا دورہ تھا۔ اور گاؤں پہنچے ہوئے دوسرا ہی دن تھا۔ صبح کے وقت میں ہاتھی تیار ہونے کا حکم دے چکا تھا اور علاقہ میں گشت کا پروگرام بنا رہا تھا کہ یک دم میری نظر سامنے کو اٹھ گئی تو میں نے غور کیا اگر جگو کی چھپت مسمار کرا کر جگو کے مکان کو اپنے صحن میں شامل کر لو تو دیوان خانہ میں بیٹھے بیٹھے نہایت آسانی سے بڑے رائفل کی چاند ماری کی مشق کر سکتا ہوں کیونکہ موجودہ صحن ۴۰ — ۳۲ رائفل اور ۱۲ بور کی چاند ماری کے لئے پڑا ہے اور نمبر ۴۰۔۴۴ اور نمبر ۳۲۳ رائفل کے لئے چھوٹا نہ ادھر کا ہے نہ ادھر کا پاس ہی لالہ بحال رائے کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے اُن کے سامنے اظہار خیال کیا۔ فوراً تائید ہوئی اور لالہ نے تمام علاقہ میں معمارانہ کی وصولیابی کا اعلان کرا دیا۔ چونکہ تعمیر معمولی تھی لہذا پانچ روپے فی ہل تمام علاقہ میں عام طور پر تجویز کیا اور وہ راب نگر خاص میں چوتھے پیچھے ایک آدمی مزید براں چونکہ تعمیر اسی موقع پر ہو رہی تھی۔

تمام دن اعلان ہوا ڈھول لے کر بھنگی تمام علاقہ میں منادی کے لئے دوڑ گئے۔ حالانکہ برسات اس سال اچھی نہ ہوئی تھی۔ اور درمیان میں بارش کم ہو جانے سے فصل زاید۔ مکا ساٹھی وغیرہ بالکل تباہ ہو گئی تھی مگر لالہ بحال رائے نے معمارانہ کی تعداد بہت کم رکھی تھی کہ ان کے نزدیک اس کا وصول ہونا کچھ مشکل نہ تھا۔ رات ہی میں تمام سپاہیوں اور بلہاروں کی ڈیوٹی لگا دی گئی تھی کہ تمام علاقہ سے وصول کر کر کے لائیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی منادی کریں کہ دو دن کے اندر جس نے معمارانہ ادا نہیں کیا اُس کے مویشی اور کھانے پینے کے برتن نیلام کر کے وصول کیا جائے گا کیونکہ کوئی فصل تیار نہ تھی۔

دوسرے روز صبح کو میں چارپائی سے اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ کام شروع ہو گیا۔ سپاہی کشاں کشاں کاشتکاروں کو پکڑ پکڑ کر لا رہے تھے۔ منشی جی بار بار کہہ رہے تھے بس آج ہی کام جوڑنا ہے کل سے تو سب آئیں گے ہی آئیں گے۔ آج پہلا دن ہے۔ مختلف مواضعات کے ملازم بیٹھے ہوئے تھے منشی جی صاحب سے اصرار کر رہے تھے کہ وصولی معمارانے کی مدت صرف دو دن رکھی گئی ہے۔ یہ بڑی زیادتی ہے۔ یہ بڑھانا چاہیے جب میاں نے کتے خانہ بنوایا تھا تو ایک مہینہ رکھی تھی اور

بڑی سرکار نے کبوتر خانہ مرغی خانہ بنوایا تھا تو پندرہ پندرہ دن رکھی تھی۔ اور رہاں خود سرکار نے موٹر خانہ کے لئے ۲۰ دن کی رکھی تھی۔ یہ اس مرتبہ دو دن کی کیوں رکھی گئی ہے منشی جی کے پاس اس کے سوا اور کیا جواب تھا کہ میاں کا حکم ہے کہ کام ہفتہ بھر کے اندر ختم کیا جائے۔

اس کے علاوہ اگر کوئی کاشتکار براہ راست عذر کرتا تو سپاہی اور بھنگی اس کو پکڑ کر منشی جی کے سامنے پیش کرتے اور جن سے عام طور پر منشی جی پہلا جملہ پست مگر زہریلی آواز میں یہی کہتے "ابے کمبخت میاں آرام فرماؤت ہیں —— ذرا آہستہ بول —— پھر کہیں ہڈیاں چورا کرانا پڑیں"۔ اس جملے کو جس میں میاں کا حوالہ تھا سن کر کاشتکار کا آدھا خون خشک ہو جاتا۔

میں بستر پر پڑا سوتے ہی میں لفظ بلفظ ہر آواز سن رہا تھا۔ اور دور سے پھاوڑا اور بیلچہ چلنے کے دھماکے —— یہاں تک کہ سامنے کی کھڑکی سے صبح کے سورج کی زرد کرنیں براہ راست میرے چہرے پر برسنے لگیں اور ساتھ ہی کمرے میں چاپ سنائی دی اور میز سرکانے کی سرسراہٹ اور چائے کے برتن کھنکنے کی آوازیں میں نے چند جمائیاں اور انگڑائیاں لے کر آنکھیں کھول دیں —— اور پیروں سے کمبل علیحدہ کیا۔ سامنے خدمتگار لڑکا پیچوان کی منال اور خاصدان لئے کھڑا تھا۔ اور بیرا میز پر چائے رکھ چکا تھا۔ آنکھیں کھولتے ہی خدمتگار لڑکے نے خاصدان میں سے ایک گلوری نکال کر منہ میں رکھ دی اور منال ہونٹوں سے لگا دی۔ دو تین کش لے کر میں اٹھا اور باہر کی آوازوں پر جواب میرے کانوں میں زیادہ واضح ہو کر آ رہی تھیں غور کرنے لگا۔ اور چائے کی جانب متوجہ ہوا —— بھنے پینے کے دانے خدمتگار لڑکا چھیل کر پلیٹ میں رکھتا جاتا تھا اور میں اٹھا کر منہ میں رکھ لیتا تھا اور کسی کسی وقت ایک چمچہ انڈے کے حلوے کا یا لوز بادام کی ٹکیہ اٹھا کر کھا لیتا تھا کبھی ایک گھونٹ چائے کی پیالی پر اور کبھی ایک کش حقے کی منہال پر لگا لیتا تھا۔ کسی وقت ڈبل اپنی بسکٹ دانت سے کتر کر پلیٹ میں رکھ دیتا تھا گویا اس صورت میں ایک بے خبری کے عالم میں شغل کر رہا تھا اور کان باہر لگے ہوئے تھے۔

ہر دو تین منٹ بعد کچھ نئے لہجے میں آوازیں کچھ سرگوشیوں میں گالیاں کسی کسی وقت چپت رسید کرنے کے چٹاخے اور سسکیوں کی آوازیں برابر میرے ناشتے کے دوران میں سنائی دیتی رہیں جس کی وجہ سے میرا ناشتہ بہت دیر تک قائم رہا۔

"لالہ آج چھوڑ دیو —— گھر والی کو البیو (کبھار (بخار) چڑھ ہو ہے کہ جینا کھنت ہیں۔ بچا بہت چھوٹو ہے کل سے ایک بوند دودھ منہ میں نائے پڑو ہے سگری رات (ساری رات) لئے ٹھاڑو رہو ہوں —— باکو داس کا یہ) جو حال ہے اور جے بھوکا چلات ہے —— گھر میں کوئی البسو نائے جو ایک بوند پانی ڈال دیئے"۔

لالہ "ابے چپ حرام زادے —— دیکھو تو بے مغزے کی دفتر کو دفتر چھانٹ کے رکھ دو —— میاں تشریف فرما ہیں۔ اور آپ ہیں کہ مینڈھ کی طرح ٹرٹر لگائے پڑے ہیں۔ آئے سرول سے احسان رکھت بھئے —— ارے حکم حاکم مرگ مفاجات داہیں کسو کو دم مارن کی گنجائش نائے ہے۔ اگر ہم جا طریقا سے عذر دارن کے لئیں سنیں تو بس اسی کے ہو جائیں —— صبح سے جا وقت لو جو کوئی آؤ ہے کچھ نہ کچھ عذر لے کر ہی آؤ ہے —— پھر جوتا کے ذریعا سے کام کرت ہو کہ نائے —— تم لوگوں پر تو وہی مثل صادق آوت ہو۔ "لوان پوجان نیچان کو مان" کاشتکار نے گھگھیا کر کہا۔ "منشی جی تمہیں وسواس نہ آوے تو تم دکھیائے لیو۔ سپاہی سے پوچھ لیو جو دیکھ کے میرے سنگ آؤ ہے"۔

منشی جی نے قدرے بلند اور نہایت ترش آواز میں کہا "ہماری پڑی ہے جوتی کو غرض —— جس ...... کی بھیگے گی ہزار مرتبہ حاضر ہوئے گو —— اور بلبلیو جیسے کوئی نئی بات تو ہے نائے تمہاری ہمیشہ کی عادت ہے ایک نہ ایک طوفان اٹھاؤت آت ہو —— ہمیں کیا میاں تشریف فرما ہیں گھنٹا آدھ گھنٹا میں باہر قدم رنجہ فرمائنگے تو ہم پیشی کرائے دیں گے —— اپنا عذر معذرہ کر لیو —— (بھنگی سے مخاطب ہو کر) ارے کلوا جو لوگ ایسے قصا گھڑ کے لا دیں میاں کے سامنے پیش کر دیو —— جاؤ اپنی مہلت کی درخواست

لکھائے گے لادو — پہلے سوا روپیہ درخواست کا داخل کرو گے تو تو میاں کے سامنے پیش ہو دگے یہاں کیا ہے زبانی جمع خرچ اور جس وقت ایک دو کی بیشی ہو گئی اور سرکار نے دس دس پانچ پانچ جرمانہ فرمائے دو سب کے دماغ صحیح ہو جائیں گے۔ جا دقت تو انسانیت سے خارج ہو رہے ہیں — جاما سے باہر ہیں — جب تک ان کے متھا کی نائے پھڑے گی سبھی لوگ بازی نائے آمنگے مجھے غصہ تو اس بات پر آوت ہے کہ سرکاری تعمیر چھڑی پڑی ہے اور جناب کی زوجہ علیل ہیں — فرزند بیمار ہیں — خوئے بدرا بہانہ بسیار۔"

ایک بیلچہ گھسینے کی آواز آئی اور ساتھ ہی جھنگی کی کرخت اور تحکمانہ آواز گہتی سنائی دی" جاؤ جاؤ کام سے لاگو بیلچہ پکڑو — بہت سی باتیں گھائیں — آئے ٹھاٹ — بھئے سارے طول کے بارہ گراہ لمبا پیٹ — تنگا دنگلے) سرنہ کم کھائیں نہ گم کھائیں — ایک جوتا ہیں سب تبیبی باہر دکھائی دینے گی — لیو تھامو بیلچا" دو تین شدید دھکے دینے کی آواز آئی — اسی قسم کے قصوں میں میں نے جب غور کیا تو میں پوری چلم جلا چکا تھا اور پورا ناشتہ تقریباً صاف کر چکا تھا جب یہ سلسلہ ختم ہو گیا تو میں باہر نکلا — ایک کافی تعداد آدمی بچوں اور عورتوں کی دیوار پر لگی ہوئی تھی اور منشی جی ایک معتدبہ رقم معمارانے میں وصول کر چکے تھے۔

(۴)

تین ہو چکے تھے جگو کے مکان کی تمام دیواریں مسمار ہو چکی تھیں محض اس کے مکان کی زمین کو لیول میں لایا جا رہا تھا — میں گڑھی کے صحن میں نیم کے درخت کے نیچے ایک گوشے میں آرام کرسی پر دراز تھا اور سر الگزنڈر ڈوما کا مشہور ناول کاؤنٹ آف مانٹی کرسٹو پڑھ رہا تھا۔ اور کتاب کے دلچسپ ترین حصے پر پہنچ چکا ہوں کہ ایڈمنڈ ڈینز قلعہ الیف کی تابوت میں چھپ کر فرار ہو چکا ہے۔ اور جزیرہ مانٹی کرسٹو میں پہنچ کر غاروں کے اندر خزانے اور دولت کا نظارہ کر رہا ہے آج دوپہر کی چھٹی منشی جی نے بند کر دی تھی۔ کیونکہ اُن کا اندازہ تھا کہ آج کا دن اگر تعمیر روکے ہوئے مسلسل کام جاری رکھا جائے تو کام شام تک ختم ہو سکتا ہے جب منشی جی کو کوئی اس قسم کا حکم نافذ کرنا ہوتا جو قدیم رواج کے خلاف ہوتا تو مجھ سے خاص طور پر منظوری لینے گویا ایک آرڈیننس جاری کراتے دروازہ پر قریب درجن بیل اور قریب پندرہ سولہ بکریاں جمع تھیں جو تمام علاقے سے ان کاشتکاروں سے پکڑ کر آئی تھیں جو اپنا معمارانہ نہیں دے سکے تھے ان کا باری باری سے سرکاری تہمنیت اور سیاہی نیلام بول رہے تھے اور ایک شور بپا تھا۔ چونکہ آج دوپہر کی چھٹی بند تھی اس لئے منشی جی بار بار تہمنیت سے چلا چلا کر کاشتکاروں کو سنانے کے لئے آدھ پاؤ فی کس کے حساب سے مزدوروں کے کھانے کے لئے چنے ادبالنے کا حکم صادر فرما رہے تھے اور بار بار گودام کی کنجی بجا دیتے تھے۔

مقدم اور میٹھہ کام کرتے ہوئے کاشتکاروں کو نہایت کرخت لہجے میں للکار رہے تھے اور توہین آمیز الفاظ میں شام تک کام ختم کرنے کی ہمت بندھا رہے تھے اور بار بار مقدم چنے کھلانے کا احسان رکھ رہا تھا۔ مقدم اور میٹھہ میں سے کوئی نہ کوئی ہر دو منٹ بعد بول اُٹھتا "جلدی جلدی کام کرو — لالہ نے تین ڈھیاں پکے چنا الین کے لئے نکالے ہیں۔ اب کیا ہے یہیں آج دوپہر کو ہاتھ مارو۔ غرض میری گڑھی کے چاروں طرف ایک شور محشر بپا تھا نیلام کی وجہ سے یہ اور بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ مالدار کاشتکار آپس میں متفق ہو گئے تھے اور نیلام ہوتے ہوئے مویشی کی قیمت واجب چندہ معمارانے سے زائد نہ لگاتے تھے۔ اور مفلس کاشتکار اپنا مال اس طرح سے پانی کے مول جاتے دیکھ کر بلبلا اُٹھتے تھے اور آپس میں بہت زیادہ بحث مباحثہ ہو رہا تھا۔ ادھر گودام کی جانب چنوں کا شور اُدھر سامنے ملازمین کی کام کرتے ہوئے کاشتکاروں پر للکاریں اور کاشتکاروں کے کام کرنے کی سرگرمی — میرا دماغ پراگندہ ہو رہا تھا اور باوجود کتاب کا دلچسپ ترین حصہ ہونے کے بھی توجہ بار بار کتاب سے ہٹ جاتی تھی۔ اور ارادہ کر رہا تھا کہ اندر جا بیٹھوں عنقریب میں اُٹھنے ہی والا تھا ایک نوجوان مزدور میرے پاس بھاگا ہوا آیا۔ اور ذرا آزادی سے میری جانب متوجہ ہوا۔ میرے خدمت گار لڑکے نے جو میرے چلم کی

آگ درست کر رہا تھا، تیوری پر بل ڈال کر کہا کہ کیا ہے جی کاشتکار پھر میری جانب متوجہ ہوا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا "گہا — گہا — گہا —"

"ابے کیا ہے" میں نے ذرا خشک اور کڑے تیوروں سے کہا۔

"سا — سا — سا — سرکار گھڑا — جا — جا جگو کے مکان میں گڑا" اس نے کہا۔

میں نے حقہ کی مُنال منہ سے علیحدہ کر کے کہا "ابے کیا بکتا ہے سیدھے بات کر"

"میاں جگو کی کوٹھیا تلے روپے کا گھڑا گڑا ہے اس کو موڑھو (منہ) دکھائی دے رہے ہے"۔ کاشتکار نے بمشکل اپنے اعصاب اور زبان پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

میں بجلی کی تیزی سے کرسی پر کتاب پٹک کر چلا اور اونچے نیچے چھوٹے بڑے ڈھیلوں پر ہوتا ہوا پہنچا تو دیکھا کہ عین کوٹھیا کے نیچے زمین کے اندر ایک گھڑے کا منہ دکھائی دے رہا ہے اور غور کرنے سے کچھ خاک آلودہ گول سکے بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ میں نے نکالنے کا اشارہ کیا۔ دوسرے کاشتکار دور سے کام کرتے ہوئے دیکھتے تو رہے مگر کسی کی ہمت قریب آنا تو درکنار استفسار کرنے کی بھی نہ ہوئی۔ دو منٹ کی کوشش کے بعد گھڑا باہر نکال لیا گیا اور کاشتکار بغیر میرے حکم کے میرا مطلب پا گیا اور لے کر چلنے لگا — میں گھڑے کو لے کر اپنے پرائیویٹ کمرے میں چلا گیا۔ اور دو معتبر ملازمین کو جن میں ایک میرا خانساماں تھا آنے کا اشارہ کیا کاشتکار گھڑا رکھ کر اور سلام کر کے باہر چلا گیا میں نے غور کیا کہ گھڑا نہایت پختہ ہے۔ اور تیز آنچ میں پکنے کی وجہ سے جگہ جگہ سے خم سا کھا گیا ہے اور اس کے منہ پر خام مٹی کچھ اس طرح سے لگائی گئی ہے کہ اس کی شکل اولٹوال دوات کی سی ہو گئی ہے جس کے اندر ہاتھ ڈال کر کوئی چیز باہر نہیں نکالی جا سکتی محض اندر ڈالی جا سکتی ہے مگر تیز متلون مزاج خانساماں نے اپنا ہاتھ زبردستی اندر ڈال ہی دیا جو بمشکل کلائی تک گیا اس کے بعد ہاتھ نکالنے کی کوشش کی تو بندر اور مٹھائی والا قصہ ہو گیا۔ دوسرے ملازم نے ڈنڈے سے اس کے ہاتھ اور گھڑے کی دولت دونوں کو آزاد کر دیا۔ اور میرے سونے کے کمرے میں چھوٹے بڑے سکوں کا ڈھیر لگ گیا جس میں گرد مٹی اور چھوٹے بڑے سینکڑوں حشرات الارض بھی تھے ملکہ کے سکوں سے لے کر جارج ششم کے سکوں تک جن کو رائج ہوئے ابھی پورا مہینہ بھی نہ ہوا تھا سبھی موجود تھے جن میں زیادہ تر تانبے کے پیسے دوّنیاں چونیاں اٹھنیاں اور چند روپے بھی تھے میں نے ذرا جھلا کر کہا لے جاؤ باہر سنبھالو انہیں — مفت میں میرا قالین میلا ہو گیا — اونی قالین ہے — دھلنے کا بھی نہیں دیکھو تو مٹی کتنی ہے اور ہزاروں کیڑے توبہ توبہ

نوکروں نے جلدی جلدی جگو کی عمر بھر کی کمائی اپنی ایک چادر میں معہ مٹی اور کیڑوں کے بھر لی اور باہر صحن میں لے گئے اور قریب پندرہ منٹ میں صاف کر کے ایک ایک روپے کی بلٹیاں لگانی شروع کیں اور قریب بیس پچیس منٹ بعد جب دو تین مرتبہ ایک دو سے چل کر چھہتر پر جا کر رک گئے تو مجھے یقین ہو گیا کہ چھہتر روپے نکلے۔ دوسرے دن ایک سیمنٹ کی خالی بوری میں بھر کر اور موٹر میں رکھ کر اسی صورت سے جگو کی عمر بھر کی کمائی کو لے کر کلب پہنچا اور جا کر کل قصہ من و عن سُنا ڈالا میرے دوست وکیل سرکار بے اختیار ہو کر بولے "افسوس مسلمان بھی ہوئے تو دُھنئے کے گھر" دفینہ بھی ملا تو بھورجی کے گھر کا اور خوب قہقہے اڑے ہر ایک نے مختلف تجویزیں پیش کیں جن میں حاکم پرگنہ صاحب کی تجویز نہایت دلچسپ تھی انہوں نے فرمایا کہ "اگر تم کچہری میں بیٹھ کر اس ریزگاری کو ایک پیسہ کم پر بھناؤ تو ابھی ستتر پیسے کی آمدنی اور ہو سکتی ہے ایک قہقہہ پڑا اور کلب کے سکرٹری صاحب نے کلب کے منشی کو بلا کر ریزگاری ان کے حوالے کر دی کیونکہ دوسرے ہی دن کلب میں ہماری جانب سے جج صاحب کی رخصتی پارٹی تھی۔ اور اس میں چھ بوتل وسکی کی آنا ضروری تھیں جن کے دام دینے میں ہم پس و پیش کر رہے تھے اور ہمارے بادہ خوار یاران طریقت اصرار ——

محمد ابوالفضل صدیقی

غزل

دعا یہ کر کہ غمِ عشق کا وقار رہے
خزاں ہے یہ تو عناں گیرِ صد بہار رہے

غرورِ عشق سے زندہ ہوں میں کہ لازم تھا
کسی کے دورِ جوانی کی یادگار رہے

جدا جدا ہے غمِ حُسن و عشق کی تقدیر
بجا نہیں کہ نگاہوں کا اعتبار رہے

کہاں تک آہ خدائی کرے کسی پہ کوئی
کہاں تک آہ کسی دل پہ اختیار رہے

وفورِ شوق کی تسکیں تو کیا یہی کم ہے
ہمارا عہدِ تمنا ہی استوار رہے

مثالِ ابر سہی تیرے سوزِ حُسن کی موج
یہ ابر اب بھی رواں ہے تو برق بار رہے

یہ دردِ کب ترے سینے میں تھا جہانِ خراب
بجا کہ تیری طرح ہم بھی بے قرار رہے

رہے بھی اور نہ رہے محفلِ حیات میں ہم
یہ کیا کہ خاطرِ اہلِ نظر پہ بار رہے

فضائے گلشنِ ایجاد تنگ تھی ہم بھی
بعزمِ بحر چلے منزل جو سبار رہے

عجب نہیں کہ کریں ہم بھی اک جہاں تعمیر
ابھی یہی روشِ دورِ روزگار رہے

وہ ایک تائب گمراہ بزم میں آیا
تمام عالمِ مے خانہ ہوشیار رہے

مراتب علی تائب

اشک صُبحگاہی

تم اشک سمجھ رہے ہو جس کو — شبنم ہے یہ لالۂ جگر کی
پروردۂ بے کرانِ اُلفت — بے نقص ہے آب اس گہر کی
دل کی ہے یہی فغانِ خاموش — تشویش نہیں ہے جسے اثر کی
شہبازِ فضائے لامکانی — حاجت نہیں جس کو بال و پر کی
جبریل سے اس کی پوچھئے قدر — یہ روحِ رواں ہے چشمِ تر کی
سرسبز نہالِ عشق اسی سے — نم ہے تو نمو بھی ہے شجر کی
ہے فکرِ عمیق کی یہ توثیق — تصدیق ہے رفعتِ نظر کی
محروم سرشک ہیں فرشتے — توقیر اسی سے ہے بشر کی
یہ آبِ حیاتِ جاوداں ہے — رمز آئی سمجھ میں اب خضر کی

اشکے کہ ز چشمِ ما چکیداست
در پردہ نویدِ عیدِ دیداست

امینِ حزیں
(سیالکوٹ)

کیا اقبال فرقہ پرست شاعر ہے؟

(ایڈیٹر کا مضمون نگار کی سیاسی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں)

اقبال نے سیاسی شاعری کی جو راہ نکالی تھی اگر اسی پر گامزن رہتے ہوئے آگے چلنے کی کوشش کرتا تو آج ہندوستان والے اُسے اِس ملک کا سب سے بڑا سیاسی اور انقلابی شاعر ماننے میں پس و پیش کرنے کے بجائے اُس پر فخر کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ "ترانۂ ہندی" اور "ہندوستانی بچوں کے ترانے" لکھنے کے بعد اس کی دُور رس نظروں نے حتماً اس کا احساس کر لیا ہوگا کہ شہرت کے معراج تک پہنچنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن کیا اقبال جیسے مخلص اور ایماندار انسان کے لئے ممکن ہو سکتا تھا کہ حالات و واقعات کی جانب سے آنکھیں بند کر لے اور قوتِ ممیزہ کو تج کر محض شہرت پسندی کے جنون میں اپنا صحیح راستہ چھوڑ دے اور دیدہ دانستہ غلط راہ اختیار کرے۔

اقبال کے اکثر ناقدین اُس پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ یورپ سے واپس ہونے کے بعد اقبال فرقہ پرست شاعر بن گیا۔ اس چیز کا اتنی شدت کے ساتھ پروپیگنڈا کیا گیا کہ حقیقت میں اقبال کو جو جگہ آج بہ حیثیت قومی شاعر کے ملنا چاہئے تھی نہ مل سکی۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم اقبال کو اس جرمِ قبیح کا مجرم ٹھہرائیں۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ اس الزام کی حقیقت کیا ہے اور وہ کہاں تک درست ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یورپ پہنچ کر جب اس نے جذبۂ وطنیت کو مختلف رنگوں میں گلکاریاں کرتے ہوئے دیکھا تو اُسے مغربی تخیلِ وطنیت سے نفرت سی ہو گئی۔ یہ بتلانے کی بات نہیں کہ یورپ والوں نے وطنیت کی آڑ لے کر کیا کیا شدائد اور مظالم روا رکھے۔ یورپ کے اُس دور کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے جس نے اقبال کو مغربی تخیلِ وطنیت سے متنفر کر دیا، اُن تمام حالات سے واقف ہیں جو اس دور میں وہاں پیش آئے۔ یہی وطنیت کا وہ غلط اور جارحانہ تصور تھا جو یورپ میں ایک طرف اُس کے بیمار ٹرکی کو ہڑپ کر جانے کی فکر میں تھا (چنانچہ اسی بہانے سے ٹرکی اور بلقان کی جنگوں کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا) اور دوسری جانب روس و برطانیہ کی ریشہ دوانیوں سے ایران بھی خطرے میں نظر آتا تھا غالباً یہی وہ تاثرات تھے جنہوں نے اقبال سے یہ اشعار کہلوائے۔

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ ‍ رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
فردِ آبائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر ‍ اپنی آزادی بھی دیکھ انکی گرفتاری بھی دیکھ
ہاں تملق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو ‍ اور جو بے آبرو تھے ان کی خودداری بھی دیکھ
سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سُن ‍ اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ

ذیل کی نظم سے اور بھی واضح ہو جائے گا کہ وطنیت کے تخیل کو اقبال کہاں تک غلط اور نقصان دہ سمجھتا تھا۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ‍ ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور ‍ تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے ‍ غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے ‍ اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی ‍ رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی ‍ دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

سنا کرتے تھے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" لیکن اقبال نے یہ نظم لکھ کر اس مشہور مقولے کو ثابت کر دیا ہے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال پہاڑ کی ایک بلند چوٹی پر بیٹھ کر بر سوں بعد آنے والے واقعات کو اسباب و علل کی روشنی میں دیکھ رہا تھا۔ گزشتہ تین چار سال کے اندر یورپ میں جو واقعات پیش آئے کیا ان کی پیشین گوئی مذکورہ بالا شعر نہیں کر رہا؟ کیا سوڈیٹن لینڈ لے لینے میں جیکوسلاویکیا کے ہڑپ کر جانے میں اور پولینڈ کے حصے بخرے کر لینے کے لئے جو عذرات نہیں پیش کئے گئے تھے اور کیا دنیا والے اس کی امید کرتے ہیں کہ وطنیت کے اس تخیل کے باعث جو آج تک کارفرما ہے۔ دنیا میں اس سے زیادہ تباہ کاریاں اور سیاہ کاریاں نہ ظاہر ہوں گی۔ یہ جنگ محض یورپ اور افریقہ تک محدود رہتی ہوئی نظر نہیں آتی بلکہ حالات یہ بتا رہے ہیں کہ اس آگ کے شعلے بہت جلد اس ملک کو بھی اپنے حلقہ میں لے لینے والے ہیں جو ابھی تک پُرامن زندگی بسر کر رہے ہیں

جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے اور حالات اپنی تمام آب و تاب کے ساتھ بے نقاب ہو کر ہمارے سامنے آ رہے ہیں ویسے ویسے اقبال کی پیغمبرانہ وقعت ہماری نظروں میں اور بھی بڑھتی جاتی ہے۔ جس وقت ہندوستان کی قومی تحریک شروع کی گئی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سے عمدہ، صحیح اور معصوم تحریک آزادی وطن کے لئے ہو ہی نہیں سکتی لیکن رفتار زمانہ اور اقبال نے اس کا سارا بھید فاش کر دیا۔ ہندوستان کا بدبخت ترین انسان بھی یہ نہ چاہے گا کہ اُس کا ملک بیرونی اثرات سے چھٹکارا نہ پائے۔ اور دوسری آزاد قوموں کے دوش بدوش نظر نہ آئے۔ سطحی طور پر یہی وہ چیز تھی جسے لے کر قومی تحریک کے کرتا دھرتا اُٹھے تھے۔ لیکن اقبال جیسے دوربین اور نکتہ رس کی نظریں مسائل کی ان گہرائیوں تک پہنچ ہی گئیں جن کے سمجھے بغیر مسلمانوں کی باوقعت اور با اثر اقلیت کو کافی نقصان پہنچتا۔ ہندوستانی انگریزوں سے اس لئے لڑ رہے تھے یا لڑنے کی تیاری میں تھے کہ آزاد ہو کر مغربی اصول جمہوریت کو سامنے رکھتے ہوئے ہندوستان پر حکومت کریں۔ لیکن کیا مغربی اصول جمہوریت ہندوستان کے ہر طبقہ کے لئے ہر وقت اور ہر حالت میں قابل عمل ہو سکتے ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب حقیقتوں کا سامنا کرتے ہوئے اثبات میں نہیں دیا جا سکتا وہ لوگ جو مغربی نظام حکومت پر آزاد ہندوستان کو چلانا چاہتے ہیں اُن سے جب اس کے ناقابل عمل ہونے کی بحث چھیڑی جاتی ہے تو اُن کی جانب سے یہ جواب ملتا ہے کہ اقلیت اور اکثریت کا سوال یہاں پر اس لئے نہیں اُٹھتا کہ ہمارے سامنے یورپ کی مثالیں موجود ہیں جہاں باوجودیکہ اقلیتیں بھی ہیں اور اکثریتیں بھی تاہم صدیوں سے یہ چیز وہاں آسانی کے ساتھ چل رہی ہے۔ مگر شاید یہ امر نظر انداز کیا جاتا ہے کہ انگلینڈ یا جہاں بھی یہ مغربی جمہوری نظام چل رہا ہے وہاں سیاسی اقلیتیں تو ضرور ہیں لیکن مذہبی اقلیت معدوم ہے اور اس کا کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا لیکن بدقسمتی سے ہندوستان ایسا ملک نہیں جہاں اس سوال کو نظر انداز کر کے کوئی سیاسی تحریک قومی بنائی جا سکے اس لئے کہ یہاں مذہبی اقلیتیں بھی موجود ہیں جن کی وجہ سے مسائل حد درجہ پیچیدہ بن گئے ہیں اور کوئی ایسا دستور العمل نہیں چل سکتا جس میں محض اکثریت کی رائے پر ہر کام ہوتا ہو۔

کانگریس نے برطانیہ کے سامنے ہندوستان کے جو مطالبات رکھے تھے وہ مختصراً یہ تھے کہ ہندوستانیوں کو اس کا اختیار دے دیا جائے کہ اُن کی اکثریت جس نظام پر ہندوستان کو چلانا چاہے اُس میں مداخلت نہ کی جائے یہ چیز بھی کوئی نئی نہ تھی صرف الفاظ بدلے ہوئے تھے اور وہی پرانی باتیں کچھ زیادہ خوبصورت اور معصوم انداز میں پیش کی گئی تھیں۔ شطرنج کی بساط پر طرفین سے مہرے پھینکے جا رہے ہیں اور

اقلیتیں غانے پر تلنے محض اس غرض سے بدل رہی ہیں تاکہ اس تگ و دو میں انہیں مات نہ ہونے پائے۔

آپ لوگ "دیوانہ راہوئے بس است" کے مصداق یہ خیال کرتے ہوں گے کہ خدا جانے کہاں سے کہاں بہکا ہوا چلا جا رہا ہوں۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس چیز کو مان لینے کے بعد کہ وطنیت کا مغربی تخیل غلط اور انتہائی غلط ہے اور یہ بھی مان لینے کے بعد کہ اس وطنیت اور جمہوریت کے اصولوں پر ہندوستانی قومی حکومت کی بنیادیں رکھی جانے والی تھیں۔ اب یہ بالکل واضح ہو گیا کہ اقبال نے اگر اس چیز کی مخالفت کی تو وہ ایسا کرنے میں قطعی حق بجانب تھے اس لئے کہ یہ امر اُن کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھا کہ ہندوستانی قومی حکومت کی پہلی اور خیالی لیکن خطرناک اینٹ ٹیڑھی رکھی جا رہی ہے۔ اس لئے اندیشہ ہوا کہ اگر اس بنیاد پر یہ عمارت کھڑی کی گئی تو ثریا تک اس کی کجی جائے گی۔ اور ممکن ہے کہ منہدم بھی ہو جائے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں اقبال یورپ سے واپس ہونے کے بعد محض اس خطا پر فرقہ پرست شاعر بنا دیا گیا کہ اُس نے چند تلخ حقیقتوں کا اظہار کرنا شروع کر دیا اور ہندوستان کے بسنے والے مسلمانوں کو ان کے آئندہ سیاسی خطرات سے آگاہ کرتے رہنے کا بیڑا اٹھا لیا اگر بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھانا۔ انجان کو آگاہ کرنا اپنے ہاتھوں اپنا گلا کاٹنے والوں کو اُن کے اقدام کی حماقتوں سے آگاہ کرنا اور اپنوں کو دوسروں سے اس لئے علیحدہ کرنا کہ دوسرے انہیں اپنا نہیں سمجھتے بلکہ محض مقصد برآری کے لئے آلۂ کار بنا رہے ہیں کسی کو فرقہ وارانہ خیال کا انسان بنا سکتا ہے تو اقبال نہایت فخر کے ساتھ اس لقب کو لینے کے لئے تیار ہے لیکن اگر اس کی نیت صادق اور دل خلوص سے پُر ہو اُس کے اندر خود غرضی کا جذبہ کام نہیں کر رہا تو باوجود ان الزامات کے اقبال اس طرح تابندہ اور درخشاں رہے گا جیسے چاند گرد و غبار سے پاک ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ان کے خطرات سے متنبہ کرنے میں اقبال کی نیت ہرگز یہ نہ تھی کہ وہ ملک کی آزادی کی تحریک میں روڑے اٹکائیں۔ آپ لوگ یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میرا یہ دعوےٰ بلا دلیل ہے اور ابھی تک میں نے اقبال کے کلام سے کوئی مثال پیش نہیں کی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں نے اقبال کا غائر مطالعہ کیا ہے۔ ان کے لئے میرے دعوے کی صداقت اظہر من الشمس ہے۔ پھر بھی اُن کے کلام سے کچھ ایسی چیزیں پیش کر رہا ہوں جو ممکن ہے گمراہ اور تاریک دلوں کے لئے مشعلِ ہدایت بن سکیں۔ یہ خیال رہے کہ جو کلام پیش ہو رہا ہے۔ وہ اقبال کے اُس دورِ شاعری سے متعلق ہے جو یورپ کی سیر و سیاحت سے واپس ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یہ وہی دور ہے جس میں اقبال کو فرقہ پرست شاعر کا قابلِ فخر لقب عنایت ہوا ہے ملاحظہ ہو۔

مناصب

ہوا ہے بندۂ مومن فسونیِ افرنگ
اسی سبب سے قلندر کی آنکھ ہے نمناک
ترے بلند مناصب کی خیر ہو یارب
کہ ان کے واسطے تو نے کیا خودی کو ہلاک
مگر یہ بات چھپائے سے چھپ نہیں سکتی
سمجھ گئی ہے اسے ہر طبیعتِ چالاک
شریکِ حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے
خریدتے ہیں فقط ان کا جوہرِ ادراک

خواجگی

دورِ حاضر ہے حقیقت میں وہی عہدِ قدیم
اہلِ سجادہ ہیں یا اہلِ سیاست ہیں امام
اس میں پیری کی کرامت ہے نہ میری کا ہجوم
سینکڑوں صدیوں سے خوگر ہیں غلامی کے عوام
خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی
پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام

جمعیتِ اقوامِ مشرق

پانی بھی مسخر ہے ہوا بھی ہے مسخر
کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے
دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اُس خواب کی تعبیر بدل جائے
طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

سلطانیِ جاوید

غواص تو فطرت نے بنایا ہے مجھے بھی
لیکن مجھے اعماقِ سیاست سے ہے پرہیز
فطرت کو گوارا نہیں سلطانیِ جاوید
ہر چند کہ یہ شعبدہ بازی ہے دل آویز
فرہاد کی خارا شکنی باقی ہے اب تک
باقی نہیں دنیا میں ملوکیتِ پرویز

یورپ اور سوریا

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا نبیٔ عفت و غمخواری و کم آزاری
صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لئے مے و قمار و ہجوم زنانِ بازاری

اصلاحات

یہ حُسن بے جہری صبا دکا پردہ آئی نہ مرے کام مری تازہ صفیری
رکھنے لگا مرجھائے ہوئے پھول قفس میں شاید کہ اسیروں کو گوارہ ہو اسیری

لیگ آف نیشنز

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے و لیکن پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرک افرنگ ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

فرمانِ خدا

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا حق سے جب حضرتِ ملّا کو ملا حکم بہشت
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت
ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

وہ شخص جو افرنگیوں کی سرشت سے اس درجہ واقف ہو گیا ہو اور بے خوف تردید و بغیر بیم تادیب پکار پکار کر کہہ رہا ہو کہ افرنگیوں نے اصلاحات اور اختیارات کا جو جال بچھا رکھا ہے۔ اُس سے اُن کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ ہندوستانیوں کو حقیقی معنوں میں اختیارات دے دیں گے بلکہ یہ اُن کا دھوکا ہے جسے ہر "طبیعت چالاک" نے سمجھ لیا ہے اُن کا یہ فعل محض "قوتِ ادراک خریدنے کے لئے" ہے اور اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا خواجگی کی چالیں سمجھنے والا "فرہاد کی خارا شکنی" کو "ملوکیت پرویز" پر ترجیح دینے والا "صلہ فرنگ" کو "مے و قمار و ہجوم زنان بازاری" بتانے والا اصلاحات کو مرجھائے ہوئے پھول اور اُن کے وجود کو ذوقِ اسیری میں اضافہ کرنے والا "ملّا" کو بدآموز اقوام و ملل گردانے والا اور خدا کے سامنے "ملّا" کے بہشت میں بھیجے جانے پر احتجاج کرنے والا "کنجشک فرومایہ" کو شاہین سے لڑانے کی ترغیب دینے کے بعد "سلطانی جمہور" کی پیشینگوئی کر کے "ہر نقش کہن" مٹا دینے کی تلقین کرتے ہوئے جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی۔ اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو کا حکم دینے والا اور خود خدا کے منہ سے "حق را بسجودے صنماں را بطوافے" کہلا دینے والا کسی وقت اور کسی صورت میں بھی فرقہ پرست شاعر کہا جا سکتا ہے؟ کیا ان اشعار کے پڑھنے کے بعد ہم یہ نہیں محسوس کرتے کہ اقبال کے دل میں بھی ہندوستان کے قابلِ افسوس حالات پر ہوک اٹھتی ہے۔ وہ بھی اس ملک کو بیرونی اثرات کے تحت میں دیکھنا نہیں چاہتا۔ اُسے بھی گوارا نہیں کہ ہندوستانی غلامی کی زندگی بسر کریں۔ وہ صاف صاف اور پکار پکار کر سرمایہ دارانہ دور کو غداری اور سرمایہ داری کو اس کا تماشا بتاتا ہے مجلس بین الاقوام کو داشتۂ پیرک افرنگ ٹھہراتا ہے جس کی بقا اگرچہ معلوم ہے پھر بھی ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز زندہ رہنے کا امکان پاتا ہے۔ کیا آج ہندوستان کے وہ نام نہاد لیڈر جن کے ہاتھوں میں تحریک آزادی کی باگ ہے۔ اس سے زیادہ انگریزوں کے متعلق کہہ سکتے ہیں۔ اور اس سے زیادہ ہندوستانیوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کر سکتے ہیں۔

ممکن ہے اقبال سے حسنِ ظن رکھنے والے ان مثالوں پر قناعت نہ فرمائیں اور اُن کے قلوب مطمئن نہ ہوں اس لئے اقبال کی ایک ایسی نظم پیش کرتا ہوں جس کے بعد کسی تاویل کی گنجائش باقی نہیں رہ جائے گی یہ نظم بھی ضرب کلیم میں ہے اور اُسی زمانے میں لکھی گئی

ہے جبکہ اقبال فرقہ پرست شاعر بنائے جا چکے تھے۔

اک شوخ کرن شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب

بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خاک سے مردانِ گراں خواب

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

چشمِ مہ و پروین ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لئے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب

بتخانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

کیا "وطن کی عظمت، وطن کے مسائل سے دلچسپی وطن کے حالِ زار پر افسوس اس سے بہتر طریقہ پر ادا ہو سکتا ہے"۔ اس نظم کے آخری دو مصرعے بتاتے ہیں کہ اقبال کس حد تک انصاف پسند تھا صرف یہ امر کہ فلاں شخص ہندو ہے۔ اس لئے اس کی تمام چیزیں بُری اور فلاں مسلمان ہے اس لئے ہمہ تن اوصاف اقبال کے یہاں لائقِ ستائش نہیں اُسے برہمن کے اندر بھی کچھ کام کی باتیں ملتی ہیں اگر وہ سونا نہ ہے۔ اور مسلمان بھی بہت کچھ کر سکتا ہے اگر قوتِ عمل سے کام لے اور تقدیر کو نہ روئے۔ اقبال کو دونوں سے امیدیں ہیں وہ ایک کا وجود دوسرے کی ضد نہیں سمجھتا۔ میں نے اقبال کے خریطۂ جواہر سے بقدر اپنے ظرف کے ہیرے چننے کی کوشش کی ہے اور امید کرتا ہوں کہ ان کی شعاعیں میری اور دوسروں کی بصیرت افروزی کا باعث ہوں گی۔ اگر اس کے بعد بھی ہم اور آپ ان سے کسبِ ضیا نہ کر سکیں اور یہ برکتیں دوسروں کی قسمت میں ہوں تو مجبوری ہے۔

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشہ کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

نجم الدین نقوی

غزل

ہے پاس ہیں نمایاں امید کی جھلک بھی
تاریکیوں میں یعنی ہے نُور کی ڈلک بھی

وہ غنچۂ جوانی ہے ناشگفتہ یعنی
شامل ہے شوخیوں میں کچھ شرم کچھ جھجک بھی

کیا خون کچھ جگر میں پھر ہو گیا فراہم؟
ہے آج آنسوؤں میں سرخی کی اک جھلک بھی

کچھ سوزشِ جگر بھی، ہاں اے غمِ تمنا!
کچھ ٹیس بھی، تڑپ بھی، کچھ درد کی چمک بھی

وہ عہدِ نوجوانی یاد آ رہا ہے مطرب!
اک نغمۂ جواں تھی جب نبض کی دھمک بھی

پھرتا تھا وحشیوں کی مانند مارا مارا
بھولا نہیں ہوں اختر وہ دن ہیں آج تک بھی

اختر انصاری

غزل

سہنا ہے غم اگر تو غمِ زندگی سہی مرنے کو کیا ہے، موت نہیں خودکشی سہی
اے خود فریب! تیری طرف دیکھتا ہوں میں تیرے لئے بہارِ چمن دیدنی سہی
اس اعتبارِ وعدۂ فردا کو کیا کروں آنکھوں کا نُور، دل کی خلش دائمی سہی
میں جا رہا ہوں دیدۂ حیراں لئے ہوئے تیری اگر یہی ہے تمنّا، یہی سہی
اچھے ہو تم! کہ تم نے توجہ نہ کی کبھی ہاں میں بُرا سہی، مری قسمت بُری سہی
فرقت کی رات سجدے میں سر ہے خدا گواہ! دونوں جہاں میں آج خدا کی کمی سہی
ہر سانس ایک رقصِ مسلسل ہے موت کا قربانِ عشق! میری یہی زندگی سہی
یہ چاندنی، یہ سیلِ حوادث، یہ اُن کی یاد مٹنے لگی ہے جینے کی حسرت رہی سہی

تیری شبِ الم کا فسانہ طویل ہے
اب ہو چکی ہے رات ظفرؔ پھر کبھی سہی

یوسف ظفرؔ

بزم فانی

(احسن لکھنوی)

نواب واجد علی شاہ جب نظر بند کر کے کلکتہ بھیج دیئے گئے تو اردو ڈراما کی سرپرستی بمبئی کے پارسیوں نے اختیار کی اندر سبھا لکھنؤ سے نکل کر بمبئی میں جمنی شروع ہوئی۔ پہلے وہاں کے نوجوان محض شوق کے طور پر اس کا تماشہ کرتے رہے۔ لوگوں نے اس تفریح میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار شروع کر دیا تو ناٹک کی باقاعدہ کمپنیاں بن گئیں۔

ان کمپنیوں نے اپنے لئے بہت سے ناٹک لکھوائے اس زمانے میں طلسم کشا شہزادوں اور جنوں پریوں کی محیر العقول داستانوں کا چرچا بہت زیادہ تھا۔ یہی کثرت سے چھپتی اور فروخت ہوتی تھیں۔ ان کی مقبولیت کی وجہ سے ناٹک کمپنیوں کے مالکو نے بھی ان ہی کی طرف توجہ کی۔ ناٹکوں میں شعرا اس غرض سے رکھے جانے لگے کہ ان داستانوں کو راگ ناٹک کی شکل میں ڈھال دیں اندر سبھا کا نمونہ موجود تھا ہی شعرا نے اسے سامنے رکھ کر تقریباً سب مشہور داستانوں کے راگ ناٹک تیار کر ڈالے۔

ابتدائی ڈرامہ نویسوں میں سے حافظ عبداللہ۔ رونق بنارسی اور مرزا نظیر بیگ نے کثرت سے ڈرامے لکھے۔ ان میں سے بعض ڈرامے عرصہ تک بہت کامیابی سے ناٹک کمپنیوں میں ہوتے رہے ہیں لیکن ان ڈراما نویسوں نے اپنے ڈراموں میں کوئی ایسی نئی بات پیدا نہ کی جو اندر سبھا سے جدا اور نمایاں نظر آئے۔ ان کی کہانیاں داستانوں سے ماخوذ ہیں۔ ان میں واقعات انوکھے ضرور ہیں۔ لیکن نوعیت میں ایسے نہیں جو ڈراما کی صورت اختیار کر کے سٹیج پر زیادہ لطف دے سکیں۔ ڈرامے کی جان کشمکش ہے خواہ اس کشمکش کا تعلق خارجی حالات سے ہو یا جذبات سے۔ ان ڈراموں کی کشمکش غیر مسلسل۔ کمزور اور بے اثر ہے۔ کیرکٹروں کا یہ حال کہ انکی کوئی ایک خصوصیت بہت مبالغہ سے پیش کر دی جاتی۔ کوئی شہزادہ عاشق دکھایا گیا تو بس اتنا ہی کہنا ضروری سمجھا گیا کہ وہ بے مثال شہزادہ اور لاجواب عاشق ہے۔ وہ کیوں عاشق ہوا؟ اور اس کا عشق کس طرح کا ہے؟ ان باتوں کو اعتنا کے قابل قرار نہ دیا جاتا تھا۔ ان ڈراموں کا انداز تحریر تقریباً وہی ہے جو اندر سبھا کا ہے۔ اندر سبھا سے بڑھ کر کوئی بات ہے تو یہ کہ تجربے نے سٹیج کی ضرورت کی فہم کسی قدر بڑھا دی ہے۔ اور بمقابلہ اندر سبھا کے اشعار اور مقفی عبارت کا استعمال کسی قدر زیادہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی امانت کی شستہ نظم و نثر کے مقابلے میں ان ڈرامہ نویسوں کی نظم و نثر ناقص اور پھیکی بھی ہے۔

لیکن ان ڈراموں کو فی الحقیقت جانچنا اس خیال سے چاہئے کہ ان کی موسیقی کیسی ہے کیونکہ یہ سب ڈرامے راگ ناٹک ہیں۔ اور اس نوع کے ڈراموں میں جو نمایاں خوبی ہوتی ہے۔ وہ موسیقی کی ہوتی ہے لیکن افسوس کہ یہ اب کسی طرح ممکن نہیں۔ دیسی موسیقی کو محفوظ کر لینے کے اول تو کوئی قابل قدر اشارات نہیں اور جتنے ہیں ان سے فائدہ اٹھانے کا کچھ خیال نہیں کیا جاتا۔ ان ڈراموں کے ایکٹر ختم ہو چکے۔ ان کے راگوں اور طرزوں سے اب کسی کو بھی واقفیت نہیں رہی۔ محض گیتوں کے الفاظ دیکھ کر کون اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان کی طرزیں کیا تھیں؟

ان داستانی انداز کے ڈراموں کی یکساں روش سے پہلا نمایاں اختلاف مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی کے ڈراموں میں نظر آتا ہے آپ لکھنؤ کے مشہور شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ شعر کے ذوق کے ساتھ آپ کی طبیعت کو ناٹک سے بھی مناسبت تھی۔ پھر اردو کی بہت سی نامی کمپنیوں سے آپ کا تعلق بھی رہا جس نے یقیناً

آپ کے تجربے میں بے حد اضافہ کیا۔ احسن صاحب نے بہت سے ڈرامے لکھے۔ جن میں سے بعض انگریزی ڈراموں سے ماخوذ ہیں۔ اور بعض طبعزاد ہیں۔ آپ کا آخری ڈرامہ چلتا پرزہ ابھی چند سال کی بات ہے کہ نیو الفریڈ تھیسٹریکل کمپنی آف بمبئی کے سٹیج پر اکثر شہروں میں بے حد مقبول ہو چکا ہے۔

چونکہ اس مضمون کا موضوع احسن صاحب نہیں بلکہ اردو ڈرامے کا ارتقا ہے۔ اس لئے ان کے آخری کامیاب ڈراموں سے کسی کو چننے کی بجائے میں نے ان کے ایک ابتدائی کامیاب ڈرامے "بزمِ فانی" کو منتخب کیا ہے۔ میرے خیال میں اپنے وقت پر بزمِ فانی کی نمائش نے ڈراما کی ترقی پر بہت زیادہ اثر ڈالا تھا۔

اردو کمپنیاں قایم ہونے کے بعد جب ڈراموں کی مانگ بڑھنی شروع ہوئی اور پریوں اور شہزادوں کی داستانوں کے خاص نمونے ختم ہو گئے۔ اور انوکھے پن کا طلسم ٹوٹ چکنے کے بعد تماشائیوں کو ان سے اکتاہٹ پیدا ہونے لگی تو کمپنیوں کے مالکوں اور ڈراما نویسوں کو نئی چیزوں کی تلاش ہوئی۔ انگریزی سے تعلق قائم ہوتے ہی ہندوستان شیکسپیر کے ڈراموں سے متاثر ہو چکا تھا۔ شکسپیر کے زندہ جاوید ڈراموں کی شہرت اور خوبیوں نے ناٹک والوں کو بہت جلد اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور ان ڈراموں کو سٹیج پر لانے کی کوششیں ہونے لگیں۔

صحیح معنوں میں شکسپیر کا کوئی ڈراما اب تک اردو سٹیج پر نہیں آسکا جو ادیب اور شاعر تھیٹروں سے وابستہ رہے۔ وہ انگریزی پر اتنا عبور نہ رکھتے تھے کہ شکسپیر کا کوئی قابل قدر ترجمہ اردو میں کر سکتے جو لوگ ترجمہ کر سکتے تھے۔ وہ ترجمہ میں ہندوستانی تماشائیوں کے ذوق کے مطابق یا تو ترمیم نہیں کر سکتے تھے اور یا ترمیم کرنا نہ جانتے تھے۔ چنانچہ اب تک شکسپیر کے جتنے ڈرامے اردو سٹیج پر آئے ہیں۔ ان کی صورت یہ ہے کہ لکھنے والے نے ڈرامے کی کہانی سن لی۔ اسے ایک ذہنی مشرقی معاشرت میں ڈھالا — ہندوستانی اسٹیج پر منظر بدلنے کی جتنی سہولت میسر ہے اس کو مد نظر رکھ کر نئے سرے سے مناظر قائم کئے۔ صرف پلاٹ سے کیرکٹر کی سیرت کا اندازہ خود کیا۔ اس کی بہت سی موٹی موٹی باتیں اخذ کرلیں

کسی جگہ انگریزی مکالمے کا کوئی بولتا ہوا حصہ لے لیا اور یوں ایک نیا ڈراما لکھ دیا۔ اس انداز سے شکسپیر کے جو ڈرامے اردو میں آکر کامیاب ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک "رومیو جولیٹ" یعنی منشی احسن کا "بزمِ فانی" ہے۔ الفریڈ کمپنی میں گوہر اور رکھشا، گلنار اور فیروز کا پارٹ اس خوبی سے ادا کر چکے ہیں کہ تماشائیوں کے دل سے اب تک بزمِ فانی کی یاد محو نہیں ہو سکی۔

بزمِ فانی کا مقابلہ شکسپیر کے سہانے "رومیو جولیٹ" سے کیجئے تو کچھ بھی نہ پایئے گا۔ البتہ جس زمانے میں یہ لکھا گیا۔ اس زمانے کے اردو ڈراموں میں رکھ کر دیکھئے تو نمایاں طور پر دلکش اور موثر کھیل ہے اور ان کامیاب ڈراموں میں سے ہے۔ جنہوں نے داستانی راگ ناٹکوں کو ختم کر کے اردو کو ڈرامے کے صحیح ذوق سے آشنا کیا۔ ان کے مقابلے میں اس کا پلاٹ بے حد رنگین اور بارونق ہے۔ نامساعد حالات کے مقابلے میں بے بس اور پوشیدہ محبت کی اندیشہ ناک کشمکش تماشائی کو تمام وقت بے حد ہمدردانہ متوجہ رکھتی ہے۔ اکثر جذبات کی اس دنیا سے گزرتا ہے جس میں وہ زیادہ مانوس معلوم ہوتا ہے اور امید و بیم کے مواقع ان تاثرات کو تیز تر کر دیتے ہیں۔ غرض عشق و محبت کی اس لطیف و زندہ جاوید داستان نے اردو اسٹیج کو ڈرامے کی بہت سی ایسی لذتوں سے واقف کیا۔ جن سے پہلے وہ ناواقف تھے۔

بزمِ فانی کا پلاٹ موٹی باتوں میں وہی ہے۔ جو شکسپیر کے رومیو جولیٹ کا ہے۔ تفصیلات میں البتہ حسبِ ضرورت ترمیم کی گئی ہے۔ احسن صاحب نے ہندوستانی تماشائیوں کے لئے زیادہ موثر بنانے کے خیال سے اسے مشرقی معاشرت میں ڈھال دیا ہے۔ اور اس غرض کے لئے نہ صرف واقعات کو بدلا۔ بلکہ جذبات کے اعتبار سے کیرکٹروں کو بھی مشرقی بنا دیا۔ اور اس میں وہ روح پھونکی۔ جو میر حسن اور مرزا شوق کی مثنویوں میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اپنی اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ بعض چیزیں البتہ ان سے نہیں نبھ سکیں۔ مثلاً مسلمان گھرانوں میں پردے کا رکھ رکھاؤ نہیں دکھا سکے۔ لیکن یہ ایسی باتیں ہیں جنہیں نظر انداز کرنا ہماری سٹیج کی روایت بن چکا ہے۔

جو چیزیں وہ خوش اسلوبی سے نبھا گئے ہیں۔ ان میں سے ایک مثلاً گلنار اور فیروز کی ملاقات ہے۔ شکسپیئر کے کھیل میں جولیٹ کے ہاں بال یعنی جلسۂ رقص ہے۔ جس میں ایک دشمن خاندان کا نوجوان رومیو چہرے پر نقاب ڈال کر چلا آتا اور وہاں جولیٹ سے مل کر اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ احسن نے گلنار کے ہاں جلسہ رقص و سرود منعقد کیا ہے۔ جس میں نوجوان اور عاشق مزاج فیروز سازندہ بن کر آجاتا اور گلنار کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔

اس موقع پر احسن نے فیروز کی فریفتگی کا اظہار یوں کیا ہے

کیا سندر روپ سروپ پھبن۔ رخسار میں ہے کیا پھول سی لالی
کیا مدھ بھرے نین کے سین چلیں کیا شوخ نگاہیں چتون متوالی
سج دھج کی پھبن۔ ان حد جوبن ہے شان خدا ہر بات نرالی
زلفوں کی لٹک سے دل کو جھٹک رہی سر کی پٹک جیسے ناگن کالی

تنہائی میسر ہوتے ہی فیروز گلنار سے بات شروع کرتا ہے مگر چند باتیں ہی کرنی پاتا ہے کہ گلنار کی انا آپہنچتی ہے۔ فیروز اسے دیکھ کر کھسک جاتا ہے۔ انا آکر کہتی ہے "چلو پیاری۔ تمہاری ہے انتظاری۔ یہاں کیا کرتی ہو میں واری؟"

گلنار کے منہ سے ایک آہ کے ساتھ بے اختیار نکلتا ہے۔

"ہائے دل"

انا۔ ہے ہے۔ چہرہ کیا تمتمایا ہوا ہے! کیا ہے؟ کیا دل میں درد ہے؟

گلنار۔ دل میں وہ درد ہے جس درد کا چارہ ہی نہیں
واں لڑی آنکھ جہاں اپنا گذارہ ہی نہیں

انا۔ کیا کہا؟ پھر تو کہو۔ کیا ہے یہ نقشہ اس وقت؟

گلنار (ٹالنے کو) آگیا یاد یوں ہی شعر کسی کا اس وقت!

انا۔ نہیں نہیں۔ کچھ دال میں کالا کالا ہے جو یہ شعر زبان سے نکالا ہے دیکھو اگر مجھ کو نہ بتاؤ گی تو بہت پچھتاؤ گی۔

گلنار۔ رات کے جاگنے سے طبیعت کسل مند ہوئی جاتی ہے۔ آنکھ بند ہوئی جاتی ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نئی بات نہیں۔

انا۔ اچھا یہ تو بتاؤ۔ جو تمہارے شانے سے شانہ ملائے سر کو چھپائے ابھی باتیں کر رہا تھا . . . .

گلنار۔ کہاں؟ ---- کوئی بھی نہیں۔

انا۔ ہاں ہاں کوئی بھی نہیں!

گلنار۔ میں سمجھتی ہوں تم کو دھوکا ہوا۔

انا۔ اری لڑکی مجھ سے چندراتی ہے۔ مجھ بڑھیا کو باتوں میں اڑاتی ہے۔

گلنار۔ خیر یوں ہی سہی۔ کوئی ہوگا۔ یہاں تو اژدہام تھا۔ جلسہ عام تھا مگر مجھ سے کسی کو کیا کام تھا؟

انا۔ ہاں ہاں جلسہ عام تو تھا۔ مگر تم سے جو شخص ہمکلام تھا۔ وہ تو کوئی خاص عالی مقام تھا۔

حال دل مل گیا ہے اک پل میں ؛ تاڑ بیٹھی نگاہ اول میں
دونوں دونوں جگہ نہیں چھپتے ؛ عشق دل میں شراب بوتل میں

احسن کی گلنار جولیٹ نہیں۔ اس نوع کی ہیروئن ہے۔ جن سے میر حسن اور مرزا شوق کی مثنویوں میں ملاقات ہوتی ہے۔ فیروز کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ابتدا ہی میں یہ غزل گاتا ہوا داخل ہوتا ہے[1]۔

مائل طرز جنوں کب دل نالاں نہ ہوا ؛ کون سا دن تھا جو میں چاک گریباں نہ ہوا

فیروز کا عزیز مسعود داخل ہو کر کہتا ہے۔ "بھائی تسلیم!"

فیروز۔ وقت کیا ہوا ہوگا؟

مسعود۔ نو کا گھنٹہ ابھی بجا ہوگا۔

فیروز۔ نہیں کٹتے سے کٹتے ہجر کے دن ؛ جدائی کا ہر اک پل اک برس ہے!

مسعود۔ کس واسطے ہے یہ حال جی کا؟

فیروز۔ دیوانہ ہوا ہوں اک پری کا!

مسعود۔ عشق خانہ خراب ہوتا ہے ؛ دل کا آنا عذاب ہوتا ہے

فیروز۔ جس کو کہتے ہیں اہل دل اکسیر ؛ اس کا وہ اضطراب ہوتا ہے

مسعود۔ آپ کو جو فکر میں پاتا ہوں میں ؛ دوستی کرتا ہوں سمجھاتا ہوں میں

فیروز (بات کاٹ کر)

اس نصیحت سے تو گھبراتا ہوں میں ؛ لیجیے تسلیم بس جاتا ہوں میں

مسعود۔ ہیں ہیں کہاں چلے۔ ٹھہرو تو سہی۔ کیا اب دل میں کچھ ہماری محبت مروت نہ رہی۔ جو یوں چھوڑ چلے۔ یہ تو بتاؤ۔ وہ کون رشک پری حسن و جمال میں بھری ہے۔ جس کے عشق میں یہ جلوہ گری ہے۔

---

[1] ہاں؟ ایڈیٹر

فیروز۔ دل یہ جس کے لئے ہر وقت فغاں کرتا ہے
لٹے عاشق کی وہ پروا کہاں کرتا ہے

ڈرامے میں اشعار بھی ہیں اور اس زمانے کے طریق کے مطابق مقفیٰ نثر بھی لیکن پھر بھی جذبات کا اظہار گفتگو کی لوچدار زبان میں ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ فقرے اس انداز کے ہیں جن میں ایکٹر کو ایکٹ کرنے کی گنجائش ملتی ہے۔

پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی کی رائے ہے کہ احسن ایک مقام پر اپنے گلنار فیروز میں شکسپیر کے رومیو جیولیٹ سے آگے چلے گئے ہیں۔ گلنار اور فیروز کی خفیہ شادی ہو جانے کے بعد گلنار کا ایک رشتہ دار فیروز سے لڑائی مول لیتا اور مجادلہ میں فیروز کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے۔ خون کرنے کے بعد فیروز کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ شہر سے فرار ہو جائے۔ شکسپیر کے ہاں رومیو جیولیٹ سے مل کر چلا جاتا ہے اور جولیٹ مغموم ہے کہ اوپر سے اس کی ماں آ جاتی ہے۔ احسن کے ہاں فیروز کے رخصت ہو جانے کے بعد گلنار بے ہوش ہو جاتی ہے اور ماں داخل ہو کر یہ سمجھتی ہے کہ اس کا یہ غم اپنے مقتول عزیز کے لئے ہے۔ چنانچہ کہتی ہے "افسوس افسوس اس نادان کے نازک دل پر مرزا کی موت کا کس قدر اثر ہے اپنے بیگانے سے بے خبر ہے۔ شاید روتے روتے گر گئی یا صدمے سے غش ہو گئی۔ گلنار! گلنار پیاری! منہ سے بولو میں واری!

بے ہوشی سے چونک کر گلنار کے منہ سے نکلتا ہے "فیروز ہائے فیروز!"

سیدھی سادی ماں کہتی ہے "اب تک قاتل کا نام لے کر چونک پڑتی ہے۔ ایڑیاں رگڑتی ہے۔ کیا ہے میری جان" وغیرہ

احسن نے بزم فانی کو خوش انجام کھیل بنایا یہ مناسب نہ کیا۔ گلنار و فیروز کی محبت کی نوعیت کا اور پھر فیروز کے قاتل ہونے کا اقتضا یہی تھا کہ یہ کھیل غم انجام ہوتا لیکن تماشائیوں کا ذوق پیشہ ور ڈرامہ نویس کو بے حد بے بس بنائے رکھتا ہے۔ یورپ میں بھی عام تماشائیوں کی خوشنودی کے خیال سے رومیو جولیٹ خوش انجام ڈرامہ بنا کر دکھایا جا چکا ہے۔

بہر حال احسن کا بزم فانی اردو کے یادگار ڈراموں میں سے ہے۔ یہ اردو کے پرانے راگ ناٹکوں سے نمایاں طور پر مختلف اور بہت زیادہ دلچسپ و موثر تھا۔ اس کا پلاٹ ڈرامے کا پلاٹ تھا کیرکٹر میں بھی حقیقت کی جھلک نظر آتی تھی۔ زبان زیادہ بے تکلف تھی۔ اس میں ایکٹروں کے لئے ایکٹ کرنے کی گنجائش بھی تھی۔ اور اس کی فضا اردو کی مشہور عشقیہ مثنویوں کی تھی۔ اسی ڈرامے کی کامیابی نے ڈرامانویسوں کو انگریزی کے دوسرے ڈرامے اردو میں منتقل کرنے پر زیادہ متوجہ کیا اور تماشائیوں کو سکھایا کہ انہیں اچھے ڈرامے میں کن کن باتوں کی توقع رکھنی چاہئے۔

(بہ اجازت اے۔ آئی۔ آر)

سید امتیاز علی تاج

رباعی

درد و غمِ تابشِ نہاں تک دے دوں
میں لذتِ فریاد و فغاں تک دے دوں
آغازِ محبت کا زمانہ آزاد!
مل جائے پھر اک بار تو جاں تک دے دوں

جگن ناتھ آزاد

جوانی

تُو نے دیکھا ہے اُسے
جاتے ہوئے ارضِ حجاز
کتنا موزوں تھا جواں قدِ دراز
— دل میں کھبا جاتا ہے

تو نے چاہا ہے اُسے
مصر! ابوالہول جمال
کتنے مردانہ تھے اس کے خدوخال
— درد بڑھا جاتا ہے

تو نے پایا ہے اُسے
شمعِ شبستانِ فرانس
کس قدر گرم تھا اس کا ہر سانس
— جسم جلا جاتا ہے

تُو نے روندا ہے اُسے
جنگ! اُلٹا میرا سہاگ
مادرِ گیتی مرے واسطے جاگ
— وقت اُڑا جاتا ہے

قیوم نظر

ایک محفل

شیر آنوالے دروازے کے باہر ہم نے ایک بیٹھک کرائے پر لے رکھی تھی۔ یہ بیٹھک ایک پرانی وضع کے مکان کی بالائی منزل میں تھی سڑک کے اوپر ایک بڑا کمرہ تھا اور پشت پر ایک چھوٹا کمرہ اور ایک غسل خانہ، بڑے کمرے میں چاندنی بچھی رہتی تھی۔ چاروں طرف گاؤ تکیے لگے رہتے تھے، ایک دو پیچوان درمیان میں کچھ خاصدان وغیرہ بھی تھے، دو کھڑکیاں سڑک پر کھلتی تھیں جن میں اندر کی طرف تو بھاری پردے لٹکتے تھے اور باہر باریک بانس کی زنگدار چقیں بچھلے کمرے میں ساز طبلے، طنبورے وغیرہ رکھے جاتے تھے، اور الماریوں میں چوسر، شطرنج، تاش، کیرم وغیرہ، چھت پر باورچی خانہ تھا۔ جس کے چولھے میں ہر وقت اُپلے سلگتے رہتے تھے تاکہ حقے ٹھنڈے نہ پڑیں، کبھی کبھار کوئی دوست شکار لے آتا تو وہ بھی یہیں بھونا جاتا، سردیوں میں اس چولھے پر پانی کی کیتلی چڑھی رہتی تھی تاکہ چائے کے دور سرد نہ پڑیں۔

اس بیٹھک میں طرح طرح کے لوگ جمع ہوتے تھے، ہر روز آنے والوں میں سب سے ممتاز میاں سراج الدین تھے، عمر میں چالیس پینتالیس کے ہوں گے۔ مگر گرانڈیل اور قوی ہیکل، سرخ رنگ اور ورزشی جسم، ان کا نام ہیرے شاہ نے تپنیل کا ''مینڈھا'' رکھا ہوا تھا، موسیقی والوں کے حلقے میں اُن کی خاص قدر و منزلت تھی، لکھنؤ کے استاد میاں جان مرحوم کے شاگردوں میں تھے اور جوانی میں مرحوم زہرہ بائی آگرے والی سے اُن کی آشنائی رہی تھی، اس آشنائی کا قصہ وہ آہیں بھر بھر کر سنایا کرتے تھے، کہا کرتے تھے کہ ملتانی کی کندھار ٹرھنا مرحوم زہرہ بائی یا استاد مرحوم کے حصے میں تھا، پہلے روز جب یہ مرحوم زہرہ بائی سے ملے تو انہوں نے ملتانی ہی کی ایک چیز سنائی۔ جب گندھار کی بڑھت ہوئی تو میاں سراج الدین نے ایسی باموقعہ داد پہ داد دی کہ مرحوم زہرہ بائی باغ باغ ہوگئی پھر کچھ ان سے بھی سنا اور اس طرح باہم رسم و راہ کا سلسلہ شروع ہوا، میاں سراج الدین نے اپنے زمانے کے تمام استادوں کو سنا تھا اور اچھے اچھوں کی صحبت پائی تھی، استاد فتح علی خاں تان کپتان کی دربار داری کی، خاں صاحب عبدالکریم خاں مرحوم سے اچھے تعلقات رہے، پھر بھاسکر راؤ اور بھات کھنڈے وغیرہ سے بھی ملنا جلنا رہا، ان ہی کی بدولت ہماری بیٹھک پر اچھے اچھے استاد آتے اور اپنے فن کے کمالات دکھا کر میاں سراج الدین سے داد پاتے تھے، ان استادوں کے علاوہ جب کوئی بڑا گویا یا اُستاد لکھنؤ آگرے یا بڑودے وغیرہ سے آتا تو ہماری بیٹھک پر مہمان اترتا اور ہم اس کے کمالات سے لطف اندوز ہوتے،

قادر سائیں ہماری بیٹھک کا گویا خانِ سامان تھا، چوبیس گھنٹے یہیں رہتا، کھانا میاں سراج الدین کے گھر کھاتا اور بات چیت (خرچ) کے لئے چار آنے روز ہم میں سے کسی ایک سے لے لیتا، بیٹھک کی صفائی اور دیکھ بھال اس کا کام تھا۔ مہمانوں کی خاطر داری اور دیکھ بھال بھی اس کے ذمہ تھی، سائیں حقے کے معاملے میں بڑا طاق تھا۔ حقہ بھر کر کسی کے آگے رکھتا اور اس کے کش لگانے سے معلوم کر لیتا کہ یہ شخص حقہ پینے میں ماہر ہے یا نہیں۔ . . . . ور جہاں کسی نے لمبا کش لیا سائیں کا مزاج برہم ہوا، میاں سراج الدین کو حقہ چلا کر دیا کرتا تھا اور ان کے حقے کو کسی بے ذوق حقہ نوش کے ہاتھ نہیں پڑنے دیتا تھا،

خصوصاً بابا رحمت کو تو قریب نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔

بابا رحمت ایک صاحبِ کمال آدمی تھا۔ جوانی میاں سراج الدین کے ساتھ کاٹی تھی۔ طبلے کا استاد تھا اچھے اچھے گویّے اور کلاونت اس کے آگے کان پکڑتے تھے۔ ساتھ بجانے میں خاص ملکہ تھا۔ مگر قادر سائیں کے نزدیک بابا رحمت "بے تالوں" کا استاد تھا، قادر سائیں ویسے تو اچھی طرح جانتا تھا کہ شہر میں کوئی طبلچی بابا رحمت کے سامنے آنکھ نہیں اٹھا سکتا اور اسے مان بھی تھا کہ بابا ہماری بیٹھک میں اٹھتا بیٹھتا ہے مگر اسے بابا رحمت کے خلاف ایک شکایت تھی اور وہ یہ کہ بابا دو کشوں میں حقے کو تباہ کر دیتا تھا، قادر سائیں سب کچھ برداشت کر سکتا تھا مگر حلیم پر یہ باد ہوتی نہیں دیکھ سکتا تھا، اسی لئے میاں سراج الدین کا حقہ بعد میں لاتا پہلے بابا رحمت کے لئے ایک گڑگڑی لا رکھتا اور اُسے کہتا بس اسے تو اکیلا ہی پی، بعض اوقات وہ بابا رحمت کو سمجھاتا کہ بابا تو حقہ پینا چھوڑ دے اور سگرٹ پیا کر، یہ دیکھ بابو احمد ہیں، بابو رفیع ہیں سگرٹ پیتے ہیں دھوئیں کے بادل اُڑاتے ہیں حقے کو ہاتھ تک نہیں لگاتے، تو خواہ مخواہ حقے کی مصیبت کیوں لاتا ہے، مگر بابا کب مانتا تھا، اگر کبھی میاں سراج الدین دیکھتے کہ ان کا حقہ نہیں چلتا تو قادر سائیں بابا رحمت پر برس پڑتا "بابا کسی محفل میں کبھی حقہ پیا ہے، قسم ہے پیران پیر کی جوتے مار کر نہ اٹھوا دئیے جاؤ تو قادر نام نہ کہنا"۔ اس پر بابا بڑی بڑی محفلوں کا ذکر کرتا، درباروں کے نام گنواتا مگر کہاں، قادر سائیں اپنی رٹ میں لگا رہتا "ڈمرو پر ڈمک ڈمک تو کر لی بابا، پر مجلس میں بیٹھنا نہ آیا اور ڈمک ڈمک بھی کس کام کی ....." اس پر بابا رحمت سے ضبط نہ ہو سکتا اور وہ بے اختیار چلاتا "سائیں تو طبلے کی بات نہ کیا کر جس چیز کی انسان کو سمجھ نہ ہو اس میں ٹر ٹر کرنے سے کیا فائدہ" آخر میاں سراج الدین بیچ میں پڑتے اور صفائی ہوتی،

قادر سائیں اور ہیرے شاہ کی روز لڑائی ہوتی تھی کیونکہ ہیرے شاہ کے خیال میں قادر سائیں کو حقہ بھرنا ہی نہیں آتا تھا، قادر سائیں یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا تھا، اس نے استاد میاں جان مرحوم کے حُقّے بھرے تھے وہ ہیرے شاہ کو کیا سمجھتا تھا اور اگر ہیرے شاہ کی ہاں میں بابا رحمت نے بھی ہاں ملا دی تو بڑے مزے کی جھڑپ ہوتی، قادر سائیں چلا چلا کر کہتا "دیکھ بابا رحمت، ہیرے شاہ سید ہے، پیران پیر کی اولاد ہے، اس لئے میں اسے کچھ نہیں کہہ سکتا، اور تو حقے کا نیچہ تک پکڑنا جانتا نہیں، میرے مُنہ نہ آئیو ورنہ ....."

ہیرے شاہ بھی میاں سراج الدین کی طرح گرانڈیل جوان تھا، ڈاڑھی بڑھا رکھی تھی اور سر اُسترے سے صاف کرواتا تھا، اس کی آنکھیں گول گول اور چھوٹی سی تھیں اور بھاری چہرے پر نہایت بدنما معلوم ہوتی تھیں، سیاہ رنگت اس پر چیچک کے داغ، گاتے وقت بے تحاشا منہ کھولتا تھا، سید ہونے کی وجہ سے میراثی گویّے اور طوائفیں اس کی بڑی خاطر مدارات کرتی تھیں ہیرے شاہ کی باتیں نہایت بے تکی معلوم ہوتی تھیں ہاں نام رکھنے میں خاص ملکہ تھا، بے پروا اور مُنہ پھٹ ہونے کی وجہ سے لوگ اسے کچھ ولی قسم کا آدمی سمجھتے اور اس کی بد دعا سے میراثی اور طوائفیں بہت ڈرتی تھیں، میراثیوں کے اس نے عجب عجب نام رکھے ہوئے تھے مثلاً اپنے استاد کو "سُر کال کا بھنگی" کا نام دے رکھا تھا، اور اس کا استاد جو اپنے فن ہی میں یکتا تھا، اس کا بُرا نہیں مانتا تھا، اور کہا کرتا "شاہ جی استادوں کو اس طرح کہتے ہیں"!

ہیرے شاہ جھک کر کہتا "تجھے استاد کون مانتا ہے میں ایک آواز لگاؤں تجھ ایسے دس ہزار گویّے چھپا لوں" اور یہ بات تھی بھی درست، ہیرے شاہ کو قدرت نے وہ گلا عطا کیا تھا کہ اگر اس میں راگ کی ذرہ بھر تمیز بھی ہوتی تو ہندوستان میں کوئی گویّا اس کے سامنے بات نہ کر سکتا، اصل سیکھ کنٹھ اور عین سُر میں مگر ہیرے شاہ صرف بھیرویں اور مالکونس گا سکتا تھا اور پھر یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ مالکونس کب بھیرویں بن جائے گا۔ اور بھیرویں مالکونس۔ پھر بھی لوگ اسے سنتے تھے، اور اچھے اچھے گویّے اسے سنتے تھے، محض سُر کی خاطر، اس کے استاد نے جب دیکھا کہ یہ راگ کو سمجھتا نہیں۔ اس میں لَے کی تمیز داری پیدا کرنی چاہی مگر کہاں ہیرے شاہ اور کہاں لَے کاری، تاہم ہیرے شاہ کو اپنے گانے پر مان تھا،

بابا رحمت اور قادر سائیں ہماری مجلس میں نقلِ محفل کی حیثیت رکھتے تھے، مگر ہیرے شاہ خواہ مخواہ ان کے منہ آتا تھا اور یہ بات ہمیں نہیں بھاتی تھی، کیونکہ ہم میں سے اکثر ہیرے شاہ کے خاندان

سے واقف تھے۔ اس کا چھوٹا بھائی میرا ہم جماعت رہ چکا تھا اور پٹنہ کے ایک کالج میں پروفیسر تھا۔ ہیرے شاہ کا کام کاج نہ کرنا اور طوائفوں کے گھروں سے کھانا پینا ہمیں برا معلوم ہوتا تھا، مگر ہیرے شاہ کو اس بات کا بالکل احساس نہیں تھا، میاں سراج الدین جو اچھے وضع دار آدمی تھے۔ اکثر ہیرے شاہ کو سمجھایا کرتے تھے کہ ان لوگوں سے علم سیکھ لو مگر انہیں اپنے برابر مت بٹھاؤ اور میاں سراج الدین کا دستور بھی یہی تھا، استاد میاں جان مرحوم اُن کے استاد تو تھے مگر تنخواہ پایا کرتے تھے اور ملازموں میں شمار ہوتے تھے۔ گو میاں سراج الدین خاص ان کے معاملے میں عزت داری برتتے تھے۔ ہیرے شاہ میاں سراج الدین کی نصیحتیں سن کر بے اختیار رونے لگتا تھا اور اپنے آپ کو گالیاں دیتا "میں جانتا ہوں میاں صاحب، میں ناخلف ہوں میں اپنی بے عزتی خود کرواتا ہوں"، پھر ہیرے شاہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ خاموشی سے بیٹھتا مگر جہاں کسی نے کوئی بات ایسی کر دی جس میں اس کا ذکر آ گیا بس ہیرے شاہ سب کچھ بھول بھلا کر میراثیوں سا میراثی بن جاتا۔

شہر میں چوٹی کی گانے والی دو طوائفوں کا بھی ہماری بیٹھک پر آنا جانا تھا، ایک تھی عزیزہ بائی جس کا نام ہیرے شاہ نے "کلہر کی ڈوئی" رکھ دیا تھا، اور یہ نام تھا بھی بہت موزوں۔ عزیزہ بائی کا قد کافی لمبا تھا اور چہرہ جسم کے لحاظ سے چھوٹا اور رنگ بہت سفید تھا، دوسری تھی گلزار۔ یہ جسم کی بھاری تھی موسیقی میں خاص مہارت رکھتی اس کا نام ہیرے شاہ نے "پیغمبر دل کی نائن" رکھ رکھا تھا، اور یہ دونوں ہیرے شاہ کی خاص ماننے والیاں تھیں۔ قادر سائیں عزیزہ بائی کی بہت تواضع کرتا تھا، بات یہ تھی رفیع صاحب نے قادر سائیں کے حقے بھرنے پر ایک نظم لکھی تھی اور عزیزہ بائی اسے گایا کرتی تھی، گلزار لے تال کی پکی تھی اس لئے بابا رحمت اس کی عزت کرتا تھا۔ اسی وجہ سے بابا رحمت اور قادر سائیں عموماً گلزار اور عزیزہ بائی کے محاسن کا جائزہ لیتے ہوئے اُلجھ پڑتے تھے۔ اور ہر دفعہ ایک بات خاص طور پر زیر بحث آتی تھی، ایک دفعہ گلزار اور عزیزہ اکٹھی گا رہی تھیں، گلزار ایک تان اٹھاتی اور اسے کہیں چھوڑ دیتی عزیزہ بائی اس تان کو لے کر سم دکھاتی پھر وہ ایک تان چھوڑ جاتی اور گلزار بول پکڑ کر گر دکھاتی۔ سائیں کا کہنا تھا کہ بابا رحمت نے اس جوڑ میں کئی دفعہ گلزار کو بے تال پا کر ایک دو تارے گرائے یا بڑھائے تھے۔ مگر بابا رحمت کہتا تھا کہ عزیزہ بائی کو اس نے کئی دفعہ سر کے بل گرنے سے بچایا تھا، اس بات کا فیصلہ کبھی نہ ہو سکا، ہیرے شاہ کہتا تھا کہ بابا رحمت خود غلط ہو ہو جاتا۔ اس لئے جہاں کسی کا گر گرتا دیکھتا تھا وہیں سم دکھا دیتا تھا، کئی دفعہ یہ مقدمہ میاں سراج الدین کے روبرو پیش ہوا، بابا رحمت اور قادر سائیں نے کئی دفعہ انہیں پیران پیر کی قسمیں دے کر فیصلہ کرنے کو کہا مگر وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے "میاں دونوں بہت خوب گاتی ہیں"۔

گویوں کے اس قسم کے دنگل ہماری بیٹھک پر اکثر ہوا کرتے تھے، جس روز اس کی خبر میراثیوں وغیرہ میں پہنچتی ہجوم کا ہجوم جمع ہو جاتا، دونوں گویوں کے ہوا خواہ آ پہنچتے اور یہ دنگل چھ چھ سات سات گھنٹے رہتا، ایسے موقعوں پر عجیب عجیب راگ گائے جاتے، عجیب عجیب تانیں ساتھ لگتیں، ولمبت میں ایک گویا لے کو بقول بابا رحمت "کوئیں میں ڈالے جاتا ہے" مڑ مڑ کر کہتا ہے" اور گاڑ دے" دُرت میں لے آسمان پر چڑھی جاتی ہے، ترانہ آیا ہے تو "دُر دُر نا نا" ایسا تیز بولتے ہیں کہ عام آدمی کی زبان دُہری ہوئی جاتی ہے۔ جہاں کوئی گویا بے تال ہوا بابا رحمت کی ہوا بندھ گئی، جہاں ایک تان ایک گویے نے دوسری دفعہ لی دنگل ختم ہوا، مگر میاں سراج الدین دونوں کو داد دیتے تھے اور یہ کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ انہیں کونسا پسند آیا ہے۔ موسیقی والوں کے حلقوں میں ایسے دنگلوں کے کئی کئی مہینے چرچے ہوتے رہتے۔ بحثیں چھڑتیں۔ بعض اوقات لڑائی جھگڑے تک نوبت آن پہنچتی۔

ہیرے شاہ کی بابا رحمت سے ایک بات پر ٹھنتی تھی۔ بابا رحمت کہتا تھا کہ پنڈت لے تال کے بادشاہ ہیں اس لئے اچھے گویے ہیں مگر ہیرے شاہ کہتا تھا کہ میراثی ایک آواز لگائے تو ہزار پنڈت چھپ جائیں، اس لئے پنڈت میراثی کے آگے زبان نہیں کھول سکتے، اور یہ بحث عموماً بہت طول پکڑ جاتی کیونکہ

اس میں جو غلط سلط مثالیں دونوں دیتے ان پر ہم میں سے اکثر کو اعتراض ہوتا۔ میاں سراج الدین چپکے سنتے رہتے اور صرف تب بولتے جب بابا رحمت جرنیل صاحب، بدو خان توکل حسین خاں کو گا لیاں دیتا اور ہیرے شاہ وشنو دگمبر بھات کھنڈے اور بھاسکر راؤ کو نبرتے سناتا، میاں صاحب دونوں کو ڈانٹ کر بٹھا دیتے اور کہتے "سب اچھا گاتے تھے"۔

جب کوئی نیا شخص ہماری بیٹھک پر آتا تو ہم گانا سننے کے مشتاق ہوتے، بابا رحمت اسے بے تال کرنے کی فکر میں رہتا، قادر سائیں اسے بڑی پریت سے حقہ بھر کر دیتا اور ہیرے شاہ فقرے کسنے کی تاک میں رہتا، قادر سائیں حقہ بھرنے پر ایک مقالہ بولتا۔ تمباکو کی قسمیں بیان ہوتیں، بڑے بڑے استادوں کی لپسند بتائی جاتی، تازہ کرنے کے اصولوں پر بحث ہوتی، اُپلے کی آگ اور جنڈ کی لکڑی کی آگ میں تقابلے کئے جاتے، ٹھیکری رکھ کر بھرنے کے فوائد یا لوہے کے توے کی خاصیتیں کھلتیں، پھر قادر سائیں بتاتا کہ اس نے کسی کے لئے کس طرح حقہ بھرا تھا، سب میں اس کی واہ واہ ہوتی،

بابا رحمت ایسی باتیں سُن کر کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ وہ اپنے کارنامے بیان کرتا "ایک دفعہ حضور میں بمبئی گیا، وہاں ایک محفل میں طبلہ میرے آگے لا رکھا گیا اور ایک پنڈت گانے لگا، حضور مجھ سے پوچھنے لگا کس کے شاگرد ہو میں نے کہا۔ حضور خاں صاحب کالے خاں کا شاگرد ہوں۔ اس پر اس نے مجھے غور سے دیکھا پھر کہنے لگا اچھا بجاؤ، مگر حضور منہ سے کچھ نہ بولے۔ بس یوں کرے ....." بابا رحمت اس کی نقل اتارنے لگا، اس نے چٹکی بجائی اور ہاتھ آگے کو بڑھا کر کوئی پانچ سیکنڈ وہاں رکھا، پھر ایک چٹکی بجائی اور ہاتھ اوپر کو اٹھایا وہاں اسے دو تین سیکنڈ رکھا، پھر ہاتھ نیچے لا کر آگے بڑھایا، پھر ایک چٹکی بجا کر ہاتھ کو جھٹکا دے کر چٹکی بجائی اور ساتھ سر ہلا کر کہا "ہاں" (یعنی گُر یہاں تھا) "بس حضور اس طرح کرے اور مُنہ سے کچھ نہ بولے پہلے تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ کونسی تال کہتا ہے، پھر حضور استاد مرحوم کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی جہاں وہ چٹکی بجائے حضور میں بجا دوں "دھن" جہاں حضور وہ خالی دکھلائے میں بجا دوں کڑانددھ" پھر وہ بجائے چٹکی اور میں بجا دوں "دھن"..... بس حضور سر دھننے لگا، کہنے لگا "واقعی تم خاں صاحب کالے خاں صاحب کے شاگرد ہو" سب نے واہ واہ کہی قادر سائیں نے ہیرے شاہ کے کان میں کہا "بکواس کرتا ہے"۔ اور پھر واہ واہ کرنا شروع کی، اب ہیرے شاہ کیونکر چپ رہ سکتا تھا،

ایک شخص وہاں بیٹھا تھا جو نیا نیا آیا تھا، اصل میں وہ میاں سراج الدین کا ملنے والا تھا، سر سے گنجا تھا، ہیرے شاہ اس کی چندیا کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا، جب وہ شخص ہیرے شاہ کی طرف دیکھتا تو یہ اسے دکھا کر منہ پھیر لیتا۔ گویا دیکھ ہی نہیں رہا تھا، اور جہاں اس بے چارے نے پھر منہ ادھر کیا ہیرے شاہ پھر اسی طرح دیکھنے لگا، آخر وہ نہ رہ سکا۔ اس نے پوچھ ہی لیا کہ صاحب کیا بات ہے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟

ہیرے شاہ نے معصوم شکل بنا کر کہا "حضرت کچھ نہیں ..... پر میں سوچ رہا ہوں آپ آئے کہاں سے ہیں؟"

وہ شرمندہ سا ہو کر کہنے لگا "جی میں بمبئی سے آیا ہوں"

"حضرت میرا مطلب ہے آپ کیا کام کرنے آئے ہیں؟"

"بس یہی دفتر میں کام کرتا ہوں ..... لکھنے پڑھنے کا"۔

ہیرے شاہ نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اچھا حضرت! میں سمجھا تھا آپ برف اٹھاتے رہے ہیں ....." اس پر محفل میں تو قہقہے پر قہقہے بلند ہونا شروع ہو گئے۔ واقعی اس شخص کی چمکتی ہوئی چاندکا برف سے کچھ تعلق معلوم ہوتا تھا، مگر میاں صاحب نے بہت برا مانا، بابا رحمت نے جب میاں صاحب کے چہرے پر غصہ دیکھا تو تیز ہو گیا اور ہیرے شاہ کو برا بھلا کہنے لگا، مگر ہیرے شاہ کی اب بن چکی تھی۔ اس نے بابا رحمت کو بھی آ لیا "حضور بنیا ایسے جا مُنہ ہوا، شکل یوں نکالی ہے جیسے گجرات سے پلنگ لگا کر منگوایا ہو"۔ اس پر اور قہقہے بلند ہوئے، اصل میں بابا رحمت نے اس روز اپنے سر کو وسمے سے رنگا ہوا تھا۔

ایک دفعہ بابا رحمت اور ہیرے شاہ کی ایسی بگڑی کہ جوت پیزار تک نوبت آئی واقعہ یوں ہوا کہ ہیرے شاہ کو کہیں سے ایک

شاگرد مل گیا، لونڈا تھا امیر گھرانے کا اور گانے کا شوقین مگر موسیقی کی ابجد تک سے کورا۔ ہیرے شاہ کا کام بن گیا وہ آئے دن اس کے سامنے نت نئی فرمائش کرتا اور وہ لونڈا بے چارہ خاموشی سے پوری کر دیتا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہیرے شاہ نے ہم سے بات چیت کے لئے پیسے تک مانگنا چھوڑ دیے۔ ہیرے شاہ پہروں اس سے آواز لگواتا، وہ بے چارہ قلعے کی دیوار کے پاس بیٹھا ہلکان ہوتا رہتا، پھر ہیرے شاہ اُسے کہتا کہ اب تیری آواز استاد فیاض خاں جیسی ہو گئی ہے۔ دیکھ تو سہی کسی دن استاد عاشق علی خاں جیسی بنا دوں گا، وہ اس چکمے میں کئی مہینے جنگھاڑتا رہا، بابا رحمت کو جب معلوم ہوا کہ ہیرے شاہ نے ایک موٹا مرغا پھنسایا ہے تو وہ اسے اپنے قبضے میں کرنے کی فکر کرنے لگا۔ اس نے اس لونڈے کو خدا جانے کیا پٹی پڑھائی کہ وہ ہیرے شاہ سے باغی ہو کر بابا رحمت کا شاگرد ہو گیا۔ اب ہیرے شاہ اسی پر ادھار کھائے بیٹھا تھا وہ کیونکر برداشت کرتا کہ اس کا شکار کوئی اور لے جائے، جب اس بات کا حال میاں سراج الدین کو معلوم ہوا تو انہوں نے اس لونڈے کو بلوا بھیجا، ان ہی دنوں آگرے سے ایک اُستاد ہمارے مہمان آئے ہوئے تھے جس شام ان کا گانا تھا وہ لونڈا بھی موجود تھا۔ استاد کوئی پانچ گھنٹے کے قریب گائے۔ سردیوں کا موسم تھا مگر وہ پسینے پسینے ہو گئے۔ خدا جانے اس لڑکے کو کیا ہوا اس دن سے اس نے شاگردی کرنا چھوڑ دی، میاں سراج الدین کہتے تھے کہ میں نے اسے بتایا ہے کہ یہ چیز کیسی کٹھن ہے اور اس نے خود دیکھ لیا ہے۔ اس لئے اس نے ارادہ ترک کر دیا ہے، مگر ہیرے شاہ کہتا تھا کہ آگرے والا استاد اس قدر بدآواز تھا لونڈے کو موسیقی سے نفرت ہو گئی۔

اس بیٹھک پر آنے والے اب بکھر گئے ہیں۔ رفیع اور احمد ملازمت کے سلسلے میں باہر چلے گئے ہیں میں یہاں فوج میں ہوں میاں صاحب کا انتقال ہو گیا ہے محفل تو برہم ہو گئی ہے مگر ہیرے شاہ کہیں نہ کہیں اپنی آواز کی کشش سے بات چیت کے لئے پیسے جمع کر رہا ہوگا، بابا رحمت اپنے کارنامے سنا رہا ہوگا۔ اور قادر سائیں بھی کہیں نہ کہیں حقہ تازہ کر رہا ہوگا۔

عبدالحمید

موت

موت اور زیست کی سرحد سے چلی بادِ فنا۔
سرد انفاس میں اُلجھے ہوئے روحوں کے فسردہ نوحے،
اور سسکتے ہوئے عفریتوں کی آہوں کی صدا۔
بحرِ ہستی پہ گری دُرّہ بدست۔

آگہی مائلِ پرواز ہوئی،
پر تولے۔
بارِ اذکار سے بوجھل بازو
رات کے سایوں پہ پھیلائے ہوئے اڑنے لگی۔
زیست کے کہنہ نہاں خانوں سے
(عنکبوت اپنے جہاں جال بنا کرتے ہیں)
آج آزاد ہوئی۔ بادِ فنا کی رَو میں
حشر تک بہنے پہ آمادہ ہوئی۔

عنکبوتوں کے لپٹتے ہوئے تاروں کے جال
ایک لمحے کے لئے ٹوٹ گئے۔ اس کے گذر جانے پر
پھر وہی جال، وہی صید، مگر
رات کے سایوں پہ پھیلے ہوئے طائر کی جلو میں اب بھی
تار لہراتے ہوئے جاتے ہیں۔

محمد صفدر

کل

روح کُش وہم وگماں، صبر شکن اندیشے
راستے میں مرے فولاد کی دیواریں تھے
تُو نہیں جانتی ہیں کتنے بکھیڑوں کے بعد
تیرے پاس آیا تھا وعدے کا سہارا لے کر
ہاتھ سینے پہ مرے رکھ کے جو دیکھا ہوتا
تجھے ہو جاتا مرے شوق کا کچھ اندازہ
سمِ قاتل میں بجھا تیر ہے یہ تیرا جواب
"جاؤ، ضد چھوڑ بھی دو، دق نہ کرو، کل ہاں کل"
سنتے ہی "کل" کا جفا کار، ستم پیشہ لفظ
خودکُشی کرلی ہے مچلے ہوئے ارمانوں نے
وہی دیواریں جنہیں توڑ کر آیا تھا میں
میرے رستے میں دوبارہ ہوئی جاتی ہیں بلند
مجھ میں اب ان کو گرانے کی بھلا تاب کہاں

کتنا دل سوز ہے یہ "کل" کا ستم پیشہ لفظ

خوف میں ڈھلتا ہوا وہم وگماں سے لبریز
سوچ تو آج بھی کل ہی تھا کوئی دم پہلے
کل کے اس دیو ستمگر کو تجھے کیا معلوم
کس طرح آج میں تبدیل کیا تھا میں نے
دیکھ یہ کل کا جفا کار، ستم پیشہ لفظ
کتنے آلام و مصائب کی جہاں میں ہے اساس
جھوٹ، اوہام، ریا، حرص، کفایت، لالچ
یہی کیا، ایسے کئی اور بھی افعال شنیع
کل کے خوف اور توہم نے کئے ہیں پیدا
یہ حسیں خاک کی دنیا یہ فلک بوس محل
کل کی آفات ہی سے بچنے کی ساماں تو ہیں
اپنے پاس ایسا مری جاں کوئی ساماں نہیں!
کل پہ کیوں چھوڑ دیں پھر آج کا لطف اور سرور

مخمور جالندھری

تہذیب و تمدّن

اصل میں انسان ویسا نہ تھا، جیسا کہ وہ اب ہے۔ لاکھوں برس، یا اس سے بھی زیادہ زمانہ گزرا کہ وہ اس زمین پر سب سے پہلے نمودار ہوا۔ اس وقت وہ ہر لحاظ سے مختلف تھا۔ اس وقت اس کی نگاہ مختلف تھی، اس کی بول چال مختلف تھی، اس کی عادتیں مختلف تھیں، اس کے مقاصد مختلف تھے، اس وقت وہ جنگلوں میں درختوں پر رہتا تھا۔ درختوں ہی پر وہ رینگتا تھا، چھپتا تھا، چڑھتا تھا، شکار کرتا تھا، لڑتا تھا اور سوتا تھا۔ مدتوں کے بعد وہ زمین پر اترا اور یہیں رہنے سہنے لگا۔ اب پناہ کے لئے وہ غاروں کی طرف رینگتا تھا۔ اب اس نے گوشت پھاڑنا اور کھانا شروع کیا، اور وہ سیدھا کھڑا ہونے لگا۔

جن حیوانات اور جاندار اور رینگنے والی چیزوں پر وہ غلبہ پاسکتا تھا، اُن کا وہ شکار کرتا تھا۔ چنانچہ کنکھجورے، مینڈک، مچھلی، سانپ، ٹڈے، پرندے، کتے، اور چھپکلی، اور دوسرے جاندار اس کی خوراک بننے لگے۔ اسی طرح صدیاں اور قرنیں گزر گئیں اب وہ وحشی ہی تھا، اور بن باسیوں کی طرح وہ بھی شہوت پرست بسیار خور، شکار پیشہ، تندمزاج، اور قاتل تھا۔ وہ آوارہ پھرتا تھا، چوری کرتا تھا، لڑتا تھا، ظلم کرتا تھا، مرتا تھا اور مارتا تھا۔ آگ کا اس کو کچھ علم نہ تھا۔ صدیاں گزرتی چلی گئیں اور یہ پہلا انسان پہاڑوں کے نمناک غاروں میں سردی سے کانپتا رہا۔ آخر ایک دن جنگل میں بجلی گری، جس سے سوکھے پتے جل اٹھے۔ یہ لوگ اور ان کے اور انسان نما بندر ساتھی، اس آگ کے ارد گرد جمع ہوئے۔ اور حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ جب وہ سب اس آگ کے ارد گرد بیٹھ گئے، تو ان میں اور بندروں میں کوئی فرق نہ رہا۔

انہوں نے آگ کو چھوا۔ اور اس کی گرمی کو محسوس کیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد آگ بجھ گئی، اور کئی صدیوں بعد بندروں اور آدمیوں کے ایک اور مجمع نے ایک اور آگ سے اپنے آپ کو گرم کیا لیکن پہلی آگ کی طرح یہ دوسری آگ بھی جلد ہی بجھ گئی، اور پھر اس پر صدیاں گزر گئیں۔ اس کے بعد بہت سی آگیں لگیں اور بجھیں۔ انسانوں اور بندروں میں سے کسی کے بھی سمجھ میں نہ آیا کہ اس آگ کو محفوظ کیوں کر کیا جائے۔ جیسے حیوانات مرتے تھے۔ اسی طرح یہ آگیں بھی ٹھنڈی ہوتی تھیں۔ آخر کار ایک اور آگ لگی۔ بندر اور بہت سے انسان تھوڑی دیر اس کو دیکھتے رہے، اور منہ بناتے رہے، اس کے بعد وہ بھاگ گئے اور کیلے کے درختوں کو جھکا جھکا کر اپنی خوراک حاصل کرتے رہے۔

لیکن بعض انسان ٹھہرے رہے اور سوچتے رہے۔ وہ کبھی ٹھنڈی ہو جانے والی آگ کو دیکھتے اور کچھ سوچتے۔ ان کی یہ سوچ بچار بھی، اس آگ کی طرح، جلد ہی ٹھنڈی ہونے والی تھی۔ اس کو تو سوچ بچار کہنا بھی شاید مناسب نہیں لیکن آخر کار ایک بندر نما انسان ایک حیرت انگیز خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ اگر اس آگ پر اور سوکھی لکڑیاں ڈال دی جائیں، تو ممکن ہے یہ آگ محفوظ ہو جائے۔ اس نے اُس کی آزمائش کی، اور اس کو کامیابی ہوئی۔ آگ کا یہ انکشاف اس زمانے کا سب سے بڑا انکشاف تھا!

اس کے بعد انسان نے اور ترقی کی۔ اب وہ غاروں سے باہر نکلا، اور جھونپڑیاں بنا کر رہنے لگا۔ اس کے بعد اُس نے مکانات بنائے۔ اب وہ جانور سے وحشی، وحشی سے اکھڑ، اکھڑ سے شکاری، شکاری سے گلہ بان، گلہ بان سے کاشتکار بن گیا، وہ بھیڑیے پالتا تھا اور کتوں کی طرح ان کو ایسا سدھاتا تھا کہ وہ اس کے مصاحب بن جاتے تھے۔ وہ گھوڑے پکڑتا تھا، اور ان کو سدھا کر ان پر بوجھ لادتا تھا۔ اس نے قصبے آباد کئے، شہر بسائے اور سڑکیں بنائیں۔

اس نے پُل بنائے اور مندر کھڑے کر کے دیوتاؤں ۔۔ بہت سے دیوتاؤں کو پوجنے لگا۔

اب اس نے گیت لکھنا اور عشق کرنا شروع کیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں پر حملہ کر کے ان کو قتل و غارت کرنا شروع کیا۔ وہ غارت گری کرتا، عورتوں کو خراب کرتا، آگ لگاتا، لوٹ مار کرتا، اور تباہی لاتا تھا۔ اس نے دوران خون کو دریافت کیا اور فن طباعت ایجاد کیا۔ اس نے بارود، بھاپ، اور بجلی، کو معلوم کیا۔ اب وہ ہزاروں میل سے بیٹھ کر اپنے دوستوں سے بآواز بلند باتیں کر سکتا ہے۔ اس نے بہت اونچے پہاڑوں کے نیچے سرنگ بنائے ہیں، اور بہت گہرے سمندروں کے نیچے سڑکیں تیار کی ہیں۔ اس نے دلدلوں کو سکھا کر زرخیز میدان بنائے ہیں۔ اس نے صحراؤں اور ریگستانوں کو سیراب کر کے لہلہاتے باغ لگائے ہیں۔ اس کی ریلوں کے جال تمام روئے زمین پر پھیلے ہوئے ہیں اور اس کے خوفناک جنگی جہاز سمندروں پر تیرتے پھرتے ہیں۔ اس کے جہاز سمندروں میں اتنے نیچے اترتے ہیں کہ جہاں تک جانے کی ڈیل مچھلی بھی ہمت نہیں کرتی۔ اس کے ہوائی جہاز بلند ترین پہاڑوں کی ان چوٹیوں کی خبر لاتے ہیں، جہاں پہنچ کر عقاب بھی چکرا کر گر پڑتے ہیں۔

اسی کا نام تہذیب و تمدن ہے!

ان ہی باتوں کو انسان اپنے کمالات اور اپنی ترقی کہتا ہے اسی ترقی سے وہ قریب قریب دیوتا بن گیا ہے! اس نے اپنے قدیم ہمسائے، بندر، کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ شمپینزی، گوریلا، اور اورنگ اُٹینگ، اور اس کے اور بھائی بند جہاں تھے، وہیں کے وہیں رہ گئے، لیکن انسان کے ذہن نے حیرت انگیز ترقی کی اب وہ جنگلوں کے جانوروں، پانی کی مچھلیوں اور ہوا کے پرندوں سے بہت آگے ہے۔ اس کے کمالات اور اکتسابات کی کوئی حد معلوم نہیں ہوتی۔

اس کی نگاہ فلک شگاف ہے۔ اس نے ایسے شیشے تیار کئے ہیں، جن کی مدد سے وہ آسمان کے تاروں کو اپنی آنکھوں کے قریب کھینچ کر لا سکتا ہے۔ وہ چاند پر کے پہاڑوں کی اونچائی اور اس کے سب سے زیادہ گہرے غاروں کی گہرائی ناپتا ہے۔ وہ اس کے آتش فشاں پہاڑوں کی تعداد بتاتا ہے، اور ان کے نام گنواتا ہے۔ وہ اس کے سمندروں اور ریگستانوں سے واقف ہے۔ مریخ تو اس کا پڑوسی ہی بن گیا ہے۔ اس نے اس کی نہروں کو دریافت کر کے ان کی پیمائش کی ہے۔ اور اس کے موسموں کو معلوم کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس نے وہاں کے باشندوں کی حرکات و سکنات تک سے واقفیت حاصل کر لی ہے۔ اس نے آسمانوں کے نقشے تیار کئے ہیں، اور دمدار ستاروں کے ٹائم ٹیبل بنائے ہیں۔

اسی کو وہ تہذیب و تمدن کہتا ہے!

اس نے حروف، قوانین اور ادب، ایجاد کئے ہیں۔ اس نے مذاہب فلسفہ کی بنیاد ڈالی ہے۔ ان مذاہب کا مقصد یہ ہے کہ وہ کائنات اور انسان کے مبداؤ معاد کو معلوم کرے لیکن کوئی مذہب بھی اس میں کامیاب نہ ہوا۔ زینو، سقراط، افلاطون، ارسطو، ایپیقورس، اے پکٹٹس، جیسے جید ذہنوں نے ان مذاہب کی بنیاد ڈالی۔ اس نے عقائد تیار کئے اور اوہام اختیار کئے۔ اس نے ایسے ذہنوں کی بنیاد ڈالی، جو ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں۔ ہر دین کا ایک پیغمبر ہے، چنانچہ زرتشت، بدھ، کنفوشس، عیسےٰ، وغیرہ پیغمبر ہیں۔

اسی کو انسان تہذیب و تمدن کہتا ہے!

انسان نے شہر آباد کئے۔ اب ہم ان کو قدیم شہر کہتے ہیں۔ نینوہ، بابل، قرطاجنہ، ٹرائے، وغیرہ ان شہروں کے نام ہیں۔ یہ شہر اپنے اپنے زمانوں میں دنیا کی خلائق کا مرجع تھے۔ یہ شہر بنے اور بگڑے، اور اب لاکھوں من مٹی کے ڈھیروں میں دفن ہیں۔ ان میں سر بفلک عمارتیں تھیں، مندر تھے، برج تھے، قید خانے تھے اور محل تھے۔ ہمارے آج کل کے شہروں کی طرح ان میں بھی دولت ثروت بھی تھی، اور فقر و فاقہ بھی۔ ان میں بھی شاندار صاف ستھرے بازار تھے، پُرتکلف مکانات تھے، اور جھومنے والے باغات تھے۔ ان میں بھی بارونق بالا خانے بھی تھے اور تنگ و تاریک گلیاں بھی شاہانہ محل بھی تھے، اور نمناک کوٹھڑیاں بھی۔ ان شہروں میں بھی مالدا

رنگ رلیاں مناتے تھے، اور غریب کراہتے اور مصیبتیں جھیلتے تھے ان میں بھی جادوگر تھے، نجومی تھے کیمیاگر تھے، اور افیونی اور چانڈو باز تھے ان میں بھی قمار باز تھے، عیاش تھے، دھوکے باز تھے، اور گٹھ کترے تھے۔ ان کا بھی کچھ حصہ زمین کے اوپر تھا، جو پُرغرور، پُرتکلف، شان دار، صاف ستھرا، سلیقے کے ساتھ سجا ہوا، آرام دہ اور پیٹ بھرا تھا، اور کچھ حصہ زمین کے نیچے تھا، جو پست، بدنام، غلیظ، مرضوں کی کان، زبوں حال، جرائم پیشہ، فاقہ مست مصیبت زدہ، اور آبرو باختہ تھا!

اُس زمانے میں انسان اسی کو تہذیب و تمدن کہتا تھا!

اسی انسان نے زمانہ حال کے شہر بھی بسائے ہیں۔ نیویارک لندن، شکاگو، پیرس، برلن، وائنا وغیرہ ان شہروں کے نام ہیں۔ یہ سب تہذیب و تمدن کے عظیم الشان گرداب ہیں۔ ان میں انسانی ذرات حرکت کرتے، چکر کاٹتے، جلدی کرتے، آتے، جاتے، اور غائب ہو جاتے ہیں، ان شہروں میں اس نے فلک شگاف عمارتیں کھڑی کی ہیں۔ ان کی انتہائی بلندی عقاب و شاہین کے گھونسلوں سے بھی پرے ہے۔ ان ہی عمارتوں میں انسان رہتا، سانس لیتا، اور بچے پیدا کرتا ہے۔ ان شہروں اور عمارتوں کے نیچے اس نے سرنگوں کے جال بچھائے ہیں، جو سنگ بستہ ہیں، محراب دار ہیں، روشن ہیں، فراخ ہیں، اور بدبودار ہیں، لاکھوں انسان ان میں اترتے ہیں، اور اپنی منزلِ مقصود کو پہنچا دیے جاتے ہیں۔

انسان نے یہ جدید شہر چوڑے چکلے، کشادہ بنائے ہیں۔ ان میں فراخ سیرگاہیں ہیں، خوش نما، صحت بخش، اور روافزا راستے ہیں۔ لیکن ان میں اندھیرے، گہرے اور زنگ بازار بھی ہیں، جن میں انسان اسی طرح بہتے پھرتے ہیں، جس طرح دو پہاڑیوں کے درمیان سے پانی بہتا اور گزرتا ہے۔ انسان نے ان میں وسیع چمن اور اونچے اونچے بُت بھی لگائے ہیں، چڑیا خانے بھی بنائے ہیں، اور شفاخانے بھی قائم کئے ہیں لیکن ان کے ساتھ ہی اُس نے نم ناک کوٹھڑیوں، تاریک مکانوں، مخرب صحت میدانوں، غریب خانوں، پاگل خانوں، اور قید خانوں کی بھی گنجائش رکھی ہے۔ ان کوٹھڑیوں وغیرہ میں ایسے بچے پیدا ہوتے ہیں، جو عمر بھر نیلا آسمان نہیں دیکھتے، اور تازہ ہوا میں سانس نہیں لیتے۔ ان ہی ایسی مائیں مرجاتی ہیں جنہوں نے کبھی ہرا کھیت نہیں دیکھا، یا جو کھلے میدانوں میں کبھی نہیں چلیں۔

یہی تہذیب و تمدن ہے!

اسی انسان کی اسی ترقی نے ایک اور دنیا بھی بنائی ہے یہ کارخانوں کے نظام کی پروردہ ہے، اور سوسائٹی کی طفیلی ہے۔ یہاں لڑکوں کو چوری کرنا، اور لڑکیوں کو حرام کاری کرنا سکھایا جاتا ہے۔ یہ نشہ خوروں، بدمعاشوں، کٹنیوں، کسبیوں گٹھ کتروں اور قلاشوں کی دنیا ہے۔ یہ اندھیرے میں گھومتے پھرتے ہیں اور موقعہ ملتے ہی ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ یہ گدڑیوں میں سوتے ہیں۔ ان کے جسم اور کپڑے جوؤں سے بھرے ہوتے ہیں، اور ہر قسم کی بدبوؤں کا خزانہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ غلاظت و نجاست تنگ دستی، مصیبت، اور امراض میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

مصیبت زدوں کی یہ دنیا قانون کی گرفت سے باہر ہوتی ہے۔ اس دنیا میں بچوں کے گلے گھونٹے جاتے ہیں، بوڑھوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور مریضوں کی طرف سے بے پروائی کی جاتی ہے۔ کمزوروں پر زبردستی کی جاتی ہے، پاگلوں کو ستایا جاتا ہے، اور جوانوں کو خراب کیا جاتا ہے۔ اس دنیا میں عورتوں کا زچہ خانہ اور ٹھگوں کی جائے پناہ ایک ہی جگہ ہوتے ہیں۔ جس جگہ مریض الموت دم توڑتے ہیں، اور ایڑیاں رگڑتے ہیں، اسی جگہ ڈاکو چلمیں پیتے اور ایک دوسرے کا گلہ گھونٹتے ہیں۔ جہاں بچے کھیلتے ہیں، وہیں کسبیاں دادِ عیش دیتی ہیں۔ اس دنیا میں اختلاف قومیت یا کسی اور امتیاز کا نام تک نہیں۔ سب ایک ہی بولی بولتے ہیں، اور وہ بولی غلیظ ترین ہوتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک چینی ہو یا سفید عورت، ایرانی ہو یا حبشی، خانہ بدوش ہو یا جاپانی، میکسیکو کا ہو یا ملاح، آوارہ گرد فقیر ہو یا روپوش جرم پیشہ، توپچی ہو یا بھک منگا، دھوکے باز ہو یا چور، اپنی اپنی جگہ نواب ہوتا ہے۔

ہر دارالسلطنت میں امارت اور علم و فن اور سامانِ عیش اور فیشن، اور شان و شوکت کی بنیاد ایسے ہی تنگ و تاریک اور

غلیظ غاروں، کوٹھڑیوں، گلیوں، اور قمار خانوں پر ہوتی ہے۔ سوسائٹی، قانون، اخبارات، اور منبر ادھر کی عمارت ہی کو دیکھ کر انسانی اکتساب کمال پر ناز کرتے ہیں۔ سوسائٹی کا جو حصہ ان کو نظر آتا ہے، اسی کو وہ بہترین کہتے ہیں۔ فخر کرتے وقت وہ گنجان آبادیوں، کارخانے میں کام کرنے والوں کی کوٹھڑیوں، اور نچلی دنیا کو بھول جاتے ہیں، یا دیدہ و دانستہ بھلا دیتے ہیں۔ اس وقت مصیبت زدہ، کمتر، آفت رسیدہ، جرم پیشہ، زندگی سے مایوس زبوں حال اور ازکار رفتہ، لوگ ان کو نظر نہیں آتے۔ وہ انسانی شبستانوں کے اُن وسیع رقبوں کو بھول جاتے ہیں، جہاں چوہے کُترتے ہیں، بلیاں غراتی ہیں، کیڑے رینگتے ہیں، مرض پرورش پاتے ہیں۔ وہ مصیبت زدہ لوگوں کے مقامات کی طرف سے آنکھیں بند کرکے انسانی کمالات پر آفرین و تحسین کے نعرے لگاتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ تہذیب و تمدن کے مجموعے میں یہ بھی شامل ہیں، کیونکہ تہذیب نام ہے مجموعے کا، نہ کہ اس مجموعے کے بہترین حصے کا۔

بعض اوقات تو میں سوچا کرتا ہوں کہ جب ستارہ مشتری کے دیو ہیکل باشندے اپنی دیو ہیکل دوربینوں سے ہماری چھوٹی سی زمین کی طرف دیکھتے ہوں گے، تو وہ کیا کہتے ہوں گے، ہو سکتا ہے کہ ان کو ہماری حقیر کوششوں ہمارے چھوٹے چھوٹے شہروں اور ہماری عجیب و غریب عادتوں کو دیکھ کر ہنسی آتی ہو بالکل اس طرح جس طرح چیونٹیوں کی عادتوں اور ان کے شہروں کو دیکھ ہمیں ہنسی آیا کرتی ہے۔ اگر دوسرے ستاروں کے باشندوں، مثلاً مریخ کے آدمیوں اور مشتری کے دیوؤں نے اتنی قوی دوربینیں بنالی ہیں کہ وہ وہاں سے بیٹھ کر ہماری سیر کر سکتے ہیں، تو ان کو ہمارے فن جنگ پر تو ضرور ہنسی آتی ہوگی، ان کے ماہرین فلکیات کو یقیناً اچنبھا ہوگا کہ ہماری جنگ عظیم آخر ہوئی کیوں؟ ممکن ہے کہ انہوں نے اس کو ایک بہت بڑا بین الاقوامی کھیل یا مشغلہ سمجھا ہو۔ لیکن اس جنگی کھیل نے ان ستاروں والوں کو پریشان تو ضرور رکھا ہوگا۔

انہوں نے دیکھا ہوگا کہ مہذب دنیا (وحشی اور جنگلی دنیا نہیں!) کے ہر کونے سے لوگ آآ کر زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر جمع ہو رہے ہیں۔ انہوں نے گہری چوڑی اور نمناک خندقیں کھودی ہیں، اور ان میں برسوں رہنے کے لئے اترے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے پُر تکلف اور آرام دہ مکانات اور خوشگوار ماحول کو چھوڑا، اپنے بیوی بچوں اور ماں باپوں کو چھوڑا، اور ان خندقوں کی دلدلوں، بدبوؤں، ان کے کیڑے مکوڑوں، اور ان حبس پیدا کرنے والی ہواؤں میں رہنا قبول کیا۔ یہاں ان پر مرضوں نے حملہ کیا، جوؤں نے ان کی کھالوں کو چھلنی کیا، چوہوں نے ان کے جسموں پر قلابازیاں کھائیں، اور مرنے کے بعد ان کے چہروں کو نوچا۔ لیکن بایں ہمہ وہ یہاں پڑے رہے۔ دور ستارے والوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

ان ستاروں کے باشندوں نے اپنی دیو ہیکل دوربینوں سے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ خندق میں رہنے والے ان انسانوں نے اپنے چہروں پر کبھی کبھی عجیب و غریب شکل کے ٹوپ چڑھائے۔ بہت عرصے تک تو یہ نظارہ ان ستارے والوں کی سمجھ میں نہ آیا ہوگا۔ لیکن بعد میں ان کو معلوم ہوا ہوگا کہ بعض اور خندقوں میں رہنے والے زہریلی گیسیں چھوڑ رہے ہیں۔ یہ گیسیں آکر ان خندقوں میں جمع ہو جاتی ہیں۔ ان کی وجہ سے تندرست نوجوان آدمی دم گھٹ کر مر جاتے ہیں، جل جاتے ہیں، اور دیوانے ہو جاتے ہیں مریخ کے آدمی اور مشتری کے دیو اس کو سمجھ سکے ہوں گے،

ہوائی جہاز اور سینکڑوں میل مار کرنے والی توپیں نہتوں اور بے گناہوں پر بمب اور گولوں کی بارش کرتی ہیں، جنگ کے بیشمار طریقے اور اس کی تمام تباہ کاریاں ان ستاروں کے باشندوں کے لئے معمہ تھیں۔ جنگ کی تباہی، مصیبت، دہشت، ظلم، کشت و خون، شکستہ امیدیں، شور و غل، خواب و خیال میں نہ آنے والے تشدد، اس کی وجہ سے لگائے جانے والے ٹیکس اس کے کشتگان، لنگڑے لولے، اندھے بہرے، بیوہ اور یتیم، بمب اور مورچے، ملبے کے ڈھیر، ملبے کے نیچے دبے ہوئے لوگوں کی چیخ پکار، رات کے وقت میدان جنگ کا سماں، خوفناک صورت مُردوں کے انبار، دم توڑنے والے زخمیوں کے آہ و نالے، ایڑیاں رگڑنے والے انسان، سبزہ آغاز نوجوانوں کا دم توڑنا، پیاسوں

کی باہر نکلی ہوئی زبانیں، پانی کی ہر طرف مانگ، چوہوں سے ان کی کشمکش ہذیان میں معشوقاؤں اور ماؤں کی یاد، خاردار تاروں میں اُلجھے ہوئے زخمیوں کی تڑپ، مایوسی کی حالت میں ستارہ شماری، اُن کے اکھڑے ہوئے سانسوں کی دل دہلا دینے والی آوازیں اور ان کی آخری ہچکیاں موت و زیست کی آخری کشمکش اور بالآخر موت کی جیت۔ مریخ اور مشتری والوں نے یہ سب دیکھا، لیکن وہ سمجھ کچھ بھی نہ سکے!

انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ میدان جنگ کے دونوں طرف عقل مند، سنجیدہ، لکھے پڑھے، اور تجربہ کار لوگ (جن کو مدبرین کہتے ہیں) پارلیمنٹ اور اسمبلی میں کھڑے ہوئے، اور بہ کمال متانت اعلان کیا کہ کشت و خون کا یہ خوف ناک بازار گرم ہی رہنا چاہئے۔ چنانچہ برسوں یہ گرم ہی رہا، اور نسل انسانی کی بہبودی کے لئے گرم رہا! یہ قصابیت، یہ بربریت، اور دیوانگی کا یہ وحشیانہ مظاہرہ انسانی نسل کی فلاح کے لئے جاری رہا! یہ تمام تماشا بھی ان ستارے والوں کی فہم و ادراک سے باہر ہی رہا!!

اب سوال یہ ہے کہ کیا تہذیب و تمدن کوئی اچھی چیز ہے؟ کیا یہ اس قابل ہے کہ اس کے لئے کوشش کی جائے؟ کیا تہذیب و تمدن بربریت سے بہتر ہے؟ یہ تمام سوالات پریشان کن ہیں۔ ہر شخص ان کا جواب اثبات میں دے گا لیکن بعض اوقات مجھے اس اثبات میں شبہ ہونے لگتا ہے۔ تہذیب و تمدن کا واحد مقصد یہ ہے کہ انسان خوشی حاصل کرے۔ یعنی وحشی کے مقابلے میں زیادہ خوشی حاصل کرے۔ اگر یہ حاصل نہ ہوئی تو تہذیب و تمدن ناکام ہے تو کیا فی الواقع اس سے زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہے؟ معاشرتی ارتقا کے سب سے اونچے درجے سے نیچے کی طرف اترتے آؤ اور دیکھو کہ نچلے درجے کے جتنے قریب تم آتے جاتے ہو، اُتنی ہی زیادہ مسرت تم محسوس کرتے جاتے ہو۔ معمولی تاجر کارخانے کے مالک سے زیادہ خوش رہتا ہے۔ متوسط درجے کا شخص لکھ پتی سے زیادہ مطمئن اور مسرور رہتا ہے۔ چھوٹے سے شہر کا گمنام افسر بڑے مدبر سے زیادہ خوش رہتا ہے۔ جاہل کاشتکار زمینداروں کے مقابلے میں زیادہ خوش رہتا ہے، اور میرا خیال ہے کہ وحشی کاشتکار کے مقابلے میں زیادہ خوش رہتا ہے۔

وحشی شخص مہذب شخص کے مقابلے میں زندگی سے شاید زیادہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے میدان میں چھلانگیں مارتا پھرتا ہے اور اپنے شباب کی رنگینیوں میں مست رہتا ہے لیکن مہذب شہری محنت و مشقت کرتا ہے اور مطالعے میں مصروف رہتا ہے۔ ۲۶ برس کی عمر میں مہذب شہری کی تعلیم ختم ہوتی ہے، اور اس کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس وقت تک وحشی بہت کچھ حاصل کر چکا ہوتا ہے اور بہت کچھ لطف اُٹھا چکا ہوتا ہے۔ گرم ملکوں میں مادر فطرت لڑکیوں کو شادی کے قابل بنا دیتی ہے۔ یہ لڑکی مادر فطرت کی حکم برداری کرتی ہے، اور جوان بیوی بن کر تمام لذتوں سے آشنا ہو چکتی ہے۔ تیرہ برس کی عمر میں وہ ماں بن کر مادری لذتوں سے لطف اندوز ہو جاتی ہے۔ سترہ برس کی عمر میں وحشی لڑکا مردوں کے مقابلے میں آ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ مرد بن کر خود اپنا مالک بن جاتا ہے۔ وہ آزادی کے معنوں سے واقف ہوتا ہے، کیونکہ وہ قید میں کبھی رہا ہی نہیں۔ رسوم و آداب کی بیڑیاں کبھی اس کے پاؤں میں نہیں پڑتیں۔

وہ جنگلی گھوڑے پر بغیر زین کے سواری کرتا ہے، اور بھینسے سے جا لڑتا ہے۔ وہ بے راہ گھنے جنگلوں میں چیتے کی طرح دبے پاؤں پھرتا ہے۔ موسم بہار میں وہ چشموں کے کنارے پڑا رہتا ہے وہ جنگ کے نعرے بلند کرتا ہے، اور آزادی اور وطن کی خاطر بہادری کے کام کرتا ہے۔ وہ کڑکڑاتی سردی میں شکار کی تلاش میں بن بن پھرتا ہے، اور اپنی خوراک حاصل کرنے کے لئے بھوکے بھیڑیے سے جا لڑتا ہے۔ وہ چلچلاتی گرمی میں اپنی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھ کر دوسروں کو دعوت جنگ دیتا ہے۔

بڑا ہو کر وہ آسمان کی طرف تکتا ہے، اور اس کی پہنائی پر تعجب کرتا ہے۔ اس کو روح برتر کا خیال آتا ہے، لیکن وہ اس کو سمجھ نہیں سکتا۔ لیکن ہمارا شہری فلسفی بھی تو اس کو اب تک نہ سمجھ سکا! وہ ابدیت پر غور کرتا ہے۔ لیکن اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ کون حل کر سکتا ہے؟! وہ سوچتا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی اور زندگی ہے یا نہیں، لیکن معلوم نہیں کر سکتا — اور دینیات کے علما بھی اس کو کب معلوم کر سکتے ہیں؟!

وہ سوال کرتا ہے کہ کائنات کس طرح پیدا ہوئی، لیکن کوئی جواب نہیں دیتا ـــ ہم کو بھی تو اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا! وہ موت سے خوف کھاتا ہے۔ لیکن مہذب انسان بھی اس سے اسی طرح خوف کھاتے ہیں! وہ اپنی زندگی بسر کرتا ہے اپنی نسل چلاتا ہے، اور آخر کار مرنے کے لئے لیٹ جاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ ہم سب بھی یہی کرتے ہیں! کون کہہ سکتا ہے کہ ہم اس سے کسی لحاظ سے بہتر ہیں؟

اب اگر تہذیب و تمدن اس زندگی میں ہم کو زیادہ مسرور یا مرتے وقت بہتر نہیں بنا سکتے، تو پھر آخر ان کی قیمت کیا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے؟!

معتضد ولی الرحمٰن

قطعات

(۱)

کہیں شعلہ کہیں سیلِ رواں دل
کہیں اک لذتِ دردِ نہاں دل
کہیں اک کوندتی بجلی کی تصویر
کہیں اک زخم کا باقی نشاں دل

(۲)

چھلک پڑتے ہیں جوشِ سرخوشی سے
بہت غم ہو تو جل جاتے ہیں آنسو
اکیلے میں نہ جانے کیوں اے محسنؔ
کبھی یونہیں نکل آتے ہیں آنسو

(۳)

وہ حُسنِ یار کا اک پیارا پہلا تخفہ
جسے اک "نامِ صد حسرت" کہا ہے
وہ اک بوسہ بہ ربِّ کعبہ اے دوست
وہ دل پر داغ بن کر رہ گیا ہے

(۴)

محبت نورِ چشمِ زندگانی
محبت دردِ پہلوئے جوانی
وہی گستاخیِ دستِ زلیخا
وہی دامانِ یوسف کی کہانی

مُحسن انصاری

ساتھی

پھول کی خوشبو ہنستی آئی! میرے بسیرے کو مہکانے
میں خوشبو میں، خوشبو مجھ میں اُس کو میں جانوں، مجھ کو وہ جانے!
مجھ سے چھُو کر مجھ میں بس کر اس کی بہاریں، اس کے زمانے!

ان کے جھکولے میری آہیں ان کی نوائیں میرے ترانے،
باقی سارے طوفانوں کو جذب کیا ہے اپنی فضا نے

لاکھوں پھولوں کی مہکاریں رکھتے ہیں گلشن، ویرانے
مجھ سے الگ ہیں مجھ سے جدا ہیں میں بیگانہ، او وہ بیگانے!
ان کو بکھیرا، ان کو اڑایا، دستِ خزاں نے، موجِ صبا نے!

فطرت کی یہ گوناگونی، گلشن، بن، وادی، ویرانے
کانٹے کلیاں، نور اندھیرا، انجمنیں، شمعیں، پروانے
لاکھوں شاطر، لاکھوں مہرے پھیلے ہیں شطرنج کے خانے
جانتا ہوں میں یہ سب کیا ہیں صہبا سے خالی پیمانے
بھس کی مٹی کو سونپے ہیں دنیا نے اپنے نذرانے

بھولا، بھٹکا، ناداں قطرہ آنکھوں کی پتلی کو سجانے
آنسو بن کر دوڑا آیا میری پلکیں اس کے ٹھکانے
اس کا تھرکنا، اس کا تڑپنا، میرے قصے، میرے فسانے!
اس کی ہستی، میری ہستی اس کے موتی، میرے خزانے
باقی سارے گوہر پارے، خاک کے ذرے ریت کے دانے

جس نے میرا دامن تھاما آیا جو مجھ میں بس جانے،
میرے طوفانوں میں بہنے میری موجوں میں لہرانے
میرے سوزِ دل کی لَو سے اپنے من کی جوت جگانے
زیست کی پہنائی میں پھیلے موت کی گیرائی کو نہ جانے
اس کا بربط، میرے نغمے، اس کے گیسو، میرے شانے!
میری نظریں، اس کی دنیا، میری سانسیں اس کے زمانے

پربت کی اونچی چوٹی سے دامن پھیلایا جو گھٹا نے،
ٹھنڈی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے بے خود، آوارہ، مستانے،
اپنی ٹھنڈک لے کر آئے مری آگ میں گھل مل جانے
اُن کی ہستی کا پیراہن میری سانس کے تانے بانے

مجید امجد بی۔اے (علیگ)

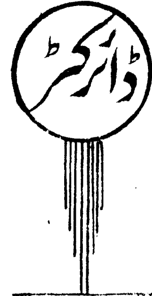
دل نواز موسیقی



روح پرور رقص

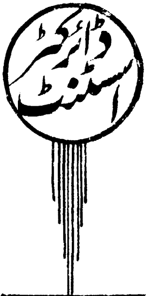
دنیا ایک کہانی ہے
اور
یاد بھی ایک کہانی ہے

ایشیاٹک پکچرز کی انمول پیشکش



مظہر خاں





اسلم نوری

وہ فلم جس کی یاد آپ کو برسوں تڑپائے گی



شمالی ہند کے ایجنٹ

سکسینہ اینڈ کمپنی۔ دہلی۔ لاہور

ایشیاٹک پکچرز زمین روڈ۔ دادر۔ بمبئی نمبر ۱۴

نیشنل لیبارٹریز لاہور کی شہرت اب پنجاب سے نکل کر ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئی ہے

کیونکہ اس کی بنائی ہوئی تمام چیزیں اپنی عمدگی اور قیمت کی کفایت کے لحاظ سے ولائتی اشیا کو مات کرتی ہیں

نیشنل لیبارٹریز کے اوڈیج اور لیمن سکواش عرقیات عطر سینٹ تیل کریم اور اینٹی سپٹال سوپ اپنے مقابلے کے ولائتی مصنوعات سے ہزار درجہ بہتر اور قیمت میں بھی بکفایت ہیں یہی وجہ ہے کہ تمام معقول دکاندار اس کا سٹاک رکھتے ہیں اور اپنے گاہکوں کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں

شاعروں کا مقولہ توڑ دیا گیا سے درد سر کے واسطے کہتے ہیں صندل ہے مفید۔
اس کا گھسنا اور لگانا درد سر یہ بھی تو ہے۔

صندل آئیل جس کے استعمال سے دائمی درد سر دور ہو جاتا ہے۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے بے نظیر تحفہ ہے۔

مونا سنو پمہ جلال بادشاہ سے لے کر بے خاماں گدا گر تک خوبصورتی کا خواہشمند ہے۔ اس کے چند روزہ استعمال سے کیل چھائیاں جھریاں اور ہر قسم کے داغ دور ہو جائیں گے اور چہرہ چاند کی مانند نکل آئے گا۔ ایک دفعہ ضرور استعمال کریں۔

سول ایجنٹ

بیلی رام اینڈ برادرز سوداگران ادویات انارکلی۔ لاہور



ڈونگرے کا بال امرت

کے استعمال سے
بچے طاقتور اور چنگے بنتے ہیں
یہ مشہور دوا ہے

ضرورت ہے

اور

اس قدر ضرورت کہ سکول فار الیکٹریشنز لدھیانہ کے اکثر ہوشیار طلبہ کو دورانِ تعلیم میں ہی سرکاری ملازمتیں مل جاتی ہیں سکول گورنمنٹ ایڈڈ ہے اور ایگزامنرز ڈاور جلد روزگار حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ لہذا بجلی کا کام سیکھنے والے طلبہ جلد درخواستیں بھیجیں۔

پراسپکٹس مفت

مینجر

عاشق حسین بٹالوی کی دو تازہ تالیفات

مشرق و مغرب کے افسانے

اس مجموعے میں انگلستان، امریکہ، جرمنی، روس، فرانس، اٹلی، ڈنمارک، ناروے، سویڈن، ترکی، جاپان، چین، ایران، افغانستان، عرب، مصر اور ہندوستان کے بہترین ادیبوں کے لکھے ہوئے افسانوں کے اردو تراجم شامل ہیں۔ ہر افسانہ ایک شاہکار ہے۔ افسانہ نویسی کے شائقین کے لئے یہ کتاب ایک رہنما کا کام دے گی $\frac{20 \times 30}{16}$ سائز کے چھ سو صفحات قیمت تین روپے۔ (زیر طبع)

اقبال کی شخصیّت اور شاعری

علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری اور اُن کے فلسفۂ زندگی پر بلند پایہ مقالات کا مجموعہ۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت اور ان کے حیات افروز پیغام پر مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ علامہ مرحوم کے معارف و حقائق سے لبریز کلام کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بے حد ضروری ہے قیمت دو روپے ۸ (زیر طبع)

مینیجر کتب خانہ ادبی دنیا مال روڈ لاہور

خوبصورتی کے لئے ایک اشارہ

AFGHAN SNOW

خوبصورتی کا راز

حسین چہرے سے بڑھ کر اور کوئی چیز زیادہ جاذب نظر نہیں افغان سنو کا استعمال اسے اور بھی حسین بنا دیتا ہے یہ مشہور عالم خوبصورتی بڑھانے والی سنو جلد کو سورج کی تپش ہوا اور گرد سے محفوظ رکھتی ہے





سول ڈسٹری بیوٹرز:- پاٹن والا لمیٹڈ بمبئی نمبر ۳



جانیئے میرے دوست
سِروَلین ’روشے‘
استعمال کیجئے!
فوراً سروَلین روشے کا
استعمال شروع کر دیجئے
کھانسی اور زکام سے نجات
حاصل کیجئے
سِروَلین ’روشے‘
کھانسی اور زکام کو دفع کرتی ہے۔

دنیائے ادب

ڈاکٹر گراہم بیلی

جون ۱۹۳۹ء میں لندن یونیورسٹی نے مجھے اُردو کا لکچرار مقرر کیا۔ اور اس کے چند دن بعد ہندوستان ہی میں مجھے ایک دن ڈاکٹر گراہم بیلی کا خط ملا۔ ڈاکٹر بیلی نے یہ خط مجھے لندن سے لکھا تھا اور میرے تقرر پر مجھے مبارکباد دی تھی۔ اس سے پہلے میں نے ان کا نام تو ضرور سُنا تھا۔ اور مجھے یہ معلوم تھا کہ لندن میں مجھے ان کے ماتحت کام کرنا پڑے گا۔ مگر سچ پوچھئے تو میں اپنے دل میں یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ جس طرح عام طور سے انگریز ہندوستانی زبان کی دو چار کتابیں پڑھ کر ٹوٹی پھوٹی اُردو لکھ پڑھ لیتے ہیں اور دو چار غلط سلط جملے بول لیتے ہیں، یہی حال ڈاکٹر بیلی کا بھی ہوگا۔ لیکن ان کے خط نے مجھے چونکا دیا۔ یہ خط آج بھی میرے سامنے رکھا ہے اور اب بھی جب کبھی میں یہ خط دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی پہلی رائے پر شرم آتی ہے۔ انہوں نے مجھے خط تو انگریزی میں لکھا تھا۔ مگر اس میں دو چار باتیں ایسے پتے کی تھیں کہ انہیں پڑھتے ہی میری آنکھیں کھُل گئیں اور ڈاکٹر بیلی کے متعلق مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا۔

"جب آپ لندن آئیں گے تو میں آپ سے ہندی اور اردو گرامر کے چند قاعدوں کے بارے میں بحث کروں گا۔ بہت سی ایسی باتیں ہیں کہ ان کے متعلق اب تک کوئی عام قاعدہ نہیں بن سکا مثلاً "کو" علامت مفعول ہے۔ مگر کبھی "کو" استعمال کرتے ہیں اور کبھی نہیں کرتے بعض لفظوں کے ساتھ "کو" کبھی استعمال نہیں کیا جاتا۔ جھوٹ بولنا۔ مار کھانا۔ بے عزت کرنا تو سب بولتے ہیں لیکن جھوٹ کو بولنا۔ مار کو کھانا۔ بے عزتی کو کرنا کبھی نہیں سُنا اس کی کیا وجہ ہے اور غیر زبان داں کس قاعدے پر چل سکتے ہیں!"

اس کے بعد ڈاکٹر بیلی نے ہندوستان ہی میں مجھے اپنے ادبی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ بھیجا اور اس میں سے چند مضمون پڑھنے کی مجھے خاص طور سے ہدایت کی۔ یہ مضمون پڑھ کر میں ان کی زباندانی کا نہیں تو کم سے کم ان کی تحقیق اور ان کے ادبی انہماک کا ضرور قائل ہو گیا۔

اکتوبر ۱۹۳۹ء میں میں لندن پہنچا۔ چونکہ ہمارا کالج لڑائی کی وجہ سے کیمبرج چلا گیا تھا۔ اس لئے میں بھی سیدھا لندن سے کیمبرج پہنچ گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر بیلی ابھی تک کیمبرج نہیں آئے۔ آٹھ دن بعد آئیں گے۔ یہ ایک ہفتہ میں نے بہت بے چینی سے گذارا۔ کیونکہ اُن سے ملاقات کا اشتیاق بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ آخر ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ کل صبح کے دس بجے فلاں کمرے میں میری اُن سے ملاقات ہوگی۔ دوسرے دن وقت سے پہلے ہی کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ ادھر کالج کے گھنٹے نے ٹن ٹن دس بجائے اور ادھر کمرے کا دروازہ کھُلا۔ نکلتا ہوا قد، بھرا ہوا جسم، سُرخ و سفید چہرہ، سفید بڑی بڑی مونچھیں چھوٹے شیشوں کی عینک۔ پرانی وضع کا چھوٹا سخت سفید کالر۔ ساٹھ ستر سال کے قریب عمر۔ گلے میں گیس کی ٹوپی کا بکس، ہاتھ میں موٹی سی لکڑی۔ ایک نظر میں اُن کا یہ حُلیہ میرے ذہن میں اتر گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ٹوپی اتاری اور میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے انگریزی میں گڈ مارننگ کہا۔ مگر میرے سلام کا جواب انہوں نے نہایت صاف اردو زبان میں دیا۔ ان کا پہلا جملہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ "آخر آپ ولایت پہنچ گئے ہیں تو سمجھا تھا کہ ہمارے اشرف صاحب

لڑائی کی وجہ سے نہیں آسکیں گے"۔ میرے کانوں کو یقین نہیں آیا میں کیسے مان سکتا تھا کہ کیمبرج میں بھی ایسی صحیح زبان سننے میں آسکتی ہے۔ اپنا شک دور کرنے کے لئے میں نے اُن سے کچھ اردو میں کہا۔ اور اس کا جواب ڈاکٹر بیلی نے پھر نہایت بامحاورہ اور صحیح زبان میں دیا۔ پھر تو ہم دونوں آتشدان کے سامنے کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔ اور پہلی ہی ملاقات میں ایسی گھُل کر باتیں ہوئیں جیسے برسوں کی دوستی ہو۔

ایک بات کا اندازہ میں نے چند منٹ میں کر لیا۔ وہ یہ کہ اگرچہ ڈاکٹر بیلی اور مجھ میں تیس چالیس سال کا فرق تھا مگر ان کا برتاؤ مجھ سے بالکل برابر والوں جیسا تھا۔ کوئی ڈھائی تین گھنٹے تک ہم بیٹھے دنیا بھر کی باتیں کرتے رہے بیچ بیچ میں یہ مجھ سے اکثر یہ بھی کہتے جاتے تھے۔ "ابھی آپ نے اس لفظ کا تلفظ یوں ادا کیا ہے میرے ایک شاگرد حیدرآباد دکن سے آئے تھے وہ تو اسے یوں بولتے تھے۔ ایک صاحب یو۔پی کے رہنے والے تھے ان کا تلفظ یہ تھا اور ڈپٹی نذیر احمد کو میں نے یوں بولتے سُنا ہے۔ مجھے اُن کی یادداشت پر بہت تعجب ہوا۔ ایک بجے کے قریب کھانے کا وقت آیا تو جیب سے گھڑی نکال کر بولے۔ اب مجھے اپنے گھر جانا چاہئے۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ ڈاکٹر بیلی کی زبان سے کیمبرج میں "وہ" کا تلفظ سُن کر مجھے ہندوستان یاد آگیا۔ اس کے بعد بھی جب کبھی انہوں نے اپنی بیوی کا ذکر کیا ہمیشہ ان کے متعلق "وہ" کا لفظ ہی استعمال کیا۔

اکثر باتوں میں ڈاکٹر بیلی پر مشرقیت کا اثر بہت غالب تھا۔ اور اردو بولتے وقت تو ہمیشہ سید انشا کا یہ مقولہ یاد رکھتے تھے کہ جو لفظ اردو میں آگیا۔ اس کا تلفظ اردو ہی کے لحاظ سے کرنا چاہئے چنانچہ اپنی گفتگو میں پلیٹ فارم۔ پوسٹ کارڈ۔ اسکول اور اسٹول وغیرہ کے لفظ ہمیشہ ہندوستانیوں کی طرح ادا کرتے تھے۔

ایک سال تک مجھے ڈاکٹر بیلی کے ساتھ کیمبرج میں اردو اور ہندی پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ اور ان سے میں نے ہندی کی دو چار کتابیں بھی پڑھیں۔ گھنٹوں ان سے علمی اور ادبی باتوں پر بحث بھی کی۔ اور ہمیشہ میں نے یہی محسوس کیا کہ ڈاکٹر بیلی کو ہندی اور اردو ادب سے حقیقی معنوں میں دلچسپی تھی۔ یہ زبان کو زبان سمجھ کر پڑھتے تھے اور اس کا لطف بھی اٹھاتے تھے۔ انہیں ہر محاورے کی سند یاد تھی۔ ان کا حافظہ اس غضب کا تھا کہ ہر بات کی سند میں اساتذہ کے شعر یا مستند ادیبوں کے فقرے کے فقرے نقل کر دیتے تھے اور یہ ایسی بات ہے کہ جو بہت کم ہندوستانیوں کو نصیب ہوگی۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ادب پر انہیں پورا عبور حاصل تھا۔ دونوں زبانوں کے مصنفوں اور شاعروں کی تصانیف ان کی نظر میں تھیں اور اب تک جتنی اچھی اچھی کتابیں ہندوستان میں چھپی تھیں یہ انہیں پڑھ چکے تھے۔

ایک سال تک برابر تقریباً ہر روز میری اُن سے دو تین گھنٹے تک ملاقات ہوتی رہی۔ اور ایک بات پر مجھے بے حد تعجب ہوا ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں لڑائی کی حالت بہت نازک ہوگئی۔ فرانس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ہر شخص کی زبان پر جنگ کا ذکر تھا۔ مگر ڈاکٹر بیلی نے مجھ سے لڑائی کا ذکر نہیں کیا۔ جس دن فرانس نے ہتھیار ڈالے ہیں اس روز ان کے چہرے پر ایک حد تک پریشانی کے آثار ضرور تھے۔ مگر ٹھیک دس بجے آن کر انہوں نے پھر وہی تذکیر و تانیث، محاوروں اور افعال پر بحث شروع کر دی۔ اگست ۱۹۴۰ء میں جب لندن پر زبردست بمباری شروع ہوئی تو ایک دن تیسرے پہر یہ مجھ سے ملنے کے لئے بی بی سی میں آئے۔ ایکا ایکی ہوائی حملے کے سائرن بجنے لگے۔ ہم سب پناہ خانے میں چلے گئے۔ دُور سے بموں کی دہشتناک آوازیں چلی آتی تھیں۔ سب لوگ بموں کا ذکر کر رہے تھے۔ مگر ڈاکٹر بیلی نے مجھ سے پوچھا کہ بم گرنے سے کھڑکیوں میں جو آواز پیدا ہوتی ہے اُسے آپ کیا کہتے ہیں میں نے کہا بم کے دھماکے سے کھڑکیاں جھنجھنا اٹھتی ہیں۔ اس کے بعد جب تک ہم پناہ خانے میں بیٹھے رہے یہ برابر زبان کے متعلق ہی مجھ سے باتیں پوچھتے رہے۔

ڈاکٹر بیلی نے آخری زمانے میں اردو پڑھانے کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی۔ اور میں اسے اپنے لئے بہت بڑا فخر سمجھتا ہوں کہ اپنے چالیس پچاس برس کے تجربے کا نچوڑ انہوں نے میرے حوالے کر دیا تاکہ میں اس کی نظرثانی کروں۔ اس کے ایک ایک لفظ کو ہم دونوں

نے بیٹھ کر جانچا۔ ان کے بتائے ہوئے قاعدوں پر بحث کی۔ ان کے جملے کے جملے بدل دیئے۔ کچھ باتوں میں مجھے ان کی رائے سے اتفاق نہیں ہوا۔ اور میں نے صاف صاف اُن سے کہہ بھی دیا۔ مگر انہیں اس بات کا کبھی رنج نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ یہ اپنی غلطی نہایت خندہ پیشانی سے مان لیتے تھے۔ اور میرے نزدیک طالب علم کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ یہ آخر دم تک علم کی تلاش کرتا رہے۔ اور دوسروں سے کوئی نئی بات سیکھنا عار نہ سمجھے۔ اس قدر علم اور فضیلت کے باوجود یہ بچوں کی طرح کھود کھود کر باتیں پوچھتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی اسی جرح سے زبان کے بہت سے نکتے میری سمجھ میں آگئے۔ اور میں نے بہت کچھ ان کے سوالوں سے سیکھ لیا۔

اگست ۱۹۳۵ء میں ۱۵ سال تک لندن یونیورسٹی میں اردو پڑھانے کے بعد ڈاکٹر بیلی نے پنشن لے لی۔ گذشتہ دس پندرہ سال سے سرکار نظام کی طرف سے لندن یونیورسٹی میں نظام ریڈر آف اردو کی تنخواہ ملتی تھی اور اس عہدے پر ڈاکٹر بیلی ممتاز تھے پنشن لینے کے بعد بھی یونیورسٹی نے انہیں اعزازی طور پر اسی عہدے پر قائم رکھا۔ لندن سے یہ اڈنبرا چلے گئے۔ مگر وہاں بھی زبان کا شوق باقی رہا۔ آخر تک میری ان سے خط و کتابت جاری تھی۔ اور ہر خط میں یہ محاورہ، افعال اور رشتوں کے متعلق مجھ سے بہت باریک باریک باتیں پوچھا کرتے تھے۔ مرنے سے چند ہفتے پہلے انہوں نے چار صفحے کے خط میں کوئی سوا ڈیڑھ سو محاورے مجھے لکھ کر بھیجے تھے اور دریافت کیا تھا کہ ان میں کیا کیا فرق ہے۔

میری درخواست پر ڈاکٹر بیلی نے بی بی سی کے لئے چھ تقریریں ہندوستانی زبان میں بند کی تھیں اور خوش قسمتی سے ہم نے اُن کا ریکارڈ بنا لیا تھا۔ یہ سب تقریریں انہوں نے خود لکھی تھیں۔ البتہ کہیں کہیں مجھ سے مشورہ لیا تھا۔ یہ سب تقریریں ہندوستان میں بہت سے لوگوں نے ریڈیو پر سنی ہوں گی۔ اور اندازہ لگا لیا ہوگا کہ زبان پر انہیں کس قدر قدرت تھی۔ عام طور سے انگریز ق، ڑ وغیرہ حروف کا تلفظ نہیں کر سکتے۔ مگر ڈاکٹر بیلی کو میں نے یہ غلطی کرتے کبھی نہیں سُنا۔ چونکہ یہ ایک مدت تک پنجاب میں رہے تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر ان کی زبان پر پنجاب کا اثر تھا۔ اگر پردے کے پیچھے سے یہ بولتے تو سننے والا یہی سمجھتا کہ کوئی پنجابی بیٹھا اردو بول رہا ہے۔ ڈاکٹر بیلی نے مجھ سے خود بیان کیا کہ ایک دفعہ پنجاب کے کسی گاؤں میں یہ جا رہے تھے کہ رات ہو گئی۔ رات کے اندھیرے میں یہ راستہ بھول گئے دور سے روشنی دیکھ کر یہ اس طرف چلے۔ قریب جا کر دیکھا تو چار پانچ پنجابی آگ کے چاروں طرف بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ انہوں نے جا کر پنجابی میں اُن سے راستہ پوچھا۔ رات کے اندھیرے کی وجہ سے وہ انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اس لئے یہی سمجھے کہ کوئی راستہ بھول گیا ہے چنانچہ گاؤں والوں نے انہیں اپنے ہاں رہنے کی دعوت دے دی اور پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے۔ انہوں نے وہیں دُور سے کھڑے کھڑے کہا "بیلی"۔ پنجاب میں عام طور سے بیلی رام نام رکھا جاتا ہے۔ اس لئے گاؤں والے سب بھی انہیں پنجابی سمجھتے رہے۔ ڈاکٹر بیلی کہا کرتے تھے۔ اس بات کا مجھے بہت لطف آیا۔

میں نے انہیں پنجابی بولتے بھی سُنا ہے اور میرا خیال ہے کہ ان جیسی پنجابی شاید ہی کوئی اور غیر پنجابی بول سکتا ہوگا۔ جوانی کے زمانے میں یہ پادری کی حیثیت سے ہندوستان گئے تھے اور ایک مدت تک پنجاب کے علاقے میں سکول میں پڑھاتے رہے چھٹیوں کے زمانے میں ہمیشہ یہ پہاڑوں کا دورہ کرتے تھے۔ اور اس طرح انہوں نے تبتی، نیپالی، کشتواڑی، اور علاقہ دردو کی زبانیں بھی سیکھ لیں۔ فارسی اور سنسکرت سے بھی انہیں شُد بد ہو گئی۔ ان زبانوں کے متعلق انہوں نے سب ملا کر سولہ کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ انگریزی کے اخباروں اور رسالوں میں بھی ہندوستانی زبانوں پر بہت دلچسپ مضمون لکھتے رہتے تھے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے ڈاکٹر گلکرسٹ کے بعد انگریزوں میں ہندوستانی زبان کی خدمت سب سے زیادہ ڈاکٹر گراہم بیلی نے کی ہے خوش قسمتی سے ڈاکٹر گلکرسٹ کو میر امّن، میر شیر علی افسوس، مظہر علی ولا اور للوجی لال جیسے ادیب مددگار کی حیثیت سے مل گئے۔ ڈاکٹر بیلی کو یہ بات نصیب نہیں ہو سکی۔ اس لئے اُن کا نام شاید اردو ادب میں زندہ نہ رہ سکے۔ مگر اتنا میں جانتا ہوں کہ ان کے دم سے لندن یونیورسٹی میں اردو اور ہندی کا نام زندہ تھا۔ اور اب ان کی کرسی ایسی خالی ہوئی ہے کہ اس پر بیٹھنے کے لئے ایسا موزوں شخص مشکل سے ہی ملے گا۔

(ساقی۔ ستمبر بحوالہ بی بی سی)

آغا محمد اشرف

؎ ۱۵ سال صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ ڈاکٹر گراہم بیلی ۱۹۱۹ء تک ہندوستان میں بمقام وزیر آباد مقیم تھے۔ ایڈیٹر

۲

اردو صحافت کا ارتقاء

۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما نے ہندوستان کیا دریافت کیا[1] کہ اس سونے کی چڑیا پر اہل یورپ کی حریصانہ نظریں پڑنے لگیں، کہیں اقتصادی اور معاشی سدھار کے لئے تجارتی تعلقات کے ریشمی پھندے ڈالے گئے، کہیں روحانی اصلاح کے لئے مشنریوں کا جال بچھایا گیا، اس کار خیر میں یورپ کا ہر ملک ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا، اور یہ کشمکش اتنی بڑھی کہ جنگوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ آخر کار برطانیہ اپنی فطری صلاحیت کی وجہ سے دوسری قوموں پر غالب رہی اور ہندوستان کو تہذیب و شائستگی کا سبق پڑھانے لگی اور اُس کے مذہبی اداروں نے چھاپے کی بنیاد ڈالی، اور اب یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں برٹش پریس کے بانیٔ اول مشنری تھے[2]۔

مشنریوں کا سب سے پہلا قدم مدراس میں آیا، اس لئے یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ پہلا تامل ٹائپ ۱۶۷۸ء میں جاری ہوا، اور دوسری کوشش ۱۷۱۰ء میں ٹرانکوبر مشن کے لئے ہوئی، پھر ۱۷۶۱ء میں حکومت مدراس نے ویپری پانڈیچری مشن کو پریس کے استعمال کی اجازت دی[3]، بنگال میں یوں تو انگریز اورنگزیب کی اجازت سے بہت پہلے فورٹ ولیم تعمیر کر چکے تھے، لیکن ابھی ان کے قدم جمے نہیں تھے، اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ۱۷۱۷ء میں انہوں نے فرخ سیر سے گجرات، دکن اور بنگال میں بلا محصول تجارت کرنے کی اجازت حاصل کر لی، ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے نے سلطنت مغلیہ کو ہلا دیا، اس کی مرکزیت ختم ہونے لگی، اور اس کے صوبے آزاد اور خود مختار ہونے لگے، اس وقت بنگال میں علی وردی خاں نواب بن بیٹھا، مرہٹے الگ اپنی طاقت بڑھا رہے تھے۔ اودھ کا تعلق دلی سے برائے نام رہ گیا تھا، ادھر سکھ بھی ہاتھ پاؤں نکال رہے تھے۔ بنگال میں علی وردی خاں کے انتقال کے بعد ۱۷۵۶ء میں سراج الدولہ تخت پر بیٹھا، اس کی اور انگریزوں کی نہ بنی کیونکہ وہ اب تجارت سے ملک گیری کا خواب دیکھنے لگے اور پھر سازشوں کا ایک جال بچھ گیا اور جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء میں بنگال اور جنگ بکسر ۱۷۶۵ء میں دہلی اور اودھ کمپنی کے زیر اثر آ گئے، اور اس کو بنگال بہار، اور اڑیسہ کی دیوانی مل گئی گویا بنگال برطانوی علاقہ ہو گیا، اس کے بعد وہاں ایسی لوٹ مچی کہ وہاں کے تمدن و معاشرت اور صنعت و حرفت کو شدید نقصان پہنچا۔ اس ظلم و ستم کی داستان اتنی عام ہو چکی تھی کہ جب کلائو نے خودکشی کی تو ڈاکٹر جانسن نے اس کے متعلق کہا کہ جس شخص نے اپنی قسمت ایسے جرائم سے بنائی تھی، اس کے ضمیر نے اُسے خودکشی پر مجبور کر دیا" اگر اس وقت کی دلی کا تباہی کا نقشہ دیکھنا ہو تو سودا کا "شہر آشوب" دیکھ لیجئے،

۱۷۷۲ء تک کمپنی نے مدراس، بمبئی اور بنگال کی پریسیڈنسی قائم کر لی اور جنوبی ہند میں بہت بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا، گویا کل کے تاجر اب تاجدار بن بیٹھے، انگلستان کی پارلیمنٹ نے ۱۷۷۳ء میں "ریگولیٹنگ ایکٹ" پاس کیا، اس سے کمپنی پارلیمنٹ کے ماتحت ہو گئی، اور تین پریسیڈنسیاں ایک نظام میں آ گئیں جس پر ایک گورنر جنرل مقرر کیا گیا، اور چار ممبر کونسل، بنگال دار السلطنت اور ہسٹنگز پہلا گورنر جنرل بنا اس زمانے سے

[1] Rise of Christian power. by Basu. [2] Newspaper History James
[3] Encyclopaedia of India Vol IV P. 688.

انگلستان اور ہندوستان کے تمدنی اور معاشرتی تعلقات اور مضبوط ہوئے، اس سے پہلے جو انگریز آتے تھے وہ ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے نہایت پست ہوتے تھے۔

اس دور سے کچھ انسان بھی آنے لگے، چارلس ولکن ۱۷۶۵ء میں ہندوستان آیا، وہ فارسی اور بنگالی ٹائپ کا بانیِ اول تھا[۱]۔ یہ پریس اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں رائج ہوا، یہ بات قابلِ غور ہے کہ ٹائپ لیتھو گرافی کے قبل وجود میں آیا، اس ٹائپ کا استعمال نہ صرف فورٹ ولیم کے سرکاری کاغذات کے لئے ہوتا تھا، بلکہ مولانا سید احمد بریلوی شہید اور مولوی کرامت علی صاحب جونپوری نے اپنی اصلاحی تحریک ۱۸۲۶-۲۷ء کی اشاعت کے لئے بھی اسی سے فائدہ اٹھایا، جب کلکتہ میں پورا استحکام ہوگیا تو سب سے پہلے جیمس آگسٹس ہیکی James Augustus Hicky نے ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء میں بنگال گزٹ نکالا، یہی ہندوستان کا پہلا اخبار کہا جا سکتا ہے، یہ ہیسٹنگز پر خوب حملہ کرتا تھا، اس لئے زیادہ دن زندہ نہ رہ سکا ۱۷۸۰ء سے ۱۸۱۸ء تک ہندوستانی اخباروں پر جو زیادہ تر انگریزی تھے، بہت سی پابندیاں عاید کر دی گئی تھیں۔ عبدالرزاق صاحب نے پنڈت کیفی پر اعتراضات کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سب سے پہلا اخبار ۱۷۸۱ء میں شائع ہونا بتایا گیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے، گورنمنٹ ہند نے فتحِ دلی کے بعد یہ ضروری سمجھا تھا کہ سرکاری کاروبار کی اطلاع اہلِ ہند کو دی جانی چاہئیے، یہ ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں پر اخبارات سختی کے ساتھ نکتہ چینی کرتے تھے اور وہ اُن کو بعض اوقات جلاوطن کر دیتی تھی، اس لئے اوّل اوّل بعض احکام کی سرکاری تحریرات کے ذریعہ اطلاعیں دی گئیں، بالآخر ۱۷۸۴ء میں انڈین ڈیلی میل ۱۸۳۱ء[۲]" معلوم نہیں، فتح دہلی سے کون فتح مراد ہے، میرا خیال ہے کہ موصوف کو غلط فہمی ہوئی، اس کی مزید تشریح کی ضرورت تھی، اٹھارھویں صدی کے آخر میں انگریزی کے بہت سے اخبار نکلنے لگے تھے، مثلاً کلکتہ گزٹ، اورئینٹل ایڈورٹائزر، لیکن ۱۷۸۰ء کے قبل کسی اخبار کا وجود ثابت نہیں[۳]۔ انڈین گزٹ ضرور ایک اخبار تھا جو بعد میں شائع ہوا۔

۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج میں پریس کھل گیا، اور یہاں سے ڈاکٹر گلکرسٹ اور کالج کے منشیوں کی تصانیف شائع ہونے لگیں، اسی زمانے میں سیرام پور کے پادریوں نے بھی ایک مطبع کھولا جس میں مختلف ہندوستانی زبانوں میں کتابیں چھپتی تھیں، یہ وہ وقت تھا جب ولزلی گورنر جنرل تھا، اور ابھی تک ہندو مسلم تعلقات بہت خوشگوار تھے، ان کے لباس اور طرزِ معاشرت میں بڑی حد تک یکسانیت تھی، سراج الدولہ اور مہاراجہ نبیب کشن کا لباس ملائیے تو کوئی فرق نظر نہ آئے گا، تعلیمیافتہ لوگوں کی زبان فارسی تھی، جس کو ہندو مسلمان دونوں سیکھتے تھے، اسی لئے جب شاہ عالم نے کلایو کو بنگال کی دیوانی عطا کی تو یہ شرط بھی رکھی تھی کہ سرکاری زبان فارسی رہے گی، اس کا اثر یہ ہوا کہ جتنے اخبارات نکلے سب فارسی زبان میں، سب سے قدیم فارسی اخبار جامِ جہاں نما ہے، جو غالباً مئی ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے نکلا تھا۔ سیرام پور سے ایک بنگالی اخبار سماچار درپن ۱۸۱۱ء میں پہلے ہی نکل چکا تھا، فارسی کا یہ پہلا اخبار تھا، ۱۸۲۳ء میں ایک اردو ضمیمہ بھی شائع کرنے لگا تھا، لیکن یہ ضمیمہ مقبول نہ ہو سکا، اس کے بعد بہت سے فارسی اخبارات جاری ہوئے، آئینہ سکندر ۱۸۳۱ء سلطان الاخبار ۱۸۳۵ء میں، اس کے ایڈیٹر اردو کے مشہور انشا پرداز رجب علی سرور تھے، سراج الاخبار[۴] ۱۸۴۱ء یہ مغل دربار کا کورٹ گزٹ تھا، اور بہادر شاہ کے زیرِ سرپرستی دلی سے نکلتا تھا، اور بھی بہت سے اخبار نکلے جن کی تفصیل غیر ضروری ہے۔

۱۸۰۳ء ہندوستان کی تاریخ میں بہت اہم ہے، کیونکہ اسی سال لارڈ لیک نے دلی پر قبضہ کر لیا، اور مرہٹوں کا اقتدار ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، شاہ عالم مرہٹوں کے بجائے انگریزوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن گیا، گویا سلطنت مغلیہ کی راجدھانی بھی بدیسی ہاتھوں میں چلی گئی اور قدیم و پُرعظمت ہندوستانی معاشرت کے

---

[۱] Cultural History of India ۔ [۲] رسالہ اردو ۱۹۳۵ء [۳] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، [۴] انسائیکلوپیڈیا آف انڈیا نیو ہیپر ہسٹری مسٹر لینن ہسٹوریکل جرنل میں ایک مضمون بعنوان Press after mutiny وغیرہ کی تحقیق یہی ہے کہ بنگال گزٹ پہلا اخبار ہے۔

مرکز میں بھی گھن لگ گیا، گو شاہ عالم ۱۸۰۶ء تک زندہ رہا، اور اکبر ثانی ۳۷-۱۸۰۶ء اور بہادر شاہ ۵۷-۱۸۳۷ء تک بادشاہ کہلائے، لیکن ان کی حقیقت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی، اس وقت کی عجیب ذہنی کشمکش کا ہلکا سا عکس مولوی نذیر احمد صاحب کی کتاب ابن الوقت میں نظر آتا ہے، سیاسی اقتدار کے بعد ۱۸۰۵ء سے اقتصادی تعلیمی اور ادبی ترقی کا دور شروع ہوا تعلیمی دلچسپی کچھ بڑھ گئی، جدید تعلیم کی بنیاد رکھی جانے لگی، اور بہت سی معاشرتی تحریکیں جو اس تعلیم کا نتیجہ تھیں شروع ہوگئیں۔ اس زمانے میں بنگال کی خاص اہمیت ہوگئی تھی، اور وہاں کا متوسط طبقہ ترقی کر رہا تھا، اس ترقی نے دوسروں کو بھی ترغیب دی، فورٹ ولیم کالج کی وجہ سے دیسی زبان پھیل رہی تھی، ۱۸۱۷ء میں ہندو کالج قائم ہوا اور راجہ رام موہن رائے نے قدیم سنسکرت تعلیم کے خلاف آواز بلند کی اس وقت سے سارے ہندوستان میں ایک تعلیمی اور مذہبی کشمکش شروع ہوگئی، ۱۸۳۵ء میں مکالے کی تجویز پر انگریزی کو ذریعہ تعلیم تسلیم کر لیا گیا، ہمارے پرانے قانون بھی اپنی اصلی حالت پر نہ رہے، بلکہ وہ ہندو لا، مسلم لا کے بجائے اینگلو ہندو لا اور اینگلو مسلم لا ہو گئے، مغرب اور اس کے فلسفیانہ خیالات نے بھی ایک ہلچل مچا دی، اسی زمانے میں مولانا سید احمد بریلوی نے تجدید اصلاح کے لئے اور سکھوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا، مولانا کرامت علی جونپوری کی تحریک مشرقی بنگال میں اردو کے ذریعہ اپنا کام کر رہی تھی، ان تحریکوں نے اردو کو ترقی دی، لیکن اردو ٹائپ مقبول نہ ہوسکا، اور دلّی میں ۱۸۳۷ء میں لیتھو پریس قائم ہوا، ۱۸۳۵ء میں شمالی ہند میں دفتر کی زبان فارسی سے اردو ہوئی اور پریس کو بھی آزادی ملی، ۱۸۳۶ء میں مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر نے دہلی سے اردو اخبار نکالا[1]۔ اردو صحافت میں اولیت کا فخر اسی کو حاصل ہے، یہ ۱۸۵۵ء تک خوب چلتا رہا، علمی نقطۂ نگاہ سے اردو اخبار اور اس کے مطبع کو اشاعت خیالات، تربیت، لے عامہ، طباعت کتب میں اولیت کا امتیاز حاصل ہے[2]۔ اس میں ادبی حیثیت کو زیادہ اہمیت تھی، چنانچہ ذوق، مومن اور غالب کی غزلیں کبھی ہم طرحی غزلیں کبھی زبان و محاورات کی بحث کبھی شہیدی کی شاعری پر مباحثہ وغیرہ موضوعوں پر مضامین ہوتے تھے، ۱۸۴۳ء میں مولوی باقر علی نے اردو کا ایک دوسرا اخبار مظہر حق نکالا معلوم نہیں وہ کتنی مدت تک زندہ رہا۔

دوسرا اخبار "سید الاخبار" ہے جس کو سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے ۱۸۳۷ء میں نکالا تھا، موصوف کا عین شباب میں انتقال ہوگیا، کچھ دنوں تک سر سید نے بھی اس کو چلایا۔ مولانا حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں:-

"سید الاخبار کا اہتمام اگرچہ برائے نام ایک اور شخص کے سپرد تھا، مگر زیادہ تر سر سید خود اس میں مضامین لکھا کرتے تھے، لیکن یہ اخبار ایک مدت تک جاری رہ کر بند ہوگیا"

"فوائد الناظرین" ماسٹر رام چند دلی سے نکالا کرتے تھے، پہلے یہ ماہوار رسالہ تھا، لیکن ۱۸۴۶ء سے ہفتہ وار ہوگیا، اس اخبار میں مشہور اشخاص کی تصویریں اور مختلف مقامات کے نقشے بھی ہوتے تھے، یہ چیز پہلے کہیں نظر نہ آتی تھی، نقشے، سائنٹفک مضامین، علمی آلات اور تاریخی اشخاص کی دستی تصویریں اس کی خصوصیات میں سے تھیں، ۱۸۴۵ء میں ایک اور اخبار قران السعدین پنڈت دھرم نرائن ہاکسر کی ادارت میں دلی سے نکلا، یہ بارہ برس تک زندہ رہا، ۱۸۴۷ء میں قمر الدین نے پھلٹی بازار آگرہ سے ہفتہ وار اخبار "اسعد الاخبار" نکالا۔ دیوان تفتہ کا پہلا حصہ اسی اخبار کے مطبع سے ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا، اس میں قطعۂ تاریخ اور کتابوں کا اشتہار نظم میں درج ہوتا تھا، ۲ر نومبر کی اشاعت میں مرزا حاتم علی مہر کا وہ قطعہ جو انہوں نے لارڈ ڈلہوزی کے خیر مقدم میں کہا تھا درج ہے ؎

ڈلہوزی ہست رونق بخش ہند — اے صبا در گوش جہت این مژدہ گو
مصرعۂ تاریخ مقدم گفت مہر — افتخار ہند باد انجم تو

۱۵ر جولائی ۱۸۵۰ء کے نمبر میں یہ خبر درج ہے کہ بدر الدین علیخاں

[1] Cultural History of India by Yusuf Ali —

[2] آب حیات محمد حسین آزاد ۵۰-۱۱۰ اب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبارات کیفی رسالہ اردو ۱۹۳۶ء

نے ملکہ وکٹوریہ اور پرنس البرٹ کے لئے مہریں کھود کر دیں،

احسن الاخبار مطبوعہ ۲۲ اکتوبر ۱۸۴۸ء میں لکھتا ہے کہ صادق الاخبار کے اڈیٹر صاحب نے رفتہ رفتہ اپنے اخبار کو اردو زبان کا اخبار بنا دیا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ فارسی زبان سے کیوں رابطۂ الفت منقطع کر دیا شاید اخبار کے خریداروں نے تقاضا کیا ہوگا کہ فارسی زبان ترک کرو اور اردو زبان جاری کر دو۔" اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان کا مطالبہ روز بروز بڑھ رہا تھا، بادشاہ دہلی کے مقدمے کے سلسلے میں، اس کے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے، ایک گواہ کشن سنگھ نامی کا بیان ہے کہ

"جمال الدین ایک ہفتہ وار اخبار نکالتا تھا جس کے مضامین قطعی انگریزی حکومت کے خلاف ہوتے تھے، اس کا نام صادق الاخبار، یہی خبریں تھا، دلّی میں بڑا اخبار سمجھا جاتا تھا"

کریم الدین مصنف تذکرۂ شعرا نے مطبع رفاہ عام قائم کیا، اور ایک اخبار "کریم الاخبار" کے نام سے جاری کیا، ۱۸۴۹ء میں شیخ محمد ضیاء اللہ نے ضیاء الاخبار نکالا،

یہ وہ وقت تھا جب ڈلہوزی ہندوستان کا گورنر جنرل تھا۔ جو مغربی تہذیب کی برتری کے خبط میں مبتلا تھا، اس نے دیسی باشندوں کے الحاق کا ایک طوفان بپا کر رکھا تھا، لیکن اسی کے ساتھ اس کے عہد میں سائنس کے فیوض و برکات بھی نظر آنے لگے، ٹیلیگراف جہاز رانی اور ڈاک میں سہولتیں ہو گئیں، کارڈ کی قیمت ایک پیسہ اور لفافے کی دو پیسہ تھی، انگریزی تعلیم اور سرکاری ملازمتوں کی وجہ سے اردو تحریر کے تکلفات ختم ہونے لگے اور ایک کاروباری زبان پیدا ہونے لگی، جس نے اس کو پھیلنے میں بڑی مدد دی[3] ۱۸۳۵ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کا زمانہ اخباروں کی انتہائی آزادی کا زمانہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں اردو اخبارات بڑی تیزی سے بڑھنے لگے۔ اور ایشیاٹک جرنل کی زبان میں[4] انگریزی نہیں بلکہ دیسی اخباروں نے ہندوستان میں معاشرتی، اخلاقی، مذہبی تعلیم اور مادی انقلاب پیدا کیا ہے"۔ دیسی اخبارات اپنے حقوق کے لئے لڑتے رہے اور یہ مطالبہ کرتے رہے کہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا جائے[1]، واقعہ یہ ہے کہ قوم کی بیداری میں ان اخباروں کا بہت بڑا حصہ ہے، اسی وقت سے اردو صحافت نے اپنے ہونہار ہونے کا ثبوت دے دیا تھا، یہ اخبارات اس وقت کی معاشرت اور مذاق کے آئینہ دار ہیں۔

کوہ نور کے اجراء سے اردو صحافت نے ترقی کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا، یہ نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کا اپنی طرز کا پہلا اخبار تھا، جسے ۱۸۵۰ء میں منشی ہرسکھ رائے نے لاہور سے نکالا، منشی ہرسکھ رائے مضافات سکندرہ کے رہنے والے تھے، مولانا احسن مارہروی نے اس کا سنہ اجراء ۱۸۴۹ء[3] بتلایا ہے۔

یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان میں بڑی کثرت سے اردو اخبارات نکلتے تھے، ڈناسی کے بیان کے مطابق چھبیس اخبارات اور رسائل صرف صوبہ شمالی و مغربی سے نکلتے تھے۔ جن میں تیئیس ہندوستانی زبان کے تھے، دو فارسی کے اور ایک بنگالی کا، دوسرے صوبوں کے اخبارات کو ملا کر پچاس تک تعداد پہنچ جائے گی، ۱۸۵۰ء کے آخر ہی میں کوہ نور کے خریداروں کی تعداد ۲۵۷ تک پہنچ گئی تھی، اس کے خریداروں میں سر جان لارنس لفٹنٹ ایبس، مسٹر میکلوڈ، مسٹر سیلین، مسٹر میکر یگر اور دوسرے انگریزوں کے نام بھی ملتے ہیں۔ یہ مدراس بمبئی اور کلکتہ تک پھیلا ہوا تھا، ۱۸۹۳ء میں یہ اخبار ہفتہ وار سے روزانہ ہو گیا، لیکن پھر ہفتہ وار ہو گیا، یہ وہی اخبار ہے، جس کے عملہ میں منشی نولکشور بھی کام کرتے تھے، اس کے دامن سے اس دور کے بہت سے ہندو اور مسلمان ادیب اور اہل قلم وابستہ رہے، مثلاً نادر علی، تاج الدین، منشی نول کشور، مرزا موحد، منشی نثار علی شہرت، مولوی سیف الحق ادیب، مولوی محمد الدین فرق اور منشی محرم علی چشتی وغیرہ اس کے اڈیٹر رہے۔ بعض عیسائی بھی اس کے اڈیٹر تھے، اس کا نام اتنا مقبول ہوا کہ ہندوستان کے بہت سے اخباروں نے اپنے نام میں نور کا جز لگایا، مثلاً دریائے نور لاہور، نور الاخبار اور نور افشاں لدھیانہ،

---

[1] کلچرل ہسٹری آف انڈیا، [2] Press after the Mutiny - Historical Journal

[3] تاریخ نثر اردو، [4] نوق ؟ د ایڈیٹر ادبی دنیا،

نورالانوار و مطلع نور ۱۹۰۴ء میں یہ نامی گرامی اخبار بند ہوگیا۔

اس زمانے کے اکثر اخبار اردو اور ہندی دونوں میں شائع ہوتے تھے، اور بعض اخباروں میں انگریزی اور اردو ساتھ ساتھ ہوتی تھی، مثلاً آگرہ گورنمنٹ گزٹ یہ سرکاری اخبار تھا جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں نکلتا تھا۔ اندور سے آٹھ صفحوں کا ہفتہ وار اخبار مالوہ نکلتا تھا، اس کے ایک کالم میں ہندی اور دوسرے میں ہندوستانی ہوتی تھی، اس کے اڈیٹر دھرم نرائن بہت اچھے شاعر تھے، اُنہوں نے مل کی پولٹیکل اکانومی اور انگلستان کی تاریخ کا ترجمہ بھی کیا ہے، راجہ بھرت پور کی سرپرستی میں بھرت پور صوبہ آگرہ سے ایک اخبار مظہر السرور نکلتا تھا، اس میں بھی ہندی اردو دونوں ہوتی تھی۔

بنارس سے ۱۸۵۱ء میں سرکارہ جاری ہوا، بریلی سے عمدۃ الاخبار لکشمن پرکاش کی ادارت میں نکلا، انہوں نے ایک علمی اخلاقی انسائیکلو پیڈیا بھی لکھی جس کا نام مشرقی طرز پر مشرقی زینت رکھا[1]، مرزا پور سے امریکی پروٹسٹنٹ مشنریوں کا اخبار خیر خواہ جاری ہوا، شملہ سے شیخ عبداللہ نے شملا اخبار نکالا، موصوف انگریزی اور ہندوستانی دونوں سے واقف تھے، ۱۸۵۳ء میں دیوان چند رئیس سیالکوٹ نے ہمائے بے بہا کے نام سے مطبع چشمۂ فیض سے جاری کیا، یہ اخبار وکٹوریہ پیپر کے نام سے بہت دنوں تک زندہ رہا۔ کلکتہ سے اردو گائیڈ نکلا۔ مولانا احسن مارہروی نے خورشید عالم سیالکوٹ اور طلسم لکھنؤ کا بھی ذکر کیا ہے، یہ دونوں اخبار ۱۸۵۶ء میں جاری ہوئے تھے۔ ان میں طلسم لکھنؤ اس لئے اہم ہے کہ اس سے ۱۸۵۷ء کی شورش کا کچھ حال معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کی خبریں زیادہ تر افواہیں ہوتی تھیں[2]، اسی کے بعد پہلا دور ختم ہوجاتا ہے۔

اس دور میں سیاسی اور خارجی امور اخباروں کی توجہ کا مرکز تھے، پریس کی آزادی کی وجہ سے لب و لہجہ میں بہت کچھ بے باکی تھی، خالص اشتہار کا اب تک رواج نہیں ہوا تھا، اخباروں کی زبان گو باغ و بہار جیسی نہ تھی، پھر بھی قدیم تھی، فارسی انشاء کا تتبع اب بھی کیا جاتا تھا، اس قسم کی ترکیبیں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں، "راقم چٹھی، صاحب چٹھی، انتخاب ایک چٹھی، اجازت اندر جانے کی لی، بیگم صاحب بیٹھی تھی، چوں بجائے چونکہ، بحصول اجازت حکام واسطے خرید نیلام اسباب لوٹ کے، چارج عہدہ جج کا تھا، وے وہ کی جمع، نسبتِ سابق صحت رکھتے ہیں، کراسپانڈنٹ بجائے نامہ نگار کے، بلاحصول پاس حاکم کے" فقروں اور جملوں کو کسی قسم کے وقفوں کے نشانات سے جدا نہیں کرتے تھے۔ انگریزی املا کی صحت کا اس قدر خیال تھا کہ سیپٹمبر اور ڈیسمبر ہی لکھتے تھے، بمبئی میں "م" کی جگہ "ن" لکھتے تھے۔ اس زمانے کی صحافت کی مدعا نگاری قابل تعریف ہے، وہ اپنا مطلب خوبی سے ادا کر لیتے تھے[3]۔

سید ابو عاصم

(معارف)

اشتہار زیر دفعہ ۵ رول ۲۰ مجموعہ ضابطہ دیوانی

باجلاس جناب سید تفضل حسین شاہ صاحب منصف درجہ اول احمد پور شرقیہ ریاست بہاول پور

دعوی دیوانی نمبر ۳۵۳۔

کریم بخش ولد الٰہ بخش قوم بھٹی سکنہ موضع گوٹھ رضا ـــ بنام

پوکھر داس ولد روپ چند ذات گدڑ سکنہ احمد پور شرقیہ

کوڑا مل ولد ״ ״ ״ ״

دعوی ۱۱۵ روپے بروئے تحریر دستخطی مدعا علیہ م ۱

بنام پوکھر داس ولد روپ چند ذات گدڑ سکنہ احمد پور شرقیہ

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں پوکھر داس مدعا علیہ مذکور تعمیل سمن سے عمداً گریز کرتا ہے اور روپوش ہے اس لئے اشتہار ہذا بنام پوکھر داس مذکور جاری کیا جاتا ہے کہ اگر مدعا علیہ مذکور تاریخ ۱۲ ماہ نومبر ۱۹۴۲ء مقام احمد پور شرقیہ حاضر عدالت ہذا میں نہیں ہوگا تو اس کی نسبت کارروائی یکطرفہ عمل میں آئیگی آج بتاریخ ۲۵ ماہ اکتوبر ۱۹۴۲ء بدستخط میرے و مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

مہر عدالت ـــ دستخط منصف درجہ اول

---

[1] خطبات گارساں دتاسی [2] Cultural History of India, Y. Ali [3] اس دور کی خصوصیات پنڈت کیفی کے مضمون اب سے آدھ صدی پہلے اردو اخبار رسالہ اردو ۱۹۳۵ء اور Historical JOURNAL AND PRESS AFTER MUTINY سے اخذ ہے۔

دسمبر سنہ ۱۹۴۲ء

جلد ۲۰ نمبر ۱۲

فہرست مضامین

ایڈیٹر: صلاح الدین احمد ۔ آنریری جائنٹ ایڈیٹر: قیوم نظر

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک و وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ فی پرچہ آٹھ آنے

مرکنٹائل پریس میں باہتمام صلاح الدین احمد ایڈیٹر پرنٹر پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا مال روڈ لاہور سے شائع ہوا

دنیائے کاروبار

اورینٹیل انشورنس کمپنی لمیٹڈ

اورینٹیل گورنمنٹ سکیورٹی لائف انشورنس کمپنی لیمیٹڈ کی گذشتہ سال کی رپورٹ حسب معمول ترقی، خوشحالی اور فائدہ رسانی کا ایک اور سال منظر عام پر لاتی ہے۔ سال زیر نظر میں بیمے کی ۵۳۶۲۸ تجاویز جن کی مجموعی مالیت ۱۱۶۳۱۱۷۰۸ روپے تھی پیش ہوئیں۔ جن میں سے ۳۷۰۶۷ منظور کی گئیں اور ۸۱۶۱۹۷۲۵ روپے کی مجموعی رقم کا بیمہ کیا گیا ان کے سالانہ پریمیم کی مجموعی مقدار جس میں واحد پریمیم کی رقم شامل نہیں ۴۲۱۸۵۵۴ روپے تک جا پہنچی اس سال کمپنی نے بیمے کے جو مطالبات ادا کئے ان کی مجموعی رقم ایک کروڑ اٹھتر لاکھ روپے تک پہنچ گئی۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کمپنی مجموعی آمدنی قریباً پانچ کروڑ روپے ہوئی اور مجموعی خرچ کی مقدار دو کروڑ نوے لاکھ روپے سے نہ بڑھی اور اس طرح دو کروڑ دس لاکھ روپے سے زیادہ کی رقم مدِ فاضل میں آئی۔

سال کے خاتمے پر کمپنی کے قبضے میں ۲۹ کروڑ ستر لاکھ روپے کی مالیت تھی۔ سال [illegible] کمپنی نے زائد از تیس ہزار روپے مختلف اغراض کے لئے چندہ میں دیا کمپنی کے اخراجات کی نسبت ۱۹٫۶ رہی جو پچھلے سال کی نسبت سے ایک فی صدی کم ہے کمپنی نے اپنے حصہ داروں کو ۱۲۵ روپے فی حصہ منافع تقسیم کیا۔ جو انکم ٹیکس سے مبرا تھا اور اس کے علاوہ ملازمین کو ایک ایک تنخواہ انعام میں دی گئی۔

جنگ کے غیر معمولی حالات کے باوجود کمپنی روز بروز ترقی کر رہی ہے اور دنیا کی بڑی بڑی کمپنیوں میں شمار ہوتی ہے۔

پنجاب کے ہر دلعزیز برانچ مینجر مسٹر گوپالداس سونی کمپنی کی اس روز افزوں ترقی پر خاص مبارکباد کے مستحق ہیں۔

بزم ادب

موجودہ شمارہ ۱۹۴۲ء کا آخری پرچہ ہے۔ اس سال کاغذ کی کمی بلکہ نایابی کے باعث ادارے کو جن تکلیفات کا سامنا کرنا پڑا اُس کا تذکرہ بے سود ہے۔ ہم نے ان کالموں میں ادبی دنیا کے انتظامی معاملات کا عمداً کبھی ذکر نہیں کیا، اس لئے کہ یہ جگہ مضامین کے تعارف اور ایڈیٹر اور ناظرین کی باہمی دلچسپیوں کے لئے وقف ہے۔ اور اس پر ہمارے منتظم صاحب کا کوئی تصرف نہیں لیکن حالات نے ایسی غیر معمولی صورت اختیار کر لی ہے کہ جن باتوں کی طرف کبھی دھیان بھی نہیں جاتا تھا، وہ آج توجہ کا سب سے بڑا حصہ لے رہی ہیں۔ آج سے سال بھر پہلے بے تحاشا کاغذ صرف ہوتا تھا اور طویل سے طویل مضامین چھاپتے وقت بھی کاغذ کی فراہمی کا مسئلہ کبھی پیش نظر نہیں ہوتا تھا۔ اور اب یہ حالت ہے کہ کوئی سیر حاصل مضمون موصول ہوا مضمون کی جامعیت سے طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ جی چاہا کہ اسی اشاعت میں شامل کر لیجئے۔ مینیجر صاحب کو رقعہ لکھا گیا کہ صاحب اس دفعہ معمول سے ذرا آٹھ دس صفحے زیادہ کا کاغذ مطلوب ہوگا۔ وہاں سے جواب صاف ملا۔ بلکہ یہ نوید جانفزا کہ اسی رفتار سے [illegible] گے تو شاید بچ نکلو ورنہ راستے ہی میں دم ٹوٹ جائے گا۔

چنانچہ آج ہمیں اپنے قلمی معاونین سے یہی کہنا ہے کہ اگرچہ ادبی دنیا ہمیشہ سیر حاصل اور طویل مضامین کی اشاعت سے امتیاز پیدا کرتا رہا۔ لیکن اب کچھ عرصے کے لئے مجبوراً اس روش کو ترک کرنا پڑے گا۔ یہ نہیں کہ طویل مضامین کی اشاعت کا سلسلہ مطلقاً رک جائے گا۔ بلکہ فرق صرف اتنا پڑے گا کہ جہاں پہلے تقریباً ہر اشاعت میں ایک جامع مقالہ ضرور شامل کیا جاتا تھا وہاں اب کبھی کبھی کیا جا سکے گا۔ جو مضامین ہمیں موصول ہو چکے ہیں اور منظور کر لئے گئے ہیں وہ تو لازماً چھپیں گے۔ البتہ آئندہ لکھنے والوں کے لئے یہ سطور ایک ضروری اشارے کا کام دے سکیں تو ہم اپنے صیغۂ انتظام سے قدرے سرخرو ہو جائیں گے۔

اس دفعہ کے مضامین میں محمد رفیق صاحب خاور ایم اے کا مقالہ اختر شیرانی پر ایک نظر ایک ایسا زاویۂ نگاہ پیش کرتا ہے جس سے بہت سے حضرات کو اختلاف ہوگا۔ مدیر ادبی دنیا ذاتی طور پر اس مضمون کے بعض نتائج سے متفق نہیں۔ بعض اعتبارات سے خاور صاحب نے ہندوستان کے اس سب سے بڑے رومانی شاعر کو اُس جچے تلے انداز سے نہیں دیکھا جو ایک تنقید نگار کا امتیازی وصف ہونا چاہئے۔ انہوں نے نتائج اخذ کرنے میں ایک نقاد کی محتاط زبان استعمال نہیں کی اور وہ بعض مقامات پر مبالغے کی رو میں بہہ گئے ہیں۔ ان نقائص کے باوجود مضمون خیال انگیز ضرور ہے۔ اور اگر اس سے متاثر ہو کر ہمارے بعض اہل الرائے معاونین اس موضوع پر قلم اٹھائیں تو ہمیں ان کے خیالات کی اشاعت سے دلی مسرت ہوگی۔

جناب ممتاز مفتی کا پچھلا افسانہ سبانی ملک بھر کے ادبی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا۔ اردو کے ایک مشہور و معروف افسانہ نگار اپنے ایک گرامی نامہ میں لکھتے ہیں" اگر نومبر کا پرچہ نہ ملتا تو میں دو اچھی چیزوں سے محروم رہ جاتا (دوسری اچھی چیز سے مراد ابوالفضل صدیقی صاحب کی کہانی دفینہ ہے) میرا خیال ہے کہ نئے افسانہ نگاروں میں صرف ممتاز مفتی ہی ایسی لڑکیاں پیش کر سکتے ہیں، جن سے شادی کرنے کو دل چاہنے لگتا ہے یعنی شادی کے معنی جنسی تعلق نہ سمجھئے، بلکہ ساتھ رہنا" کہئے ممتاز صاحب! کیسا خیال ہے! ہاں ان کا ایک اور افسانہ جو پچھلے افسانے سے زیادہ سلونا ہے، اس اشاعت میں ملاحظہ فرمائیے نام ہے اندھا۔ اور انجام ـــــ دیکھئے کیا ہو۔

صلاح الدین احمد

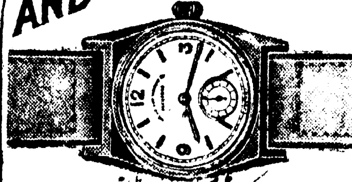
We keep good time!



ہر زمانے میں بہترین وقت!!

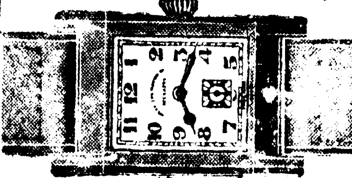
گھڑی کا مقصد یہ ہے کہ وقت کا اندازہ ہو سکے۔ وقت کے صحیح اندازہ کے لئے ضروری ہے کہ سالہا سال تک کے اعتماد کے لئے مشینری بالکل بے عیب ہو۔ ویسٹ اینڈ گھڑیاں اسی اصول پر کہ جیسے نظر بنائی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے طول و عرض میں بے شمار لوگ استعمال کر رہے ہیں۔ آپ کو بھی ایک خرید لینی چاہئے۔ آپ کے مذاق اور قیمت کے مطابق بہت سے ماڈل ہیں۔

AND SO DO WE!



بینڈکس ٹونیو

اسٹیل .... ۵۴/-/- روپے
.... ۶۵/-/- روپے
۹ کیرٹ خالص سونا .... ۱۱۱/-/- روپے



سیکنڈس مستطیل

رولڈ گولڈ .... ۶۶/-/- روپے
ریڈیم کے ہندسے اور سوئیاں ہر ایک قسم قیمت کے علاوہ تین روپے





نہایت اعلیٰ باتصویر فہرست مفت طلب کریں۔

ویسٹ اینڈ واچ کمپنی

بمبئی
کلکتہ

ترجمانِ حقیقت
حضرت علامہ

اقبال

کی
یاد کو تازہ
رکھنے کے لئے
ان کی بہترین عکسی
تصویر سے اپنے کمرے
کی زینت
بڑھائیے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے
محصول ڈاک علاوہ
مینجر کتب خانہ ادبی دنیا

ایک شہید کی میراث

"شاعری زندگی کی ازلی اور ابدی حقیقتوں کی سچی تصویر کشی کا نام ہے ..... موجودہ زمانے کے بڑے شعرا کے کلام کو پڑھ کر کوئی بھی زندگی کی اُس برقی رَو سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جو اُن کے الفاظ میں لرزاں اور فروزاں ہوتی ہے۔"

شیلے

قضا کس کو نہیں آتی ہے؟ یوں تو سب ہی مرتے ہیں
پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے!

(مولانا محمد علی جوہر)

افراد کی جسمانی موت واقع ہو سکتی ہے۔ اُن کے کارہائے نمایاں کی تابانی اور چمک دمک ایک زمانے کے بعد ماند پڑ سکتی ہے۔ لوگوں کے دلوں سے اُن کی یاد بھی رفتہ رفتہ محو ہو سکتی ہے ——— مگر اُن کی رُوح اُن کے ارفع خیالات کی شکل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہتی اور زمانے کو متاثر کرتی رہتی ہے۔ اور اگر کہیں خوش قسمتی سے شاعری ان ارفع خیالات کا آلۂ اظہار بن جائے تب تو اُس روح کی بقائے دوام کی بابت شک کرنے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، جو اس شاعری میں صرف ہوئی ہو۔

پیکرِ شعر میں جلوہ گر ہو کر ایک بلند پایہ رُوح زمان و مکان کی حدود سے آزاد ہو جاتی ہے۔ پھر وقت کی تخریبی سرگرمیوں کا اُس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر میں خیال کرتا ہوں کہ ایک جلیل القدر ہستی کی شخصیت کا صحیح اندازہ کرانے میں تذکروں اور سوانح عمریوں کے مقابلے میں خود اُس کی اپنی شاعری کہیں زیادہ معاون ہوتی ہے۔

مولانا محمد علی مرحوم نوّر اللہ مرقدہٗ

(زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے)

کی شاعری بھی اسی قسم کی شاعری ہے۔ اُن کی زبردست برقی شخصیت کی تصویر تمام و کمال الفاظ میں پیش کرنا ناممکن ہے۔ یہ شخصیت اگر کہیں نظر آ سکتی ہے تو خود اُن کی اپنی شاعری میں۔

آج اُن کی شہرت کا باعث وہ کارہائے نمایاں ہیں جو انہوں نے اپنی زندگی میں انجام دیئے۔ مگر ہم میں سے کتنے ہیں جو اُن کی شاعری (اُن کے ایک عظیم کارنامے) کی اصلی قدر و قیمت سے واقف ہیں؟

اپنی باعمل زندگی کی شورشوں اور سرگرمیوں میں شاید مولانا محمد علی مرحوم نے خود بھی اپنی شاعری کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی مگر اُن کی روح کا نہ دب سکنے والا جوش و خروش پیرایہ شعر میں ظاہر ہو کر رہا۔ انہوں نے شعر کہے اور کیسے شعر! ایسے شعر جن میں ایک بے مثال رُوح کی پاکیزگی اور طاقت جلوہ فرما ہے ؎

گویا ہے لاش بھی تو تمہارے شہید کی
پیہم صدا بلند ہے ہل من مزید کی

اُن کی زندگی اسی جوشِ کردار کا نمونہ تھی جس کے متعلق علامہ اقبال مرحوم فرما گئے ہیں ؎

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس
عوض یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز!

لیکن میرا خیال ہے کہ قبر کی شب ہائے دراز بھی ایک شفاف اور پاکیزہ روح کے اس شعلے سے منور رہتی ہیں جو فانوسِ شعر میں بھڑک چکا ہو۔ میرے نزدیک یہ شعلہ فنا ناپذیر ہے۔ اس کی تپش اور حرارت ابد مدت ہے۔

دنیا کی کسی زبان کی شاعری میں حق کی حمایت میں جان دینے کا یہ مجنونانہ جذبہ اس شدّ و مد کے ساتھ اور اس والہانہ انداز میں نہیں پایا جاتا جو مولانا محمد علی مرحوم کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے اور جس پر اردو

زبان جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔ وہ "جان کی قربانی" کی اصل عظمت سے واقف تھے۔ وہ شدت کے ساتھ اس کا احساس کرتے تھے کہ

جان کی قربانیاں دیتی ہیں عالم کو حیات — خون کے چھینٹوں سے ہو جاتی ہے زندہ کائنات

(نشور واحدی)

اُن کی نظر میں "شہادت" ہی معراجِ انسانیت ہے "تزکیۂ نفس" کی بہترین صورت اُن کے خیال میں یہی تھی۔ کہ اُس کے سامنے مذہب اسلام کے باقی کل ارکان — نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج — بے اثر معلوم ہوتے ہیں کیونکہ اُن میں ریاکاری کا دخل ہو سکتا ہے۔ مگر "شہادت" کا جو بلند معیار فدائیان اسلام نے قائم کر دیا ہے۔ وہ عین صداقت ہے، آپ اپنا ثبوت ہے اور یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد علی مرحوم دل و جان سے اس کے شیدا تھے۔ فرماتے ہیں

طوافِ کعبہ بھی کر آئے شوقِ جو ڈالا ہیں — جب آخر دار کو دیکھا بہار بے خزاں پایا

وہ ہر گھڑی موت سے گلے ملنے کے لئے بے تاب نظر آتے ہیں — لیکن اُس موت سے نہیں جس کی آرزو پست حوصلہ اور بزدل لوگ زندگی سے ڈر کر کیا کرتے ہیں، بلکہ اُس موت سے جو "تیغ قاتل" یا "دار" کی شکل میں ایک شانِ محبوبی اختیار کر لیتی ہے۔

گو بظاہر اُن کی یہ حسرت پوری نہ ہو سکی، لیکن میری نظر میں اُن کی زندگی بھی ان ہی تمام کیفیتوں کی حامل تھی جن کو مجموعی طور پر "شہادت" کہا جاتا ہے ؎

اس طرح کے جینے میں بھی مرنے کا مزہ ہے — قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہِ قضا دیکھ

شہادت کا یہ شوقِ بے حد — یہ شعلۂ جوالہ — زندگی بھر اُن کے قلب میں آگ بھڑکاتا رہا اور اب بھی اُن کے اشعار میں روشن ہے اور قیامت تک روشن رہے گا۔ مجھے مولانا محمد علی مرحوم اور شروع زمانہ اسلام کے مجاہدین اور شہدا میں بہت زیادہ روحانی یگانگت نظر آتی ہے۔ اُن کا ذہن بار بار "کربلا" کی جانب منتقل ہوتا ہے اُن کی تمام طلب کوششوں کا منتہیٰ وہی ہے۔

ملاحظہ فرمایئے:۔

روزِ ازل سے ہے یہی اک مقصدِ حیات — جائے گا سر کے ساتھ ہی سودائے کربلا

مطلب فرات سے ہے نہ آبِ حیات سے — ہوں تشنۂ شہادت و شیدائے کربلا

جو ہر مسیح و خضر کو ملتی نہیں یہ شے — اور یوں نصیب سے تجھے مل جائے کربلا

جب تک کہ دل سے محو نہ ہو کربلا کی یاد — ہم سے نہ ہو سکے گی اطاعت یزید کی

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

جو دشت کہ آرام گہِ سبطِ نبی ہے — اُس دشت کو لاکھوں ابھی آباد کریں گے

نوحۂ غم سے گھٹاتے نہیں ہم شانِ حسین — حق ہے شاہد کہ شہادت ہی تھی شایانِ حسین

شکر حق ہے کہ ابھی حق کی حفاظت کے لئے — جان دینے کو ہیں موجود غلامانِ حسین

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے — پر غیب سے سامانِ بقا میرے لئے ہے

یہ حورِ بہشتی کی طرف سے ہے بلاوا — لبیک کہ مقتل کا صلا میرے لئے ہے

پیغام ملا تھا جو حسینؑ ابنِ علیؑ کو — خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لئے ہے

ہم سنتِ خلیل کے پابند ہوں تو کیوں — پھولے نہ آگ ہی میں گلستانِ کلکتہ

تقلیدِ اہلِ بیت کریں ہم تو کیا عجب — میدانِ کربلا بنے "میدانِ کلکتہ"

دار و رسن کے عشق میں وہ منصور اور سرمد کے دوش بدوش ہیں۔ سرو و شمشاد کی رعنائی اور برنائی اور قدِ محبوب سے ان کی مشابہت کے تصور پر سر دھننے والے لوگوں کو "دار و رسن" جیسی ہولناک چیز کی جمالیاتی قدر سے روشناس کرانا کوئی آسان کام نہیں۔ سوائے مولانا محمد علی مرحوم کے اور کسی شاعر نے یہ مہم سر نہیں کی۔ یہ ان کا بے مثال کارنامہ ہے، اور دار و رسن کے متعلق اُن کے جتنے اشعار ہیں۔ وہ ہندوستانی ادب میں زندۂ جاوید ہیں۔ واقعی وہ دار و رسن کی "رسمِ کہن" زندہ کر گئے۔

جو ہر نہ کیوں یہ رسمِ کہن زندہ کر چلیں — دار و رسن کے گرچہ نہ ہوں بانیوں میں ہم!

ہے رشک کیوں آج ہم کو سرِ دار دیکھ کر — "دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر"!

عاشقوں کے لئے ہو دار بھی دارِ شفا — عشق کی طب میں دوا نام ہو بیماری کا

اے مسیحا اس مرض سے کون چاہے گا شفا؟ دار پر موت آئے اس کی بھی کوئی تدبیر ہے؟

یہ بھی کیا بیدردیٔ حق ہے کہ خاموش ہیں سب ہاں انا الحق بھی ہو منصور بھی ہو دار بھی ہو!

سرفروشی اور جانبازی کا یہ سچا مجاہدانہ جوش اور جذبہ اُن کی شاعری میں ایک ایسی رُوح پرور کیفیت پیدا کر دیتا ہے جسے اہلِ دل ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ انہیں تیغِ قاتل کی چمک میں تجلّیٔ طور نظر آتی ہے۔

کر گئی زندۂ جاوید ہمیں تیغِ قاتل نے مسیحائی کی
ہو نہ تقلید وِلا منقل میں کہیں موسیٰ سے تمنائی کی!
نہ سہی تیغ، تجلی ہی سہی آنکھ جھپکے نہ تماشائی کی!
نعلین ہی پہ ہو نہ کہیں اکتفا کلیم اُس آستاں پہ آئے تو سر بھی اتار دے

خوکردۂ ازل سے تجلّیٔ طور کے جھپکے گی آنکھ کیا تری تلوار دیکھ کر!

اس "شہیدائے شہادت" کے تیور غضب کے ہیں۔ اس کے انداز میں بلا کا بانکپن ہے۔ اس کے غرور کے آگے پیشانیٔ آفاق جھکی جاتی ہے۔

خونریزیٔ دو روزہ، مرا پیماں ہے ازل سے پابندِ جفا تو ہے تو میری بھی وفا دیکھ!
ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے!

خاک جینا ہے، اگر موت سے ڈرنا ہے یہی ہوسِ زیست ہے اس درجہ تو مرنا ہے یہی

مرنے کو یوں تو مرتے ہیں ہر روز سینکڑوں اپنے لئے پیامِ قضا ہو تو جانئے
کہتے ہیں نقدِ جان جسے، ہے عاشقوں پہ قرض یہ قرض ہم سے جلد ادا ہو تو جانئے
ہر شے کو رب کے شکر کیا بھی تو کیا کیا جاں دیتے وقت شکر ادا ہو تو جانئے

جو آرزوئے مرگ میں مرتے تھے وہ کُشتے کس مُنہ سے شکایت تری جلّاد کریں گے؟

میرے رنگِ کفن کی شوخی دیکھ یوں ہی عاشق ترا سنورتا ہے

بہارِ خونِ شہادت دکھا گئے جوہر خزاں میں اور یہ رنگِ شباب دیکھو تو!

ہم کو خود شوقِ شہادت ہے گواہی کیسی فیصلہ کر بھی چکو مُجرمِ اقراری کا
میری شہرت بھی اگر ہو گی تو کیا قتل بھی کر نام ہو جائے گا تیری بھی ستمگاری کا

یہ نورِ خدا کا ہے بجھائے نہ بجھے گا کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو آ تو بھی بجھا دیکھ!

قاتلِ جوہر کے ہاتھوں سے نہ چھوٹا حشر تک کس بلا کا خون ظالم کی رگِ گردن میں تھا

خونِ ناحق کا کسی کے شبہ اور تم پر؟ مگر سینۂ جوہر میں دیکھو تو یہ کس کا تیر ہے!

خوش قسمتی کے آگے جھکایا نہ سر کبھی اس خانماں خراب کو کتنا غرور تھا

ہم خاصگانِ اہلِ نظر، اور یہ قتلِ عام جور و ستم بھی کر تو ستمگار دیکھ کر!

وہ "حیاتِ شہداء" کے قائل ہیں۔

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

کچھ بھی وہاں نہ خنجرِ قاتل کا بس چلا روحِ شہید رہتی ہے نعش و کفن سے دُور

اردو شاعری میں زیادہ تر یا تو مجازی جام و مینا کے راگ گائے گئے ہیں یا پھر اُن ہی میں کھینچ تان کر شرابِ معرفت بھر دی گئی ہے۔ لیکن ہمارے بادہ کش اور دُردآشام "جامِ شہادت" کی عظمت و تقدیس سے ناواقف تھے۔ ہمارے میخانے میں مولانا محمد علی مرحوم ہی پہلی بار یہ اچھوتا جام لے کر داخل ہوئے۔

تشنہ لب ہوں مدتوں سے دیکھئے کب درِ میخانۂ کوثر کھلے

کرنا ہی تھا حرام تو پھر وعدہ کس لئے یہ کیا کہ مے حلال وہاں ہو یہاں نہ ہو!

ساقیا! سب کو تری ایک نظر تھی کافی تھا کسے ہوش ترے عہد میں ہشیاری کا

میں فدا! آج بھی ہو جائے وہی ایک نگاہ خاتمہ ہو کہیں اِس دور کی خودداری کا

مستِ مئے الست کہاں اور ہوس کہاں! طرزِ وفائے غیر ہے اپنے چلن سے دور
ہم تک جو دورِ جام پھر آئے تو کیا عجب یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور

حرم میں کر تو دے اظہار نزک میکشی جو ہر مگر کمبخت کی بو سے دہن کچھ اور کہتی ہے!

شہد و شراب خلد میں یہ چاشنی کہاں! کچھ خونِ دل سے بڑھ کے مزا ہو تو جانئے

مروت سوزی ہم بیکسوں کی شرم رہ جاتی بھری محفل میں ساقی اک یہی پیمانہ خالی ہے

دیکھیں ہمارے متغزلین میں سے کتنے اس "مے مرد افگن" کی "تاب لاسکتے ہیں"!

اردو غزل میں "عشقِ مجازی" اور "عشقِ حقیقی" ایک دوسرے سے اتنے زیادہ اُلجھے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اکثر ایک کو دوسرے سے تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس الجھاؤ کے کئی اسباب ہیں۔

(۱) عشقِ حقیقی کے اظہار کے لئے بھی زیادہ تر شعرا نے وہی الفاظ، اصطلاحات اور طرزِ ادا اختیار کر لئے ہیں جو عشقِ مجازی کے لئے۔

(۲) شارحین چونکہ ماہر نفسیات نہیں اس لئے وہ جذبات کا تجزیہ کر کے اور مجموعی طور پر ایک شاعر کی زندگی اور کلام کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کر کے اُن جذبات کی تہ تک نہیں پہنچ پاتے۔

(۳)۔ مروجہ رسم و رواج عشقِ مجازی کی صاف گوئی کے ساتھ تشریح کرنے کے روادار نہیں، اس لئے تصوف پرست شارحین "حقیقت" سے ڈر کر عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے میں اپنی تمام علمیت صرف کر دیتے ہیں، جس کا جو کچھ بھی اثر ہوتا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

اردو غزل میں عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی دونوں موجود ہیں۔ لیکن شارحین کی دست درازیوں کے باعث نقاب پوش نظر آتے ہیں۔ ان دونوں میں تمیز تب ہی ہو سکتی ہے جب یا تو کوئی "مشتاقِ دید" بڑھ کر خود ہی نقاب الٹ دے یا پھر یہ دونوں اپنی اپنی جگہ "برافگندہ نقاب" رہیں۔

مولانا محمد علی مرحوم کی شاعری میں جس عشق کا اظہار ہے اُس کے "حقیقی" ہونے میں شک و شبہ کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں۔ غزل کی نرم آہنگ زبان میں مولانا جس لطافت کے ساتھ اس عشقِ حقیقی کا اظہار کرتے ہیں اُس کا جواب نہیں:۔

رہے گی اُٹھ کے یہ اک دن نقاب دیکھو تو ہمارے رب ہو ہمیں سے حجاب، دیکھو تو

تجھے تسکینِ دل پایا، تجھے آرامِ جاں پایا یہاں بھی ہے تو کیا تجھ کو جہاں ڈھونڈا وہاں پایا
ہمیں ہر چیز میں آئی نظر یارب ادا تیری وہ کیسے ہو گئے جن لوگوں نے تجھ کو نہ نشاں پایا
زاہد بتلا، ناکام سمجھا جس کو دنیا نے اُسی کو سرخرو دیکھا، اسی کو کامراں پایا
حرم میں تھا ہر اک کو ہوتی تیری عشق کا دعویٰ جو کی تحقیق تو اکثر وہی عشقِ بتاں پایا

ہوں بے ہراس، یہ مجھے رکھیں کسی جگہ ڈر ہے وہاں کہ تیری حکومت جہاں نہ ہو
اک تو جو مہرباں ہو تو ہر اک ہو مہرباں اور یوں نہ ہو بلا سے کوئی مہرباں نہ ہو
ہم کو تو ایک تجھ سے دو عالم میں ہے غرض سب بدگماں ہوا کریں، تو بدگماں نہ ہو
دیر و حرم میں ڈھونڈھ کے سب تھک گئے اُسے اب کون کہہ سکے کہ کہاں ہو کہاں نہ ہو

ایک ہی در کا بھکاری ہوں مجھے اک فقط تیرا سہارا چاہیئے

دشمنوں سے گر تلطف ہے تو کچھ دوستوں سے بھی مدارا چاہیئے
ہے تقاضائے جنوں پردہ دری خاک اڑانا آشکارا چاہیئے
ہے وہی فرمودۂ غالب کا پاس ضبط کا کچھ اور یارا چاہیئے
چاک مت کر جیب بے ایامِ گل کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیئے

جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیری آرزو باقی ہے موت ہی دل بے مدعا کے بعد
تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
اک شہرِ آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد
غیروں پہ لطف ہم سے الگ حیف ہے اگر یہ بے حجابیاں بھی ہوں عذرِ حیا کے بعد!

عہدِ اول کو بھی اچھا ہے جو پورا کر دو تم وفادار رہو، تھوڑی سہی وفا اور سہی

مجھے انکارِ وصلِ غیر پر کیونکر نہ شک گذرے — زباں کچھ اور بوسے پر نہیں کچھ اور کہتی ہے
یقیں آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیماں کا — تری آنکھ اے بُتِ وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے
تری خاطر بھی ہے مدِ نظر، پاسِ عدو بھی ہے — مگر میں کیا کروں دل کی جلن کچھ اور کہتی ہے

یہ جور ترا لا، یہ جفا اور ہی کچھ ہے — یہ ظلم نہیں، نام خدا اور ہی کچھ ہے
ہوں لائقِ تعزیر، یہ الزام ہے جھوٹا — مجرم تو ہوں بیشک، یہ خطا اور ہی کچھ ہے
کرنا نہ کبھی اُن پہ گماں اہلِ ہوس کا — عشاق کی نیت بخدا اور ہی کچھ ہے
یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی — پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے

اس عشق میں اُن کو زندان و سلاسل کا بھی سامنا کرنا پڑا اور دشتِ شوق کی خاک بھی چھاننی پڑی لیکن ان کے نزدیک "شہادت" ہی عشق کا مقصودِ اولیں ہے۔

کیا عشقِ ناتمام کی تبلاؤں سرگذشت — دار و رسن کا اور ابھی انتظار دیکھ

اسی عشق کی تفسیر وہ یوں بیان فرماتے ہیں۔

عشق ہی باعثِ تکوینِ جہاں ہے، غافل — تو نے جانا ہے کہ یہ شغل ہے بیکاری کا!

عشق تو اپنا خود انجام ہے، پر تو ناصح — اور اک مسئلہ سود و زیاں لایا ہے!

طالبِ خلد ہُمزۂ عشق بھی اب — ہو گیا کیا تجھے رہا لینا؟"

ناکامیوں سے کام محبت کا بن گیا — اک دولت تھی کہ آگ میں پڑ کر نکھر گئی
بیجا لگی ہوس کے چھٹے سارے مشغلے — اے دل! نگاہِ یار یہ کیا سحر کر گئی!

"نگاہِ یار" کا سحر کہئے یا عشقِ حقیقی کا اعجاز جس نے آکسفورڈ کی فضا میں پلی ہوئی ذہنیت کو اُن روحانی بلندیوں پہ پہنچا دیا جن کا پتہ مندرجہ ذیل اشعار سے چلتا ہے:۔

تنہائی کی سب راتیں، اب ہونے لگیں اُن سے — خلوت میں ملاقاتیں تنہائی کی سب راتیں
ہر آن تسلی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے — ہر وقت ہے دلجوئی، ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے وعدے ہیں — ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت — اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں!
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں — بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

اس راز و نیاز کو سمجھنا اور ان بلندیوں کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ یہ مقامات سرحدِ ادراک کے پرے اور عقلِ انسانی کی دسترس سے باہر ہیں۔

سو جھنا کیا ہمیں ان آنکھوں سے — شرط تھی قلب کی بینائی کی!

تھوڑی دیر کے لئے "قلب کی بینائی" سے کام لیجئے اور بیت المقدس میں "مسجد عمرؓ" کے اُس گوشے پر نظر ڈالئے جہاں کوئی عشق کا مارا مصروفِ خواب ہے۔ پھر ان اشعار پر غور کیجئے:۔

یوں بچ سکو تو خندۂ حشر سے تو ہاں — مار و دیارِ غیر میں ہم کو وطن سے دُور

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں — آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا سزا کے بعد

بے گناہی سے بڑھ کر ہے اگر کوئی گناہ — تو سزائے عشق پا کر بخدا تقصیر ہے

شاید کہ آج حسرتِ جوہر نکل گئی — اک لاش تھی پڑی ہوئی گور و کفن سے دُور

اور سوچئے کہ کیا "ایک شہید" کے افکار سے بڑھ کر اس کی قوم کے واسطے کوئی میراث ہو سکتی ہے؟

مظہر عزیز ایم اے

ہماری بزم طرب

صراحی مے کی لے کر سوئے گلشن جب میں جاتا ہوں
کہ پھولوں میں کروں کچھ دیر شغل بادۂ و مینا

مری بزم طرب میں ہوتے ہیں دو اور ہم صحبت
قمر چرخ بریں پر اور زمیں پر خود مرا سایا

قمر پیتا نہیں خوبی ہے یہ میرے نصیبوں کی
پھر اُس پر یہ کہ سایہ بھی مری شرکت نہیں کرتا

مگر پھر بھی اکیلے بیٹھ کر پینا نہیں پڑتی
یہ دونوں میرے ساتھی چھوڑتے مجھ کو نہیں تنہا

میں گاتا ہوں تو سایہ میرا خاموشی سے سُنتا ہے
اگر میں رقص میں آؤں تو وہ بھی ساتھ ناچے گا

میں جب تفریح کر کے گھر کی جانب واپس آتا ہوں
مری بزم طرب کا خاتمہ ہوتا ہے گویا

مگر یہ دونوں ساتھی میرے مجھ سے کب بچھڑتے ہیں
قمر بھی ساتھ چلتا ہے جب [illegible] ہیں اور مرا سایا

ابوالفضل صدیقی

ہمارے میر صاحب

میر صاحب تھے تو ٹپیالہ کے رہنے والے مگر "لکھنوی ساخت" کے آدمی تھے۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ پیر، چکور کی سی دھنسی دھنسی ہوئی آنکھیں، چوسا ہوا لمبوترہ چہرا، بشرے پر "شاعری" کی علامات "شدت" کے ساتھ نمودار، اور کھانے پینے کے معاملے میں صرف سونگھنے کے قائل۔ ان میں اگر کوئی خوبی تھی تو یہی کہ باتیں کرتے تھے۔ دنیا جہان کا کوئی موضوع ان کی دسترس سے باہر نہ تھا۔ گفتگو کرنے بیٹھتے تو یوں معلوم ہوتا کہ دریائے علم کا کوئی "گلیشیئر" ٹوٹ گیا ہے۔ ایک سیلاب ہے جو امڈا چلا آرہا ہے۔ فلسفے پر "طبع آزمائی" ہو رہی ہے تو مشرق و مغرب کے تمام جدید و قدیم فلسفہ کا "عرض و طول" ناپ گئے۔ ریاضی و سائنس، موضوع گفتگو ہے تو یوں معلوم ہوگا کہ کسی آئن سٹائن یا "دل محمد" کی روح اُن میں حسلول کرآئی ہے۔ علم و ادب پر حملہ کرنے کی ٹھانی، تو یوں سمجھئے کہ دفتروں کے دفتر کھنگال کر ہی دم لیں گے۔ غرض ہر وقت باتیں! —— باتیں!! باتیں!!!

پھر ستم یہ، کہ جو اناپ شناپ آپ کے منہ سے نکل جائے اُسے سولہ آنے ٹھیک سمجھئے، اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اُن کے ایک حرف کی بھی تردید کرسکے۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ انہیں چھیڑ کر خواہی نخواہی دن بھر کی بخ بخ مول لے —— میر صاحب کی گفتگو کا ایک خاصہ یہ بھی تھا، کہ اگر وہ بول رہے ہیں تو بس وہی بول رہے ہیں۔ اس تیزی، روانی، اور تسلسل سے گفتگو فرماتے کہ دوسرے کو درمیان میں بولنے کا موقع ہی نہ ملتا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ننھیال کی طرف سے پانچویں پشت میں میر صاحب کا سلسلہ نسب لکھنؤ کے ایک بھٹیارے جمن میاں سے ملتا ہے۔ جو بقول میر صاحب "لکھنو بھر میں زبان و بیان کے استاد مانے جاتے تھے"۔ اور میر صاحب کو اپنی اس "لکھنوی رشتہ داری" پر یک گونہ ناز بھی تھا۔ چنانچہ وہ اکثر فخریہ کہا کرتے ہیں "ارے میاں تم پنجابی ڈھگے کیا جانو اردو کہتے کس چڑیا کو ہیں! اور اس بولی کو بولتے کیونکر ہیں! اپنا تو یہ ایمان ہے کہ یہ زبان جمن میاں کے گھر سے ہی نکلی ہے۔ اس خاکسار کی زبان میں بھی آپ کی دعا، اور اللہ پاک کی برکت سے جو شیرینی اور مٹھاس ہے یہ سب اُسی "سرکار" کا فیض ہے۔ ورنہ ......!"

اُس کے علاوہ میر صاحب تعلیم کے سلسلہ میں کچھ عرصہ "علی گڈھ" کی ہوا بھی کھا چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہاں بھی ٹپراٹپرا "ظفر علی خان" تیار ہوتا ہے۔ ان حالات میں "یہ نیم چڑھا کریلا" جتنا بھی کڑوا ہوتا۔ کم تھا۔

ہمارے کالج میں میر صاحب بی اے کے آخری سال میں داخل ہوئے۔ ہوسٹل پہنچے تو بدقسمتی سے انہیں میرے کمرے میں ہی جگہ دی گئی۔ پہلے کچھ روز تو میر صاحب نے تکلفات میں گذارے۔ لیکن آخر فطرت، فطرت ہے۔ بدل نہیں سکتی۔ چند دن تو معاملہ "السلام علیکم" سے آگے نہ بڑھ سکا۔ مگر ایک روز چائے کی میز پر انہوں نے "اجی حضرت" کہہ کر جو سلسلہ کلام شروع کیا تو —— ہٹلر —— پنڈت نہرو —— مسلم لیگ —— پان خوری —— علامہ اقبال —— روس —— استاد جمن —— ان سب پر سے پھرتے پھراتے اپنی شاعری پر آکر ختم ہوئے۔ ادھر میں فطرتاً ذرا کم گو اور جیبوسا ہوں۔ میر صاحب فراٹے بھرتے ہوئے جا رہے تھے۔ اور میں یہ سوچ سوچ کر گھبرا رہا تھا کہ الٰہی ان سینکڑوں

باتوں کا میں کیا جواب دوں گا؟ لیکن جلد ہی یہ معلوم کر کے ایک قسم کی روحانی خوشی ہوئی کہ میر صاحب کی تقریریں ختم نہیں ہوا کرتیں۔ اس بحرِ بے کراں کا کنارا کوئی نہیں۔

اس روز کے بعد گو میں نے انتہائی کوشش کی کہ میر صاحب مجھ سے مزید "تکلف" نہ ہونے پائیں۔ ہزار ناک سکیڑ سکیڑ کر باتیں کرتا۔ روکھے پھیکے جواب دیتا لیکن میر صاحب نے بھی گویا قسم کھا رکھی تھی کہ وہ "شیر و شکر" ہو کر ہی دم لیں گے۔ تعارف اور بے تکلفی کے اس درمیانی وقفے میں ان کی بے چینی اور بے قراری دیکھ کر میں اکثر محسوس کرتا کہ ان کے سینے میں کوئی طوفان بند ہے۔ جسے وہ آزاد کر دینا چاہتے ہیں کبھی اُٹھتے کبھی بیٹھتے کبھی شعر گنگناتے اور کبھی پان کی پیک پھینک پھینک کر دیواروں اور فرش کا رنگ بدلنے کی مسلسل کوشش میں مصروف رہتے۔ اس وقت تو میں اُن کی اس بے قراری کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ مگر بعد میں معلوم ہو گیا کہ اس اضطراب کی وجہ میری فطری اور اُن کی جبری خاموشی تھی ——— خیر آخر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ یعنی میر صاحب مجھ سے بے تکلف ہو گئے۔

اب کیا تھا۔ ہمارے کمرے میں ہر وقت محفلیں ہونے لگیں۔ چار چار پہر کی باتیں کبھی موسیقی پر لاٹھی چارج ہو رہا ہے۔ کبھی لہک لہک کر "مطلع عرض" کیا جا رہا ہے۔ پھر ان کے شعر پڑھنے کا انداز بھی کچھ ان کا اپنا ہی تھا۔ خود اُن کا بیان ہے کہ انہوں نے یہ انداز استاد حسن کے پوتے کلن کے یہاں سے اڑایا ہے ——— اس "مطلع عرض ہے" کے سلسلہ میں یہ بات خاص دلچسپی کے ساتھ سننے کے قابل ہے کہ جب تک سامعین سے جبری طور پر داد وصول نہ کر لیتے۔ اگلا مصرع قطعاً نہ پڑھتے۔ چنانچہ ہم نے بھی سمجھ لیا تھا کہ جس طرح میر صاحب پر کلام سنانا فرض ہے۔ اسی طرح ہمارا بھی یہ فرض ہونا چاہیے کہ انہیں داد دینے میں بخل سے کام نہ لیں۔ ویسے بھی "مقطع عرض ہے" کو قریب کرنے کے لئے ہمارے لئے یہ نہایت ضروری تھا کہ داد دینے کے معاملے میں اپنی "زود فہمی" اور "تیز گفتاری" کا ثبوت دیں چنانچہ اکثر تو یوں ہوتا کہ ادھر میر صاحب نے مصرع کے چند الفاظ ہی فرمائے، اور اُدھر محفل میں واہ وا کا ڈونگرا برس گیا۔ حاضرین پھڑکنے لگے۔ ہر طرف سبحان اللہ۔ ماشاء اللہ کی صدائیں گونجنے لگیں لیکن اس سارے شور و غوغا میں "مکرر" کی آواز کبھی سنائی نہ دیتی تھی۔

امتحان کے دن قریب تھے۔ طلبہ کا رنگ زرد اور پروفیسروں کے چہرے خوفناک ہو رہے تھے لیکن میر صاحب اُسی رفتار سے جا رہے تھے۔ باتیں! شاعری!! شعر پڑھ رہے ہیں اور پیک پھینک رہے ہیں کبھی اپنے شعر گنگنا رہے ہیں کبھی جوش، جگر اور حفیظ کا "جھٹکا" ہو رہا ہے۔ ہوسٹل والوں کے لئے آپ ایک "تماشے" کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ جب دیکھئے بالی جم رہی ہے۔ میر صاحب بول رہے ہیں۔ باقی بیٹھے سر دُھن رہے ہیں۔ بارہا ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ میر صاحب کے "وجد آفریں" کلام سے کوئی صاحب یکایک "وجد آ" گئے۔ اور اُن کا ہاتھ (گھونسے کی شکل میں) میر صاحب کے چہرۂ مبارک پر جا پڑا۔

میں نے میر صاحب سے کئی مرتبہ عرض کیا کہ حضرت امتحان قریب ہے کیوں اس شغل بے کار میں میرا اور اپنا بیڑا غرق کرتے ہو؟ اپنے پر نہیں تو خدا کے لئے مجھ غریب پر ہی رحم کرو۔ میں تو پہلے بھی امتحانوں میں کئی بار . . . . . . نگران کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اور آخر کار اُن کے اس "مطلع عرض ہے" اور "مقطع عرض ہے" کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ یعنی دوسرے سال جب کالج کے داخلے شروع ہوئے، تو میں اور میر صاحب ایک بار پھر اُسی کلاس کے "داخلہ فارم" پر دستخط کر رہے تھے۔

سید ضمیر جعفری

اقبال کی سیاسی شاعری

(ایک نئے زاویۂ نگاہ سے)

"اقبال کی سیاسی شاعری۔ ایک نئے زاویۂ نگاہ سے" آپ کہیں گے ۔ یہ نیا زاویۂ نگاہ کیا ہے ؟ آج تک اقبال کی سیاسی شاعری پر کس زاویۂ نگاہ سے بحث کی گئی ہے ۔ کیا نئے زاویۂ نگاہ کا مطلب یہ تو نہیں کہ اقبال کی عظمت کو گھٹا کر ظاہر کیا جائے ؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے نزدیک اقبال کی شخصیت ان باتوں سے بالا تر ہے ۔ اس کی عظمت کو ایک معمولی پڑھا لکھا نوجوان گھٹانا بھی چاہے تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا ۔ اور نہ کبھی یہ بات میرے ذہن میں آئی ہے ۔ میں اقبال کو آپ لوگوں کی طرح اس دور کا سب سے بڑا شاعر اور فلسفی تصور کرتا ہوں ۔ اُس کا پایہ اتنا بلند ہے کہ ایسا شاعر سالہا سال تک پیدا نہ ہوگا ۔ آج وہ ہم میں نہیں ہے لیکن جب تک اردو شاعری زندہ ہے ۔ اقبال زندہ رہے گا ۔

اقبال کی سیاسی شاعری پر آج تک جن حضرات نے کچھ نہ کچھ لکھا ۔ انہوں نے یہی کہا کہ اقبال پہلے وطنیت کا حامی تھا ۔ پھر اجتماعی احساس و ادراک کی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا بین الاقوامیت اور انسانیت کا پیغام دینے لگا ۔ وہ اشتراکیت کا حامی تھا لیکن ساتھ ہی مذہب کی ضرورت کے سلسلے میں بڑا احساس تھا جمہوریت کا ذکر آیا تو کہہ دیا کہ اُس نے ایسی جمہوریت کی مخالفت کی جس میں چرب زبان اور گندم نما جو فروش قسم کے لوگ برسر اقتدار آجاتے ہیں غرضکہ اقبال نے جو کہا سچ کہا ۔ صرف سیاسی شاعری ہی نہیں اقبال کی شاعری کے کسی پہلو کو لیجئے ۔ ہمارے نقادوں نے عقیدت کے جذبے میں ڈوب کر اقبال کی پرستش کی ہے ۔ اس کی ہر بات کو پسند کیا ہے ۔ اور تضاد کو تسلیم ہی نہیں کیا حالانکہ اقبال انسان تھے پیغمبر نہ تھے ۔ وہ غلطی کر سکتے تھے ۔ اور پھر سیاسی شاعری میں تضاد کا نہ ہونا ناممکن ہے اس لئے کہ سیاست ایک ہر لمحہ بدلتی ہوئی چیز کا نام ہے ۔ اقبال شاعر تھا اور شاعر پر اس کے ماحول کی ہر غیر معمولی چیز اثر کر جاتی ہے ۔ رنگا رنگ کی سیاسی تحریکیں چلیں کئی قسم کے نظریات سامنے آئے ۔ ہو سکتا ہے کہ اقبال اُن سب کی کسی نہ کسی بات سے اتفاق رکھتا ہو ایک بات کو ایک وقت پر پسند کرتا ہو اور دوسرے وقت پر ناپسند کرتا ہو ۔ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ضرورت یہ تھی کہ اقبال کو اس کے اصلی رنگ میں پیش کیا جاتا عقیدت اور پرستش کے اظہار کے طریقے بیشمار ہیں لیکن اقبال کے کلام کی تنقید میں انہیں نظر انداز کر دینا ضروری ہے میرا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ پرستش کے نظریے کو چھوڑ کر ایک طالب علم کی حیثیت سے اقبال کا مطالعہ کروں اور بالکل غیر جانبدار ہو کر پرستش اور تنقیص دونوں سے الگ رہتے ہوئے ایک درمیانی راستہ اختیار کر لوں ۔

اقبال اور وطنیت :-

مجھے یاد ہے کہ علامہ اقبال کی وفات پر ہم لوگوں نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے ایک تعزیتی جلسے کا انتظام کیا تھا ۔ اور اس کی صدارت کے لئے کابینۂ پنجاب کے ایک رکن کو بلایا تھا ۔ ان صاحب نے صدارتی تقریر میں اس بات کا خیال رکھا کہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں سبھی کے لئے ہو ۔ وجہ یہ تھی کہ جلسے کی حاضری مذہبی اعتبار سے مخلوط تھی ۔ چنانچہ انہوں نے کہا ۔ اقبال کے ان دو مصرعوں میں ہمارے لئے ایک بڑا سبق پوشیدہ ہے ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

جلسے کے بعد مجھ سے دو دوست ملے جو اقبال کے بڑے مداح تھے۔ وہ مجھ سے کچھ اس طرح پیش آئے جیسے میں نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہے۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی کہنے لگے۔ اس شخص کو صدارت کے لئے بلانے میں کیا مصلحت تھی۔ میں نے کہا۔ اُن کے عہدے کی وجہ سے۔ میں نے وزیر اعظم کو بلانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ نہ آسکے۔ اس لئے انہیں بلایا۔ انہوں نے کہا۔ اس کی جگہ اگر تم صدارت کر لیتے تو بہتر تھا۔ میں گھبرا گیا کہ الٰہی انہوں نے میری تعریف کی ہے یا مذمت بہرحال میں نے اُن سے پوچھا کہ اس شخص کے خلاف آپ کو شکایت کیا ہے کہنے لگے۔ اس کمبخت نے اقبال کے اس مصرعے کو پسند کر کے اُس کی توہین کر دی ہے کہ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا اقبال نے تو بعد میں وطنیت کی شدید مخالفت کی ہے۔ اور وہ "ترانۂ ہندی" کو اپنے ایام کفر کی یادگار سمجھتے تھے۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ میں نے اُن سے کیا کہا۔ لیکن بات ختم ہو گئی۔

بعد میں اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ ترانۂ ہندی کو اقبال "ایام کفر" کی یادگار سمجھتے تھے۔ اور جہاں مسلم لیگ کے کسی جلسے میں ترانۂ ہندی پڑھا جاتا۔ لوگ اُسے مسلم لیگ نہیں کانگریس کہتے تھے۔ اس لئے تمام اسلامی اور سیاسی اجتماعات میں ترانۂ ملی پڑھا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ترانۂ ہندی اتنا ہی خطرناک ہے۔ جتنا مسلمان اسے سمجھتے ہیں۔ یا جس کے خلاف اقبال کے ذہن میں یہ ردّ عمل ہوا کہ

نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

کیا اتنا زبردست ردّ عمل جائز ہے؟ ترانۂ ہندی میں کیا لکھا ہے؟ ہمالہ کی بلندی۔ ہندوستان کی ندیوں کا حسن گنگا کا ذکر اور دو مصرعے اور جن پر بڑا اعتراض ہے ؎

۱۔ ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
۲۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

اقبال اسے اپنے ایام کفر کی یادگار سمجھیں لیکن ان کے کلام کے اوراق پلٹیں تو ہر جگہ ایسے خیالات مل جائیں گے۔ "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا" کے حق میں اقبال کی یہی سطور کافی ہیں جو انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی سے خطاب کی ہیں

"ہم سب ہندی ہیں۔ اور ہندی کہلاتے ہیں کیونکہ ہم سب کرۂ ارض کے اس حصے میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔"

رہا۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا تو اس کے لئے بانگ درا میں آگے چل کر دیکھیں۔ اقبال کیا کہتا ہے۔

یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند

پہلے ہندوستان سارے جہاں سے اچھا تھا، اور اب آسمان سے بھی اونچا ہو گیا ہے۔ ضرب کلیم میں ہندوستان کے متعلق لکھا ہے ؎

اس خاک سے اُٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لئے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب
جسم سرد پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب

اور بڑی بات تو یہ ہے کہ ؎

خاور کی اُمیدوں کا یہی خاک ہے مرکز

ان اشعار کے بعد آپ خود ہی بتائیے کہ ان کے آگے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کہاں تک قابلِ اعتراض ہے۔

اس کے بعد اقبال کے ترانۂ ملی کو لیجئے کہتے ہیں ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اور پھر وطنیت کے سیاسی تصور کو اس رنگ میں پیش کیا ؎

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

ساتھ ہی ذرا ایک اقتباس اُس مقالے سے بھی سن لیجئے۔ جو

اقبال نے مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں لکھا تھا۔ اس کے بعد ہم اس پر بحث کریں گے

"ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے۔ اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے۔ جس کی پرورش کے لئے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں۔ مگر زمانۂ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول ہے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا۔ اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے۔ اس لئے جب لفظ وطن کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔"

کیا وطن کا جغرافیائی تصور سیاسی تصور سے الگ ہے؟ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ اقبال وطن کے متعلق کہاں تک آ گئے آتا ہے؟ وطن سے محبت کرتا ہے۔ اسے غیروں سے آزاد کرانا چاہتا ہے۔ اور اس کے لئے قربانی دینے کو تیار ہے۔ وطن سے محبت۔ غیروں سے آزادی حاصل کرنا اور اس کے لئے قربانی دینا سیاست نہیں تو اور کیا ہے؟ سیاست کا مطلب ہے۔ ہر وہ چیز جس کا نظم و نسق حکومت پر اثر پڑے۔ اس لحاظ سے اقبال ایک خاص حد تک وطنیت کے سیاسی تصور کا حامی تھا۔ وہ سیاسی تصور کو آخری سیاسی نصب العین Ultimate Political Ideal سے خلط ملط کر دیتا ہے اگر ہم وطنیت کو اپنے مقاصد کی انتہا یا آخری سیاسی نصب العین قرار دیں تو یہ یقیناً اسلام سے ٹکر کھائے گی۔ لیکن محض سیاسی تصور ہونے کی بنا پر یہ خطرناک نہیں یہ عین اسلامی چیز ہے۔ خود سید جمال الدین افغانی نے تحریک اتحادِ اسلامی کا جو نظریہ پیش کیا تھا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ ہر اسلامی ملک پہلے اپنی اپنی جگہ پر آزاد ہو۔ اور پھر تمام ایک نظام کے ماتحت آ جائیں۔ اور جمال الدین افغانی خوب جانتے تھے کہ آزادیٔ وطن کے لئے وطنیت ہی ایک ایسا نعرہ ہے جو کام آ سکتا ہے۔ اور عارضی طور پر وطنیت کو ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک اصول ماننا پڑے گا

اقبال خود اتحادِ اسلامی کے حامی تھے۔ اور جمال الدین افغانی کے نظریات سے متفق۔ اس لئے حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے اسلامیان ہند کو ارتقا کے ذریعے اتحادِ اسلامی کی منزل پر پہنچانے کی جگہ یک لخت ہر چیز سے آشنا کر دیا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

اگرچہ زادۂ ہندم فروغِ چشمِ من است زخاکِ پاکِ بخارا و کابل و تبریز

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

اور پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اقبال جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے تو وہاں ایک مسلمان نوجوان چودھری رحمت علی کو پاکستان سے آشنا کیا۔ چودھری صاحب نے اقبال کے مشورے سے پاکستان کے متعلق جتنے پمفلٹ شائع کئے اُن میں پاکستان کو نیشنلسٹ نقطۂ نگاہ سے پیش کیا۔

اور پھر آپ حیران ہوں گے کہ اقبال وطنیت کے سیاسی تصور کو تو بُرا کہتے ہیں لیکن سیاسی مقصد کے لئے اتحادِ تورانی کا نسلی نعرہ بلند کرنے سے نہیں گھبراتے۔

بالِ جبریل میں تاتاری کا خواب ملاحظہ ہو

یکایک ہل گئی خاکِ سمرقند اٹھا تیمور کی تربت سے اک نور
شفق آمیز تھی اس کی سفیدی صدا آئی کہ میں ہوں روحِ تیمور
اگر محصور ہیں مردانِ تاتار نہیں اللہ کی تقدیر محصور
تقاضا زندگی کا کیا یہی ہے کہ تورانی ہو تورانی سے مہجور

اقبال جمعیتہ اقوام کا مخالف تھا۔ اُس کا یہ شعر کسے بھول سکتا ہے۔؟

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہرِ تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند۔

اور اقبال نے صحیح کہا ہے۔ جمعیتہ اقوام کا مقصد یہی تھا اور جب مقصد نیک نہ ہو تو جماعت کبھی نہ کبھی ٹوٹ ہی جاتی ہے یہی حال جمعیتہ اقوام کا ہوا ہے۔ اقبال نے جمعیتہ اقوام کے مقابلے پر جمعیتہ اقوامِ شرق کی تجویز پیش کی ہے۔ ؎

دیکھا ہے ملوکیت افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے
طہراں ہو اگر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

اقبال نے تین نظریے ہمارے سامنے رکھے ہیں۔ اتحادِ اسلامی۔ اتحادِ تورانی۔ اتحادِ مشرق۔ اتحادِ اسلامی سے اتحادِ مشرق تک جو ارتقا ہوا۔ اُس کی انتہا اتحادِ عالم ہونا چاہیے تھی۔ لیکن اقبال نے اتحادِ عالم کا تصور پیش نہیں کیا بلکہ بار بار یورپ کی مذمت کی ہے۔ کیا مشرق اور مغرب کا اتحاد ناممکن ہے؟ کیا ان دونوں میں کشمکش جاری رہے؟ اور کیا دونوں ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش کریں؟ ممکن ہے کہ اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ اقبال اور ہر مسلمان کے نزدیک دنیا کے تمام امراض کا علاج اسلام ہے، اگر مغرب اسلام قبول کر لے۔ تو مشرق اور مغرب میں کوئی کشمکش نہیں رہتی۔ لیکن ابھی تو تمام کے تمام مشرق نے بھی اسلام قبول نہیں کیا۔ ہندوستان کا بیشتر حصہ چین کی غالب اکثریت۔ جاپان۔ برما۔ ملایا۔ ہند چینی۔ فلپائن۔ یہ سب غیر مسلم ہیں۔ اگر ان سے بغیر اسلام قبول کئے کوئی اتحاد ہو سکتا ہے تو یورپ سے ایسا اتحاد کیوں ناممکن ہے؟ ایک اور بات ہے۔ یورپ کے قبول اسلام میں ابھی بڑی دیر ہے۔ اس عبوری دور TRANSITIONAL PERIOD میں امنِ عالم کے لئے کیا کیا جائے۔ اقبال اس کے متعلق خاموش ہے۔

اقبال اور اشتراکیت:۔

عصرِ حاضر میں دو بڑی سیاسی تحریکوں نے دنیا پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ ان میں سے ایک اشتراکیت ہے۔ اور دوسری فسطائیت۔ موخر الذکر ایک تازہ چیز ہے۔ اس لئے اقبال نے اس پر اپنی آخری کتابوں میں روشنی ڈالی ہے لیکن اشتراکیت سے اقبال بانگِ درا کے وقت سے متاثر تھا۔ اُس کی نظم خضر راہ کے ایک دو شعر ملاحظہ ہوں۔

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اور جاوید نامہ میں ؎

ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو | لن تنالوا البر حتےٰ تنفقوا
چیست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ | دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

سود کے متعلق ؎

از ربا آخر چہ می زاید فتن | کس نداند لذتِ قرضِ حسن
از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ | آدمی درندہ بے دندان و چنگ

زمین پر مزدور کا حق ؎

رزق خود را از زمیں بردن رواست | ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست

اور مساوات کے متعلق ؎

عبد مسلم کم تر از احرار نیست | خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست
پیشِ قرآں بندہ و مولا یکیست | بوریا و مسندِ دیبا یکیست

بالِ جبریل میں بھی اقبال نے اس نظم میں اپنے اشتراکی خیالات کو ظاہر کیا ہے۔ جس میں لینن خدا کے حضور میں کہتا ہے۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

فرشتے یہ کہتے ہوئے یہ پیغام خدا تک پہنچاتے ہیں ؎

تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی

اور پھر فرشتوں کے نام فرمانِ خدا ملاحظہ ہو ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو | کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی | اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ | جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

یہاں تک تو اقبال صحیح راستے پر آ رہا ہے لیکن ابھی تصویر کا دوسرا رُخ بھی موجود ہے۔ "خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست" کا مطلب کیا ہے یہی کہ امیر اور غریب، سرمایہ دار اور مزدور سب برابر ہیں۔ مزدور جب کسی ملک کی تعمیر میں سب سے زیادہ حصہ لیں گے۔ لوگوں کو روٹی دیں گے۔ بڑے بڑے کارخانے تعمیر کریں گے۔ غرضیکہ تمام کام کریں گے تو کیا انہیں حکومت کے نظم و نسق میں حصہ نہ دیا جائے۔ اقبال خود مساوات کا حامی ہے۔ اور مساوات کا مطلب یہ ہے کہ مزدور حکومت پر غالب آ جائیں گے لیکن اقبال کہتا ہے۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اس کا مطلب تو یہ ہے کہ مزدور سب کے برابر تو ہے لیکن اُس کے ہاتھوں میں حکومت دینا یہ ناممکن ہے۔ پھر اقبال بار بار جمہوریت کی مخالفت کرتا ہے ملاحظہ ہو ؎

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

اور ؎

اس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

یہی نہیں۔ اقبال آزادیِ افکار کے بھی خلاف ہے ؎

گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ
آزادیِ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

وہ سرمایہ داری کی مذمت کرتا ہے۔ اشتراکیت کی کسی حد تک تعریف کرتا ہے۔ جمہوریت کا مخالف ہے۔ مزدور کے ہاتھ میں حکومت دینے سے گھبراتا ہے۔ اور آزادیِ افکار کو ابلیس کی ایجاد بتاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ چاہتا کیا ہے؟ اقبال کسی شخصیت کا منتظر ہے۔ اُس کی نگاہیں کسی آنے والے مردِ با خدا۔ مومن۔ مجاہد۔ میر کارواں کی طرف لگی ہوئی ہیں جو انسانیت کامل کا مظہر ہو۔ اور اقبال کے نزدیک مکمل انسان میں یہ خصوصیات ہونا چاہئیں ؎

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

وہ قوت و شوکت کا خواہاں ہے۔ قہاری۔ جبروت اور اقتدار کی پرستش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ضربِ کلیم اور بالِ جبریل میں اُس نے انہی خصوصیات کے حامل پرند شاہین کو بہت اچھالا ہے۔ شاہین کے متعلق اقبال کے کچھ شعر سنئے۔ ان سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اُس کے خیالات کا رُخ کیا ہے۔

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقابِ سالخورد | اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر | وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

یہ چنگیزیت نہیں تو اور کیا ہے؟ آگے سنئے۔ شاہین کی زبانی کہلوایا ہے ؎

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا | لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

کیا اقبال اسی قسم کی شخصیت چاہتا ہے۔ جو محض لہو گرم رکھنے کی غرض سے کمزوروں پر ظلم کرتی رہے۔ جب علامہ اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان گئے تو واپسی پر مسولینی سے ملاقات کی۔ اور بعد میں مسولینی کے متعلق یہ شعر کہے

رومۃ الکبریٰ دگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر | اینکہ می بینم بہ بیداری ست یا رب یا بخواب
چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ | نوجواں تیرے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب
یہ محبت کی حرارت یہ تمنا یہ نمود | فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب
نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے | زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب

فیض یہ کس کی نظر کا ہے؟ کرامت کس کی ہے؟
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثل شعاع آفتاب

ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا کہنا عوام کا شیوہ ہے۔ وہ عوام جو غیر تربیت یافتہ ہوں جن میں فکر کا مادہ نہ ہو لیکن اقبال جیسے مفکر سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ اس نے مسولینی کی تحریک فسطائیت پر غور کئے بغیر ہی مسولینی کی تعریف کر دی ہو۔ اطالیہ نے کچھ عرصہ بعد حبش پر حملہ کیا اور سپین میں رجعت پسندانہ طاقتوں کو بے حساب مدد دی۔ اقبال نے یہ سب کچھ دیکھا اور مسولینی سے یہ کہلوایا۔

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم؟ — بے محل بگڑا ہے معصومان یورپ کا مزاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم — تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں — راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجا ہے نہ راج
آل سیزر چوبِ نَے کی آبیاری میں رہے — اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج

کیا مسولینی کے تمام جرائم پر اس لئے پردہ ڈال دیا گیا ہے کہ ایسے جرم دوسروں نے بھی کئے ہیں۔ مجرم ہر حالت میں مجرم ہے اور اسے برا کہنا چاہیئے۔ اگر ایک شخص چور ہے تو ضروری نہیں کہ ہر شخص چور بن جائے۔

مختصر یہ کہ

۱۔ اقبال اتحاد اسلامی کا حامی تو تھا۔ لیکن وطنیت کا بھی شروع سے آخر تک حامی رہا (وطنیت سے میری مراد تنگدلانہ وطنیت نہیں)
۲۔ اتحاد تورانی کی طرف اشارے سے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ نسلی اتحاد کا حامی بھی تھا۔
۳۔ مزدوروں کا بھلا چاہتا تھا۔ اور سرمایہ داری کا مخالف تھا۔
۴۔ مزدوروں کے ہاتھ میں زمام حکومت نہ دینا چاہتا تھا۔
۵۔ جمہوریت کا مخالف تھا۔
۶۔ آزادیٔ افکار کو ابلیس کی ایجاد سمجھتا تھا۔
۷۔ شخصیت پرست تھا۔ خواہ وہ فوجی طاقت ہی کے بل بوتے پر برسر اقتدار رہے۔
۸۔ اطالوی فسطائی انقلاب کو پسند کرتا تھا۔
۹۔ اس کا خیال تھا۔ کہ مندرجہ بالا خیالات کا مالک صحیح مسلمان ہے۔ کیا یہ درست ہے۔ کیا فسطائی خیالات اسلام کے نزدیک درست ہیں یا غلط۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اسلام اور فسطائیت میں ایک بعد المشرقین ہے لیکن اس مسئلے پر کبھی پھر غور کیا جا سکتا ہے۔

عبد السلام خورشید

الجھن

آشنائے رموز فطرت ہوں
جانتا ہوں، حیات کیا شے ہے
در حقیقت مرا تن خاکی
ایک ننھی سی خوشنما نَے ہے

اپنی سانسوں سے نَے نواز مرا
پھونکتا ہے اک آگ سی اس میں
گونج اُٹھتی ہے زندگی بن کر
ایک بے چین راگنی اس میں

نَے بکف نَے نواز پھرتا ہے
گاؤں میں، شہر میں، کہستاں میں
دشت میں، وادیوں میں، صحرا میں
باغ میں، بحر میں، بیاباں میں

گیت جو بے خودی میں گاتا ہوں
جانے اُن سب کا مدعا کیا ہے
آپ ہی آپ مضطرب ہو کر
گیت گا سکتی ہے کوئی نَے کیا

تخت سنگھ

تیاگ

افراد

سدھارتھ .... ناٹک کا ہیرو
شدھودھن ...... کپل وستو کا راجہ۔ سدھارتھ کا باپ
کبھلک .... شاہی رتھ بان۔
منتری .... وزیر
بدوشک .... درباری مسخرا
نٹ .... ایکٹر (مینجر)
پنڈت .... پروہت
دُکاندار ....

عورتیں:۔ جسودھا، سدھارتھ کی بیوی۔ کیچن، مالتی، کسم۔ محل کی باندیاں۔ طوائف وغیرہ

پہلا منظر:۔ شاہی محل سے ملحق باغ،

(ڈھلتے دن کا سماں بسنت کی آمد سے چاروں طرف عجیب سماں ہے گھنے درختوں میں سے محل کی عمارت کا کچھ حصہ جھلک رہا ہے۔ حوض کے کنارے جس میں کسی دیوتا کے نصب شدہ مجسمہ کے منہ سے پانی چھوٹ رہا ہے۔ مہاراج شدھودھن متفکر بیٹھے ہیں کھوئے سے ایک سنگِ مرمر کے تخت پر بیٹھے ہیں ـــــ بدوشک روش چھوڑ کر سبزے اور پھولوں کو روندتا ہوا گھبرائے ہوئے انداز میں فوارے کی جانب تیزی سے آتا ہے ......)

بدوشک:۔ (اونچی آواز سے) مہاراج بھالو ...... بھالو، مہاراج ......

مہاراج:۔ (چونک کر تخت چھوڑ کر اُس کی طرف آتے ہوئے) کیوں ـــــ بدوشک! کیا ہوا؟

بدوشک:۔ (ہانپتے ہوئے قریب آکر بوکھلایا سا، تماشا گروں (ٹھکا درست کر کے) کا ریچھ بدمست ہو کر چھوٹ گیا تھا۔ ہا ہا ہا۔ ظالم نے آج ختم ہی کر دیا ہوتا...... آخر آپ کے نام کی دہائی آڑے آئی۔ دراصل ......

مہاراج:۔ (کچھ پریشان ہو کر) احمق ...... تم ذرا سی بات کیلئے یوں ہی آسمان سر پر اٹھا لیتے ہو۔ ریچھ تھا تو کیا ہوا ـــــ پکڑا نہیں گیا؟

بدوشک:۔ جی ...... جی مہاراج! جی وہ تو ...... جبھی پکڑ لیا تھا۔ انہوں نے ...... دراصل ......

مہاراج:۔ (مسکرا کر) ڈرپوک کہیں گے۔ تمہیں کسی کو پریشان کرنا خوب آتا ہے۔ صبح سے نظر نہیں آئے۔ کہاں تھے اب تک؟

بدوشک:۔ وہ تو۔ ایں ...... وہ تو مجھے پوچھنا چاہئے تھا مہاراج ـــــ آج صبح سے اداس اداس آپ کو ڈھونڈا کیا ـــــ محل کا کونا کونا چھان مارا ـــ مندر اور رنگ شالا میں بھی دیکھا بھالا ...... دراصل ......

مہاراج:۔ بیکھو! ہمیں زیادہ پریشان نہ کرو ......

بدوشک:۔ مہاراج آپ کی سوں جو کھیل بھی صبح سے منہ میں گئی ہو۔

مہاراج:۔ (مسکرا کر) آگئے نہ آخر اپنی بات پر ـــ بھی چاہے کوئی موقع ہو۔ مگر تمہیں پیٹ نہیں بھولتا۔

بدوشک:۔ جی۔ مہاراج۔ دراصل ......

مہاراج:۔ مگر تم جیسے پیٹو کا کون اعتبار کرے۔

بدوشک: جی نہیں جی نہیں ۔۔۔۔۔۔ مہاراج دراصل ۔۔۔۔
بڑی رانی جی نے ایک تھال موتی چور کا بھینٹ کیا تھا اور
۔۔۔۔۔ چونکہ چونکہ دراصل ۔۔۔۔ جی تو آپ کے لئے
ڈوب رہا تھا۔ مگر اُن کا جی بھی رکھنا تھا سو وہ لڈو زہر مار کرنے
ہی پڑے ۔۔۔۔۔۔ دراصل ۔۔۔۔۔

مہاراج: اتنی محبت کے لئے شکریہ ــــ مگر تمہاری کم خوری
بھی حیرت ناک ہے۔

بدوشک: جی ۔۔۔۔ جی مہاراج ۔۔۔۔ دراصل ۔۔۔۔۔
میرا ہاضمہ آج کل خراب ہے۔ اب تو میری خوراک پہلے
سے آدھی بھی نہیں رہی ــــ (ذرا پہلو بدل کر) اور ۔۔
اور ۔۔۔۔ دراصل ۔۔۔۔ آپ نے بھی تو مجھے بھلا ہی دیا ۔۔
۔۔۔ کہئے وہ لڈوؤں کا وعدہ کیا ہوا ۔۔۔۔۔ مہاراج کمار
کی شادی بھی ہو گئی ۔۔۔۔ اب اُن کے ہاں بیٹا ہونے پر کوئی
رعایت نہ ہو سکے گی۔

مہاراج: اوہ ۔۔۔ تمہاری یادداشت کس قدر سچی ہے۔ مگر
صرف لڈوؤں کے لئے ۔۔۔۔ خیر ۔۔۔۔ ہم اپنے وعدے
پر قائم ہیں ــــ اب کی صرف کھانے بھر کو کیا لڈو ڈھیروں
میں دبا دیں گے۔

بدوشک: ہے ہے ۔۔۔۔۔ دراصل دراصل ۔۔۔۔

مہاراج: گھبراؤ نہیں منھ کھلا رکھیں گے۔

بدوشک: (آنکھیں بند کر کے ہونٹ چاٹتے ہوئے) پھر تو مزے
سے پڑے پڑے لڈو کھائیں گے۔ آہاہا (خوشی کے عالم
میں ناچتا ہے)

مہاراج: بدوشک ۔۔۔۔

بدوشک: (سہم کر رکتے ہوئے) جی مہاراج ۔۔۔۔۔ میں
دراصل ۔۔۔۔ خوشی ۔۔۔۔۔

مہاراج: دن ڈھل گیا ہے ــــ اب محل کو چلنا چاہئے۔

بدوشک: مگر ابھی میرا پیٹ باتوں سے بھرا ہوا ہے ۔۔۔۔

مہاراج: پیٹ باتوں سے بھر لیا تو لڈو کہاں ٹھونسو گے ۔۔

بدوشک: (بوکھلا کر) اے ۔۔۔۔ میں بھول گیا تھا۔ دراصل
۔۔۔۔ ایں آپ اس کی فکر نہ کیجئے۔

مہاراج: گھبراتے کیوں ہو ہم اپنے وعدے پر قائم ہیں ۔۔۔
چلو اب ۔۔۔۔ باتیں محل میں بھی ہو سکیں گی۔

بدوشک: (اُن کے ساتھ محل کی طرف مڑتے ہوئے) جی مہاراج
میں ہیں ۔۔۔۔ دراصل دراصل ۔۔۔۔

(منتری دو مصاحبوں کے ساتھ روش کی دہنی جانب سے داخل
ہوتا ہے)

منتری: (کورنش بجا کر) مہاراج ۔۔۔۔

مہاراج: (متوجہ ہو کر) منتری۔

منتری: دیا ندھان (پھر سر جھکا کر) تماشا گروں کو معقول انعام
دے کر رخصت کر دیا ہے۔ ابھی ابھی ایک نٹ منڈلی در دولت
پر حاضر ہوئی ہے ــــ حکم ہو تو انہیں پرمود کانن ــــ
بھیج دوں!

مہاراج: اس میں ہماری اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ تم
خود سمجھدار ہو ــــ مگر احتیاطاً ہر حالت میں لازم ہے
ــــ اس بوڑھے جوتشی کے الفاظ ابھی تک ہمارے
کانوں میں گونج رہے ہیں ــــ خبردار ــــ کوئی
دکھی، اپاہج، فقیر یہاں نہ پہنچنے پائے۔

منتری: احتیاط اور دوراندیشی میں اپنا فرض سمجھتا ہوں ــــ
امید ہے کہ آپ کو کوئی موقع شکایت کا نہیں ملے گا۔

مہاراج: تمہیں معلوم ہے سدھارتھ کے سوا اور ہمارے
پاس ہے ہی کیا؟ ــــ اس پہ مرنے والی کی نشانی ـــ
ہماری آنکھیں جب تک اُسے ایک بار دیکھ نہ لیں چین نہیں
پاتیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا اندھیری ہے ــــ
پیدا ہونے کے دن ہی سے وہ ایک محدود جگہ میں قید ہے
اور ایسی قید میں بیس برس بیت گئے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس
چار دیواری کے باہر کی دنیا کیسی ہے۔ اُسے نہیں معلوم
اُس خوشنما قید خانے کے باہر کیا ہوتا ہے۔ (آنکھوں
میں آنسو بھر کر) ہم جانتے ہیں یہ اُس پر بڑی سختی ہے ـــ
لیکن یہ خوشی اور سکون بھی ہے کہ یہ سب کچھ اُسی کی بھلائی

کے لئے ہے ــــ پرماتما کرے یہ پھول ہمیشہ خزاں کی گرم و تند ہوا سے محفوظ و ناآشنا رہے۔

منتری: آپ نچنت رہیئے بھگوان بھلی کریں گے۔

مہاراج: مگر اپنا فرض اور مصلحت ہمیشہ یاد رکھو۔ وہاں پرمود کانن میں کوئی نہ کوئی دلچسپی کا سامان ضرور رہے تاکہ سدھارتھ کو تنہائی نہ مل سکے۔

منتری: میں اس کے لئے انتہائی کوشش کر رہا ہوں۔

مہاراج: یہ سال کسی طرح گزر جائے۔ پھر منگل ہی منگل ہے ہم بھی راج پاٹ سدھارتھ کو سونپ کر بھگوت بھجن میں من لگائیں گے

منتری: راج گورو مہاراج کی بھی یہی رائے ہے . . .

مہاراج: اس کے باوجود خبردار اور چوکس رہو ــــ اب رتھ تیار ہونا چاہیئے۔ ہم پرمود کانن جائیں گے۔

منتری: بہتر ــــ اندھیرا ہو چلا ہے مشعل بردار کو . . . . .

مہاراج: نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم یونہی سیر دیکھتے ہوئے چلیں گے۔

(ــــ گئے ــ سین ختم ــ)

دوسرا منظر

پرمود کانن میں تھیئٹر ہال

(وسیع کمرے میں قندیلوں اور جھاڑوں کی رنگ برنگی روشنیوں سے عجیب سماں چھا رہا ہے۔ سامنے سٹیج پر چند آدمی بہروپ بھرے کھڑے ہیں۔ تماشائیوں میں سدھارتھ اور یشودھا کے علاوہ محل کی لونڈیاں باندیاں یا دو دو خادموں کے پرے نظر آتے ہیں۔ سازندے سازوں پر کلیان کی دھن بجاتے ہیں۔ نٹ (مینیجر) سٹیج کی دائیں جانب سے داخل ہوتا ہے۔ سازندے ہاتھ روک لیتے ہیں ــــ)

نٹ: آج تمہاری خوش قسمتی میں کوئی شک نہیں۔ آج تمہیں وہ سنہری موقع ملا ہے جو اس سے پہلے نہ زندگی بھر کبھی ملا اور نہ آئندہ ملنے کی اُمید ہے۔ مہاراج کمار یُغس نفیس تمہارا کمال دیکھنے کے لئے تشریف فرما ہیں۔ اگر تم اپنے ہنر کا اظہار خوش اسلوبی سے کر سکے تو راحت اور شہرت کی دیویاں تمہیں کامیابی اور خوشیوں کے سدا بہار پھولوں کے ہار پہنائیں گی۔ سٹیج پر کام کرتے ہوئے اپنے کردار میں اس قدر کھو جاؤ کہ نقل اصل کی طرح حاضرین کے ذہن پر چھا جائے۔ آنکھیں مصنوعی نظارے میں واقعیت کی جھلک پائیں۔ لب و لہجہ تلفظ اور زبان کی صحت کا خیال رہے۔ گفتگو میں روانی ہو۔ آواز بناوٹی اور کانوں کو بھدی محسوس ہونے والی نہ ہو۔ اگر ان سب باتوں کا خیال تم نے رکھا تو کامیابی تمہارے قدم چومے گی

ایک ایکٹر: آپ اس کی فکر نہ کیجئے۔ ہم اپنی عمر بھر کی مشق کو کام میں لائیں گے۔ صرف ڈرامے کا انتخاب اور سٹیج کے دوسرے کارندوں کو تنبیہ کر دینا کافی ہو گا۔

نٹ: سٹیج کا کوئی کارندہ۔ چاہے سازندہ ہو چاہے پردہ کھینچنے والا کام کے وقت تم سے اختلاف رکھ کر اپنی جگ ہنسائی کا باعث نہ بنے گا۔ رہا ناٹک کا انتخاب سو وہ ہم مہاراج کی خوشنودی کے لئے اپنے مشہور ڈراما نگار پنڈت وِاسشٹ کا کرونارس پر دھان ناٹک الفناف کھیلیں گے۔ پہلا منظر اور اس کے کردار تیار ہیں ــــ جاؤ تم بھی اپنی تیاری کرو ــــ

(سازندے نٹ کے اشارے پر سماج کی دھن بجاتے ہیں)

(پردہ اٹھتا ہے)

(طوائف کا مکان۔ راج پروہت اور سمن طوائف)

پروہت: اب مجھے جانے دو سمن باتوں میں بہت وقت بیت گیا۔ مجھے راج محل بھی پہنچنا ہے۔

سمن: بس جان لیا۔ بڑا پیار جتانے چلے تھے۔ کیا راج محل مجھ سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

پروہت: یہ بھی ایک ہی کہی۔ کاش میں تمہیں اپنا دل چیر کر دکھا سکتا۔

سمن: یہ سب منہ رکھنے کی باتیں ہیں۔ بیٹھ جائیے تو نہ جانے کیا

کہتے ہوں گے۔

پروہت: تم کو یقین نہ آئے گا۔ میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔

سمن: تو پھر کیا میرے ہاں بھوت ناچتے ہیں۔ جو آتے ہی جاؤں جاؤں کی رٹ لگا دیتے ہیں۔

پروہت: شک کرنا تو تمہاری عادت میں داخل ہے کبھی کبھی ایسا کام آ ہی پڑتا ہے کہ اپنی پیاری سے پیاری چیز کو بھی تھوڑے عرصے کے لئے چھوڑتے ہی بنتی ہے۔

سمن: سارا دن پرائے کام ہی کرتے پھرتے ہو۔ کہئے میرا کون سا کام اب تک کیا۔ بھولے سے ایک جھومر کے لئے کہہ بیٹھی تھی مگر یہ دن آیا ہے کوئی خبر نہیں۔ معلوم نہیں موئے سنار کو مراق ہو گیا یا مراّق دیوالیہ ہو گیا ہے۔

پروہت: اوہ مطلب کی بات تو اب کہی تم نے۔ خاطر جمع رکھو جھومر بھی آ جائے گا۔ مگر اب تو اجازت . . . .

سمن: پروہت جی اگر جھومر کے نام سے گھبراہٹ ہے تو آئندہ میں اس کا ذکر نہ کروں گی۔ آپ بیٹھئے تو سہی لیجئے ایک پیالی مدرا۔

پروہت: نہیں سمن . . . . . .

سمن: (پیالی اُس کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے) آپ کو میری سوں۔

پروہت: تمہارا کہنا ٹالنا ناممکن ہے (ڈرتے جھجکتے پی جاتا ہے)

سمن: ایک اور۔

پروہت: نہیں بس۔ بہت تیز ہے اور پھر وقت کا بھی خیال چاہیئے۔

سمن: آپ کی مہربانی کا شکریہ۔ میرے بھاگ کتنے اچھے ہیں کہ آپ جیسے مہاپرش جو کسی کے ہاتھ کا پانی نہیں پیتے میرے ہاں کی شراب بھی پی لیتے ہیں۔

پروہت: چپ۔ ایسی باتیں نہ کہو۔ تم زہر بھی دو تو انکار نہیں اچھا تو آخری پیار . . . . مجھے دیر ہو رہی ہے۔

(پروہت گیا۔ نائکہ آتی ہے)

نائکہ: (سمن کی دلالہ) پروہت جی گئے سمن — جھومر کا کیا ہوا؟

سمن: وارا و چھا پڑا ہے مگر آخر کہاں تک۔

نائکہ: ان جیسے مگلے بھگتوں سے جیسے بھی ہو جلدی کام نکالنا چاہیئے۔ اری مجھے یاد نہ رہا۔ استاد جی انتظار کر رہے تھے۔ شام کو راج سبھا بھی تو چلنا ہے۔

سمن: اوہ میں تو بھول ہی گئی (جاتی ہے نائکہ بھی ایک طرف کو گئی) (پردہ گرتا ہے)

راستہ:

(چند لڑکے کھیل رہے ہیں۔ پروہت جی لمبے لمبے ڈگ بھرتے جا رہے ہیں ان کا پٹکا گر پڑتا ہے)

پہلا لڑکا: ارے وہ اُن پنڈت جی کا کچھ گر پڑا (اٹھا کر) ریشمی پٹکا۔

دوسرا: وہ ابھی دور نہیں گئے ان کو دے دینا چاہیئے۔

پہلا: جانتے ہو وہ برہمن ہیں اور ہم چمار۔ الٹے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

دوسرا: خیر دیکھا جائے گا۔ (پروہت جی پٹکے کی تلاش میں لوٹتے ہیں) پنڈت جی یہ آپ کا پٹکا۔

پروہت: اوہ میں اسی کی تلاش میں تھا۔ اچھا کیا۔ جیتے رہو۔ آشیرباد۔ کسی کسان کے بیٹے ہو؟

لڑکا: جی نہیں جمّو چمار کا لڑکا ہوں

پروہت: (گھبرا کر) ارے چمار! (غضبناک ہو کر) چنڈال میرا دھرم بھرشٹ کر دیا۔ نارائن نارائن۔ نالائق کس نے کہا تھا میرے کپڑے کو چھو!

لڑکا: مہاراج کہیں چھونے سے بھی کوئی چیز ناپاک ہو سکتی ہے ہر روز آپ اُسی دھرتی پر چلتے ہیں جس پر ہم بھی چلتے ہیں۔ اس طرح سے تو آپ ہر روز اپنا دھرم ناش کرتے ہیں۔

پروہت: بے حیا۔ لڑکے۔ تیرے سر پر موت کھیل رہی ہے ٹھہر تو سہی تجھے اس ڈھٹائی کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا —

(غصے میں بھرا ہوا جاتا ہے۔ لڑکے سہمے سے ایک طرف کو نکل جاتے ہیں) (پردہ اٹھتا ہے)

دربار

(راجہ ایک اونچے سے تخت پر بیٹھے ہیں۔ پروہت اور دوسرے اہلکار حاضر ہیں چمار کے لڑکے کا مقدمہ پیش ہے۔ تماشائی خاصی تعداد میں جمع ہیں)

راجا:۔ پروہت جی ہماری طرف سے آپ کو ہر فیصلہ کرنے کا پورا اختیار ہے۔
اس گناہگار کے لئے ایسی سزا تجویز کیجئے کہ آیندہ کے لئے دوسروں کو کان ہو جائیں۔

پروہت:۔ دھرم شاستر کی بھی یہی آگیا ہے۔ دھارمک معاملوں میں راج نیتی رہنمائی نہیں کرسکتی۔

لڑکے کا باپ:۔ (نمناک آنکھوں سے التجا کرتے ہوئے) مہاراج آپ برہمن ہیں دیا اور انصاف آپ کا دھرم ہے۔ میرے لڑکے کی کوئی خطا نہیں۔ اُسے معاف کیجئے۔ بالک ہے آئندہ ایسی غلطی نہیں کرے گا

پروہت:۔ بڈھے پاگل ہوگیا ہے۔ جا اس قصور کے لئے کوئی رعایت نہیں ہوسکتی۔

لڑکے کا باپ:۔ مہاراج وہ تو سادھو برہمنوں کا بڑا سیوک ہے۔ دھرم کی باتوں میں وہ بڑا اچھر ہے۔ ٹھاکر جی کا پاس بھی کرتا ہے۔

پروہت:۔ یہ لیجئے مہاراج۔ اِن چنڈالوں کا دوسرا قصور۔ چمار ہوکر ٹھاکر پوجنے چلے۔ اُف کس قدر ازتھ کی بات ہے۔

ایک سپاہی:۔ یہ تو ہماری آنکھوں دیکھی بات ہے مہاراج۔ جب ہم اسے بندی کرنے گئے تو یہ ایک مٹی کی مورتی کے آگے جھکا ہوا تھا۔

پروہت:۔ (غصے سے) سُن رہے ہیں۔ یہ نیچ پاپی۔

راجا:۔ سُن رہا ہوں آپ کی کیا رائے ہے۔

پروہت:۔ دھرم شاستر میں ٹھاکر پوجا اور ودیا پڑھنا صرف برہمن اور چھتری کے لئے ہے۔ شودر کی بھگتی یہی ہے کہ وہ سچے دل سے اپنے سے اونچے رتبے والوں کی سیوا کرے۔ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کے لئے زندہ آگ میں جلا دینے کا حکم ہے۔

لڑکے کا باپ:۔ (دھاڑیں مار کر روتے ہوئے) ہے ہے مہاراج یہ کیا ازتھ کرتے ہیں۔ دیا کیجئے کر پا ندھان دیا کیجئے۔ میں بوڑھا اس صدمے کو برداشت نہیں کرسکوں گا۔

پروہت:۔ اس سے زیادہ اور کیا دیا کرسکتا ہوں کہ تیرے بیٹے کو مکتی دان دے کر اس اواگون کے چکر سے ہمیشہ کے لئے آزاد کر رہا ہوں۔ رہا تمہارا اس صدمے سے جانبر نہ ہونا۔ سو تمہارا بھی اب مر جانا ہی بہتر ہے۔ مکتی کے لئے اور اس سے اچھا موقعہ نہیں ــــ مہاراج اپرادھی کے لئے یہی سزا کافی ہے۔ اس پر عمل نہ کیا گیا تو بھگوان دھرم کا ناش ہوتے دیکھ کر اس دیش پر وہ کوپ کریں گے کہ پھر اُس کا اپایے مشکل ہوگا۔

راجہ:۔ (سہم کر) مہاراج ایسا نہ کہئے۔ آپ کی آگیا انوسار ہی ہوگا۔ سپاہیو اس نیچ کو زندہ آگ میں جھونک دو ــــ اب دربار برخاست!

(بوڑھا غش کھا کر گر پڑتا ہے۔ سپاہی مجرم کو لے گئے۔ بے ہوش بوڑھے کو روندتے چلے جاتے ہیں (پردہ گرتا ہے)

(تماشائی تماشے میں کھوئے ہوئے ہیں سدھارتھ چہرے پر غم کے اثرات لئے چپکے سے اُٹھ کر چلا جاتا ہے۔ سازندے بیس راگ کی غمگین دھن بجاتے ہیں)

حسودھا:۔ (اُٹھتے ہوئے) ہمارے راج کمار اچانک اٹھ کر آرام گاہ کو چل دیئے نہ جانے کیوں؟ مجھے اُن کے پیچھے جانا چاہئے۔ (ایک ہار گلے سے اتار کر اور نقدی کی تھیلی اُن نٹوں کو دے کر) یہ تمہارا انعام ہے . . . . (حسودھا جاتی ہے)

سب حیرت اور خاموشی کے عالم میں کھڑے رہ جاتے ہیں۔

(سین ختم ہوا)

تیسرا منظر

پرمود کانن کا ایک حصہ

(مختلف مرمریں ستون محل کی چھت کو سنبھالے ہوئے ہیں جگہ

(یکہ سنگ تراشی کے دلفریب نمونے نصب ہیں۔ فانوس اور جھاڑ روشن ہیں۔ چند خواصیں ادھر اُدھر جھاڑ پونچھ رہی ہیں)

ایک:۔ (ایک پری کے مجسمے کو کپڑے سے پونچھتے ہوئے) میں حیران ہوں کنچن! مہاراج کمار اتنی دلچسپیوں کے باوجود اس قدر اداس کیوں رہتے ہیں۔

کنچن:۔ مجھے آپ بڑی حیرانی ہے۔ اُن کا پھول سا چہرہ کئی دنوں سے کمھلایا سا رہتا ہے۔ اُن کی وہ کمل سی مسکراتی ہوئی آنکھیں کسی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

پہلی:۔ (رازدارانہ لہجے میں) بہن سچ پوچھو تو ایک جگہ رہتے ہوئے بھی آدمی اکتا جاتا ہے۔ بچپن کی بات اور ہے مگر اب تو مہاراج کمار سب کچھ سمجھتے ہیں۔ نہ جانے مہاراج کی اس سختی سے کیا مراد ہو سکتی ہے۔

کنچن:۔ (جھجک کر) دیواریں بھی کان رکھتی ہیں! مردار! آفت ڈھانا چاہتی ہے۔

پہلی:۔ اے تم اتنی جلدی چڑ جاتی ہو۔ میں نے تو بات میں بات کہہ دی کیا برا کیا۔

کنچن:۔ دریا کا بند جب ٹوٹتا ہے تو تھوڑے سے شگاف سے بہہ نکلتا ہے مگر پھر اُس کے بہاؤ کا رکنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے ___ چھوڑو اس بحث کو کوئی کام کی بات کرو۔ کہو میری راج کماری سے آج کیا اینٹھا۔

پہلی:۔ تمہیں تو بس انہی باتوں کی پڑی رہتی ہے۔ اُن کی تو کئی دن سے صورت بھی نہیں دیکھی۔ معلوم نہیں کہاں رہتی ہیں سارا دن۔

کنچن:۔ وہ بڑی ست ونتی ہے کُسم! (مخاطب کا نام) دیکھتی نہیں ہو کیا پتی کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہتی ہے۔ پرماتما انہیں دودھوں نہائے پوتوں پھلائے۔

کُسم:۔ میں تو جانوں آج کل اُن کے پاؤں بھاری ہیں۔

کنچن:۔ پرماتما تمہاری زبان مبارک کرے ___ مگر یہ تو کہو آخر مہاراج انہیں اپنے سے اس قدر دور کیوں رکھتے ہیں۔

کُسم:۔ یہ راز کی بات ہے۔ سنو ___ مگر پہلے دیکھ لو کوئی چھپ کر سن نہ رہا ہو۔

کنچن:۔ (ایک دم گھبرا کر) اے ...... اب ہوش آیا۔ مردار اپنے ساتھ میری گردن بھی مروائے گی۔ (چاروں طرف دیکھ کر) وہ مالتی تخت کے پاس اُونگھ رہی ہے۔

کُسم:۔ دیکھو کہیں مکر تو نہیں کر رہی۔

کنچن:۔ (تخت کے پاس جاکر) مالتی ___ مالتی۔ سوگئی موئی سندر کی آگ بجھانے گئی ہے صبح سے پہلے اُٹھے گی۔

کُسم:۔ (اُسے جھنجھوڑ کر) اری مالتی۔ یونہی کام کرتی رہوگی دن بھر..

مالتی:۔ (ہڑبڑا کر) کون ___ کسم ___ اے تم نے تو ڈرا ہی دیا مجھ کو

کنچن:۔ (طنزاً) کیا شان ہے مہارانی کی۔ واہ کیا کہنے نزاکت کے۔ مردار اگر ایسے ہی آرام کی ضرورت تھی تو کسی راجہ کے ہاں جنم لینا تھا۔ یہاں تو کام کرنا ہوگا کام!

مالتی۔ جان کو کیوں آتی ہو۔ کام کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ یہاں ذرا کو بیٹھی تھی کہ نگوڑی نیند نے آدبایا....

کُسم:۔ بڑی کام چور ہو تم۔ پہر بھر سے سوئی پڑی ہو۔ ہم بھلا کہاں تھیں موئی اپنے ساتھ ہم کو نکلوائے گی۔

مالتی:۔ (ذرا تنک کر) مگر کیوں چلاتی ہو تم نے کون سا پہاڑ ڈھا لیا اتنے میں جو دار دندین کے آئی ہو میرے سر پر۔ وہ تخت ترتیب سے رکھنے تھے۔ ابھی ویسے ہی بے ڈھبے پڑے ہیں۔ مہاراج کماری کے کان بھرنے پر آؤں تو تم ایک پل نہ ٹھہر سکو۔

کنچن:۔ (معاملہ ٹالنے کو۔ مسکرا کر) اے ہے تم تو یونہی چڑ گئیں۔ ہم تمہیں سچ مچ تھوڑی ڈانٹ رہی تھیں۔ کھڑے کھڑے یونہی جی میں آئی۔ ذرا دیکھیں تم کتنے پانی میں ہو۔

مالتی:۔ چل دور ہو بے حیا۔ مجھے بناتی ہے ___ میں نہ سمجھی کہ یہ دونوں آج کیوں پیچھے جھاڑ کر میرے گرد ہو رہی ہیں۔

کُسم:۔ تم بھی تو بڑی چیز بنی پھرتی تھیں۔ دیکھا ایک ہی داؤں میں چاروں شانے چت کر دیا۔ کہو ہاریں؟

مالتی:۔ میری جوتی۔ (سامنے دروازے کی طرف دیکھ کر) ہوشیار

مہاراج کمار تشریف لا رہے ہیں۔

(سب اپنے اپنے کام میں لگ جاتی ہیں تھوڑی دیر کے بعد سدھارتھ کھوئے سے انداز میں افسردگی سے سر نیچا کئے داخل ہوتے ہیں)

نیتول:۔ (ہاتھ باندھ کر) شری مہاراج کمار کو پرنام۔

سدھارتھ:۔ (سر کے اشارے سے سلام کا جواب دے کر) آج ہمارا جی اداس ہے کنچن کچھ دیر اکیلے میں رہیں گے۔ کوئی بغیر اجازت اندر نہ آنے پائے۔

کنچن:۔ (سر جھکا کر) جو آگیا مہاراج (وہ جاتے ہیں فوراً بعد جسودھا تیزی سے آتی ہے)

نیتول: (حسب سابق) مہاراج کماری کی جے ہو۔

جسودھا (بے چینی سے دھیان نہ دیتے ہوئے) وہ ابھی یہاں آئے تھے؟

کنچن: خوابگاہ میں تشریف لے گئے ہیں۔

جسودھا:۔ (ادھر کو قدم بڑھاتے ہوئے) میرا خیال ٹھیک نکلا...

کنچن:۔ (خوفزدہ سی) مگر مہاراج کماری جی .....

جسودھا:۔ (وہیں رک کر) کہو۔

کنچن:۔ (ڈرتے ڈرتے) ان کا جی اچھا نہیں۔ اکیلے میں رہیں گے تاکیدی حکم ہے کہ کوئی بے اطلاع اندر نہ آنے پائے۔

جسودھا: جب تو میرا وہاں جانا اور بھی ضروری ہے۔ (قدم اٹھاتی ہے)

کنچن:۔ (گھبرا کر لجاجت سے) مہاراج کماری۔

جسودھا: تم بے فکر رہو۔ میں ان کی طبیعت کو جانتی ہوں

(تیزی سے جاتی ہے سب باندیاں خوف و حیرت کے اثرات چہرے پر لئے بت بنی کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہیں۔)

(سین ختم)

چوتھا منظر

خوابگاہ

(شاہی ٹھاٹھ کا وسیع کمرہ سدھارتھ پرتکلف مسہری پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ایک جوکی پر بیٹھی ہوئی جسودھا سے باتیں کر رہے ہیں)

جسودھا:۔ آپ کے سکھ سے مجھے سکھ اور دکھ سے دکھ ہوتا ہے یہ جانتے ہوئے بھی آپ اپنی اداسی کی وجہ مجھے کیوں نہیں بتاتے؟

سدھارتھ:۔ (نگاہیں زمین پر گاڑے ہوئے) میں اکیلا تھا میری دنیا سونی اور اندھیری تھی تم نے پورنما کے چاند کی طرح آکر اسے روشنیوں سے بھر دیا نہیں تو نفیس جسودھا جس کی وجہ سے میرے یہ تنہا اور بے کیف دن آسانی سے بیت گئے۔ اب میرے ماحول میں چند دن سے پھر ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو رہا ہے۔ میں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے میری کوئی قیمتی چیز کھوئی ہے یا جیسے میں کسی اجاڑ اور سونے صحرا میں کسی کو پکارتا پھر رہا ہوں۔

جسودھا: ایسا کیوں ہے میرے راجا یہاں کس چیز کی کمی ہے لونڈیوں باندیوں اور خادموں کی اس بھیڑ کے باوجود ویرانگی کیسی۔

سدھارتھ:۔ (جیسے کسی سوچ میں کھویا ہوا ہو) کچھ نہیں۔ یہ سب کچھ ۔۔۔ کوئی چیز نہیں ۔۔۔ اف۔ آج میں ایک گہرے خواب سے چونک اٹھا ہوں۔ میری آنکھوں سے کوئی پردہ اٹھ گیا ہے ۔۔ آہ...

جسودھا:۔ آج آپ کی باتیں عجیب و غریب ہیں۔ ایسا جان پڑتا ہے آپ کے کومل ہردے کو کوئی بھاری چوٹ پہنچی ہے۔۔

سدھارتھ:۔ سونی روح بھائیں بھائیں کر رہی ہے۔ میں نہیں جانتا آج مجھے کیا ہو گیا ہے۔

جسودھا:۔ (حیرانی سے اسے تکتے ہوئے) میں آپ کی پراسرار باتوں کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میرے راجا آپ کھل کر کیوں نہیں کہتے۔ اس اچانک غیر معمولی اداسی کا کیا سبب ہے؟

سدھارتھ: میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ کچھ نہیں کہہ سکتا ہے۔ روح بے زبان ہے۔ آنکھیں محبوس۔ آہ مجبوری مجبوری....

جسودھا:۔ معلوم ہوتا ہے ناٹک کے کسی پہلو سے آپ نے

بہت اُترا اُترا ہے۔ میں دیکھتی ہوئی جب سے آپ رنگ شالہ
سے اٹھ کر آئے ہیں۔ چہرہ اترا اترا سا ہے ـــــ مگر وہ تو محض
بناوٹ تھی۔ اور نٹوں نے صرف ہمیں خوش کرنے کے لئے
ان ہونی کو ہونی کر دکھایا۔۔۔۔۔۔

سدھارتھ: تم بھولتی ہو جسودھا اسی ناٹک کے اثر نے مجھے جیسے گہری خواب سے جگا دیا ہے میں محسوس کرتا ہوں جیسے کوئی زبردست طاقت مجھے اس چاردیواری سے نکل بھاگنے پر اکسا رہی ہے ـــــ اُف آج تک مجھے کتنے گہرے اندھیرے میں رکھا گیا۔ اُف دنیا اور اُس کی حقیقت۔۔۔

جسودھا: آج آپ کیسی اُلجھنوں میں پڑ گئے۔ چھوڑیے ان باتوں کو۔ ٹھہریئے میں آپ کا جی بہلانے کی کوئی تدبیر کرتی ہوتی ـــــ کُسم!

سدھارتھ: رہنے دو ـــــ اب یہ تھپکیاں اور خواب آور باتیں میری جاگتی روح کو نہیں سُلا سکتیں ـــــ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس چار دیواری کے باہر کے بسنے والے کیسے ہیں کس حال میں ہیں۔ یہ روشن سورج روز کہاں غائب ہو جاتا ہے اور یہ اندھیرے کا دل بادل کہاں سے آتا ہے۔ ایک نامعلوم سی آرزو اور ایک غم کی کسک مجھے بے حال کر رہی ہے ـــــ بیتابی اور بے کلی کا طوفان میرا جینا دوبھر کئے ہوئے ہے۔

جسودھا: آپ کو باہر کی دنیا دیکھنے کی اس قدر بے چینی کیوں ہے۔ یہاں کس چیز کی کمی ہے یہاں کون سی دلچسپی نہیں

سدھارتھ: (جوش میں مسہری سے اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے) آخر کیوں۔ مجھے اس محدود جگہ رہنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ میں ایک سی حالت اور دائمی قید سے تنگ آ گیا ہوں ـــــ مجھے ان بندھنوں کو بہت جلد توڑنا ہوگا۔

(باہر سے کئی آدمیوں کے بھاری قدموں کی آواز آتی ہے۔ اس کے بعد ایک بارعب آواز۔ مالتی! اندر اطلاع کرو ہم آ رہے ہیں)

جسودھا: مہاراج آ گئے۔

مالتی: (داخل ہو کر آداب بجاتے ہوئے) شری مہاراج پدھار رہے ہیں۔

(جسودھا اور سدھارتھ پیشوائی کو بڑھتے ہیں مہاراج شدھودھن چند مصاحبوں کے ساتھ آتے ہیں)

دونوں: پتا جی پرنام (دونوں پاؤں چھوتے ہیں)

شدودھن: جیتے رہو۔ سدا سکھی رہو۔ خوش تو ہے میری چاند سورج کی جوڑی! (سدھارتھ کو پیار کرتا ہے جسودھا کو آشیرباد دیتا ہے) آج تمہارا چہرہ اُترا اُترا سا کیوں ہے۔ میرے لاڈلے! کیا بات ہے؟

سدھارتھ: پتاجی۔۔۔۔۔۔

شدودھن: ہاں ہاں کہو رُک کیوں گئے ہو میرے سورج!

سدھارتھ: میں نہیں جانتا کچھ دنوں سے میرے دل میں ایک بے چینی ورداسی کیوں ہے۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے ایک اُلجھن سی کیوں رہتی ہے۔۔۔۔۔

شدودھن: میری آنکھوں کے تارے آج تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔

سدھارتھ: مجھے پرمود کامن کی زندگی سے نفرت ہو رہی ہے یہ سب راگ رنگ بے رس محسوس ہوتے ہیں ـــــ نہ جانے کیوں میری روح ایک قیدی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی رہتی ہے ـــــ میری اداس اور محبوس نگاہیں اونچی دیواروں سے اُٹھ کر دور نیلے آسمان سے ٹکرا کر ایک تھکے ہوئے پرندے کی طرح نیچے آ گرتی ہیں۔

شدودھن: (حیرانی کو چھپاتے ہوئے مسکرا کر) میرے باورے بیٹے تم یہ کیا کہہ رہے ہو!

سدھارتھ: میں چاہتا ہوں مجھ پر کوئی پابندی نہ ہو۔ اپنی مرضی سے جدھر چاہوں ایک آزاد چڑیا کی طرح چہکتا پھروں۔ میرا حال اُس بلبل کا سا ہے جو اُس کا مالک اس خیال سے نت نئے کھلونے کھلاتا اور مہربانیوں سے اُس کا دل بہلاتا ہے کہ وہ اپنی قید کی حالت کو بھول جائے میں نے اس چاردیواری میں کنوئیں کے مینڈک کی طرح آنکھ کھولی ہے۔ مجھے معلوم نہیں باہر کی دنیا کیسی ہے ـــ میں ان مصنوعی تسلیوں اور وقتی خوشیوں سے تنگ آ گیا ہوں ـــــ

شدودھن: (مسکرا کر) میرا لاڈلا آج تو کمال کر رہا ہے۔ کتنا سیانا

ہو گیا ہے سنا منتری جی آپ نے؟

منتری: ۔ بلا شبہ۔ مہاراج کمار نے ایک جہاندیدہ پنڈت کی سی علمیت کا اظہار کیا ہے اسے کہتے ہیں ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔

شدودھن: ۔ بیٹے تم باہر جانے کو اس قدر بے تاب کیوں ہو۔ ابھی ایک مصلحت ہے کہ تمہیں یہاں رہنے پہ مجبور کیا جا رہا ہے۔

سدھارتھ: ۔ اب صبر کی انتہا ہو چکی ہے ۔۔۔ پتا جی ۔۔۔ میرا دل ایک چھپی ہوئی آگ سے تپ رہا ہے ۔۔۔ دماغ پر ایک وحشت چھا رہی ہے۔ اگر آپ میری التجا کو رد کر دیں گے تو میری روح اس پنجرے کی تیلیاں توڑ پھوڑ کر اڑ جائے گی۔

شدودھن: ۔ (گھبرا کر) ارے ۔۔۔ باولے اتنی سی بات کے لئے اس قدر ہٹ ۔۔۔ اچھی بات کل تمہیں راجدھانی کی سیر کرائی جائے گی ۔۔۔ اچھا اب آرام کرو۔ رات بہت بیت گئی ہے۔

(مہاراج اپنے مصاحبوں کے ساتھ جاتے ہیں سدھارتھ پر امید چہرے سے اپنے کمرے میں ۔۔۔۔۔)

(سین ختم)

پانچواں منظر

دالان

(بدوشک آنکھوں پر پٹکا باندھے۔ باندیوں سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں)

کسُم: بدوشک جی اب چھو لو تو جانیں ۔۔۔

کنچن: ۔ آج عمر بھر کے کھائے ہوئے لڈو کرکرے نہ ہوئے تو نام دھرنا۔

بدوشک: ۔ یہ تم کہتی ہو کنچن (ہیں) در اصل تم سے ڈرتا ہوں۔

کسُم: ۔ تم نہ کہو کنچن انہیں کچھ ۔۔۔ تم پر تو بچارے جان دیتے ہیں۔

کنچن: ۔ مجھ پر کیوں جان دیں گے ۔۔۔ جان دیں کسی اپنی ہوتی سوتی پر ۔۔۔۔

بدوشک: ۔ تم بے کار لڑتی ہو۔ میری شادی ہی کب ہوئی ہے ابھی ۔۔۔۔ لو ہٹ جاؤ میں آیا۔

مالتی: ۔ لو سن لو بی کنچن ۔ بدوشک جی تو ابھی کنوارے ہی ہیں۔

کسُم: ۔ کنوارے کیا۔ ابھی تو بچاروں کے دودھ کے دانت بھی نہیں اکھڑے۔

کنچن: ۔ ابھی عمر ہی کیا ہوگی بے چاروں کی

مالتی: ۔ پچاس برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے ابھی جوانی آئے گی۔

بدوشک: ۔ مالتی کسُم دیکھو بات نہ بڑھاؤ۔ در اصل میں بہت غصیلا ہوں ۔۔۔۔

کنچن: ۔ باتوں میں کھسکنا چاہتے ہو ۔۔۔۔ اس طرح جان نہ چھوٹے گی۔ لو چھوؤ ہمیں۔ ورنہ کہو مانی ہاری ۔۔۔۔

بدوشک: کبھی نہیں (آگے بڑھتے ہوئے کھمبے سے لپٹ کر) بس پکڑ لیا پکڑ لیا۔

کنچن: ۔ بس ہار گئے۔ اب بنو گھوڑی ۔۔۔

مالتی: ۔ کنچن کھول دو پٹکا۔ بچارے لڈوؤں ہی پہ تو پلے ہیں۔ بھرکس ہی نکل جائے گا۔

بدوشک: ۔ کون ہیں ۔۔۔۔ در اصل میں ۔۔۔ میں تو میں تو

کنچن: ۔ تو یہ لیجئے ۔۔۔۔ (سب اس کے گرد ہو جاتی ہیں مہاراج اور منتری داخل ہوتے ہیں)

مہاراج: ۔ ارے یہ کیا ہو رہا ہے (سب سہم کر چپکی کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہیں)

بدوشک: ۔ جی میں ہیں در اصل ۔۔۔۔ انہیں زینہ سکھا رہا تھا ۔۔۔

مہاراج: ۔ (مسکرا کر) خاک ۔۔۔ لڈوؤں کی لاج تو رکھی ہوتی عورتوں سے دب گئے (باندیاں کھسک جاتی ہیں)

بدوشک: ۔ (ذرا سنبھل کر) کون ہیں ۔۔۔ میں تو میں تو در اصل

مہاراج: ۔ کچھ نہیں تم ڈرپوک ہو ۔۔۔ آؤ چلیں بہت کھیل چکے ۔۔۔

منتری: ۔ (آہستہ آہستہ چلتے ہوئے) آخر وہی ہوا جس بات کا اندیشہ تھا

شدودھن: ۔ اس کی اداسی ہم سے نہیں دیکھی جاتی ۔۔۔۔ اب تم اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑو۔ شہر کی آرائش اور سجاوٹ کے لئے خزانے سے جس قدر ضرورت ہو خرچ کیا جائے۔ راستے فقیروں اور اپاہجوں سے پاک رہیں۔ تاکہ

دنیا کی خوبصورتی کا نقشہ جو سدھارتھ کے پیش نظر ہے۔ قائم رہے۔

منتری:۔ آپ اس بات کی فکر نہ کریں میں ابھی شہر بھر میں منادی کے ذریعے آپ کا فرمان مشتہر کئے دیتا ہوں — کل دوپہر سے پہلے پہلے کپل وستو کو دلہن کی طرح آراستہ لیجئے

شدودھن:۔ ہم تمہاری وجہ سے بے فکر رہیں گے۔

منتری:۔ شری مہاراج کی کرپا ہے۔ (جاتے ہیں)

(سین ختم)

چھٹا منظر

کپل وستو کا مرکزی بازار

(ہر طرف خوب چہل پہل ہے دکانوں اور مکانوں کو طرح طرح کی چیزوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ چند راہ گذر باتیں کرتے داخل ہوتے ہیں)

پہلا:۔ واہ وا آج تو راجدھانی کی شان دیکھنے کے لائق ہے۔

دوسرا:۔ صاحب کیا بات ہے۔ میں نے عمر بھر میں اس رنگ کی سجاوٹ نہیں دیکھی ذرا دیکھئے تو کیا من بھاونا نظارہ ہے۔

ایک بوڑھا:۔ مہاراج کے راج تلک کے موقع پر بھی شہر کو سجایا گیا تھا۔ مگر آج کی تو شان ہی دوسری ہے۔

دوسرا:۔ کیوں نہ ہو — آخر مہاراج کمار کا شہر میں پدھارنا اور پھر پہلی بار! کیا معمولی بات ہے!

تیسرا:۔ سب کو ان کے درشنوں کی چاہ ہے۔ دیکھئے تو شہر بھر میں کیا چہل پہل ہے۔ بڑے میاں! ذرا اس بھیڑ بھڑکے کا بھی دھیان رہے۔

بوڑھا:۔ بھائی تن میں سکت نہیں مگر اپنے مہاراج کمار کو دیکھنے کی لالسا کھینچ لائی ہے۔ جو نہ دیکھا جائے گا درشنوں کی حسرت تو نہ رہے گی۔

پہلا:۔ آپ کیوں گھبراتے ہیں۔ ہم جو ساتھ ہیں آپ کے۔

بوڑھا:۔ بھگوان تمہاری بڑی عمر کرے

دکاندار:۔ اے بابا — او بھئی — بڑے میاں سنتے ہو۔ ذرا ایک طرف ہٹ کر باتیں کرو۔

بوڑھا:۔ بھائی ناراض کیوں ہوتے ہو پل بھر کی بات ہے۔ ہم یہاں بیٹھ تھوڑی رہیں گے۔

دکاندار:۔ (جھلا کر) سٹھیا گئے ہو بڑے میاں! بھر بھر سے دکان روک رکھی ہے۔ اور پھر باتیں بھی بنائے جاتے ہو۔

دوسرا دکاندار:۔ ہاں بھئی باتیں کرنی ہیں تو کوئی اور جگہ ڈھونڈو۔ یہ دکان ہے کوئی چوپال یا بھنگڑ خانہ نہیں کہ بے تکی ہانکتے رہو۔

پہلا دکاندار:۔ ارے میاں ایسے ہی تو ہوتے ہیں اُدھر نظر بچائی اور کچھ نہ کچھ بغل میں دبا چلتے بنے — جاؤ بھائی اپنی راہ لو۔

پہلا راہرو:۔ دیکھو منہ سنبھال کر بات کرو۔ میں جس قدر طرح دیتا رہا تم سر پر ہی چڑھتے گئے۔ ہم کسی کے دبیل نہیں۔

دوسرا راہرو:۔ اب کے زبان کھولی تو یاد رکھو ہیکڑی بھلا دوں گا معلوم ہوتا ہے شریفوں سے واسطہ نہیں پڑتا۔

دکاندار:۔ شرافت بھی تو تمہارے چہرے سے چھاجوں برس رہی ہے۔ سیدھی طرح راستہ ناپو نہیں تو ابھی بلاتا ہوں کوتوال کو ——

ایک بوڑھا دکاندار:۔ (بیچ بچاؤ کرنے) ارے یہاں کیا ہے۔ کیا بات ہے۔ لڑتے کیوں ہو! ایسے شبھ موقع پر یہ بدشگونی نہ کرو

دکاندار:۔ ارنجھ ہو رہا ہے صاحب سچ بات کہو تو جان کو آتے ہیں

بوڑھا:۔ میاں جھگڑا بڑھانے کی کوشش نہ کرو۔ جلوس کا دن ہے۔ بھیڑ تو ہوگی ہی ضرور کس کس کو روکو گے (ایک طرف سے شور بلند ہوتا ہے) لیجئے وہ آپہنچا شاہی جلوس۔

دکاندار:۔ (گردن بڑھا کر) بس خاموش۔ خاک ڈالو جھگڑے پر...... یوراج کی سواری آرہی ہے (سپاہی آتے ہیں)

پہلا سپاہی:۔ کیا شور مچا رکھا ہے —— راستہ چھوڑ دو جلوس آرہا ہے۔

(جلوس کی آمد آدمیوں کی بھیڑ اور شور۔ لوگوں کی مختلف آوازیں۔ گھوڑوں کے ہنہنانے کی صدائیں۔ رفتہ رفتہ یہ ہجوم گذرتا جاتا ہے سپاہی راستہ صاف کرتے آتے ہیں۔ رتھ پر سوار سدھارتھ داخل ہوتے ہیں۔ شور کم ہوجاتا ہے رتھ رک جاتی ہے)

سدھارتھ :۔ دنیا ظاہرا کتنی خوبصورت ہے کمبھلک۔ دلشاد انسانوں کی یہ بھیڑ بھاڑ۔ یہ اونچی اونچی خوشنما عمارتیں۔ یہ شادمانی کا لہریں مارتا ہوا سمندر۔ میری امیدوں کو زندگی بخشتا ہے۔ ـــ مگر نہ جانے وہ کون ہے جو میرے کانوں میں چپکے سے کہہ رہا ہے کہ یہ حسن۔ یہ دلکشی۔ یہ آراستگی اور مسرت سب عارضی ہیں یہ سنہرے خواب یہ خوشیوں کے گیت دفتی ہیں میں دنیا کو بے نقاب دیکھنا چاہتا تھا اس کی اصلیت جاننے کے لئے بے قرار تھا مگر افسوس یہ کمبخت ہر بار اپنی حقیقت کو سہانے پردوں میں چھپائے میرے سامنے آتی ہے۔

کمبھلک :۔ رتھ ہانکتے میری عمر بیت گئی ہے مہاراج کمار۔ یہ اچنبھا خود میری سمجھ میں اب تک نہیں آیا۔ دنیا میری نظر میں آنسوؤں کے اتھاہ سمندر کے سوا اور کچھ نہیں عقلمندوں نے اسے مایا جال کہا ہے اور سچ تو یہ ہے سکھی وہی ہے جو اس کے جھمیلوں سے دور ہے۔ در اصل یہ سنسار مِتھیا ہے اس کی ہر چیز مٹنے والی ہے۔

سدھارتھ :۔ کیا کہا ـــ یہ اونچی اونچی عمارتیں۔ یہ مسرتیں واقعی مٹنے والی ہیں؟ ـــ تم ٹھیک ہی تو کہتے ہو ـــ میں نے بھی یہی انوبھو کیا ہے۔ (ایک ہڈیوں کا ڈھینچر سامنے سے گزرتا ہے) مگر کمبھلک ٹھہرو ـــ یہ کیا ہے میں نے یہ جانور پہلی بار دیکھا ہے۔

کمبھلک :۔ جانور ـــ آہ مہاراج کمار یہ ایک بوڑھا فقیر ہے جو کبھی ہم آپ جیسا تھا مگر اب بڑھاپے کی وجہ سے کمر بھی سیدھی نہیں ہوتی۔

سدھارتھ :۔ بڑھاپا ـــ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

کمبھلک :۔ ایک اداس وقت ہے جو دنیا میں رہتے ہوئے سب کے لئے ہے۔ دن رات سے لے کر بڑھاپا تک کیلئے۔

سدھارتھ :۔ آہ اب تک مجھے کس قدر تاریکی میں رکھا گیا (ایک طرف رونے پیٹنے کی آوازیں سن کر) یہ شور کیسا ہے۔

(ایک گروہ مردے کی ارتھی لئے آتا ہے بعض عورتیں بین کر رہی ہیں۔ بعض رو رہے ہیں)

کمبھلک :۔ ان کا کوئی مر گیا مہاراج کمار۔ یہ سب اس کے سوگ میں رو رہے ہیں۔

افسر :۔ شاہی فرمان کی خلاف ورزی کرنے والا بندی بنا لیا جائے۔ سپاہیو۔ روکو اس جتھے کو۔

سدھارتھ :۔ ٹھہرو۔ ان کو ادھر سے آنے دو۔

(وہ گروہ روتا دھوتا آگے نکل جاتا ہے)

سدھارتھ :۔ کمبھلک میں یہ معمّا اب تک نہیں سمجھا۔ یہ مرنا کیا ہوتا ہے اور وہ لوگ کیوں رو رہے تھے۔

کمبھلک :۔ ایک پوشیدہ طاقت سے انسان مر جاتا ہے یعنی جیتا جاگتا پرانی بے جان ہو جاتا ہے۔ اس طاقت کو موت کہتے ہیں۔

سدھارتھ :۔ تو کیا موت سب کو آتی ہے؟

کمبھلک :۔ جی ہاں اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔

سدھارتھ :۔ مگر ہمارے پاس تو اتنی طاقتیں ہیں کیا پتا جی اس کا کوئی انتظام نہیں کر سکتے؟

کمبھلک :۔ موت کے آگے سب طاقتیں بے کار ہو جاتی ہیں وہ ایسی چور ہے کہ اپنا کام کرتے وقت کسی کو علم بھی نہیں ہونے دیتی۔ اس کے وار سے بچنے کے لئے کہیں پناہ نہیں۔

سدھارتھ :۔ آہ دنیا کی حقیقت مجھ سے کس قدر چھپائی گئی کمبھلک رتھ ہانک لے چلو۔ یہاں کھڑے کھڑے میرا جی گھبرا رہا ہے۔

(رتھ میں غم کی شدت سے سر ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔ رتھ جاتی ہے سب لوگ اس واقعہ سے متاثر انداز میں ایک دوسرے سے چہ میگوئیاں کرتے چلتے جاتے ہیں۔

منظر ختم

ساتواں منظر

ندی کا کنارہ

(آدھی رات بیت چکی ہے۔ دلفریب چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ دور درختوں کے اندھیرے سے ایک رتھ ظاہر ہوتی ہے جو تیزی سے ندی کنارے پہنچ جاتی ہے)

پہلی آواز :۔ رتھ روک لو کمبھلک (رتھ رک جانے پر اتر کر) میں

چاہتا ہوں تمہیں اور ان بے زبانوں کو میرے لئے اب اور
زیادہ تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔

کمبھلک :۔ (حیرت سے اُسے تکتے ہوئے) مہاراج کمار . . . .

سدھارتھ :۔ (اُسے دیکھے بغیر قدرے اطمینان سے) ہماری منزل
یہیں ختم ہے ــــ اچھا ہوا کہ تم عین وقت پر پرمود کانن کے
پچھواڑے پہنچ گئے۔ ورنہ میری آرزو کبھی پوری نہ ہوتی ــــ
(ایک پتھر پر بیٹھ کر) اُف ــــ

کمبھلک :۔ گدی بچھا دوں (رتھ سے ایک گدی لاتا ہے)

سدھارتھ :۔ نہیں۔ اب ان بناوٹوں کو رہنے دو ــــ
(سدھارتھ سادے لباس میں ہے)

کمبھلک :۔ (حیرانی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے) آج کی
رات غیر معمولی طور پر سہانی اور پرسکون ہے۔ گھوڑے بھی
اتنی لمبی مسافت بے تکان طے کر آئے۔

سدھارتھ :۔ آج کے بعد یہ پھر میری وجہ سے تکلیف نہیں اٹھائیں گے

کمبھلک :۔ یوراج ــــ (حیرانی سے) میں حیرانیوں میں کھویا
جا رہا ہوں۔ آپ کی عجیب و غریب اداس باتیں۔ متفکر
چہرہ۔ مبہوت اور کھوئی کھوئی آنکھیں۔ اپنے اندر کیا
اسرار رکھتی ہیں ــــ

سدھارتھ :۔ دنیا پر اسرار ہے۔ اس کی حقیقت کو سمجھنا کس قدر
مشکل ہے۔ کمبھلک گھوڑوں کو کھول کر ذرا دیر سہلا لو۔
تمہیں جلدی لوٹنا ہوگا۔

کمبھلک :۔ (گہری حیرانی سے) یوراج . . . . .

سدھارتھ :۔ آج روح جسم کی بندشوں سے آزاد ہو کر آسمانی
بلندیوں میں اڑنا چاہتی ہے۔ مایا کا شکاری اپنے دلفریب
جال میں اُسے پھانسنا چاہتا ہے۔ کیا عجیب تضاد ہے۔
ــــ اُف۔ کمبھلک یہ درد بھری آواز کیسی ہے۔

کمبھلک :۔ یہ چکوا ہے مہاراج کمار ــــ اپنی پیاری کے ہجر
میں بے کل ہے۔ دیکھئے وہ دوسرا پرندہ بھی نظر آ رہا ہے
جو اُس کی پکار سن کر اس پار آیا ہے۔ یہ چکوی ہے۔ بس اسی
طرح ایک دوسرے کے فراق میں رات گزار دیتے ہیں۔

سدھارتھ :۔ یہ کیوں؟

کمبھلک :۔ ایشور کی گت نیاری ہے۔ شروع ہی سے
دنیا میں سُکھ اور دکھ میں دشمنی چلی آتی ہے۔ اور بیشتر
دُکھ ہی سُکھ پر غالب رہتا ہے۔

سدھارتھ :۔ آہ ــ کمبھلک رتھ جوت لو۔ چاند پچھم میں جھک
گیا ہے۔ تمہیں پو پھٹنے سے پہلے کپل وستو پہنچنا ہے۔

کمبھلک :۔ مہاراج کمار . . . . .

سدھارتھ :۔ بڑی مشکل سے دنیا کے سنہرے جال سے بچ کر آیا
ہوں۔ اُف کس قدر درد انگیز موقع تھا۔ جب میں پرمود کانن
سے چلا تو محبت نے آتما کو جیتنے کے لئے ایڑی چوٹی کا
زور لگایا۔ جسودھا کا پیار۔ بچے کی کشش اور باپ کی
محبت نے مجھے روکنا چاہا۔ مگر میں اُن سنہری زنجیروں
کو توڑ کر چل پڑا ــــ آہ وہ شہر وہ پرمود کانن جس میں میری
اندھی زندگی کے چند ادھورے دن بیتے تھے۔ میں نے
محسوس کیا جیسے وہ میرے پیچھے آ رہے تھے۔ جسودھا
اور باپ کی روحیں میرے تعاقب میں تھیں۔ میں اچانک
رُک گیا۔ میرے پاؤں ڈگمگانے لگے۔ مگر فوراً سنبھل گیا
وہ طلسم اپنے آپ ٹوٹ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں
اب آزاد ہوں۔ مگر دنیا اپنے دلفریب گیتوں کے ہتھیاروں
سے لیس میرا پیچھا کر رہی تھی ــــ مگر۔ آہ۔ آخر آتما نے
اُن سب پر فتح پائی . . . .

کمبھلک :۔ (دھاڑیں مار کر روتے ہوئے) یوراج یہ آپ کے جی
میں کیا سمائی۔ مجھ سے اگر پوچھا گیا تو میں کیا جواب دوں گا۔
. . . مہاراج اور راج کماری جسودھا برستی ہوئی آنکھوں
سے جب اپنا سدھارتھ مجھ سے مانگیں گے تو میں کیونکر
سر اٹھا سکوں گا۔ جب آپ کی فرقت میں راج بھر میں کہرام
مچے گا تو . . . . تو وہ جگر دوز نالے میں کس طرح سن سکوں گا

سدھارتھ :۔ اب یہ مایا جال بے کار ہو چکا ہے کمبھلک۔ اس کے
حلقے اب مجھے اپنی گرفت میں نہیں لے سکتے۔ میں بیداری
کے عالم میں ہوں۔ تم جاؤ میرے پیارے وطن کو جو

دلکشیوں سے بھرا ہے میرا آخری سلام دینا اور اہل وطن کو جن کے دلوں میں میرے لئے جگہ ہے۔ بوڑھے باپ کو جن کی امیدیں مجھ سے بندھی ہوئی تھیں۔ جسودھا کو جس میں سب کچھ تھا جو میری گم شدگی سے نڈھال ہو رہی ہوگی۔ اُن میں میرے یہ تابناک آنسو جو اُن کی مٹتی ہوئی محبت کی یاد میں بہا رہا ہوں بطور یادگار بانٹ دینا اور کہنا کہ میرا غم فضول ہے۔ ہم پھر ایک دن آسمان پر ملیں گے۔ فی الحال تاروں بھرے آسمان سے سبق حاصل کریں جو ہر صبح کو اپنا خزانہ لٹا کر بھی خاموش رہتا ہے۔

کمبھلک:۔ یوراج آپ کیوں ہم سب کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ اپنا کپل وستو لوٹ چلیئے۔

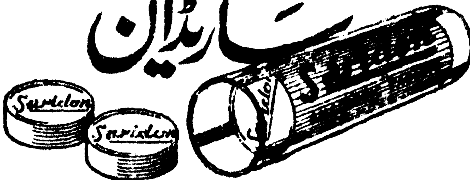
سدھارتھ:۔ میں جن پھندوں سے آزاد ہونا چاہتا ہوں تم وہی بیڑیاں پھر مجھے پہناتے ہو۔ اب یہ ناممکن ہے —— دنیا کی اصلیت یہی ہے کہ جب اُس کی خواہش نہ کرو تو وہ دُور دُور رہتی ہے۔ نفرت کرنے پر پاؤں کے تلوے چاٹتی ہے —— جاؤ میں کپل وستو لوٹ کر نہیں جاؤں گا۔ تمہارے آس پاس دنیوی اندھیرا چھا رہا ہے۔ نمناک آنکھوں میں فریب جھلک رہا ہے۔ جاؤ —— چلے جاؤ —— میری آتما اس اندھیرے سے گھبرا رہی ہے۔ (دو درختوں کے جھنڈ کی طرف دوڑ بھاگتا ہے)

کمبھلک:۔ (تھوڑی دور پیچھا کرکے) مہاراج کمار —— یوراج —— آہ ——

(سدھارتھ دور درختوں کے اندھیرے میں گم ہو جاتا ہے کمبھلک ٹوٹے ہوئے دل سے روتا ہوا رتھ ہانک کر لے جاتا ہے ——) (سین ختم)

تاجور سامری





بادۂ دوشینہ:- گاہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را

رُوحِ ایشیا

شہزادہ گوتم کا شاہی جلوس

کپل وستو کی صورت آج پہچانی نہ جاتی تھی
فلک بھی مُسکراتا تھا زمیں بھی مُسکراتی تھی
گلابی تھے مکانوں کے در و دیوار پھولوں سے
بہارِ خلد کی تصویر تھے بازار پھُولوں سے
محلّوں سے نکل کر سیر کو شہزادہ آیا تھا
یہ شہزادہ نہ تھا نگری پہ پرمیشور کا سایہ تھا
رعایا پھُول برساتی تھی گوتم کی سواری پہ
کِھلے جاتے تھے غنچے آمدِ بادِ بہاری پہ
عقیدت مند روحیں راہ میں آنکھیں بچھاتی تھیں
نگاہیں مُسکراتی تھیں کہ کرنیں مُسکراتی تھیں
کوئی اس کے بہارِ حُسن کی تعریف کرتا تھا
کوئی اس روپ پر من موہنی صورت پہ مرتا تھا
جوانی خود تھی عاشق شاہزادے کی جوانی پہ
جوانی تھی کہ روشن تھا کنول کا پھُول پانی پر
حسیں چہرہ گلابی رنگ کے پھولوں کی مالا تھا
کہ اُس کے حُسن سے پرجا کی آنکھوں میں اجالا تھا

کہا گوتم نے چھنّا! سامنے وہ کون آتا ہے
اسے کیا ہو گیا جو ہر قدم پر لڑکھڑاتا ہے
بدن یوں کانپتا ہے جیسے کشتی تیز دھارے پر
چلا آتا ہے یہ کیوں ایک لکڑی کے سہارے پر

چھنّا

حضور! انسان پر اک روز یہ حالت بھی آتی ہے
سحر کی روشنی میں شمع کی لَو تھرتھراتی ہے
بڑھاپا ہو رہا ہے مسند اپنی نوجوانی پر
فنا ہونے سے پہلے کھیلتی ہے موج پانی پر

گوتم

تری تقریر کچھ سمجھے ہیں لیکن سب نہیں سمجھے
بڑھاپا کیا ہے ہم اس لفظ کا مطلب نہیں سمجھے

چھنا

بڑھاپا کیا ہے یہ تاریک رُخ ہے زندگانی کا
یہ اک بگڑا ہوا خاکہ ہے تصویرِ جوانی کا
یہ آتا ہے تو پھر چہرے پہ رعنائی نہیں رہتی
دل آویزی نہیں رہتی، دل آرائی نہیں رہتی
بچھا دیتا ہے آ کر جھرّیوں کا جال گالوں پر
چھڑک دیتا ہے اپنے ہاتھ سے کافور بالوں پر
نظر کمزور ہو جاتی ہے چہرہ زرد رہتا ہے
کمر میں بازوؤں میں ہلکا ہلکا درد رہتا ہے
ذرا سا، دو قدم چلتے ہیں تو دم پھول جاتا ہے
ہوا جب حافظہ کمزور سب کچھ بھول جاتا ہے
یہ حالت آنے والی موت کا پیغام ہوتی ہے
سحر ہو چکتی ہے تو زندگی کی شام ہوتی ہے
ہماری آپ کی ہر ایک کی حالت یہی ہوگی
بگڑ جائے گی جب صورت تو پھر صورت یہی ہوگی
جوانی کیا ہے اک اُڑتے ہوئے بادل کا سایہ ہے
یہ سب دھوکا ہی دھوکا ہے یہ سب مایا ہی مایا ہے

جواں شہزادے کو اپنے بڑھاپے کا خیال آیا
ہوا دل سخت زخمی نازک آئینے میں بال آیا
مگر رہنے نہ پائی دیر تک یہ عارضی حالت
اندھیرے میں کھُلی بجلی کی ہاں یہ عارضی حالت
کیا پھر حُسن نے مائل اُسے رنگیں نظاروں میں
مکاں تھے یا لڑی تھیں دلہنیں پھولوں کے ہاروں میں
کھڑی تھیں مائیں بچوں کو لئے اپنے مکانوں پر
نگاہیں تو زمیں پر تھیں خیالات آسمانوں پر
کہیں منڈلی میں رامائن کا میٹھا پاٹ ہوتا تھا
کوئی سُن سُن کے ہنستا تھا، کوئی سُن سُن کے روتا تھا
مہا بھارت کہیں میٹھے سُروں میں گائی جاتی تھی
برہمن گا رہے تھے اور خلقت سر ہلاتی تھی
پسند آئے بہت گوتم کو کرتب پہلوانوں کے
ہوا خوش دیکھ کر وہ جسم ہندی نوجوانوں کے
سریلے منتروں کی لَے نے دل پر خاص اثر ڈالا
اسے کاشی کے مندر کی طرح پاکیزہ کر ڈالا
یونہی پھرتے پھراتے سر پہ آخر دوپہر آئی
کہ اتنے میں اُسے اک چوک میں ارتھی نظر آئی

چھپی تھی کوئی شے کپڑے کے پردے میں نگاہوں سے
کیا جاتا تھا جس کا ماتم اب چیخوں سے آہوں سے
کہا گوتم نے چھنّا! ان سے پوچھو ماجرا کیا ہے
یہ آہیں کیا ہیں نالے کیوں ہیں یہ شور و بکا کیا ہے
یہ ان میں بوڑھی عورت کون ہے جو اتنی روتی ہے
یہ عورت جس کی ہر اک چیخ دل کے پار ہوتی ہے

چھنّا

نہ جب تک موج ہی تنکے کو پہنچا دے کنارے پر
ٹھہر سکتا نہیں یہ تیز رو پانی کے دھارے پر
کبھی بہتے ہوئے بہتے لبِ جو تھم نہیں سکتے
پہنچ جاتے ہیں جب پلکوں پر آنسو تھم نہیں سکتے
انہیں رونے دو رو دھو کر ہی انساں صبر کرتا ہے
یہ دل کا زخم ہے یوراج! بھرتے بھرتے بھرتا ہے

گوتم

تری تقریر سے اس وقت کتنا خوف آتا ہے

چھنّا

ہوا جب تیز ہوتی ہے سمندر کانپ جاتا ہے

گوتم

ڈرا جاتا ہوں میں اک آنے والے غم کے سائے سے
پھٹا جاتا ہے دل سینے میں اُس کی ہائے ہائے سے
یہ کس کا نام لیتی ہے یہ کس کو یاد کرتی ہے
جسے سُن سُن کے میری آتما فریاد کرتی ہے

چھنّا

یہ رونے والی بڑھیا ایک ماں ہے ایک بیٹی کی
لٹا بیٹھی ہے جو ہاتھوں سے دولت نیک بیٹے کی
یہ مرنے والا بیٹا ایک بوڑھی ماں کا بیٹا تھا
مگر تقدیر کا قلاش تھا قسمت کا ہیٹا تھا
بجھایا موت نے روشن چراغ اس کی جوانی کا
رہے گا مامتا کے دل پہ داغ اس کی جوانی کا
محبت کرنے والے یہ محبت کا صلہ دیں گے
اسے لے جا کر اب مرگھٹ کی مٹی میں ملا دیں گے

گوتم

پتاجی کرتے ہیں تعریف سارے سورماؤں کی
کہاں ہیں آج تلواریں ہمارے سورماؤں کی
کہ ظالم موت کی ہستی کا قصہ پاک کر ڈالیں
جلا دیں پیس دیں برباد کر دیں خاک کر ڈالیں
نگل جاتی ہے جو ماؤں کے بیٹوں کو جوانی میں
یہ ڈائن رہ نہیں سکتی ہماری راج دھانی میں

چھنّا

طلسم و سحر سے شیطان کو باندھا نہیں جاتا
ہوا سے آگ کے طوفان کو باندھا نہیں جاتا
یہ اپنے سحر سے ہر چیز کو مسحور کرتی ہے
نہ یہ تیغوں سے ڈرتی ہے نہ یہ تیروں سے ڈرتی ہے

گوتم

بچا سکتے نہیں جب ملک کو اس کی تباہی سے
تو پھر کیا فائدہ اس سلطنت سے بادشاہی سے

چھنّا

نظر آتی نہیں تدبیر کوئی حکمرانوں کو
یہ دن کی روشنی میں لوٹتی ہے کاروانوں کو
سفینوں کو پھنسا دیتی ہے گرداب تباہی میں
یہ دنّاتی ہوئی ہوتی ہے داخل قصر شاہی میں
بچا سکتی نہیں اس سے کوئی شے شہریاروں کو
یہ آتی ہے تو نیند آجاتی ہے سب پہرہ داروں کو
بچھا دیتی ہے صحن باغ میں کانٹے ببولوں کے
جلا دیتی ہے رنگیں پیرہن خوش رنگ پھولوں کے
بجھا دیتی ہے جلتی مشعلیں روشن ستاروں کی
چھپا دیتی ہے زیر خاک ہستی آبشاروں کی

گوتم

تو پھر یہ آدمی کس چیز پر مغرور ہے اتنا
کہ جب دنیا میں بھی رہتے ہوئے مجبور ہے اتنا

چھنّا

یہ پُتلا خاک کا بھولا ہوا ہے زندگانی پر
ہوا کا بُلبلہ ہے تیرتا پھرتا ہے پانی پر
ہماری زندگی اڑتے ہوئے بادل کا سایہ ہے
یہ سب دھوکا ہی دھوکا ہے یہ سب مایا ہی مایا ہے

یہ سننا تھا کہ شہزادے کی آنکھوں سے حجاب اُٹھا
حقیقت کے رُخ مستور سے آخر نقاب اُٹھا
نظر کے سامنے تھی سب حقیقت زندگانی کی
نہ دیکھی جاتی تھی مکروہ صورت عمر فانی کی
کہا دل نے کہ تیرا بھی یہی انجام ہونا ہے
تجھے مٹی میں ملنا ہے تجھے مٹی میں سونا ہے
یہ جھگڑے چند روزہ ہیں غریبی کیا امیری کیا
یہ ساری ظاہری باتیں ہیں شاہی کیا فقیری کیا

فاخر ہریانوی

از ادبی دنیا دسمبر ۱۹۳۳ء

"انسان"

"عارف! عارف!"

رشید بھائی کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔ عارف گھبرا کر اُٹھ بیٹھا "عارف۔ اُٹھو۔ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کر ڈالو ہمیں ابھی جانا ہے۔ بیچارے ہریچن چاچا کل رات کو......"

اُن کا گلا رُندھ گیا۔ آنکھوں میں آنسو چھلچھلا آئے۔ عارف کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ذرا رک کر بولے "اُٹھو جلدی سے تیار ہو جاؤ"

عارف کا دل دھک سے ہو گیا۔ کھڑا ہوا تو ٹانگیں کانپنے لگیں اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک کر اُس نے جلد جلد کپڑے تبدیل کئے اور بھائی کے ساتھ موٹر میں آ بیٹھا۔ راستے میں عارف سوچنے لگا "..... اصل میں چاچا کی حالت کل سے ہی خراب تھی۔ تب ہی تو امی رات کو وہیں رہ گئی تھیں..... لیکن..... چاچا کیا سچ مچ مر گئے۔ کہیں رشید بھائی کو دھوکا تو نہیں ہوا ممکن ہے یہ خبر آنے کے بعد کوئی اور ڈاکٹر آیا ہو اور اُس کی دوا سے چاچا اچھے ہو گئے ہوں اور جب ہم وہاں پہنچیں تو چاچا خاصے بھلے باتیں کر رہے ہوں.....

عارف کو یقین ہونے لگا کہ ضرور یہی بات ہوئی ہوگی"..... نہیں تو..... نہیں تو..... ایسی بُری بات کیسے ہو سکتی ہے کہتے ہیں خدا کوئی بُری بات نہیں کرتا۔ وہ بہت رحم دل ہے ..... اور پھر چاچا تو ابھی عمر میں بھی کوئی زیادہ نہیں تھے۔ اور اُن کے بعد چاچی بیچاری کس کے ساتھ رہیں گی..... کیا کریں گی اور اُوشا.....!"

اُوشا کا خیال آتے ہی عارف کا دل بےچین ہو اُٹھا۔ اُس کے دماغ نے اوشا کو اس حالت میں تصور کرنے سے انکار کر دیا۔

"..... نہیں یہ نہیں ہو سکتا....." وہ اور بھی ارادے سے یقین کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ چاچا ابھی مرے نہیں۔ اُن کو ضرور کسی ڈاکٹر نے بچا لیا ہوگا"

موٹر رک گئی۔ عارف کا دل دھڑکنے لگا۔ اتنی مشکل سے اس نے جس یقین کا آسرا لیا تھا وہ عین موقع پر اُس کے ہاتھوں سے نکلنے لگا سہمی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے اُس نے بھائی کے ساتھ چاچا کے گھر میں قدم رکھا۔ جو ہولناک منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے آیا وہ اُس کے لئے بالکل نیا نہ تھا۔ آج سے دو سال پہلے اپنے والد کی موت پر عارف یہی سب کچھ دیکھ چکا تھا۔ پھر بھی اُس کا ننھا سا دل دہل گیا۔ رشید بھائی کے پیچھے پیچھے چلتا رہا مگر اُسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ آخر عارف نے اپنے تئیں ایک کرسی پر بیٹھے پایا۔

وہ سوچ رہا تھا "آخر میرا یقین غلط نکلا..... تو پھر یہ جھوٹ ہے کہ خدا کسی کا برا نہیں کرتا..... پھر وہ رحم دل نہیں ہے!"

"عارف" رشید بھائی کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی "جاؤ ذرا اُوشا کو پیار کرو۔ تسلی دو"

عارف نے ڈرتے ڈرتے اپنی نظریں ذرا سی اُٹھائیں۔ اوشا سامنے فرش پر اوندھی پڑی تھی۔ جسم کی ساری طاقت اپنی ٹانگوں میں سمیٹ کر عارف اوشا کے قریب جا پہنچا۔ اُس کی پیٹھ پر آہستہ سے ہاتھ رکھا اور پکارنا چاہا "اوشا!" مگر آواز نہیں نکلی۔ عارف نے پھر ہمت کی اور پکارا "اوشا"۔ اس دفعہ آواز نکلی۔ اوشا نے ایک بار سر اُٹھا کر دیکھا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی پہلے تو عارف کا دل چاہا کہ وہ بھی خوب دل بھر کر روئے مگر فوراً ہی اُسے اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا"..... میں یا ہوں اوشا سے زیادہ سمجھدار ہوں۔ مجھے تو اوشا کو تسلی دینا چاہئے اگر ہریچن چاچا

نہیں رہے تو کیا ہوا میں تو ہوں میں اس کو کبھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ عارف نے پھر پکارا "اوشا" تاکہ اوشا کو بھی اپنے مصمم ارادے سے آگاہ کر دے۔ جب اوشا نے اُس کی طرف دیکھا تو وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ "رو نہیں۔ اوشا"!

. . . .

ان دنوں عارف میٹرک میں پڑھتا تھا کچھ ماہ بعد اُس نے امتحان دیا اور پاس ہو گیا۔ ان ہی دنوں رشید بھائی کی تبدیلی سیتا پور ہو گئی۔ سیتا پور ایک چھوٹی سی جگہ تھی اور وہاں کوئی کالج نہ تھا۔ امّی بچاری ایک ہی جگہ رہ سکتی تھیں۔ یا عارف کے پاس یا رشید بھائی کے۔ رشید بھائی ایک بالکل نئی جگہ جا رہے تھے۔ اُن کو تنہا چھوڑنا بھی مناسب نہ تھا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ عارف وہیں ایف اے میں داخل ہو جائے اور کالج کے ہوسٹل میں رہے۔

ہوسٹل کی زندگی عارف کے لئے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ ہوسٹل کے ساتھیوں سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کالج میں بھی اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ عارف بے حد شرمیلا اور محتاط تھا۔ اس کے دوست ذرا مشکل سے ہی ملا کرتے تھے۔

اس روکھی پھیکی زندگی سے بھاگ کر عارف ایک ہی جگہ پناہ لے سکتا تھا۔ وہ جگہ تھی ہرین چاچا کا گھر۔ عارف کے والد اور ہرین چاچا (اوشا کے والد) میں لڑکپن کی دوستی تھی۔ جب سے عارف نے ہوش سنبھالا اُس نے ہرین چاچا کو چاچا ہی کہا اور چاچا ہی سمجھا۔ دونوں گھرانوں کے تعلقات ہی کچھ ایسے تھے کہ عارف کو کبھی یہ سوچنے کا خیال بھی نہیں آیا کہ ہرین چاچا دراصل اُس کے چاچا نہیں ہیں۔ ہرین چاچا کی زندگی میں بھی عارف کو اوشا سے بے حد دلچسپی تھی۔ ایک اوشا ہی اُس گھر میں اُس کی ہم عمر تھی۔ انورادھا ابھی بچہ تھی۔ اور اس کی دلچسپی عارف بھائی میں صرف اتنی ہی تھی کہ وہ بہت اچھی اچھی کہانیاں سُناتے ہیں اور کبھی کبھی انگریزی مٹھائی بھی کھلا دیتے ہیں۔

چاچا کی موت۔ رشید بھائی کی تبدیلی۔ ہوسٹل کی روکھی پھیکی زندگی ...... ان تمام باتوں سے عارف کی دلچسپی چاچا کے گھر میں اور خصوصاً اوشا میں۔ دلچسپی کی حد سے گذر کر جذبات کی دنیا میں داخل ہو گئی۔ اور پھر اُسے اپنا "مصمم ارادہ" یاد تھا جو اُس نے چاچا کی موت پر اُوشا کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کیا تھا!

ہر روز کالج سے فارغ ہوتے ہی عارف چاچی کے ہاں جا دھمکتا۔ انورادھا اُس سے کہانیاں سُنتی جس میں کبھی کبھی اوشا بھی شریک ہو جاتی۔ چاچی سے الگ باتیں ہوا کرتیں۔ شاید اس مصیبت میں عارف کا سہارا چاچی کو بھی غنیمت معلوم ہوا۔ وہ عارف کو بہت ماننے لگیں۔ روز شام کی چائے اور اکثر رات کا کھانا بھی عارف کا وہیں ہوتا۔ ہوسٹل تو بس رات کو سونے کا ٹھکانا رہ گیا تھا۔

ہر اتوار کو سینما کا پروگرام ہوتا۔ عارف، اوشا اور انورادھا۔ چاچی تو نہیں جاتیں۔ وہاں سے آ کر تصویر پر بحث شروع ہوتی۔ انورادھا کچھ کہنے کے لائق تو نہ تھی مگر عارف اور اوشا جو کچھ کہتے اُسے بہت غور سے سنتی۔ عارف تصویر کی ان لطافتوں پر روشنی ڈالتا۔ جو شاید اوشا کی نظر سے چُوک گئی ہوں۔ اور اوشا ان باریکیوں کا ذکر کرتی جنہوں نے اُس کے دل پر زیادہ اثر کیا ہوتا۔ یہ بحث نہ صرف ایک اچھے خاصے فنی معیار کی ہوتی بلکہ عارف اور اوشا کی طبیعتوں کے جھکاؤ کا دلچسپ اظہار بھی۔

اکثر چاچی بھی اس میں دلچسپی لیتیں اور جب کبھی عارف اور اوشا میں کسی بات پر اختلاف رائے ہو جاتی تو اُوشا فوراً پوچھ بیٹھتی — "اچھا سی جی تمہاری کیا رائے ہے"؟

"سی جی" چاچی کا پیار کا نام تھا۔ اس کو ایجاد تو شاید ہرین چاچا نے کیا تھا لیکن زیادہ استعمال اُوشا کرتی تھی۔ وہ لاڈ میں آ کر ماں کو اکثر "سی جی" ہی کہتی تھی۔ کبھی کبھی چاچی کہتیں بھی "میری دادی اماں تو دیکھو کس بے تکلفی سے پکارتی ہے مجھے"! لیکن یہ مذاق ہوتا۔ چاچی کبھی اس کا بُرا نہیں مانتی۔ آہستہ آہستہ "سی جی" کا استعمال بڑھنے لگا اور انورادھا اور عارف بھی اس سے فائدہ اٹھانے لگے!

گرمی کی چھٹیاں ہو گئیں۔ عارف کو سیتا پور جانا پڑا۔ یہاں سے اُس نے اوشا کو خط لکھا۔ اپنی زندگی کا پہلا خط! گھنٹوں کی محنت کا نتیجہ ہوا ایک ورق۔ صرف ایک ورق! اب جواب کا انتظار شروع ہوا۔ آخر جواب بھی آیا۔ اب خط باقاعدہ آنے اور جانے لگے۔ یہ خط کوئی معمولی خط نہ ہوتے۔ عارف اپنی عمر کے

لحاظ سے کہیں زیادہ متفکر اور حساس تھا۔ وہ اپنے دل و دماغ کی تاریک سے تاریک گہرائیوں میں اُتر جاتا اور اُس کے خط انہی نئی دنیا کے تجربات سے بھرے ہوتے۔ اسی بات کی اُمید وہ اوشا کے خطوں سے بھی رکھتا اور اوشا اُسے کبھی مایوس نہ کرتی۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ زندگی کی موج پھر پرانے راستوں سے بہنے لگی۔ وہی کالج۔ وہی ہوسٹل۔ وہی سینما۔ وہی دلچسپ مباحثے۔

اوشا کی بیماری نے یہ سب کچھ روک دیا۔ ڈاکٹر نے کہا "ٹائیفائڈ ہے غالباً اکیس روز لے گا۔ احتیاط کی ضرورت ہے۔"

ہر دو گھنٹے میں دوا کا وقت تھا۔ ویسے بھی مریض کے پاس ہر وقت کسی کے موجود رہنے کی ضرورت تھی۔ اوشا بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ دوپہر کے بعد تو عارف کالج سے آجاتا۔ مگر دوپہر تک اور تمام رات تیمارداری کون کرتا۔ چاچی ایک تو اکیلی اور پھر بے حد پریشان۔ انورادھا کو انہوں نے اسکول سے چھٹی دلوا لی مگر انورادھا پھر بچہ تھی۔ اُس کا بھروسہ کیسے کیا جا سکتا تھا۔ آخر عارف نے بھی کالج سے چھٹی لی اور ہوسٹل سے باہر سونے کی اجازت بھی حاصل کر لی۔

اب وہ دن رات تیمارداری میں لگا رہتا۔

چاچی نے کہا "عارف تمہارا امتحان نزدیک ہے، پڑھائی کا کیا کرو گے؟"

عارف نے جواب دیا "میں ضروری کتابیں ساتھ لے آیا ہوں سی جی! پڑھتا بھی رہوں گا۔"

مگر عارف کا خیال غلط تھا۔ وہ پڑھتا نہیں رہا۔ تمام رات جاگنے کے بعد پڑھنا ممکن بھی نہیں تھا۔

اکیسویں روز بخار اُتر گیا۔ اوشا بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ مگر اب کوئی پریشانی کی بات نہ تھی۔ عارف نے واپس ہوسٹل جانا چاہا تو چاچی بولیں "میری سمجھ میں نہیں آتا۔ عارف، کہ جب اپنا گھر موجود ہے تو تم ہوسٹل میں کیوں رہتے ہو؟"

عارف اس کا کچھ جواب نہ دے سکا۔

چاچی بولیں "بس اب ہوسٹل جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنا سامان یہیں اٹھوا لاؤ۔"

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔" عارف نے رُکتے ہوئے کہا "مگر رشید بھائی اور امّی کی اجازت ..."!

"اچھا تو اُن سے لکھ کر اجازت لے لو۔ بلکہ میں خود بھی اُن کو لکھوں گی۔"

جیسا کہ عارف کو اُمید تھی۔ رشید بھائی اور امّی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ انورادھا کی خوشی کی تو کوئی انتہا نہیں رہی۔ اب تو وہ ہر رات کو سونے سے پہلے عارف بھائی سے ایک کہانی سُنا کرے گی!

بیماری کے بعد اُوشا کالج گئی تو معلوم ہوا کہ جو لڑکی دسمبر کے امتحان میں پاس نہ ہو گی۔ اُس کا نام یونیورسٹی میں نہیں بھیجا جائے گا امتحان میں صرف پندرہ روز باقی تھے اور اُوشا نے پچھلے ایک ماہ سے کتاب کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ گھر آئی تو چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ چاچی نے پوچھا "کیوں طبیعت کیسی ہے"؟

بس اتنا کہنے کی دیر تھی کہ آنسو امنڈ پڑے۔ چاچی تو گھبرا گئیں۔ عارف کالج سے آیا تو اُس نے سُنا۔ وہ بولا:۔

"اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ اوشا تو پگلی ہے۔ وہ امتحان میں فیل ہو ہی نہیں سکتی۔"

اسی شام سے عارف نے اوشا کو پڑھانا شروع کر دیا۔ جب تک اوشا جاگ سکتی عارف اُسے پڑھاتا اور اُس کے بعد خود پڑھتا۔ بے چاری انورادھا کی کہانیاں بند ہو گئیں۔ سینما کے پروگرام ملتوی ہو گئے۔ عارف، اوشا، اور کتابیں ..... پندرہ روز اسی طرح گذرے۔ امتحان آیا۔ اُوشا کامیاب ہو گئی۔ عارف کے اپنے پرچے بے شک بہت اچھے نہ ہو سکے۔ مگر اُسے اُس کی پروا نہ تھی۔ اُوشا کی کامیابی پر وہ بے حد خوش تھا۔ اُس نے کہا۔ "سی جی! اُوشا تو پاس ہو گئی۔ اور ہم کو کچھ نہیں ملے گا؟"

"ملے گا کیوں نہیں" چاچی نے ہنس کر جواب دیا۔ "جو تم کہو!"

"یہ نہ کہئے۔ نہ معلوم میں کیا مانگ بیٹھوں۔"

"آخر وہی مانگنا جو میں دے سکوں!"

"ہاں۔ ہاں۔ وہی ..... پھر بھی ..... !"

چاچی ہنس کر بولیں "تم بڑے شریر ہو۔ عارف"۔

عارف بھی ہنس پڑا۔ بات ٹل گئی۔

عارف نے بی اے پاس کر لیا اور اوشا نے ایف اے انٹر بھی اور دو سال میں میٹرک کرنے کی دھمکیاں دینے لگی۔ عارف کا ارادہ تعلیم جاری رکھنے کا نہ تھا مگر اس کے معنے تھے سیتاپور کو روانگی یا ملازمت کی تلاش میں اور کہیں دور ..... اس موجودہ زندگی سے دور ..... آخر عارف نے ایم اے کرنے کا فیصلہ کیا حسب معمول رشید بھائی نے فوراً اور امی نے وزرا ہچکچاتے ہوئے اجازت دے دی۔

رشید بھائی کی شادی ہو چکی تھی اور اب ان کے پاس امی کا رہنا کوئی لازمی نہ تھا۔ انہوں نے خود عارف کے پاس آنے اور الگ گھر کر کے رہنے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر عارف نے انہیں
کہ ایم اے کی پڑھائی گھر پر رہ کر نہیں ہو سکتی۔ اک
جانا پڑے گا۔ اور کالج کی لائبریری میں تو
حالت میں ہوسٹل میں رہنا لازمی
نے چاچی کو بھی سمجھا د
مگر زندگی وہی
کہانیاں

اوشا

اس کا اندیشہ غلط ثابت کر دیتا۔ ان تخیل کی پروازوں میں وہ کبھی عارف سے پیچھے نہ رہتی!

ایک روز .....

"..... مجھے اب اوشا کے لئے رشتہ کی تلاش ہے میری خواہش تو یہی ہے کہ یہ بی اے پاس کرے تو اس کی شادی کر دوں۔ آگے دیکھو پرماتما کو کیا منظور ہے ....."

عارف سوچنے لگا۔ یہ اس کے ہاتھ میں کہ ... کو کیا کرے؟ .... آخر اس کا ...

گھر میں قدم رکھتے ہی انورادھا دوڑ کر اُس سے لپٹ گئی۔

"عارف بھائی" وہ خوشی سے چہک کر بولی۔ "اُودی کی شادی ہو رہی

ہے"

"اُودی" انورادھا کی ایجاد تھی "اُوشا دیدی" کا مختصر۔

اوپر سے ستار کی آواز آ رہی تھی۔ عارف زینے چڑھنے لگا۔ آشا

نے ستار رکھ دی۔ عارف بیٹھ گیا۔ دونوں خاموش تھے۔

آخر عارف نے کہا "انو کہہ رہی تھی کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے"

ہنس دیا۔ سر جھکائے تاروں کو چھیڑتی

"نہیں۔ لیکن میں جانتی ہوں۔ ممی جی ہماری بات نہیں سمجھیں گی

ان کو رنج ہوگا۔ اور میں ان کو تکلیف نہیں دے سکتی"

"سمجھیں گی کیوں نہیں؟ کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکیں۔ ....."

عارف بھائی آپ ابھی تک اپنے خطوں کی دنیا میں ہیں مگر

مجھے اس لوہے اور پتھر کی دنیا میں رہنا ہے"

"میں جانتا ہوں۔ اوشا۔ لیکن ایک بے معنی سی بات انسان

کی خوشی کو اس طرح روند ڈالے ...... یہ دیکھا نہیں جاتا"

"آپ اسے ایک بے معنی سی بات سمجھتے ہیں مگر دنیا تو نہیں سمجھتی

...... اور اسی دنیا میں ہمیں رہنا ہے۔ اسی لوہے اور پتھر کی

دنیا میں!"

انورادھا نے آ کر کہا۔ "عارف بھائی۔ ممی جی پوچھتی ہیں کہ

چائے لگے گی نا؟"

عارف نے جواب دیا "میں ابھی جا رہا ہوں"

چہرے کی طرف دیکھا۔ مگر آشا

خاموش کھڑا تھا۔

"!

اُوشا

ن

اختیار ہے لیکن آپ اُوشا کی گردن میں ان اصولوں کی رسیاں ...."

اُوشا نے عارف کا فقرہ پورا نہ ہونے دیا۔ "لیکن عارف بھائی"
وہ بول اُٹھی۔ "میں جو کچھ کر رہی ہوں وہ میری مرضی کے خلاف ہے
یہ آپ سے کس نے کہا؟"

"کسی کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے، میں خود سمجھ سکتا ہوں
کہ....."

"مگر" اوشا نے دھیمے اور مصمم لہجے میں کہا۔ "آپ غلط بھی تو
سمجھ سکتے ہیں۔"

عارف نے اوشا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ نیچی نظروں
سے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

عارف کا سر جھک گیا — نظریں میز پر جم گئیں۔ گویا
کے تختے میں سے گذر کر کسی چیز کو دیکھنا چاہتی

عارف نے سر اٹھایا تو کمرہ خالی تھا
سہارے کھڑی اداسی سے اُ
چاہتی تھی کہ کیا آج سر
جب عارف
لگا تو انوراد

"اُودی"

کھولا تو حیران رہ گئی۔

"عارف بھائی! ..... کیوں؟"

"کچھ نہیں ہوسٹل بند ہو چکا تھا۔"

"لیکن آپ تو یہاں سے کب کے گئے ہوئے ہیں۔"

"راستہ بھول گیا تھا۔"

اوشا کسی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی۔ "آپ میرے
بستر پہ سو رہیئے۔ میں انو کے ساتھ سو جاؤں گی۔"

عارف نے آہستہ سے کچھ کہا
والے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

کر یہ سوال اُٹھ رہا تھا "کیا ہر انسان انسان نہیں ہے"؟

سویرا ہوا۔ عارف کالج چلا گیا۔ شام اِدھر اُدھر گھوم کر
گزار دی، چاچی کے ہاں نہیں گیا۔ آہستہ آہستہ اُس نے آنا جانا
کم کر دیا۔ اور جب آتا بھی تو گم سُم بیٹھا رہتا۔ کبھی کوئی کتاب لے
کر لیٹ جاتا اور چپ چاپ پڑھتا رہتا۔ کبھی انورادھا اپنے سکول
کی باتیں سناتی اور وہ سنتا رہتا۔ کبھی کبھی اُوشا ستار بجا رہی
... تھا اُس کی انگلیوں کو ہی دیکھتا رہتا۔ اسی طرح شام

... ...

"شاید آپ سمجھتے ہیں کہ ......"
باہر سے تانگے والے نے پکارا۔ "اور کتنی دیر ہے بابو صاحب!"
عارف نے ہاتھ بڑھایا اور انورادھا اُس سے لپٹ گئی۔ اوشا نے
بھی اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ تانگے والے نے پھر آواز دی۔
"خط" اوشا نے گویا کچھ نگلتے ہوئے کہا "خط لکھئے گا؟"
"دیکھو"۔
"کم سے کم پہنچنے کی دو سطریں تو ......"
"اچھا"۔ عارف نے اوشا کا ہاتھ چھوڑ دیا۔
تانگے میں بیٹھ کر عارف سوچنے لگا ..... اوشا نے قربانی
کی ہے۔ قربانی! ..... مگر کس لئے؟ ..... آخر کس لئے؟ ...
... اوشا خوش ہوگی کہ وہ جیت گئی ہیں ہار گیا۔ لیکن
... طاقتوں کی شکست نہیں ہے جو انسان کو
آزاد کرنے کے لئے لڑ رہی ہیں؟ ....
... ہجوم میں سے اپنی راہ پر دنا
... ابھی دیر تھی۔ ایک
... کے سیلاب

... س لئے!
... ہلکان
... ہی
... ے؟
!
.

"غریب آدمی ہیں ر۔۔۔۔۔"

"اچھا۔ اچھا۔ ہم تو یہی دیں گے۔ لینا ہے تو لو۔ ورنہ موج کرو۔"

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"تازہ اخبار۔ تازہ اخبار۔"

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"ارے او پوری والے۔ پوری گرم ہے؟"

۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"دو۔ دو پیسے۔ دو پیسے۔ سنگترہ!"

۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"ارے او پانی والے۔ ہندو پانی ہے یا مسلمان؟"

"مسلمان!"

"اچھا۔ اچھا۔ جاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہندو پانی۔ ارے او ہندو پانی!"

مدن موہن نقایا

رباعی

پیشِ چہرۂ خورشید سیاہی تا چند
سلطانِ حقیقت بہ تباہی تا چند
جانم ہمہ تن ز قیدِ تن تنگ آمد
زیں مردہ بدو زیستنِ من الٰہی تا چند

امجد حیدرآبادی

سکوت

وقت نے باغ میں چھیڑا ہے پھر افسانۂ حُسن
چاندنی رات، دلآویز فضا
زرد رو کاہکشاں
پھول ـــــ بشاش و ملول
چند خاموش سے کردار ہیں افسانے کے
یہ فسانہ کہ کسی قید کا پابند نہیں
یہ فسانہ کہ ازل سے ہے ابد تک جاری
چھا گیا آج کی رات
بن کے احساس دلِ شاعر پہ
جاذبیت کا وہ عالم ہے اس افسانے میں
کہ گماں ہوتا ہے
میں بھی اک جزو ہوں شاید اسی افسانے کا۔

جگن ناتھ آزاد

گیت

سپنوں کا جادو ٹوٹ گیا
رہ تکتے تکتے چندرماں کی جی تاروں کا چھوٹ گیا
دم اک اک کر کے توڑ رہے ہیں
پتھرائی آنکھیں پھوڑ رہے ہیں
سجی سجائی سیج رین کی بھوت بھور کا لوٹ گیا
سپنوں کا جادو ٹوٹ گیا

جاگ رہے ہیں دھیرے دھیرے
پنڈت، پانڈے، پجاری، پروہت، کھڑتالے، سنکھ مجیرے
آرتی پوجا کو درشن پیاسی
من مندر میں ہے دیوا داسی
چھنا چھنا چھن گری پاؤں میں دھیان کا درپن پھوٹ گیا
سپنوں کا جادو ٹوٹ گیا

قیوم نظر



نے اپنے دونوں ہاتھ کیچڑ میں ڈبو دیئے ہیں۔ "مرا ننھا جوان ہوگا"۔ اور اس قسم کی دوسری نظمیں نہایت سطحی ہیں اور مجھے تعجب ہے کہ راشد ایسے فہمیدہ نقاد نے انہیں سند کے طور پر کیوں پیش کیا۔ یہ نظمیں وہ ہیں جن سے اختر کی شاعری بالکل بازیچۂ اطفال معلوم ہوتی ہے اور قاری "نغمۂ حرم" کے مطالعے سے یہی کیفیت لے کر اٹھتا ہے۔

اختر کو جن نظموں کی وجہ سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے وہ اس کی عشقیہ نظمیں ہیں۔ ان میں سلمیٰ کے ساتھ قدیم عرب شعرا کے انداز میں جو محبت ظاہر کی گئی ہے۔ اس نے بعض لوگوں کو نہایت متاثر کیا ہے۔ لیکن محض ایک عورت کا نام لے دینے سے شاعر کی عظمت ثابت نہیں ہوتی جب تک اس کی نظمیں کامیاب نہ ہوں اور ان سے واقعی عشق و محبت کا احساس ظاہر نہ ہو۔ اختر کی بہت کم نظمیں ہیں جن میں عشق کی حرارت یا حقیقی تجربات موجود ہوں۔ عام طور پر وہ خیالی اور رسمی باتوں کا اظہار کرتا ہے۔ مثلاً

ہمارے چاک گریباں کو دیکھئے تو سہی ہمارے سینۂ عریاں کو دیکھتے تو سہی؟
اور اس بہانے انہیں ہمکنار کر لیتے

بعض لوگ اس قسم کے معمولی مضامین سے جو آخری مصرعے میں ادا کیا گیا ہے۔ بہت خوش ہوتے ہیں۔ لیکن بلند پایہ عشقیہ شاعری میں یہی مضمون کہیں زیادہ خوش اسلوبی سے ادا کیا جا سکتا ہے اور اس میں کہیں زیادہ اصلیت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اختر کے جذبات بالعموم سطحی ہوتے ہیں۔ گویا وہ صرف سنی سنائی باتوں کا اظہار کر رہا ہے اور حقیقی معنوں میں عشق کا ذوق آشنا نہیں۔ مجھے اس امر سے انکار نہیں کہ وہ فی الواقع محبت میں مبتلا رہا ہے یا نہیں۔ ممکن ہے وہ زندگی کے اس میدان کا ایک بہت بڑا شہسوار ہو۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ شاعری کے میدان میں کس طرح جولانی طبع دکھاتا ہے۔ اور اس میں یہ اہلیت ہے یا نہیں کہ وہ واردات محبت کے جذبات کی توضیح کر سکے۔ اختر میں یہ اہلیت بہت کم ہے۔ وہ محبت کے تجربوں کا ذکر ایک محرم راز کی حیثیت سے نہیں کرتا بلکہ ایسے ناظر کی حیثیت سے کرتا ہے جو اس پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر گزر جائے۔ یا دوسروں سے کوئی جھوٹی سچی بات سن کر اسے معمولی تصرف کے ساتھ پیش کر دے۔ غزلوں میں اس کی ناکامی بہت واضح ہے۔ وہ ان میں بالاکثر رسمی مضامین پیش کرتا ہے اور جو غزلیں اس عیب سے خالی ہیں ان میں بھی نہایت سطحی عشقیہ جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔

اختر نے زیادہ تر لمبی بحر کی نظموں میں تنوع پیدا کیا ہے۔ اس لحاظ سے اس نے اقبال کے ان تجربوں میں وسعت پیدا کی جو اس نے وضعی ہیئت کے سلسلے میں کئے۔ اختر کو چھوٹی بحروں سے کم رغبت تھی۔ اس لئے یہ میدان حفیظ کے ہاتھ رہا۔

اختر نے ہمارے افکار اور ادبی تصورات میں کوئی نئی بات اضافہ نہیں کی۔ ماسوائے ان کے جو اس کی شاعری میں التزاماً موجود ہیں یعنی رومانویت۔ آزادی۔

اختر کی طبیعت میں موسیقیت ہے لیکن وہ اسے اپنی منظومات میں زیادہ دیر برقرار نہیں رکھ سکتا۔ چنانچہ اس کی متعدد نظموں کی دھن۔ ابتدائی بول اور ٹیپ کے مصرعے یا شعر بہت سریلے ہوتے ہیں اور ہم ان سے ایک بلند ٹھاٹھ کی توقع کرتے ہیں۔ لیکن چند شعروں کے بعد ان کا ترنم ماند پڑ جاتا ہے۔ اسے ہر دلعزیز شاعری کرنے کا ڈھنگ تو آتا ہے اور اس کا ذہن اچھے اچھے موضوعات میٹھی دھنوں اور جاذب توجہ بولوں تک تو پہنچ جاتا ہے لیکن وہ انہیں نبھا نہیں سکتا۔ سریلی دھنوں کی مثال۔

مندرجہ ذیل مصرعے ہیں۔

۱۔ اے عشق کہیں لے چل۔
۲۔ سنا ہے میں نے سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں۔
۳۔ دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے۔
۴۔ مجھے تو کچھ دکھی بیمار کلیوں سے محبت ہے۔
۵۔ مرا ننھا جوان ہوگا۔
۶۔ سنو کہ صحرائے نجد اک دکھ بھرا افسانہ سنا رہا ہے۔
۷۔ حصار دہلی پہ ماہ تاباں شراب سیمیں بہا رہا ہے۔
۸۔ ہواؤں کی گود میں فرشتے سنہری پر پھٹ پھٹا رہے ہیں
۹۔ بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو گیا ہوں۔

۱۰۔ اودیس سے آنے والے بتا۔

غالبًا یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اختر کو ہندوستانی زندگی کا نقشہ کھینچنے میں کافی مہارت ہے۔ اور یہی شاعر کو ہردلعزیز بنانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہی بات تھی جس نے امیر خسرو کو ایک مقبولِ عام شاعر بنایا۔ چنانچہ ان کی پہیلیاں۔ بول اور دوسخنے آج تک مشہور ہیں۔ اختر کو بھی ابتدا میں اس بات نے مشہور کیا جب اس کی نظمیں پہلے پہل مشتہر ہوئیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کی خاک نے ایک بظاہر دلعزیز شاعر پیدا کیا ہے۔ جو کچھ دنوں میں تمام ملک پر چھا جائے گا۔ اس فوری شہرت کا سبب اس کی نظموں کی سریلی دھن اور شعریت بھی تھی۔ ان میں غنائیہ شاعری کی مسحور کن دلآویزی تھی۔ لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا وہ ملکۂ شعری جس نے "اودیس سے آنے والے بتا" اور "بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو گیا ہوں" ایسے خالص وطنی اور جذباتی گیت پیدا کئے تھے۔ وہ بالکل ماند پڑ گئی۔ یہاں تک کہ اس میں دوبارہ ابھرنے کی اہلیت ہی نہ رہی نہ وہ رومانوی اور واقعاتی فضا رہی اور نہ وہ مدبھرے گیتوں کا سرِیلا ترنم جو انسان کو خودبخود اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اور اس کے دل و دماغ پر جادو کی طرح چھا جاتا ہے۔ کیا یہ روح پھر بیدار ہو گی؟ کیا یہ جادو پھر اپنا اثر دکھائے گا؟ کیا یہ عشقیہ لے پھر ہواؤں میں گونجے گی؟ کیا یہ شعریت پھر شناسائے تکلم ہو گی۔ ان سوالات کا جواب اختر کے تاثر یا فکرِ شعری پر موقوف ہے بعض اوقات شاعر کی روح مدت تک محوِ خواب رہتی ہے اور نئے نئے سپنوں کا تصور کرتی ہے۔ پھر وہ دفعتًہ کسی اور تحریک سے بیدار ہو کر ان سپنوں کو شاعری کا لباس پہناتی ہے۔ ممکن ہے اختر کا تخیل جو اپنے سابقہ تاثرات کی ترجمانی سے فارغ ہو کر ایک برسے ہوئے بادل کی طرح بے نم ہو چکا ہے پھر نئے احساسات سے لبریز ہو کر نئے گیت اور نئے نغمے پیش کرے بظاہر یہ امید خوابِ پریشاں معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اب اختر وہ پہلا اختر نہیں رہا اور اس کی طبیعت کا رخ بالکل ماضی کی طرف ہے۔[۱]

یہ ہے اختر شیرانی کا مختصر تعارف۔ اگر پھر کبھی ملاقات کا اتفاق ہوا تو چند اور الفاظ شبنم کے چند اور قطرے۔

محمد رفیق خاور

[۱] الٰہی خیر! (ا۔ا۔د)

تنہائی

دور جہاں کے ہنگاموں سے
سونی سونی ہے اک وادی
بنجر راہیں، سنساں ٹیلے
کالی، گہری، لمبی درزیں،
آگے پیچھے، دائیں بائیں
مایوسی کی لہریں گائیں،
غم کے جھولے میں لہرائے
ایک مسلسل سائیں سائیں
رومانی تخئیل کے ڈھلیچے
چرمر چرمر، کرتے جائیں
لاکھوں ہلکی ہلکی نیندیں
ایسے آئیں، ایسے جائیں
بادل کے پردوں کے پیچھے
چاند کی آنکھ مچولی جیسے
فطرت کی یہ طوفاں خیزی
کانپ اٹھا تنہا فریادی
دور جہاں کے ہنگاموں سے
سونی سونی ہے اک وادی

(فکر تونسوی)

سویرا

پھر سے نغمۂ شب گیر کی افسردہ فغاں۔
دور لہراتی ہوئی جاتی ہے
نیلگوں، سرخ، سنہری تانیں
وقت کے ساز کے پردے سے لپک اٹھی ہیں
سیم بر کہرے کی موجوں میں ڈھپی دیواریں۔
سرد شفاف ہواؤں میں اٹھیں
سینہ تانے ہوئے سرا فروزاں

محمد صفدر

اُڑان

خوشنوا، شوخ، پرندے ہیں خیالات مرے
جو سناتے ہیں مجھے رات کی تنہائی میں
خواب کی پریوں کے پرکیف سریلے نغمے

یہ پرندے، یہ تمناؤں کے بکھرے ہوئے عکس
جن کے جلووں سے ہے فردوسِ تصور معمور
تیرتے پھرتے ہیں امواجِ صبا پر ہر سمت

جی میں آتا ہے کہ اے کاش کسی طرح انہیں
اپنے الفاظ کے پنجروں میں مقید کر لوں
دام پھیلاتا ہوں ان کے لئے لیکن بے سود
اونچی شاخوں پہ یہ جا بیٹھتے ہیں گاتے ہوئے
دسترس سے یہ مری دور رہا کرتے ہیں
کسی دوشیزہ کی مغرور جوانی کی طرح

میرے پنجروں میں تو ٹوٹے ہوئے پر ہیں چند ایک
میری افسردہ تمناؤں کے اُجڑے مرقد

(۲)

اور جب اس کاوشِ بے سود سے تھک جاتا ہوں
نیند کی دیوی اشاروں سے بلاتی ہے مجھے
چپکے چپکے پھر اتر آتے ہیں ان شاخوں سے
یہ پرندے، مری تخئیل کے گلزاروں میں
اپنی آغوش میں خوابیدہ ترنم لے کر
پھر وہی یاد، وہی گذرے ہوئے وقت کی بات
سوچتے سوچتے مدہوش سا ہو جاتا ہوں
یہ پرندے، یہ مرے ذہن کے لمعاتِ جمیل
پھیلتے سایوں میں تحلیل ہوئے جاتے ہیں
اور مجھے دور لئے جاتے ہیں ان کے نغمے
ایسی وادی میں جہاں ساری فضا ہے مخمور
دھندلے دھندلے ہیں پراگندہ نقوشِ ہستی

سید ضیا جالندھری

نقد و نظر

راہگذر

(عاشق حسین صاحب بٹالوی کے ۱۵ جدید افسانوں کا مجلد مجموعہ۔ دیباچہ از ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ۔ ضخامت تین سو صفحات۔ کاغذ سفید دبیز۔ لکھائی چھپائی گوارا۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے ۱/۱۲ ناشرین اردو بک شاپ نسبت روڈ لاہور)

آج سے کم و بیش چھ سال پہلے جب عاشق حسین صاحب بٹالوی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ سوزِ ناتمام کے نام سے چھپا تو اس زمانے کی نسبتاً خاموش فضا میں ایک ہنگامہ سا بپا ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے ادب کی محفل میں پرانی بساطیں الٹی جا رہی تھیں۔ کل کے صدر نشین بستہ ہو رہے تھے اور وہ لوگ جن سے آج کے ہنگامے قائم ہیں، آگے بڑھتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ ایسے میں سوزِ ناتمام کا مصنف اُس اعتماد کے ساتھ جو ہنرمندی کا خاصہ ہے، مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور قریب کی ایک مسند پر جمتے ہی محفل پر چھا گیا۔ اُس کے فن کا مظہر ایک آئینہ تھا جس میں اہلِ مجلس اپنی صورتیں دیکھتے اور چونک اُٹھتے تھے۔ وہ اسے آئینہ خود نما کہتا تھا، جہاں نما نہیں پس جن لوگوں نے چاہا کہ اُس میں اِدھر اُدھر کے تماشے دیکھیں انہیں مایوسی ہوئی۔ اور انہوں نے اسے فن کار کی کمزوری سے تعبیر کیا لیکن فن کار مسکراتا رہا اور اُس کا آئینہ اُس مسکراہٹ اور اُس کے پیچھے چھپی ہوئی تلخ کامیوں کے ایک طوفان کی عکاسی کرتا رہا۔

سوزِ ناتمام کے افسانے اپنے داخلی اندازِ نظر کے باعث ایک بے پناہ قوت اور ایک اضطراب انگیز انفرادیت کے حامل تھے۔ وہ صداقت اور گہرائی جو موضوع کی ہم نفسی اور مطالعے کے قُرب سے پیدا ہوتی ہے، ان افسانوں کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ زمانے کی بدلتی ہوئی ہوا کے باوجود عاشق بٹالوی کی فنی تخلیقات ہمارے شعور کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوتی رہیں اور آج بھی جبکہ چاروں طرف ادب برائے زندگی کا شور برپا ہے۔ اور ہمارے "ترقی پسند" ادیب اپنے فن کو حیاتِ اجتماعی کی قربانگاہ پر پیش کر رہے ہیں، اگر کوئی چیز ہماری روحانی تشنگی کو تسکین کا پیغام دیتی ہے۔ اور ہماری جراحتوں کے لئے مرہم کا سامان کرتی ہے، تو یقین جانئے کہ یہ وہی سِرِ دلبراں ہے جو حدیثِ دیگراں کا نقاب پہن کر کبھی کبھی کسی ایسے فن پارے کی اوٹ میں سے ہمیں جھانک لیتا ہے جس کی تخلیق آرٹسٹ کے اپنے دل کے لہو اور اُس کی اپنی جانِ ناتواں کے سوز سے ہوتی ہے۔

سوزِ ناتمام کے بیشتر افسانے اسی کیفیت سے معمور تھے۔ راہ گذر میں مصنف کا ذہنی افق وسیع تر ہو گیا ہے۔ وہ کبھی کبھی اپنے دل کی گہرائیوں سے نظریں اٹھا کر ایک نگاہِ غلط انداز اپنے گرد و پیش بھی ڈال لیتا ہے۔ اس مجموعے کے ہلکے ہلکے تأثر پارے مثلاً خوشبودار خط، الف لیلیٰ کی ایک رات، آموں کی فصل، پہاڑ کی سیر، نئی زندگی کی تلاش۔ اسی جنبشِ نگاہ کے نتائج ہیں۔ اور از بسکہ ایک نفسیاتی فرار کی پیداوار ہیں۔ اس لئے مصنف کے اندازِ نظر کی مخصوص کیفیتوں سے محروم ہیں۔ تاہم حسنِ بیان کی وہی رنگینیاں جو عاشق کی سنجیدہ تخلیقات میں پائی جاتی ہیں، ان پر بھی چھا رہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر میں فن کار کی شدتِ احساس ایک طاقت ور مقناطیس کی طرح الفاظ کو ان کی خواب گاہوں سے کھینچ کھینچ کر نکالتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ان سُبک نرم رقعوں میں الفاظ کا رنگ مطالب کے نقوش سے یوں گھُل مل جاتا ہے جیسے یہ دونوں عناصر خالصتاً ایک دوسرے کے لئے وضع کئے گئے ہوں۔ میری ناچیز رائے میں الفاظ اور انشا پر جو حیرت انگیز قابو اس مصنف کو حاصل ہے، اس کی نظیر دورِ حاضر کے افسانہ نگاروں میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔

مجموعۂ زیرِ نظر کے متین افسانوں میں "قدرت کی گود میں" بحیثیتِ مجموعی سب سے اچھا افسانہ ہے۔ یوں تو سوزِ ناتمام کے بعد مصنف کے قنوطی اندازِ خیال میں ایک خوشگوار تبدیلی کے آثار پیدا ہو گئے تھے، جن کا مجموعی اثر موجودہ تصنیف میں خوب نمایاں ہے۔ لیکن یہ افسانہ بجائے خود جذبات و تأثرات کا ایک بالکل جدید رجحان پیش کرتا ہے جس کی بنیاد فرار پر نہیں بلکہ ایک ایسے صحت مند احساسِ تسکین پر ہے جو ایک روتے ہوئے بچے کو آغوشِ مادر اور ایک شکستہ دل حساس نوجوان کو آغوشِ قدرت ہی میں مل سکتا ہے۔ مصنف نے ہماری ادبیات میں حسنِ قدرت سے ہم آہنگی کا یہ جدید زاویہ پیش کر کے اس دور کی عام ناصبوری کا ایک نہایت کامیاب علاج تجویز کیا ہے جو فرار سے نہیں

بلکہ ایک تسکینِ حقیقی سی ہاتھ آتی ہے۔ جب تک یہ زندگی اپنی گوناگوں کیفیتوں اور کمزوریوں کے ساتھ قائم ہے، انسان اپنے زخموں کا اندمال تلاش کرے گا، پس اگر وہ اس جستجو میں اُس چشمۂ جاوداں تک پہنچ جائے جو خود زندگی کا منبع ہے تو ظاہر ہے کہ اُس کی تلاش بے کار نہیں گئی یہ نظریہ اس کتاب کی سب سے دل افروز کہانی میں پیش کیا گیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اپنے حُسن اور افادیت کے لحاظ سے اسے ہمارے ادب میں ایک نہایت بلند مقام دیا جائے گا۔

جوانی کا خواب اور **بسترِ دلبراں** عشق کی جانگدازیوں اور حسن کی ناسمجھیوں کی دو ایسی پُرآشوب داستانیں ہیں، جن میں مصنف کا اسٹائل اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ اور کم و بیش یہی کیفیت کاشانۂ محبوب کو دیکھ کر اور حورِ صحرا کے نام میں پائی جاتی ہے عشق کا المیہ عنصر عاشق صاحب کے جوہرِ طبع سے خداداد مناسبت رکھتا ہے اور اس موضوع پر ان کے قلم کی خونناب فشانی یقیناً اپنی مثال نہیں رکھتی۔

چار یاری مصنف کے ایک اور محبوب موضوع کا مرقع ہے بلکہ یوں کہئے کہ اُس کے اندازِ فکر کا ایک تابناک پہلو۔ عاشق صاحب کی شخصیت مخلص احباب کی صحبت میں جس قدر نکھرتی ہے اور اُن کا فن اُس کے حیات افروز ماحول میں جس قدر ابھرتا ہے، اس کا اندازہ اُن لوگوں کو نہیں ہو سکتا جو اُن سے ذاتی طور پر آشنا نہیں لیکن چار یاری جیسے نقوش میں اس خصوصیت کی ایک جھلک سی ضرور دکھائی دیتی ہے یہاں اُن کی نگارش کی حزیں کیفیت کو ہلکے ہلکے مزاح کی موجیں ڈھانپ لیتی ہیں اور اُن کے زندہ کرداروں کے قہقہے ہمارے قہقہوں میں کھو جاتے ہیں۔ مصنف کی یہ قدرت اُس کے فن کی ہمہ گیری کا ایک روشن ثبوت ہے۔

راہ گذر اپنے عہد اور اُس کی اضطرابی کیفیتوں کی ایک کامیاب اور دل آویز تصویر ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ ذہین پڑھنے والے اس کے مطالعے سے نہ صرف لطف اندوز ہوں گے بلکہ فکر و خیال کی چند ایسی ندرتوں سے آشنا ہوں گے جو زندگی کی حقیقی قدروں میں اضافے کا باعث ہوتی ہیں۔

ہمیں مصنف سے صرف ایک شکایت ہے، وہ یہ کہ اگر وہ چاہتے تو اس مجموعے میں چند ایسی چیزیں شامل نہ کرتے جو اپنی سراپا جمال ہمنشینوں کے ساتھ کچھ بھلی معلوم نہیں ہوتیں۔

صلاح الدین احمد

(بقیہ صفحہ ۲۰)

معاملات سے گہری دلچسپی لیتے تھے۔ اردو ہندی کا جھگڑا [illegible] جاری تھا جس میں سب شریک تھے، ملک میں مسلمانوں کی تعلیم کا خیال اہمیت حاصل کرتا جا رہا تھا اور ایک مشرقی جامعہ کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی۔ سر سید [illegible] وقت کی تعلیم کے خلاف تھے، اور سید عبداللہ ان کے ہمنوا تھے، سر سید نے موجودہ تعلیم کے خلاف "موجودہ تعلیم پر اعتراضات" کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع کیا تھا، جس کا جواب بابو شیو پرشاد [illegible] کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے، ان کے اختلاف کی [illegible] نوعیت تھی، جو اردو ہندی کے مسئلہ میں عام ہندوؤں کی تھی جس کا ثبوت اُن کے الفاظ سے ملتا ہے کہ آٹھ صدی تک مسلمانوں کے مظالم برداشت کر چکے ہیں"۔ مظفر پور کی سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار الاخیار میں سید امداد علی نے ایک مضمون میں ثابت کیا تھا کہ روزمرہ کی زبان میں تعلیم دینے سے تعلیم میں سہولت ہوگی [illegible] ہندوستانیوں کو دیسی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کا موقع [illegible]

اس وقت اردو اخبارات ترقی کی راہ پر تیز تیز قدم بڑھا رہے [illegible] ان میں روزنامے اور ہفتہ وار زیادہ تھے، انہیں کچھ آزادی بھی حاصل ہو گئی تھی [illegible] اخبار جو سرکار کی سرپرستی میں نہ تھے [illegible] ضرورت سمجھتے تھے، انگریزی حکومت پر تنقید بھی کرتے تھے، اور پریس کی قوت ایک حقیقت ہوتی جاتی تھی"۔ دتاسی اپنے ۱۸۷۲ء کے خطبہ میں لکھتا ہے "ادبی کتابوں کے [illegible] اردو کو خاص اہمیت حاصل ہے جنہیں دن بدن ترقی ہو رہی ہے، وہ سیاسی، علمی، ادبی اخبار جن کی نسبت میں پہلے ذکر کر چکا ہوں بدستور جاری ہیں"۔

(معارف)

(سید) ابوعاصم

سلہ

[illegible] "بیان دتاسی"